

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224137

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 1915 C.F. A

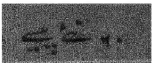
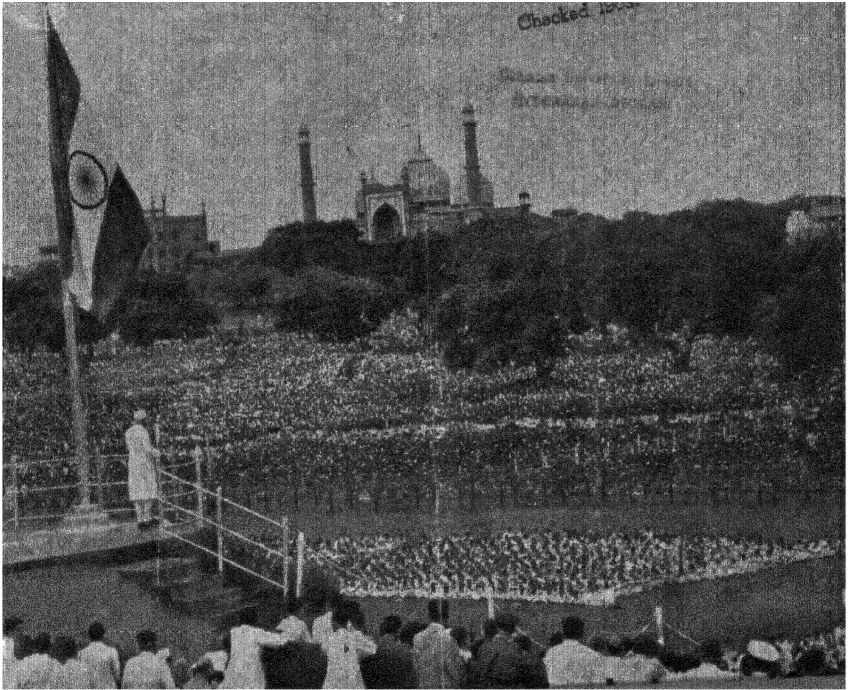
Accession No.

Author

Title 1945 1970 - 1975

This book should be returned on or before the date last marked below.

آج کل



نہروں شکستہ
۱۹۶۱ء
سخت



سیلاب کی تباہ کاریاں

وزیراعظم نثری جو اہل لال نہرو
کی

ایمل

برسات کا موسم آگیا ہے اور

پھر ہمیں بڑے بڑے سیلاب اور

بعض اوقات ایسی تباہیوں کا سامنا

کرنا پڑ رہا ہے، جن کا شکار ہونے والوں

کی فوری امداد کی ضرورت ہے۔

پرائم منسٹر نیشنل ریلیف فنڈ سے جس میں بہت سے ہندوستانیوں اور باہر کے لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا ہے، ہندوستان

بھر میں ان لوگوں کی بڑی امداد کی جاتی رہی ہے، جو قدرتی مصائب کا شکار ہوتے رہے ہیں۔

یہ فنڈ اب قریب قریب ختم ہو چکا ہے اور اگر فوری طور پر اس میں مزید چندہ نہیں آیا، تو ہمارے لئے ان ضرورتوں

کو پورا کرنا ممکن نہ ہو گا خواہ وہ کیسی ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ اس وقت کیرل کی ریاست سے فوری امداد کی مانگ آئی

ہے، جہاں ایسے سیلاب آئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہ آئے تھے اور جن کی وجہ سے بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ

دوسری جگہوں پر بھی امداد کی ضرورت ہے۔

اس لئے میں پھر اپنے ملک کے خوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس نیشنل ریلیف فنڈ میں چندہ دیں تاکہ مصیبت زدہ

لوگوں کی امداد کی جاسکے۔

چندہ اس پتہ پر بھیجا جائے: سیکرٹری پرائم منسٹر نیشنل ریلیف فنڈ، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ

ساؤتھ بلاک، نئی دہلی۔

چیک اور معنی آؤ اور وغیرہ۔ پرائم منسٹر نیشنل ریلیف فنڈ کے نام ہی بھیجے جائیں۔

ملاحظات

میدان میں آگئے ہیں اور کثرت کا سلسلہ گورڈی کونسل میں پیش ہو چکا ہے عراق کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ کویت کو ایک آزاد اور خود مختار حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ خدا کرے عرب لیگ کی کوششیں بار آور ثابت ہوں اور عربوں کا اختلاف باہمی مخالفت سے دور ہو جائے۔

دنیا کے امن پسندوں کو کاغذ میں مصالحت کی جڑوں سے خوشی ہوئی تھی مگر کتنا دکھ کے صدر مرشدوہ نے کتنا لگاؤ کی آزادی کا پیرا اعلان کر دیا ہے۔ کاغذ کی پارلیمنٹ کا اجلاس اگلے پختہ ہونے والا ہے۔ مرشدوہ کے اس قلابازی ٹکے کو پیچیدہ بنا دیا، اور ایک بار پھر بحران کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

انگلوں اور فریقوں کے قتل عام کی جڑوں نے دنیا کو بڑی طرح مجبور کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ نے انگلوں کے تسلط ایک ریڈیو نوٹس پاس کیا ہے مگر اس کی بعض تجویزیں مرث کا فزوں ہی پر رہ جاتی ہیں۔ جنوبی افریقہ کے معاملے میں بھی ہوا۔ امریکا کا مسکو بھی کٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ اقوام متحدہ ظالموں کے خلاف مضبوط قدم اٹھائے تاکہ ظلم و جبر کا خاتمہ ہو۔

ہندوستان میں آسام کا لسانی مسئلہ نئے خطوط کی نشاں دہی کر رہا ہے۔ پگھار اور برہمن لکشی کے واقعات بہت ہی قابل انصاف ہیں زبان اور مذہب، ذات اور فرقہ ملک کی یک جہتی اور جدائی ہم آہنگی کے لئے سنگ گراں بنے ہوئے ہیں ہم ہندوستانی ہیں، ملک ایک ہے، جھنڈا ایک ہے مگر ہم نے ان بنیادی باتوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور جھوٹے جھوٹے گروہوں میں بٹ کر لینے ہی صحابوں کا لگا لگاتے ہیں اور اپنی ہی بیڑوں کو بے عزت کرتے ہیں۔ یہی فرقہ پرستی صوبہ پٹی اور زبان پرستی کے ذہر کو گرم کرتا ہی ہوگا۔

مطلح عالم پھر ابراہم دوسے بھی کبھی جنگ کے سبب بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ امین کی کریمیں ان سیاہ بادلوں کی اوٹ سے بھٹکتے لگتی ہیں مگر طبعی گھٹا ہی گھٹا ہی اٹھ رہا چھا جاتا ہے۔ اندھیرے اودھا جائے گی یہ آنکھ بچوئی بہت دلوں سے جاری ہے۔

دنیا کی دوڑی طاقتیں امریکا اور روس امن کی مدھی ہیں، دھڑ اس بات پر متفق المیے ہیں کہ دنیا کا امن و سکون کی ضرورت ہے مگر امن کے حصول کے واسطے کیا ہیں اس پر ان کا اتفاق نہیں اور یہی وہ بنیادی چیز ہے جو امن و امان کی ساری کوششوں کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ مثلاً ٹاؤس ہی کا مسئلہ ہے۔ روس اور امریکا دونوں اعلان کر چکے ہیں کہ ٹاؤس کو بالکل جبراً بنادنا دنیا چاہیے۔ مگر کیسے؟ جنیوا میں چودہ طاقتوں کا اجلاس بھی ملتوی ہو جاتا ہے اور کسی شروع ہو جاتا ہے۔ ٹیمن ٹمزاد سے بھی اپنے اختلافات دور کرنے میں لگے ہوئے ہیں گراپ ٹک کوئی اطمینان بخش حل نہیں نکلا ہے۔

کینیڈی فریقیت ملاقات سے بڑی امیدیوں بندھی تھیں مگر جرمن کے شے پردوس اور امریکیہ حریت بن کر میدان میں آگئے ہیں۔ الزام اور جاتی الزام کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہر شے پر دو یا زیادہ دائیں پیش کی جاتی ہیں اور دنیا کے ملک باہم متفق نہیں ہو پاتے۔ حال میں مطلع عالم پر کویت کی جلی جلی سے بیلیج فارس کی یہ چوٹی سی سیاست جس کی آبادی ہندو دہلی کے دسویں حصے کے برابر ہے، قدرت کے حیلے سے مالا مال ہے۔ عراق نے اس پر دعویٰ کر دیا ہے اور اسے صوبہ بصرہ کا ایک حصہ قرار دیا ہے بشرطی وسطیٰ ہیں کھلی چوٹی کے سعودی عرب اور شرق اردن نے کویت کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ بھی عراق کے حق میں نہیں ہے پیر سلطانہ اور امریکی بھی کویت کے حکمران شیخ عبداللہ کی امداد کے لئے

جگر کی شاعری

تھے گڑا حزن میں کے یکوں کہ ان کے اندر نہ ایک لذت پرست کا دل تھا نہ صوفی کا۔ وہ تو ایک ایسے سرمست اور سرشار انسان کا دل ہے کہ آیا تھا جس کے پاس صرف ایک دولت تھی — خلوص کی دولت، اور ایک قوت تھی — محبت کی قوت۔

مجھے جگر کی شاعری کی جن خصوصیات نے متاثر کیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری ذات کا پر تو ہے، معنی کا پر وہ نہیں ہے۔ یہاں حرف ان احساسات اور جذبات کی جھلک ملتی ہے جنہوں نے شاعر کو بے چینی کیا ہے، مضطرب رکھا ہے۔ یہاں وہ مضامین نظم ہوئے ہیں، جنہوں نے تیرے شاعر کو مجبور کیا ہے کہ اپنے کو نغمہ کر لیا ہے۔ یہ آسان بات نہیں ہے اس کے لئے زبردست محنت اور محنت کی ضرورت ہے جو ہر معلوت کو ٹھکرا کر آگے بڑھ سکے۔ دوسروں سے خلوص بڑھنا آسان ہے اپنے سے خلوص بڑھنا بہت مشکل ہے۔ جگر کی سب سے بڑی حیثیت یہی ہے کہ انہوں نے اپنے فنی پر بھی معلوت کا نقاب نہیں ڈالا۔

جگر نے شراب و شبابی کی شاعری کی ہے اور ان کی زندگی کے یہ گوشے بھی کسی کی غفلتوں سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ شراب کو انہوں نے پھینکا اور اس دھڑلے سے پی کر شاید ہی اتنی سستی اور اتنی زیادہ مٹھاپ ہندوستان کے کسی زبان کے کسی شاعر نے پی ہو۔ جب سب کو جگر کے شراب سے ڈال رہے تھے اس وقت

رشید احمد علی نے غزل کو اردو شاعری کی اکبر و ہمسایہ مانا۔ یہ بات مان لی جائے تو جگر مراد آبادی ان شعراء میں سے تھے جو جسید غزل کی اکبر و ہمسایہ تھے۔ جن شعراء نے غزل کو نئے، نئے رنگوں کے قلعوں سے آشنا کیا اور اسے میرے مقبولیت بخشی ان میں حسرت موہانی، قافی اور امیر کے ساتھ جگر کا نام ضرور لیا جائے گا۔ وہ ۱۸۹۰ء میں سرسید کے انتقال سے دو سال پہلے پیدا ہوئے تھے گویا انہوں نے ایک ایسے دور میں ہوش ستھالا تھا جب غزل کی اکبر و ہمسایہ تھی۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس میں ریزہ خیالی اور انتشار پایا جاتا ہے اور غزل گو شاعر عقیدہ اور رسمیات کا شکار ہوتا ہے۔ اس کا تصوف برائے شاعر مفسد ہوتا ہے۔ اس کا مشق آزمائش بیان اور اس کی زندگی پر مبنی ذہنی داستانیں لے کر ہوتی ہیں۔ اس کا لہر سستا اور اس کا لہر مٹا جاتا رہتا ہے۔ غزل کے لپٹے حریف اور اپنی مجبوریاں ہیں۔ جگر نے غزل کو سب کچھ سمجھا ان کی اس عظمت سے اتفاق کرنا دشوار ہے مگر اس مختصر دائرے میں رہ کر ان کے کمال نے جو سرشاریاں حاصل کیں ان کا اعتراف ضروری ہے۔

جگر نے بھی غزل کے اسی بنام کو پچھ میں پرورش پائی تھی۔ داغ کی شاگردی انہیں سستے لہر کا مزہ بھی چکھایا تھا اور معنی زبان کے لطیف اور بیان کے پشمارے سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ مگر جگر کی عظمت یہ تھی کہ انہوں نے اس کو پچھ میں قیام نہ کیا۔ وہ داغ کے شاگرد تھے مگر داغ انہیں سے بڑھ کر ان کے اندر کے انداز اور عقیدت مند

جگر شراب اٹا دل ہی مٹی، شاہد و شباب سے ان کے ربط و ضبط بھی
چھپے نہیں ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی اور اپنے عشق دونوں کو
بانگ اور بے لگ رکھا۔ ایسا ربط یا دسا اور ایسا پاکیزہ مشرب شاہد باز
شاہد ہی اردو ادب نے بھی پیدا کیا ہو۔ لہذا جگر کی منزل میں غربیات
کا درگاہ گیتی نہیں آپ جی کا علم رکھتا ہے۔ عشق اور وہ ادب آرتھ قلیہ
شاہد ہی نہیں مٹی زندگی مٹی جس سے تمام شاعری جنم لیتی ہے۔ غزل
یہاں تعلیمی غزل نہیں مٹی اس میں حقیقی تجربے کا رنگ بھرا گیا وہ
ذاتی کیفیت و دود اور سوز و نشاط کی آواز یہی مٹی تھی۔

شراب و شباب جگر کے ان آلودگی پر ختم نہیں ہوتے۔ دانغ
سے تولد تبت اور حیات کا مزا انھیں ملا تھا اسے اختر کے سموت لے
نکھ کر آلودگی سے پاک کر دیا۔ ان کے ان عشق وصال کے مرے کا نام
درا ہوا جو کافیت بن گیا۔ جگر کی شاعری محبوب کے پانے کی شاعری سے
زیادہ محبوب ہیں کھوجانے کی شاعری ہے۔ وہ گویا محبوب سے زیادہ
جذبہ عشق سے عشق کرتے ہیں۔ وہ جذبہ عشق جو محبوب سے ملنا نہیں
البتہ اس سے ملنے کی کتنی میں مستل تر پاتا ہے۔ اور تڑپ، عیش و
یغم وہ کلید ہے جو کائنات کے کھد کھوئی چلی جاتی ہے۔ جو بے تباقی
ہے کہ اصل بعیرت نشاط میں گم ہو جاتے ہیں نہیں بلکہ نشاط سے
آگے بڑھ کر نرم دو جہاں کے زہر کو خیمو کی طرح پی کر کائنات کے وجود
کے دائمی کرب کا ہرگز ہوا جاتے ہیں ہے۔ انسان دوستی، عالمگیر ہمدردی
اور اخوت کے مبارک جذبے مرث غم سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ غم
محبوب کا حسین اور بیش بہا حلیہ ہے

بجرت شاد و صل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے
اک شاہد معنی و صورت کے لئے کی تناسب کو ہے

ام اس کے منظر پر ہی خدا لیکن یہ مذاق عام نہیں
غم کیا ہے ذیہ مفات و ذات غم نہیں ہے تو آرزو، نجات
یہاں محبوب کا کوئی گم حیار تصور نہیں ہو سکتا جگر کا محبوب
نشاہد یا نازی ہے نہ بے رحم حلاؤ بلکہ وہ دھامل عاشق کی تحلیل ذات
کا ایک ذریعہ ہے وہ خود بھی شاعری کی طرح درد و کفیت سے آشنا
ہے اور وہ بھی شاعری کی ذات کی سرسقا اور وہاں نہیں میں شریک ہے۔

ان ہاں تجھے کیا کام مری سختی غم سے
ان ہاں نہیں بھوکا ترے دامن کی ہوا یاد
ملا جلتا ہے مزاج سہی سے رنگ عشق
شع مجھے پاک ہے گستاخ پروا نہ بھی ہے
ہے خود بھی عشق کی دولت عزیز ہے، اور جو عشق کے دل کی بات کو
نفوذ مٹی کے اشاروں کے بغیر پھر سکتا ہے۔

ابھی ہے دل کو مقام سپرد دئی سے گریز
اک اور بھی ہسی گریسے غمیں میں خلکی
بٹھے ہیں بزم دوست ہیں گم شدگان صحن دوست
عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

اور اسی لئے صحن کا درد ہے ان کے ان پرستش کا نہیں رفاقت کا ہے۔
گروہ رفاقت جو کھوپڑیا ہے جو اس قدر حدتس ہے کہ تیر کے غفلتوں
دور دنیا غبار تیر اس سے عشق ہی یہ ادب نہیں آتا
کی مصداق ہے۔ اس پاکیزگی کا ذکر کرتے ان الفاظ میں کیا ہے
وہ ہزار دہشیں جاں ہی مجھے غیر میر جی عزیز ہے
مجھے خاک پا تر ی جھوٹی وہ بڑا بھی ہو تو بڑا نہیں
مری طبیعت کو صحن غفلت سے ربط و رابطہ نہ جانے کیا ہے

مری نگاہیں بھی زائچیں ہمارت چشم تر سے پہلے
غم انسانی زندگی کی بعیرت کی کلید ہے اور غم محبت کا فیضان
ہے لہذا جگر کے نزدیک محبت ہی زندگی کا آدرش ہے اور اسی مرکز پر
انسانی سماج کی تشکیل ہوتی جا پئے (میر انیام محبت ہے جہاں تک پہنچے)
اسی لئے وہ ایک انسانی سماج کا تصور کرتے ہیں جس میں ہر افراد اور ان
خود غرضی اور تعصب کے بجائے محبت، راست گرداری اور خلوص کو
نظام حیات قرار دے سکیں۔ ان کے نزدیک اصل علم واصل مرغان
یہی ہے اور اگر تہذیب کے سارے منبع اور علم و سائنس کی ساری
ترقی کے باوجود انسان کی داخلی زندگی میں انقلاب پیدا نہ ہو سکا اور
وہ خود غرضی، لالچ، تعصب اور تنگ دلی سے نہ نکل سکا تو ان کے
نزدیک انسانیت کی ترقی ہے کار ہے

تیسر ہر وہاں مبارک تجھے مگر
دل میں اگر نہیں تو کہیں رو شنی نہیں

ہاں سے بڑھ کر پہنچے ہیں ہسان تک علم دفع ساقی
 گر آسودہ انسان کا دق ساقی دق ساقی
 جہل خروٹے دن سے دکھائے
 تخت گئے انسان بڑھ گئے سائے
 بڑے نزدیک انسان کی راست کرداری اور جڑے مسند
 خلوص سب سے اہم خصوصیات ہیں اور اس لئے عجیب اہمیت
 دہی میں راست کرداری پر جڑے مسند خلوص اور وسعت تنہری کی
 کمی نظر آتی ہے تو وہ مسعت پرستی کے بغیر پورے خلوص اور کرب کی مسعت
 اس پر تنقید کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے بہت سے مرثیے لکھے گئے ہیں مگر
 کی چھوٹی سی نظم اس سب پر بھاری ہے کیوں کہ اس میں دھندلی جی کے
 سیاسی کردار سے زیادہ اسی کے خلوص، ان کے پیغام محبت اور انسان
 کی پرست سے زیادہ زور دیتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جمہوریت کا صحیح معیار فرد ہے۔ جو تہذیب
 بہتر افراد کو کم نہ کر سکتی ہے۔ وہی میاری تہذیب کہلاتی ہے
 جگر انسانوں میں اپنے خود کے ہندوستان اور اپنے دور کی تہذیب دنیا
 سے نا آسودہ ہیں وہ انھیں مادی آسودگی اور ظاہری چمک دکھانے
 سامان دیتی ہے مگر انسان کی باطنی آسودگی اور اس کی راست کرداری
 کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ انسان کی مادی ترقی اور اس کے فہار
 کے دھال کا یہی تضاد ہے جسے کردار کے بجائے تعبیر کیا گیا ہے۔
 وہ دن بدن زیادہ آسائش پسند، زیادہ متمول اور زیادہ طاقتور
 ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کی ظرفیت اور اس کی
 مسعت پرستی اور اس کی تنگ نظری اور تعصب بھی بڑھتے جا رہے
 ہیں۔ جگر اس مفہم لہذا اور ذہنی جوان۔۔۔۔۔ پر سخت تنقید
 کرتے ہیں۔

جگر اپنے دور سے ملوث نہیں ہیں گروہ دایوس بھی نہیں ہیں۔
 جگر کی شاعری فرد کے لئے یقینی کام نہیں ملے اور سوئے فطرت کا پیغام
 دیتی ہے۔ وہ اہل کی تاریکی سے تھک کر بیٹھے دالوں میں نہیں خود اپنے
 "سوئے باطنی سے جڑ فانی" میں۔۔۔۔۔ جلائے دالوں میں سے ہیں۔

خود اپنے ہی سوئے باطنی سے نکال اک شمع جڑ فانی
 چمکانے دیر دم تو اسے دل جلا کر ہیں گئے بجاکر ہیں گئے

آج کل کی

اپنا دانا آپ بناتے ہیں اہل دل ہم وہ نہیں کہ جس کو دانا نہ بانیگا
 قسمت تری خود ہے ترے کردار میں منبر
 قسمت کو بنانا ہے تو قسمت سے گذرنا
 ہم اپنی کیوں طرز فکر چھوڑیں ہم اپنی کیوں وضع خاص بدلیں
 کہ اعتقاد بات تو یہ تو ہو گئے ہیں ہماری گئے
 اپنی اپنی دستِ فکر و یقین کی بات ہے
 جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو عیا
 جان خدا اس پر کہ جس نے جگر۔۔۔۔۔ نہایت بے زہار نہ ہار نہ ساتھ
 یہ معرکہ کاش لہجہ پروردہ دلدار ہو جائے
 جسے جینا ہو مرنے کے لئے متیار ہو جائے
 ہر ایک غلطیہ درپیش کارزارِ حیات
 سکون کاشش ذکر اسے دل سکون دشمن
 خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جگر۔۔۔۔۔ دو
 برائی آگ میں جلتا ہے کارِ مردانہ
 جو دشمنی کے لئے دہی سر سے اپنے کھیل جلتے ہیں
 دل خراب میں جھپٹا ہے انھیں کا باطن ساقی
 ہم کو شاکے پر ڈالنے میں دم نہیں
 ہم سے دانا خود ہے ڈالنے میں ہم نہیں
 یہاں جگر ایک ایسے شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں جسے
 فرد کی طاقتوں پر پے پناہ اعتماد ہے۔ جسے انسان کی مسعت اور اس
 کے باطنی متاع سے بہک کا احساس ہے
 ہر مسند کائنات دو عالم میں اسے جگر
 انسان ہی ایک چیز ہے انسان گرجاں

اور ان کی شاعری یہاں اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں وہ سستا نشہ
 نہیں بنتی، سوئے فطرت اور خوشی عمل کی پناہ میں رہ جاتی ہے اور
 غزل میں یہ آہنگ سمو لیتا اس دور کے شعراء میں جگر کے علاوہ
 بہت کم شعراء کے یہاں ملتا ہے۔

ان خیالات کے بارے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔
 یہ خیالات جگر کے ذاتی خلوص سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں نہ تقلید کا

رنگ ہے دیکھ منور کتب خیال یا پادشہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے
ان کو اپنا یا گیا ہے۔ ان پر جگر کی شخصیت کی چاپ ہے۔ یہ جگر کی ذات
کے رہنے رہنے کی بھار ہیں اور اس میں ان کا ظلم معلوم کوششیں،
گردہ بندیں (اداکر نظر پرستیں) کو لگا کر حقیقت کی بجی دریافت
کے درجے تک پہنچا ہے۔

بچے کا دل علم کی کوئی کمی نہیں یہی خود اپنی فکر اپنی نظر کہا
نیٹے ہم ہر بزم میں یہی بچے جھاڑے اٹھے اپنا دامن
دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان خیالات کو جگرتے جذبے کی شکل
میں دھال کر شریعت بحث دی ہے۔ شاعری کی حدود احساسات کے
لیف ترین ارتکافات سے شروع ہوتی ہیں اور خیال تک پہنچتی ہیں۔
علیم شاعری معنی احساسات کی شاعری نہیں ہوتی وہ خیالات کو
جدہ کی قوت اور گھٹی بٹھ رہی ہے اور اسے شریعت کے پیکر میں
دھل رہی ہے۔ بگڑاں گئے پچے شراہ میں ہیں جنھوں نے جن خیال
کو نظم کیا، اسے جذبہ کی رنگین اور شریعت کا حق بٹھ دیا۔ ان کے ان
خیال کی خلعت دہی گھراس کامی اور اس کی صداقت فرد ہے۔ الگ مقام
ہمارے معیار پر شہزادی صفت میں دہی گھرا کامیاب اور رنگیں نوا شعرا
کی صوبہ اول میں فرد ہے۔

غالباً ”دانا بگڑ“ (وزن خطہ طور) کے کلام کے پہلی عنصر
جگر کی فن کوئی کے بارے میں یہ رائے عام طور پر ظاہر کی جاتی ہے کہ ان
کی فن کوئی استادہ کی کامیاب تقلید ہے اور اس میں شباب و شباب کی
پیشین مستیاں ہیں اور اسے سبکی تنہید یا فکری سمت سے سروکار نہیں
لیکن ”آتش علی“ کے دھوکے شاعری کے بارے میں یہ رائے یقیناً نامتناہی
ہے۔ یہاں بگڑ کی قوت تھل اس قدر پر تاثر ہے کہ وہ خیال کی سولہ راہ
انہار کے باوجود شریعت اور تھل کے اٹھا کر برقرار رکھنے میں کامیاب
ہوئے ہیں۔ چند نظموں کے استثناء کے بعد جگر کی شاید کسی فن کوئی
اس کیفیت سے خالی قرار دیا جاسکے گا۔

جگر کی ایک اہم اہم خصوصیت ان کی شاعری کا کیفیت ہے۔
دیگر کے دھارے میں ایک کہانہ کہا تھا، ہمارے الفاظ بولتے نہیں
گاتے ہیں۔ جگر کے الفاظ بھی بولتے نہیں گاتے ہیں۔ جگر کی ظاہری ہتمام

یا درویشیت کے بغیر شریعت اور موسیقی قائم رکھتے ہیں غفلت
کے آفتاب، ان کے معنی ریلہ اور ان کی جھنگار اور صوفی تاثر پر
ان کی نظر اس قدر گہری ہے کہ گویا موزوں ترین الفاظ بلا کسی کاوش
کے ان کے فکر سے نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ شریعت اور موسیقی جگر کی
شخصیت کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار میں وہ جھنگار ہے
جس میں صنعت گری کا تاثر معلوم نہیں ہوتا۔ انشائیہ بیان کا وہ سادا
نہرا ہمارا روپ ہے جو دروں کو دھجیں لانا ہے اور شاعری کو موسیقی
کے کینہ دست سے لالہ لال کر دیتا ہے۔ جگر نے انشائیہ بیان کے مختلف
انماز اختیار کئے ہیں اور ہر جگہ ان کی ندرت ادا، واپا نہیں اپنے ساختگی
اور سادگی سے سمور اور شریعت سے بھرپور آہنگ ایک نیا عالم
پیدا کر دیتا ہے۔ چند نونے

خسرہ تنہیت چالاک دچستہ دست غرام

جنوں صداقت ہے پاک و مصلحت و دھن

ہمسال کے لالہ دلگی، کیا ہمارا تو بے شک

کھلے ہوئے ہیں دیوں کی جراثیموں کے چمن

ارے غضب اسے ستم وہ اک نوا و محسوس

جھکے اگر تو بت کدہ اٹھے اگر تو بت شکن

دہی دہی دہی زمان دہی مکیں دہی مکان

گر مسرور یک دلی گر نٹ ڈا جن

کہاں پہلے خورشید جاں تاب کہاں اک نازنین دوشیزہ شبنم

زندگی فسر بنی قدم بن کے کچھ جاتی ہے

اسے جنوں اور جی اک نواز بن متناہی

اپنی شوریدہ مراہی کو کہاں سے جاؤں

یڑا میساہ ہی تیرا اشارہ نہ سہی

راہ جنوں آسان ہوئی ہے زلف و دم کے سایے سایے

کار و زمانہ جتنا جتنا بنتا جائے بگڑتا جائے

ہو آتا نہیں کچھ کر مڑا تک نہ آئے گی ہمارا بکیریں کیا

یک لہر خوشی کا جب اجسام نظر آیا

شبنم کو ہنسی آئی دل فچوں کا بھر آیا

خسرو لغزہ رنگ و نکبت جام مہربا ہو گیا
زندگی سے حسن نکلا اور سوا ہو گیا
مشیق ہے پیارے کیل نہیں ہے مشق ہے کارِ شیشہ و آئین
غرض جگر کی غزل شاعرانہ وراثت کا ایک اہم سرمایہ
ہے۔ جگر کی سرسختی، ان کا خلوص، ان کی جرأت اور راست کرداری
ان کی شہریت اور کشنل کی کوتاہی — یہ سب ایسے

جو ہمیں جن سے کیفیت و بعیرت حاصل کی جاتی رہے گی۔
علی گنداب اس دنیا میں نہیں لیکن جسگر مراد آبادی
کی آواز ایک مدت تک سولہ یقینی اور زور بعیرت عشق رہے گی
جگر نے چرخ کسا تھا۔

جان کر نمبر خواصان سے خاندان بچے
مقلد رویا کریں گے جام و پیلا نہ بچے

نیل کنھڑ کی فح

نیل کنھڑ کی چوٹی مشہور ترقی استھان بدری ناکہ سے ۵ میل دور مغرب میں واقع ہے۔ اس کی بلندی ۲۱۶۴ فٹ ہے۔
دستلی ہمالیہ کی چوٹی کو پہاڑوں کی رانے میں بڑی دشوار گزار سمی جاتی ہے۔ اس خوبصورت چوٹی کو گوٹھوال کی ملکہ کہا جاتا ہے۔
اس صدی کی ابتداء ہی سے اس چوٹی کو سر کرنے کی کوششیں ہونے لگی تھیں۔ پہلی بار ۱۹۳۷ء میں ہستہ کی رہنمائی
میں ایک برطانوی ٹیم نے اس پر چڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ دس سال کے بعد ایک دوسری برطانوی ٹیم نے اس چوٹی کو
فتح کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ۱۹۰۰ فٹ کی بلندی سے اوپر نہ جاسکی۔ اس سال سوئٹزرلینڈ کے اپناٹھی کلب
کی طرف سے اس چوٹی تک پہنچنے کی کوششیں ہوئیں مگر ناکامی ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں ایورسٹ کے فاتح سر ایڈمنڈ ہلاری نے نیوزی لینڈ
کی ایک ٹیم کے ساتھ اس چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کی مگر ۱۸۰۰ فٹ کی بلندی سے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ برسات کے بعد
انھوں نے دوسری طرف پھرنے کی پھر کوشش کی مگر اس بار بھی کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں مشہور کوہ پیما ڈی۔ ایچ۔ ٹلی کی
رہنمائی میں تیسری برطانوی ٹیم نے چوٹی پر سر کرنے کی کوشش کی مگر اسے بھی ناکام و ٹھٹھا پڑا۔ سب سے آخری کوشش دو سال
پہلے انڈین ایئر فورس کی ایک ٹیم نے کی تھی مگر اسے بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس طرح ہر بار یہ چوٹی کو پہاڑوں کو شکست دیتی رہی جو اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر اس کو فتح کرنا چاہتے تھے لیکن
انسانی عزم اور ادا دے کے آگے اس چوٹی کو سر نہ جھکا نہ ہی پڑا۔ ساتویں بار جب کیپٹن این گاکی سرگرد کی ہیں ہندوستانی فوج
کی ٹیم نے اس پر پرتلاش اس چوٹی نے بھارتی سوردانوں کے سلسلے تکھے ٹیک دئے اور ۱۳ جولائی ۱۹۶۱ء کو سری او۔ پی۔ شرما
دو شہر پاؤں کے ساتھ چوٹی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے اور یہ ناقابل تہیز چوٹی فتح کر لی گئی۔

قابلی تجربے

بڑے بڑے دیہے نکالے دیں سے لکڑی کے ٹکڑوں کو کھوتا رہا مگر لکڑی کا کراہی میں غائب ہو گیا اور وہ پھر جیسی کی تیسری دکھائی دیئے گئی۔

جری سوچنے لگا۔ یہ کیا بات ہے۔ پھر اسے خیال آیا لکڑی میں چپا پریت باہر نکل کر چلا گیا ہوگا جب ہی وہ اپنے پیٹھ سے نہیں نکلتی تھی۔ وہ ڈرتا، ہستتا، جھکتا، غلٹکتا پھر اس طرف بڑھا۔ اس نے قریب آکر دونوں ٹکڑوں کو پھر غور سے دیکھا اور ہلکی سی ٹوکر ماری۔ لمبی لکڑی جیسی لکڑی سے الگ ہو کر گر گئی۔ اس نے ٹوکن جھکا کر انھیں غور سے دیکھا۔ وہ بے حور محسوس ہوئیں۔ اس نے اب ڈرتے ڈرتے انھیں چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے جیسی لکڑی کو ایک اونٹنی سے چھوٹے سی جلدی سے ہاتھ کیچ کر لیا۔ جہاں سے ہرا نکلتا تھا وہ محسوس کیا مائی بھی تھا اور گرم بھی۔ اس نے اُسے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے سونگھا، پھر یہ متلائے لگا، پھر ڈر گئے لگا۔ مگر کھوج لگانے والی خواہش بڑھتی ہی گئی۔ وہ جی لکڑا کر کے اکڑوں جلیے گیا اور اس نے جیسی لکڑی کو پاؤں کے انگوٹھوں سے دبایا۔ اور لمبی لکڑی کی ٹوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمائے لگا۔ اب کے جو دھواں نکلا تو اس نے پیر دانہ کی۔ وہ برابر گردن پڑھی کے کڑی پر لکڑی رکھتا ہی چپٹا لگیا۔ دھوڑ دھوڑ میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک گرم رو اس کی آنکھوں میں آگئی۔ ان میں ایک جلیں سی پیدا ہوئی۔ اس نے لمبی لکڑی ہاتھ سے پھر لکڑی اور جیسی میں سے نکلی ہوئی چمک کو

جری اپنے دوسرے ساتھیوں سے کچھ زیادہ عجوبہ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ جیسی کی نئی چیزوں کی کھوج میں لگا رہتا تھا۔ وہ بابا کے بتائے ہوئے آوں میں برابر ترمیم کرتا رہتا، گول کر چپٹا، پیچھے کو نوکیلا بنا کر دیکھتا کہ اس سے کون کون سے دوسرے کام لئے جا سکتے ہیں۔ ایک دن اس نے سوچا سارے آلے پتھر کی کیوں رہیں۔ کوئی آلہ لکڑی کا کیوں نہ بنایا جائے۔ اس کے داغ میں ایک کاٹھ کی ترنگری کا دھندلا سا خاکہ آیا۔ اس نے ایک چوکور جیسی لکڑی میں ایک نوکیلی لمبی لکڑی پہناتا چاہی۔ اس نے پتھر کے نوکیلے آلے سے جیسی لکڑی میں بڑی کوششوں سے ایک چوڑا سا سوراخ کیا۔ مگر لمبی لکڑی اس سوراخ میں نہ چا پائی تھی۔ اس نے لمبی لکڑی کی ٹوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمائا شروع کیا۔ وہ پیچھے پیچھے ہو گیا۔ مگر گھمائا رہا گھمائا رہا۔ دھند جیسی لکڑی سے لکڑی کے جال جیسی ایک ہیٹھیں سی چیز نکلنے لگی۔ جری نے لمبی لکڑی اور تیزی سے گھمائی۔ لکڑی کا جال کمرے جیسا سیاہی مائی ہو گیا۔ جری نے کبھی کسی لکڑی کے ٹکڑے سے اس طرح کی چیز نکلنے نہ دیکھی تھی۔ پھر اس نے ہرے میں ایسی بونٹھی کر اس کا یہ متلائے لگا۔ آنکھوں میں بھی مچھلی سی لگیں اور ان سے پانی پھینکے لگا۔ وہ ڈر گیا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا اور تھوٹھو کرنا بھاگ کر دور کھڑا ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس لکڑی میں کوئی پرتیت چپا ہوا ہے۔ وہ کسی بھالو یا بیڑی کے شکل میں نکلنے والا ہی ہے۔ وہ گردن بڑھاتے ہوئے

چوٹیں دیتا رہا، گر اب نہ وہ بڑھا، نہ پھیلا۔ اس نے اسے ہاتھ میں
 اٹھ کر دیکھا اس میں نوک پیدا ہو گئی تھی اور وہ ایک پسو سے
 زیادہ چمٹا ہو گیا تھا۔ جری نے چھٹے صفے کو پانی سے گیلے پتھر پر
 گھسنا، رگڑنا شروع کیا۔ اس کی سیاہی کم ہوئی تھی اور اس میں
 چمک سی پیدا ہو گئی گردہ موت بھر بھی نہ بڑھا۔ جری نے کچھ
 سوچ کر پینے کی لکڑی کے دو ٹکڑے سے چوٹی لکڑی میں اس
 ٹے آگے کی نوک سے سوراخ کرنے کی کوشش کی۔ وہ پتھر والے
 آگے سے زیادہ جلد لکڑی میں گھس گیا۔ جری ہاتھ سے پسینہ
 پونچھتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس نے سوراخ کے منہ پر ڈھیلی لکڑی
 رکھ کر اسے زور زور سے گھماتا شروع کیا۔ جیسے ہی اس میں سے
 دھواں نکلا اور چمک پیدا ہوئی۔ اس نے اسے سوکھی پتیلیاں
 اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گھماتا شروع کر دیے۔
 پھر لال لال زبانیں آس پاس کی چیزوں کو کھانے کے لئے نکل
 پڑیں۔ اس نے اپنے آگے کو ان پر رکھ کر بہت سی سوکھی
 پتیلیاں اور گھاس نوچ کر اس پر ڈال دیں۔ کالٹھوڈا پھر لال لال
 ہو گیا۔ جری نے پھر اسے گڑھے آگ میں اچھال کر چٹان تک پہنچایا اور
 پھر اسے پتھر سے دبا کر وہ اسے پکینے لگا۔ وہ بڑھتا گیا، پھیلتا
 گیا اور اس کے چھٹے حصے میں دھواں سی پیدا ہو گئی۔ گولال زبانیں
 اس تک بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ جو ہوا کا جھونکا ادھر سے آتا
 اسے محسوس ہوتا وہ جھلس جائے گا، جھن جائے گا۔ جری نے
 اس پرست کو بجھانے کے لئے بھائی کے طریقے پر عمل کیا۔ اس
 نے چلوں میں پانی بھر کر ان زبانوں پر لاکر چھڑائیوں اس
 پرست کو اپنے اوک سے پانی پلانے پر وہ منہ چپا کر چسلا گیا،
 گری ٹھنڈک میں بدل گئی اور لال آگ پھر کھو باں ہو گیا۔ اب
 وہ اس کھو سے کوہر پتھر پر رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس
 کی لالک دور ہو گئی اور وہ نوک اور دھار کے پاس چم چمکے
 لگا۔ جری اس کی یہ چمک بھڑک دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ اسے
 ہاتھ میں لے کر گھماتے لگا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جتنے چوڑے،
 لمبی ٹھانسیں یا پتے تھے والے وضعت پہنچے ہیں آگے وہ سب

کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔

وہ کھل کھل کر ہنس پڑا۔ اس نے سارے موجودہ آگوں سے
 بہتر کھانے والا کر دیا۔ گڑھا تھوڑی دیر میں خالی آیا اسے کسی
 جاندار پر آکر دیکھنا چاہیے۔ جاندار کے اندر جو پرست چھپا
 ہوا ہے نکلی ہے وہ انھیں اس صفائی سے کاٹنے نہ دے۔ اس
 نے جلدی جلدی ادھر ادھر نظر ڈالی تو مڑے فاصلے پر ایک
 بھڑائی میں ایک بوڑھی، لنگڑی بھید کے بال اس طرح جھنس
 گئے تھے کہ وہ اس سے نکل نہ سکتی تھی اور بڑی بے بسی سے کھڑی
 "میں! میں!" کر رہی تھی۔ اس کے مالک کا کہیں پتہ نہ تھا البتہ
 دو چار گھر ابھی سے مڑلاتے دکھائی دے رہے تھے۔ جری کے
 ہونٹوں پر ایک زہری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ لپکتا ہوا میٹھ
 کے پاس پہنچا اور اس نے اپنے ہاتھ تینے کا بھر پورا ہتھ اس کی
 گردن پر مارا۔ سرکٹ کر دھڑلے ڈور گڑا۔ جری خوشی سے
 آچل پڑا اور اس نے خون میرے تینے کو چوم لیا۔ ساتھ ہی خیال
 آیا لاؤ تینے کے اس پہلے شکار کو نذرانے پتھر پر چیلھا دیں۔
 محنت مفت کی نذر بھی ہو جائے گی اور پتھر سے کوئی دھواں نکلتا
 ہے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اس
 نے تیز رفتاری سے دبا دیا اور پھر کاسرا دھڑ دھڑا ہاتھوں میں
 اٹھائے وہ نذرانے پتھر کی طرف چلا۔

راہ میں اس نے دیکھا کہ اس کا بھائی سٹی بھی اپنے صفے کی
 بالیوں کا ایک موٹا سا کٹا سر پر رکھے چلا آ رہا ہے۔ جری ٹھٹھک
 کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے فز سے سٹی کو اپنے تینے کا مہیلا
 شکار دکھایا۔ پھر وہ کرکڑی بولا "اوہ تم دو دوں اپنی اپنی
 نذر چڑھاؤں" دیکھیں کسی کی قبول ہوتی ہے!"
 دو دوں سے پتھر کے الگ الگ کوٹے پر اپنی اپنی نذر رکھ
 دی۔ سٹی گھٹے ٹیکس اور ادا تھوڑ کر نذر کے قبول کے جانے کی
 دعا مانگنے لگا۔ جری ہاتھ میں تینے لے کرکڑا شکار دھڑا جس
 صفے پر میٹھوں کی ہنسی ہنری بالیاں رنگی تھیں وہاں سے دھواں
 نکلے لگا اور اُنھ جیسے ہی آنا گرا اور گھسنا ہو گیا کہ اس کے

اندکی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ چند منٹ بعد جب یہ دھواں غائب ہوا تو سنی کی نذر کا ایک ایک دانہ ساتھ لیتا چلا گیا مگر جری کی بیڑا کی طرح پڑی رہی۔ جری کی آنکھیں غصے سے چلنے لگیں۔ اس نے سنی کو مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ وہ دنگلے ٹھنڈی دیر بیٹھا جھومتا رہا۔ پھر وہ "شکر! شکر!" کہتا "بابا" کی طرح صبر سے میں گر پڑا۔ جری کا غصہ جھڑک اٹھا۔ جی چاہتا تھا سنی کی نذر قبول کرنے والا سا ہے، ہوتا تو اس پر وار کر کے دیکھتا کہ وہ بھی گھٹتا ہے۔ یا نہیں۔ پھر اس نے سوچا، لاڈ اس صبر سے میں بھی ہوئی فوج پر تینے کا وارڈ مار دوں گھوڑوں وہ کھینچے گئے کہ نہیں! اس نے بھائی کی گردن پر تینے کا بھر پور ہاتھ مار دیا۔ بیڑے کے سر کی طرح سنی کا سر بھی دھڑلے سے الگ ہو کر دوڑ کر

بیڑا اور اس کی لاش خاک و خون میں سمیٹ کر زمین پر پھیل گئے تھے۔

لوڑے "بابا" کو جب سب سے پہلے اس خوشی خبر دی گئی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جریوں سے کہا: "آج سے تمہارے قبیلے والا جب بھی کوئی کاٹے، مارے والا لا لیا جا کرے گا تو وہ اسے اپنے بھائیوں کی پر ضرور آڑے لگا دے گا۔" مقدس کتابوں کی زبان سے ہم نے "بابا" کا نام آدم، جری کا قابیل اور سنی کا ہابیل سنا ہے۔ آدم ہم جو اپنے کو آدمی کہتے ہیں یہ برابر دیکھ رہے ہیں کہ کوئی "قابیل" جب بھی کوئی نیا آدمی آکر دیکھتا ہے تو وہ بھینٹے، لمبیلیوں کی تاک میں لگ جاتا ہے کہ کوئی ہنسنا نہ تھکا جائے اور وہ اسے اپنے بھائی پر آڑا ڈالے!

فردینہ تعلیم کو اعلیٰ ترین درجے دینے کی ضرورت

نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کے اجلاس میں پڑتال ہند کی تقریر

بیسرے پھیلا ہوا ملک کے مسودے میں ملک کی آمدنیہ ترقیات کے لئے انداز فکر، طریق کار اور ترجیحات وغیرہ سب درج ہیں لیکن ان سب کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے ہر خاص و عام میں ایک جذبہ ہو۔ ایک ایسا جذبہ جو تاخیر کو برداشت نہ کرے، کسی فرد سے اپنا فرض ادا نہ کرنے پر بہم ہو جائے اور ایک لمحہ کامیابی سے کوتاہی برتنے کے خلاف حرکت میں آجائے۔

پلان کے مسودے کے مشروع میں ہی اس کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں لیکن وہ تو پورا ایک باب ہے۔ مختصر طور پر یہ مقاصد ایک جملے میں بیان کئے جاسکتے ہیں یعنی بھارت کے ہر باشندے کو اپنی زندگی کا موقع ہتیا کیا جائے۔ اب یہ کس طرح کیا جائے یہ سب کچھ آپ کو ڈھونڈنا پڑے گا۔ لیکن یہ ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ ہمارے پیش نظر پورے ملک کی آبادی ہے۔ ۳۴ کروڑ ۸۰ لاکھ لوگ ہیں۔ ان لوگوں کے مابین زندگی کی اصلاح کرنے والی تدبیروں کے لئے ہم سب کو قوت فکر، قوت عمل اور قوت اعتماد سے کام لینا چاہیے۔

غزل

تیرے دو دینا نہیں زندگی بہ مدد اعتبار گزر گئی
 تیری راہ گز اسے ربط تھا سب رہ گزرا گز گئی
 غم ساز کا رطلہ ہمیں غم ساز کا رکے آسے
 شبِ احتیاء گزر گئی شبِ انتظار گزر گئی
 میر بزم جلوہ فروشن تھا بہ ہزار ملکنت واد
 اُسے کیا خبر ہے کہ تجھ پہ کیا دل بے قرار گزر گئی
 یہ گھسان ساز گزرا دی بہ یقین سوز گزرا دی
 کسی نامراد کی زندگی بھی مایل کار گزر گئی
 تو نہ مل سکا تیرے غم لے ہمیں دل نواز ستم لے
 جسے زندگی کی خزاں کہیں بڑی پڑ پڑ بہا گزر گئی
 ابھی ربط اتنا بہا سے کسی بے ٹوٹے چین کو ہے
 کوئی موج آئی انگر بھی تو شمارہ بار گزر گئی
 وہی محنت کی سیاستیں، وہی نشانی کی اوتیتیں
 کسی بادہ کش پہ قیامتِ غم روزگار گزر گئی

فرانس بیکن

گئے اور اس نے کچھ وقت کے لئے فلسفہ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ سولہ سال کی عمر میں ہی اسے فرانس میں انگریزی سفر کے محلے میں ایک اسامی مل گئی۔ اسامی قبول کرے دقت اس کے دل میں فلسفہ اور سیاست کی ترقیوں میں ایک کھینچا تانی سے ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں اسے یقین ہو گیا کہ ”میں بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔“ لیکن ابھی اس خدمت کو انجام دینے میں کچھ دیر تھی۔

۱۵۷۹ء میں اچانک اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اُسے واپس انگلستان آنا پڑا۔ عیش و آرام میں پلا ہوا بیسیک اٹھارہ سال کی عمر میں ہی یتیم اور مغس ہو گیا اور اُسے جبراً سادہ زندگی اختیار کرنی پڑی۔ ایک طرف تو اسے ولایت شروع کر دی اور دوسری طرف اپنے بادر سوخ رشتہ داروں سے انجا کرتا رہا کہ وہ اُسے کوئی اچھا ہمدہ دلا دیں جو اُسے مالی شکلات سے نجات دلائے۔ اس کے خطوط خوشامد اور چالوسی سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا کوئی تسلی بخش نتیجہ نہ نکلا۔ بیکن کو اپنی ہی کوششوں پر اکتفا کرنا پڑا۔ اس میں اس کے کئی سال لگ گئے

۱۵۸۳ء میں وہ پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا۔ ۱۵۹۵ء میں لارڈ ایکس نے جس سے ملکہ ناکام جہت کرتی تھی اُسے ایک معقول جائداد بغور دھمک دے دی۔ لیکن بیکن شکاری گزاردی کو کوئی اہم جذبہ خیال نہیں کرتا تھا۔ ایکس نے کچھ سال بعد ارنلڈ جھوٹ

الرنڈ جھوٹ کا جہد انگلستان کے لئے دیا ہی ہے جیسا پیریکلر کا ایتھنز کے لئے یا چندرگپت کا ہندوستان کے لئے۔ انگلستان دنیا کی طاقتوں میں سر تاج تھا، اس میں لینڈ اور فرس کی بعد دیگرے متاقد ہیں اُسے بیکس جھڑکے۔ اسی تھری ہمد نے انگلستان کا سب سے بڑا شاعر و ڈراما نویس شکسپیر پیدا کیا اور یورپ کے جدید فلسفہ اور سائنس کا بانی بیکن۔

بیکن ایک امیر گھرانے میں ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سر نکولس بیکن ہمد ارنڈ جھوٹ کے ابتدائی بیس سال ایک نہایت ممتاز ہمد سے پر سر فرازا رہا۔ اس کی ماں شاہ ایڈورڈ ششم کے استاد کی بیٹی اور لارڈ برکلی کی سالی تھی جو ارنڈ جھوٹ کا سرخاذا اور اس کے پیچھے مدبھوں میں سے تھا۔ خود وہ ایک نہایت پوشیدار اور قابل عورت تھی۔ کئی زبانیں جانتی تھی۔ یونانی میں خط و کتابت کرتی تھی۔ اس نے بیکن کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بارہ سال کی عمر میں بیکن یمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ تین سال وہاں رہا۔ اسے وہاں کی تعلیم اور ضابطہ سے سخت نفرت ہو گئی، خاص کر اسلوب کے فلسفہ سے جس کا اس وقت کیمبرج میں بہت زور تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر فلسفہ کو خشک اور غیر مفید ٹوشنگائی کے رستے سے نکال کر عملی اور درخیز راستے کی طرف لے جائے گا۔ لیکن ایک سیاسی خاندان کے لڑکے کے لئے اس چھوٹی سی عمر میں سیاسی راستے کو

سے آثار نے اور تیکرے کے لئے سازش شروع کر دی۔ لیکن نے اپنی بناوٹ کے خلاف پہلے تو اسے کئی خط لکھے مگر جب ایکس باز نہ آیا تو یقین اس کے خلاف ہو گیا اور اس کے خلاف مقدمے میں سرگرم حصہ لیا۔ ایکس کو چھائی کی سزا ملی۔

فلسفی لیکن حرص کو باندھ سکا۔ ہیڈز غیر ملشی رہتا۔ عیش پرستی اُسے پس پس سے لی تھی۔ آمدنی سے خرچ کئی گنا زیادہ تھا۔ نمائندہ کو وہ سیاسی زندگی کا ایک اہم جز سمجھتا تھا۔ قرض کی وجہ سے قید بھی ہو گیا مگر اس کی ترقی برابر جاری رہی۔ ۱۹۰۶ء میں وہ سائنس جرنل اور ۱۹۱۳ء میں ہی انارنی جرنل بنایا گیا اور آخر کار ۱۹۱۸ء میں وہ لارڈ چانسلر کے عہدے پر مقرر ہوا۔

جون چوں لیکن سیاست میں ترقی کے ذریعے پرچڑھتا گیا، توں توں وہ فلسفہ میں بھی کامیاب کر گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس نے اپنے بہترین فلسفی بہترین مدبر بھی بنے گا اور اخلاطون کے فلسفی بادشاہ کا نمونہ۔ فکری اور علمی زندگی میں وہ دونوں کو ملا دے گا۔

رہے کی معروقات اور ترقیوں اس کی علم دوستی کو کم نہ کریں گے۔ وہ بابرار لکھتا ہے کہ اس سیاسی زندگی میں اپنے رجحان کے خلاف بہا جا رہا ہوں۔ ” مجھے فلسفہ کے بیڑ جینے کی پروا نہیں۔ ” میں کسی اور شے کی نسبت ادب کے لئے زیادہ موزوں ہوں۔ ” ذہن انسان ہے اور علم ذہن ہے۔ ایک انسان مرث اس حسرت

انسان ہوتا ہے جس میں طبع کو وہ علم رکھتا ہے۔ “

لیکن کی سب سے مشہور اور بہترین ادبی تصنیف ”یہیز“ (مضامین) ہیں جن میں وہ ایک دنیا وار فلسفی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ۱ سے فلسفے سے سیاست کی نسبت محبت تو ضرور زیادہ ہے لیکن وہ فلسفہ کو سیاست کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اسی فلسفی قدر کرتا ہے جس کا سیاسی اور جامع زندگی میں دائرہ اٹھایا جاسکے۔ لیکن کہیں تو وہ خود غرضی اور چالاک کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس کے مضامین ایک سیاست دان کے تجربے کا پتہ دیتے ہیں۔ او سیاست دان بھی وہ جو کئی کو کئی کے لئے مل جلانے بلکہ مفاد کے لئے۔ بلیک تو یقین کو منکر سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر لیکن کا

کہنا صحیح ہے تو حضرت مسیح کا کہنا غلط ہے۔ لیکن کا نقطہ نگاہ انسانی فطرت پر مبنی ہے۔ اس بات پر نہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے بلکہ اس بات پر کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اس کو غرض بینی سے نہیں بچائی سے ہے۔ ” انسان فطرت میں دائمی کی نسبت بے وقتی کا عنصر زیادہ ہے۔ “ لیکن اٹلی کے مشہور مدبر میک ویلی کی اس کا فلسفہ خود غرضی اور مکاری کے لئے مشہور ہے، چاہا جو تعریف کرتا ہے۔

” ہم میک ویلی کے مبنی احسان ہیں کہ اس نے حکم کھلا اور بلا دریغ ہم پر رواج کر دیا ہے کہ انسان کی تعلیمت کیا ہے۔ “ ” ہمیں عدل سے زیادہ خوش اخلاق اور نیک نہیں ہونا چاہیے میا دانوگ، ہم سے نفرت کریں اور ہمیں ایذا پہنچائیں۔ “ ” دنیا میں بخیرا بہت خریب لاڑی ہے۔ “ ” اس طرح محبت کرو کہ شاید تمہیں بھی نفرت کرنی پڑ جائے اور اس طرح نفرت کرو کہ شاید تمہیں بھی محبت کرنی پڑ جائے۔ “ ” جھوٹ کی طاوٹ سونے اور چاندی کے سکڑ ہیں دھات کی ملاوٹ کے موافق ہے جو ان سکڑ کو زیادہ کارگر بناتی ہے۔ “ ” انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے اطوار اور محروروں کی ملاوٹ کرے تاکہ وہ انہیں اپنے مطلب کے لئے استعمال کر سکے۔ “ ” قیمت بے وقتی ہے جے دوسری رکھنا چاہیے۔ “ ” ناکامی ہے، چو، ہسر کے برخلاف فشی مت چلاؤ۔ بڑے آدمیوں کے اطوار کے مطابق اپنے آپ کو بدل لو۔ “ یہ لیکن کا اخلاقی نقطہ نگاہ ہے۔ یہ ایک ایسے اوقت سیاست دان کا نقطہ نگاہ ہے جن میں روحانیت کی اکساہٹ اور محنت کی پاکیزگی کا دخل نہیں۔ جذبات اور احساسات کو بیکس دینا چاہتا ہے۔ ایک ناقد کا کہنا ہے کہ اس کے مضامین لکھتے وقت دل کو مقل کر دیا اور دماغ سے کام لیا۔ انسان کو لیکن ایک مشین تصور کرتا ہے جو محرورہ دان کے مطابق کام کرے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک سیاست دان کے لئے رشک اور دھوکا جیسا نہیں کہ بد اخلاقی بھی ضروری ہے۔ دوست خود غرضی پر مبنی ہے۔ ایسی قیمت اور وقتی جو دوروں کے درمیان ایک خوش کن اور دل پذیر شہر ہے لیکن کے لئے کوئی حق نہیں رکھتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک

سیاست میں یونیک قدامت پسندہ اور طاقت ور مرکز کی حکومت کا حامی - بادشاہت حکومت کی بہترین عملی شکل ہے جنگ کی وہ کھلم کھلا حمایت کرتا ہے - "جنگ ایک صحت مند قدم کھٹنے قدرتی ورزش ہے۔" "سنسٹ وومن کی ترقی جیٹی" میں لکھنے کیروڑوں ہے۔ "۔" طویل امن انسان کے جنگی جذبہ کو شکست دیتا ہے۔" "یونیک انگلینڈ کے خلاف ہے۔" "انگلینڈ کو دبائے کی نعت اس کے اسباب کو دور کرتا بہتر ہے۔" "انگلینڈ کے دواہا ہوتے ہیں، ایک مغربی دوسرے اٹھینائی۔" "انگلینڈ سے بچنے کا ایک بہتر نسخہ یہ ہے کہ دولت کے انصاف کے ساتھ تعظیم کیا جائے۔" "روپیہ کا کی طرح ہے۔ یہ اس وقت تک اچھا نہیں ہے جب تک اسے پھیلا دیا جائے۔" "یونیک اس کا یہ مطلب نہیں کہ یونیک جمہوریت یا اشتراکیت کا حامی ہے۔ وہ عوام پر اعتبار نہیں کرتا۔ وہ فاسیس کو شیک سمجھتا ہے جس نے یہ دیکھ کر کہ عوام اس کی تعریف کر رہے ہیں یہ پوچھا کہ کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے؟" "یونیک ڈیمینڈز کی قدم کو پسند کرتا ہے جن پر شرقی حکومت کریں اور کمران عالم بدل اور ایسے کمرانوں میں بینیاں اور راکس ویلیس کی مثالیں دیتا ہے۔ وہ خود بھی ایسی ہی کمران لے کر آؤا پیش مشرف۔" "کمرانی کے الزام میں بھی اس کی ظلم دوستی قائم رہی۔ اسے یہ دیکھ کر کہ بڑے ہوتا تھا کہ مڈلٹن سے فلسفہ اور سائنس سائنس حالت میں ہیں اور ان میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔" "اس وقت بھی فکر تھا کہ کس طرح فلسفے کو کسی نے سرسے سے تعبیر کیا جائے اور ترقی دہی مشرف نے اسے نکال کر بھی راستہ پر لگایا جائے۔" "علم ایک رائے نہیں جس کو قائم کر لیا جائے بلکہ ایک کام ہے جس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ میں کسی فرقے یا عقیدے کے بنیاد رکھنے کی کوشش

ہے۔ خواہشات دہانے سے پہلے ہی کہیں اور طاقت و سرمایہ جاتی ہیں۔ انسان کی فطرت کچھ دیر کے لئے بھیجی جاسکتی ہے مگر یہ نہیں جاسکتی۔ رغبت کے وقت بھی فطرت نمودار ہوتی ہے اس کی کار فرم جو ایک خوب صورت پری کی شکل اختیار کر کے میز پر بیٹھ کر قریب بیٹھتی ہے۔ جب وہ پاپاس سے گزرتی جھٹکتی ہے اس پر تعجب پڑتی ہے۔ جسم کو ضبط اور اپنے اعتدالی دونوں کا عادی کرنا چاہئے۔

یہی شیکرے طرح انسانی فطرت کا مظاہرہ اور ترجمانی کرتا ہے اور بھی غلطی نہیں کرتا۔ " شادی کے پہلے دن آدمی اپنے خیال میں سات سال پوچھا جاتا ہے۔ " اگر تو دیکھ گیا ہے کہ بڑے آدمیوں کا بھی یہ بیان ہوتا ہے۔ "۔ " دنیا میں دوستی بہت کم ہے اور برابر والوں میں اور بھی کم۔ " اگر کم سے بھی تو

نہیں کر رہا ہوں بلکہ مفاد اور طاقت حاصل کرنے کی۔" اسی مقصد کے لئے اس نے ترقی علم "مادی کتاب لکھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہ ارادہ ہے کہ علم کی دنیا کا دورہ کروں اور لوگوں کو کھلے سے حقے بھرا اور غیر موزوں ہوں جو انسان کی منت سے چھوڑ رکھا ہے تاکہ وہ ان تھکوں کے صحیح نقطہ نظر پر نظر کران کی اصلاح کے لئے شخصی اور جماعتی قوتوں کو استعمال کیا جائے۔" اس نے برصغیر ۱۵۹۲ء میں یہ لکھ دیا تھا کہ میں نے تمام علوم کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی آواز تھی جسے جدید علوم کی بنیاد کا اعلان کر دیا۔

اس کتاب میں وہ باری باری ہر ایک علم کا جائزہ لیتا ہے کہ اس میں کتنی ترقی آپائی ہوئی ہے۔ لکھتا اس میں تو بہت کچھ کاغذ پر ہے اور اس طرقت ترقی ہوتا یا ترقی ہے۔ مثال کے طور پر وہ علم طب کی بابت لکھتا ہے کہ حکمت کا فرض ہے کہ جسم کے ہر حصہ کو سراور قابل میں رکھے۔ طبیب اچھل پھلے کچھ استعمال کرتے ہیں۔ اپنے انوکھے وہم پر پھر ورسہ رکھتے ہیں۔ طب کے قریب بات کے لئے بڑی بڑی یہ بار دیاں ہوتی چاہیں جس میں وسیع پیمانے پر سمجھ دیوں کی کھوج ہو۔ انسانی جسم کا کاش کہ مطالعہ کرنا چاہیے، انھیں زحمت انسان کی عمر کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے بلکہ موت کے درد کو بھی کم کرنا چاہیے۔ آج کل یہ تمام باتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن آج سے تین سو سال پہلے علم طب یورپ میں سائنس کے اصولوں پر مبنی نہیں تھا۔ جاویدگر طبیب خیال کئے جاتے تھے اور بہت سے بیماریوں کا علاج جاوید سے کر لیا جاتا تھا اگر آج علم طب سائنس کے اصولوں کے مطابق ترقی کر رہا ہے تو اس کے لئے ہمیں بہت حد تک کچھ کامنوح احسان ہونا چاہیے جس نے خود کوئی تجربہ کر دیا مگر لٹا، کو ٹیک راستہ دکھایا۔

اسی طرح لیکن تمام علوم کی چھان بین کرتا ہے۔ ان کی موجودہ حالت کے نقائص نکالتا ہے اور ان کے لئے ٹیک راستہ تلاش کرتا ہے۔ وہ ہر ایک سائنس کو علت اور معلول میں وجہ اور اس کے نتیجہ کے اصول پر چلاتا چاہتا ہے اس کے مفاد کو نہیں کہنت سے نکال دیتا چاہتا ہے۔ اتفاق ایک ایس چیز کا نام ہے

جس کا وجود نہیں ہے، اسی طرح وہ انسان کی زندگی میں ارادے کی ہستی کو نہیں مانتا۔ "کائنات میں جو حیثیت اتفاق کی ہے انسان میں وہی ارادے کی۔" انسان میں عقل ہی حکمرانی کرتی ہے ارادہ کچھ نہیں۔

سائنس کے تمام حصوں کا ذکر کر کے لیکن دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی سائنس کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ ضرورت علم کی ہے یعنی اپنے آپ کو جاننا اور دوسروں کو جاننا انسان کے حکماء خاص کر اسلئے لکھ تھا کہ اپنے آپ کو جانو، لیکن اس کا کچھ خاص فائدہ نہیں بھگتا۔ اپنے آپ کو جاننے کے علاوہ اپنے ساتھیوں اور لواحقین وغیرہ کو جاننا ضروری ہے جو سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے۔ ان کی خوبیوں کے علاوہ ان کی کمزوریوں، ان کے دوستوں اور دشمنوں، ان کے مزاجوں، ارادوں اور مقاصد کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ کرنت سے دوست بنانے چاہیے لیکن عدسے زیادہ شیرینی اور خوش مزاجی سے اپنے آپ کو فرسار نہیں کر لینا چاہیے۔ چشمہ کی طرح شمس کے ساتھ ڈھنگ بھی رکھنا چاہیے۔ دوستوں کو تمام راز نہیں بتانے چاہیے۔ اپنے دوستوں سے اس طرح جملہ کر دیا کہ وہ تمہارے دوست بننے والے ہیں۔ "ترقی کئے کئے کسی حد تک خود بھی لاڑی ہے۔" فائنش اخلاقیات کی دوسرے نقصان کو تو ہو، بیاسیات کی ڈوسے نہیں۔ فائنش سے بہتر بڑھتی ہے جو دنیاوی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

سائنس میں ایک نئے طریقے کی ضرورت ہے جو سے پُرانی غلطیوں سے نکال کر ترقی کے راستے پر گامزن کرے۔ یہ طریقہ بھگانے کے لئے لیکن نے اپنی سب سے بڑی کتاب کچھ جس کا نام "دوم آرگنم" یعنی نیا طریقہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یونانیوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ انھوں نے تصور پر زیادہ زور دیا، اور شریکے تجربے پر کم۔ اسی واسطے اسلئے دہلنے سے آج تک بہت کم ترقی ہوئی ہے لیکن کائناتیا طریقے سے کہ سب سے پہلے انسان کو اپنی عقل کی مصافی کرنی چاہیے یعنی اپنے ذہن کے تمام قہرات اور تشبیہات شاد دینے

چاہیں۔ ان تعصبات کے لئے بیکم "بت" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور چارتم کے نمونے کی تشریح کرتا ہے۔ "جب تک ہم اپنے تعصبات سے نجات نہیں پاتے سائنس کے راستے پر نہیں چل سکتے۔ کسی چیز کو ماننے سے پہلے پوری تحقیق کرنی چاہیے۔ اگر ہم تحقیق سے شردار کریں گے تو شک و شبہ نہیں رہے گا اور اگر شک سے شردار کریں گے تو یقیناً شک پہنچ جائیگا۔"

سائنس کے لئے بیکم نے انوکھی طرح کی شاماعت کی۔ یعنی پہلے اچھی طرح تمام پہلوؤں کو دیکھا، جانچا، تجربہ کر دیا اور پھر تعصب نکال دیا۔ یہ کوئی نیا طریقہ نہیں تھا۔ ہم اس طریقے کو اپنی زندگی میں روزمرہ استعمال کرتے ہیں لیکن بیکم نے سائنس دانوں کی اس طرف پہلی بار توجہ دلائی اور امتحان و قیامات کی دنیا سے نکال کر تجربے کے راستے پر چلایا۔ اسی راستے پر چل کر سائنس نے ترقی کی ہے۔ یہ بیکم کا اہم ترین کام تھا۔

بیکم اب دنیاوی ترقی کے تمام زینے طے کر چکا تھا۔ اسے لاڈ کا خطاب ملا۔ اب وہ حیرت انگیز اول کے واسطے بازو کے مانند تھا لیکن مشعل مشہور ہے کہ کسی شخص کو اس کی موت سے پہلے خوش نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس

دماغ میں بے دستور تھا کہ حج و حجاب ان لوگوں سے جن کے مقصدے ان کی حرامتوں میں چلے تھے، تماثلت لیا کرتے تھے۔ بیکم بھی تماثلت لیتا رہا۔ اس کے دشمنوں کو موت ملی گئی۔ ۱۹۶۱ء میں اس پر انعام لگا یا گیا۔ کہ اس نے ایک مقصدے کے فیصلے کے لئے رو بہر لیا ہے۔ یہ کوئی فیصلہ بات نہ تھی۔ بیکم نے ہرم کا اعتراف کر لیا اور صافی مانگی۔ اسے قید کر دیا گیا لیکن دو دن کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا اور اس کا بڑا بھائی مٹا کر لیا گیا اس نے اپنی زندگی کے باقی سالوں کو شیفنی میں گزارا۔ دو تین کتابیں

ادریں۔ اب اسے افسوس ہے کہ کیا کہیں نے سیاسیات کو پہلے کیوں نہ سمجھ دیا اور اپنا تمام وقت ادبی فلسفہ میں کیوں نہ لگا دیا۔ مارچ ۱۹۶۶ء میں وہ گھوڑے پر جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ پوت میں دھبہ دینے سے گوشت کس حد تک مضر ہے یا چا جا سکتا ہے۔ اسی وقت اس نے ایک مرنے والا اور اسے ہفت میں دھبہ دیا۔ مرنے سے وہ غم ہوا کہ ہو گیا اور اس سے قریب ہی ایک دوست کے مکان پر پہنچا گیا۔ اس کا تجربہ جاری رہا اور آخر کار کامیاب ہوا۔ لیکن یہ اس کا آخری تجربہ تھا۔ اس کی بیماری ہلکے ثابت ہوئی۔ ۹۔ اپریل ۱۹۶۶ء کو وہ چل بسا۔ تمام عمر سائنس کے لئے جیسا اور آخر کار سائنس ہی کے لئے جان و سہ دی۔

بھارت میں خام لوہے کی پیداوار میں اضافہ

انڈین بورڈ آف مائنز کی اطلاع کے مطابق مارچ ۱۹۶۱ء کے دوران میں خام لوہے کی پیداوار ۹۶۱۰۰۰ میٹرک ٹن رہی۔ جنوری سے اپریل ۱۹۶۱ء تک بھارت میں خام لوہے کی پیداوار ۲۸۱۵۰۰۰ میٹرک ٹن رہی جوگزشتہ سال کی اسی مدت کی پیداوار سے تقریباً ۶ فی صدی زیادہ تھی۔

خام لوہا پیدا کرنے والی ریاستوں میں اڑیسہ سب سے آگے رہا۔ اس کی پیداوار ۳۳۵۰۰۰ میٹرک ٹن تھی اس کے بعد ریاست بہار کا نمبر رہا۔ اس کی پیداوار ۳۳۵۰۰۰ میٹرک ٹن رہی جبکہ مدھیہ پردیش اور ہاراشتر کی پیداوار اسی ترتیب ۳۱۵۰۰۰ میٹرک ٹن اور ۱۲۰۰۰۰ میٹرک ٹن اور ۴۰۰۰۰ میٹرک ٹن تھی۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کمیت کے لئے ۴۵۰۰۰۰ میٹرک ٹن خام لوہا بھیجا گیا جبکہ فرنگوں میں برآمد ہونے والے خام لوہے کی مقدار ۱۹۵۰۰۰ میٹرک ٹن تھی۔

اورنگ آباد

(مرتبہ دارہ کا قدیم تاریخی و ادبی شہر)

ہے۔ ملک جنرل اپنے اس کارنامے کی وجہ سے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس نے اس زمانے میں اورنگ آباد میں مٹی کے پوتے جاری کر دئے تھے اس کی مثال دنیا آج تک نہ پائی گئی۔ اس کی وجہ سے پانی کی اتنی افزائش ہو گئی تھی کہ گھر گھر بار بار نکلنے لگے تھے اور اگر بعض انگریزوں کو تحقیق کا شوق نہ چراتا تو کوئی جھبہ تھا کہ آج بھی اورنگ آباد کے باشندے ملک جنرل کی اس دماغی اختراع سے فائدہ اٹھاتے، مگر افسوس کہ بعض انگریزوں نے تحقیق کی دھن میں سارا نظام دہم برہم کر دیا۔ پھر بھی ان دنوں ایک مٹی جاگتی مثال آج بھی پن چلی، نائی ایک مشہور مقام پر جس کی تمغیں یہیں آئے گی، موجود ہے جہاں رات دن ہر موسم میں ایک بلند مقام سے ایشاد کے مانند پانی کی چادر گرتی رہتی ہے۔ یہ پانی ان ہی مٹی کے پائوں کے ذریعے آتا ہے۔ لیکن یہ اب ملک مظلوم دہسوسکا کہ یہ پانی کہاں سے آتا ہے اور اس کا کیا انتظام ہے۔

ملک جنرل کے بعد اس کے فرورجائیشیوں کی وجہ سے دکن پر مغلوں نے قبضہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۶۵۳ء میں اورنگ زیب اپنے باپ شاہ جہاں کے مقررہ حکومت میں میان کا صوبے دار مقرر ہوا۔ اورنگ زیب کو اپنی گونا گویا خصوصیات کی بنا پر یہ مقام بہت پسند آیا اور اس نے اپنے نام کی مناسبت سے اس

روں تو مرتبہ دارہ میں کی ایک تاریخی مقامات راجپوتوں نے (لداوا و اجنٹا) ہیں جو آج بھی زبان حال سے اپنے زمانے کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور معاشرت کا حال بیان کر رہے ہیں، لیکن اورنگ آباد شہر ان تاریخی مقامات میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس شہر نے کئی زمانے دیکھے، کئی حکومتیں دیکھیں اور ہر ایک کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ آج کا اورنگ آباد دہندہ مسلم تہذیب کا ایک عہدہ نمونہ ہے۔

دہلی کی طرح اورنگ آباد کی تاریخ میں بڑی طویل ہے اور اس میں بڑے مدوجزر پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں دولت آباد میں بادشاہان کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی (بارہویں صدی مسیحی) اورنگ آباد ایک چوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام کھڑکی تھا۔ لیکن ملک جنرل کی قسمت کے ساتھ ہی اورنگ آباد کی قسمت بھی پیٹ۔ احمد شاہ کی حکومت کے زمانے کے بعد ۱۶۰۰ء میں اس کے سپہ سالار ملک جنرل نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے اورنگ آباد کا نام کھڑکی تبدیل کر کے گرجہ رکھا اور اس کو اپنی حکومت کا پایہ تخت بنایا۔ ملک جنرل نے اس مقررہ فزقی میں بہت حصہ لیا اور اسے ہر طرح آراستہ و پیراستہ کیا۔ ملک جنرل نے اس کی آبادی اپنے زمانے میں تقریباً دو لاکھ تک پہنچا دی تھی۔ ملک جنرل اورنگ آباد کے تعلق سے جو سب سے اہم کام ہے وہ پانی کا عہدہ بندوبست

نام اورنگ آباد رکھا۔ جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

شاہ جہاں کے بعد جب اورنگ زیب اس زمانے کی عظیم مشرقی مملکت کا شہنشاہ ہوا تو اس نے اورنگ آباد کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی۔ گوکنڈہ اور سیجا پور دکن میں دو بڑی سلطنتیں جنہیں مغلوب کئے بغیر دکن میں نئی سلطنت تسلیم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ ان سلطنتوں کو مغلوب کرنے کے لئے مستقل طور پر اورنگ آباد میں رہنے لگا۔ اور ایک طرح سے نئی سلطنت کا پائے تخت اورنگ آباد میں ہی بنایا گیا۔ یہ زمانہ اورنگ آباد کی ترقی کا انتہائی زمانہ ہے۔ اورنگ زیب کی وجہ سے شاہی خاندان کے بہت سے افراد امراء اور حکام یہاں چلے آئے اور یہ ایک بارہوئی اور ہندو، اشرافیہ، اہل علم و ادب میں اورنگ آباد کی آبادی پانچ لاکھ سیاحی کی جاتی ہے۔ اورنگ زیب نے اس زمانے میں یہاں بڑی اچھی اچھی عمارتیں اور مسجدیں وغیرہ تعمیر کرائیں جو آج کل تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

اورنگ زیب کے بعد اس کے کمزور جانشینوں کی وجہ سے نئی سلطنت کو احوال آنا مشرور ہوا اور مشرقی کی عظیم نشان مملکت پارہ پارہ ہو گئی۔ خود غرضوں اور مفاد پرستوں نے اس کی تباہی میں دل کھول کر حصہ لیا۔ چنانچہ انکو ویدینیز صوبے خود مختار ہو گئے۔ نظام الملک نے جو اس زمانے کے بہت ہی قابل اور بیلے ن سیاست دان تھے، اس بات کی بہت کوشش کی کہ مرکز میں رہ کر ایک با پھر ہندوستان بھر میں دینی و ملی تنظیم قائم کی جائے مگر خود غرض اور مفاد پرست امراء کی وجہ سے وہ اپنی اس اسکیم میں ناکام رہے۔ اور جیسا کہ اگلے موقوف پر انکو ہوتا ہے ان کی مخالفت مسترد کر دی گئی۔

چنانچہ محمود پرگز نظام الملک نے دکن چھوڑ دی اور دکن میں اگر ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اورنگ آباد کی قسمت ایک بار پھر چمک اٹھی جب کہ اس نے مغربی آصف جاہی سلطنت کا پائے تخت بنایا گیا۔ اورنگ آباد کی پرانی اورنگ زیبی شان و شوکت پھر نمودار ہوئی اور یہاں وہی چمک پھیلی اور گہا گہا نذر آئے لگی۔ نظام الملک اول کے انتقال کے بعد ان کے دو جانشینوں نے بھی

اورنگ آباد میں گورنر صوبہ سلطنت کا پائے تخت رکھا لیکن ان کے تیسرے جانشین نظام سوم نے چند انحطاطی مجبوروں کی بناء پر اورنگ آباد کو غیر آباد کیا اور جدید آباد کو آصف جاہی سلطنت کا پائے تخت قرار دیا اور اورنگ آباد کو اس کا ایک صوبہ بنادیا گیا جس کے تخت مرثواڑہ کے چار اضلاع ناندرہ، بیڑ، پریمئی اور عثمان آباد تھے۔

یہاں سے اورنگ آباد کے بڑے دن شروع ہوتے ہیں۔ پائے تخت کی اس منتقلی نے اورنگ آباد پر بہت بڑا اثر ڈالا اور اس کی خوشحالی شان و شوکت تھی وہ جاتی رہی۔ بادشاہ اور حکومت کے ساتھ تمام اعلیٰ افسران اور شاہی خاندان کے ارکان و درباری اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے۔ جس کی وجہ سے یہاں کی آبادی بہت کم ہو گئی۔ اور آخر کار حیدر آباد نظر آنے لگی لیکن پھر بھی آصفیہ سلطنت میں اورنگ آباد کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اورنگ آباد آج کل ریاست ہمارا شرط کے ایک ڈوینٹن مرثواڑہ کا صدر مقام ہے اور برہمنوں میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اورنگ آباد شہر کی خوشحالی ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے آج کے زمانے میں بھی اسے ہمارا شرط میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

ہندوستان میں جتنے تاریخی مقامات ہیں ان میں اورنگ آباد کو بھی ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور ہر موسم میں یہاں سیاحوں کا جنگل ہوتا ہے، خصوصاً سربا کے موسم میں تو یہاں سیاحوں کی ایک مائت ہزار ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ سربا کے موسم میں اس شہر میں دیکھنے جاسکتے ہیں خصوصاً ایلرا، ایشیا اور دولت آباد کو یہاں سے راستہ ہونے کی وجہ سے اس شہر کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ یوں تو اس شہر میں قدم قدم پر تاریخی یادگاریں ملتی ہیں لیکن ان میں خاص خاص تاریخی چیزیں جو تباہیوں کی قور کار مرکز ہوتی ہیں دینی کا مقبرہ، قلعہ ایک اور کنڈہ وغیرہ ہیں۔

اورنگ آباد شہر کے چاروں طرف مغربوں نے تعمیر ہے جسے اورنگ زیب نے اپنے زمانے میں مرثوں کے محلے سے جدا کر کے نئے

اسے تاج محل کا سادہ خاکہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُسے دادا نے بنوایا تھا اور اسے پہنتے تھے، اس لئے قدرت نے اس میں دادا اور پوتے کے فرق کو باقی رکھا ہے۔ بہر حال اورنگ آباد کا راجہ درانی کا مقبرہ بہت عمدہ تاریخی یادگار جس میں اُگرے کے تاج محل کا پیر تو موجود ہے اور جس نے تاج محل نہیں دیکھا ہے یہ عمارت بہت صاف ہے۔

راجہ درانی کے مقبرے کے بعد اورنگ آباد میں جو دوسری اہم تاریخی یادگار ہے وہ پین چلی ہے۔ یہاں شہنشاہی بابا شہزادہ کی درگاہ ہے۔ یہاں پہلے ایک پین چلی تھی جو پانی کے زور سے چلتی تھی۔ اسی مناسبت سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ یہاں درگاہ کے علاوہ ایک مسجد ہے۔ دو تین بڑے بڑے مال ہیں جو منل فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ باہر کے حصے میں ایک بڑا حوض ہے جس میں ایک بلند دیوار سے چاندنی شکل میں پانی گرتا ہے۔ اس کا انتظام ملک غنبر کے زمانے سے کرکے راج نگ وہاں رہا ہے۔ ملک غنبر کے مئی کے نگوں کی یہی ایک آخری یادگار ہے۔ اس زمانے میں اس پانی کے زور سے ایک چلی چلتی تھی۔ اس سے بالکل متعلکام ندی بہتی ہے۔ یہ مقام آتنا خوبصورت ہے کہ اکثر فلموں کے لئے یہاں سے مناظر لئے جاتے ہیں۔

قلعہ ارک اورنگ آباد کی وہ تاریخی یادگار ہے جہاں خود اورنگ زیب مہاراجہ پنے دل و جہاں رہتا تھا۔ ۱۶۹۲ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ارک کے معنی عری زبان میں تخت کے ہوتے ہیں۔ یہاں بادشاہ رہتا تھا اس لئے قلعہ ارک کہا جاتا تھا جس کے معنی ہیں کہ ایسا قلعہ جہاں بادشاہ کا تخت ہو یعنی یہاں بادشاہ سکونت پذیر ہو۔ یہ بہت بڑی عمارت ہے جس میں زنانہ محل مردانہ اور کچھ دیوانے، مال گھر، حمام اور آرائے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں باغات اور حوض و دریا بھی بکثرت ہیں۔ یہاں ایک مسجد بھی ہے جس میں بیٹھ کر اورنگ زیب قرآن شریف لکھا کرتا تھا یا بیٹھے اور نوہیں دیرہ بنا کر ردی پیرا کرتا تھا اور اپنے خرچے میں لاتا تھا آج کل اس عمارت میں گورنمنٹ کالج ہے۔ ان عمارتوں اور تاریخی یادگاروں کے علاوہ

بنوایا تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے لئے چاروں طرف چار بڑے بڑے دروازے ہیں جو قی دروازہ، لکھی دروازہ، پٹن دروازہ اور قلعہ دروازہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دروازوں کے ناموں کے نیچے بھی ایک پس منظر ہے جس کے پٹن تقریباً نام رکھے گئے ہیں۔ قی دروازہ وہ دروازہ ہے جو اجنستہ کے زور پر ہے۔ کچھ میں جب عمدہ تعلق نے قی سے اپنا پائے تخت دولت آباد منتقل کیا تھا اس وقت یہ دروازہ لاٹتے میں پڑتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا نام قی دروازہ پڑ گیا جو ہندوستان کی راجدھانی قی کے رخ پر واقع ہے۔ پٹن دکن کا بہت مقدس مقام ہے اور چونکہ پٹن دروازہ اس رخ پر واقع ہے اس لئے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ کچھ دروازہ مگر منظر کے رخ پر ہے اور پہلے زمانے میں ج کے لئے لوگ اسی دروازے سے جاتے تھے اسی مناسبت سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ اورنگ زیب عجا پور اور گولانڈہ کی ریاستیں رخ کے قلعہ دروازے سے شہر میں داخل ہوا تھا اس لئے پھر قلعہ دروازے کا نام قلعہ دروازہ ہے۔

راجہ درانی کا مقبرہ جسے عرت عام میں بی بی کا مقبرہ کہا جاتا ہے اورنگ آباد کی سب سے اہم اور سب سے خوبصورت تاریخی یادگار ہے۔ راجہ درانی اورنگ زیب کی بیوی تھی۔ اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ اعظم نے اپنی ماں کی یاد میں یہ مقبرہ بنوایا تھا۔ اس کی بناوٹ، سجاوٹ، نقشہ اور پلاٹ بالکل تاج محل سے ملتی ہیں اس لئے اکثر لوگ اسے دکن کا تاج محل کہتے ہیں۔

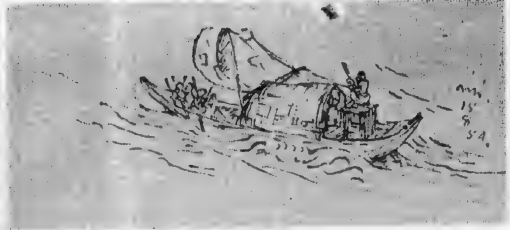
تاج محل اُگرے کی طرح یہاں بھی ایک اونچے چوڑے پر واقع ہے چاروں طرف چار اونچے مینار اور اطراف و اکناف باغات ہیں اس کے علاوہ اس کے متصل ہی ایک ندی بہتی ہے اور نیچے چھوٹی چھوٹی نہائیاں ہیں جنہوں نے اس کی خوب صورتی میں اور اضافہ کیا ہے۔ تاج محل کی طرح اسے بھی دیکھنے کا لطف چاندنی راتوں میں آتا ہے تاج محل میں اور اس میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ وہ پورا پورا سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور یہ منوئی پتھروں کا۔ اس میں صرف تربت اور اس کی باقی دیرہ سنگ مرمر کے ہے۔ اس کے علاوہ تاج محل میں صفائی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں اور یہاں وہ بات نہیں۔ پھر بھی ہم



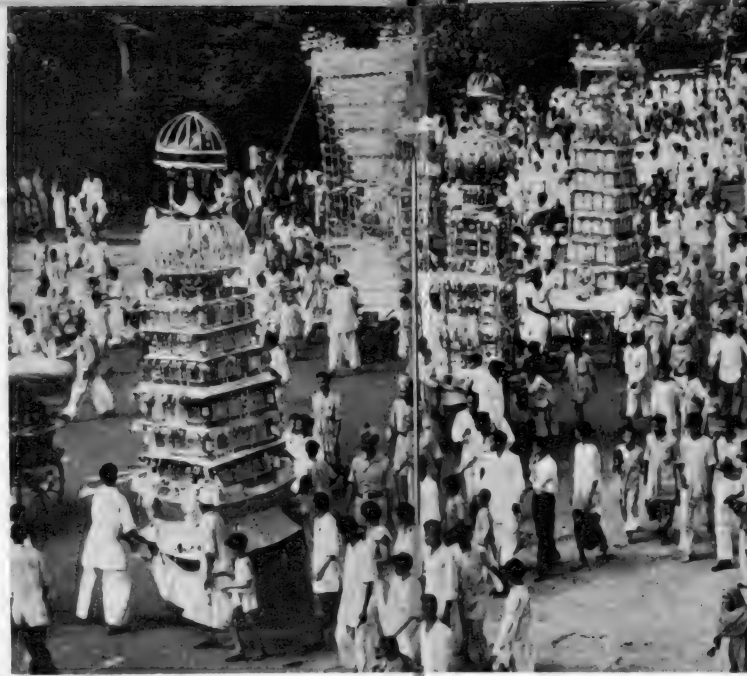
47. To Kumail
Sunni
with love & blessings.

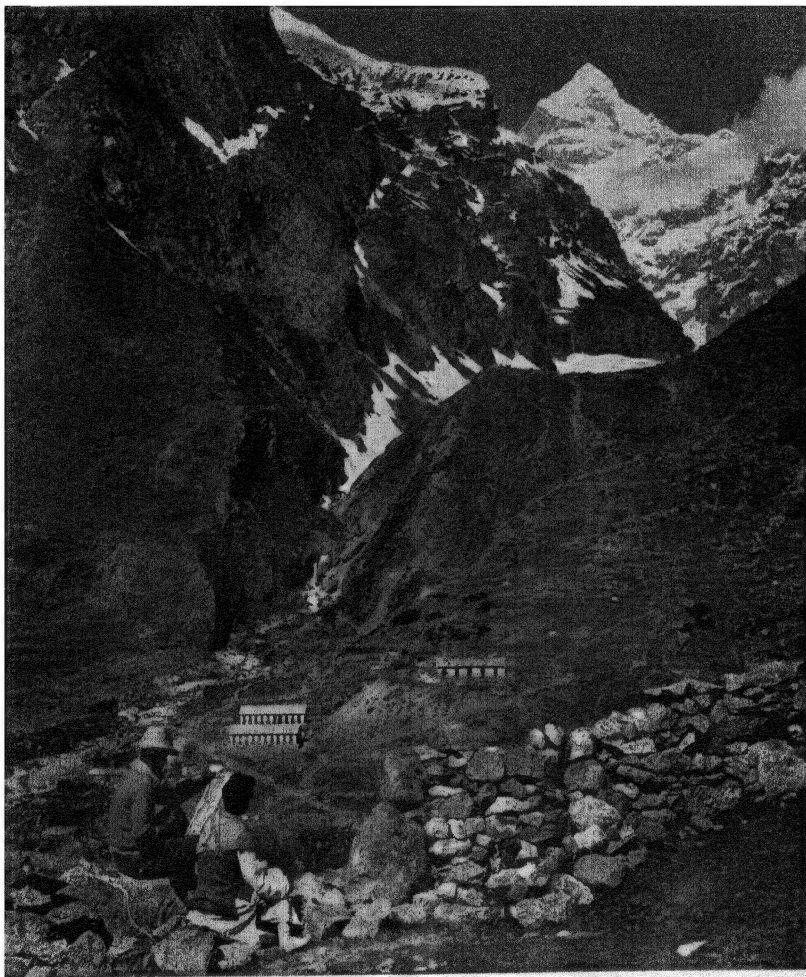


ندلاں پوس کے آپس
کمال سواہی کے نام خطوں میں



دلی میں محرم





بدری ناتھ کے قریب برزانی چوٹی میل کنڈھ
مستقلہ معنوں معنوں پر علاحدہ فرمائیں

اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا پس منظر

کے جو آگے چل کر رومانی شاعری کی صورت میں جلوہ گر ہوئے، وہ بیشتر اس سرزمین کی پیداوار تھے جس کو اختر کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور میں کو خود اختر ”ارض حسن و شباب“ کہا کرتے تھے۔

ٹونک کی وہ رومان ایگز دا دیان، وہ جیسی مقامات، وہ شان باغ، وہ سبز پوش کسار، وہ رحمان دیاں، وہ پُر بردنی پہلے اور وہ رنگیں مرغ و شام جو آج زمانہ کے انقلاب کے باغوں میں اپنا حسن اپنی رونق، اپنی ہمسار اپنی رعنائی، اپنی رنگینی اور لطافت گھر چکے ہیں اور تباہ حال، خزاں رسیدہ و دیوانہ نظر آ رہے ہیں ”دیرہ جرت نگاہ“ کو ”دعوتِ نگارہ“ دے رہے ہیں اور ”گوشی حقیقت تیش“ کو اپنی بہار رفتہ اور غفلت پارسیہ کی بہانیاں ستار ہے ہیں۔ یہی اختر کی شاعری ایران کی رومانی زندگی کی تعمیر میں غنیمتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہیں ان کے مرغِ تخیل نے پیر پرواز نکالے، یہاں ہی ان کی کشفِ فکر کی بنیاد پڑی، اور ان ہی کے ذریعہ تخیل اختر میں ہزاروں جنیت آباد ہوئیں۔ اختر نے جب پوشش کی آنکھیں کھولیں تو گرد و پیشِ ملم و فصل کے ساتھ ساتھ حسن و ذمہ کو بھی جلوہ گر کیا۔ ٹونک جہاں ایک طرف ملم و فصل کا گہوارہ بنا ہوا تھا وہیں ح کی کلاہوں کا ولن اور زہرہ جبینوں کا دیوار بھی تھا۔ حسن کے جا دو چلتے تھے اور عشق کی گائیاں ہوا کرتی تھیں

اختر مرحوم کو جدید شاعری میں جو بلند اہداف و رفیع مقام حاصل ہوئے، اور اردو شعر و ادب نے ان کی ذات سے جو عروج و فروغ پایا ہے وہ کسی تعارف و تیسرے کا محتاج نہیں ہے۔ وہ رومانی شاعری کے خالق تھے۔ ان کے افکارِ عالیہ میں رومانیت اور شہساز کوٹ کوٹ کر چھل رہا ہے، اور شاعری میں انھوں نے جو ترانے گنگنا رہے اور رومان و محبت کے بریل سے جو دل آویز لفظے بھجیرے وہ کثرت و سرشاری کی ایک نئی ذخیرہ پیدا کیئے اور انڈل خیز و ببول ریختہ کا مصداق بنے۔

”رومان“ کے وہ بار بارئے سرسبزہ جو اب تک ہمارا نہ دل میں پوشیدہ تھے۔ اختر کی زبان اور ان کے بیان سے ان کی ترجمانی میں جیسے جیسے اور ان کے انداز سے ہوئی ہے اس کا لطف اور مزہ ڈھاکشیاں جیتیں ہی سکتے ہیں جو ”کے پیار“ کے چکر کاٹ چکے ہیں اور ان دو چار محنت مقامات“ سے گزر چکے ہوں، جو بس راہ میں آئے ہیں۔ مجرکہ

ڈونے است در پی بادہ کو مستان دامنڈ
اختر کی شاعری ایران کی رومانیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر اور اس محل کو سمجھنا ضروری ہے جن میں اختر کی تخلیق ہوئی اور ان کی شاعری نے جنم لیا، یوں تو ان کی پوری زندگی ہی ان کی شاعری کے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن وہ عوامل جنھوں نے اختر کو شاعرِ رومان بنا دیا اور ان میں وہ لیلیف و حبیبی جذبات پیدا

نہیں ہتر پڑا تو خیاں کا مصلحت تھا، اور سندی باغ اسے سے کر
توق باغ، "مکھنن سندی کا باپ بیچ صفرو قرطاس سے سیغ رض
پیشنقل ہو کر جائداد ہوتا چلا گیا تھا۔" یہاں کے لگی کو چوڑی
حافظہ صدی کی عزتیں گونج رہی تھیں اور محفل میں پڑھی اور گائی
جاتی تھیں جو محبت کا مارا ڈنک میں دم جاتا تھا، اس کا دل پیراس
کو پھڑکنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مولانا احمد علی صاحب نیپا نے
اسی وجہ سے کہتا تھا

خاطر از ٹونک نواہد کہ در آید بیرون
جلوہ شمس بہر کوچہ و باب است
بترجیح بجز از روضہ حبیبان
چشمہ ہر دم و حقیقہ آب است

اور مولانا رومانی صاحب غشتہ، باوجودیکہ اس بنا راس میں
صح و شام گزارد رہے تھے جس کے لئے علی حوین نے کہا تھا،
از بنا راس زوم بعد عام است
ہر دم میں ہر دم لہجہ و لام است
لیکن وہ جب چشمہ تعمیر میں ٹونک اور بنا راس کا مقابلہ کرتے ہیں
تو بنا راس کے تعزز اور حسن کو بھول جاتے ہیں اور بے خودانہ
ان کی زبان سے حسینان ٹونک کی مدح اس طرح نکل جاتی ہے
پیرس از جا لیکر در آدی است
کہ غول بیابان بشکل پری است

ذہن درود در آں تشدد است
نہ ناز حیت چوں کاشی در حرم است
شکم بہت و سیمین بلند آرد
نہ ہم چو بنا راس شکم پرورد

غرض کہ اس زمانہ آجیز و جدید آگین کا بول اور فشانے
"اختر رومانی کو جہم دیا، اور جب وہ سم کی منزل سے ہر شب
میں داخل ہوئے تو

لبسلبان بہرستند و باغیاں بہنا

والا معاملہ تھا، وہ مجتہد کا محروم و مکرہ بن گئے۔ چاہئے والی اور

حسرت کا درد سے پرنگا ہیں ان کے گرد منڈلائے لگیں۔ ہر طرف
محبت و دھان کے سدا بہار بھول اپنی ہمک سے دامن کو مضطر
کرتے گئے۔ رشک و تقاببت کی داستانیں موضوع سنی بننے لگیں
اور "یہ کم سنی کا زمانہ رہا، ابتلائے شباب" غارت گرد مرود قرار بن گیا۔
بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان تمام چاہتوں اور محبتوں سے آخر کا
حساس دل متاثر نہ ہوتا۔ وہ اپنے گرد ایک حسین بادل کو دیکھ کر غیر متغیر
کیسیوں میں مبتلا ہو گئے، خود بھی کسی کو "چاہئے گئے اور دوسروں کو"
بھی اس کا موقع دیا کہ وہ انھیں چاہیں، جو پس اور بیار کر سکیں۔ انھوں
نے محسوس کیا کہ "اس انجمن کی گین شے بھی ہیں، شہم بھی اور لطف شامی"
بھی ہے اور ذوق مصلہ چنگ، بھی۔ یہ جنت نگاہ ہے تو وہ
'فردوس کوش'۔

۱۹۲۱ء میں جب وہ اس زمانہ پر اور محبت میں سر زمین سے
نکل کر لاہور پہنچے تو وہ بھی اس "نواہد" کی یاد کو جو ذہن اور بند
بھی تھا، بڑے چاؤ سے انھوں نے یاد کیا اور غور سے ہی دن کے بعد
اختر نے لاہور کی رومانی دشت میں بھی اپنا مقام الگ پیدا کیا۔

اختر کی عمر ہی میں ٹونک سے شہر کے بھونے نکلے تھے، لاہور جیسے
شہر کے رسالوں اور اخباروں نے ٹونک کے اس خیر کو بھوکا دیا۔ ان
کی شاعری نے ہمیشہ اپنے پس منظر میں "سرو خدا کی سیم تنان" اور
مضمر و ان شیریں دہان" کو چھپائے رکھا ہے۔ آپ اسے کچھ بھی نام
دے دیجئے اختر کی زبان میں "سلی، عذرا، برجانہ" جو چاہے کہہ لیئے
اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اختر کے پرستار اس کے کلام پر تنقید و تہرہ کرنے والے،
آج تک اختر کے محبوب کو حرف لاہور، بکرات اور گنڈواہی کی فضا
میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔ انھوں نے اختر کی اس اولین جہانگاہ محبت
ٹونک کو اپنی حقیقت و جستجو کا کبھی مطلع نظر نہیں بنایا۔ حالانکہ
"نزد و من" کے نام سے لاہور سے ٹونک آئے ہوئے اختر نے جو نظم
لکھی ہے اس میں خود اختر نے کہا ہے کہ

نفت تھا جس نے پہلے پہل، دل کو درویش
پھر اس کے در پر مسیدہ شکر ان چاہئے

مدت کا عرصہ سامنے ہوگی وہ ’منش زدہ‘

پھر دل کو سوزشیں بہر پروانہ چاہیے

لیکن یہ بات کہ ”وہ بہت لمبا زائدہ“ ”منش زدہ“ کوئی آج تک
پروہ رازدی میں ہے۔ اختر یاد جو طبیعت کی رفتار شوقی کے ٹوک
کے غم کی ٹھری تربیت کے ذریعہ ایک جاپہ درو جوان تھے اس نے
انھوں نے اس کی نقاب کشائی بھی نہیں کی اور دل کی بات زبان پر
جب آئی تو حدیث دیگیاں کے طور پر آئی، یا ایک سینہ سے نکل کر
دوسرے سینہ میں محفوظ ہوگئی، یہ سینہ بہ سینہ راز ابھی منظر عام
پر نہ آ سکے گا، اس لئے کہ اصل راز کا وقت یا تو خود اختر تھا یا اس
کے بعض خاص ہلز و مساز، ان میں سے ایک ہلز کا زوال ہی میں
وصال ہو چکا ہے۔ دوسری شخصیت اس وقت ہماری درمیان
البتہ موجود ہے لیکن یہ ایک ایسا بحر ہے کہ اس کے ’ساحل‘ کا
پتہ آج تک نہ لگایا جا سکا اس لئے یہ حقیقت اب فضائی ہی بن
کر رہ گئی ہے۔

بہر حال اختر لاہور کی جنت ارضی میں رہے ہوں یا دہلی کی
روانی نشاؤں میں ان کا ذوق شغری ترقی پذیر ہوا اور ان کو
بشریت و عزت ملی ہو، ٹوک کی دواں، اس کے بارے، اس کی دیرینہ
میں ان کا دل ہمیشہ اٹھارہا ہے اور وہ اپنی اس محبت خیز اور شغری
سرزمین کو گھر ہر کے لئے بھی نہ مہیا کر سکے تھے۔

مجھ سے ملتا ہے دل جب سے ٹوک چھوٹا ہے

وہ صحنہ باز نہیں، سیرا شباب نہیں

بچے ہوئے ہیں نکا ہوں ہیں وہ حبس کو چپے

ہر ایک ذرہ جہاں کم تر آفتاب نہیں

وہ بارے اور وہ باغوں کے دل نشیں منظر

کہ جن کے ہوتے ہوئے خلش خواب نہیں

دہ سرور اور معنی بناس کا پانی

شراب سے نہیں کچھ کم اگر شراب نہیں

ہر ایک ذرہ پختیاں وہ مہربانے دواں

کہ جن کی یاد میں ناؤں کو فکس خواب نہیں

دلن کا چھیل دیا کس نے تذکرہ اختر

کہ چشمِ ذوق کو پھر راز نہ دے خواب نہیں

اس کے علاوہ ان کی مشہور نظم ’اویس سے آئے والے بتا‘ بھی

ان ہی جذبات و غنیت کا ترجمان ہے اور حبِ وطن کی ہر طرف ایک
شاہکار مثال ہے بلکہ حبِ وطن کا ایمان کے جذبہ صاف
کی آئینہ دار بھی ہے۔

یہ نظم بقول مولانا فضائی صاحب مرحوم ”اردو کے تمام

منظوم نظمیں اس کی نظیر آپ ہی ہے۔“ بچپن کے مصوم دور کی

مخصوص رواایت، وہ دہانہ شاہزادگی کے زمانہ کی نئی نئی پیش

آنے والی کیفیتیں ’جیب‘ کی آدمی کو اس کی تجربہ نہیں ہوتی کہ میں

جنت سے نکلا لایا ہوں یا جنت کی طرف سے جایا جا رہا ہوں، ہم

میں سے ہر ایک کا ناتا ہے کس قدر شیشی ادھر رکیت ہوتی ہیں،

اختر نے خود اس نظم کو اپنی پسندیدہ نظموں میں سب

سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ

کو لکھتے ہیں :-

”یہ بتانا کہ اپنی نظموں میں کون سب سے زیادہ

عزیمے بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر مجھے ایک بیک

جواب دے، پھر مجبور کیا جائے تو شاید

”اویس سے آئے والے بتا“ کا نام لوں گا اس

کی شایہ نزول کیا ہے؟ ہر طرف تاثرات جواب ایک

دیس سے آئے والے سے برسوں کے بعد دل کرکسی

غریب وطن کے دل میں مترتب ہوتے ہیں اور انکو

یا شعرین کرچنگ پرستے ہیں۔ یہ واقعہ دے کہ جہاں

بچپن گزارا ہو، اس مقام کو یاد تو ہر ایک کے گوشہ دل

میں بھی رہتی ہے لیکن جس شخص کو اس مقام سے

جدا ہوئے ۱۵ سال گزر چکے ہوں، اس کی تعلیمی جذبات

اور شدت احساس ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ میرا

بھی ایسا ہی حال تھا۔“

(ماخوذ از مکتبہ فہرست لائبریری لاہور ص ۱۰)

اگست ۱۹۶۱ء

اس نظم کی شان نزول کے سلسلہ میں اختصار سے جو اس خط میں اشارہ کیا ہے اس کی تشریح و توضیح اسی کی زبان سے سن لیجئے جو درس سے گیا تھا اور اس نظم کا مقابلہ تھا۔ میری مراد اسٹاؤ محترم ابو الفرحان مولانا محمد حبیب اللہ خاں فضائی مرحوم سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

”نظم نیرنگ خیال ۱۹۳۴ء کے سالنامہ، طبعان لاہور کے اشاعت نمبر میں اور گلستانِ طمان میں سب سے پہلے شائع ہوئی اور پھر ہندوستان کے دو سرکاری رسالوں نے اس کو نقل کیا۔ مئی ۱۹۳۴ء میں جب میں لاہور پہنچا تو یہ نظم مجھ کے ادبی اور شعری حلقوں میں سب سے زیادہ مرقعہ سلط پر رقص کر رہی تھی اور نازک خیالیاں سر دھن رہی تھیں کہ اس نظم کی نگارش میں گوئیے سعادت نے چائے کا ہمارا ہارسہ سرسویں نہ رہا۔ اور یقین ہے کہ اس نظم کے جواب میں کئی اور عمدہ نظمیں اور ادب میں داخل ہو جائیں گی۔

ایک دہائی سے آئے دن اس کے طافات پر دہیں میں زندگی گزارنے والے دوست کے ساتھ خلوص محبت کی سند پر میرا بھی کیفیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اب سے کئی سال پہلے وہ دہائی سے آئے دن دہا میں تھی جب میں کی آمد طافات نے اختر صاحبہ جذبات غربت و مسافر کو گڑگڑایا تھا، اب ان دنوں جب میں کئی سال کے بعد پھر لاہور پہنچا تو ان گزشتہ جذبات کو اس عنوان کے ماتحت منظم پایا۔“

راخڑا ذمہ منعم اور دہائی سے آئے دن کی تعریحات

(رسالہ روانہ جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۳)

اس نظم کی اشاعت کے بعد اس فوری اندو دنیا میں ایک نئی چل سی چمک گئی اور اس کی روانی فضا کو دیکھ کر تو بعض ناقدین نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ نظم نئی نظم ہے۔ حقائق و واقعات سے وہ کابھی واسطہ نہیں۔

لیکن حیران اسرار اور واقعات راز جاننے ہیں کہ اختصار سے حقائق کو کس قدر کامیاب انداز میں رنگ دیا تھا۔ لیکن حقیقت پھر بھی حقیقت دہی اور ٹونک کا ذرہ ذرہ اس حقیقت کی واقعیت و صداقت کی گواہی دیتا رہا ہے۔

اختر کی یہ شاہکار نظم، یونکران کے وطن ٹونک کی قدیم معاشرت، تہذیب، تمدن اور لوگوں کے یادگار مقامات کی عکاسی اور ترجمان ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس نظم کے بعض بندوں کی وہ تعریحات بھی نقل کر دی جائیں جو اس کے مقابلہ مولانا فضائی مرحوم کے قلم کی رہیں ممت ہیں:-

”راخڑا ذمہ منعم میں ٹونک ایک چھوٹے سے پہاڑ رسیبا

کے دامن میں آباد ہے۔ شہر سے دو ڈھائی میل دُور ایک ندرہ خاس کے نام سے شمال سے جنوب کی طرف بہتی ہے۔ ٹونک کے کھلے ہوئے میدانوں میں برسات کے موسم میں بہاؤ کا لشکر اس طرح اُڑ پڑتا ہے کہ یہ دارالاسلام عالمِ نباتات کی کارخانہ بہادوں کے اعتبار سے دارالحرب بن جاتا ہے۔ دیہاتے بناس ہر بار شش کے آغاز میں جب پہلی مرتبہ غلہائی پر آتا ہے تو اس کے پھر پھش نکالنے کے لئے خانہ نشین اور متعلقہ نمک بیج بردست نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

جنگوں اور کھیتوں میں جب سبزہ کا خمیر فشن بچھ جاتا ہے تو مسلمانوں کے سینے گھونٹے پر اور ہندوؤں کے سینے ان پر رنا کی پہاڑی پر جہاں قدیم عمارتیں ہیں اور ایک خوراپنا ہوا ہے شروع ہو جاتا ہے۔ نو ذہنی کے دلوں میں ہے ان علاقوں میں گوشت کرنا کہتے ہیں، یا لایا بے تکلف کے گھونٹوں میں اُٹھال ڈال کر مین میں تیس تیس کی تعداد میں سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور شاداب و ذرخش منظر میں رات رات مجریش رہتے ہیں۔ ایک نظر خود ساختہ چوڑھوں پر برساتی بچان پکے رہتے ہیں

اور دوسری طرف 'چار بیت' جو ٹونک اور رام پور کے شعرا کی مخصوص صنف تھی، دائرہ اور طبلوں پر ایک ساتھ آواز لگنے کی پوری طاقت سے کاؤں پر ہاتھ رکھ کر گائی جاتی ہے۔ اس صنف میں میں حمد و نعت بھی ہوتی ہے مگر مشعر و دگر کے گئے بھی، بے دفا پری رویوں پر مٹی دلفن بھی ہوتی ہے اور فوج رسادہ و دمسوزوں کے لئے ترغیب اور ان کے خط و خال کی تعریف بھی مثلاً ہے

آؤ سب سے پرہیز جاؤ بہا نہ کرہ
وقت قسمت سے ملا ہے یہ کہاں بھی لو

گوں آتا ہے وہ! ہر بار یہ کہہ کر نہ ڈرہ
بہوش ہیں آؤ، کہاں ہو، کوئی آیا نہ گیا
ایسے ہی دل و دوز اور فرخ بزم اداؤں کی روانی بخیر
یا دو نصرتے اس نظم کا پلاٹ تیار کیا ہے اور
آخر صاحب نے اس صوری اور فامری ٹونک کے
یا مقابل لطیف حیات کے عالم میں ایک مضمون
ٹونک آباد کر کے رکھ دیا ہے۔

اس نظم کو پڑھ کر دل کے گوشے سے آنسوؤں
کی ایک لہر بتا سب مل کھاتی ہوئی نکلتی ہے اور
آنکھوں میں طوفان اُمڈ آتا ہے۔ میں غلبہ جذبات
ذات اثرات کی وجہ سے بیک وقت مسلسل اب تک
اس نظم کو نہیں پڑھ سکا ہوں۔

کیا اب بھی وطن میں دلیسے ہی سرمست نگاہیں
کیا اب بھی مہمانی لڑائیوں کو آتش پرتا رہے ہوتے ہیں
ہم کہیں جو جھلک کر تھے گئے کیا اب بھی وہ ساتھ ساتھ ہیں
ادویس سے آئے والے بتا!

گویا پیر دلیس میں نہ سہرا آسان ہے، نہ آسمان
پیرستارے، نہ پیر دلیس کے باخوں میں ستارے ہوا میں
آتی ہیں نہ غریب الوطنی میں پریت پرگٹھ گھڑائیں

پچاق ہیں بلکہ شفق کے سایوں میں دن رات کے
دامن بھی نہیں ملتے، شام غریب ہر چند کہ مشہور
ہے لیکن شاعر کے نزدیک وطن سے نکلنے کے بعد
گویا کہ شام ہی نہیں ہوتی، اس لئے پیر دلیس میں
پھولیں تک نہیں سونگے، اسی لئے تو وہ شام وطن
اور وطن کی یاد میں سرمست و بے خود بٹھایا ہوا
ہے۔

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
کیا اب بھی ہیں ایسے ہی خوش رنگ شگفتے کھلتے ہیں؟
برساتی ہوا کی لہروں سے بھیجے ہوئے پودے پلتے ہیں؟
ادویس سے آئے والے بتا!

ذہن کے اشترا میں ٹونک کی مخصوص معاشرت کی
تصویر سے وہ باریک نقاب سرکاری ہے جس سے
مرث دہی شخص لذت گیر ہو سکتا ہے جس نے کبھی
ٹونک کو دیکھا ہو۔

کیا اب بھی وہاں دیسی جواں اور مدھیری راتیں ہوتی ہیں؟
کیا رات بھرا بھری گیتوں کی اور باریکی باتیں ہوتی ہیں؟
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں، وہ عشق کی گھائیں ہوتی ہیں؟
ادویس سے آئے والے بتا!

کیا شام بڑے سڑکوں پر دھن لے چیب اندھیرا ہوتا ہے؟
اور گیتوں کی دھندلی مستحوش پر سیاہوں کا بیڑا ہوتا ہے؟
یا جاگی ہوئی آنکھوں کو کھار اور خواب نے گھرا ہوتا ہے؟
ادویس سے آئے والے بتا!

اس بند کو بھیجے کہ ٹونک کی معاشرتی تصویر کے اس پہلو
کو اس زیادہ خوبصورت نگاہ میں دیا جاسکتا ہے۔
وہ آجڑا ہوا، وہ نکھرا ہوا آباد ہے یا زار آباد کہ نہیں؟
تکڑیاں بٹل میں دلے ہوئے پھرتے ہیں طرح دار آباد کہ نہیں؟
اور بلیوں میں چھانکتے ہیں تکران سیرے کا راب کہ نہیں؟
ادویس سے آئے والے بتا!

ٹونک کی مذہبیت اور دارالاسلامیت پرچہاں
اسلامی حکمران کے زیر سایہ اذان اور ناقوس میں کبھی
آویزش نہیں ہوتی کسی لیلیٰ پیرایہ میں روشنی
ڈالی ہے۔

کیا ابھی ہلکے متندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا ابھی مقدس مسجد پر مستانہ اذان بھڑکتی ہے؟
اور شام کے دھندے سیلوں پر اکٹھت سی بھجا جاتی
اور دس سے آٹے والے بست!

گلرنگ کے باغ، تالاب اور بنگلے سے بھٹوں کی موہا
اور آخرت صاحب کی خصوصاً بہت سی محبت آمیز
دستاویز متعلق ہوں گی، کیونکہ روداد منائے گئے
یہ ایک بہترین اور پُر فضا مقام ہے۔ کیا ذیل
محاکاتی بدن تمام افسانہ بھٹوں کا ترجمان نہیں ہے؟
گلراج کا خواب، اکو سا گھاٹ اور اس کی فضا میں کسی ہیں
وہ باغ وہ بنگلہ وہ تالاب اور اس کی ہوا میں کسی ہیں
وہ کھیت وہ گاؤں وہ چیریاں اور ان کی مٹی میں کسی ہیں
اور دس سے آٹے والے بست!.....

آخر میں مولانا فضائی صاحب اپنا تعارف اور اپنے اور آخرت
کے تعلقات پر برہنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”میں کون؟ — وہ میں جو اس نظم پر خصوصیت
کے ساتھ اور آخرت کی زندگی کے تمام حالات پر
سب سے زیادہ کچھ لکھنے کا حق رکھتا ہوں، کیونکہ
میرا اور آخرت صاحب کا دلھی ارتباط اور مخلصانہ
تعلقات اس زمانہ سے قائم ہیں جب یہ صرف
ابن محمد تھے اور ہندو آخرت نہیں ہوئے تھے۔ جب
ان کی معصومانہ شوخیوں پر رگوں کے سینڈز میں مل
بن کر رہا کرتی تھیں۔ یعنی ان کی عمر دو دس سال سے
زیادہ نہ تھی، جب ہم ساتھ کھیلنے تھے۔ اس وقت
کے معلوم تھا کہ یہ ستوخ و شنگ پتہ حشر آخرت شریف

کے نام سے ہندوستان کی فضا سے سفر و ادب پر
اپنے شباب (یخیز رنگ نعل کی سعادت) تاباں
دلوں کو بیدار اور دماغوں کو بھلی کر دے گا۔

نظم کے مندرجہ ذیل بند میں ح
کیا ابھی پرانے کھنڈوں پر تاریخ کی جھرت طاری ہے؟
اُن پرنا کے مجرہ سے مندر پر پانی و شربت طاری ہے؟
سنان گھروں پر بچاؤنی کے دیہاتی وقت طاری ہے؟
اور دس سے آٹے والے بست!

آخر صاحب نے ”بچاؤنی“ کے جن سنان گھروں
کا ذکر کیا ہے وہ مجھ شوریدہ قسمت کی جائے سکونت
تھی اور میرے عم محترم مولانا محمد صابر شاہ مرحوم
کا محلہ ہے جو آخرت صاحب کے بھٹو تھے اور جنھوں
نے شعر و سخن، اور علم و ادب کے پاکیزہ ذوق کا
وہ تحفہ آخرت کی گل زمینِ ذہانت میں بویا جو آج
ایک پھل پھولا گل رہا اور قرارِ درخت ہے۔“

(ماخذ از مضمون اور دس سے آٹے والے کی تعریحات
شائع شدہ رسالہ ”روان لہو و جزیری شمس“ و منصفہ ۳۳)

یہ تو تھا آخرت کی رومانی شاعری اور دماغی زندگی کے پس منظر
کا ایک ابتدائی اور پہلا سانس، اب رہ گئے وہ قہار اور اسباب
جن کو آخرت کی شخصیت کی تہذیب میں دخل تھا۔

گر آں جہل را سدی اطلو کند
گر دفتے دیگر آں کشد

البتہ مضمون ختم کرنے سے پہلے ماننا سب تو ہوگا اگر اس تاریکی اور
ادبی دستاویز کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو آخرت کے چہن اور ان کی
ابتدائی شاعری سے متعلق ہے۔

جن اتفاق سے کمالی احترام مولانا حکیم سید ظہیر احمد صاحب
برکاتی (رحمہم اللہ) کے چہن کے دوستوں میں سے ہیں، ان کی بیاض
میں آخرت کے قلم کی لکھی ہوئی ”ایک نزل“ لکھی ہے جو ان کے چہن

کی یادگار ہے۔ اس غزل پر اختر ہی کے لہذا لکھا ہوا ایک نوٹ بھی مندرج ہے۔

اختر اپنے جلیلوطن بیت کو یاد کرتے ہوئے کس حسرت سے لکھتے ہیں :-

یہ غزل اس بارے میں اشد افسانہ خوش گوارایم

کی ہے میں کو برنگوں کی زبان میں بچپن کسا جاتا ہے۔

یعنی میرے بارہ سال کی عمر میں دماغ ناتواں سے

نکل جاتی، گذشتہ زمانہ کی یاد دل کو بہت گہرا کرتی

ہے اور یہ اختیار زبان سے نکل جاتا ہے کاش

میں بچہ ہوتے، مزے مزے اور فارغ اہمالی سے

دن کاٹتے، لیکن آہ زندگی آگ جاب ہے جو یکدم

نور و نور سے سہاگ کی طرح آفتنی اور نعتیں پا

کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ وقت بھی بھرتا نہیں، اسے

ذرا سکوت نہیں، مگر نا یہ ضرور ہے کہ ہر وقت

کچھ نہ کچھ کوئی نہ کوئی قابل یادگار نقش چھوڑ جاتا

ہے۔ بچپن آہ بچپن، وہ دلاویز سین تھا جس کے

دیکھنے کو آنکھیں ابھی تک بے قرارانہ منتظر ہیں، مگر

آہ جو بھی نہ آئے گا۔ کس حسرت نسیب نوجوان کی

زبان سے ایک آہ سرو کے ساتھ کس طرح بے قوی

سے نکل جاتا ہے ع

دردن کو آہ جلائی دے دے اودھار بچپن

کوئی منظر یا فاش ایک ٹھنڈی سانس چکر چکر کا تھا ہے

اسیر فوج عشق تو شباب کمر کے مجھے

کہاں گیا مرا بچپن خراب کمر کے مجھے

انہیں ایام پیشینہ کی یاد میں مندرج ذیل غزل

لکھی جاتی ہے — اختر

غزل

نہیں دشمن بہت پڑن کسی کا

کمرے کی کسب تری چہون کسی کا

کوئی ہے ساتھ مختصر میں کسی کے

کسی کا ہاتھ ہے دامن کسی کا

بنایا سب نے اپنا اپنا مسکن

کسی کا دشت ہے گلشن کسی کا

ارادہ ہے ابھی سے ہونے کا

ابھی تو دور ہے مدفن کسی کا

تھیں دل کے کیا ہاتھ آیا اختر

کسی کو کسب اکھوں دشمن کسی کا

اختر کا یہ قلمی نوٹ اور یہ غزل چوں کہ اب تک کہیں

شائع نہیں ہوئی ہے اس لئے ایک ادبی اور تاریخی تذکرہ

کی حیثیت رکھتی ہے۔

سہیلی

● سماجی اور گھریلو زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کہانیاں

● اہم اور پے پییدہ سیاسی اور انفرادی مسائل پر خیال انگیز مضامین

● دل نشین نظمیں اور جذباتی غزلیں

● طنز و مزاح

● عورتوں کے شیعہ ہونے مضامین

فی شمارہ ۷۵ نئے پے

دو سالانہ ایک سال ۶ روپے دو سال ۱۱ روپے

میںبر، سریتا اور د۔ جھنڈے والا، رانی جھانسی روڈ۔ نئی دہلی۔

مجھے اگلے شمارہ سے ایک سال / دو سال کے لئے خریدار

بنالینے۔ رجسٹرڈ کرنے کے لئے وہ شمارہ دی۔ پی۔ پی سے روانہ کیجئے۔

نام

پتہ

ہنی ایچ ڈی

اور اپنے والدین کے گناہوں پر بار ہیں
 اور آج ہی سے شغل میں تحقیق کے لگیں
 کھل جائے گا دریغ پہ قسمت جو بند ہے
 دم بھر میں، بیخ ڈالنے، پھل توڑ لیجئے
 جیسے، لحد پہ درد کے جلتے تھے کے لئے
 قاتل کو قید خانے میں کھسک جو تھا ملا
 چیلر تھے اس میں نہیں کھسک تھے اس میں تیز
 لکتے ہیں خود کہ دوسروں کے قرض دار ہیں
 اس کے علاوہ وقت بھی لگ جائے گا سوا
 کم وقت میں تمام ہو تحقیق کا سفر
 قلعی کوئی کتاب دہل سے اڑا لیجئے
 گر لگ گیا تو آپ کا ہے ختم نعت کام
 ہر اک ورق پہ ٹانگے دو چار مائیے
 یا ہم صیغہ حلقہ، گوشنِ نظیر تھا
 جو آئے جی میں باپ کا نام اس کے بیچے
 اس کو نکال دیجئے، اگر معمول ہو کہیں
 تہیہ نعت لیجئے، لیکن حساب سے

جو لوگ ایم۔ اے کر کے بھی بے روزگار ہیں
 اُن سے ہے میری عرض کر کُل فکر چھوڑ دیں
 جی لگ گیا تو کام بڑا سود مند ہے
 ترکیب لکھ رہا ہوں عمل آپ لیجئے
 دیئے تو تنو مواد ہیں تحقیق کے لئے
 یا میری چٹائی کا تھا طول و عرض کیا
 بال اس کے کھرہ تھے کہ اُن اس کا تھا نفیس
 یا آج کل جو شاعر و مضمون نگار ہیں
 بیکی یہ سارے کام ہیں محنت طلب ذرا
 میرے کہے پر آپ عمل لیجئے، اگر
 اک دن کسی کسٹری کی دوکان پر جائیے
 کوشش رہے کہ ہر کسی شاعر کا وہ کلام
 تحفیل کی مدد سے فسانے تراشیے
 شاعر کو فرض کیجئے شاگردِ میر تھا
 یہ نہیں وطن بھی اس کا کہیں فرض کیجئے
 حالاتِ زندگی کے بھی لکھ جائیے یوٹیں
 پچھلے معتمدین کی دوا کا کتاب سے

ان کا عواد ہو مگر اپنا بیاں رہے
 پہونچے جہولوں جھیفہ تو تا یہ اختتام
 یہی کینچہ میں ہوں ہما د باپ تل و عقد
 بچوں کو ان کے جا کے سینا د کھا بیٹے
 تیر کو ان کے تولے اپنی نگاہ میں
 خدمت میں ان کی خون جگر پانی کیجئے
 کھٹی کو ان کی ناک پہ جانے نہ دیجئے
 عقل معاجزت سے ذرا کام لیجئے
 میں مفرزت کیجئے اندیشہ جات میں

اقوال دوسروں کے ہوں اپنی زبان سے
 ہے اس کے بعد مرحلہ سجدہ و سلام
 جھک جھک کے سجدے کیجئے پس ان کو نقد
 باتیں ہوں ان کی خشک تو کھن لکھیے
 بچے پیشیوں کی طرح ان کی راہ میں
 ہر روز حقوڑی دیر گس رانی کیجئے
 جوتے تک ان کے اگر دو کوسے نہ دیجئے
 دانش کدہ سے اپنے پھر انعام لیجئے
 پی - اے - ڈی لوگ بننے ہیں اب تباہات میں

ہر فرق علم و جہل کا معدوم ہو گیا
 کیں جس نے خدمتیں دی مجدوم ہو گیا

آل انڈیا ریڈیو

۱۹۲۷ء میں بمبئی اور کلکتہ میں انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس کا اجراء ہوا۔ یہ ایک فرسٹ کلاس نظام تھا۔
 ۸۔ جون ۱۹۳۶ء سے اس کے بعد مرکزی سروس قرار دے کر آل انڈیا ریڈیو کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں نوآئیشن
 کام کر رہے تھے اور بیرونی نشریات سروس کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں تقسیم ملک کے بعد صرف چھ اسٹیشن ہندوستان
 میں رہ گئے۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ۶۰ نوآئیشن ہیں اور ۲ ریڈیو اسٹیشن جن کے ساتھ ۱۳۵ اسٹریٹو، چار ماؤنٹ
 اسٹریٹو، ۲۸ رسیڈنگ سٹیشن اور ایک ٹیلی ویژن مرکز ہے۔ ملکی نشریات کا دائرہ بڑھانے کے لئے ۵ ٹرانسمیٹر اور
 نصب کئے جاتے والے ہیں تاکہ کوسمیا ۶۱ فی صدی ریتجہ اور ۷۰ فی صدی آبادی تک یہ نشریات پہنچ سکیں۔
 آل انڈیا ریڈیو نے اپنے وجود کے ۲۵ سالوں میں عوامی مذاق کو سمجھنے اور ظاہر کرنے، علمین کرنے اور بہتر کرنے اور کسی حد
 تک اس کی رہنمائی کرنے کی حق الامکان کوشش کی ہے اور ہماری قومی زندگی کی اندرونی ترقی کو ترقی دینے کی ہمت کی۔ اس لئے
 اس کا نصب العین ہے 'عوام کی بہتری کے لئے' ان کی خوشی کے واسطے !

حاصل حیات

جو اس سنے سے کہیں زیادہ لطیف اور لذت رنگ بڑی چیزوں کے چیموں پر سے درختوں کی جھاڑوں اور چیل چیل پانی کی روانی میں ہے۔ وہ بھی ماں کو نہ بتا سکا کہ نیلا آسمان بونہی خاموش چپ چاپ نہیں کھڑا بلکہ غور سے دیکھتے پر شوکت و عظمت کے صدائے سراد بھی اپنے آپ کو لے رہا ہے۔ اور جو کچھ اطراف میں پھیلا ہوا ہے وہ محض ایک ہے وقت، بے ربط واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنے آپ میں کائنات محفوظ رکھے ہوئے ہے اور جانے کتے احساس اور گرد پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے۔ رجائیت کے کتے شعلے جستجو کی کتے آگ بھڑکی، لیکن اس کی آہنج وہ بھی دوسروں کو محسوس نہ کر سکا۔ چپ چاپ مار گھاسے وہ چڑمٹا اسکول جانے والے راستے پر چل پڑتا پر کہیں نہ کہیں راہ میں بیٹھ کر آڑی ترمیمی لکیریں کھینچنے لگتا۔ اس مشتعل میں ایک سکون تھا۔ ایک ایسا احساس جو ہر جہے کی تسکین کا باعث بنتا۔ پھر وہی گھر، وہی ماں باپ کی سختیاں۔ بڑے کی پیدائش پر ماں باپ کی یہ خواہش فطری تھی کہ وہ جلدی جلدی چلے پڑھ لکھ کر ان کی معیبتوں کا حل ہے۔ ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن وہ ان پابندیوں سے عاجز آ گیا تھا۔ ان سے خوار کی کوئی صورت اس کے ذہن میں نہ آتی۔ محلے کی عورتیں جب اس کی شکایت ماں سے کرتیں اس کی ناخلفی پر ملنے دیتیں تو اس کا وجود ایک زخم بن کر ہد جاتا ان کی باتیں ان کے کھیتے

فرائے ہرقی ہوئی دیوان صاحب کی موٹر میں بہتر سے اپنے گرد بٹھے ہوئے سنووش رہ رہ کے یہی سوچ رہا تھا۔ یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ درخت، یہ لکڑی — یہ سب کتے ہر بان ہیں جنہوں نے اسے زندگی کا گداز جتنا، فن کی گویائی، اس کی نمو، اس کی قوت بخشنی۔

پھر قومیت کے ایک جاں نسل احساس نے اس کی رگ رگ میں گردش وادھت دوڑادی۔ ماں کا خیال بڑا محوہم تھا۔ حد و خال آئے یاد نہ تھے، صرف ان کا ایک ہیو لاسا اس کے ذہن میں رہ گیا تھا اور اس کے ہمارے وہ خیالات کتے تانے بانے بن رہا تھا۔ جانے اب اس کی ماں کیسی ہوگی۔ دیوان صاحب کے پاس آئے سے قبل کی اگر کوئی یاد اس کے ذہن میں تھی تو وہ تلخ اور نزش حقیقتوں کی وہ کرپ ناک یاد تھی جو اس کی ماں کے لطیفوں کی صورت میں اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ پڑھنے لکھنے کے بجائے جب وہ آڑی ترمیمی سے مقصد لکیریں کھینچتے تو جانے کیوں ماں اسے مارتی اور بسا اوقات کو سابی کرتی۔

”میں کہوں جان آ تو اسکول جانے کا بھی یاد دہنوں کے نیچے بیٹھا بونہی لکیریں کھینچ رہے گا۔“ ماں سلیٹ اور پینل پیچھ لیتی۔ کبھی گہری گہری غمگین آنکھوں سے غور کرتی، کبھی اس کی دیرینہ دھڑی پر ایک آدھ لہر پڑھی لگا دیتی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بھی ماں کو نہ بتا سکا کہ اسکول ماسٹر کی اول ذل

اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح اتر جاتے اور ان کا غصہ تیز تر ہو جاتا۔
 فاجہ آ کر اس کے باپ سے آئے دیوان صاحب کے پاس
 چھوڑ دیا۔ دیوان صاحب عزیز رشتہ دار بنے لیکن بے حس مذاقی
 دشمن اور بڑے غریب پرور۔ نادار مشرق کے اکثر لڑکے انھیں کے
 خرچ سے کھ پرکھ کر روزی کما رہے تھے، لائق بن رہے تھے۔

لائق ابھی بیٹا تھا اس نے کبیز لائق بنے روٹی نہیں
 مل سکتی۔ سو مستحق کی خاک کی خاطر کبھی دیواروں کے غیر ممنوعہ گھر
 میں روٹی دینی سانس لینے والا سنتوش جیپ اوچی اوچی آسمان کو
 چھو کر ہوئی دیواروں میں اٹھ گیا تو ان کی سجاوٹ اور آرائش دیکھ کر
 کچھ ایسا ہلکسا کر کچھ دلوں تک اپنا دل چپ شعلہ ترچی ترچی
 لکڑی کی جیسے کے بجائے دیواروں پر آدھریاں ایک ایک کھویر کے
 ایک ایک نقش کو اپنی لپکتی آنکھوں سے جوہر دیکھتا رہا کہ وہ
 رنگ اور نقش ہی ہیں یا کوئی اور مجرب۔ اور جب کئی دن کی تاحیر
 اور کھوج کے بعد اسے یقینی آیا کہ یہ ساری تصویریں یہ سارے
 نقش و نگار کا مجموعہ ہیں تو اس کے ذہن میں ایک نیا خیال
 بجلی کی طرح گونز کر رہ گیا۔ کس نے یہ تصویریں بنائی ہیں؟ کس طرح
 انھیں جیتے جاگتے رنگ کاغذ پر پڑوں پر منتقل کر دیئے گئے ہیں؟
 بہت دنوں تک وہ اس آئین میں بیتلا رہا حتیٰ کہ دیوان صاحب
 نے پوچھا "یہ ہر دم ٹیٹے کیا سوچا کرتے ہو؟"

سنتوش ہلکائی۔ رنگ دکھایا۔ "جن پر یوں کہا نیاں
 پہن میں سنا کرتا تھا ان پر یوں کو ان کے ہرے جیسے باغ بیٹیوں کو
 ان کے خوب صورت گھروں کو اپنی آنکھوں سے آپ کے گھر عیش
 دیکھ لیا۔"

دیوان صاحب مسکرائے، عقل مسکرائی، فراست مسکرائی۔
 "وہ۔" اور تم انھیں جان بھی سکتے ہو۔ بشرطیکہ.....
 وہ اپنی کسی سے؟ پھل پڑا "میں دیوان صاحب میں..."
 اسے یقین نہ آیا۔ شاید یہی ایک غلطاب ہی ہو۔
 لیکن سچے خرابوں کی طرح اس کی تیسری بھی اٹھی ہو کر رہ گئی۔
 دوسرے دن اپنے کمرے میں عجیب و غریب چیزیں دیکھ کر

وہ بہت دیر تک بھی سوچتا رہا کہ کس طرح اپنے منہ کے کچھ گھر دینے
 کو واپس بھیجے۔ ان عجیب چیزوں نے اس کی ہمت کو بالکل ڈاؤن
 کر دیا... بے قراری، بے چین، اضطراب!!!

ایچانک ایک مسکراتے ہرے نے اس کے کمرے میں قدم
 رکھا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کی لٹوئیں دیکھ کر فراخ دلی سے بولا
 "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہر ذی روح ان کے پیٹ سے کھینچتا
 نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے لئے دنیا میں کی ضرورت ہے۔..."

اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ بیزان و پریشانی انھیں کھولے
 ان روزوں کو دیکھتا رہا جس سے سورج کی شعاعیں ایک ایک کر کے
 کمرے میں اچالا پھیلا رہی تھیں۔ نہیں معلوم کتنا وقت، کتنی ساعتیں
 خاموشی میں گزر گئیں۔ وہ بالکل ساکت و جامد رہا اور انھیں آہستہ
 آہستہ بھرے ہوئے سامان کو میٹھا، سلیطے سے رکھتا رہا۔ حتیٰ کہ
 ان کی لمبی ہوئی۔

دیوان صاحب خفیف سا مسکرائے، چہرے کے متواتر
 کو نیچے نگاہ سے جانچا، پھر ذرا بے تعلقت ہو کر بولے، "کیوں میان
 سنتوش نے نئے دوست تعین پسند آئے۔" سنتوش ہلکا کر رہ گیا۔
 دوستی۔ جس شے سے وہ آج تک نا آشنا تھا۔
 جانے دوستی میں کیا کچھ کرنا پڑے۔

دے مسکرایا۔ "دیوان صاحب آپ کی نگاہ و انتخاب کی داو
 دیتا ہوں۔" وہ قد سے جھکا اور پھر سنتوش نے ایچانک دیوان صاحب
 کی خاموشی لیکن پوچھتی ہوئی نگاہوں میں وہ سارے اسرار پردے لے کر
 آج تک اس سے پوشیدہ تھے۔

ذہنی شلیس اور رنگ برنگی کٹوریاں سرت کی ایک ہر
 یں کر اس کے جسم و جان میں دوڑ گئیں۔

اس روز پہلی بار اس نے بے مقصد لکیروں کے بحالے
 نئی نئی چیزوں کی تصویریں بنائیں۔ دماغ میں ہی ہوئی جستجو کی
 خوشبو کو سونگھا اور سرسبز درختوں، لٹڈنڈ پڑیوں، لائق ستروں
 منڈلاتے جھونروں کی ہزارہا شکلیں ان ذک و دانشوں کے بنا دیں
 اس کی ہر دم کیلپاتی آنکھیاں کا غذا و تلم پر اس طرح جم گئیں جیسے پتھر

کی انٹ بکر اور جیسے دھن گزرتے گئے دیوان صاحب کی آنکھوں کا چاؤ اور ان کا گہرا اہٹاک اس کی آنکھوں میں قوت بن کر دوڑنے لگا۔ بنیروغوں کے استقبال کے اس نے ایسے مناظر محض پیش کیے کہ سے مغرور قلم اس پر کھینچنے کا حقیں دیکھ کر نہ ہر سکا کہ کسی مبتدی کا نقش آدین ہے۔ ان میں ایک پختہ کار نہیں کا پورا سجادہ اور بالکلین تھا۔ نئی نئی چیزیات، ان کا تنوع ان کی گہرائی، ان کی فطری سرچھہ بوجھ۔

وچے نے جلد ہی دیوان صاحب کو آکاہ کر دیا کہ اس مشتاق کے لئے کسی رسمیری کیئے العز کوئی ضرورت نہیں۔ یوں وہ بھی بھی اس کا لام ضرور دیکھ جایا کرے گا۔ سو اس دل سے سنتوش تہنا، میٹھا دینا بہان کی رنگینیاں کا فز پریمیا کرتا اور دیوان صاحب پر شام ان تصویروں کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے اور تعجب کرتے۔

ایک شام لان میں بیٹھے بیٹھے، عنوان نے سنتوش سے پوچھا "تم ہمیشہ جھاڑ پھاڑی کیوں آکاہ کرتے ہو بھی کسی انسانی نقش کی طرف توجہ کیوں نہیں کیسے۔"

سنتوش کو گیلی میں ملی وہ بہت سی تصویریں یاد آئیں جس کے نقش اتنے، کتے ہوئے اور اتنے جان دار تھے کہ اسے اکثر اٹھ پر زندگی کا گمان ہونے لگتا۔ وہ دیکھا ایک پڑمرہ ہو گیا۔ وہ دیکھے اتنی بڑی جرأت کر ڈالے جبکہ زندگی میں بھی اس نے اس حسن اس حقیقت کو نہیں دیکھا۔۔۔

سچائی اس وقت تک گنتی ادھوری رہتی ہے جب تک کہ وہ حقیقت کا روپ نہ دکھا دے۔

تین کی منگھٹوں پر وہ سارے نقش وچوں کی طرح سمٹنے لگے۔ تصویر لاکھ رنگیں ہستی حقیقت سے کم اثر آؤ گزرتا ہے۔ اور اس شام اڈھروں، آٹھالوں کے سوسے مہبوت جب اس نے بہت سے انسانی نقش اپنے ذہن میں مرتب کئے اور روشنی میں انھیں کا فز پر آنا چاہا تو بار بار قلم چٹک کر رہ گیا۔

کئی دنوں تک اس غلش نے اُسے بے قرار کیا۔ ایک شام

آئیٹھے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ بڑی محنت سے اس چہرے کو کاغذ پر منتقل کیا، چہرہ جانے کیا سوچ کر اُسے پڑے پڑے کر ڈالا۔ خودمانی — خودمانی فن کو طبعی میٹ کر دیتی ہے۔ پاکیزگی۔ دل و دماغ، خواب و خیال، جذبات و تصورات کی پاکیزگی بہ حال ضروری ہے اور پھر بھی اس نے یہ کوشش نہ کی۔ ابراہا، بارش ہوئی، بل ترنگ بجا، آنکھوں سے ہر چیز اوجھل ہو گئی اور جب مطلع چمکا تو کیا ایک وہ سورج روشن ہو گیا جس نے ایک فن کار کی گھپ اندھیری دنیا کو بقعہ نور بنا دیا۔

نیشیالی کا پہلی بار دیکھ کر مارے اضطراب کے دوڑا دوڑ کر پیرور میں جا پہنچا۔ دیواروں پر آویزاں دو بدیع تصاویر دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ کیا بنائے داؤں نے یہ ساری تصویریں اس کے حصے سے متاثر ہو کر بنائی ہیں، کیا ان ساری تصویروں میں اس بے مثال حسن کا جلوہ نہیں، گنجی ہوئی آنکھیں، تنے ہوئے اڑتے تسمتے ہوئے رخسار، پتھر پتھروں کی طرح نرم و نازک ہونٹ۔

اس نے بہت سے رنگ ایک دوسرے سے ملائے پٹری محنت اور عرق ریزی سے ان کا مرکب تیار کیا۔ پھر اس رات اپنی تہائیوں میں اس نے بڑے تزک و احتشام سے، بڑی محبت و رجحان سے ایک تصویر بنائی — پہلی انسانی تصویر —

پہلا نیشی پیکر — جن کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے حواس سے محسوس کیا، اپنی روح کی گہرائیوں سے پسند کیا۔ مگر وہ اس تصویر کے بارے میں کوشش اور خواہش کے باوجود دیوانہ گنا کو نہ بتا سکا۔ اگر وہ ناراض ہو جائیں تو وہ بہرہ بہر کہ اسے معصوب کر دیں تو.....

اس کے طول دل میں بہت سے خیالات خوفناک کا فوڑوں کی طرح چنگٹا ڈٹے رہے اور اس بلبل میں ایک نرم و نازک کوئل سا جذبہ رہا کہ اسے اٹھاتا رہا۔ وہ چپکے چپکے تصویریں بناتا رہا۔ بناتا اور لگاؤ ڈالتا رہا..... کمزور میں آٹھ کوئل ملا دی جائے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس جذبہ کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر کے اس نے فن کو زندگی بخشی۔

بات کرنے کے لئے ترستی ہوئی اس کی زبان ، دیکھنے کے لئے ترستی ہوئی اس کی آنکھیں ، افعال کے لئے جین اس کا جسم ، سکون کے لئے طے قرا داس کی روح رنگوں اور نگیروں میں مدھلتی رہی ۔ مدھلتی رہی ۔ یہاں تک کہ ان کی پیاس ایک مستقل عرصہ تک اس کی آنکھوں میں جھلک پڑی ۔

اس شام جب شیبانی نے دیوان صاحب سے پوچھا : ” ڈیڑی ! یہ کون لڑکا ہے جو بھی بھی نظر آ جاتا ہے ؟ “ تو وہ قرا کی ایک لہریں کر سناکت ہو گیا ” مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند ہیں ۔ ان میں گہرائی ، فنون اور ارتعاش ہے ۔ جیسے جیسے “ دیوان صاحب نے کرسی پر پہلو بدلا ۔ بیٹی کی آنکھوں نے رخ بچا کر پوئے ۔ ” وہ لڑکا آرٹسٹ ہے بٹیا ۔ اپنے فن کا دیوانہ ۔ اس کی آنکھوں کی ترپ اس کے فن کا فنون ، اس کی جستجو کا خزانہ صرف اس کی آنکھیں ہیں ۔ “

اعنوں نے سنتوش کی طرف ہجرت انتفاع سے دیکھا اور بولے ” یہ میری شیبانی ہے ۔ تمہیں اس سے کئی کرفوشی ہوگی سنتوش ! “ سنتوش نے نظریں نہ اٹھائیں نیچے ہی نیچے دیکھ کر کہتا ہوا بولا ۔ ” مجھے بے حد مہارت ہے کہ یہ ۔ یہ آپ کی صاحبزادی ہیں ۔ “ اس کا دل دور دور سے دھڑک رہا تھا ۔

تجانی اپنے پورے حسن ، رعب و جلال ، وقار و دبیرے کے ساتھ اس کے آگے بڑھتی ۔

” ان سے کہیے کہ میری ایک تصویر بنائیں “ شیبانی بولی ۔ ” میں ۔ میں ۔ انسانی تصویریں نہیں بناتا ، خالق “ وہ بڑبڑایا ۔ ” تو اب آپ کو بتانی ہوگی ۔ “ اس کے حکم میں اٹھا تھی ۔ ” میں آج آپ کی ساری تصویریں دیکھوں گی “ اور بڑے ۔

” نا ، بڑی نا ، بڑی جاہ سے شیبانی نے اپنی دو آنکھوں کے ہمارے دیوان صاحب کی ٹھوڑی اوچی اٹھائی ۔ ” ڈیڑی “ دیوان صاحب موم کی طرح چمکے تھے ۔

کوشش کرو سنتوش کوشش کرو کہ اس کی تصویریں جانے

یہیں ماں کی لڑکی ہے ۔ میں نے اس کا کہا کبھی نہیں ٹالا ۔ یہ گھر ، اس کی دیواریں ، اس کی ہر چیز شیبانی کے حسن ، اس کے سلیقے ، اس کی آمد و رفت کی آئینہ دار ہیں ۔ ڈھلے ہوئے دل با سلیقہ اور با شوق ہو ہیں ، انہیں سمجھنے کی کوشش کرو ۔ “

اور اس خوشنوش نے محسوس کیا کہ وہ نہیں سے اٹھ کر فلک پر پہنچ چکا ہے ۔ خلد کی پنہاٹوں میں پٹیاں خود طومک سے جو گشتگو ہے ۔ اس کا چھوٹا پن ، گھڑی کا احساس ، پستی ، سب کچھ دیوان صاحب کی عظمت کا شکار ہو کر بکھرے ہوئے پلڑے کی طرح تابدید ہو گئے ۔

انسانی عزم ، انسانی وقار نے اپنی بار اس کے دل میں انگریزائی لی ۔ وہ خود بھی اس قابل ہے کہ کسی کو سمجھے کبھی کو سمجھائے اور اس نے بڑے دھیمے یکس بڑے سحر سے پڑا انداز میں کہا ۔ ” میں کوشش کروں گا دیوان صاحب ، اگر یہ میری پہلی اور آخری کامیاب تصویر ہو ۔ “

شیبانی کو ماڈل بنا کر اس کے قلم کی رفتوں نے جس نزاکت کو چھو وہ تار کے چھناکے کی طرح اس کی سوئی ہوئی روح کو بھی جھنجھوڑ گئیں ۔ اس کی ساری حسیات ایک ایک کر کے جاگ اٹھیں ۔ زندگی کے حوصلے ، اس کی آج ، اس کی شان دل رہائی ۔

اور جب تصویر دیوان صاحب نے دیکھی تو دیر تک بیٹھے دنگے اپنی بیٹی کا یہ سن رہی رنگ و احوال بھی دیکھتی تھی جانتی تھی آنکھوں سے بھی نہ دیکھا تھا ۔ لعل و اکملی اور سرور کے لہجے سے جو انہوں نے اٹھ کے بے ساختہ سنتوش کو اپنے گھٹنے سے لٹایا ۔ مٹی کا کچا کھروندا اوچی اوچی فلک بوس دیواروں میں مدغم ہو گیا ۔

مقامی فائش میں منتخب ہو کر تصویریریوں مالک عی اور ہرجگرم ویش پہلا انعام حاصل کیا ۔

اور آج اتھارہ سال بعد دیوان صاحب کی فرمائے جرقہ ہوئی موٹر میں شہر سے اپنے گھر واپس لوٹتے ہوئے سنتوش رہ رہ کر یہی سوچ رہا تھا کہ ایک ماں کو اس کا سہارا مل رہا ہے یا ایک بیٹے کو اس کا حاصل تھا ۔

کلامِ جوہر

ہائے پھرائی ہوئی آنکھوں کے اشک جیسے تاروں کو پیسے آگئے
 آنکھ نے اشکوں کی چادر اڑھ لی دل کی دنیا پر دھندلے چھا گئے
 ٹوٹ کر کانٹے نہ بکھے پاؤں سے ہم سفر تھے تا بمسند آگئے
 کھلے کھلے پر لگی ٹھپوں پہ اوس مکرانے تھے کہ آنسو آگئے
 جیب ہوا ویران دامن ہبسا دیبہ ہائے شوق گل برسا گئے
 چاؤب ساحل بنا سیلاب غم تباہ کشتی خود کنارے آگئے
 ذہ ذہ ہے یہاں گرم سفر یہاں اے ہم سفر ہم آگئے
 جوہر آنکھوں کا رکنا تھا مجھ
 اس لئے دانستہ دھوکا کھا گئے

سکوں برباد کروں حسرت دارماں کاخوں کروں جو وہ بیدا دگر یوں شاد ہو جائے تو یوں کروں
 الم سے شاد مافی درد سے پیدا سکوں کروں زسزنا پا جنوں ہو کہ ملا وائے جنوں کروں
 گراں گزروں تو گزروں بغیر میری زمانے کو میں آخر ہوش میں کیوں آکے تو بہن جنوں کروں
 عدول سے چمن میں وا دلے لوں ہم مذاقی کی گلوں کی چاک دامانی سے تسکین جنوں کروں
 نگاہ واپس سے دیکھ لوں اپنے نشیمن کو اجازت ہو تو اے حیا نہ نظریں یوں بیول کروں

سناؤں زلفی، عشق کی کیا کشمکش جوہر
 کبھی کہتا ہوں یوں کروں، کبھی کہتا ہوں یوں کروں

انتظار

بہت گراں ہیں ترے انتظار کی گھڑیاں بٹک رہی ہے خلاؤں میں بے قرار نظر
 نفسِ نری آہٹ، نظرِ نظر تری دید کمالِ شوق سے رہ دیکھتی ہے راہِ گذر
 قریبِ مرگ ہیں ماہِ دہخوم کی قمعیں اداس رات کھڑی ہے ادب سے چشمِ براہ
 یہ دشتِ وکوہِ وسیاں یہ دمِ نوجوانِ شکار بچھی ہوئی ہے تری راہ میں ہر اک کی نگاہ
 غمِ فراق کے اشکوں سے دھلتا جاتا ہے اندھیری رات کی آنکھوں سے نیند کا لاجل
 نڈھال ہو چکی اب تھک کے شب کی رقاصہ فضا اداس، مبہم، منظرِ پوچھل
 ستارے نود کی کلیاں لٹانے بیٹھے ہیں کھڑے ہیں ساکت و جامد اندھیر شمع لے
 عروسِ شب نے سماں ہے سیجِ پھولوں کی کریں گے لمحے پھلے اور ترے قدم پر ڈیے
 ہر ایک سمت اندھیرے کا ہر چھایا ہے صبا جو سنے تو لمحاتِ چو تک پڑتے ہیں
 فضا کا دل جو دھڑک جائے ایک لمحے کو اسیرِ خوابِ خیالاتِ چو تک پڑتے ہیں

نگاہِ کب سے تری دید کو ترستی ہے
 تری تلاش میں دل سو گوار ہے کب سے
 مددِ آرزوئے غمِ دل کی خوش گوار سحر
 گزرتی جیسا کہ ترا انتظار ہے کب سے

ڈال ڈال کے پات

سید محمد مجذبی

مردم شماری

ہے جہن میں آج کل مردم شماری کی بہار
census گھوڑوں گدھوں کا ہو چکا ہے پہلی بار
اس لئے عیوان ملحق ہو رہے ہیں اب سشار
رہ نہ جائے تو کہیں اسے مردو عاقل ہوشیار

اس جہاں میں ہر جہاں فی ورنہ کھلائے گا تو
جدولی مردم شماری سے نکل جائے گا تو

پچھے جانے چاہیں اس وقت کچھ ایسے سوال
ہی رہے ہو کہ سے اور کیوں اور کب ہو گا سوال
ہے مکاں اپنا کہ بے گانہ ہو اکب انتقال
آج تک پیدا کیا کس چیز ہیں تم نے مکاں

بڑھ چھیں کتنی گھر بڑھ منیتیں دس سال میں
آدی کس حال میں ہیں جاؤ کس حال میں

مولوی کی طرح کھاتے ہو کہ ہے پٹیا پسند!
خاندانی طور پر کھتے ہو تم منموہر پسند!
کھتے منموہر ہیں چھوٹے کھتے منموہر بلند
اور اگر منموہریاں ہیں کچھ تو کتنی ہوش مند

صاحب اولاد ہو یا زائد ابیضا ہو؟
تم غنڈل گئی ہیں کس استاد کی اولاد ہو؟

آدمیت کس قدر ہے، والہریت کس قدر؟
خارجیت کس قدر ہے، داخلیت کس قدر؟
قابلیت کس قدر ہے، جاہلیت کس قدر؟
ذہنیت کس قدر ہے، مولویت کس قدر؟

کیا زبانیں بولتے ہو یا ہو یا نکلے زبان
یا زبان ایسی ہے سن کہ جس کو کر لیں بند کال

(لغتن کراچی)

د انتخاب

اگست ۱۹۶۱ء

اردو شاعری میں ایہام گوئی — ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ایہام گوئی کا سارا دارومدار دو صنفِ نظم پر ہے اور یہ کہیں اسے
کیلا جاتا ہے۔ فارسی میں تعلقات کی کچھ کہیں خصوصاً شاعری نے اس
معا میں کوئی کسر نہیں اٹھارہ کی لیکن باوجود اس کے فارسی شواہد
نے غزل میں صنائے استعمال میں احتیاط سے کام لیا ہے اور اس
کا استعمال اس حد تک نہیں کیا کہ وہ گراں گزرے۔ اس لئے یہ خیال
قرین صحت معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایہام گوئی پر زیادہ تر ہندی
شاعری کا اثر ہوا ہے اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے بنی ہے۔

سنسکرت میں اس صنعت کا نام ہے شلیش۔ شلیش ایسے
لفظ کو کہتے ہیں جس کے کئی معنی ہوں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں یکے کے
دو ہیں۔ سہنگ اور ابہنگ۔ سہنگ وہ حالت ہے جب کہ لفظ سالم
رہتا ہے اور ابہنگ وہ ہے جب کہ لفظ کے ٹوٹنے کو کہے یہ صنعت
پیدا کی جاتی ہے۔

ہندی میں اس صنعت کو بہت فروغ ہوا اور اس کی لئے پہلا
نیک بڑھی کہ بعض جہت پسند صاحبوں نے بہاری کے کلام سے لیتی
نئے نکالے ہیں۔ ہندی میں اکثر شاعر ورنے اس صنعت کو استعمال
کیا ہے۔ مثلاً یہ کہتا ہے

جیون ریم گئی دیکھ کی کل پکوت گئی سوئے
بارے اجیار دنگے بڑے اندھیر ہوئے

چلی چراغ کی حالت ہے ایسے خاندان میں پکوت کی حالت ہے۔ جلتا
پر آ جالا ہوتا ہے اور بڑھنے پر اندھیرا۔

یہاں بار کا لفظ دو معنی ہے ایک معنی بھیجی کے اور دوسرے
جلانے کے۔ اسی طرح بڑھنا کبھی دو معنی میں لیتی ہے لا بڑھنا اور بڑھنا
لا بڑھنا بھیہ بکھنا۔ آخری مصرعے کے دوسرے معنی یہ ہوتے کہ میں میں بھیج
اچالا ہوتا ہے اور جوں بڑھنا چاہتا ہے تو وہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔

ڈہم قلم کراچی

آگے کل دی

اور ایسے جذبہ حب الوطنی کے محبت کئے ہیں۔ کش صاحب قادر الکلام شاعر ہیں اور مؤثر اثر انہیں ایسے خیالات کا اہلکار کرتے ہیں۔ یہ نگین اہل کشمیر کے علاوہ دوسروں کو بھی متاثر کریں گی۔

دھرتی کا کال

معصفت جو گزرا پال۔ صفحات ۴۷، قیمت دود روپے چارپاس
نئے پیسے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط۔ جلد ۱۲ ڈسٹ گود
پبلشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

جو گزرا پال بستانے لکھنے والے ہیں۔ ان کے یہ تمام شاعری
افریقہ اور افریقی زندگی کے بارے میں ہیں۔ معصفت خود افریقہ میں
رہتے ہیں اور انھوں نے ان کی زندگی کا بڑا قریب سے مطالعہ کیا ہے
اسی لئے ان میں صداقت بھی ہے اور افریقی۔ تعارف میں کرشن چندر
نے ٹیپ کیا ہے:

"..... وہ اردو کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے

افریقہ زندگی کو اس شدت اور خوبی سے سمجھ
رہا تھا کہ کیا ہے۔"

کرشن چندر کے علاوہ دیو نرتیا رتی نے بھی معصفت اور تعصفت
کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے امید ہے یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

نروان

'لاٹ آف ایشیا' معصفت ایڈلڈ ریلز کا منظوم ترجمہ
ترجمہ فاروقی جنوں۔ قیمت دود روپے صفحات ۱۱۰۔

'لاٹ آف ایشیا' میں پروفیسر ایڈلڈ ریلز نے اٹلے کو تم بھر
ادمان کی تعلیمات کو انجینئری میں نغمہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں بڑی
مشہور معروف ہے۔ فاروقی جنوں صاحب نے اس کو اردو کا نام
پہنا کر ایک بڑی مستحسن کوشش کی ہے۔ جن کو گوئی کے اس دور میں
ایسی کاوشیں اور کوششیں قابل نیک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ترجمہ
بھی روان، صاف اور شاعری و صاف کا حامل ہے۔ امید ہے کہ
اہل ذوق اس کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

شاعر آتش لہا

کافی تذرا لاسلام کی سوانح حیات، شخصیت اور شاعری سے

متعلق مقالوں کا مجموعہ اور منتخب کلام کا اردو ترجمہ، مرتب اہل اجملی
صفحات ۷۸۸۔ قیمت دود روپے چارپاس نئے پیسے۔ جلد ۱۲ گرد پوش۔
اردو میں ہندوستان کے دوسری زبانوں کے شاعروں اور
ادیبوں کے حالات، ان کی تعینات کے ترجمے نہ ہونے کے برابر ہیں۔
اجملی صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے خدا لاسلام کی حیات،
شخصیت اور شاعری سے متعلق معلومات افزا مقالوں اور ان کی بہترین
نظموں کے ترجموں کو یکجا کیا ہے۔ ترجمے کی اچھائی کا ثبوت اس سے

زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ فراق گورکھ پوری مرتب ہیں۔

"..... ان ترجموں کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے

کہ نیکو شاعری کے طرز احساس، طرز فکر اور طریق

سے ہم اردو والے بہت خوش گوار اور دل نشین

طرز لکھنے سے واقف ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ بہت نازک

اور سب کا انداز سے لکھے گئے ہیں۔"

معارف کاروں میں اہل اجملی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، وقار راشدی
اور پرنس احمد قابل ذکر ہیں۔

یادِ آبیام

معصفت ضیاء الحسن علوی۔ صفحات ۸۷، قیمت ایک روپیہ
چارپاس نئے پیسے۔

"مولانا ضیاء الحسن علوی مدنی مرحوم کا کوری ضلع گھنٹہ کے مشہور
علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مدنی کے عالم اور علمی گروہ کے
گروہ جویت تھے۔ زیر نظر مقالہ ۱۹۱۵ء میں المدنی کے دو بیرون میں
شانے ہوا تھا۔" ادارہ انیسو اداروں نے اس کو کتابی شکل میں شائع
کیا ہے۔ شروع میں مرحوم کے متعلق مولانا سید سلیمان مدنی کا مضمون
ہے۔ مولانا سید سلیمان مدنی کے مطابق یہ گویا ان کی آپ بیتی ہے جس
میں ملکہ بیچ کے بہت سے دل چاہنے والے مناظر ملتے ہیں۔ اس
مضمون میں گھنٹہ کی زبان کا مزہ اور دودھ کا چائے رہا تھا
کہ کسی ہی ذوق نے اس کو یہ حد پسند کیا تھا..... " اور کوئی
وجہ نہیں کہ اب بھی پسند نہ کیا جائے کیونکہ اب ایسی پیاری زبان
لکھنے والے کہاں؟

۱۔ تنقید اور تنقیدی شعور ۲۔ جائزے

ان دونوں کتابوں کے مستعمل ناظر کا ردی ہیں۔ پہلی کتاب "مدسلہ ادب کا ادبی قریہ" ہے اور دوسری کتاب "مدسلہ ادب کا شعوری اور تنقیدی قریہ" ہے۔

پہلی کتاب کا نام تو ہے تنقید اور تنقیدی شعور مگر ساری کتاب میں شعوری تو کیا غیر شعوری طور پر بھی تنقید کا پتہ نہیں۔ مقدمہ میں (فٹ نوٹ کی مدد سے جو دوسرے معنیوں کے طویل اقتباسات پر مشتمل ہے) اندوہان کی پیدائش اور آتما پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیشتر باتیں محض نظروں سے گزر گئی ہیں۔ دوسرا باب تنقید اور شعوری تنقید کا ہے اس میں تنقید کی تعریف کی گئی ہے۔ "تنقید، تخلیق و تفریع سے ملحقہ چیز ہے اس میں ہم غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں" دوسرا باب تنقید جلد کی تشکیل کے عنوان سے ہے۔ تیسرا باب قریہ ادبی ہے جس کا پہلا قریہ عنوان غالب، دوسرا محضی، ماکھ اوڈو اور تیسرا سمبھوٹی میں اردو کی مقبولیت ہے۔ غرضیکہ معنائیں میں ربط و تسلسل پا کر لیں گے کیا کام انتشار نمایاں ہے تنقید کا یہ حال ہے کہ سوائے سلفی رائیں اور وہ بھی زیادہ تر دوسروں کی قدم قدم پر بھول کر لیاں گئی تھیں۔ نقل کی گئی ہیں۔ صفحہ ۱۲۶ پر ایک ذیلی عنوان ہے "مختار معنیوں کا نام لکھی، قوم لکھ اور جعفر علی اثر۔ پھر کتاب کے "زبان شعور کی غزل میں" اس پر اگر غزل کی انکی سلا ہے "مختار معنیوں اور آخر میر کے اغاد کو اپنانے کی سعی کرتے ہیں۔" لعلت قریہ ہے کہ جعفر علی غزل شعور کی صفت میں کوشش کرتے گئے ہیں۔ مگر اس صفت میں صحت ہی اکیلے نہیں۔ ہیں۔ دوسری کتاب جائزے کے صفحہ ۳۹ پر ذیلی عنوان ہے "زبان شعور کے گھٹا ہے۔ اس دور کے زبانی شعور ادیب، شعور، شوکت قادیانی کا مقام ہے حدود شعور اور بلند ہے۔ اس طرح اور جو کتاب، سراج الدہاؤی سراج لکھنوی، اہلبارام پوری، محضر مرزا پوری، جلیل قادیانی، اشفاق حسین نے خود، صدق جاسی، مانی جاسی" معلوم ہوتا ہے کہ مستف نے مختلف رسالوں اور پرچوں کی مدد سے شعراء اور مصنفین کے نام اکٹھے کر لئے ہیں اور دونوں کتابوں میں متعدد غلطیاں سے ان کی فہرست

نقل کی ہے زیادہ تر نام انہوں نے محض اپنے حسن نیتی یا لاپرواہی سے شامل کئے ہیں۔ جامعے میں کتابوں، ادیبوں و شعاعوں، لائبریریوں، رسالوں اور مختلف پرائیویٹ ورکس میں تحقیقی کام کرنے والی کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ فہرست کسی اصول یا قاعدے کے مطابق تیار نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی نقل ہے۔ مثلاً تنقیدی ادب کے تحت کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں کلیم الدین کی کتاب "سنتی رائے غلط" "قدرت سے مگر اردو شاعری پر ایک نظر" "اردو تنقید پر ایک نظر اور انگریز دانش گاہی جو معنی کی مشہور و معروف کتابیں ہیں، ان کا ذکر نہیں۔ ہر قدم پر اظہار کی ضرورت ہے۔ بڑی عجیب و غریب رائیں اور زیادہ تر وہوں کے ذریعے سنی سنائی غیر ذمہ داری سے درج کی گئی ہیں۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ورنہ بے شمار شبہ و پشیمانی کی جاسکتی ہیں۔ معنی کے دینا چوں میں دوسروں کے احوال اور اپنی معروف کتابوں کا ذکر کیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کتابوں کی تعینیت کو آتما آسان کیونکر سمجھ لیا گیا ہے۔ جو کچھ دیا غلط ہے، جو کچھ جانے اس کا چھوٹا کیا ضرور ہے۔ تنقید اور تنقیدی شعور کی قیمت تین روپے چار پانچ روپے اور ضخامت ۱۸۲ صفحات اور "جائزے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ اور صفحات ۱۲۸ ہیں۔

مندرج بالا پانچوں کتابیں ادارہ انیس اردو ادب یاد سے شائع کی ہیں اور سوائے یاد آتما کے ہر کتاب کی کھائی اور چھاپائی اچھی ہے۔ ریاست میسور میں اردو (جلد اول)

مترجم ڈاکٹر آتما خاؤن اور محمد خان۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات کاغذ کتابت اور طبعات اچھی ہے۔ لئے کا پتہ۔ ڈاکٹر آتما خاؤن فربر ۱۳۷۲ھ میں سیوا جی روڈ، سمبارا محلہ۔ میسور۔

ڈاکٹر آتما خاؤن پروفیسر بہارلی کالج میسور بہاری مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے میسور میں دور قیام کے جگہ کے پانچ میں اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق ایک تحقیقی کتاب مرتب کی ہے اور بعض ناگزیر غلطیوں کی اشاعت کی ہے۔ میسور کی زبان پر دکن کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ تحقیقی کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے کیونکہ بہت سے گناہ گوشوں کو روشنی کرتی ہے۔ امید ہے ان کی ذوق اس کتاب کو پانچوں پانچ لیں گے۔ (رحمہ)

’ٹیگورنبر‘ کے باب میں

بڑے کی اور بزرادوں ایسے لوگ جو ٹیگور کا حرف نام جانتے تھے ٹیگور کے پیغام سے وقت ان کے فزون اور کمالات سے معرفت اور نفع حاصل کر سکیں گے۔

جناب علی عباس حسینی

’آج کل‘ کا ٹیگورنبر گزشتہ خاص نمبروں سے بھی بہتر ہے۔ موری اور موزی حیثیت سے اس کی ترجیح میں آپ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ شائقِ نکیتین پر اچل خان صاحب کا مضمون فائدہ ہے۔ فراق صاحب نے اس غلیظ فن کا کی شاعری پر چونکر ڈالی ہے و لٹرائز ہونے پر بھی بصیرت افزا ہے۔ بی گو پالی ریڈی، ابو الکلام زہرہ سہگل، سید انصاری، و آتیا شی، شائق، دیو گھوش نے جن پہلوؤں پر تبصرہ فرمایا ہے ان کے وہ خود بھی ماہر ہیں اور انہیں جیسے لوگ اس ہرگز شغفیت کے کمالات پر روشنی ڈالنے کا حق بھی رکھتے تھے۔ آپ کا ادارہ سقہ مبارک باد ہے کہ اس نے آرٹ اور ادب کے اس دیو قدمن کار کو اردو دانانِ بلیک سے شرافت کرانے لے آئے بڑے ماہرینِ فن تلاش کر لے۔ میری طرف سے لکھنے والی اور ترتیب دینے والی دو نوں کی خدمت میں بدینہ تبریک پیش ہے۔

’ہماری زبان‘ علی گڑھ

ٹیگور کی مسلسل ارسال گرہ کے موقع پر ہمارا ’آج کل‘ دہلی نے خدمات کے اعتبار سے فخر لیکن مواد کے اعتبار سے جانِ بھر شائع کیا ہے۔ اس خاص نمبر میں ٹیگور کی عظمت اور شخصیت کے حلقہ اہم پہلوؤں پر اہم مضامین شامل ہیں۔ فراق گورکھپوری کے مختصر ترجیع اور مضمون قریشی کا مضمون اور ٹیگور کی تصویریں مضمون سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی ترتیب کے لئے ریڈیڑ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

پروفیسر اخشام حسین

’آج کل‘ کے عام نمبر ہی دل چسپ اور قابلِ مطالعہ ہوتے ہیں پیر خاص نمبروں کا کیا پوچھنا! ’ٹیگورنبر‘ بہت خوب ہے۔ یوں تو ٹیگور پر انگریزی میں اتنے اچھے مضامین دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ یہ جانتا ہے اردو میں بھی ایسے ہی مقالے دیکھنے کو ملیں۔ لیکن اس کی طرف ہمارے توجہ سے لکھے والے توجہ کرتے ہیں، تاہم آپ نے کئی اچھے مضامین نکال کر دئے ہیں اور ٹیگور کی زندگی اور فکر پر کئی پہلوؤں سے معقول مواد بھی ہو گیا ہے۔ تصاویر نے اس میں اور پارچا نڈنگا دئے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ نمبر بھی گزشتہ خاص نمبروں کی طرح مقبول ہوگا۔

جناب آنر لکھنوی

’آج کل‘ کا ٹیگورنبر ہر لحاظ سے میں، دلکش اور خیال انگیز ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ میری مبارکباد قبول کیجئے۔

پروفیسر تلوک چند محروم

شاعر اعظمِ ہندوستان ٹیگور کی شخصیت، شاعری، ڈراما، انشائیہ نویس، سیاست اور مدعا حیات کا جس خوبی سے ’آج کل‘ نے اپنے ٹیگورنبر میں احاطہ کر لیا ہے وہ ناقابلِ بزدلی ہے۔ ادارے ٹیگور پر یہ ضخیم نثر لکال کر ہندوستان کی ادب و ثقافت کی بے بسا خدمت کی ہے۔

جناب مکیش اکبر آبادی

’آج کل‘ کا ٹیگورنبر ٹیگور کی تمام ادبی اور فنی خصوصیات کمالات اور سوانح پر ایک نکتہ و ستارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نمبر سے ٹیگور کی مقبولیت کے ساتھ ان کے کام اور پیام سے عوام کی واقفیت

جھنجھٹ بنا لین دین

میٹرک باؤں کا استفادہ شروع ہو گیا ہے۔ انیس
بھی میٹرک اکائیوں میں ظاہر کی جاتی ہیں۔ لیکن
میں دین کے حساب کتاب میں اب بھی بڑی دماغ سواری
کرتی پڑتی ہے۔ آخر کیوں؟
معضل اس بنے کہ میٹرک کے طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اشیاء یا تو
پڑائے باؤں کے حساب سے خریدی جاتی ہیں یا پھر ان کے سادی
اوزان کے حساب سے اشیاء

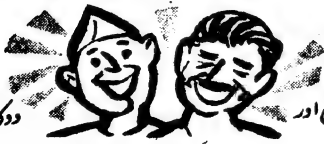
ایک پاؤ کے بنے — ۳۳۳ گرام

ایک پونڈ کے بنے — ۴۵۴ گرام

ایسی صورت میں ظاہر ہے، اس اصلاح سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا
جاسکتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اب آپ ۳۳۳ گرام کی جگہ ۳۵۴ گرام
گرام اور ۴۵۴ گرام کے بجائے ۳۵۴ گرام پر خریدیں۔
اس طرح آپ اس اصلاح سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ یہی نہیں
مشرقی بیکنوں کی بدولت لین دین کے حساب کتاب میں بھی آپ کو آسانی
رہے گی۔

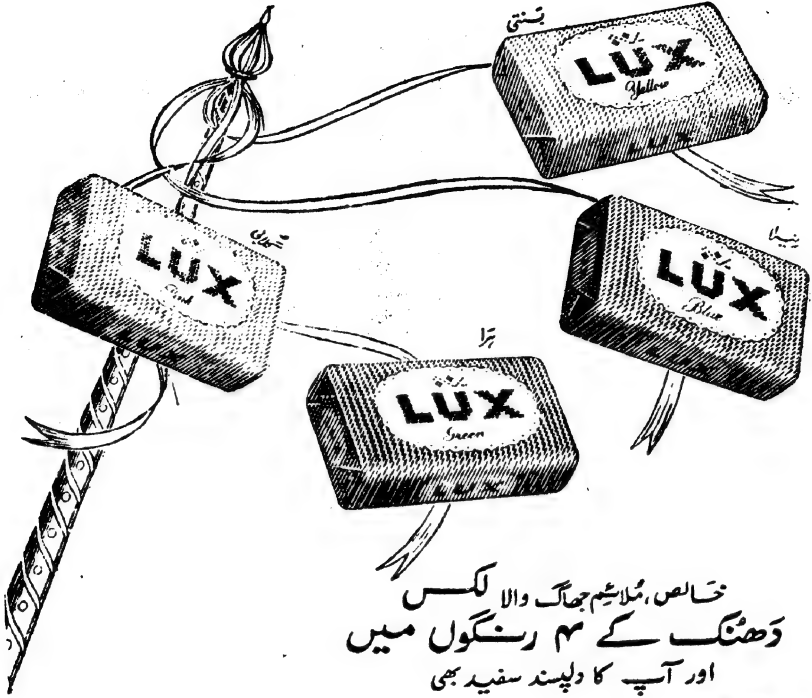
اپنی ضروریات کی چیزیں

مکمل میٹرک اکائیوں میں خریدیے



اسی میں آپ کی اور دکاندار کی سہولت ہے

جادوی کردہ بھارت سرکار



خالص، ملائیم جھاگ والا لکس
دھنک کے م رنگوں میں
اور آپ کا دلپند سفید بھی

دیکھئے! لکس کے چھیلے رنگ اور اچھی رنگوں کے چھیلے سرورق!
اور سفید بھی! رنگ کئی، مٹا بن دہی — آپ کا
پسندیدہ خالص لکس — آپ کے رنگ روپ کی رونق!

آرائش جال کے لئے اچھوتا خیال...
میرا پسندیدہ لکس رنگوں میں!
سادہ سناکھ جتی ہیں



فلمی ستاروں کا خالص، ملائیم جھاگ والا، حسن بخش مٹا بن
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

LTS K1-X52 UD

ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نپٹرت نہرو سے بات چیت	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
ابوالکلام آزاد	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
تیسرا پنج سالہ پلان	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے
نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶	(فی نمبر)	(فی نمبر)

————— لے کا پیستہ —————

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آه گل

ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
ابوالکلام آزاد	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
تیسرا پنج سالہ پلان	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۷۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۷۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے
نمبر ۶۰-۵۰-۴۰-۳۰-۲۰-۱۰	(دفتر)	(دفتر)

————— کا پتہ —————

بزنس میجر پبلکیشنز ڈویژن اولڈ سکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوامی مہنامہ

تہ تییب

آج کل دہلی

علی احارت

محمد مجیب جامہ تہ دہلی
محمد الدین قادری نندہ جیل آباد
گوپی ناتھ امس دہلی
خواجہ احمد فاروقی دہلی
رسان دہلی سری نگر

یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
بی۔ این۔ ایس۔ راجھون دہلی ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ
جی۔ جنس ناتھ ڈہلی ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبہ اردو پبلیکری،
مدیر مسئول

اسٹنٹ ایڈیٹر: مظفر شاہ

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
اشلیگ ۶ پیس یا ڈیڑھ روپے
ہندوستان میں :- ۶۰ پیس
پاکستان میں :- ۶۰ پیس (پاک)
غیر ملک سے :- اشلیگ یا ۱۰۰ پیس

مفت و شائع کردہ
ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، سرکاری آف انفارمیشن اینڈ پبلک کالمونٹ
پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات
سوامی بارہوی
غزل
پہلا گام
غالب کے شریک غالب
لمحہ کی شکست
جعدین مصوری کی بی بی الاقوی نمائش
غزل
فن لطیف گوئی
غزل
تغلیات تاریخ و فکات مگر مراد آبادی
نحیری ادب میں دیگر زبانوں کے تراجم
ادارہ
گوپی چند نارنگ
محمد نشا اورینٹل شاہ
عرش لسانی
دجاہت علی سندیلوی
عابد سہیل
امد حبیب لال
شیم کرانی
احمد جمال پاشا
سانی کھنڈی
ڈاکٹر منگلوری
غلام نبی خیال

سودق :-
پہلا گام کا ایک مندر
رسالہ کی پشت پر :- جنوبی ہند کی ایک دہ شہرہ

بھوراشک ستمبر ۱۸۸۳ء
ستمبر ۱۹۶۱ء

جلد ۲۰ - نمبر ۲

مفتیہ سے تعلق خط و کتابت کا پستہ
بال مکند عرش لسانی، ایڈیٹر آج کل، اردو ادب سیکرٹریٹ دہلی
پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

مشرق جرحی سے صلح کا معاہدہ کرنے کا یہ صورت حال مغربی حاکم کے لئے قابل قبول نہیں، اس لئے کش مکش برصغیر کا اندیشہ ہے۔ اگرچہ نے بھی اس معاملے میں سخت رد و اختیار کر لیا ہے اور وہ بھی اپنی فوجی قوت بڑھانے کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔

کویت کے تنازعہ کی شدت میں بڑی حد تک کمی چکی تھی کہ ادھر تو شیشیا اور فرانس کے درمیان لڑائی چڑ گئی۔ فرانس نے میرز تلکے شہر پر بمباری کر کے بو ظلم ڈھایا ہے اس سے پورے افریقہ میں غم و غصہ کی ہر دوڑ مچی ہے۔ تنازعہ میرز تلکے ہوائی اور سمندری آڈے پر ہے جس پر فرانس کا قبضہ ہے اور تو شیشیا جس کی واپسی ملایا کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے حالات میں کوئی ملک بھی اپنی سرزمین پر غیر ملکی قبضہ برداشت نہیں کر سکتا۔

افسوس کہ ۱۶۔ جولائی کو کھنڈ میں تان بہادر ظفر حسین خاں کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم بڑے علمی آدمی تھے۔ یو۔ پی کے شیعہ انقلابیات میں مصلحت افغانی احمدول پرفا نژاد ہے۔ ساہتہ اکادمی کے ممبر تھے۔ دینیات و فلسفہ سے آپ کو خاص شغف تھا۔ ان موضوعات پر آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ آپ کی کتاب ”مالی و شیعہ“ پر ساہتہ اکادمی نے پانچ ہزار روپیہ کا انعام بھی دیا تھا۔ ان خدمات کی بدولت علمی و ادبی حلقوں میں آپ کی یاد ہمیشہ قائم رہے گی۔

اب جبکہ ہم اپنی آزادی کے پندرہویں سال میں داخل ہو چکے ہیں اور ملک کی تیسروں ترقی کی جدوجہد اور دیوینڈرونی اور برقی سائل سے دوچار ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ملک کی سالمیت اور جغرافیہ ہم آہنگی کو تمام باتوں پر ترجیح دیں اور سماجی پس ماندگی سے نکل کر اعتماد اور قوم پرستی کے جذبہ کے ساتھ اپنے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ ملک کی ترقی و آبادی اور اشتراک عمل میں ہے جیسا کہ وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے متنبہ کیا ہے، اگر ہندوستان نے ذات پات، فرقہ داریت اور دوجہ خیانت کے جنالی سے بچا نہیں چھڑایا تو وہ نہ کوئی جہوری ڈھانچہ کھڑا کر سکتا ہے اور نہ قومیت اور سوشلزم کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ ہم نے ملک میں سوشلسٹ سماج قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر قسم کی کمزوریوں اور چھٹی باتوں سے اوپر اٹھ کر ہم اتحاد و تعاون کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہوں اور سیکورٹیا نظام حکومت کی جڑیں مضبوط کریں۔

دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی باہمی کش مکش شروع ہی سے امن و عالم کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ایک طرف تخفیف اسلحہ اور ایٹمی دھماکوں کو بند کرنے کی بات جیت ہوئی ہے۔ دوسری طرف فوجی اخراجات میں اضافہ اور لام بندی کی بھی خبریں آتی ہیں اور اس پسند دنیا ہم جاتی ہے۔ حالی میں برسنے کے حملے نے نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ دوسرے اعلان کیا ہے کہ وہ اس سال کے آخر تک

سوامی مارہروی

بیتہ نام الدین "نذھنیک"، میر عبد الجلیل بلگرامی، سید غلام نبی بلگرامی اور سید برکت اللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہی سید برکت اللہ جیاداً سمجھے گئے سوائے ماہر ہدی کے۔ آزاد بلگرامی نے "اخیر فتح حلقہٴ خزا" لکھا ہے۔ "داسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شکر تھے۔ فانی میں "خلمس" "حشوق" اور "ہندی جی" "بہی" تھا۔ ان کے دودھ و برکت کا مجموعہ "ہیم پیرکاس" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ بیٹے تھے "میتا داسی بن میر عبد الجلیل بن میر عبد الواحد بلگرامی" کے اور "صاحب البرکات" کے لقب سے مشہور تھے۔ چند پشتون میں درگا بکریہ (سرکار خور) کے سجادہ نشین حضرت شاہ صاحب عالم تھیں۔ صاحب ہرے (المتوفی ۱۲۸۸ھ) یہ غالب کے خاص دوست تھے اور غالب کے خطوط کے مجموعہ "عود ہندی کی ترتیب" میں کے ایک مضمون پر چودھری عبد الغفور سترو ماہروی کے سپرد ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے جیسے سید شاہ عالم ماہروی، شائق، غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ استاد شرف کے بھائی سید رفیع زماں صاحب بلگرامی معتمد مذکورہ علوہ خضر جی غالب

۱۔ نظام علی آباد علی گڑھی، سرحد آزاد، حیدر آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۲۴۴ اور ص ۳۹
 نیز ملاحظہ ہو: سیل اونٹینیل یادگرائی علی گڑھی، کلکتہ، ۱۸۸۱ء، ص ۶۹۔
 نظامی برائی، قاتل سوس انتہا، برادوں، ۱۹۲۶ء، جلد ۳ ص ۳۵
 ۲۔ ہر، خطبہ غالب، لاہور، ۱۹۵۱ء، جلد دوم ص ۲۴۵
 ۳۔ بابک رام، سنگار خانہ غالب، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۵۰ اور ۱۶۴

گیت کی زبان اور اس کے فنی رموز و نکات سے اندو گے
جس جدید شاعروں نے پوری واقفیت کا ثبوت دیا ہے ان میں سوائی دہلی
کا نام سرفہرست ہے۔ افسوس ہے کہ ۱۰-۱۱ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ان کا انتقال
ہو گیا۔ اردو میں گیتوں کی کمی ہے نہ گیت کے کلاسیک کی لیکن ہمارے بیشتر
شاعر جب غزل یا نغمہ سے اکتا جاتے ہیں تو گیت بھی بھلا دیتے ہیں۔
اس کے برعکس سوائی دہلی کوئی ایسا شاعر نہیں رہا جس نے گیت کے لیے وقت
جھوٹے اپنے ہی کو ٹھکانا لیا اور سنجیدگی سے گیت کے لیے وقت
کر دیا تھا۔ ابھی وہی وجہ ہے کہ اس میدان میں وہ دوسروں سے بہت
اگے رہے۔

سواہی ماہروی کا تعلق بلگرام کے اس مردم خیز خطے سے تھا جو صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ اتر پردیش کے خلیج برہمپور کا ایک قصبہ ہے جسے بھی جلتے ہیں۔ اس کی غائب پاک سے ایسی ایسی سہیلیاں دو جو ہیں، تو یہی ہیں جو غزوہ تھوڑا وقت اور شرواہ کے آسمان پر آفتاب و مہتاب میں گر چکیں۔ بلگرام کی علمی و ادبی غذا کا گہوارہ میر غلام علی آزاد کے ضخیم تذکرہ کا شکر اکرام سے لگایا جاسکتا ہے، جس کی پہلی جلد بلگرام کے فخر و فخر سے مستحق ہے اور دوسری میں جو شہرہ آراء کے نام سے موسوم ہے، ۱۵۱ شریکے فارسی اور ہندی کا احسان کیا گیا ہے۔ ان میں شریک شاہ، محمد بن شریک مراد علی

ہی کے خاکروہے تلے نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہ علی حسن، اسی ماہروی مرحوم بھی انھیں سید شاہ صاحب عالم، صاحب کے پرچہ تھے۔ شائق کے علاوہ حضرت صاحب عالم کے دو اور بیٹے تھے سید عالم اور مقبول عالم۔ مقبول عالم نے بھی دو فرزند یعنی یادگار چھوٹے : سید محمود عالم اثر اور سید مختار عالم آزاد۔ انھیں اقتدار عالم کے بیٹے کا نام سرود عالم تھا جو اردو فطرت میں ستویں کے تخلص سے مشہور ہوئے بلگرام کے سادات کی جو شاخ ماہرہ منسلک ایٹھ میں بس گئی تھی، سوای کا تعلق اسی سے تھا۔ وہ اگست ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں کرنیاں، پسیلیاں اور دو بچے کبچہ کاروانج تھا ان کی طبیعت بھی اسی رنگ پر آگئی اور بڑے ہو کر گیت وغیرہ کہنے لگے۔ گذر اوقات کے لیے موروثی جائداد کافی تھی لیکن مدت ٹکڑا خرچ کر لے بھی دوبارہ نہ رہا۔ ماہرہ میں اپنے مکان کے سامنے ایک کٹیہا بنوائی تھی جو ان کے تخلص کی رعایت سے سوای جی کی کٹیہا کہلائی تھی۔ اپنے عقیدت مندوں سے یہیں ملتے اور کلام سننا کہ انھیں غلو تکبیر کرتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں اعتدال و امراض کا شکار ہو گئے اور ان کی ایک ہی کلام بڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ باآخرواغ سے ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو ماہرہ ہی میں انتقال فرمایا۔ انھیں : جو بادہ کش تھے پرانے وہ اچھے جانتے ہیں

سوای ماہروی کی دو شاخیں دیالی ہوئیں۔ پہلی سے ایک ایک بڑا اور دو لڑکیاں اور دوسری سے دو لڑکیاں تھیں۔ سوای نے شاعری گویا ورثہ میں پائی تھی۔ داد حسیل اور فاضیل دونوں طرف کے اجلا میں شرو منن کا ذوق لپشتوں سے جلا آتا تھا۔ چنانچہ سوای نے باقاعدہ طور پر کسی کی شاعری اختیار نہیں کی۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ شہرہ شاعری سے قطعاً تعلق کر کے گوش نشین ہو گئے تھے۔ لیکن گیتوں کی شناس میں غلو نے جو سرمایہ اردو کو دیا، بڑا وسیع ہے۔ ان کی نظمیں اور گیتوں کا

لے مالک رام، خاکروہہ غائب، ۱۹۵۵ء میں ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء

کے سوای ماہروی کے کئی حالات نام، لکھنؤ کی فراموش بیان کے بچانے جناب تیرہ ترقی میں لکھنؤ نے حمایت و دل سے ان کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔

آج کل کی

مجموعہ سوای دشن کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور اثر پریش سرکار نے اس پر انھیں انعام بھی دیا تھا۔ ان کے گیتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے، زبان دیباچہ پر ان کی غیر معمولی قدرت ہے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسی بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں گویا کوئی سانسے بٹھا یا ہیں کر رہا ہے۔ ان کی زبان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ آریز مہندی ہے یا مہندی آریز اردو ہے، الفاظ کے ساتھ کھیلنا ہوگا۔ ان کی زبان بس گیت کی زبان ہے۔ نرم رواں، میٹھی اور دیہاتی زندگی کی سانسوں میں بسی ہوئی زبان! اس میں کہیں، مہینیت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہیں بھی کسی سیٹھی یا زوردار اور مشکل بھی نہیں۔ بس سادہ، سہل اور رسائی، جیسے لوگ گیتوں کی زبان ہوتی ہے، جس میں کسی صناعی یا ذہنی کاوش کو دخل نہیں اور جو جذبات کا ہمارا کار دل کے بھرے سے پانی کی دھار کی طرح خود بخود چھوٹ نکلتی ہے۔

ان کے گیتوں کا دامن وسیع ہے ان کی نظر گاؤں کے کیسے کھلیاں اور تال تالیں سے لے کر بڑے کارخانوں اور مزدوروں کے بھی نہروں تک گئی ہے لیکن ہر جگہ یہی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے پاں راستے سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ گیتوں کا ازلی اور ادبی موضوع پریم کس ہے۔ سوای ماہروی نے بھی بہرہ کے آنسو گیتوں میں پروئے ہیں۔ پیچھے سے دکھ درد بانٹا ہے۔ برکھا کے چھینٹے اڑانے ہیں، چپت چوڑی کھانوں کا گلیا ہے بیس مضمون سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ۔ پریم کس سے متعلق ان کا گیت مگس کی بے آواز، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں ایک بہن کی آدھی رات کے وقت کی ذہنی کیفیت بیان کی گئی ہے اور جرجم دل متراگی کا وہ منظر دکھایا گیا ہے جب خود، غیر خود کی کشش میں اس حاکم کو ہوجاتا ہے کہ ساری کائنات ایک نقطہ پر مرکوز معلوم ہونے لگتی ہے عبارت کیا، اشارت کیا، ادائیگا ہر غلط سے یہ گیت "بلانے جاں" ہے، دیکھ تو ادا دھماکتے مردے کوں کھڑا ہے تیرے دوارے ۹

کس کی ہے آواز ؟
 کون یہ بولا یا رکی بائی ؟ تو لب اٹھی ہیں آدمی رات
 چاندی کی جوالا میں بھیٹیں
 پگے میں آئیں جاگیں
 دھک دھک میرا دل چل دارے پھل اٹھی آنسو کی حمار
 آکاش اڑی
 پاتال ساٹی

پون بج بدلاسی چھائی
 دشا دشا میں ڈھونڈ پھری چنت چور
 دیکھ تو اودھ مانتے ہر دے !
 کون کھڑا ہے ترے دوا سے ؟
 کس کی ہے آواز !

خود کلامی کا یہ فخر روح کی گھبراہٹوں سے نکلا ہے۔ شاعر
 کامالیہ ہے کہ اس نے جمالیاتی احساس کی اس وجدانی یقینیت کہ
 جو اس کے اوارامے، افانکے شیخی میں آنا دیا ہے پوچھ رہے کہ کون گیت
 کا موضوع پریم رس ہے لیکن اس میں شائنیت رس کی بایسیدگی بھی
 ملتی ہے۔ اپنی انھیں خوبیوں کی بدولت ہمارے نزدیک یہ
 سواری کا بہترین رمز یہ گیت ہے۔ لیکن ان کا رخ رمز یہ گیتوں
 تک محدود نہیں، انھوں نے بعض اچھے بیانیہ گیت بھی لکھے ہیں
 مسند گھڑائی، میں انھوں نے پیگھٹ کا جانے والی نارکا نقشہ
 کھینچا ہے۔ اس میں ان کی نادر انکلائی پوری طرح ظاہر ہے۔ طرزا
 کی لذت، معروض کی برجستگی اور بچے کی شگفتگی نے سارے منظر
 میں جان ڈال دی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی فوہبہ رتنا
 کی آمد سے زندگی خود بخود لنگھنے لگی ہے :

اک نارائیلی، ابلی، ات سندھ روپ، لیش لیش
 جوں شش جگے جگے مل بدلی، تیوں داٹ لے ٹھوگھٹ پٹک
 کچھ ہلکی سی گت کا تھی، انک پھول کھلے، کلیاں ملی
 کرسائیں نیں تیر بھرے، اترا تے، پہلی مٹلی
 تیر باڈی کا تھ میں بیج لے اویش دھر گوری مٹی
 ابعان مکان سوں جا دت تھی وہ پتھلے دھرن گھٹک

آکھ دلی

آکاش پری کی جھکی سوں، پاتال کی جھل پریاں مٹشکی
 پاتال میں اک سبھو غلام ٹھو، جوں مل میں شکی مٹشکی
 موری پائیں میں آؤکے پیاس اٹھی کوئی انڈو گھنڈ ترخا کی
 نیک پریم جلی سے گھونٹ پیا، موری اگن بھیا ہر دے تٹکی
 سسٹی، بڑی، جھکی، بڑکی، وہ دیکھو بوے من میں کھکی
 پھر مودہ کے جا رہیں پائس مودے، منات بھی کھر کوشکی
 انھوں نے وطن کی محبت سے مرثا رہو کر بھی گیت لکھے ہیں
 پھر پھر اڑے ترخا، میں انھوں نے آزادی کا سواگت کیا ہے لیکن
 وطن کی موجودہ حالت سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کی شاعری
 میں پھیلے ہیں جیسے برس کے مندرستان کی سیاسی بد و جہد اور
 سماجی کش مکش کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ وہ گاندھی کی شخصیت
 سے متاثر ہے۔ ان کی شہادت پر انھوں نے ایک پروردہ دوسرے
 بھی لکھا لیکن غالباً وہ گاندھی داد کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکے۔
 انھوں نے جذباتی سطح پر اشتراکیت سے بھی اثر قبول کیا ہے۔
 ”مٹکے کا یہ مزدور“، ”شانت سنریش“ اور ”ایسے ہیں ہم لوگ“
 اسی قسم کے گیت ہیں۔ گریہ ان کی ذہنی افادہ سے مطابقت
 نہیں رکھتے، اس لیے ان میں غلوں کے باوجود شعریت نہیں
 پیدا ہو سکی۔ ان کا رنگ سخن دراصل سماجی گیتوں میں نھر کے سٹنے
 آتا ہے یہی ان کا خاص میدان ہے، جس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔
 سواری کے سماجی گیت ہندوستانی زندگی کے بھری اور دیہاتی
 دونوں پہلوں پر عادی ہیں۔ ان میں متوسط طبقے کے بے بسی،
 سرایہ داروں کی ہرے اوروام کی مغنی، مظلومیت اور بہامت
 کی داستان سے متوالے سے بیان کی گئی ہے۔ انھوں نے گاؤں کے لوگوں
 کی سادہ لوحی، معصومیت اور سریل الاعتقادی کی سچی تصویریں
 پیش کی ہیں۔ مذہب کی چادر داری اور ظاہر پرستی کا پردہ چاک
 کیا ہے۔ وہ اس مذہب کے خلاف ہیں جس کے نام پر ظلم اور بے
 عوام کو دھوکا دیتے ہیں اور جو ظلم اور ریاکاری میں سرایہ داری
 کا سب سے بڑا معاون ہے :

مسوہ جیبر، اند بند اور البشر قید خواہوں میں
 سورگ پر قبضہ نہوٹ جی کا، جنت اندھ اور میں

پڑھی رام کی اہلیہ کافی رام بھینے جھاو میں
شکست کے ساتھ بھی دیکھ سو کر مرقہ والوں میں

کون کسی کا ایشیائندہ کون کسی کا بندا ہے
کون یہ اویچا بھندا دلے دھرم کا جھوٹا دھندا ہے
یکسی مذہب پر ان کی تنقید مضمین معاشی یا اقتصادی نقطہ نظر سے نہیں
بلکہ اس کی بنیاد اخلاق قدردان پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک اصل مذہب
نام ہے عرفان نفس کا :

مسجد سونے، مندر دیوان، کوئی گھر آباد نہیں
پنڈت بے کل اپنی دھن میں، لاکھوں دل شاد نہیں
آنجانا کہ عہدیتنا دوں بات ہے بنیا دہ نہیں
دو دن ہیں بڑھوں سے کھلی، سورگ کی کیا باتیں

اسے سیدھے بشوں سے تو اٹا سیدھا کام نہ لے
اپنے آپ کو بن چھانے رام کا مورخ نام نہ لے
سرایہ و محنت کا تعداد ان کے سماجی گیتوں کا مرکزی موضوع ہے۔
نہ ہندوؤں کی قریب ہی، اے ایانی اور شکر پروردی کو انھوں نے
شاعر کے دل سے محسوس کیا اور مصور کے مو قلم سے صفوہ قرطاس
پر اُتار ہے۔ ”کرشنک بنی“ ”جھگوان تو ان میں کوئی نہیں“ اور
”سواگت پتر“ میں وہ سماجی بے انصافیوں کے خلاف مہم و نت کرتے
ہوئے نظر آتے ہیں۔ ”دورگ مٹا“ میں وہ بھارت ان سے سوال کرتے ہیں
کیا کوئی ان ہی اویچہ بچے کے فرق سے کسی کو پوت اور کسی کو پوت سمجھ
کر جاتی ہے :

سوسن ری اور بھارت مانا، تو کیوں جتی کیوت
کو کہہ تیری اور متوار، ایک بات آئے چوت اچوت
جھل کھینٹ تو ہے لاج نہ آئی گھر گشت یہ دوزخی
گورے گورے گھر کر مینا، کالے کالے سب بھئی
داهے تیری مٹا مانا، دواہے تیری آربا ت
لاہو لاہو پکی پکی، لاہو دودھ دھیرا بھارت

ای کی سماجی حقیقت نگاری کا شاہکار دھوبی کا گیت ہے۔ اس میں
افراد کے دس اور خیال کی لطافت نے مل کر ایک پُرکین خنایت پیدا

کر دی ہے۔ اس کے ہلکے سروں میں محنت کش لوگوں کے لئے اظہارِ ان
کی معصومیت، فاقہ مست، بھرگوا دی اور کسکی دوسری کی عادت کو ایسے
پُر تاثیر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ با واسطہ طور پر اچھے محلوں والوں کی
لذت کو حق، عیش پسندی اور بوس پرستی سے نفرت ہونے لگتی ہے اور
دل میں محنت کی عظمت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے تین بندوں میں
دنگی سے متعلق ہیں ان میں سوامی کی فن کارانہ منظر کشی بھی ملاحظہ کیجئے۔

ہری لایا ہر ہی رام کیسا پیسا اور چھپ رام
رام بڑھو سے من کو تمام ہری تانے بڑھوے کام
چاند کو کھنڈ ہے ایک تھی بچے لے سنی، ہر کا نام
چھپو رام چھپو رام

باندھی لادی، لادابی دل دھوبی چلی ہوں بیل گھیل
کر من کھدی دھوبی کی تیل چلے نہ دیا، اپنی گھیل
پیت کرانے کیا کیا کام بچے سے سنی ہر کا نام
چھپو رام چھپو رام

چھٹی چھٹی کالی تریاں جگر گرا کاش تریاں
خندہ جلی کالی تریاں گیلے پڑے گوری بہاں
دوڑی ہے اپت کام بچے سے سنی ہر کا نام
چھپو رام چھپو رام

اگے چل کر جتن سنی سے عرش مٹی پر پڑے والوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔
اگر اگریستہ شکاری راجوں کے راجوں کی لانی
لاکھوں سیلے پدوں گیانی سب کی دیکھی اٹھی بانی
شہوہ کرے سو رام کا نام بچے سے سنی ہر کا نام
چھپو رام چھپو رام

مندر مندر مٹھے بجاری دھرم آشرم میں رام دھاری
دھرم دھرم پریم بھاری ایک ہی بھگت سب شکاری
من میں پاپ اور پرندہ رام بچے سے سنی ہر کا نام
چھپو رام چھپو رام

خاک اور جی کی سب سے نچی سطح پر پہنچنے والی دھوبی اپنی محنت
میں کسی کا پہلو تماشہ کرتے ہوئے کہتی ہے :

مومن موت چیل چیلے
 ہائے ترچے رنگ دیکھے
 اُجل کرنا اپنا نام
 چھوڑام چھوڑام
 منسل اور نادار کی اصل پوچی جنت، اخلاص اور اثباتِ حق میں کفایت
 پر بھی وہ اٹھ اٹھانے کو تیار نہیں :

ان گری کی سیکھ نہ لگو
 اپنی پلٹی پلک نہ دیکھو
 پریم کی پوچی بھی نہ دیکھو
 بت پوچھیں یہ کبھی نہ لگو
 سمن کے شوالے شیا شیا م
 بجے سے بھی ہر کا نام
 چھوڑام چھوڑام

سوامی کی نغمہ بندت فی عورت کی بے بسی اور گھر گشت کی بے رحم
 اور فرسودہ روایات پر بھی گم ہے اور اسے بھی انھوں نے اپنی سماجی
 حقیقت نگاری کا نشانہ بنایا ہے۔ مشرق کا خانقاہ میں بہو صبروں سے ساس
 کے آہ و غصہ کا شکار رہی ہے۔ ملاحظہ ہو، سوامی نے ہندوستانی سکا
 کے نہیں کیے شاعرانہ کمال سے بیان کئے ہیں :

ہر کاٹے بولنا کو اپنے گنج بھری ساسلیا موری
 ہنسٹی، جھری، بولنا جادو، گھٹ گھٹ میں چڑائی
 گورے چام چسکتی ناگن، بس، دھرمیں ہسرتی
 یورپ گرے، پیچھے برسے، چپال چلے، پروائی
 ات کے میٹھے بول میں ساسلیا پا چھے سے کڑواوی
 چمن لائے بولنا کو مورے گنج بھری ساسلیا موری
 پیر چھڑا، ناتے ٹوٹے، چھوٹے مورے بھاگ
 ساسلیا گھر سا بولیا چھوٹے، داگ پہ لاگو داگ
 آپ ہی چالو چھوٹے بوریس، آپ لگا دیں آگ
 چور سے کہہ دئی چوری کرے، ساہ سے کہہ دئی جاگ

دیکھئے یہو سینا کو مورے گنج بھری ساسلیا موری
 ہر کاٹے بولنا کو اپنے گنج بھری ساسلیا موری
 ایک اور گیت "تو کی ماری ایک دوانی" میں انھوں نے ساس
 کے علاوہ ہندو اور دوانی کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے :

گھونگھٹ پٹ کی لال لگائے، چارونا بچھے سامرے آئے
 نندل، برن بولتے بولے، دھردھر سائل دانت چیلے
 جیٹی نندیا بڑی درانی، کنسے لے لے دار چیلے
 آوے کا آدا ایسا بگڑا، کوڈنیری دھیر بندھاٹے
 سوامی نے کچھ دوسرے بھی لکھے ہیں۔ ان کا لطف، انھیں بلا ترم
 پڑھنے میں ہے،

پانی تینا بدھنا خانے، پری ہیں کہ چور
 آپ ہی دھیر گ لگاؤں، آپ چاوت شور
 مورکھ بیدار نائی لکھے، بننا پانچے پوختی
 ہر دے بیچ کوڈن چلے، ودیا سب کی قوختی
 نہیں روگ، جرن لاگو، ہر دے لاگی چھاس
 روٹ پلگتے پانچے دی، لال لال لاگی دھان
 پریم کا دیوا، پریم کی باقی، پریم کا لاگو نیل
 پریم کی انگی، پری چوٹے، پریم کا دیکھو نیل
 بھنور گھیری رین اندر جی، آس کی ہٹی ڈور
 دھیرے دھیرے آری تیریا، سنگ لگی ہے بھور
 ایدے باروسے مڑھٹے ہرے، اب تو مورکھ جاگ
 دیکھو تھکے کس بری لے، گھر میں دے دی گ
 گھونگھٹ اوٹ کروں میں کت لنگ کن کو یہوں قھام
 اک لنگ تو پریم تھانے، اک لنگ تھانے رام
 پنا پنا کی سمن ہوا، پیو پیو سو کی کوک
 اپنی اپنی انھی سے یہ اپنی اپنی ہوک

سوامی نے ہندی فنون کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا
 یہ قلم ہیچ این جی مادیہ سے مشتق نہایت دل چپ ہے،
 سوای ناوں بھار کے جنم یو داھا ڈوں
 رشیں کا بو دلش ہے مارہر ہے ناؤں
 واہی شنبہ استھان میں سودت شاہ برکات
 اُسی بروا کی ڈار ہم چیکے چیکے پات

غزل

اشکِ خوہنیں آنکھ سے ڈھلکا شاید دل کا ساغر چھلکا
شاہد رنگیں حسن سراپا جیسے مطلع میری غزل کا
اصل میں ڈاؤے جان بہارِ شہ پارہ ہے حسن ازل کا
رنگ چرایا ہے بادل نے تیرے نینوں نے جل کا
اُجلارُخ اور شعلہ عارض آگ میں جیسے پھول کنول کا
قوس قزح میں کچھ ملتا ہے چرب رنگ بھرے آئین کا
تھک کو دیکھے عرصہ بیتا نشہ ہے اب تک ہلا ہلا
زیت ہے کانٹوں کا تنگی فرش نہیں ہے پھینل کا،
جو پتھر سے گھبراتا ہو خواب زد کیے شیش محل کا
آج کے غم سے جب نہیں فرت کون کرے غم گزرے کل کا
حسن قسمت کہتے جس کو نام ہے اپنے ذوقِ عمل کا
نورِ سرور پوش تھا جس میں چھٹے لگا ہے اب وہ دھندلا
مشرقتِ اردو مجموعہ ہے اب زمزم و گنگا جل کا

اس میں ہر شے ملتی ہے منشاہ

کتنا کھلا دامن ہے غزل کا

غرض فکر ہو، دوام ہو، گیت ہو، سواہی ماہروی نے جس صفت میں بھی
کلم اٹھایا، اس کا حق ادا کر دیا۔ جدید و قدیم گیت کی باقیات کا سہرا
مخلت اللہ خان کے سر ہے، لیکن اردو میں گیت کی روایت اتنی ہی
قدیم ہے، جتنا امیر خسرو، خواجہ بہاء الدین اور سید بہکٹ اللہ بختی
بلکائی کا کلام۔ سرزمینِ بلگرام سے ایک سے ایک بڑھ کر ہندی شاعر
اٹھا ہے۔ اور سواہی ماہروی بھی علم و ادب کے اسی قدیم سرچشمے سے
فیضِ آبِ ہوتے تھے۔ ہمارے دیکھے ہی دیکھتے اردو شاعری کی دنیا
میں کیے کیے انقلاب آئے اور قزح کے نام پر کیا کیا جھوٹیں بچائی
گئیں۔ لیکن سواہی ماہروی نے ان آندھیوں میں بھی اپنے بچے بچے نگر کو
براہِ روش رکھا اور نہایت خاموشی، یکسوئی اور دل سوڑی سے
گیت لکھتے رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اپنے ذہن کے
دریچوں کو کھولا ہی نہیں۔ ان کے کلام میں جدید نظریوں کی جھلک بھی
جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی بھی تحریک یا نظریہ ان کے قدم اکھڑا سکا۔ انھوں
نے اپنی شاعری کی بنیاد روایت پر رکھی ہے۔ ان کے گیتوں میں شائستگی
کی پر اسرار اور راہیت، چاندنی کے سائے، پریم رس کی چھوٹ اور
برہم کی پکار سچی کھلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے حال
کی چھپ چھپائی اور مستقبل کے تھانوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں
نے غزلیوں سے رکھ درد بانٹا، سماج کے ناسوروں پر نالی رکھی اور
محنت کش عوام کے دل کی دھڑکنوں کو گیتوں کی زبان بولی۔ سواہی
کے گیت اردو شاعری کا مزینہ و درخشاں ہیں۔ اور جب تک اردو میں
گیت کی اہمیت محسوس کی جاتی رہے گی، سواہی ماہروی کے گیتوں
کی ہرک سے شہنام جان مسرور رہیں گے۔

مضمون نگار حضرات سے التماس

از راہِ کرم کاغذ کے ایک طرف اور خوشحال لکھنے

پہلے کام

رنگین سحر اور حسیں شام کا منظر اسپان سبک سیر و سبک کام کا منظر

خاموش مکافوں کے درو بام کا منظر بھڑی ہوئی اک گردش آیتام کا منظر

سرمایہ تکیں ہے پہلے کام کا منظر

یہ وادی لہر ہے کہ اک شاہد رنگیں اک قصہ صد ناز اک افسانہ تکیں

رہے نہیں دیتا غم دنیا و غم دیں اس لہجہ گل پوش و گل اندام کا منظر

سرمایہ تکیں ہے پہلے کام کا منظر

لہر ہے کہ مردنگ ہے فطرت کی پری کا کیا نغمہ خوش آہنگ ہے فطرت کی پری کا

جلوہ ہے کہ تیرنگ ہے فطرت کی پری کا گرد اس کے ہے دیوان سیہ قام کا منظر

سرمایہ تکیں ہے پہلے کام کا منظر

دنیا سے الگ شام و سحر دیکھ رہے ہیں اس جن کو ادبِ نغز دیکھ رہے ہیں

ہر گوشہٴ عالم کے بشر دیکھ رہے ہیں تیا حوں کی اس رگِ زہرِ عام کا منظر

سرمایہٴ تسکین ہے پہلا گام کا منظر

اک سمت میں خیمے ہیں اک سمت میں اشجار ہے بیچ میں لہر طرب افزا و طرب کار

اک شاعر دیوانہ ہے مسرت سے اشعار یا مے کدہٴ حافظ و خیام کا منظر

سرمایہٴ تسکین ہے پہلا گام کا منظر

سیڑھی سی ہواؤں میں وہ جھروں کی چھا چھم بالائے سبر کوہ وہ اشجار کے پر پرچم

اک نقطہ پہ ملتے ہوئے دو سلسلے یا ہم آغاز سے بھی خوب ہے انجام کا منظر

سرمایہٴ تسکین ہے پہلا گام کا منظر

دل میں تھا مرے ہمہ جذب و اثر جیب مر طلع و مہ پارہ مٹی اک پیش نظر جیب

پل پر تھا کھڑا عرش میں با دیدہ تر جیب بھولے گا تہرگز مجھے اس شام کا منظر

سرمایہٴ تسکین ہے پہلا گام کا منظر

غالب کے شریک غالب

کر بیٹھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں کسی بارود کے ذرائع کے قریب دیا سلائی جلائے کی کوشش کر رہا ہوں؟ پھر کیا تھا۔ آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں "یہ" کہ مابر غالبیت چھٹ ہی تو پڑے مجھ پر! اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے جن غالبیات کی ایسی ایسی تو پڑیں اور آتش فشاں کے دالے کھول دے کہ میں سراسیمہ، بہوت اور ششدر ہو کر ہمیشہ کے لئے ہند کر بیٹھا کر آئینہ کسی انجینیئرنگ کے سامنے حضرت غالب کا نام اپنی زبان نے لگام سے ہرگز ہرگز نکلنے نہ دیں گا۔ دوسرے ہی دن سے مابر غالبیت نے "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں" کے عنوان سے میری باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ سویرے میں بستر پر ہوتا کہ وہ "لذت خواب سحر" پر دھاوا بولے آپ بچے اور پہلے غالب کے کچھ انتہائی سنگلاخ اشاریہ پڑھ کر ان کے معنی سمجھ سے پوچھتے گویا میرا آؤ نہ سنتے اور پھر قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکال پاؤں وہ "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں" فرما کر ان کے معنی اور مطالب خود بیان کرنا شروع کر دیتے اور پھر اپنی "کل افشاں گفتار" سے جرت افزائی، حسن تخیل، لطف بیان، شکوہ و نا بلندی روازی، ندرت کلام، بلکہ چاش کو پاش اور رانی کو پھاڑ بیٹانے کے ایسے ایسے عمل کرتے کہ میرے لئے "ماعتہ و شملہ و سیاب" کا عالم ہوجاتا اور وہ خود اس شریک مجسم تفسیر پر گرہ جاتے کہ آہی دلم شیدیں جس قدر چاہے پھلے مدعا حق ہے اپنے عالم تفسیر کا

ادھر کئی ہینڈوں سے مکان کی تلاش میں شریک بہت سے تعاون اور گوشوں کی خاک چھانے اور کئی محلوں کی آپ دہوا کو نوٹے کے طور پر چکھنے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ جس طرح ہرگی کے لئے کم سے کم ایک کم قول نہیاری، ایک گھر کا شیرکت، ایک لڑکا ساس، ایک پڑیاں بہو، ایک نصیحت کرنے والے بزرگ، ایک فیضوت پی جانے والا رند، اور حجاج ضروری سے فارغ ہوتے ہوئے بہت سے بچوں کا ہونا لازمی ہے اسی طرح کسی نہ کسی جیس میں ایک مابر غالبیت کا ہونا بھی لازمی ہوتا ہے اور بغیر اس کے گرد و پیش کا جھنڈا فیر کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔

اتجھا بھلا ایک مکان مل گیا تھا لیکن ابھی اس میں منعقد اس پٹیل کی میرا بیٹا بائیس بھی ٹھیک سے کھلے نہ پایا تھا کہ مابر غالبیت نے نہیں معلوم کیسے سو گھنٹہ لیا کہ میں سنی ہم نہ ہی غالب کا طرہ دار فرد ہوں اور مجھے اپنی "غایا دگر گفت" میں ایک "میدرہ بوں کی طرح جکودیا۔ آستہمی آتے انھوں نے غالب کے متعلق دو چار حیرت انگیز انکشافات کے بعد مجھے چھانے کے لئے ایک آدھ ہلکا پھلکا سوال کر دیا۔ اب میری حافقت ملاحظہ ہو۔۔۔ کہ دل ہی دل میں ایسے آپ کو بہت بڑا غالب فہم سمجھتا۔۔۔ میں نے ان کو نرم چارہ سمجھ کر ان پر دو چار صفحہ مادہ نہ پایاں سمجھ لیئے ان کی دم پر پریرکہ دیا لیکن ان کے سامنے غالب کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کی سعی لاحسن

اور پھر نسبت میان تک پہنچ کر ہیں، اڑھی بنا رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفہ صحن سمجھا رہے ہیں۔ میں گنگھا کر رہا ہوں اور وہ آرائشِ حال سے فارغ نہیں ہونے، میں مسئلہ ارتقا کو پروں پر چڑھ دیکھ رہے ہیں۔ میں کپڑے بدل رہا ہوں اور وہ ہولی بڑی خرما کا ہے خوب گرم دھنوں کا، پڑھ پڑھ کر اور گاہے رگاہے انقلابِ زندہ باد کا فرقہ لگا لگا کر غالب کو ہنسنے شان کا سب سے پہلا انقلابی ثابت کر رہے ہیں۔ میں جوتے کی ڈوریاں بانڈ رہا ہوں اور وہ 'بینی' کے اور ستارے اب آسمان کے لئے، 'والے مصارع' سے فضائے آسمانی پر اسپیشک چھوڑ رہے ہیں۔ میں ناشتہ کر رہا ہوں اور وہ 'تے ہے ہے یگیس' کی تے نہیں ہے، "مہراؤ ہرا کر غالب کے علم الغزایہ پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں کہ میرے منہ کا ٹوڑا ملحق بن جانے سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ میں دفر بن جانے کے لئے سائیکل نکال رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفہ مہراثیات بیان کر رہے ہیں۔ میں سائیکل پر بیٹھ چکا ہوں اور وہ شام کو دفر سے میری دہلی پر غالب اور غیبی قوید کے موضوع پر اپنے تازہ ترین اہلانات کو کچھ پیرنازل کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

شام کو کھنور بڈ رہتے تو غالب اور وہ سرے شہر اور کاموازدن شروع فرما دیتے، اور غالب کے منہ ٹھکے دالے دیگر قسم شہر اور گردن زدنی قرار دے کر بھی جیت جیتی نہ ہوتی تو غالب کے مختلف شاعرین کا پہلے بکس چکر کشتی شروع کر دیتے اور کافی دھڑلے کے بعد جب ہر شاعر کا کافی پست ہو جاتا تو خود بھی اکھاڑتے ہیں کوڈ پڑتے اور فردا فردا ہر شاعر کو پچھا ڈالتے اور پھر ہر شاعر کے متعلق اپنے ایک انوکھی، اچھوتی اور عجیب و غریب ذکر کا شرح کا آغاز کر دیتے جس کا انجام غالباً اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میں اپنے ہوش و حواس کی قید و بند سے نجات پا کر دہاں نہ پہنچ جاتا جہاں سے خود کچھ کو میری خبر نہ آتی، یعنی بالکل ہی بے سدھ ہو کر اپنے بسز پر گر نہ جاتا۔

میں اکثر خواب میں دیکھتا کہ حضرت غالب اپنا دیوان لٹل میں دبا لے جے تماشہ پھینچتے، سوئے جھاگ رہے ہیں، "بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ"

مجھے میرے شاعرین اور ماہرین سے بچاؤ، "اور ان کے جیسے شاعرین، ماہرین اور پرستاروں کا ایک غولی بیا باقی ان کا تعاقب کر رہا ہے جس کی قیادت ایک ڈنڈا لے میرے کھلے ماہر قابلیت کر رہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی ایک زنجیر میں بانڈ کر گھسیٹ رہے ہیں۔

کئی دفعہ کھٹک برطرف کر کے ان کی منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، دانٹیں بھی لگا دیا، کان پکڑا کھٹا جھٹکیا اور حرفِ مطلب یوں زبان پر لایا کہ اسے ماہر قابلیت آپ کو آپ کے حضرت غالب مبارک! مجھ مغلوب کو میرے ہی حال پر چھوڑ دیجئے تو آپ کی قابلیت میں کون سا بڑا لگ جائے گا؟ میں ایک گوانے بے قوا ہوں، احمق، جاہل اور بچپنا ہوں۔ میرے ایسے ذوقِ ناچیز کو غالب ایسے آفتابِ عالم تاب سے کیا نسبت؟ میں حضرت غالب کا حرفت اس قدر گنگھا رہوں کہ عالم طفولیت میں ایک مولوی صاحب نے اسکول میں کورس کی کتاب سے ان کی چند غزلیں زبردستی پڑھا دی تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے قسم لے لیجئے جو میں نے کبھی انھیں ہاتھ بھی لگایا ہو اور ہاتھ لگا تا بھی خاک۔

ہاتھ آئیں تو ہاتھ ٹکٹے رہتے، غالب کو میں کیا میری سات پیشین بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ میں نہ انھیں سمجھا ہوں نہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ آپ بے کار میرے ہوش و حواس پر چاند ماری گویا بغیر زمین میں تھر زریزی اور آبیاری کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا یا میرے بیوی اور بچے آپ کو اور مرزا غالب کو کوستے پھریں گے۔

لیکن ماہر قابلیت جھلاکب مانے والے تھے؟ میرے اہلکار بے جا رہے ہیں ان کی ہمدانی میں اور بھی چار چاند لگ جاتے اور فز و تمکنت سے ان کے گنگے کی رنگیں پیلے سے بھی زیادہ چولنے لگتیں، ہو گا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے؟ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو نہ باں اور! آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں! اسے دلینا وہ رنر شاہ یاد! "اور یہ فرمائے کے بعد وہ غالب کے متعلق اپنی تحقیق اور دریافت کی گولہ باری پھر

کچھ اور تیز کر دیتے مجھے بھی اگر اذگھٹنا یا اس با عتہ دیکھتے تو چوکتا کرتے کئے گئے۔ مجھے پر دو چار آہٹاؤں نے زبردست سوالات داغ دیے۔
 "غالب کے نظریہ طبلیات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کے ماتحت 'مرغختب' کے ساتھ 'دست قضا' لے کیا بنتا کیا تھا؟"
 "غالب نے قدرتی مناظر سے جو نوعیت کی روشنی فیاں کی ہیں اس سے ان کے تحت استوری کسی بلندی کا پتہ چلتا ہے؟" "غالب کے سابی شعروں میں سیاسی اور اقتصادی جو طبیعت کب اور کیسے پیدا ہوئی؟"
 "غیرہ وغیرہ۔ میں بھلا ان سوالات کا جواب کیا دیتا؟ میں مجبوراً باہر غالبیات کی گمانیجہ طبیعت کے لئے انہیں بھانڈ کر منہ کھول دیتا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں اپنے حیرت زدہ ہونے کا پورا پورا یقینی دلا دیتا لیکن دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر میں اپنی سماجی طبیعت کو کام میں لاتے ہوئے اپنا ذوقی طہان باہر غالبیات کے تحت استور پر پوری قوت سے پیش کر دوں تو یقیناً ان پر فطلیات کے بہت سے طبق دوست سختی ہو جائیں گے۔

بس کیا عرض کیا جائے کہ کس طرح عاجز اور پریشان کرکھا تھا ان باہر غالبیات نے؟ ان سے جان پھڑانے کے لئے 'بسیوں ترکیبیں' کیں۔ مجھے کہ اکثر لوگوں کا داؤد ملایا۔ گننام خلوت کھئے۔ ایک انیسویں پولیس سے ان کے خلاف کوئی فرضی مقدمہ چلانے کی فراہمی کی، بیماری کا ڈھونگ بنایا۔ ہرے پتے 'تو اسقامت دونا ہو گیا' دوستوں کے گھر جا کر پناہ لی، گھر کے دروازے بند کرائے۔ نوکر کو ہدایت کی کہ "ہر چند کہیں کہے نہیں ہے!" لیکن ابی تو یہ مجھے —
 اہل تدبیر کی دامادوں کی! باہر غالبیات مجھے نہایت تو گھٹنوں غالب کا کوئی شہر اور اس سے متعلق ایک نئی داستان پریش رہا اپنے اوپر غاری کے ہوئے میرے دروازے کے سامنے گلی میں بٹھلا کرتے اور جب تک مجھے گھر جاتے یا گھر سے نکلے تو غدار کے مجھ پر یہ شہر صادق نہ کر دیتے دم ہی نہ لیتے۔

بھاگتے تھے ہم بہت سواسی کی سزا ہے یہ ہو کر ابیر دایتے ہیں ماہزل کے پاؤں ان حالات میں اسے چاہے میری بدزدنی مجھے بچا ہے

اقدام قتل سے گریز۔ کہ جیسے ہی مجھے ایک دوسرا مکان ملا جو اگرچہ میرے پہلے مکان کا صرف نصف بہتر معلوم ہوتا میں رسیاں تڑا کر بھاگا۔ باہر غالبیات سے میں نے کبھی کیا نہیں شہر کیا صوبہ جھڑ رہا ہوں اور وہ مجھے ابیدہ ہو کر خدمت کرنے آئے تو بڑے وقت انگریز بھی میں فرمایا "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں۔" اور انگریز میں "مشرم تم کو گرتی نہیں آتی" نہ چیتا اور غلطی سے تانگے والا اس کا مخالف اپنے آپ کو سمجھ کر ڈرنا تاکر نامک نہ دیتا تو یقیناً باہر غالبیات مجھے ایک فی البدیہہ الوداعی خطاب دے کر بزرگ نہ مانتے!
 اپنے ان جان لیوا باہر غالبیات سے جھینکارا پاکر مجھے جو مسرت ہے بایاں حاصل ہوئی اس کا انہماک غالباً غیر ضروری ہے ع مرثدہ اسے مرغ کر گزرا میں عتیاد نہیں

مکان تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنا ایک مکان سے آہٹاؤں بدحواسی اور سرسراہٹ کی سے باز تھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے لوٹ کر لائے ہوئے مالی غنیمت کا لطف آ جاتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ نا لطف سر بڑیاں ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرا وہ اٹھیند جس کو میں نے یقیناً کسی بہت معمولی جگہ پر ہی اعتقاد سے چھپا دیا تھا کہ سمندر ہے اور وہ قوت مزدورت کام آئے۔ ان تھک تاش اڈو جس کو کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتا ہے لیکن نگار کا وہ جوتا جس کے متعلق یقیناً کامل تھا کہ وہ دھینچے ہوئے کھوپچا ہے، چنانچہ اس کے جوڑی دیا کو میں نے چلنے چلائے باہر غالبیات کے مکان کی طرف اچھال دیا تھا، ایک ڈبے سے بے ساختہ نکل پڑتا ہے۔ میں اپنے سامان سے کشتی اڑا کر اس قسم کے حوادث سے دوچار تھا کہ دفعتاً کسی نے ہاکرو دوازہ جڑ جڑا کر شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت پر پوچھے تو ملک الموت سے ملنے کی فرصت نہ تھی لیکن طوعاً کو دلا لاول پڑتا ہوا پکا اور دوازہ کھول دیا۔

داڑھی بڑھانے اور دفعتاً بنیاٹن اور تہہ پہنے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے "سلام علیکم" کہتے ہوئے بیٹھکے

میں داخل ہو کر ایک نرسی گیسٹری اور اس پر کنبوں بیٹھ گئے اور
کچھ جھوم کر یہ شریطہ حاحہ
”ہم بیکاریں اور کھلے یوں کون جانے؟“
یار دار و ازادہ یا بین نگر کھلا! “
مجھے مجبوراً ”و علیکم السلام“ بھر کر ایک توتڑے پر پینا
یعنی پڑی۔

”اس مکان کے نئے کرائے دار آپ ہی ہیں؟ ع
کوئی دیرانی سی دیرانی ہے؟ مطلب یہ کہ ”ع“ کو اسے دیکھوں پسند کرے گا
مکان ہے!“

مرزا غالب کا تاثر تو کلام سننے کے بعد غصے یا مستقبل کے
خوف سے میرے کان خود بخود ہلنے لگے اور بڑی شکل سے میرے
منہ سے فقط ایچ ”ی“ نکل سکی۔

اچھی اچھی مرزا کیس صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف
لائے سے قبل آپ دہلی میں رہتے تھے ع

”کیوں نہ دہلی میں ہر اک ناچیز کو اپنی نگرے“
”جی ہاں دو تین ماہ دہلی بھی رہا ہوں۔ کیا میرے خلاف
خفیہ پولیس کی کوئی تحقیقات آپ کے سپرد ہوئی ہے؟“
سکرا کر میچ آٹھے۔

”ہے ہے خدا خواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منغل یہ تجھے کیا خیال ہے“
میں نے ہمت کر کے دہلی زبان سے عرض کیا۔ ”آپ نے
ابھی تک مجھے خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کا شرف
نہیں بخشا۔“

اسنے سر کے بال تو پچھے ہٹے ہوئے۔
”پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی ستلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟“
اب میری بدعنوانی مٹتی ہو چکی تھی۔ ”جی۔ آپ؟“
”جی ہاں حضرت غالب! ع ہم پیشہ وہم شریطہ ہم باز ہے میرا
میں اس وقت صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا تھا کہ آپ دہلی میں رہے

ہیں تو شہنشاہ و اعلیٰ معنی حضرت غالب سے کو مزید ہی واقف
ہوں گے۔“

مجھے جبر جبری سی محسوس ہونے لگی اور میں نے بڑی بے اعتنائی
سے جواب دیا۔ ”جی ہاں سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار
دہلی ہی میں ہے۔“

اپنا سر پٹیتے ہوئے بولے ”معاف کیجئے گا آپ نے بے ادبی
کی حد کر دی! سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے
ع جوہ دہلی کے سوا اگر دہلی کے مزار میں نہیں۔ ایسی آپ کو یہ کو فتن
نہیں ہوئی کہ آپ اس بار کا وہ ملک منزلت پر ع

رتبہ میں ہر وہاں سے کم تر نہیں ہوں ہیں۔ سر عقیدت غم کر کے کہے
کہ شرف قدم ہو تو حاصل کر لیتے۔ وہی شش بارہ برس دہلی میں رہے
اور ع سر جلتے بارہ برس نہ رہیں پر بے بغیر بھاڑی بھونکتے رہے۔“
میں نے بھی کچھ اس بھلاہٹ سے جواب دیا جیسے اگر میرا بس
چلتا تو غالب کو ان کی خواہش کے مطابق ”ع“ دیا، ہو جائے دیتا
اور کچھ نہیں تو دہلی میں ان کا مزار ہرگز بننے نہ دیتا۔ ”میں مزار
پر حاضر بھی ہوتا تو مرحوم کو قبر کے اندر رکھنے نہ کہ اوپر، میں شرف
قدم دوسری کیسے حاصل کر پاتا؟“

کچھ کچھ کے بولے ”ہے ہے! ع رکھتا ہے مزار پر کرنا ہرگز پائے
ابھی آپ کو کیا خبر ہے

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت کا وہ لفظاں ہے
نثر اور سنگے تربیت پر میری گل فشائی کی!“
میں خاموش رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہونے
”کم سے کم ازار اور قزیت آپ کو مرحوم کے بیوی بچوں کے پاس تو
چلا ہی جانا چاہئے قح۔ بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشائی کوئی دن اور۔“
”اب کسی روز آپ کو ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔“

میرے جواب کو شتان اسکر کے اچانک ہر بڑھے اور میری
کتابوں کے گھر پر جو امی میز پر بڑی بے ترتیبی سے دکھا ہوا تھا
پھینکے اور سب سے اوپر کی کتاب ہوا ثقافت سے دیوانا غالب تھی
اٹھا کر ”جو بخش بہا رجوہ“ بننے ہوئے بولے ”یہ عہد آپ کو کہاں سے

سے دستیاب ہوا، ع یا دیکار نالاک دیوانی بے خیر زادہ تھا۔
مرت کے بعد آج ایک مسلم دیوانی غالب لکھ آیا ہے جو کسی طرح بھی
مجھے مرغ مسلم سے کم عزیز نہیں ع
بکھتے ہیں کہ غالب کا بے امانہ بیباں اور
”بازار سے“

”بازار سے“ ع اور بازار سے آئے اگر ٹوٹ گیا!
کیا بازیاں ہیں اس قسم کا بھی کلام کہتا ہے و خدا جھوٹ نہ بولائے تو
سترہ اتحادہ سال ہوئے میرے پاس بھی ایک مسلم دیوانی غالب
تھا جو میرے ایک رشتے کے نانا میرے گھر پر بھول گئے تھے ع
کبھی فزاک میں تیرے کوئی چیز بھی تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک رو
برخوردار جس کی دالہ جو آگ جلائے بیٹھی ع
کہ لگائے رنگے اور بچائے نہ تھے۔ تو اس صبیحہ زریں کو کچھ اس طرح
پھاڑا کہ اس ع دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی۔ ”یہ دیوان
کا قریب قریب ہر مصرع ادنیٰ اپنے مصرع ثانی سے جدا ہو گیا۔
وہ دیکھے کہ بروقت میری نظر پڑ گئی در نہ ع
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ کامنوں درپیش آجاتا۔
کیوں صاحب یہ لفظ خوش قسمتی پر آپ چونکے کیوں؟ جی ہاں
ع اس میں کچھ مشابہ خفی تغذیر بھی تھا۔“

میں نے اپنا پیٹ پڑھتے اور منہ ہلکتے ہوئے عرض کیا
”اس وقت پیٹ میں کچھ درد ہو رہا ہے۔ اگر یہ گھٹکواپ کی دوسر
وقت کے لئے ملتوی کر دیں۔۔۔۔۔“

نادر شاہی حکم دیا ع
”درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بڑا نہ ہوا
جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اب جو دالہ عزمہ مطلب یہ کہ جس
کی دالہ عزمہ من ادراک پریشان کی جو کسی عاشق کا گریساں ہو
چکے تھے جو نے بیٹیں تو ان کو کچھ ایسا جوڑ دیا کہ جن غالبیات
میں ایک نئے درد کا آغاز ملکہ اٹھا ہو گیا اور جس پر ناجیز اپنی
عجز عز کے بارہ سال مرث کر چکا ہے اور اب بہت جلد دیوانی کا
حب ترتیب پانچ منظر عام پر جلوہ افروز ہو کر مشافاتی غالب اور

قدشنا سا بی باق کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش بننے والا
ہے۔ محض معرونی بخوڑی سی الٹ پیٹ سے کلام کی لافست،
ظرافت اور صداقت نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔
اور قتیاب مرزا غالب کو فرمانے کا ع
نہی گھر سے اشتیاد میں نہی — کوئی حق باقی نہیں رہتا
ہے۔ کائن کہ وہ خدا اس کو دیکھے۔ تو عش عش کر کے کب انہوں ملے
کہائے خود مجھے یہ کیوں نہ سوجھی اور بلا اہاد پانچ میں نے یہ
پہیلی کیوں بولی۔“

سلسلہ کلام یک فرد کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ”نوسلے
کے طور پر چند اشتیاد لکھ ہوں۔ دیکھئے کس طرح دریا کو کونٹ میں
بند کر دیا ہے؟ ایک روز مجوز اسکو سے روتا ہوا نوا تو اس نے
اپنے کار حین مرزا غالب سے شکایت کی کہ اس کو ماسٹر نے بے قعود
مارا ہے۔ مرزا غالب کا افراسیابی خون جوش میں آگیا اور وہ
ماسٹر کے پرزے اڑنے“ اسکو پہنچے تو میں موقع دانا داسچہ
شاعر مل گیا اور وہ انھیں سمجھا تا ہے کہ ماسٹر نے برخوردار مجبور کو جو
سزا دی وہ بالکل حق بجانب تھی کیوں کہ یہ جاز داسے کوٹنے سے
اسکو کی دیوار خراب کرتے ہوئے پھٹے گئے تھے ع

نوا نام سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
کہ مجبور نام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر
زرا خدا لگتی کچھ کا کہ اب شری اخلاقی حیثیت کہاں سے کہاں پہنچ
گئی ہے و عاشق کی عزت نفس کے مستحق غالب نے بہت سے اختا
ہے ہیں لیکن خدا اس شکر کے طور فرمائیے۔ ایک دفتر میں کلرک
ہو جانے کے بعد عاشق کے بھے میں کسی خود اعتمادی آجاتی ہے و

دائم پڑا ہوا ترسے در پر نہیں ہوں میں
وہ دن گئے کہ بکھتے تھے تو گھر نہیں ہمیں میں
کون کہتا ہے کہ مرزا صاحب نا عاقبت انڈیش تھے۔ دیکھئے اس طرح
اپنے چھوٹے بھائی اسد کو مشورہ دینے کے بہانے نصیحت کرتے ہیں
سے تو توں سوچتے ہیں اس کے پاؤں کا بوسہ کر
فارہ کیا سوچ آخرو تو بھی دانا ہے اسد

اور غالباً آپ کے عناق کا شعر ہو۔ ذرا مصروف کی جلد بازی تو
ملاحظہ فرمائیے۔

ذلت سے بڑھ کر نقاب اس شوق کے صف پر کھلا
جتنے عرصے میں مرا پشما ہوا۔ ستر کھلا
اور مصروف کی تیز رفتاری تو غالباً اس سے بہتر کبھی بیان ہی
نہیں کی جاسکتی

تھکان سے وہ جرت مر مر کھلا
کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا
اور غالباً یہ شعر تو داد سے مستثنیٰ ہے۔ ساقی اس سے بڑھ کر
مرزا صاحب بہ اور احسان ہی کیا کر سکتا تھا۔

میں اور خلیل و محل خدا ساز یات ہے
ساقی نے کچھ طمان ویا ہو شراب میں

اور پھر مصروف کے بڑھاپے کی جب وہ کئی پتھوں کی ماں بن کر بیٹے
شوہر یعنی غالب کے پرائے رقیب کے ساتھ 'سب غیریت ہے'
قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے کیا خوب تعبیر کچھ کر رکھ دی ہے۔
یہی ہے ہم کو کبھی 'سیکس اب اس میں دم کیا ہے'
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کب ہے

دیکھیے 'عظم ہے گردن دو سمن کی داد! یہ سب معرے حضرت غالب
ہی کے ہیں اور میں نے ان میں کسی قسم کی کوئی قریب نہیں کی ہے
مرث ذرا چابک دستی سے ان کی ترتیب میں تھوڑی سی المٹ پلٹ
کر دی ہے"

میں فقیر جرت بنائے سب میں رہا تھا لیکن نہیں معلوم میرے
ہاتھوں میں ایک خاموش قسم کی تشبیہ کیفیت کیوں پھرا ہو رہی تھی۔
بالغ صاحب کی درانی بلے کچھ اور تیز ہو چلی۔ دیکھئے
مرزا صاحب مصروف کو پہلا ہیبلا کر اسے چھب چھب کر لٹنے کے

کیسے کیسے مقامات بتاتے ہیں ہر گرج باران ویدہ تھے کہ نہیں! ح
بھوکو بھی پوچھتے رہو تو کیا کنا رہو
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اور یہ شعر تو حامل دیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے شعر میں پیر
میں اس کے تفصیلات زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔
غیر سے رات کیا ہی یہ جو کسا تو دیکھئے
موج محیط اب میں مار سے ہے دست دیا کیوں

اس کے بعد کیا ہوا؟ تفصیلات برطرف ایک تھمداد
ایک بنیائیں کی کچھ دو جہان میرے صفے میں آئیں اور میرا پرانا
رفیق دیوان غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔

فی الحال میں اسپتال میں ہوں اور بیوی بچے مٹولی ہیں۔ الاٹ
افسر کو درخواست دے رکھی ہے کہ مجھے کوئی ایسا مکان
الاٹ کیجئے جس میں چاہے روشن دان، تابان بلکہ چھتیں او
دیوادیں تنگ نہ ہوں لیکن اس سے ایک میل کے قطر میں کوئی
ماہر غائبیات نہ پایا جاتا ہو۔ ابھی تک تو ایسا کوئی مکان انہیں پایا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب اب بھی میرا محبوب ترین شاعر ہے
بلکہ ماہرین اور شاعرین کے ہاتھوں اس کی درگت نیچے دیکھ کر
وہ مجھے پیٹنے سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ عبداللہ
میں نے دیوان غالب کا ایک نسخہ خرید لیا ہے اور غسل خانے
میں جب بھی پانی ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو میں

اس کے اور صرف اس کے اشعار گنگنا کر کرتا ہوں اور اکثر
اس کی مظلومیت کا تصور کر کے یہ مصرع بھی پڑھ لیتا
ہوں ع

شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے

لمحہ کی شکست

آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ اور پھر اس آئینے نے بہت سے عکس دکھائے۔
گرمیوں کی ایک فوسٹ گوارش کم کو جب وہ دو ذوق طرت پنکھے
لگے ہوئے کے باوجود پسینہ سے شرابور ہو رہی تھیں، بیاہ دی گئی تھیں
شوہر خوش اخلاق منکسر المزاج، خاصا صمیم اور رئیس۔ بس ایک
بات ذرا ایسی دلی تھی۔ لیکن اس سے تو وہ پہلے سے ہی واقف تھیں
اور خود انہوں نے بھی پہلی ہی ملاقات میں شاید گفتگو کا آغاز اس
طرح کیا تھا۔

”بیگم اتنا بڑا فی ودق مکان ہے اسے دیکھنے والا بھی کوئی
نہیں، خدا کا دیا گھر میں سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں۔ بس میں
مقروض ہوں اور یہ قرض آپ ہی پورا کر سکتے ہیں۔“
اور وہ خاموش رہی تھی۔

”بولے اس قرض کی ادائیگی میں آپ میری مدد کیجئے گا نا؟“
اب کے بھی شوکت بیگم کے منہ سے جو اس وقت ’شکوہ لہلہا‘
تھیں ایک نھنڈ چھوٹا تھا۔

”بولے نا۔ کیا میں سمجھوں کہ آپ کو میری باتوں سے کوئی
دل چپی نہیں۔“

وہ بڑی شکل سے دل کی تھیں ”بھ کیوں نہیں۔“

”تو پھر بتائیے کہ آپ اس مسئلے میں میری مدد کریں گی؟“

”آپ اور مقروض۔؟“

”جی ہاں بیگم میں مقروض ہوں۔ سہرہ منہ جاتے جاتے

شوکت بیگم نے صوبہ کی نسا نہ پڑھ کر اپنی عجیبی مہترا اور
جھاغیے تسلیم کو بلا کر چھوٹک ڈالی اور بیٹی نکاح رخصت کو ہوں کر کے
اشارہ کیا تو نگارین جو ابھی ابھی نسا نہ پڑھ کر کچھ پیچھے سہری پرانے
بیٹی تھی انکار کر کے پاس آئی۔ انہوں نے اس کے دودھ سے دھوئے
سفید چہرہ کو ایک نظر دیکھا اور اپنے دودھ مانتے اس کے سر کی طرت پڑھا
دئے۔ ان کی انگلیوں نے پہلے اس کی کشیاں چھوئیں، پھر کان، پھر آنکھیں
اور پھر منہ کے دبانے کے۔ بیچ، پیچ، ہانگ کی سیدھیں اکراؤں کے دودھوں
ماتھل کر رک گئے۔ انہوں نے اسی طرح اس کے چہرہ پر چھوٹک ڈالی اور
پھر ان کے ساتھ دھیرے دھیرے واپس لوٹ گئے۔ کینٹیوں کے قریب
پہنچ کر دونوں انہوں نے اس کے چہرہ کو منبوسھی سے تمام لیا۔ لوگ
ٹیکس می کو دیکھتے تھے کہ ان میں کیا ہوتی ہوئی ہیں۔ وہی
سیدھی ستھان، ہانگ، چھوٹا سا ڈانڈا، ایسا کریمے کی بولی ہی نہ چھوٹے
ہوں، ذرا غصہ تین مال ہو جائے والی ہوں، گوارنگ، حق ضرورت
آنکھیں اور کسادہ پیشانی۔ ان آنکھوں نے یہ سب کچھ ایک ہی بار
دیکھ لیا اور پھر ان کی آنکھیں پت پت بینائی پر ہانگ کے قریب آئے ہانگ
تھیں۔ اے اندھا پس مشا بہت بھی کیا، نگارین بھی اپنی ماں کی طرح بالکل
سیدھی ہانگ نہ نکال پاتی۔ بیچ بیچ مشہور تھا کہ کنگھی کتنی ہی دبانے
کیوں دلی جائے ہانگ ذرا سی ٹیڑھی ہو جاتی۔

شوکت بیگم نے اسی طرح چہرہ انھیں تھا سے تھا سے ایک ہار
پھرنی کی طرت دیکھا۔ انھیں ایسا لگے جیسے پچیس پچیس سال ادھر

دمیت کی تھی، دھیتے گیا مجھ سے دھو راستی کی تھی کہ میں فرزند کو اس بات کا بھی احساس ہی نہ ہونے دوں گا کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مرحومہ کی اس خواہش کی تکمیل میرے اوپر فرض ہے اور یہ قسمیں آپ ہی ادا کر سکتی ہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن انھوں نے، شوکت بیگم، اور بیگم سے کم کسی اور شخص سے خطاب ہی نہیں کیا، مشکوکیا اس قسم کا کوئی اور شخص سننے کے لئے اس کے کان ترس گئے۔

آئینہ نے ذرا ساؤرخ بدلا اور اب سامنے ایک اور تصویر تھی۔ فرزند نے ساؤن درجہ پاس کر لیا ہے۔ اب اس کا داخلہ دوسرے اسکول میں ہو رہا ہے۔ جاڑے کی چھٹیوں کے بعد اس نے، اسکول میں وہ پہلی بار جا رہا ہے۔ بستہ میں کتا ہیں، نیشنل اور کاپیاں شوکت بیگم نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں۔ یہی بستہ کمر میں مانگے فرزند مسہری کے پاس کھڑا ہے۔ ماں نے ایک بوسہ لیا، فرزند نے اس کی پیشانی کو چومنا، تھی ماٹا — تھی ماٹا — ان چھ سات برسوں میں اسے اپنی مرحوم ماں کا شاید ایک بار بھی خیال نہیں آیا۔

شادی کے بعد آٹھ برس انیں گزرنے پر نگار کش اس دنیا میں آئی۔ اب نگار کش ہی اس کی سب کچھ بن کر رہ گئی ہے۔ شوہر کی ذمہ داریاں دیہے ہی کیا تھیں۔ بیج جمع، تھکر دوکان چلے جاتے۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک تو وہ بہر کا کھانا کھانے آتے رہے۔ پھر کبھی کبھی دوکان پر منگاتے تھے اور پھر دھیرے دھیرے وہ بہر کا کھانا ہی ختم ہو گیا۔ شام کو دوکان سے واپس آئے تو تھکے تھکے، نڈھال، تجوری کی بجائی اور دونوں کی منتھلی بیوی کے حوالہ کر دیتے اور وہ رپے تجوری میں رکھ دیتی۔ ویسے ایک جانی اس کے پاس بھی رہتی، کتنا گس کو دیا، کیا کیا خرچ کیا، یہ خبر سنے ایک بار بھی نہ پوچھا تھا۔

اور اب تو وہ اوپر کوٹھے پر سوئے، اپنی رات کو دو ایک بار ضرور دھاتی، آنکھ کھل جاتی تو گھنٹوں نیند نہ آتی اور دن کو دوکان کے کام میں تھل پڑتا۔ ناہلا قحط کے بس دو ایک ہی عوارق رہ گئے تھے بیج جانے کی میز پر، شام کو کھانے پر یا جموات کو جب دوکانیں بند ہوتیں۔ یہ ذمہ داریاں تھیں ہی کیا کہ ان میں کمی ہوتی۔ اب تہ کرشن نے فرزند

کے لاڈ بیار کا تھوڑا سا حتمہ بنایا تھا۔ اب وہ اسکول سے وٹ کے آتا اور شوکت بیگم نگار کش کو دودھ پلا ہی پوچھتیں تو کہیں بڑا کھانا لا کر میز پر رکھ دیتیں۔ خدو میں تو فرزند نے اس تبدیلی کو خاصا محسوس کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے عادی ہو گیا۔ کھانے کے بعد چھوٹے کے پاس کھڑا ہو جاتا اور سیٹی بجاتا تو نعرہ رشن، فون فون کر کے ہاتھ پر مارتی اور سمراتی — اب ایک اور تصویر تھی۔

کچھ عرصوں کی ایک دوپہر تھی کہ ایک تانگر گھر کے سامنے آکر رکا اور توڑنے آقاغ دی کر جاوید صاحب آئے ہیں۔ جاوید جمیم صاحب کے رخصت کا بھائی تھا اور پھر شوکت بیگم کے گھر آئے اور جاوید کے گھرانے سے دیریز تعلقات تھے اس لئے وہ پہلے ہی پردہ نہ کرتی تھیں شادی کے بعد ابدتہ سامنے آئے تھیں ذرا تھی اس لئے پہلے تو چھکیں پھر جلدی سے دوپٹہ سر پر ڈال کر باہر کے دالان میں ہمان کے ہتھکڑیاں کے لئے کھڑکی ہوئیں۔

جاوید بھائی اندر داخل ہوئے۔ ایک عرصہ سے بلکہ شادی کے بعد سے بھائی کو نہیں دیکھا تھا لیکن رشتہ ی مذاق کا تھا، مسکراتے گزروں سے اسے بھونے جاوید بھائی تجوڑی دیر میں ناٹھ منہ دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ شوہر کا کھانا پہلے ہی دوکان جا چکا تھا، اس لئے انتظار لا کوئی سوال ہی نہ تھا وہ بھی ہمان کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئیں۔ کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شوکت بیگم نے دور دور کے رشتہ داروں کی خیر خیریت پوچھ ڈالی۔ متیرہ بی کی کسی ہیں، کیا اب بھی کام کرتے آتی ہیں۔ اب تو ان کے بال اس سفید ہو گئے ہوں گے، کوئی بچے کے پاس دالے کوڑکے درخت کے نیچے کچے کھانے میں ہوسنا رہتا تھا اس کی بڑی تو اب بڑی ہو گئی تھی لڑکیوں کے اسکول میں کون کون سی پڑائی استانیان لگتی ہیں اور اس طرح کے چاٹنے پھٹنے، سوالات۔

روائے میز پر سے برتن اٹھائے اور مٹکے بائیں دالے میں سلجی رکھ کر جاوید بھائی کے ناٹھ کھلائے اور ٹاٹ کے پرے پر آئے جب سے نکادش کو کوئی تھی دس بجے سے ہی دالان کے پردے گر جانے جاتے لیکن آج دھانے کیسے اب مٹک کسی کو خیال نہ آیا تھا۔ جاوید بھائی

نے تازیہ سے ہاتھ پوچھے اور کہنے میں رکھے ہوئے ریڈیو پر فرخندگی
 نائیں تصویر دیکھنے لگے۔ اسی وہ تصویر دیکھنے ہی میں محو تھے کہ اندر
 کمرے میں جوئے پر نشان کش روتی، وہ اس وقت بشل سال بھر کی
 ہوگی۔ جاوید جانی نے کان کھڑے کئے۔ شرارت بھرے انداز میں سکا
 چہرے۔ "واہ بھائی یہ کارناما آپ نے کب کر ڈالا؟"

شرفتم یلگم جس سکا کرہ گیش تو جاویر جھانی نے اپنا سا
 دھرایا۔ ”آپ تو خوب غصہ یہ خفیہ کرنا تے کہ ذاتی ہی ادھر کی کولاقوں
 کان خیرتم نہیں ہوتی“ اور کہہ کر ایک ہی جیت میں اندر محسوس
 چلے گئے اور شرفتم کو گواہ دینے کے بہا میں دلائل میں آئے۔ سچے سچے کہ
 چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔ گواہ کے لئے تھلایا اور طرے سے تھلکا

پسایو کیا، جمعہ بجایا۔ پر اسے چپ نہ بولنا تھا مٹھی، شوکت بیگم نے اہراہی کیا کیونکہ جاوید بیٹا نے اسے گودے میں چھوڑا "ایسا ہی تجھے کھلانے کا حق ہے تو شادی کیوں نہیں کر ڈالتے؟" شوکت بیگم نے کہا۔ "میرا دل کوسیدہ نہ سلھتے ہوئے دلیس" شادی کی ڈالت لے میرا دوسرے تیس بچے تھے، دن لگے ہیں۔"

جاوید بھائی غالی خالی نظروں سے بھا بھی کی طرف دیکھتے رہے، پھر نگرش کو چمکا لیا تو اس نے اسی طرف دیکھ کر ایک ہلکی سی۔
جاوید بھائی نے اس کے منہ میں سیدھے ہاتھ کی ایک انچلی ڈالی تو وہ جوتے لگی۔ خود بولے: ”اب کیا تھی دی گردن۔ کرنا ہوتی تو گسکا کر دے ہوتا۔“

”کیوں اب کیا ہوا۔ کیا پوڑھے ہو گئے۔“

یہ بات شوکت بیگم نے بوجھ کہہ دی تھی لیکن اس کے بچے
لاشور میں ان کی پوری زندگی تھی۔ جاوید بھائی اب بھی چالیس کے
چھٹے ہیں ہوں گے جبکہ دس سال قبل ان کی شادی مجیم صاحب سے ہوئی
تھی تو کہہ کر کھڑے ہوئے کہ مہر بھی ان کی شادی شدہ زندگی کامیاب
ہی تھی۔ ان دس برسوں میں ان کی ایک بار بھی شوہر سے رفاقت نہ ہوئی
تھی۔ رفاقت تو دور کی بات کسی بات پر اختلاف کی نوبت تک نہ آئی تھی
اور رفاقت ہوتی تھی تو کیسے، دونوں کے راستے اتنے الگ الگ بلکہ متضاد
تھے کہ ان میں کسی ٹکڑا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو مجیم صاحب
کے پاس تھا اسے دیتے ہیں انھوں نے کبھی اتنا پاس نہ کی تھی، جو ان کے
پاس نہ تھا اس کی شوکت بیگم سے بھی چاہی نہ تھی۔ انھوں نے انگاروں
سے اٹھ سیکے نہ تھے لیکن دوسروں کو سیکنے سنا اور دیکھا تھا۔ یہاں
آگ ہی نہ تھی تو انگارے کیا ہوتے اور جو بھل کے سامنے خواہ مخواہ
بات چھیلائے سے حاصل ہو۔ یہاں غلبہ ہی نہ ہوا ان میں غلبہ

کیا ہوگی؟ یکسی اس وقت یہ باتیں شادی کی طور پر شوکت بیگم کے ذہن میں نہ آتی تھیں اور انھوں نے اس طرح اس مسئلہ پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ یکسی بے زبان احساسات کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ ہمارے اور آپ کے طور پر لفظ کے پابند نہیں ہوتے۔

اپنے سوال کے جواب میں جاوید بھائی کو خاموش یا کر شوکت بیگم بول اٹھیں:

”شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے، ویسے اُس وقت کیسے کیسے رشتے آ رہے تھے لیکن جناب کے مزاج ہی نہ ملے تھے۔“

”اُس وقت کی بات چھوڑو، اب مجھ کو پوچھو سے سے کون شادی کرے گا۔“ جاوید بھائی کی آواز جیسے کسی خالی ڈالے سے نکلی رہتی تھی۔

”کیوں، اگر سے گا کیوں نہیں۔ کوئی بھی کرے گا۔“ بھابی نے مسکرا کے جواب دیا۔

”آپ کو کیسے گا۔؟“

شوکت بیگم کو ہوش آیا تو انھوں نے خود کو جاوید بھائی کے بالکل قریب کھڑا پایا۔ نگار کش کو گود سے پیسے کی کوشش کرتے وقت ان کا ہاتھ جاوید بھائی کی منہ بٹھپھیلوں کے پاس ٹپک گیا تھا۔ سانس دھڑلہ دھڑ سے چل رہی تھی اور کان کی دھڑکیوں میں جیسے چوڑیاں کاٹ رہی تھیں۔

گرم ہوا کا غیبتہ نہ آیا اور نہ پھر ایک چائنا ریسڈ گور کے چائینا۔ کان کے پاس سے ایک گولی سن سے نکل گئی۔

”کیا آپ مجھ سے شادی کر لیتے گا۔“ کیا آپ مجھ سے شادی کر لیتے گا۔“ کیا آپ مجھ سے شادی کر لیتے گا۔“ شوکت بیگم پاس ہی پڑی ہوئی مہسری پر گر پڑیں۔ خاموش، بے مشدد، سوج بستا۔ جاوید بھائی بھی اسی جگہ کھڑے تھے، ساکت و سامت، گم سم، چپ چاپ۔ نگار کش جو تھوڑی دیر قبل جاوید بھائی کی گود میں درد کے ہلانک ہوئی جا رہی تھی نہ جانے کب کی خاموش ہو چکی تھی۔ شوکت بیگم کی دیر تو اسی طرح بے مشدد پڑی ہیں پیرا ہر آدمی دھڑکے بغیر اندر کرے ہیں جا کر مہسری پر گر پڑیں اور گدی میں

چہرہ اُڑس لیا۔

باہر آنکھ میں میٹھی چون کی وکیل ہی تھی۔ ڈکرائی کھانا پکا کے جانے کب کی اپنی کونٹری میں پڑ رہی تھی۔ ڈکرائی کا بھی کہیں کوئے کھڑے میں سودا ہوگا۔ فرزند مشورہ گرمیوں میں اپنی خالہ کے پاس شہر چلا گیا تھا۔ جاوید بھائی کچھ دیر تو اسی طرح کھڑے رہے، پھر انھوں نے ہستہ سے نگار کش کو مہسری پر لٹا دیا۔ نگار کش پہلے تو کھلائی پھر خاموش ہو گئی اور وہ خود دالان میں دھیرے دھیرے پھٹنے لگے۔ گھر میں موت کا سا

سناٹا ماری تھا۔ کبھی بھی اندر سے بھگیوں کی آوازیں نہ رونا سنائی دیتیں۔ تھوڑی دیر بعد جاوید بھائی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ بجکر۔ بم منٹ ہوئے تھے۔ سوا چار بجے میل کان پڑ جاتا تھا۔ انھوں نے گھر سے کاؤرغ کیا۔ دہلیز کے پاس جا کر کچھ سوچا، پلٹے، پھر اندر چلے ہی گئے شوکت بیگم اسی طرح بے مشدد پڑی تھیں۔ جاوید بھائی پلٹنگ کے سرٹانے کچھ دیر کھڑے رہے پھر بولے

”بھابی۔“

کوئی جواب نہ ملا۔

”بھابی سنئے تو۔“

شوکت بیگم نے ایک ہانگی لی۔

”بھابی مجھے صاف کر دو بیگم، میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ دلیسے میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔“ اچھا اب جا رہا ہوں خدا حافظ۔“

قدیموں کی بھاری چاب، پھر ڈالہ کی، پھر جیسے کسی نے شوکت بیگم کو ہاتھ دیا۔ ابھی جاوید بھائی دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ کوئی دھچک کھڑا تھا۔ دھچک دیکھا تو شوکت بیگم تھیں۔ منٹے سر، منٹے پیسینہ سے دو پہر غائب، آنکھیں شرع اور بال بھرے ہوئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو نظر ہیرے دیکھا۔ شوکت بیگم ایک دم جھوٹ پڑیں۔ ”جاوید بھئی اب بھی یہاں نہ آ۔ دلیسے تم خط کب لکھتے تھے اب اور بھی نہ لکھنا۔ میں تمھاری کوئی خاطر تواضع بھی نہ کر سکی اچھا خدا حافظ۔“ شوکت بیگم نے ایک بار پھر جاوید بھائی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں کے درمیان جیسے سورج تھا۔ دونوں نے نظریں

بھالیں۔ پھر جاوید بھائی نے اپنا ہاتھ شوکت بیگم کے سر پر رکھا اور 'خدا حافظ' کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئے۔ شوکت بیگم نے دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ لکھنے کی بات کہی۔ شوکت بیگم نے اسے کھٹ کر رہ گئے۔ پھر خود ہی دروازہ بند کیا اور پھر پھر چلائی۔ کچھ دیر اسی طرح دروازے تک لنگے کھڑی رہیں اور نہ جانے کب اندر گئیں۔

سیٹھ سیم الدین شام کو جب دوکان سے لوٹے تو وہ بے بسا رہیں۔ شوکت بیگم ہی تھیں۔ فوراً ڈاکو لایا گیا۔ تین چاندن میں بخار دیا تو شوکت بیگم بالکل بدل گئی تھیں۔ ویسے گھر میں پہلے ہی کون تھا جس سے باتیں کیا کرتیں۔ پر اب بالکل ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ صبح شام تلاوت کلام پاک ہوتی، پانچوں وقت کی نماز کے علاوہ ہمد اور ٹیپے پڑھتیں۔۔۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن کسی وقت کی نماز قضا نہ ہوئی، کوئی روزہ نہ چھوٹا۔

یہ تصویر بڑی جاگرو اور مفصل تھی۔ جاوید بھائی کی بڑی بڑی بیک خاموش نگاہیں۔ ان آنکھوں پر چھتے کی طرح چھائی ہوئی بھری سیاہ جھونپ، جسے ہاتھ تھمتہ مارنے کی زندگی کو کھلوانے لگے۔ لیکن دراصل بات پر پریشان ہو جانے کی عادت۔۔۔ پھر اس وقت کی اپنی زندگی، شوہر، دو سال کی نگارش۔۔۔ سارے لغزش ایک ایک کر کے سامنے سے گزر گئے۔ شوکت بیگم کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور نگارش جو مال کے اس برتاؤ سے جرت زدہ سی تھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شوکت بیگم نے جلدی سے دعا مانگی۔ خوش نصیبی، بڑھ کر لپٹے اور دم کیا تب جا کر کہیں سکون نصیب ہوا۔

جب سے نگارش کے رشتہ کی بات پہلی تھی وہ ماں باپ کے سامنے ڈراما ہی آتی۔ رات کا کھانا عام طور سے سبسا ہڑی کھاتے تھے لیکن اب نگارش اسے بھی مال جاتی اور پردوں میں شوکت بیگم نے یہ فوراً کرنے کے لئے کسی چیز کی کمی تو نہیں رہ گئی ہے اس کے جہیز کے سامنے بڑھ کر لگے اور سٹے اور بڑے کپڑے بڑی بڑی مہربوں پر جانے تو نگارش دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلے۔

یوں تو بات چیت کئی گھنٹوں سے چل رہی تھی۔ دو ایک بڑے پاکستان کے بھی زیرِ غور تھے لیکن ماں باپ الگ تو تین کو دور دیں بھیجے کے خیال ہی سے کانپ کانپ جاتے۔ یہاں جن گھرانوں

سے بات چیت چل رہی تھی ان میں سے کچھ کی مالی حالت ایسی تھی کہ ان کو پل بچے کو کچھ پانچ روپے یا نو روپے کے خیال سے کچھ مہنگا کرتا۔ کچھ کھاتے پیتے تھے تو ان کی ذات کا پتہ نہ خاندان کا، غرض بیان ہوئی دونوں اسی ادھر ہیں ہیں تھے کہ شوکت بیگم کی تندرستی بیگم نے مشکل آسان کر دی۔ باہر کا ڈاکو ٹیکٹا روم خوب اچھی طرح جھڑا پوچھا گیا۔ دروازہ اور کمرہ کیوں کے پردے تبدیل کئے گئے اور ادھر کمرہ ہمان کے لئے آراستہ کر دیا گیا۔ سرور بیگم خود ہی لڑکے کو ساتھ لے کے آئیں۔ گھر میں کون تھا جو سبیشیش پیشانی کے لئے جاتا۔ فرخندہ آبادی نور علی میں ڈاکو ٹیکٹا کرنا تھا لیکن ہمان جب سبیشیش سے باہر نکلے تو محض حرور موجود تھا۔

ہوئے والی سسرال کی خاطر مدارات، اونچی قلمو نما کوٹھی، سلیٹہ منہ اور خوش اخلاق ساس، سیٹھ جیم الدین کی دولت، بڑا نام بڑا کام اور پھر نگارش ایسی لڑکی جس کی تصویر سرور بیگم پہلے ہی دکھا چکی تھیں اور میان و بینہ ضلعی ہو گئے۔ ادھر سیٹھ جیم الدین کو بھی لڑکے میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ لاکھوں میں نہ کسی ہزاروں میں ایک تو تھا ہی، پڑھا کھا، قبول صورت، شریف خاندان اور دوکان بھی اچھی خامی چلتی۔ انھوں نے پہلی ہی نگرانی کر ڈیڑھ لکھ لیا اور پھر اندر آکر بیگم سے بولے۔

”واللہ نے خود سے اختلاف کر دیا، میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جو سرور بیگم کی پسند ہی وہی میری بھی، اور پھر لڑکا بھی گھر ہی کا ہے حاملہ بھائی کا جانی ہے، وہی خلوص، ویسی ہی سبیدی کا خدا مومنین طبیعت“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ شوکت بیگم نے کسی جوش و خروش کا اظہار نہ کر کے بغیر جواب دیا۔

بڑی کے منہ سے ’ہوں ماں‘ اس گرافیں کچھ تشفی نہ بھئی کہ ان کو اتنا جوش و خروش تھا۔ دن بھر کھڑے کھڑے لڑے صاف کر دیا تھا، اوپر کا کمرہ سجایا تھا۔ بیٹے کو دیکھنے کا لیا جاؤ تھا اور کہاں اب ’جیسی آپ کی مرضی‘۔ بولے ”کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟“ شوکت بیگم نے سرور تو پاخانہ میں رکھا اور گوری موڈ کر منہ

میں دہائی اور بولیں " اسے آپ کی باتیں کرتے ہیں، کیا خوشی میں
 اچھوں، کو دود، سرور کی لکھ آپ کی بہن ہسی پر اب تو میں
 پرستے لکری، اور آ تو میاں ان کے دلبری تو ہیں۔ کوئی مسدھیانے
 داوان کے سامنے رشتہ پرستے ہونے سے پہلے ایسی خوشی کا انہما رکھتا
 ہے۔ سن ہیں گی تو سوجھی کی بڑی جاری ہو رہی تھی۔ "

بات سیٹھی کی سمجھ میں آگئی۔ انھوں نے اپنے چہرے پر
 مصنوعی مسکندگی پیدا کی، لیکن خوشی تھی کہ بستی کھول کے باہر نکل آتی
 تھی۔ تو ڈی دیر چپ رہے، پھر بولے " بھئی اور چاہے کچھ ہو
 لیکن اب تک تجھے لڑکے دیکھے ان میں تو سب سے اچھا ہے۔
 بس ذرا عمر زیادہ ہے۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایسا کوئی فرق
 بھی نہیں۔ " انھوں نے مسکرائی لکری کی طرف دیکھا اور بات جاری
 رکھی " اور پھر دم دونوں کی عمروں میں بھی تو کتنا فرق تھا۔ میں تو
 سرور سے ماں کے دیتا ہوں۔ "

" آپ کی یہ عمر تو لیکن جلد بازی نہ گئی " شوکت بیگم نے دہائی
 سر پر ڈالا " کوئی پرانا زمانہ تو اب ہے نہیں کہ ماں باپ سے جس کو
 چاہا لڑائی کا تھ تھا، یا نگار رش کو پٹھایا لکھا یا ہے، یونیورسٹی
 سے بی۔ اے کر آیا ہے، تو اس کا بھی عندیہ معلوم ہی کر لیا جائے "۔
 " داہ بیگم تم نہیں زنی کی کی۔ بچی۔ " جم صاحب اس
 وقت بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ " اب تم جاؤ گی نگار رش
 سے پوچھ کر تجھے لڑا پسند ہے یا نہیں، دیکھا نہیں کی جب سے
 اور میاں آئے ہیں کمر سے باہر نکلی ہی نہیں۔ "

شوکت بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا اور بولیں۔ " وہ
 شرمیلی ہے، اور خود سے کچھ نہ کہہ پائے تو ہم اس سے کہیں
 ہوا لکریوں اور میں بھلا پوچھنے جاؤں گی، شام کو اس کی
 سہیلی عذرا آئے گی تو اس سے پوچھ لوں گی، انھیں ماں نہ کرنا۔ "
 سرور بیگم سے ابھی بھائی بھائی سے ان تو نہیں تھی تھی
 لیکن بھائی کے برتاؤ اور پھر کل صبح سے اس وقت تک کی خاطر داری
 سے یہ مزو بھوگئی تھیں کہ رشتہ منلوہ ہے۔ انھیں یقینی تھا کہ کل
 صبح جب واپس جانے لگیں گی تو انور میاں کی ماں کی طرف سے

امام خاص نگار رش کے بازو میں بازو دھیں گی اور یا قوت کی
 انگوٹھی جو ان کے پس کے اوپری خانہ میں ایک ڈمیر کے اندر چھوڑ
 ہے نگار رش کی انگلی میں سرک چکی ہوگی۔

سرور بیگم اوپر کھٹے پر سے انور کے پاس سے تڑپنے تو بے حد
 مسرور تھیں۔ اتنی رات گئے تک مجھ بھی کو جانا نہ پوچھ کر انھیں
 کچھ حیرت مزو ہوئی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ لڑکی کا رشتہ بچا کرنا ہے کچھ
 پڑھ دو لکھ رہی ہوں گی وہ اپنی ہمراہی پر عا کر دیا ہو گئیں، شوکت بیگم
 نے بڑا دے نگار رش کو ایک بار پھر اپنے بازو دھایا اور کھٹے کے قریب
 جانا سنا پڑ ہی بٹھا لیا۔ ایک لمبی سی دعا پڑھ کے اس کی پیشانی پر دم
 کیا۔ دونوں ہاتھوں سے بیٹی کی پیشانی پر چٹ لائیں۔ اسے سینہ سے
 لٹکایا اور پھر ان کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ وہ کیا دعا
 مانگ رہی تھیں یہ نگار رش کی خاک سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ انھوں میں انسو
 تھے، لگا رہا ہوا تھا اور سبز پر اس کے سر کے پوچھ سے آواز دہی
 دہی نکلتی ہی تھی۔ پر اس نے اتنا فرود سنا " اللہ میرے گستاہوں کو
 مصافحہ کیجئے سوچتی ہوں کہ منہ سے سامنا کر دوں گی۔ اس میں میرا کوئی
 قصور نہ تھا۔ اور میری بیٹی کی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ نہ لائیو، اسے
 آزمائش میں نہ ڈالو۔ "

نگار رش تھوڑی دیر تک تو اسی طرح ماں کے سینہ سے
 سر لٹائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں پر ماں کے سامنے
 لا کر آنکھیں اور مزو نہ کرنا چاہتی تھی۔ آٹھی اور اپنے کمر سے
 میں چلی گئی۔

رات گئے تک میاں بیوی کمر سے میں نہ جانے کیا کھر پیر
 کرتے رہے لیکن میں جب بیٹھ جیم الدین ناشتہ کی بیڑ پر آئے تو
 فحشہ سے ان کا مزو لگا ہوا تھا۔ انھوں نے بہن کے رخصت ہونے کا
 انتظار بھی نہ کیا اور بارے کے کمر سے ہی دوکان چلے گئے اور نہ
 کو رخصت کرتے وقت شوکت بیگم نے ان سے جس مفصل خط بھیجے گا
 وعدہ کیا وہ بھی نہ بھیجی گیا۔

جدید فن مصوری کی بین الاقوامی نمائش

اور سائنس کی روز افزوں ترقی نے عوام میں قہرس کا مادہ پیدا کر دیا۔ علم و ادب کی دنیا میں نئے نئے خیالات پیش کئے جانے لگے اور پچ تویر بے کرج ادب میں آٹنا انقلاب آیا تو اس کا اثر آرٹ پر بھی پڑا اور اس طرح ایک نئے ہی جدید آرٹ کی ابتداء ہوئی۔

لگ بھگ دو سو برس تک یورپ کے معذور و ماہیت اور اہلیت پسندی کی طرف راغب رہے۔ یہاں تک کہ تخلیقی فن معنی لٹائی میں کر رہ گیا۔ لیکن جدید فن کی خصوصیات نے مصوری کے رنگ روپ کو یکسر بدل ڈالا۔ اس سے پیشہ لوگ مناظر کی عکاسی سے بہت کم دل چسپی رکھتے تھے لیکن جدید فن میں اس صنف کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مناظر قدرت کا تقدس باقی نہ رہا۔ اس کا درجہ انسان کے مساوی تھا۔ محض رنگوں کے لپاٹی خے بیرونی سطحوں کو اجاگر کر کے مصوری زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ بیرونی جذبات نگاری کے مقابلہ میں گہرائی اور گیرائی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جدید آرٹ بھی محض چند خصوصیات کے ہمارے زندہ نہیں۔ اس کی مہمیت و جوشیات میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور جو جن اس کا ارتقاء ہوتا گیا نئے نئے اسلوب میں داخل ہوتے گئے اور آج کل یہ حالت ہے کہ جدید فن مصوری کے مختلف رجحانات بیک وقت پورے فن پر چھائے ہوئے ہیں۔

کلاڈ مونٹ اور آگسٹ ری تارن نے اترپرتی کے بھان کو جدید فن میں داخل کیا اور یہ آج کے فن کا ایک ضروری سبب و قرار دیا جاتا

مصوری ایک ایسا فن ہے جو دنیا کے ہر ملک میں سیکڑوں برسوں سے ماہرین فن کے ہاتھوں ارتقاء پذیر رہا۔ ہمارے ہاں فن کی تاریخ میں بودھی، راجستھانی، پالی، مثل اور پہاڑی اسکول کے کمال فن کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح یورپ کے مالک میں بھی یہ فن مختلف اسلوب کی صورت میں پرانے وقتوں میں نشوونما پاتا رہا۔ لیکن جو جن انسان کا جالیاتی ذوق اور فنی شعور بدلتا رہا فن مصوری میں بھی انقلاب لگتا ہوتا رہے یہاں تک کہ گھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جدید آرٹ کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتدا یورپ کی سرزمین سے ہوئی اور وہیں سے رفتہ رفتہ یہ چارہا نگ عالم میں پھیلا۔ آج حالت یہ ہے کہ جدید آرٹ کی خصوصیات کے حامل مصوری کے شاہکار یورپ کے سب ہی مالک پیش کر رہے ہیں۔

گھارہویں صدی کے آخری دور سے پہلے مصوری کلاسیکی عینیت کا دوسرا نام سمجھا جاتا تھا۔ فن کا رجحان ہرکام پیشی کرتے تھے ان میں ان کا مقصد جائیدادوں اور رئیس زادوں کی خوشدلی بھرا کرتا تھا۔ عوام نہ تو اس فن سے دل چسپی رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے شعور یا تنقیدی کوئی قدر و قیمت ہوتی تھی۔ لیکن دور لشاعتِ ناخبر کے خاتمہ کے بعد یورپ کے سچا سچے ایک فن کار لٹل ڈوگن کا مذاق بھلا ڈا نئی تھیں پیدا ہوئیں۔ جمہوریت اور شفقی آزادی نے مصوری کو عوام کے ملاق اور خوشی کا سامان بنا دیا۔ انسان کے دل میں علم و دانش کے حصول کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ مشی انقلاب

مستاز رہے۔

ان سب رجحانات اور افراہی رنگوں سے ہر پورکچہ تصاویر پچھلے دہائی آرٹ کی بین الاقوامی نمائش کی زینت بنیں۔ یہ نمائش اپنے طرز کی واحد نمائش تھی جو دہائی میں منعقد ہوئی جس میں آسٹریلیا، بلجیئم، چین، کیمبوڈیا، چیکوسلاویہ، دھیت نام، جمہوریہ جرمنی، فن لینڈ، فرانس، گھانا، ہنگری، انڈونیشیا، اٹلی، جاپان، ملائیا، منگولیا، نیدرلینڈز، پولینڈ، سویڈن، انگلستان، متحدہ عرب جمہوریہ، امریکا، رومانیہ، پاکستان، کوریا اور شکستہ موصول شدہ مرنے والی نمائش کی خاطر پیش کی گئی۔ ان ممالک سے کل ۳۳۹ تصاویر موصول ہوئیں، جن میں سے ہر ملک کے ایک ایک شاہکار کو اعزاز کی سند عطا کی گئی۔ چونکہ کیمبوڈیا، پاکستان، کوریا، ایران اور لٹوانی تصاویر معجزہ تاریخ کے بعد موصول ہوئیں اس لئے انھیں اعزاز کی سند دی جا سکی۔

اس سے پہلے ایسی ہی تین نمائشیں بالترتیب ۱۹۴۶، ۱۹۵۳ اور ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئیں۔ لیکن اس سال کی نمائش خصوصاً قابل ذکر ہے کیونکہ میٹری اعتبار سے یہ بھی نمائش سے بہتر تھی۔ ہندوستان خود جدید فن معنوی کا مرکز نہیں اور نہ ہی اس نے ایٹمک یورینیم ممالک کی نسبت زیادہ کامیاب حاصل کیا ہے۔ بہر حال یہ نمائش ہمارے ذوق و شوق اور قدر فن کا ایک سنگ میل ہے کہ بین الاقوامی درجہ پر ایک بھاری نمائش کا اہتمام ہمارے ملک سے کیا۔ راستہ پرستی ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنے پیغام میں نمائش کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے الفاظ میں: ”کسی قوم کی بیداری میں فنون لطیفہ کا بشیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنے ملک کے دیگر ترقی کی راہوں کی طرح اس پر بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔“ پینت تہوڑے فنون لطیفہ سے چلنی کووم کی ترقی سے ناستہ دی ہے۔ نائب صدر ڈاکٹر واہ کمرشانی نے نمائش کا افتتاح فرمایا تھا۔

نمائش میں لگ بھگ پانچ پشتوں کے رنگ، خاکے، نوائے اور تصاویر کی دس جلدیں یا احساس کے تہذیب کا دیکھتے، چھو سکتے سے کر کے ایک مختلف اسلوب جو معنوی کے دائرہ میں پروان چڑھے، ان سب کی نمائندگی کی گئی تھی۔ تخلیقات میں جدت اور روایت

ہے۔ اسی طرح انگلستان کے کچھ فن کاروں اور شاعروں نے جانی سکوی تبادت میں ایک تحریک بنام Pre-Raphaelite کو جنم دیا۔ جنھوں نے فن کی خوبصورتی میں پڑا اضافہ کر دیا۔ اسی طرح فن جدید میں ایک نئے Cubism کا راجہ بل کھی جس کی روشنی میں کسی شے کی عکاسی محض آنکھ کی اشارے پر نہیں کی جاتی تھی بلکہ علم کی حقیقت فن کار کی معاون ثابت ہوتی تھی۔ یہ خصوصیت جدید فن میں خوب کامیاب رہی۔ اسی وجہ سے کہ فن کار کو جتنی آزادی کیوں نہ مین دیتے تھے اتنی اور کسی طرز میں نہیں۔ اس میں اس کی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار کا بڑا موقع ملا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں فن برلن فن کا فخر بلند ہوا اور بیشتر فن کار جمالیاتی خصوصیات اور حسن و جمال کو دوسری خصوصیات پر ترجیح دینے لگے اور اس رجحان کے آثار میں بھی بڑے شاہکار منظر عام پر آئے۔ اس رجحان کے معاون نے فن میں ڈنڈم کیسے کام قابل ذکر ہے۔ جمالیات کا ایک وسیع اسلوب قرار دیا۔ چنانچہ اسے تضاد رجحانات نے بھی جدید فن پر بھاری اثر ڈالا۔

آج کا فن معنوی ان سب رجحانات کا حاصل ہے۔ کچھ فن کار ایسے ہیں جو اپنے شاہکاروں کی تخلیق میں ایک وقت کئی رجحانات کا اتباع کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا شاہکار صرف ایک رجحان کا عکس نہیں رہتا اور ایسی مثالیں عام طور سے ملتی ہیں۔ دراصل آج کے معنوی کو جتنی آزادی نہیں ملتی ہے اسلوب کے اعتبار سے حاصل ہے وہ کسی دور میں کسی فن کار کو نصیب نہ ہو سکی ہوگی۔ آج کا فن کار کسی جسد پر یا احساس کو کسی بھی رنگ یا اسلوب میں پیش کر سکتا ہے اس پر کوئی قید یا پابندی نہیں۔ انفرادیت اور ذاتی احساس آج کے فن میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مشہور ادیب مسکرواٹل کے قول کے مطابق کوئی برائی کا کسی چیز کو اس طرح سے نہیں دیکھتا کہ وہ جون کی کون نظر آئے اور اگر وہ اس طرح سے ہی دیکھتا ہے تو وہ غلیظ فن کار کہلائے گا کوئی فن نہیں۔“ اسی عظمت کو حاصل کرنے کے لئے آج کا فن کار اپنا معنوی بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور دعائیت کی پابندی کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت کو جاگڑ رکھتا ہے تاکہ اس کا فن

کو نہایت خوب صورتی سے سمجھایا گیا تھا۔ فنِ جدید کے رجحانات کے ساتھ ساتھ ہر ملک کی اپنی اپنی روایت بھی ان مرقوں میں نمایاں تھی دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا درجہ ان کوئی قدر یا موضوع ہوگا جو ان تصاویر کا موضوع نہ بنا ہو۔ دنیا کی بے چینی، ریاست، جنگ کا خوف نفسیاتی اُلجھن، بیضر، شہکاروں کے پس منظر سے بیان بھی خصوصاً فرادیت کا رنگ کئی مرقوں پر غالب تھا۔ یوں جان پڑتا ہے کہ فنِ کار کو اُمین اور پیشانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا چنانچہ وہ ٹیکس کا ہسارا بیٹا ہے اور محض رنگ و خاکہ سے اپنے فن میں کوئی تخیل پیش کر دیتا ہے بلکہ کئی ایسا تخیل وہ پیش کرنے سے منور رہے جس میں فراڈیت حاوی نہ ہو۔ کسی حد تک وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔ جب یہ تاثر خود آج کے حامل میں موجود ہے تو شعوری یا لا شعوری طور پر فنِ کار بھی اس سے بچ نہیں سکتا۔ ایسے مرقوں میں زیادہ اشتراکی ممالک کے شاہکار شامل تھے۔ چین سے لے کر ہنگری تک سب ہی ملکوں کے مرقے اس رنگ کے حامل تھے۔ کسی کسی خاکے سے ورتاؤ قدر و کثرت خلوتِ لغت کا اور کسی سے نظام کوئی تائیدگی کا اظہار ہوتا تھا فنِ کاری نفسیاتی گہرائی کا مطالعہ کرنے سے اس کی تخلیق کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

چین کے شاہکاروں میں زیادہ تر درختوں، آبشاروں، باغوں اور پرنسپل کی عکاسی کی گئی تھی۔ ایسے شاہکار کچھ پرانی طرز کے جان پڑتے تھے۔ جدید نمونوں میں سوہ اور فولاد کے لئے جنگ، ہمیں کی دھوئیں دی بیلک، کسال، گرہ، قابل ذکر ہیں۔ انہی تصویروں میں اور پھول، ایک رنگین اور خوب صورت پیش کش ہے۔

ہنگری کے فنِ نمونوں میں ماں اور بچہ، "اور سرکس" قابل ذکر ہیں۔ پولینڈ کے مرقے پر متوجہ طور پر عام نوعیت کے تھے مرقے دو فنِ کاروں کے شاہکار شامل نمائش تھے ان مرقوں پر اڑھتی پستی کا غلبہ

تھا اگلی مرقہ The landscape from witkowice

ایک مہینہ و جیل نمونہ ہے۔ دوسری تصاویر میں "ایک آدمی کی تصویر" اور "پتے پھول" خوب صورت نمونے تھے۔

فرانس کے شاہکار سب سے زیادہ دل فریب ہیں۔ ۳۰ ستمبر

کے ایک جوان بخت کا Torero نمائش کے بہترین نمونوں میں شامل تھا۔ اس فن کار نے اپنی چھٹی عمر میں ہی اتنا اعلیٰ شاہکار پیش کیا ہے جو بڑے شاہکاروں پر بھاری ہے۔ اس نمونہ میں جان بھی ہے اور ایک بے پناہ جاذبیت بھی۔ اسی طرح Le Corbusier چندی گڑھ کا فہرست مرتب کیا تھا کا شاہکار "سمندری دیوتا" قابل ذکر ہے۔ کارپوزیر فرانس کا ایک مستند فن کار ہے۔ اس نے اپنے شاہکار میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ فرانس کے دو اور نمونے "مچھویش" اور "پٹنگ" قابل تحسین ہیں۔ اگلی کی مصوری کے نمونے بہت اعلیٰ پایہ کے تھے۔

Reclining figure in interior ایک دل چب اور قابل قدر و نفیس تصویر (ریکلینگ فیکر) ہے جس میں ایک حسین صورت آرام کرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ حقیقت پسندی جاذبیت اور طاقت اس مرقے کی خصوصیات ہیں۔ دوسری تصاویر میں The landing ایک خوب صورت پیش کش ہے۔ تصویر شاعری اور موسیقی کا مرکب معلوم ہوتی ہے۔ اگلی کا ایک شاہکار جو سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ Spatial Concept ہے۔ جدید فنِ مصوری کا ایک ایسا نمونہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ایک جگہ چوڑے کنارے پر چاقو سے چھدے ہوئے ۱۱۴ سوراخ ہیں۔ پس منظر کیا ہے، سوراخ عوامی طور پر کیا ظاہر کرتے ہیں یہ کچھ واضح نہیں ہوتا۔ تدریجی ارتقا جدید فنِ مصوری کا ایک خاصہ ہے اور اس اعتبار سے یہ شاہکار تدریج کا ایک نمونہ ہے۔

برطانیہ اور امریکہ کی تصاویر زیادہ تر گرافوں کی بنی ہوئی تھیں۔ میٹرائی اعتبار سے یہ شاہکار دل چب بھی ہیں اور جاذب نگر بھی۔ برطانیہ کی تصاویر میں Hera اور Standing figure قابل ذکر ہیں اور امریکی شاہکاروں میں "کالا اور شیشا" اور "سمندری آواز" قابلِ داد ہیں۔ خصوصاً مؤثر الذکر ایک بیچ زادہ خوب صورت گراف کشیدہ تصویر ہے۔ اسی طرح ایک اور شاہکار Tobias and the Angel ہے جس کو دیکھ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ فن کار ہر شے میں موتیت بھردھینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ملایا کے شاہکار نہایت خوب صورت اور لطیف ہیں۔ اور جدید فن کے نمبر میں ان میں قابل ذکر ہے The Bait جو تدریجی موضوع کا شاہکار ہے۔ ٹیکس یا ذمیت کا حامل مزدور ہے۔ منگو یا کے فن کے نمونے موجودہ دور کے ترچان نہیں۔ وہ یا تو دروازی ٹرن کی صورت کے نمونے ہیں، جن پر کچھ نہ کچھ تنہا رنگ اور تاویز لگا دیا ہے، یا پھر منگو یا فن کاروں نے مغربی فن کاروں کی حقیقت پسندی کو اپنے فن میں خوش اسلوبی سے سمجھا ہے جن کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی خاک کئی کا معیار بہت اونچی ہو گیا ہے۔ "سنگیت کارٹوٹ" رنگینی کا اور Catching horse with lasso حرکت کا بہترین رقع ہیں۔ جاپان کے شاہکاروں کو کچھ کر عموماً ہوتا ہے کہ انھوں نے جدید فن معنوی میں بہت ترقی حاصل کر لی ہے۔ "پتہ" ایک قابل دا مرقع ہے جس میں فن کار کی انفرادیت نمایاں ہے۔ دوسرے نمونوں میں "پاپ بیٹا" "پھول" اور "سرس" شامل ہیں۔ خصوصاً ہر جس میں فن کار نے مزہ بیت کو اپنے فن میں خوب سمجھا ہے۔ یہ سٹا ہمارے جاپانی اور مغربی فن کا اظہار نمونہ ہے۔ ایک اور مرقع "کچھ نہیں" ایک تدریجی نمونہ ہے۔ رنگوں کی پوتا پاتی کے سوا ہر کسی اعلیٰ فنکار کا نمونہ نہیں۔

اسٹریٹ کے حرفے جذبات نگاری کے نمونے ہیں۔ پنگی اور انسانی رنگ مرقعوں کے حامل ہیں۔ "بارسٹور راقص" کی مرقع نگاری مٹی نہیں معلوم ہوتی پھر میری اس سے ذوق تخیل نمایاں ہوتا ہے۔ انڈونیشیہ کے شاہکار جدید رجحانات کے ترچان ہیں۔ دائرہ کار میں Masks ایک دل فریب تصویر ہے اس طرح "ایک بڑی" جدید طرز کا مرقع ہے جس کی خوب صورتی اور دل کشی سے ہم فرد محفوظ ہو سکتے ہیں۔ سویڈن کی معنوی میں نشی اور تری میں قابل قدر قطعہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک نمونہ "ایم کا دور" ہے جو نفسیاتی اعتبار

سے اس تباہی و بربادی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایٹم سے پیدا ہو سکتی ہے۔ آج کے دور میں سائنس کے کوششیں بھی ہماری معنوی کا موضوع بن رہی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار اپنے گرد و پیش کی زندگی اور سماجی اقتدار سے جوئی استفادہ کرتے ہوئے انھیں اپنے فن کا لوک بنا لیتے ہیں۔ "ایم کے دور" سے ملتی جلتی ایک اور تصویر مشرقی جرمنی کے کمال فن کا نمونہ ہے۔ دو ویٹکس۔ دو بوائے "ایک مزبوریت تصویر ہے جو جدیدیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ حقیقت پسندی اس طرح کی خصوصیت ہے جنگ کی تباہی کو جس درمیانے طریقے پر پیش کیا ہے اس کا جواب نہیں۔ شاہکار میں دو بوائے۔ ایک پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کا شکام ہیں اور دونوں منوم دہرا ساں شانہ بہ شانہ دکھائی ہوئی موضوع فن کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

دیت نام کے Lacquer کے شاہکار خوب صورتی اور دل کشی کے معنیے ملگتے رہتے ہیں۔ خطوں اور زخموں کی تکنیک اور اچھا میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ یہ شاہکار بالعموم امیروں کے ذوق سلیم کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تکنیکی قوت کا اظہار نہیں ہاں اسلوب نے خوب صورتی کو بڑھا دیا ہے۔ "موم ہمارے کیمت کو پانی دیتے ہوئے" قابل ذکر مرقع ہے۔

بہ حیثیت مجموعی نمائش دل کشی اور فن کاری کا بھرپور نمونہ مٹی۔ جن میں دنیا کے چیدہ چیدہ معنوی کے شاہکار نمونے کر کے یکجا کر دئے گئے تھے۔ مرقعوں کی بگڑی اور گڑبگڑ ان کی اہمیت کی ضامن مٹی۔ دوسرے ان شاہکاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کا فن کار کچھ مضامین قدر، نظام یا اصول سے اپنے آپ کو یا مذہم کر نہیں رکھ سکتا۔ نمائش خود فکر اور فلسفیانہ رموز کی نفاذ بھی کر سکتی مٹی۔ اس سے ذہن جدید فن معنوی سے محفوظ ہونے کا موقع ملا بلکہ دعوت کر رہی ہے۔

عزل

مشراب و شرکے سا پنے میں ڈھل کے آئی ہے یسٹام کس کی گلی سے نکل کے آئی ہے
 سمجھ رہا ہوں سحر کے قریب زنگیس کو نیا لباس شبِ غم بدل کے آئی ہے
 ترے قدم کی بہک ہے، تری قبا کی بہک نیم تیرے شبتال سے چل کے آئی ہے
 وفا پہ آپنچ نہ آئی اگر، تو کسہ دیتے دباں تک آج جو اک بات جل کے آئی ہے
 سحر تک آؤ گئی سچے تا بہ پروانہ مگر حرارتِ غم سے لگھسل کے آئی ہے
 بےسی ہوئی ہے ستاروں سے عکس کی فضا کہ رات تیرے تصور میں ڈھل کے آئی ہے
 ہماری آہ ہمارے ہی دل کی آہ نہیں نہ جانے کتنے دلوں سے نکل کے آئی ہے
 با احتیاط ہماری طرف اٹھی ہے نگاہ بوں پہ موجِ تیسرے سنبھل کے آئی ہے

مری نگاہِ تمت کا عکس ہو نہ شمیم

کسی کے رخ پہ جو سُرخِ چمن کے آئی ہے

فنِ لیفہ گوئی

ہمیشہ اپنی راہ میں کانٹے بچھائے اور ہٹائے ہیں وہاں اس نے کانٹوں میں پھول کھلانے کی جدوجہد بھی جاری رکھی ہے۔ اس حیوانِ ظریف کی یہی خوش طبعی ہمارے موعود سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

لیفہ کے لئے مزدوری ہے کہ وہ خدائی سلیم پر بار نہ ہو، سمیت پر گر کر نہ گزرتے، اسی لئے لیفہ کو روحِ فصاحت اور نشاۃِ روح کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیفہ ایک نہایت ہی لیفہ نشے ہے جس کے بیان کے لئے ایک خاص قسم کی ذہانت، عاجز و اجنبی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہے۔ اگر لیفہ بھولہ بھول میں چلا گیا تو وہ حکایت، داستان، قصہ، انشاد غرض کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر لیفہ کے ذیل میں ہرگز اس کا شمار نہ ہو گا۔ پیراس میں پانی میں اٹھنے والے لیفے کی سی حبابی کیفیت نہ رہے گی اسے سندھِ تعلق نہ کہا جاسکے گا۔ اس کے انوکھے پن کا خراج ادا نہ جائے گا۔

لیفہ اچھلے لیکن شانے والا اس کے فن سے ناواقف اور جذباتِ سماتراتِ دلوں کے آثار چرچا و پُر قدرت نہیں رکھتا۔ دورانِ بیان اچھی لکھنے سے ہٹ جاتا ہے۔ تہید کو ہل دے دیتا ہے، کھانٹے اور کھنکھاتے لگتا ہے۔ درمیان میں بقیہ لیفہ بھول جاتا ہے تو پھر لیفہ کی نزاکت، تجسس و لطیفِ رخصت ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ نازک مسئلہ لیفہ لکھنا کا ہے۔ جعفری، واقعات، حالات اور ماحول سے تعلق لیفہ ہو سکتا ہے کہ محض مرقطاس پر آکر بے درجہ دے دے جان ہو جائے پھر اس میں وہ کشش بھی باقی نہ رہ جائے جسے ہم کاغذ کے پھولوں

معتق مزید واقف و کجس میں مزاج کی چاشنی ہو عمرہ اور لطیف پیرا میں اس انداز سے بیان کیا جائے کہ ان الفاظ یا فقرہ کے سنے والے کو ہنسی آ جائے لیفہ کہیں گے۔ اس کے لئے عربی بیان و حسنِ ادا کی پابندی ضروری ہے۔ واقف کی دلی چسپی مذہبِ بیان کے ساتھ اعتدال لئے ہوئے ہونے والے ہیں اور سنے والے میں ذہنی ہم آہنگی تبشیر و استعارہ کے ذریعے کے ذریعہ جو لیفہ کی جان ہیں اور جن کی مدد سے ہمارے جذبات ہماری تخیل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

لیفہ کا شغ اس کے اختصار میں ہے اور مقررہ کے مزے سے پھول پھرنے شروع ہوں اور محفل میں قہقہوں کے گنگو چلنے لگیں، اسی لئے اس کو اجسالی مزاج بھی کہا جاسکتا ہے۔

لحاقی طور پر یہ ذہنی کمبل ایک ہنگامی فراہ ہے اس شیشی دور کی ابتدا دینے والی تنہید، مصروفیات و وسائل، غم، جان و دم دورانِ اور اگر فردا سے پیشینہ دور نے زندگی کے تقاضے زیادہ سنگین، سنجیدہ اور اہم بنادے ہیں۔ اب فرد کی حیثیت محض تماشا کی نہیں رہی وہ خود اس مہین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیفہ کے لئے ایک نیا انسان پیدا کیے کے قول سے باہر آ جاتا ہے اور جو وقت لیفہ کہنے اور سنے میں کٹتا ہے وہ روزمرہ کے غم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر کے لئے سب آپس کے اختلافات کو بھول کر ایک دوسرے کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔ کچھ مشیخہ دہریہ پر وقت نہیں ہر دور اپنے مصائب و مسائل اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں اس نے

ہی سے تشبیہ دے سکیں اور بعض لطیفہ قاریے ہوتے ہیں جنہیں خود بیان یا ادائیگی کا سہا ہے۔ بہت کم لطیفہ قاریے ہوتے ہیں جو کاغذ پر لکھنے کے بعد بھی اسی قدر تازہ اور سادہ ہارہ جاتیں۔

لطیفے کی ابتداء انسانیت کے آغاز کی داستان ہے۔ انسان جوں جوں تہذیب سے آشنا ہوتا گیا اس کا یہ چہرہ نکرتا گیا۔ جیسے جیسے اس کی آفاقی زندگی میں مہر اوڑھتا گیا وہ عام انسانی قیمری ترقی میں زیادہ گہری دل چسپی لیتا گیا۔ اس کی یہی دل چسپی وہ لکھنے کے جہاں سے لطیفے کے آغاز اور فنون لطیفہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس کو شروع میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ لکھنے کی طرح لکھنے کے لئے بھی پائپر و مجبور ہے۔ اس کے نفسیاتی و فطری جواز سے وہ کبھی لا شعوری طور پر بھی بے خود منکر نہ ہو سکا۔ کہنی کے عضلاتی عمل سے قطعاً نرسہ و بذلت کی ملکہ قدرت کی جانب سے کرنا یا تھاجس نے اسے ثابت قوی مسلسل جدوجہد عمل اور حرکت پر قائم رکھا۔ اس کے انھیں عزائم نے زندگی، ازادہ دلی اور شجاعتوں کے ساتھ میں قدرت اور اس کے مظاہر پر غیباتی۔ غاروں اور بیڑوں پر رہنے والے نیم وحشی انسان نے اپنی حق کا اظہار دشمن کی کھال آٹا کر اور اس کے سر کو قلم کر کے کیا۔ اس میں عجیبیت تھی، الجھجھلاہٹ اور جہالت تھی۔ یہ وحشیانہ جذبہ تہذیب کے عروج سے دبا تو نہیں دیا مگر کم مزور کر دیا۔ آج بھی سخت سے پاکی ہو جانے اور عقل سے ناغہ دھولینے والے انسان کی دیوانگی اور بھول میں یہ جذبہ بیل جاتا ہے جس میں تکلیف دے کر لطف اٹھانے کی آرزو فطری ہے۔ بیکے کے چیلے سے پھیل کر گرنے والے کسی موٹے آدمی پر بیٹنے، کسی نیم پاکی انسان کو کتے و شکار کرنے کی صورت میں اس کا اظہار آج بھی عام ہے۔ اس میں مذاق کے پردے میں بنیادی طور پر وہ انسانی جذبہ پس پشت رہ جاتا ہے جو کسی بابر، بیکس و بے زبان سے ہمدردی و مدد کرنے پر پاکستان ہے۔ وہ خود رویاں اور فرامیاں جو آج بھی انسان کے پس میں ہیں اور جن کے لئے وہ قدرت کے آگے بے دست و پا ہے اس کو لطیفے میں المادینا ایک ایسا لطیفہ ہے جس میں کوئی جان، کوئی روح اور کوئی آمد نہیں جہاں طرہ کا اثر اور ذہنیاتی اثر ہوتا ہے اور

آج کل

اس بعض ذہنی پستی و کمزوری کا اظہار بھی ہوتا ہے جس میں آدھی آدھ ہے۔ عمل مذاق یا لطیفے کی انتہائی ناگزیر ذہنی ناچیز شکل کے ذریعہ ذہنی ارتقائی منازل طے کر کے اب یہ صورت اختیار کر لیں کہ ایک انسان دوست انسان کی ذہانت کی اپیل کے اوپر۔ بہت ہے۔ کون تکمیل لیا ہے جو اپنے ہم طبعوں و ہم زبانوں کو کش کرنا پائپر کرے گا اور جو ذہن کا اس ثابت کا مالک ہوتا ہے باعزم و ہرمل عزیز بھی ہوتا ہے۔ بذلت کی کسے سائے کی لطافت و نزاکت نے اہل علم کو بہت جلد اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ علم و اخلاق کے مہلبین نے اس کے پردے میں نا آشناؤں کو آشنائے لازم کیا۔ جہالت، ظلم اور سوسی انصاف کے طوفان پر عقل و ذکاوت کے بند باندھے اور لطیفہ والا سطرطو پر اصلاح و تربیت کا ذریعہ بن گیا۔

ہمدردی و انسانیت کی جھلکیوں کے ساتھ گہری وابستگی نے تحریر، تحریر، عمل، صوت، حرکات و سکنات کے ذریعہ اس کا اظہار عام تمام کر دیا۔ فنون لطیفہ کی یہ شکل رفتہ رفتہ خواص و خواص میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہوئی۔ ان کے لطافت نے زندہ دل بزرگوں کے جیسے مکالموں کی شہزادہ بندی میں وہی طبیعت اختیار کر لی جو قوی اور ملکی ادب میں دس گیتوں کی ہو سکتی ہے۔

بیرشتائے غلاب قیاس و اخلاق لطافت ہنوز علم سیدھی کی پہنائیوں میں غرق رہے۔ خواص اور اہل علم تو دور کا رومال کا شعور و سنجیدہ لطیفے میں بھی انھیں قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی نفی ایک طرف تعلیم یافتہ اور بہت ہی لطیفے کے تو وہ سری جانب مذہبی و اخلاقی حلقے بھی ان کی کلمہ کلا خدمت کرتے رہے اسی وجہ سے پست و اخلاق سوز لطافت مجلس و مقلی کبھی زینت نہ بن سکے اور اسی طرح یہ بلحا کا گرا ہوا ان کی نگاہ کی زینت و زینت بن سکے۔ نگہروں میں وہی صاف سطر اور پاکیزہ لطافت مقبول رہے جو ذکاوت و ذہانت کا مرقع تھے اور جن کے انوکھے پن میں سکرا بھولوں کی بھلیاں اور فقہوں کے اترتے۔

چونکہ لطیفہ گوئی قاری اور سامع دونوں کو فائدہ پہنچاتی ہے او ہر کسی کی دل بہبود چیز ہے اس لئے اس کے بارے میں ہرگز دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ بعض محققین، معتمد و سیاست دان بھی وہی سمجھا گیا جو ساتھ ہی اچھے لفظ کو بھی ہو۔ جو فحش مضمن، مرطوب اور حصول خواہش کی شکل

اپنی بڑائی سے دوسرے کے اپنی حاضر جوابی کی سامع و قاری سے فی البدیہہ داد حاصل کر کے۔

یہ بحث بہت پراپی ہے کہ ہم کس چیز کو خلاف تہذیب کہیں گے اور کس کو تہذیب کے دائرہ میں لائیں گے۔ فتن و فتن کے الفاظ بھی بنتی ہیں۔ کل ملک جو مریوب تھا وہ آج سراپا جریب سمجھا جاسکتا ہے اور آج جو مستحق ہے ہو سکتا ہے کل اس کا شمار گناہ گیارہ میں کیا جائے گے۔ تقدیر بدلتی رہتی ہیں۔ انہیں کے ساتھ فکر و فکر کے پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم لکھنؤ کے شرفاء بے تعلقی سے سر بازار منسلک کرتے ہیں۔ کتے، فخرے چست کرتے تھے مگر آج کی تہذیب اس کی نواوا نہیں بلکہ یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ گزشتہ لکھنؤ کی کڑی تہذیب آج کے مقابلے میں بہت ملتی ہے اس کے معیار دانشمندی کی آج بھی ہم کھا سکے ہیں۔ یورپ میں سربراہ زار کی حسیہ کا دوسرے لینا اس سے مل کر ہوتا حسن میں داخل ہے اور اس کا نظرا مذاکرہ بنا دلائی دگر آج بھی ہماری مشرقی تہذیب میں یہ انتہائی سیوہ سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے کی کوشش کرنے والا اطلاق و قانون گرفت میں آجاتا ہے۔

کسی کو خوش کرنا عقلاً و اخلاقاً ایک مستحسن فعل ہے۔ اہل ایمان کی ایک ترفیل یہ بھی ہے کہ "ان کے ہرے ہنسنے ہونے ہوں گے"۔ لیکن کو مزاح المومنین کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور مزاح کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ وہ "مزاح کی کوشش کرتا ہے اور شیریں سخن ہوتا ہے"۔ خود حضرت علیؑ نے اسے "حکمت کے نحرین کا قصہ" کہا اور "اشرف المخلوقات کی پہچان" قرار دیا ہے کیونکہ بڑی سخی سے عقل پر عطا ہوتی ہے۔

لیکن یہ چار تہذیب ہوتی ہیں :-

۱۔ تبسم آفرین

۲۔ خندہ و مذاہن

۳۔ تہنچہ

۴۔ کینچہ

تبسم آفرین کا شمار مزاح یا سفیدہ ظرافت میں ہے۔ یہ لیکن کی سب سے اعلیٰ قسم ہے اس کا تعلق دل سے نکلے ہوئے کسی جرسینہ فخرے، اچانک واقعے یا خوش گوار حادثے سے ہوتا ہے۔ اس کی تریک بڑی بچی

خوش مذاق، مزاحیہ یا کسی تلیح کے پردے میں ہوتی ہے۔ یہ فطری لطافت مخصوص شخصیات، واقعات، فضا اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس میں جذبات کی تسکین، مسرت حاصل کر کے اور دوسرے کی ذانت پر ہنسنے اور ہنسائے پر مبنی ہوتی ہے۔ غیر معمولی تاریخی شخصیتوں کے حوالہ میں اور فہم انسانوں، رہنماؤں، فلسفیوں، سیاست دانوں، معلموں، مبلغوں، صحافیوں اور دیگر شخصیتوں کے حالات و واقعات اس قسم کے دلکش لطافت سے چر میں یہ تعلق بے غم ہوتے ہیں اور سامع کی حد تک انسان کو مسرور کر کے اس کے چہرے کی طرف سے جاتے ہیں۔ اس طرح عام زندگی بسر کرنے کی قوت ہنسی کی صورت میں نکل کر پڑ جاتی ہے مثلاً:

شاہ عراق جس وقت تیارہ سال کے تھے اور ملدن میں زیر تعلیم تھے ایک دفعہ ایک ابراہن غنیا نے اسے کہا "چپ ہیں یا نیکس کی سواری ہوتا ہوں تو تیرے سوچنے کی رفتار دگنی ہو جاتی ہے"۔ شاہ نے جواب دیا "پھر تو آپ کو کوڑا سائیکل چڑھ کر سوچنا چاہیے"۔

لیکن یہ دوسری قسم خندہ و مذاہن نامہ ہے۔ اس کا شاہ رضان کے ذیل میں آتا ہے یعنی چھیڑ چھاؤ، چوٹ کرینے، جلد چکانے، فخر یا پھینچنے، کتے، ضلع ملک کرنے یا طنز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں افادیت ہوتی ہے اور خواہش کی تسکین کے لئے دوسری پروری کیا جاتا ہے اس میں علم تکین کی بوجہ ہنسی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً:

اسکر وائلڈ کا ایک ڈرامہ اپنی بات کو قیل ہو گیا
دوسروں اس کے دوست نے پوچھا "کہو یا تمھارا
ڈرامہ کیا رہا؟" اسکر وائلڈ نے جواب دیا "ڈراما
بے حد کامیاب رہا لیکن دیکھنے والے قیل ہو گئے"۔

لیکن تیسری قسم تہنچہ ہے یہ تہنچہ کی ہرست میں داخل ہے اور لیکن کی سب سے خالص قسم ہے جو ظرافت، خوش مذاق اور لطافت کی پیداوار ہے۔ اس میں خاص چیز اس کا بے ساختہ پن اور انوکھی سادگی ہے جس سے مزاح و قاری بے اختیار اور اچانک ٹھٹھا کر رہنے لگتا ہے اور یہی نہی دراصل شکل ہے اس سبب کی جو ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً

دقائق و ماحول کے سامنے میں پروان چڑھتی ہے۔ وقت اور حالات موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلے ہوئے خیالات کا انکراؤ۔ جدید و قدیم کی شکل میں کسی دور یا کسی بھی زمانے میں سادہ و معصوم جذبات کے ہمارے شگفتے کھلاتا رہتا ہے۔

لیلیٰ نے کوہ جملی مزاج میں کہا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اس کے پٹاٹ اور مکالمات کا انداز عمل اپنے ایجاز کی مدد سے مزاحیہ فضا کی تعمیر کرتا ہے۔ تاثراتی و صحت و اندلیق کی تنقید کی تکمیل اس اختصار کے ساتھ عمل میں آنے کے اس کی منزل اتنی مختصر ہو جائے کہ رادھ کرنا دیا جا اُدھر لاک بوجھا جھول کی ترسش خراش ادب پرستی بھی ابلاغ کے عمل کو تیز تر کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے محسوساتی محلوں میں حسن ادا و حسن بیزن کی جو بھی چیزیں ہیں تاکہ محسوس کا رکھ رکھاؤ مہینے ہوئے لحاظ میں ہنسی کے بلبلوں کی صورت میں ظاہر ہو سکے۔ مزاج پر بیان اظہار ادا و اسلوب و خیال کے عمومی ساچے، سماجی افراد کی ذہنی ساخت و درجہ ذات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ان لطافت کا تاثر کچھ اور شدید ہو کر ادر و دیر پا ثابت ہو سکے۔ لیلیٰ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس کی دنیا میں جہاں وصل و دل کش سرور و سرور سخی و قصاں نغمے و دیاں ساج کے ہیں افراد کے لئے یہ پیش کیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکیں۔

لیلیٰ سننے ہی ہم سے اختیار رہنے لگے ہیں اس لئے اس کا براہ راست تعلق فنز و مزاج سے ہے۔ فنز و مزاج کسی مزاحیہ کردار مزاحیہ صورت و اقدار، عقلی بازی گری، موازنہ یا قرینیت کے رنگ روپ میں ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس کا تعلق کسی بھی لیلیٰ میں اس کی کسی مذکورہ شکل یا صورت سے ضرور ہوتا ہے جن کے لیلیٰ سے بہت ہی نازک تعلق و لطیف فرق ہے۔ اس لئے اس کو ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی دو کیفیتیں ہیں جن میں لیلیٰ یا عموم جنم پاتا ہے۔ مثلاً:

فنز، مزاج، اطراف، امر، فنز، لمبا، بڈوگٹی

حاضر جوابی، مذاق، عملی مذاق، خوش مذاق، اداکاری

قرین، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، انکار، رعایت لفظی

ضلع جگت، مغرب، جھو، جھوٹ، عربانی، ہزل، زرق

فنز، صبیح، آواز، لمحہ، فنز، فنز، بازی،

جمل بازی، چوٹ، جملی ٹی

لیلیٰ کو عموماً ظریف ہوتے تھے جو خوب صورت، خوش سیرت خوش قیافہ، خوش بیان، ذہین، دانا اور متدل ہوتے تھے۔ وہ چرب و نرم آواز کے فن سے بھی واقف ہوتے تھے۔ وہ لطافت کے پردے میں تاریخی محلات اور نصیحتوں کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کے اعلیٰ نمونوں سے بھی روشناس کروانے چلتے۔ مثال کے طور پر درویشوں اور داناؤں کی عقل مندی، خود دادی، نیا نیا، حق پرستی، جرات اور عدل کی مثالیں پیش کرتے اور حکایتیں سناتے کیونکہ ان کا سب سے اہم فریضہ پیچہ کو موم کرنا ہوتا تھا اور عرض کرنے سے پیشینہ جان کی ادا پانے کے باوجود جان سخت خطرے میں رہتی تھی۔ مطلق، افسانہ حکمرانوں کے نیم و دوزیر کی مشیت سے ان کے اندر روش خیالی اور توازن پیدا کرنا انھیں عدل کی سیدھی گیر سے نہ جھٹکنے دینا اور لیلیٰ کی لگنے کے ذریعہ رعایا کے ان گل پاؤں کو غیر شعوری طور پر نازک کر دیا وہ راہ عدل پر لٹکا دینا ہوتا تھا۔ خارجی و بیرونی معراشات، عدم توازن بے ڈھنگے ہیں اور عدم تکمیل پر فنز کر کے وہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ ان کا مقصد اس کے پردے میں عمل جرائی کر کے فساد و فحشا دور کرنا بھی ہوتا تھا۔ سولی پر چڑھتے وقت بھی لیلیٰ سناتا ہی جرات و عظمت کی داستان ہے۔

ظریف حاضر جوابی کا آئینہ ہے۔ ان کے درمیان جو نازک کامیابی ہو تھی وہ شان و وقار کو اتنی دیر کے لئے جتنی بہت پیچیدہ ملکی مسائل، سیاست و تفکرات کے عالم سے اٹھا کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتیں جہاں بڑے سنی کے سر بیٹھے سے مرث و ذات کے سوتے ہوئے تھے۔ علم و حکمت کے یہ مہذب جیسے ہلاسی منطقی ادا کے سامنے خود کو خود بخود اس ذہنی سطح پر لے جاتے جہاں پھر اتنا اپنے جوہر دکھاتی ہے اور ایسی برصیت یادگار ہو جاتی ہے۔

ہر دربار اور ریاست سے وابستہ لیلیٰ کو یا ظریف کہا کرتے تھے جس کا کام تھکے مارے حکمران کو اپنے باغ و بہار لطافت کے ذریعے تازہ کر دینا ہوتا تھا۔ ان درباروں میں جب تعیش کی ہسرانی انھوں نے

ساتھ لطف بھی نقل کرنے لگا۔ "نفاٹس، لکایات۔" "مغضات" اور "مطاباات سعدی" وغیرہ اس سلسلے کے عہد اہم گڑیاں ہیں۔ اردو کو یہ مذاق فارسی سے ورتنے میں ملا۔ شروع میں لطف، سنعلم ہوتے رہے۔ تیرنے فارسی میں لطافت پر ایک منتر رسالہ لکھا۔ اٹھا نے لطافت کے دریا بہائے گرا دی لطف کی باقا عہد استواء مرزا غالب سے ہوئی۔ مولانا حالی نے داگداہ غائب میں ایک لطف کو ایک باب کی صورت دی اور مرزا کو جیوان خریف کہا۔ اس وقت سے اردو میں مشابہت کی سوانح عربوں میں لطف کو بھی منگ دی جانے لگی۔ اسی زمانے میں "پیام یا وکھنؤ" اور "پیام عاشق قنوج" نامی نکلنے شروع ہوئے تھے جو اپنے لطف کے لئے مشہور ہیں۔ یہی اہتمام بدین "فتنہ"، "اودھ پنچ" اور "اودھ اخبار" میں بھی ملتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں لطیفوں کی دنیا آباد ہے جس میں اس کے اپنے لطیف ملے اور دوسری زبانوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر زبان میں ایک ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کی مترادف دوسری زبانوں میں نہیں ملتا۔ اس لئے مولانا کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ دراصل عربی کا لفظ ہے جس سے فارسی اور اردو میں آیا۔

انگریزی زبان میں لطیفے کے لئے ہم کو کوئی ایک مخصوص لفظ نہیں ملتا بلکہ Pleasantry, Wit, Wot, Jest, Joke, Humour, Quip, Fun, Irony اور Satire وغیرہ ملتے ہیں۔ دراصل ان سب کا لطیفے سے بہت ہی قریب کا تعلق ہے۔ مگر ہر قسمی ان سے لطیفے کا مفہوم مجھے طریقے پر نہیں ادا کیا جاسکتا۔ مغربی لطافت کرم اس عزائم کے تحت تسلیم کر لیتے ہیں جس مرتبے کے ساتھ وہ ہم تک پہنچتے ہیں۔

لطیفے کی ابتدائی شکل حکایتوں کی صورت میں ملتی ہے جس میں لطیفے کے پورے میں فیلسوف، بزرگ، دیوبلین، حویلیا کے کرام اور وزیر وانا شاہان وقت اور مریدوں کو ان حکمت اور نصیحت آمیز حکایتوں کے ذریعے راہ حق پر لگانے کی سعی کرتے۔ اس کی مثال حکیم الہی، لقمان، بقراط، ارسطو، افلاطون، دیوجانس لکھی،

میدان جنگ کے مقابلے میں حرم سرا اور جلوت کے مقابلے میں جلوت کو ترجیح دی کہ موت لطیفہ گوئی کا پیشہ عام ہوا بلکہ عرفاؤ کی کثرت نے اس پیشے کو اس کی سطح سے بہت پست کر دیا عام آدمی سے مذاق، عکرا، ٹھٹھل اور استہلال کی کھلی جھوٹے طریقوں کو سفر، جھانڈ اور لطیفے کو کشیدہ بنادیا درجہ لطیفہ گو نہایت گڑھا کر دیا، ترشا ترشایا ماہرین ہمارے کرتا تھا جس کی ذہانت، ذکاوت، علویت اور سمجھ بوجھ حاضر جہاں و بڑا بھائی اُسے دوسروں سے داد دلواتی تھی۔ باواسطہ طور پر وہ آتائیں، نگوان یا مشیر کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ بیسے میر علی اور علاء دہلیا زہ۔ جو محض خلیفہ بننے بلکہ درباری گری کے لئے وقت اور وزیر یا ترجمانی بھی تھے۔ وہ ملی معاملات پر ایک ماہر سیاست کی حیثیت سے بھی نظر رکھتے تھے۔

لطیفہ گوؤں نے بہت سے عربوں کی خطائیں و سزائیں معاف کر لیں سلاطین وقت کی کا باطل کی۔ بے قصہوں کو معفو کیا۔ منسوب مترادف ہوئے۔ جلا وطن حب وطن کے دامن سے ہم گناہ ہوئے۔ بلکہ داند کو یکک بنایا۔ مولوی یا شاہوں کو ان کے ملک واپس لوٹے بختہ خان کو دم بھر میں اسودہ کیا۔ ان گنت جھگڑے سے فیصلہ کر لئے۔ شاہان وقت سے پیش ہوا بھلے پائے۔

تقریباً ان افساد ہونے سے قبل لطف سیدہ یسینہ نسل ذلیل پہنچتے رہے۔ ان کی حدس زبان تنگ نہ تھی۔ تقریباً ان افساد ہونے کے بعد بھی عرصہ تک لطافت پر توجہ نہیں کی گئی۔ پھر سلاطین و مشاہیر کے حالات و تصانیف میں ان کی جھلک ملنے لگی۔ تسلیم کرتے ہیں کہ "حکیم الہی کی کہانیاں" ہے جو اس نے عربوں کے درس اخلاق کے لئے جانوروں کی زبان سے بیان کی ہیں۔ عربی میں سب سے پہلے عقلمر جاخدا (نشمہ ۱۸۵۵ء) اس کی تصنیف خود اپنی بات "کے لطف قابل ذکر ہیں جس کی تقلید میں دوسرے قابل ذکر ادباء وجود میں آئے۔ عربی سے یہ ذوق فارسی میں آیا۔ نکلی سرقتی نے مشاعرہ میں "لاؤاؤ" لکھ کر فارسی ادب میں لطف کا قلمبند کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ مگر سب سے زیادہ مقبولیت "عج لکایات" کو ہوئی اور فارسی میں یہ رواج استعارہ بڑا پکڑ گیا کہ ہر تذکرہ و بیان نظم و شعر و ادب کے

بزرگ جبر، دید، جان، برہمن، جعفر برہمنی، فتح، سدھی، جھکسر، ڈاکٹر جان
ابوالفضل، برہیل، ملا دہ پیارہ اور نعمت خان عالی محسن کرلیت
اور لطیفہ گوئی تھے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان مفکروں
مبتون اور دھرمیوں کے جیکہ نہ نکلنے کے لطیفے کو دیوار سے لے کر کتب
وغافلہ تک برابر تراشا، رشتا، سٹورا اور نالما۔ انھیں کی بنیاد پر
اطلاق و تہذیب نے گلستان پوستان اور انوار سہیلی جیسے خلک بوس
قصر قمر کرے۔

راج دربار کے ساتھ یہ فن بھی رخصت ہوا۔ اب کوئی سکاہلی
خان نہیں جو اتنے کے لطیفے نہ، کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو
ان کے حسن طلب کی داد دے۔ وہ یا راج و بہار شخصیتیں اب اس قدر
عام نہیں کیوں کہ ان کے اب قدرداں نہیں۔ یہ سب فراغت کی باتیں
نہیں جو یاد شاہت، جایگز داری اور زمینداری کے ساتھ رخصت
ہوئیں۔ راج راج سٹاٹ کے ساتھ لطیفہ گوئی دونوں رخصت ہوئے۔
’رنگیے بیا‘ اور ان کے جانشینوں کی سرپرستی زیادہ عرصہ قائم
نہ سکی۔ محمود واکر جیسے سرپرستوں کے ساتھ فردوسی، سدھی، ابوالفضل
اور میر جی جیسے ظریفوں کا دور بھی ختم ہوا۔ وزیر اور دھرم کی جگہ سوسے
بھانڈ اور مقصد خور سے زیادہ دن نہ رہ سکے۔ انھوں نے آتے
ہی اس قدر دھول اڑائی کہ لطیفہ کا دامن گرد و غبار سے اٹ گیا۔ اس
کی آب و ترگی۔ ”آپ“ سے ”تم“۔ ”تم سے تو“۔ کو تو میں میں
اوداس کے بعد عشوقاتی مظاہر سے ہونے لگے۔ شہنشاہی کی جگہ شہنشاہ
آئے لڑکے، اساک، لکھا کے انھوں نے مرزا مرزا کر اب کر کے ہی دم لیا۔
لطیفہ دربار سے باہر اڑ گیا۔ ضلع جلت اور جھٹیان اس پر حاوی
ہو گئیں۔ ان توانشات کا یہ اثر ہوا کہ لطیفہ گوئی کا بلند میاں گرے
رہا۔ علاوہ کی جگہ جہلانہ سبھالی۔ اجنٹی نا تھہ اسے سبھال نہ سکے۔
وہ عمل کے طور پر خواہم کی ذہنی سطح بھی پست ہونے لگی۔ اس کی
روشنی میں اگر ہم دہلی اور کشنہ کی حکومتوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ
محاشی اور سیاسی زوال نے اس تہذیبی زوال کو اور بھی تیز کر دیا۔ دوسری
دہائی ریاستیں ہی اس تاریخی بھاؤ سے آگے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ شہنشاہ
کے انقلاب، یوگرہی غلامی اور دیسی حکومتوں کے خاتمے نے اس کے

تلاوت میں آخری کھل ٹھونک دی۔ لطیفہ گوئی کی روشنی میں دیکھتے سے
یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی جہد کا کیا مذاق تھا۔

بادشاہت کے ساتھ لطیفہ گوئی کا ہر رخصت ہوا۔ لطیفہ باز
سے دربار میں واپس نہ جاسکا۔ اب ملک عام انسان کا تاج و تخت سے
علاحدہ کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن اناروٹی آزادی اور
جمہوریت اپنے ساتھ آزادی کا ہی نام لائی۔ ملوکیت رخصت
ہوئی۔ فرد کی اہمیت سماج میں بڑھ گئی۔ انفرادی حیثیت سے
پہلے چلنے چلنے کے مساوی حقوق نے شعنی آزادی کو سرسبز ہونے کا
موت دیا۔ شعنی آزادی کے ساتھ ادب و صحافت نے پھر سنبھالا لیا۔
جس کے دامن میں خلافت نے پناہ لی۔ بہت جلد ملو سمریز پھر
’اودھ پنچ‘ کے ہتھوں سے گنجلے لگا۔ اودھ پنچ لطافت کا مرثیہ
ہے۔ اب خلیف اور داستان گو کی جگہ کتب و رسائل نے سنبھالی۔
ملا نصر الدین کو اردو دالوں نے شہنشاہی کے روپ میں پیش کیا۔
عربی دالوں کے پاس جا خلد اور فارسی دالوں کے پاس ملا کا کردار
تھا گر اردو ادب اس میدان میں کوئی نمایاں کردار نہ پیش کر سکا۔
شہنشاہی، ملا جی، حافظ جی، پٹوات جی، لال جھکسر، شیخ جی، خاصا صاحب
نواب صاحب، انجمنی، میان جی کے پردے میں یہ لطافت سماج کی خاموش
پر طر کرتے رہے۔ کچھ شخصیتیں بھی ساتھ آئیں اور کچھ لطافت کی صورت
میں سامنے آئے۔ جلد جدید کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لطافت
کتب و رسائل کی صورت میں محفوظ ہوئے گئے۔

اردو ادب میں کلاسیکی لطافت کا ذخیرہ بہت کم ہے بلکہ
یوں سمجھ کر غرض و خاشاک کا ایک پہاڑ ہے جس میں نہیں کہیں کہیں
طرز و مزاج کی چنگاریاں دی ہوئی ہیں۔ ورنہ زیادہ تر ان کثافت
کی اور کثافت و عریانیت مذاق سلیم پر یاد گرتی ہے۔ ان میں
’گلستہ پنچ‘، ’خندہ غلی‘، مذاق کا پیارہ، اہنسی کا گول گپ،
دیوار معقبہ، لاجول، شیطاں، برہیل، ملا دہ پیارہ، شیخ جی، لطافت
نوراف، رنگ نرافت، غالب کے لطیفے، آب حیات کے لطیفے، لاد
چٹکیاں اور گنگلیاں، اویوں کے لطافت، لطافت، انشاء، امر کے لطیفے
سیاہ حاشیہ اور مجاز کے لطیفے اردو ادب کا ایک ایسا گلستہ ہے۔

کہ اس میں اسے اپنا کھویا ہوا درجہ اور ذخائرِ رفتہ و رفتہ واپس مل رہا ہے۔ اچھے ادبی انتخاب سائے آ رہے ہیں۔ ادبی رسائل، منتخب رسائل اور بحثوں کے رسائل خاص طور پر اچھے اور میاری لائف کو زیادہ سے زیادہ اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں۔

لیفٹ کوئی کی موجودہ صورت حال سے اس خیال کو تقویت بخوتی ہے کہ اس کا مستقبل خاصا واضح اور روشن ہے۔ اس میں اصلاح اضافہ اور ترقی کے امکانات بہت صاف ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے ساتھ اس کی ترقی بھی فطری دلازی ہے۔ زبان کے جھیلاؤ، گہرائی اور گہرائی کے ساتھ اس میں جو اضافہ ہو رہا ہے انکی میاری نیند اور میاری جگہ۔

جس میں کئی بھی ہیں اور کئی بھی۔ بیشتر لطافتِ مہربان کے مذاق و میاری پر پورے نہیں اترتے۔ ان مجموعوں کے ساتھ ایک لیفٹ یہ بھی ہے کہ عموماً بیشتر کتب میں تقریباً ایک ہی سے لیفٹ معمولی رد و بدل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ وقت کی گزرنے ان کا چہرہ ماند و مسخ کر دیا ہے۔ دفتر کے دفتر اسٹے پر بھی اس اوقات ایک لیفٹ بھی ایسا نہیں ملتا جو اعلیٰ علمی و ادبی میاری پر پورا اتر سکے۔ بعض کتب میں خال خال ایسے بھی لطافت مل جاتے ہیں جو روح کو پھرنا کا دیتے ہیں۔ ذہانت کو حرکت دیتے اور ہمارے لئے مسترت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ دورِ حاضر اور دو لطافت کی تاریخ میں اس دے سے اہم ہے

ساقی لکھنوی

غزل

جہاں نفاق کے شیط میں بھجا کے چلو
چراغِ امن و محبت کا تم جلا کے چلو
تمہارے بعد بھی آئیں گے قافلے یا رو
میں بورا میں کانٹے انھیں شا کے چلو
نہ میکے سے کبھی کوئی تشہ کام پھرے
نظامِ مے کہہ ایسا تو کچھ نیا کے چلو
تھکے ہوؤں کو ملے جن کی چھاؤں میں آرام
شجرہ کچھا ایسے سر ہر ہلکڑ لگا کے چلو
ابھی تو کام انھیں بھی بہت سے باقی ہیں
نمودِ صبح ہے سوتوں کو بھی جگا کے چلو
اشارہ وقت کا یہ ہے کہ اسے جہاں والو
نیا زمانہ کی تفریق کو مٹا کے چلو
مرہ تو ہنسنے کا جب ہے کہ اپنے ساتھ ڈو
عہ زمانہ کے ماروں کو بھی ہنسا کے چلو
بھٹک رہے ہیں جو راہوں میں دیں گے تم کو دعا
نیا زمانہ کی تفریق کو مٹا کے چلو

مے ہیں ہوش و خرد اسے نہیں ساقی

جنوں کی راہ میں ہوش و خرد شا کے چلو

قطعات تاریخ وفات جگر مراد آبادی

(درصندت قنبر ج)

اے مہ افوس رحلت کر گئے حضرت جگر
کیوں نہ اک ماتم کدہ اُسے نظر ہندوستان
دور حاضر کے تھے یہ اک نکتہ سنج بالکمال
کر رہا تھا نازان کی ذات پر ہندوستان
علقہ ارباب فن میں آج ہے ان کی کمی
جس قدر بھی ہو تو کم ہے نوحہ گر ہندوستان
نام آور مستیوں نے پائی اس میں پرورش
ہے جیسی گہوارۂ اہل ہتر ہندوستان
توڑ میں ہیں کہا ذاتی نے سال انتقال
چرخِ یزجاہ ہے مہ اے جگر ہندوستان

۸۰	۷۰	۶۰
چرخ یزجاہ ۱۰۴۲	ہندوستان ۵۴۶	۱۰۲۴
۲۵	جگر ۲۲۳	۳۵۳
۱۰۲۴	۳۵۳	۱۳۸۰

(درصندت قنبر ج)

اب کہاں وہ روئی بزم سخن
اٹھ گئے دنیاے فانی سے جگر
ساجد ابو گشتِ شہر و سخن
محسوس اُردو ادیب نامور
آفتاب آسمانِ علم و فضل
تلمِ شہرت کا رخسندہ جگر
تھی ربیع الاولین کی ہفتدہم
دے گئی مرگ جگر داغِ جگر
بے سرو و پاسبانِ ذاتی بہر سال
حسن و عشق و رقت و فکر و فکر

۸۰ ۷۰ ۶۰

(درصندت قنبر ج)

بڑا افسوس کی جہاں سے علی سکندر جگر نے رحلت
غزل سرا کی انجمن پر فرسروگی پچا دی ہے دیکھو
بکلم سیناے نکتہ ذاتی قسیم ہیا نے خوش بانی
شکر اس کو قضا ودا اپنے کے پر پچا دی ہے دیکھو
ربیع اول کی ہفتدہم اور جمعہ کی جمع حتی قیامت
اگرچہ ہم ہیں جگر نہیں ان کی یاد ڈیاری ہے دیکھو
جگر نے پانی عجب بسیت جگر میں دیکھی ملا کی حیرت
یہ جام چھلکاری ہے دیکھو وہ کیت برسا دی ہے دیکھو
کہا ہے ذاتی نے تخریہ میں سن وفات اس طرح سب کو
جگر سے خالی زمین ہندوستان نظر آ رہی ہے دیکھو

۸۰	۷۰	۶۰
زمین ہندوستان ۶۸۳	۴۸۳	۴۰
۲۵	۲۲۳	۳۵۳
۱۳۸۰	۳۵۳	۱۳۸۰

(درصندت قنبر ج و تلمیہ)

اک حشر ہے برپا چمنستانِ سخن میں
نہیں کے عوض آتی ہے آوازِ فشاں آج
اربابِ ادب ہم سے پھوٹے گئے افسوس
سیماب کہاں آج ہے حیرت ہے کہاں آج
کس بزم میں کس دل میں نہیں یا دگر کی
ہے سوگ یہاں آج تو ماتم ہے وہاں آج
ذاتی نے کہا تلمیہ و قنبر میں سال
ہے خاک بسرِ مجید غزل اشک فشاں آج

۸۰ ۷۰ ۶۰

۸۰	۷۰	۶۰
غزل ۱۰۳۴	۴۴۴	۴۱۴
۴۲۱	۴۱۴	۱۳۸۰

کشمیری ادب میں دیگر زبانوں کے تراجم

میں ملحق ہو۔ کامیاب ترجمہ دی کہلایا جاسکتا ہے جیسے پڑھ کر نہرت اصل کا گمان ہو بلکہ اس کی اصلی لطافت اور شیرینی میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے۔ اعراس پاؤں کے پیش نظر علماء نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ترجمہ کرنا ایسا اوقات اصل شعر کہنے سے زیادہ مشکل صورت اختیار کرتا ہے۔ بہر حال اس بارے میں فرماتے ہیں:

”ہر زبان کے خصائص کو بھی منتقل نہیں۔ جس طرح ایک روزمرہ یا محاورہ استعارہ تاثر میں ایک خیال کو ادا کر سکتے ہیں۔ عروضا نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی اسی قبیل کے الفاظ موجود ہوں۔ اس سے بھی زیادہ مشکل املاحات کی ہے۔“

منظوم چیز کو محض منظوم سا بچے میں ڈھالنا اور وہ بھی اس طریقے پر کہ نہ تو اصل کے ساتھ انصاف ہو سکے اور نہ ہی ترجمہ سے کوئی مفید حاصل ہو۔ ایک طرف اگر معتقد کی عرق ریزی کو مترجم کی تخریج میں پختہ بن کر لے کر شہوت و تباہی دے دیا جائے خود مترجم کی فنی خامیوں کی قلعی کھول دیتا ہے۔ کئی ترجمہ کی دیکھ کر اکرادہ جیشہ تراجم اسی کج کا شکار نظر آتے ہیں۔ تفصیل کے ساتھ آگے بحث ہوگی فی الحال ہم ذیل کی دو مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ فارسی کا ایک مشہور مصرعہ ہے:

بہا سانی کہ چون یرم کنی از برگ تا مگر کنی

اور ہمارے گھٹ ٹھٹک بندشا ہرے اسی مصرعہ کو اپنی زبان میں یوں ڈھالا ہے:

کس ملک اور قوم کے ادبی خزانے بھی بالامال کہلائے جاسکتے ہیں کہ ان کا احاطہ دوسری زبانوں کے ادب عالیہ سے خالی نہ ہو۔ ہندو دنیا کی تمام بڑی زبانوں کی گہرائی اور گہرائی بہت حد تک اسی بات کی مرہون منت ہے کہ انھوں نے اپنے دامن کو عالمی ادب کے گنج خانے گراں مایہ سے بھر لیا۔ ہر قسم کے ادب میں طبع ذاتی تعلیقوں کے ہونے ہوئے بھی دنیا نے ادب کے عظیم ادبی شاہکاروں کے تراجم ہی دراصل اس کے ذخیرہ میں وسعت اور پُر دامنی پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ تاریخ ادب میں بتاتی ہے کہ کچھ زبانوں کا ادب آج سر ملے دار ہے انھوں نے وقتاً فوقتاً دوسری زبانوں کے ادب سے اپنے کو متاثر کیا۔

ایک زبان کا ادب دوسری زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس کی بدولت جہاں کس قوم اور ملت کی ثقافتی دنیا میں غفلت و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے وہاں اس ملک قوم کے افراد دوسری ملکوں کی سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے جزو یا کچھ کیفیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔

ترجمہ کرنے کا کام جہاں مترجم سے اس کی فنی صلاحیتوں کا متقاضی ہوتا ہے وہاں اس بات کو بھی ناگزیر قرار دیا جاتا ہے کہ مترجم دونوں زبانوں یعنی جس سے ترجمہ کرنا مقصود ہو اور جس میں ترجمہ کیا جائے پوری دسترس رکھتے ہوئے ان زبانوں کے تکیا و تکیا کو سنوئی و صوری دونوں خوبیوں کے ساتھ استعمال کرنے

وہ وہاں آیا مورو لیکن کرے نیم دُ چھے پند کوئی

اسی طرح ع

عاشقی جیتے ہو سبندہ جانان بون

کالے جان سافلے تر جہ اس طرح کب گیا ہے ع

عاشقی کیا: پھر دُ و بندہ جانان آتش

کثیریری ادب کے شری خزینے کی حقیقت فارسی شاعری کے
خرمن کی خوشہ چینی سے ہی مالا مال ہوئے ہیں۔ فارسی مدون تک بادشاہ کثیر

کی درباری زبان ہی ہے اور اس زبان کے پھیلاؤ نے یہاں کے

یا مشہور بلقہ کو بھی فارسی علم و ادب کی طرف راغب کر دیا۔ اس سلسلے میں

سب سے زیادہ ہمارے شاعروں نے فارسی کا اثر قبول کیا اور ان کے

کلام میں فارسیت کی چھاپ نظر آنے لگی۔ اس چیز نے جہاں ہماری زبان

کے دامن کو اور بھی وسعت بخشی وہاں ہمارا ادب اسی کی بدولت

پروان چڑھا گیا۔ محمود گامی، رسول میرا، مقبول، حقایق اور دُ و بیکانی

ہمارے ان معنی ورن کے سرپرست ہیں جن کی شاعری کے چٹے براہ راست

فارسی کے سونوں سے چھوئے ہیں۔ نانا کہ بعض جگہ انھوں نے فارسی

زبان و ادب کو بے جا تقلید کی حد تک اپنایا لیکن شہسوار کی طرف

ایک اچھی سی نظر ڈالنا سراسر مانعائی کے مترادف ہوگا۔ اسی

اتباع اور تقلید کی بدولت ہمارے ادب میں شاہنامہ دور کی جیسے

عظیم ترین شاہکار اور گل ریز جیسی مقبول عام مثنوی کا اضافہ ہوا۔

فارسی مثنوی کا ہمارے ادب میں داخل ہونا بالخصوص ہمارے

ادبی ارتقاء کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا۔ فارسی مثنویوں کو کثیریری میں

نتقل کرنے کی وجہ سے ہی شیریں خسرو، دامن قد، ایلچا، مجنون اور

شاہنامہ کی داستانوں کے اکثر گہوارہ ہمارے زندگی کے اتنے قریب

آئے ہیں کہ ہم آج بھی اپنی محفوں میں ان کے کارناموں کو مزے سے لے

کر بات کرتے ہیں۔

محمود گامی، شمار، حبیبی صدی میں منظر عام پر آیا۔ اس نے

اگرچہ شاعری کی نسبتاً پرصفت میں طبع آزمائی کی لیکن اس کے کلام کا

بیشتر حصہ فارسی داستانوں کا منظم کثیریری ترجمہ ہے اور یہی وجہ

ہے کہ اس کی شاعری میں جا بجا فارسی ادب کے چہرہ پورا کے ساتھ

فارسیت کا ڈھام نھرتا ہے۔ بایں ہمہ ان تراجم نے ہمارے ادب

میں خاطر خواہ اضافے کیے۔ محمود علی مجنون، شیریں خسرو، یوسف زلیخا

سلطان محمود قرظی، قہرہ مارون الرشید، رشید قسان اور شیخ مستور

جیسی فارسی مثنویوں کو کثیریری زبان میں نظم کیا۔ محمود علی مجنون اگرچہ

عیارت کے لحاظ سے نکلی ہوئی مثنوی کی بجائے مجنون سے منسلک، لکھا ہی دیتی ہے

لیکن پھر بھی محمود اس میں نکلی کے خرم کای خوش چین رہا ہے

قہرہ مارون الرشید بھی نکلی ہی کے ایک نقشے سے ماخوذ ہے۔ مثنوی

یوسف زلیخا اور شیرینی خسرو بالترتیب مولانا جامی اور نلسا کی

فارسی مثنویات کے تراجم ہیں جن میں بعض جگہوں پر اگر کب مترجم نے

ایجاز و اختصار سے بھی کام لیا ہے لیکن داستانوں کی دلچسپی اور

معنوں کے تسلسل میں محمود کے قلم کے کوئی فرق نہ آنے دیا ہے۔ ان

مثنویوں کے اخیر میں مترجم مثنویوں کو ان الفاظ میں عہدیت پیش

کرتا ہے

درد زلیخا و آن بہ حضرت جامین دونے کا مشعر ہاں طبع ہو گیا (یوسف زلیخا)

ہزاراں رحمت حق پر نکلی غلام دلہن محمود گامی! (شیریں خسرو)

مثنوی یوسف زلیخا میں اختصار سے کام لیتے وقت محمود نے اپنی

اخلاقی روایتوں کے پیش نظر یا تو کچھ ایسے حصے حذف کر دیے

ہیں جو کسی بھی صورت میں کثیریری کے ایک سنجیدہ قاری کے حسن ذوق

کو ٹھیس پہنچاتے۔

مثنوی کے اخیر میں چومرثیہ، مادالایہ میانہ یوسف و دُ و یوسف

کے مرثیہ پر زلیخا کی زبان سے اہلو ایسا گیا ہے وہ آج بھی کثیریری

زبان و ادب خواص ہے۔

مقبول کرانہ اداری ۱۸۰۷ میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب

کثیریری کے اہل علم بلقہ میں خاص طور پر فارسی زبان کا فروغ تھی۔ چنانچہ

اس صدی کے مشہور شعراء محمود اور رسول میر کے کلام پر بھی فارسی

زبان کا گہرا اثر ہے۔ مقبول خود فارسی علم و ادب سے آشنا تھا وہ بھی

اس اثر سے بچ نہ سکا۔ گل ریز، کثیریری ترجمہ بھی درحقیقت اسی

قدوم منزلت کے رد عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو اس دور میں فارسی

زبان و ادب نے سرزمین کثیریری میں حاصل کی تھی۔ یہ ترجمہ مقبول نے

۱۸۶۳ء یعنی اپنی عمر کے اس حصے میں کیا جیلاس کا شور فٹکی کے لحاظ معراج کمال پر تھا۔ یہ اس وقت ۱۲۸۶ھ میں بہار کے دنوں میں پایہ تکمیل کو پہنچی جیسا کہ تاریخ اختتام کے بارے میں خود متبادل لکھا ہے۔

سنا بہا ہمشہ فیہ پیچو شستین برابر
بہار سن منزیر نسو۔ دوت تاسر

۱۲۸۶ء میں مزید مثنویوں کی اگرچہ کوئی کی نہیں لیکن مکی ریز نے اپنی سلاست اور شاعرانہ وقت گیری کی وجہ سے ان سب پر سبقت لی ہے۔ واضح رہے کہ کبیری ادب میں کل ریز سے زیادہ کسی مثنوی کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا اور اس کے اشعار ہمارے عوام کی زبان پر ہیں جن میں طبعوں اور اجتنابوں میں آج بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ قطع نظر ان اوصاف کے مقبول کے یہاں بھی مکی فارسی کی اس قدر بہتات نظر آتی ہے کہ اسے "تقلید ہے جا" کا نام دینا مبالغہ نہ ہوگا۔ ترجمہ میں وہ بھی لیر کی پس و پیش کے فارسی الفاظ اور ترکیب استعمال کرتے چلے جاتے ہیں جو کافوں کو بوجھل معلوم ہوتے ہیں اور مثنوی کی ابتدا تو خاص فارسی کے اشارے سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

خدا یا جسہ امید بنا کے درے از حکمت جاوید بکشاے
چراغ حرکت و لہیم بر افروز زبانم در سخن در سفتن آموزد
مبتلی حنظل را بار طیب کن زبانم پر شکر از نوش لب کن
دودوے شمار و نصب بے حد و دام باد از ما بر محمد
سرم بادا نثار چار یا رشن فدائے آل و اصحاب کیاوش
شاہنا مکلایسی ادب کا ایک ابا عظیم کارنامہ ہے جس نے
فردوسی کو ملک الشعراء بنا کر دئے زمین کے سمن فہوں چراغ مریخی
دھول کیا

دب پر سے بنے شاہنامہ کو کبیری میں منتقل کر کے دل گوشتے کا ایک قابل داد شجرت دیا ہے۔ اس ترجمہ کی بدولت کبیری ادب میں رزمیہ شاعری پہلی بار نظر آتی ہے۔ اپنی بیاد نویسی کی وجہ سے وہاں اگرچہ کبیری معنی میں اپنی نیل نہیں رکھتے مگر سن کارنا

نے ان کی ادبی شخصیت کو ہمارے سامنے ایسا کر دیا ہے وہ بھی ترجمہ ہے۔

وہاں ابھی بس بلوقت میں قدم ہی رکھ چکے تھے کہ انھوں نے شاہنامہ کا ذکر سنا ہوا نہیں دلوں میں سے ایک مبلغ سے چپ کر شائع ہوا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہاں کو دستیاب ہوا لیکن مالک نوح کے واپس کرنے کے اصرار نے وہاں کو اس کے ترجمہ پر حرکت کیا اور اس نے کہا ہے

تر کوز تھ بیزت سیٹھاہ خارم گوم اژان کیند زن سے دے تار سوم
سبب بچہ بچہ از خارہ بازی بن غیم رے شاہنامہ کا مثنوی
ہر چند وہاں کا فردوسی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس کا
سارا کلام دروغ گوئی اور سن فحشٹ افسانوں کا ذخیرہ ہے۔
بچہ سور دی کلام دروغ و دراب بچہ رادی تیک لیا دان تو صواب
کہرگو ز بر نلکم آراستم بکشم دروہر چہ خود خواستم
لیکن وہاں کا یہ دعوئی ان کی سائنہ آمیزی کے سوا اور کچھ نہیں کہ
بچے داوہ درودان تھا سوم بڑھ

لیکن وہاں کا یہ دعوئی ان کی سائنہ آمیزی کے سوا اور کچھ نہیں کہ
بچے داوہ درودان تھا سوم بڑھ

فہ کی عظمت و رفعت کی آخری منزلوں کو روک چکی ہے۔
وہاں کو نیزہ شاہنامہ کے حاصل ہونے کے واقعہ کے پیش نظر ثابت ہے کہ وہاں نے کسی ادبی مقصد یا طبیعت امتگ کے تحت ترجمہ کرنے کا کام نہ لیا تھا۔ اس میں غیرت یا رشک کا جذبہ کارفرما تھا۔ ظاہر ہے کہ جذبہ ثانی کے مطابق کوئی ادبی کارنامہ صحیح معنوں میں پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں چونکہ اس وعدہ سب سے ہشکارا دیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ خود بیان کا شاہنامہ قرار میں ہے وہ جو سن و خروش کیتا پیدا نہیں کر سکا ہے جس کی وجہ سے فردوسی کا لوٹا جاتا ہے جس شاہنامہ نے فردوسی کی دلوں سے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اس کے قلم برداشتہ ترجمہ میں (جو بجائے خود عظمت میں مکمل ہو سکتا ہے) تجلی کی طلب اس بات کی آمیزہ دار ہے کہ وہاں نے یہ

کھیل سترہ مترود کیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنے آپ کو بچے چیلنے سے باز رکھنا ہی مناسب سمجھا اور اسٹھ ہزار اشعار کو تیس ہزار اشعار میں تبدیل کر کے دم لیا۔

دناپہرے نے فارسی کے بہت قصبہ مکہ مکرمہ، قصبہ چہارم و مدینہ، بہرام گور اور حمید اللہ اسلام آبادی کے ایک نامہ کو بھی منقول کثیر میں تابعت کیا ہے۔ علاوہ انہیں انھوں نے اردو کی ایک عشقہ داستان 'فہماں گلبدن' کو کثیر میں لاس پہنا دیا ہے۔ ان تراجم کا تفصیلی ذکر زیادہ اہم نہیں۔ مولوی صدیقی اللہ حاجی نے نظامی کے مسکڑ نامہ کا کثیر میں ترجمہ کیا ہے جو حد سے زیادہ اقتصاد کی وجہ سے اصل کا ایک خاصہ معلوم ہوتا ہے۔

پیر عزیز اللہ حقانی کثیر زبان کے ایک صوفی شاعر گورہ ہیں جنھوں نے ابتدا سے ہی فارسی کا بخور ملا سہ کیا تھا۔ انھوں نے فارسی کی چند مشہور معروف مثنویوں کو کثیر میں منتقل کیا جن میں جوہر عشق، قصبہ ممتاز ہے، بغیر، گلرستہ، بغیر، مثنوی چند بک، سرو و گی انعام، گلشن عشق اور جنگ سواق اور روشنتا انشہاء وغیرہ شامل ہیں۔

حقانی کی ان جملہ تالیفات میں قصبہ ممتاز ہے بغیر ایک غلط اور رنگیں رومانی داستان ہے جسے مترجم نے چھ جلدوں میں نظم کیا ہے۔ مجموعی طور پر حقانی نے جو داد و غزل کے میدان میں حاصل کی ہے وہ انھیں تراجم میں تعیب نہ ہو سکی۔

گلستانِ سدی کی چند ابتدائی حکایات کا کسمر احمد نے کثیر میں ترجمہ کیا ہے لیکن اس میں وہ فصاحت و بلاغت نام کو نہیں جو سدی کے اس شاہکار کا خاصہ ہے اور مترجم اپنی زبان میں اس کی متعلقہ اور سچی عبارت کا ماہر گرنے سے کوسوں دھرے ہیں۔ مثلاً

اذا شرب الانسان طائلاً بسائتہ
کسب ترنم غزل و بزم لعل و گلے الکلب

ترجمہ یوں ہے:

یکدعا جز گزہ کا نہ راہ زینہ زو چو سرو و کران
تک گزہ حسن بزور ہنس تھپ دودن نے بخت زان
اسی طرح اس قرآنی آیت: اَلْغُلَامُ الْهَانِئُونَ الْاِنْسَانِ
کا ترجمہ: ٹکڑا ٹکڑا تو لیکن گزہ غصہ کیا ہے جو مثنوی طالع سے مراد نادرست ہے۔

مدرس حالی کو کثیر میں نظم میں ڈھالنے کا پرانا پروفیسر محی الدین حاجی نے اٹھایا تھا جو گزہ کے صفحات پر باقائدہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ حاجی صاحب کے حسن ذوق میں جو اہل نثر کھردرا ہیں موجود ہے اس کے پیش نظر اس بات کا مشکل ہے یہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کی لطیف و نادرک صنعت کا بار بھی اٹھا سکے ہیں۔ ترجمہ مدرس بڑے بڑے بدکاری بلا سبب اور کہہ سکتا ہے کہ حاجی صاحب کا قلم تک بند کی حدود سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ اگرچہ بندوں کے لفظی ترجمہ سے جہاں ترجمہ میں جرئت کا افساد کر دیا ہے وہاں کثیر میں عمارات و تلواریں، اصل صورت بھی مسح ہو کر گئی ہے۔ چند ایک مثالوں سے وضاحت کی جاتی ہے۔

ڈرایا تہیب سے ان کو بے کسر کہ
گڈبہ رہا اور مرا جو اسی پر
سماء و ہمدی جماعت سے باہر
وہ ساتھی ہمارا ہم اس کے یا وہ

نہیں حتیٰ کہ اس محبت کو برا
کہ جو تم کو اندھا کرے اور ہسلا

ترجمہ یوں ہے
ڈراؤں نے قصبہ نش و نشہ یی
بسی مودیا زہد بزدلی و ذہبت یی
الگ میانہ اثر غیبت سوی الگ تجھ یی
چمن سوی زانہ ترسہ و ابھی چھی

خدا کیوں کہ حیدر چمن
کڑے دوزخ آؤں تیس کہ ہے پہ چمن

حق تو یہ ہے کہ ترجمہ میں اس سے زیادہ بے ڈھنگے ہیں کی اور کیا مثال مل سکتی ہے۔

- ۱ - کیا دین حق کو جو بدنام اُنھوں نے (حالی)
- ۲ - یزید مس کروری دیکس پاکشیں (حاجی)

دین کو برت سے تشبیہ دینا کسی بھی صورت میں برع عمل اور زیبا نہیں ہے۔

اصل - وگرنہ ہماری رگوں میں ہو میں

ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں

ترجمہ - شے خود منزہ یا کہ سائیں رکن منز

ارادوں میں جستجو چینی پکسیٰ منز۔

مولانا حالی مرحوم کا اس بند سے یہ مطلب ہے کہ ہمارے حرکات و سکنات اور طبیعت و فطرت میں غیبت کا کوئی ذرہ باقی نہیں رہا ہے اور اگر ہو بھی تو محض اتفاق کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ حاجی صاحب کا پہلا ہی شعر شریک معنی و تباہ ہے شے خود منز محض کوئی مفہوم ادا نہیں کرتا۔ دوسرے مصرع میں اُنھوں نے ارادوں کے پُر لنگہ کو حالی مرحوم سے بھی دو قدم آگے جانے کا شرف حاصل کیا ہے۔ مولانا مرحوم کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہم مسلمان اپنی ماضی کی تمام روایات کو بھول کر اپنی غفلت گذشتہ کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ یہاں اُنھوں نے ارادہ، جستجو، دل زبان طبیعت فطرت وغیرہ استعمال کئے ہیں پہلا ہی ارادوں کے پر دوں میں بھی غیبت کا ذرہ باقی نہ رہنا چاہئے مگر مادہ؟ ارادوں میں کیوں نہیں۔

حاجی صاحب کئی جگہوں پر ترجمہ میں اگر کوئی عذبت و قافیہ سے بھی باہر ہو بیٹھے ہیں جیسے

شریعت، ایمان گئے باقراتیں نش

تو تہا ہر کاغذ حقیقتہ تمن نشیں

وینوئیت میں دس تم کو تو تمن نشیں

شہ گشتہ اوس نہیں خود دزدن بیوچہ تمن نشیں

مگر آج بھی بکے بکول حاتم کا ترجمہ اس لئے کیا باب ہے کہ پر دھیرے کے دل پر مسلمان کی ذہن حالی دیکھ کر ہی چوٹ لگی ہے جو مدرس

لکھتے وقت مولانا کے دل پر لگی تھی۔ مولانا حالی کس دل سے بات نکل گئی اس لئے پُر اثر تھی۔ پر دھیرے کے دل کا بھی وہی حال ہوا اس لئے مدرس پُر دھیرے کا انھوں نے از خود مدرس کے طرز میں اپنی بولی میں اشعار لکھے گویا قادر ہوا۔ اس لئے ترجمہ کا سیاب رہا جس میں سادگی، روانی، ذور بیان، بندشوں کی حقیقت اور اثر نمایاں ہے اور مدرس حالی سے کسی طرح کم نہیں۔ حالانکہ پر دھیرے صاحب شاعر نہیں ہیں

پھر صاحب نے اپنی تفسیر کو جس طرح خود ہی رد کر دیا ہے اس کی مثال میں نے نقد و منظر کے باب میں شاید پہلی بار دیکھی ہے خط کشیدہ۔ علامہ ان باقی کا مکمل جواب خود دے رہا ہے۔

تراجم میں ہمارے یہاں شاعرانہ بے راہ روی کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے شعراء نے باغی قاری کی تقلید کو اس حد تک اپنایا کہ وہ قلم برداشتہ تراجم کہتے چلے گئے اور اس طرح بے راہ روی کا شکار ہوئے۔ بعض اوقات انھوں نے فارسی اور کبیری میں کوئی امتیاز نہ رکھا اور کبیری کے ساتھ ساتھ بے قشاعت فارسی کے خالص اشعار نقل کرتے چلے گئے۔ اس ضمن میں محمد گامی، رسول میرا اور واپ حاجی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جن کا کلام فارسی تراکیب، عبارات و اصطلاحات اور پورا اشعار سے بھرا پڑا ہے اس طرح سے ہمارے ادب میں لفظی تراجم کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوا ہے۔ ہم یہاں قرنِ دواہیک اشعار کی مثالیں پہلی انگٹا کرتے ہیں۔

غالی سید گوشہ چشم تو مرا کشت خون کردن مردم نہ سز و گوشہ نشین را

ناظم کا ترجمہ ہے

طرفِ غالی گوشہ چشم تو بقیہ عام کرد خون مردم گوشہ گرل چھری نہ روا دہش (چھری نہ) کے علاوہ ترجمہ میں کوئی لفظ کبیری نہیں۔

ع نہ طبیب چارہ ساز نہ فسون گرد مارا

ع کیا ماور فیترس تو طبیب بہ دل زار (رسول میر)

اب چنڈا یک اچھی مثالیں بھی ملاحظہ کیجئے:

مگر کام دل بگڑے بتر شرسے زو دست

مرد سال خوش بڈے دست غریستہ (خونی)

دو غیر متبر تا فرگڑہ ہے بعد تین سنگین دس
رات دھہ پینڈا پینڈو خوں یازان مارہ را (د. محمود)
خلافی اہتمام خشک و تر ہے عداوند خدائی دوسرے
ولیکن ہمدلی، استفادگی یہ دوسرے نہیں دود جگہ ہے (اقبال)
چشم بومہ زمانہ خدائی پچھو دو دو دو دو نہراہ
بست کی خون جگر چون چھو جناب عالی (آزاد)
۱۹۴۰ء کے بعد ہمارے ادب نے ایک نئی لکھائی جگہ پہلی بار
کشمیری مصنفین نے عیندگی کے ساتھ نئی لکھائی اپنی ترجمہ مذول کی -
فی الحقیقت گذشتہ چند سال ہی ہمارے ادبی ارتقاء میں ایک سنگ میل
کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مارن نے جیوس فینک کی شہرہ آفاق کتاب
Notes from galkows د چھانی کے ساتھ میں) جو فینک

نے چھانی کی لکھائی میں لکھی ہے کہ انفرادے ساتھ کشمیری زبان میں
پیش کیا۔ اس طرح علی محمود، حبیب کارمان، ارتش اور ایس دیو جیو
نے چند اچھے ترجمے پیش کئے۔

”گایہ مرادس پنڈت“ قاسم گرس کے مشہور مرتبے کا ترجمہ
غلام احمد کشمیری کے دوتلم کا نتیجہ ہے۔ گیتا جلی کی چند نظموں کا
مکمل لال بکس نے ترجمہ کیا ہے اور پوری کتاب کا ترجمہ پھر لال اکادی کی
دھوت پر دیشا ناتھ نامہ کرپہ میں۔ ہر دے کو چار حق اور ون نے
پنج تہہ کی کچھ کہا نیوں کو کشمیری زبان میں ڈھالا ہے۔ ون نے
لینڈرس اور غلام برادران کی چند کتابیاں بھی اپنی زبان میں منتقل کی
میں جلی نے ناظم لکھت کی سافحہ د ایک سافحہ قیدی کو مشورہ
اور گرسو زمار لوکے ڈاکو فاسس کے آخری سین کا دل نشین اور پراثر
کشمیری ترجمہ کیا ہے۔ نامہ کا گایا ہوا ادھیلو کے ایک ستے کا ترجمہ تعمیر
میں شائع ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نامہ اس شاکا کو
پوری طرح کشمیری میں منتقل کریں۔

غلام نرسراق نے انگریزی زبان کے چندہ فی پارسے کشمیری
میں پیش کرنے کی لکھت دوسرے ہم عمروں کی برکت غامی ترجمہ دی
ہے۔ قلع نرساق کے لکھت کے ترجموں میں ہیں اس فنی
چابک دستی اور شہرہ پختگی کا کسی حد تک حقدار بھی مٹا ہے جو ترجموں

کے لئے ایک لازمی چیز کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم اس بات کو نظر انداز نہیں
کر سکتے کہ اس نے جس چیزوں کا ترجمہ کیا ہے وہ ہمارے خود ہی چیزیں
ہیں کہ کشمیری زبان کے اخلاک حقدار کے ان کے مطالب کا احاطہ نہیں
کر سکتے لیکن تاثر کی موجودگی کو نرساق نے کوئی رنگ نہیں پہنچائی ہے
اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ فراق کے ان تراجم میں لکھت
کا قصیدہ بیل اور خنداں سے خطاب، یعنی سن کا یونس، اسکر داملہ
کا ایک مرتبہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ”عرفت اول“
کے عنوان سے سردار جمزی کے ایک اردو مضمون کا بھی کشمیری
میں ترجمہ کیا ہے۔

ساتھ ہی اکادی کی لکھت سے منتخب ادب عالیہ کو ملاقاتی
زبانوں میں پیش کرنے کا جو قابل تعسی سلسلہ شروع کیا گیا ہے
اس کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ہماری
زبان غلام لکھت کی ادب سے بالابال ہو سکتی۔ اس سلسلے میں اب
ہمک ایس کی گوشت اور دایلاؤک، شیشو کی کھنڈ دھارا اور
ڈاک گھر کو کشمیری میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکادی کے آئینہ پر گرام
الغنی، ادالت، دیشی کی لکھت کی پتیاں اور شیکسپیر کے چند ایک
ڈراموں کے کشمیری تراجم شامل ہیں۔

قلعہ تاریخ وفات جگر مراد آبادی

(در منبت منج العنن)

بست مہافوس زین عالم جگر رخت حیات
آکر از لکھت سہاں صاحب گشتا بود
سال تر حلیش یعنی العنن ذاتی زود رقم
لیک ہزار و سہ و ہشتاد دل آزاد بود

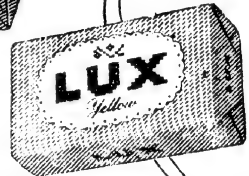
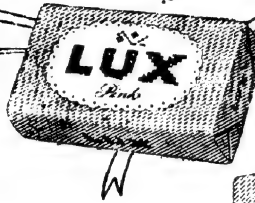
۱۳

۱۴

۱۵

الغنی ممدوہ کے ۲ مددے لکھے ہیں۔ اکا برض نے اس کو جائز قرار دیا ہے
(ذاتی بنگلوں)

کس دھنک کے ہم رنگوں میں اور آپ کا دلپسند سفید بھی



دھر رنگ میں
انوکھی جاڈ بیت -
مجھے یہ سبھی بید پسند ہیں!
جینتی مالا کہتی ہیں

دیکھئے! شہانے رنگوں میں کس! اور اپنی رنگوں کے دلنریب سروقت!
اور سفید بھی! رنگ کنی! جسا بن دی - آپکا دلپسند خاص کس -
آپکے رنگ ڈوپ کی رونق!



نامی ستاروں کا خاص انیسر!
شلا کر جتا گئے دانا
حسن بخت
جسا بن

ضروری ضروری ضروری

کوئی بیمار ہے
ضروری خبر بھیجی گئے!
اسے پرائی "تار" بھیجتے

بیماری، حادثہ یا صحت پر پیغام پرائی "تار" سرکس سے بھیجا جاسکتا ہے۔
پرائی "تار" کو اجنٹ یا ایکپریس تدویر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے فیس
ایکپریس تازہ دینی ہی لی جاتی ہے۔
اس طرح کا تدویر بھیجتے وقت منسلک "پرائی" ضرور لکھنا چاہئے

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیکھئے
محکمہ ڈاک و تار

بابہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹- اسٹریٹ نمبر ۳- پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲- رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵- بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۳۱ گرینج روڈ سنگاپور

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ ہی

آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں آج کل کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ میچ دین تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی سہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انہیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریسپانڈی کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی فائبر پری کر کے سپرد ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے دی۔ پی۔ نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ادارہ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولے۔

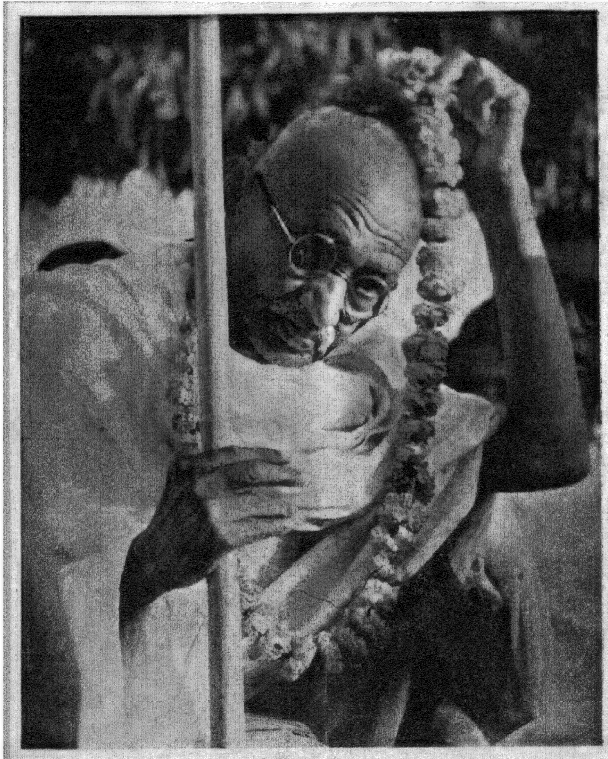
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi 6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آج کل



ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پیڈیٹ جہروت بات چیت	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
نیرا ایچ سادہ پلان	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۷۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیے	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ناب ٹول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جوہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے

نمبر ۱۰-۲۰-۳۰-۴۰-۵۰ (دفتر)

۱۰-۲۰-۳۰-۴۰-۵۰ (دفتر)

دعا کا یہ

بزنس منیجر پبلکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

تقریب

آج کل دہلی

مجلس ادارت

محمد محبوب جامعہ طیبہ دہلی

فی الدین قادری زور حیدر آباد

گوئی ناتمہ اس دلی

خواجہ احمد فاروقی دہلی

دیسان دایسی مصری ننگ

یو۔ ایس۔ مومن راؤ ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی۔ ایس۔ ایس۔ ایں راگھوں ڈیٹی ڈاٹر کڑا (ایڈیٹوریل)

جی نمبانا تھ ڈیٹی ڈائریکٹ (پروڈکشن)

مال مکند عرش اللہ مژ شمسہ اردو دیکھو ٹی

عبدیہ رسول

اسٹوڈنٹ ایڈیٹر، مظفر شاہ

سالانہ چندہ -

ہندوستان میں :- سات روپے
 پاکستان میں :- سات روپیہ (ہاک)

۱۰۔ اشلنگ + بینس یا ڈرہڈ ڈالر غیر مالک سے :-

۱۔ ہندوستان میں :- ۶۔ نئے پیرے

فی مریح :- } پاکستان میں :- ۶۰ میے (پاک)

غیر مالک سے :- اسٹنگ یا سینٹ

مرتبہ و ضائع کردہ

ڈاکٹر کا پیلیکیشنرز ڈوئٹن ہسپتال آف انفارمیشن اینڈ برادر کاسٹنگ حکومت

۵	ادارہ	خلافت
۳	تاریخ پر سیاہ نگری	جشن جمہور
۵	سنگھنہ دی وجہ	رباعی
۶	عابد سیل	گائیکھی، سیاست اور خدائیات
۹	نادم سیتا پوری	جموہر سمی
۲	واجبہ بیستم	بڑے چھوٹے
۱۴	شیر افضل جعفری	خشکست آدم
۱۸	—	قوی یک ہی پخت اور چڑ باقی اتحاد
۲۲	عرش سلطانی	دو چراز اور بج
۲۴	موتور لکھنوی	عزید لکھنوی
۲۶	ارشاد حقیر	ترقیاتی منصوبہ بندی
۲۸	سماوت مرزا	سیاحہ
۳۸	محمد امین	یاقوتی علماء میں انسانی کاسفر
۴۲	کاوش پدی	من و تو
۴۳	عبدالحمید برت	غزل
۴۴	م۔ ش۔ ح	نئی کتابیں اور رسالے
۴۶	بیابک مرحوم شاہ جہاں پوری	ٹال ڈال کے پات
	احمد انصاری	

سرمشق ۱ :- ہمارا تاج گاندھی، جن کا یوم پیدائش ۲ - اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔
رسالے کی نشست پر :- گاندھی جی کی کشیا (سیواگرام، وردھا)

اسوان شیک سم ۱۸۸۳

اکتوبر ۱۹۴۱ء

جلد ۲۰ - نمبر ۳۳

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بالکند عرش طیبانی ایڈیٹر، 'آج کل' اردو، اولڈ سیکورٹریٹ دہلی۔

پبلیکیشنز ڈوٹرین یوسٹیکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

مرکاری حلقے میں ۵۰ ارب اور نئی حلقے میں ۴۱ ارب روپیہ کے پروگرام شامل ہیں۔ ان پروگراموں کی بدولت قومی آمدنی میں تیس فی صدی اضافے کی توقع ہے۔ پلان میں غریبوں کو کسٹے کے لئے قومی تدبیریں تجویز کی گئی ہیں تاکہ ایک ایسا نظام قائم ہو جس میں غلام کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں اور اس کے ساتھ ہی جدید میکانیکی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ گویا یہ پلان جہتہ اور سوشلزم کا نمونہ دار ہے اور ایک قومی پروگرام ہے۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے، جس کو ہمیں قبول کرنا ہے۔

۶۔ اگست کو روس نے اپنا دوسرا انسان بردار خلائی جہاز بھیج کر خلائی پروازیں شان داد کا میابی حاصل کی۔ یہ جہاز ۵۰ گھنٹہ ۱۸ منٹ خلا میں رہا اور اس نے زمین کے گرد ۷،۰۰۰ گھبرکائے اور پھر مریخ و دیگر واپس اتار لیا گیا۔ جہاز کے مسافر تین تھوڑے تھے۔ روس کا یہ کارنامہ انسانی تاریخ میں بے نظیر اور عالم انسانیت کے لئے قابل فخر ہے۔ بقول بیڈلٹ ہیرو اس سے ایک نیا نقطہ نظر ملے گا اور ہم پر اس چھوٹی سی دنیا میں لڑائی کی حسرت اور داغ ہو جائے گی۔

اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ نے من پانچ عالمی کواہرازی سندیں عطا کی ہیں ان میں جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحبی شامل ہیں جنہیں فارسی کے عالم کی حیثیت سے یہ اعزاز ملے گا۔ آپ نے فارسی اور عربی زبانوں کے ادب و تالیفات لغت اور زبانوں کے تقابلی مطالعہ وغیرہ پر پیش قیمت تحقیقی کام کیا ہے۔ ادارہ آج کل آپ کو اس اعزاز پر پر غور میں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ہر سال ۲۰ اکتوبر کو ہم اس غلیظ المرتبت انسان کا یوم پیدائش مناتے ہیں جس نے ہمیں نیک اور چھلنی کا راستہ دکھایا اور جس کی قیادت میں ہم نے ایک پُر امن انقلاب برپا کر کے آزادی حاصل کی۔ یہ ایسا انقلاب تھا، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس یوتھ پر اپنے دلوں کی ٹوٹیں اور ہمتا کا گدھڑی کی قیادت کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیں، اور ایک مرتبہ پھر مصیبت خلیب کے ساتھ ہمہ گیریں کرنا چاہیے جس کے راستہ پر چل کر ملک کے اتحاد و اتفاق اور تعمیر و ترقی کے لئے ان تھک کوشش کریں گے اور اپنے شانی کردار سے یہ ثابت کر دیں گے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود اہمیت اس وسلاحت اور باہمی محبت اور رواداری میں

اس سال ۱۰ اگست کو یوم آزادی کی تقریب ملک بھر میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ حب دستور دہریہ اعظم بیڈلٹ ہیرو نے دئی کے تعلق پر جھنڈا ہرانے کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر انھوں نے پوری قوم سے متحد ہوجانے کی اپیل کی اور کہا کہ دل و دماغ کا ایسا اتحاد قائم ہو جو کبھی نہ ٹوٹ سکے۔ ہم جو سماج بن رہے ہیں وہ نہ ہندو سماج نہ مسلم سماج نہ سکھ نہ عیسائی، بلکہ وہ ہندوستانی سماج ہے۔ بلاشبہ وقت کی سب سے اہم ضرورت یہی ہے کہ ہم ذات، باپ، رنگ و نسل کی تفریق کو یکسر ختم کر دیں اور قومی اتحاد اور منظم و خدیکوٹھوس بنیادوں پر قائم کریں۔ ملک کے مستقبل کے بارے میں مکمل اعتماد ہو اور ہر فرد کو نئے حالات کے مطابق نیشنل کے اہل ہوں۔

پارلیمنٹ نے تیسرے پینل پلان کی منظوری دے دی۔ اس پلان میں ایک کھرب ۱۰۰ ارب روپیہ کے خرچ کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

جنتِ جمہور

سانو جو دور میں بے توگردش ہیں جام ہے
یعنی وہی حیات کا رقصِ دوام ہے
یوں تو یہ جنتِ تازہ بہ نامِ عوام ہے
جمہور کا جمالِ مگر ناقصام ہے

خوابوں میں پل رہی تھی جو تصویر کیا ہوئی
کیوں دوستو وہ وقتِ تمسیر کیا ہوئی

نہیں جسکے سے چول کھلاتے رہے ہیں ہم
ہر دور میں زمیں کو سمجھاتے رہے ہیں ہم
وقتِ رواں کو راہ دکھاتے رہے ہیں ہم
سایہِ زندگی کی بسلتے رہے ہیں ہم

ہمکے واماں گلاب تو چھوٹی شفق واماں

ماحقوں سے ہم نے پوچھ کے چھڑکا غرقِ جہاں

عزم و عمل کی راہ سے کلٹے نکل گئے
تیبے نے دی وہ آغ کر پختہ بکھل گئے
سخت دسیہ چٹاؤں کے نقشے بدل گئے
ایک ایک ضرب میں کئی اضمات ڈھل گئے

عنت کشوں نے یہ بھی تماشا دکھا دیا

چرا پہاڑ کو تو ایلا بستا دیا

مٹی کو جام و ساغر و دنیا میں ڈھال کر
ذند کو کر دیا ہے تریا اُچھال کر
اُٹھے جو اپنے ہاتھوں میں تیش سنبھال کر
دھرتی نے دے دیا ہے کیو نہال کر

یوں ہم نے کو ہمارے سینے میں مل دیا

خبر اکے پتہ دوں نے اجنتا اُگل دیا

جب بھی عیتدوں نے سہیں حوصلہ دیا
دھرتی پر سار تاتھ کا نقشہ جسا دیا
اُٹے تو کوئی سانچے کا استوپ اُٹھا دیا
مستد ہمیں پر بودہ گیب کا بنا دیا

شعلوں کو بے کے ہاتھوں میں لٹے رہے ہیں ہم

پرہیز کی چوٹیوں کو کچلتے رہے ہیں ہم

تو ریب و حادثات کے گوسلے رہے قصیر زندگی کے گلستاں گلے رہے
یوں اپنی جسراتوں کے مداف کا نئے رہے یں گرفتار کی لاٹ جوں سوھے رہے

محنت کی جب ننگا جسگر دار اُٹھ گئی
دلی میں لال تلے کی دیوار اُٹھ گئی

یہ مجھ سے ہیں دیوار کا مگر کے چھوٹے دل خزاں سے شگوفے بہار کے
جلوے لئے جلو میں رُخ شایہ کے لائے ہیں ہم زمین پہ جنت آتار کے

روئے وفا میں رنگِ علی بھیر دیا گیا
مر مر کو بچی کے تاجِ محمل کر دیا گیا

اس مجھ سے کو پھر سے دکھانا ہے ساتیو جنت کو بھیر زمین پر لانا ہے ساتیو
برداشت کو ہمارے پھانا ہے ساتیو تعمیر نو کا حسی بڑھانا ہے ساتیو

بنیاد ڈالنی ہے نئے دور کی ہمیں
بھیر انقلابِ وقت کے آواز دی ہمیں

پیرِ عزمِ تازہ کا رو بڑھ کر پکارو چہرہوں پہ راہِ جد و عمل کا غبارو
زہرِ حیاتِ پنی کے بھی کچھ دن گزارو شکرِ بزمِ جشائوں میں گنگا اتارو

دھرتی پر اس ادا سے گردِ راج دوستو
دے دو ہر اگر سے کوئی تاج دوستو

فطرت چلے آدھ کو روانہ ہو تم جدھر جلی رہے تھاری نلکا ہوں کی منتظر
فلاد سے ہمو کر گئے اک اشار سے پر پانی کو حکم دو کہ بے تم سے پلو چھ کر

ہر سمت روڈ کی سلا، بھلائی ملند ہوں
دلیاں ہوں جتنی اُستغنی رہیں ہند ہوں

آپ رواں کو قیدیوں لاکر جھوڑ دو سارا فلسفہ فطرت آزاد توڑ دو
ہر موڑ پر بیاس پر جو جھٹ جھوڑ دو دریا کی موج موج کا پنجہ مڑوڑ دو

جنگل کے گوشے گوشے میں منگل کی بات ہو
صرف ایک ہی نہیں، کئی منگل کی بات ہو

تیشے میں اور کوہ میں پھر کوئی جنگ ہو کاٹو وہ یہ ستون کہ فرنا د دنگ ہو
ہیرے کی طرح تر شا ہوا ہو جو سنگ ہو بیٹے میں ہر پہاڑ کے ہر سرونگ ہو

ڈروں کو ہسر و ماہ کا ہسر کے چلو
خلیہ وطنی کو خلد سے برتر کئے چلو

لے کھینچ کر ایک نئی سرنگ میں کاہل نام جو اہلش ہے۔ تازیش

مائوں کو لاکھوں گنبد و مینار بخش دو ہنروں کو کارخانوں کا انبار بخش دو
 گی مرگ کو نئے نئے سنگار بخش دو بارغِ نفاط اور بھی ددیہ بخش دو
 ہر برگ ہو بہار کی تصویرِ قوسِ سہی
 سارا وطن ہو دادِ قیاسِ تو سہی
 ہمسار ہوں دو نیم، چٹائی تر بخش دو ارب حیات پردہِ ظلمت سے ڈھونڈ لو
 زندہ کرو وطن میں نئے کالی داس کو جھونکا ادھر جو آئے دی سیکھ دوت ہو
 عزم و عمل کے جوش سے بھر پور جاگ اٹھو
 راہِ جنوں کے سرمد و منصور جاگ اٹھو
 ہاتھوں میں زندگی کے نیاسازیں گے ہم جس میں عوامیت ہو وہ انداز دیں گے ہم
 تینپلو کو قوت پر داز دیں گے ہم غالب کے ٹکڑوں کو پیرا داز دیں گے ہم
 وقت آئے یوں شکفتن گلِ مائے ناز کا
 محمود سے بلند ہو رتبہ ایاز کا

رُباعی

شب کی دادی میں چاند خاموش گیا
 آہستہ بہا کا ہلکاں کا دیریا
 اے روشن حیات۔ صبح کی پلکوں پر
 آنسو کی طرح لرز رہی ہے دنیا

سکندر علی وجد

گاندھی جی، سیاست اور اخلاقیات

نہیں رہ جاتی۔

بیرا کاٹش، نیٹس، ہیکل اور گرین نے جنگ و جدال کو انسانی سماج کی بقا کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ مشہور Pragmatist فلسفی ولیم جیمز نے بھی جنگ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جنگ قوموں میں احساس ذمہ داری، فیصلہ نگر، رفاقت اور جرأت پیدا کرتی ہے لیکن انسانی فطرت کو تیز فطرت میں لگا دینے سے بھی بڑھ کر حاصل ہو سکتے ہیں۔ بات اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ وقتی ہم کے حصول اور مقصد کی تکمیل کے لئے اگر ڈوگ ہے حد بنیادی اخلاقیات بھول کر یا انھیں پس پشت ڈال کر متقدم ہو جاتے ہیں، لیکن اس مقصد کے حصول کے بعد وہ اخلاقیات پھر اُچھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور شاید زیادہ شد و حد کے ساتھ۔ ایسی حالت میں کسی خارجی مقصد کے حصول کے لئے قائم ہونے والا اتحاد محض عارضی اور وقتی ہوگا، اس میں وہ پائیداری نہ ہوگی جو انسانی تعلقات اور رشتوں کو استوار کر کے دائمی اس یا سماجی ہم آہنگی کی منزل تک پہنچا دے۔ اسی لئے گاندھی جی کے نزدیک جنگ کا بدل انسانی صلاحیتوں کو تیز فطرت کی طرف موڑ دینا نہیں بلکہ روحانی قوت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں عدم تشدد، دوسروں کے لئے معاصی برداشت کرنے اور سچے علم کے حصول کو اعلیٰ اقدار میں شامل کیا گیا ہے۔

ہندستان کا قدیم فلسفہ حیات اگر عدم تشدد پر مبنی نہ ہوتا اور

گاندھی جی کے فلسفہ اخلاقیات پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے قدیم فلسفہ کی روایت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ذہن سے گھونٹتے یا ٹھٹھکے یورپ میں فلسفی جس معنی میں استعمال ہوتا ہے اس طرح تو گاندھی جی فلسفی نہیں تھے نہ تو انھوں نے نظام عالم کی حقیقت اور عدم وجود کے بارے میں کوئی سبیل نظریہ پیش کیا اور نہ مبادیات علم ہی سے بحث کی۔ لیکن ہندوستان میں فلسفہ کے معنی بالکل مختلف رہے ہیں۔ یہاں فلسفہ کے لئے 'دورشی' کا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے جو 'درش' سے ماخوذ ہے۔ 'درش' کے معنی ہیں دیکھنا، روح کی گہسر اٹیوں میں اُتر جانا۔ یورپ کے فلسفہ نے بھی وہاں کے نظام حیات پر افرورو ڈالا ہے لیکن ہندوستان میں فلسفہ کا زندگی سے براہ راست تعلق رہا ہے۔ ہندوستان میں فلسفہ نے قدم قدم پر طرز حیات، طریقہ فکر اور سماجی قریبوں کی رہنمائی کی ہے۔

ہندوستان کے قدیم فلاسفہ شکر، چار، پست، بدھ اور رامناج جس فلسفہ کو ہم سمجھتے تھے نہ صرف اس کی تبلیغ کرتے بلکہ اپنی ساری زندگی اس فلسفہ کے اصولوں کے تحت ڈھال بھی بیٹے۔ اسی طرح ملک کے پلو، طرز حیات اور اخلاقی اقدار سے گاندھی جی کے فلسفہ کا تعلق نہ صرف اتنا گہرا ہے بلکہ انھیں کی آغوش میں پلا اور پروان چڑھا ہے۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی نہ صرف ان اصولوں کے تحت ڈھال لی جنہیں ہم سمجھتے تھے بلکہ ان کی تبلیغ بھی کی۔ اس نقطہ نظر سے گاندھی جی کے فلسفی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی

گاندھی جی کو اتنی طویل رسدایت و درذیبیں نہ ملی ہوتی تو ان کو اپنے کرداروں کی تینلیں میں کہیں زیادہ وقت کا سامنا کرنا پڑتا گا۔ گاندھی جی نے انسان کی سفاقتی کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادی اور روحانی ترقی پر بھی زور دیا اور کہا کہ انسان کا غلطہ خبیثیات اور اس فلسفے کا تقدس ہی سماج سے مطابقت رکھنے والے فضائل کی جانب رہنما کی کرتا ہے۔ چھانڈو کی اپنشد میں بھی ساری زندگی قریانی، حصول علم کی کوشش، اور حق کو برتاؤ آتما اور انجیل کی ذات میں، جو بذات خود مطلق ہے، ہم کریمے کی تعلیم کی گئی ہے۔

گاندھی جی کا خیال ہے کہ انسانی زندگی خوشی، مسرت، اور پاکیزگی سے گزارنے کے لئے اخلاقیات کے اصولوں پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ یہ اصول مسرت کے اصولوں کی طرح متین، سلفہ شدہ اور غیر مشروط ہیں مسرت کے اصولوں کی طرح ان کی خلافت و رزی بھی ممکن تو ہے لیکن ایسا کرنے سے روح کا سکون اور ذرا ختم ہو جائے گا۔

سیاست اور اخلاقیات

گاندھی جی سے پہلے سیاست میں اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سیاسی رہنماؤں کا کام حکومت حاصل کرنا اور اس سے متعلق دوسرے کاموں کو انجام دینا ہے، عوام کی اخلاقی حالت سدھارنا نہیں۔ انفرادی طور سے تو لوگوں کا اخلاقی ہونا اور اخلاقیات کے اصولوں پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن سیاست کے میدان میں جہاں حکومتوں کے مفادات کے تضاد کا سوال ہوتا ہے اخلاقیات کے اصولوں پر عمل کرنا ضروری نہیں اور سیاسی رہنماؤں کے لئے خود کو اخلاقی اصولوں کا یا مبدع بنانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ ان کو ملک اور قوم کے کہیں زیادہ اہم اور ضروری مسائل سے جہد برآ ہونا پڑتا ہے۔

اس نظریہ کے خلاف گاندھی جی کے دو اعزازات ہیں:-

(۱) ملک اور قوم کے سیاسی مسائل کی اہمیت مسلم لیکن انہیں اخلاقی اقتدار سے زیادہ اہمیت دینا غلط ہے۔ زندگی کی اعلیٰ ترین قدر ایک با اخلاق اور پاکیزہ زندگی کے علاوہ کچھ نہیں۔ نئی نوع انسان کی مسرت کا انحصار دولت اور طاقت نہیں بلکہ خود کو نئی نوع انسان کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر ہے اور یہی سب سے بڑی مسرت اور اخلاقی قدر ہے۔ اس طرح کے افعال صرف اس شخص سے ممکن

ہیں جو کسی فائدہ کے بغیر دوسروں کی خدمت کو اپنا شیروہ بنائے۔ انسان کی اعلیٰ مسرت اس کی روحانی تکمیل اور ترقی میں ملتی ہے۔ سماجی اور انفرادی ترقی کا راز اسی میں ہے اصول میں معرکہ ہے۔ مزدور اور ایسا سماج جو بھی دوسری شکست دے کر ترقی کرنے کی کوشش کرے گا ایک دن نیک دن برآمد ہو جائے گا۔

(۲) اگر دولت اور طاقت کو قدر اعلیٰ تسلیم ہی کر لیا جائے تو بھی یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ ان کا حصول غلط اور غیر اخلاقی طریقوں سے ہی ممکن ہے بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ اگر غیر اخلاقی طریقے اپناتے جائیں تو ان کا حصول قطعاً ناممکن ہو جائے گا۔ گاندھی جی کا یہ استدلال ہمراہ ناکہ کی یاد دلانا ہے جس نے کہا تھا کہ کسی غیر اخلاقی فعل سے فائدہ صرف اس صورت میں اچھا یا جاسکتا ہے جب اسے صرف چند لوگ برتیں اور باقی اس سے گریز کریں کیونکہ اگر اسے وسیع پیمانہ پر اپنایا جائے گا تو وہ خود اپنی ضد میں پھنس جائے گا۔ مثال کے طور پر وعدہ خالی یا جوٹ ہی کو لے لیجئے۔ ظاہر ہے کہ لوگ جوٹ بول کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر برتھمن جوٹ بولنے لگے تو ظاہر ہے اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا کیوں کہ کوئی بھی پراعتاد یہی نہیں کرے گا۔ اسی طرح گاندھی جی کا خیال ہے کہ اگر دولت اور طاقت کے لئے سب سے غیر اخلاقی ذرائع استعمال کئے تو ظاہر ہے ان کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ اسی لئے گاندھی جی نے انسانی اور سماجی تعلقات کی استواری کے لئے سچائی اور عدم تشدد کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے روحانی سکون اور دائمی مسرت پر زور دیا۔

تشدد کے استعمال کے خلاف گاندھی جی نے دو اہم ہندوستانی پیشگی ہیں (۱) مقصد خواہ، کتہا ہی نیک اور جائز کہیں نہ ہو لیکن اگر اس کے حصول کے لئے غلط طریقے استعمال کئے گئے ہوں تو وہ اچھا مقصد بھی بڑی حسد تک برائیوں اور خرابیوں سے طوط ہو جائے گا اور فائدہ اپنی کامیابی کے زعم میں اپنی کامیابیوں کی طرف سے ہم نہیں بند کر سکتے ہیں۔

(۲) برخلاف اس کے عدم تشدد اور عدم تعاون کے ذریعہ حاصل کی ہوئی کامیابی کے بغیر معترف ذائقہ کے دم و دم پر نہیں ہوتا بلکہ دونوں اپنی اپنی علیان جیتے ہیں اور سماجی اور اقتصادی نابرابری کے سماج کی جگہ ایسا مذاکرہ اور انصاف کی بنیادوں پر ایک اچھے سماج کی تشکیل کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

اخلاقیات اور دولت

گاندھی جی نے ضرورت سے زیادہ دولت کے حصول کو ایک نہایت

فراطاقِ فعل قرار دیا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں لوٹ کھسوٹ عام ہو، محبت کے قانون کی حکمرانی آسان نہیں، بلکہ پیچ تو یہ ہے کہ استعمال اور محبت دوست خدایہ چیزیں ہیں۔ ایک جگہ کا مذہبی لکھتے ہیں:-

”فوری ضرورت سے زیادہ چیزیں حاصل کرنا ایک طرح کی چوڑی ہے۔ قدرت نے انسان کے استعمال کے لئے چیزیں اس قدر بنائی ہیں کہ وہ اس کی ضرورت بھر کے لئے کافی ہیں اور اگر ہر انسان فوری ضرورت سے زیادہ چیزیں جمع نہ کرے تو دنیا سے غربی اور اغلاس کا نام و نشان ہمک مٹ جائے۔“

دوست کا بچہ حاصلِ زحمت سماجی بلکہ اخلاقی گناہ بھی ہے لیکن اس گناہ کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنا بھی غلط ہے کیونکہ تشدد کا استعمال بذاتِ خود ایک نہایت غیر اخلاقی فعل ہے۔ اس طرح کی نابرابری ختم کرنے کے لئے عدم تشدد اور ستیرگاہ کا استعمال ہی جائز ہے۔ اگر کسی کو مجبور کر کے اسے کچھ اغال کرنا بھی ملے گا جیسا تو قس سے کیا قالوہ؟ اخلاقیات کی بنیاد تو محض آزادی، ارادہ اور رضا کا راز تھا یا پرتا قہ ہے۔ ایک مشین کی طرح کام کر کے حالات تحوُّلی دیر کے لئے سدھارے تو جاسکتے ہیں لیکن پھر اخلاقیات کی اعلیٰ قدروں کا ریزہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا یا کہ، خلیا ہونے کے لئے ان کا شعوری اور رضا کا راز طور پر سرزد ہونا ضروری ہے۔

گاندھی ایک جگہ کہتے ہیں:-

”میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی کام کو انجام دینے کے لئے ہر دماغ کو ملش کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ دل کو ملش کرنا بھی ضروری ہے۔“ عمبر اور دل کا یہ اھلیان گاندھی جی کے فلسفہ حیات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے قدیم فلسفہ کے لحاظ سے انسان کی زندگی کا واحد مقصد خود کو برہما کی ذات میں ضم کر دینا ہے۔ گاندھی جی کے یہاں بھی اس خیال کو بنیاد اہمیت حاصل ہے لیکن انھوں نے اس کی ترویج ذرا مختلف طریقے سے کی ہے۔ ان کے خیال میں برہما، خدا اور سچائی ایک ہی چیز کے الگ الگ نام ہیں۔ (ایک جگہ لکھتے ہیں:- ”میں اکثر اپنے مذہب کو سچائی اور استنادی کا مذہب کہتا ہوں۔ ایک عمر سے میں نے خدا ہی سچائی ہے کے بجائے سچائی ہی خدا ہے“ کہنا شروع کر دیا ہے۔) اس کی

وجہ یہ ہے کہ خدا کے وجود سے انکار تو اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن ایک سچائی سے انکار کرتے کسی کو نہیں سنا۔ مقصد حیات سچائی ہو یا خدا اس کے حصول کے طریقے ہمیشہ ایک ہی رہتے ہیں اور خود خدا کی ذات میں ضم کر دیے گا اور طریقہ عدم تشدد، محبت یا ایٹریک مناد کے بیانیہ انسان کی خدمت ہے۔ خدا کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ اس کی مخلوق کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہے۔“

راما میں ایک جگہ لکھا ہے:-

”جنگ و جدال کرنے والے کی طاقت قابلِ ستائش نہیں بلکہ قابلِ نفرت ہے، ہر ت سادھو اور فیکری قوت ہی اصل قوت ہے۔“ گاندھی جی نے بھی انسان کی روحانی ترقی پر زور دیا ہے۔ عدم تشدد کو گزروں اور برزوں کی علامت تصور کرنا غلط ہے۔ اصل وہی لوگ عدم تشدد پر عمل کر سکتے ہیں جنہیں اپنے اوپر کھنکھن کرنا دل و دماغ کی کھنکھن، اچھی حاصل ہو چکی ہو۔

گاندھی جی کے فلسفہ حیات پر شکر چارہ اور دماغ کے فلسفہ گہری چھاپ ہے۔ دیدانت کی طرح ان کا بھی یہی خیال ہے کہ انسان غیر شعوری طور پر خود کو برہما سے ہم آہنگ کر دینے کی کوشش رہتا ہے لیکن گاندھی جی کا کہنا ہے کہ انسان کو اس ہم آہنگی کے لئے شعوری کوشش کرنا چاہئے اس لئے کہ یہی زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے اور دوسری تمام اقدار مثلاً محبت، دولت، مسرت و فرح محض ثنائی حیثیت رکھتی ہیں۔ گاندھی جی کے خیال میں کوئی بھی ایسی چیز جو انسان کے اعلیٰ مقاصد میں آڑے آئے غیر اخلاقی اور بڑی ہے۔ دولت صرف اس لئے بڑی ہے کہ اس سے انسان اور انسان کے درمیان دیوار کھڑی ہوجاتی ہے۔

آدرش وادی ہونے کے باوجود گاندھی جی کے فلسفہ حیات میں عمل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک باعمل انسان تھے اور انھوں نے فلسفہ عدم تشدد پر زحمت خود عمل کیا بلکہ اسے جنگِ بڑی میں قوم کے احقوں ایک مضبوط اور طاقت ور ہتھیار بنا دیا۔ انھوں نے ایک ایسی قوم کے کردار اور اخلاق کو سدھارا جو ایک صدی سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

مجموعہ سخن

ی کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔ چنانچہ طلباء امت کے امتحان دہریس اس نام کے لئے شمار مجرے ہی شامل ہو چکے ہیں۔ خود لکھنؤ ہی کے مبلغ نوکشتور نے ۱۸۴۲ء میں ایک ”مجموعہ سخن“ دو حصوں میں شامل کیا تھا جس میں مختلف عنوانات کے تحت شراٹے متعین و متاخرین کا کلام شامل ہے۔ یہ ”مجموعہ سخن“ ڈاکٹر آت بیلک (ٹرکشن داودہ) کا سن ۱۸۴۲ء پراؤنگ کے ایڈیٹر نیلٹ شید نرائن (ڈپٹی انسپکٹ آف اسکول مین لکھنؤ) سید غلام حیدر قندیلگرامی (سٹیٹ اسٹریٹ ہونڈ اسکول مین لکھنؤ) اور ششی محمد حکیم الدین (سٹیٹ اسٹریٹ چوک اسکول لکھنؤ) نے ترتیب دیا تھا۔ جس نظم ”مجموعہ سخن“ کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ فیصلہ بادشاہ اور شاہ ۱۱ھ ”غلام ہمدی لکھنؤ“ نے مرتب کیا تھا جو سرٹے صافی خان لکھنؤ میں لپھٹے تھے۔ ابتدا میں جناب موسوم صاحب ادیب سے چند نقاد فی سطور بھی تقریر فرمائی ہیں۔

”مجموعہ سخن“ — جس کو غلام ہمدی لکھنؤ نے فیصلہ الدین حیدر بادشاہ کے عہد سلطنت میں مرتب کیا اور خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر یکم صفر ۱۲۷۴ھ کو تمام کیا۔ مؤلف کتاب (غلام ہمدی) جرنیل اقبال اللہ قطب الملک محمد قیاس، مبارز علی خان بہادر و خضر جنگ کی سرکامیں داستان گوئی اور بدلتی کجی کی خدمت پانومر تھا۔ یہ باتیں خود مؤلف ”مجموعہ سخن“ کتاب کے آخر میں لکھی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے پرمجسے ہوئے ادوارق اب تک لکھنے کی دست برد سے محض ہیں ”مجموعہ سخن“ بھی انھیں میں سے ایک ہے جسے جناب پرفیسر سید موسوم بنوی ادیب (سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) کا گراں بہا کتب خانہ اپنے بیٹے سے اس طرح لگائے ہوئے ہے جیسے کسی امیر پوری مال کی آفرش اپنے ”خیریت دل کسمبلی“ ہے۔

چار سوا اکتیس ورق کا یہ ”مجموعہ سخن“ اردو زبان کی وہ بہترین ”نظمی بیاض“ ہے جو اس زمانے میں ترتیب دی گئی تھی جب لکھنؤ ادرا س کے مضامین میں کوئی ایسا اردو کا پریس قائم نہیں ہوا تھا جس میں ”پرمکاری“ کتابوں کی اشاعت و طباعت کا کوئی انتظام کیا گیا ہو۔ ذاب فیصلہ الدین حیدر بادشاہ اور شاہ ۱۱ھ کے زمانے میں ”پرمکاری“ قائم کیا گیا تھا جو سکتا ہے کہ وہ قائم ہو چکا ہو لیکن وہ محض ”پرمکاری پریس“ تھا عوامی نہیں اس لئے اس نظم ”بیاض“ میں جن شرا و کا انتخاب شامل کیا گیا ہے اس کے بارے میں یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ زیادہ تر بارہ راست حاصل کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس ”مجموعہ“ کی ترتیب و تدوین میں بعض شرا کے قلم درواؤں سے بھی مدد لی گئی ہو لیکن یہ درواؤں میں زیادہ تر انھیں شراؤں کے ہونے جو اس زمانے تک خود زندہ تھے۔

جب تک پریس اور مطبع کا رواج قائم نہیں ہوا تھا شری ادب میں قلمی بیاضوں کی ترتیب و تدوین کا عام رواج تھا۔ قدیم کتب خانوں میں آج بھی نادری اور اردو کے ”لکھنؤ“ اور بیاضوں کا قافی پڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ اس قسم کے انتخابات اکثر ”مجموعہ سخن“

موت کتاب نے ذیل کے قطعہ سے اپنا سال ولادت ۱۱۸۹ھ لکھا ہے۔

یاد غلام ہمدانی یا حسن حبیبی
ہمدانیامام ہادی، ہمدانیامام ہمدی
ابن یحییٰ سیرت چوں در وجود آید۔
تاریخ گفت اقامت ہمدانی غلام ہمدی

۱۱۸۹ھ

یہ قطعی اس کتاب کے آخر میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو ختم کرتے وقت مولف کی عمر تقریباً ۱۱۸۹ سال کی تھی۔“ (سید مصدق حسینی)

آخری ورق پر غلام ہمدانی لکھتی ہے خود خاتمہ کتاب کی عبارت لکھی تھی۔

”محمد بن ابی نصر دل پسند مجموعہ معنی“ از دست ہمدانی

در کاہ ایزدی غلام ہمدانی ساکن سرافہ ممالک ایران در عصر

دولت و سلطنت حضرت کل ہونی فیض و مافیٰ خورشید الشہار

ثریا اقدار قزقم نگہ بستہ، ظل اللہ، انجم سپاہ، رعیت فوار

ظہرت گداز، قاصد بیان بدعت و عودان شہار کان لغتہ

ایمان السلطان ابن سلطان ابو نصر قطب الدین سلیمان جاہ

سلطان عامل نویشہار زمان لغیر الدین حید شاہ جہاں بادشاہ

غازی خدا اللہ ملکہ و سلطانہ کہ در جناب فیوض آیات منورین

وسادہ امارت منشی صدر الدان حکومت انیس خاص حضرت

سلطان شیر بہار، رموز بادشاہ، دوران جریں افواج طہر طہر

شاہی کار فرامی کا نگہ داران حضرت جہاں پائی فدوی خاص

جریں اقبال الدولہ قطب الملک محمد عباس مبارز علی خان بہاؤ

منظر جنگ حاضر قدم فساد سنجی و بزرگوئی کہ

خاطر و لایہ ای چین کا کمال افتات داشت شبناہ روزے

در صعب فوال نشینان اختتام داشتہ تاریخ عہد صفر المعظم

۱۲۰۰ھ

کتاب کے شروع میں جناب پروفیسر محمد حسن ادیب کی ترتیب

دی ہوئی ایک تفصیلی فہرست بھی شامل ہے جس سے یہ معلوم کیا جاسکتا

ہے کہ کس شاعر کی کتنی غزلیں مجموعہ میں ہیں شامل ہیں امدان غزلوں

کے اشعار کی مجموعی تعداد کتنی ہے ۹۶ فہرست جس سلیطے سے مرتب کی گئی

ہے اس سے کتاب کی خصوصیات کو چارچاندنگ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کتاب کی فہرست اس کتاب کا جزو نہ بنادی جاتی تو سب سے زیادہ پر مجموعہ معنی کی اہمیت کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ یہ فہرست میں دس نفل کی جاتی ہے۔

فہرست (نام) شاعر تعداد غزلیات تعداد اشعار

۱- آتش (خواجہ جید علی) ۵۰ ۵۸۹

۲- اسیر (منظر علی خان)

۳- آتش (منظر علی خان)

۴- آصف (ذو اب آصف الدولہ)

۵- افسوس (دیریش علی)

۶- اقبال

۷- اہلی

۸- امیر

۹- انشاء (انشاء اللہ خان)

۱۰- بادشاہ (غیر الدین حید)

۱۱- بقا (دینچہ اللہ خان)

۱۲- پارسا

۱۳- قدور

۱۴- جرأت (دندہ بخش)

۱۵- چرکیس (یار علی)

۱۶- حامد

۱۷- حریف

۱۸- حسرت (محمد جعفر علی)

۱۹- حسن (میر حسن)

۲۰- خسرو (امیر خسرو)

۲۱- خلیف (میر حسن)

۲۲- دلد (خواجہ میر دلد)

۲۳- رشک

لہ جرأت کے اشعار ۱۲۴۲ھ میں دفات پائی (دس ۲۰۱ تذکرہ اب بقا)

نمبر شمار	نام، شاعر	تعداد غزلیات	تعداد غزلیات
۲۴۴	رشید	۲	۲۰
۲۵	ربیعین (سادت یا رضا)	۱	۵
۲۶	ساکان	۶	۵۶
۲۷	سعدی	۱	۱۲
۲۸	سودا (مرزا رفیع)	۳۳	۲۹۱
۲۹	سونہ (میر محمدی)	۱۰	۶۳
۳۰	سید	۵	۲۷
۳۱	شاہ	۱	۱۰
۳۲	شاہد	۱	۹
۳۳	بشیم	۱	۱۰
۳۴	صادق	۲	۲۲
۳۵	عاجز	۱	۹
۳۶	عزا	۱	۱۰
۳۷	وشت	۱	۵
۳۸	عشق	۱	۴
۳۹	عیشی (طالع علی)	۵۷	۵۶۲
۴۰	عافی	۴	۲۸
۴۱	غضنفر	۱	۹
۴۲	قائم	۱	۷
۴۳	قدرت	۱	۱۲
۴۴	قمر	۱	۲۷
۴۵	قیس	۲	۲۰
۴۶	گویا (فیض محمد خان)	۱۶	۲۵۸
۴۷	لفٹ	۱	۱۴
۴۸	مبارز	۴	۴۴
۴۹	معنی	۱	۸
۵۰	محمد	۱	۵
۵۱	مروت	۲	۱۶

شانہ نہیں ہوا ہے۔ ان غزلوں کے علاوہ یہ دوسرے مسعود حسن صاحبیہ
کے مکتب خانے میں ’ہوس‘ کا ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی موجود ہے۔ ہوس
کی طبعاً ان کے ایک دو سرے مہم عمر طالب علی شیشی میں ان بیضیہ ایوان گل
میں ہیں جن کا ذکر کبیس ہنس تذکرہ میں ہے تو درج کیا جاتا ہے لیکن دیوان
آج تک شانہ نہیں ہوا۔ ادیب صاحب کی لاہوری میں ان کے دیوان
کا بھی ایک تیاپ محفوظ نہ موجود ہے۔

’جموہ سنہ‘ میں سودا، میر، جرات، انشا اور آتش کی جو غزلیں
شانہ میں وہ اتنی خرد ہیں کہ اگر ان کا بکری نظر سے قریب کیا جائے تو یقیناً
پکڑ لے کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مرسری طور پر میں نے اودھ اور دھرے دیکھا تو
بعض مقامات پر مروجہ دیوانوں میں اور اس مجموعہ میں ہیں کہیں فرق بھی ملا
اور فرق ’اس لئے‘ اہمیت رکھتا ہے کہ یہ غزلیں ایک ایسے شخص کی
انتخاب کردہ ہیں جہاں شرا میں سے لکڑے ویشڑ لوگوں کا مہم عرصہ تھا۔ علی
ہے کہ ان غزلوں کا جڑا صبر براہ راست ’انتخاب نگار‘ نے خود حاصل کیا ہو
یوں کہ اس وقت تک ان شرا میں سے کسی کا دیوان شانہ نہیں ہوا تھا۔
’جموہ سنہ‘ کا جلد اودھ نواب نصیر الدین حیدر کے جہد حکومت
(۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۷ء) میں کئی کیا گیا۔ شانہ اودھ میں نصیر الدین حیدر
اودھ جلی شاہ دوا لیے دلیب نماز و گزرتے میں معین تاریخ نے
کبھی چھپ نہیں لینے دیا۔ ان تحریروں نے ان دونوں کے خلاف جو سن گھڑا
انسانے ترانے تھے ان کی نگہبیاں ’آج تک دامن تاریخ کو داغدار
نہاے ہوئے‘ ہیں اور نصیر الدین حیدر کے بارے میں تو شاید یہی لوگوں کو
معلوم ہوگا کہ وہ صرف اودھ کا ایک بد نصیب شاہدار ہیں تھا بلکہ اپنے
دور کا ایک بالکل اور دو گوشہ شرمی تھاجن کی حشر و منتشر غزلیں
اب بھی کبھی نہیں نظر آجاق ہیں۔ اودھ کے وہ بہت سے معرے اور شرا
جو حزب الامثال اور کہاوتوں میں نقل ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ معرہ
نہ پیش کا ذکر ’زادۃ‘ آپ سیات میں بھی کیا ہے۔ ہاں مہاراجا راجہ
اپریل ۱۹۰۰ء میں جناب محمود حقیر احمد پوری کا ایک محفل طالب علی شیشی شانہ ہوا
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معرے کے اودھ ناسخ و دوڑن لکھتے تھے نہ صرف
لاہوری رام پور میں بھی موجود ہیں بیش مرزا قلیل کے شاگرد تھے جس دلاور تینہ
۱۱۹۴ھ میں وفات ۱۲۳۲ھ رہے۔

بھی دیوان ذو خاص و عام ہے

جودھ دیکھتا ہوں اودھ تو یہی تو ہے

گھر یہ بتنے والے شاید چہرے کا یہ رنگ ہوں کہ یہ مشہور معرہ انہیں
’نصیر الدین حیدر کی ایک فرعونیت غزل کا معرہ‘ ہے۔ گیارہ شعر
کی چھدی غزل ایک نظمیں بلاض میں لکھی ہوئی ہے جو میرے کتب خانہ میں
موجود ہے۔ ان کے دو شخص تھے بادشاہ اودھ بادشاہ! ابھی ایک کوئی قلمی
یا مطبوعہ دیوان میری نظر سے نہیں گزرا۔ تین غزلیں ’جموہ سنہ‘ میں ہیں
اور ایک اس قلمی بلاض میں ’ہوس‘ جو میرے پاس ہے۔ قلمی بلاض کی غزل
درج ذیل ہے۔

یہ آنے کی کسمت کی آرزو ہے کس ساقی نے ساغر مشکبو ہے
سایا ہے جیت تو آنکھوں میں میری جودھ دیکھتا ہوں اودھ تو یہی تو ہے
بتاؤں میں کیا حال زلف پریشاں عیاں زلف دلاڑی کو مہم ہو ہے
جلو قبر فرسار پر فائے کو گھر آپ شریں سے لازم دھو ہے
نکل جائے جان ترے قدموں کیچے یہی دل کی حرمت ہی آرزو ہے
گشت میں جاگہر ہلکے لکے دیکھا نڈیری ہی رنگت سے نڈیری ہو ہے
ستیا ہے ناحق ہیں تو نے ظالم یہ انصاف انشہ کے دوبرو ہے
کیا چاک و مشت نے ایسا گریاں کسینے کا قالی نہ جائے رفو ہے
شوقین کے گردن پہ ہوتا ہے ظاہر یکس کشتہ لمبے گنڈ کا ہو ہے
عبث مجھ کو سنس نہیں کے دیتے ہو گئی زبان کو سلجاو یہ کیبا لنگو ہے
شب و دم میں اب کی بارہی چوہلا چھری اودھ مرے سحر کا لگو ہے
رہے سایہ پنہاں بادستہ پر خداوند عالم جہاں تو ہے

’جموہ سنہ‘ میں ان کی تین غزلیں شانہ میں جو اس سے پہلے مجھے کبھی نظر
نہیں آئیں۔ اور ان کے فرمولو ہوسے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔
صورت نظر آگئی کسی کی کس سے ہوں آہ پتی کی
یہ بات ہے ایک عاشقی کی کہنے زکسی سے اپنے جی کی
اس دل کو لبوں میں ہم نے پالا دشمن سے بھی ہم نے دوست کی
کیونکہ نہ زینے خند سیدھا خراکی سے تیرے ہسری کی
آیا جو خیال چشم و حساں غزاد میں ہم نے کس کی

چہ صحرایہ کا درد ورجب سے
 بہو چنیا یا ہبا کے نامہ شوق
 غم کو صبا نے دی ہے تقدیر
 عادی آئی وہیں کہ جب چین میں
 ناخوش وہ رہا مرا مہیا
 اس پر بھی خطبہ تو، تو خوش رہ
 ابرو کا پڑا ہے عکس اگر
 اس منہ کہا ہے ہم سے ہنس کر
 وہ دادی عشق لے کیا ہے
 دل میں رہتا ہے یاد تیسوی
 پائی مرے دل سے جب رانی
 پچھتہ بھگت خلد سے نہیں کم
 کیا ہے مرے گھر میں آپ سے وہ
 کیا دیں گے جواب روزِ عشر
 دل سے ہوں میں یاد تہ، عاشق
 سمرن ہے۔ محمد کو یا علی کی
 دوسری منزل کے چند شعر ہیں :-

اے فلک ایک تو مشب ایسی بھی آئی ہوتی
 زہرِ مرزدست نگاہیں کی کلائی ہوتی

چاند سی شکل اگر کونے دکھائی ہوتی
 چٹھکے ہتھاب کے حنف پر بھی ہوائی ہوتی
 ہوتی آگاہ جو پردانے کے سمندر دل سے
 شبنمِ فائوس سے یا ہر نکل آئی ہوتی
 آسمان نے جو نہ قدرت دی اسے خوب کیا!
 ورنہ انسان نے زمین سر پر اٹھائی ہوتی
 شیشہ دل کو جو کرتے نہ کدورت سے مفا
 آئینہ رویوں سے کس طرح مٹائی ہوتی
 ظلم کرتے تھے وناحق نہ اگر بندوں پر
 اسے تو فکس میں تمہاری بھی جعدائی ہوتی
 دل ہی آزادی کو چاہتا، مسارا درد
 ایک جھٹکے میں زنجیر کاڑائی ہوتی
 باتش فعل الہی جو نہ (ہوتا، ہم پر)
 کس طرح زہرِ نگین ساری خندائی ہوتی

اس مجموعہ کے پہلی خدو حال ہیں۔ اگر اربابِ نظر اس کی چھان بین کریں تو
 یقیناً اس تاریخی غلو لکے اذواقِ شعر و ادب میں قابلِ ذکر شاعر
 ہی کریں گے! کیا جب ہے کہ اس مجموعہ میں تلاش و جو کرنے سے معافی،
 میرا، انشاء، جرات اور آتشِ دیرہ کی ایسی غزلیں ہیں جو مل جائیں جو
 مہلوعہ دیوانوں میں شامل نہ ہوں۔

قوی آمدنی میں ۱۹۷۵ء فی صد کا اضافہ

۱۹۵۹-۶۰ء کے مقابلے ۱۹۶۰-۶۱ء کے دوران میں بھارت کی قوی آمدنی میں ایک سرسری تخمینے کے مطابق جو مرکزی
 اعداد و شمار کے ادارے نے پشتر شدہ تازہ معلومات کی روشنی میں کیا ہے، ۱۹۷۵ء فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔
 اس بلکہ اضافے میں کم از کم ۳۷ فی صد زراعت کے سبب اضافہ ہوا ہے۔ یہ عارضی تخمینہ ہے، کیونکہ یہ جزوی معلومات کی
 رہتا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ سال کے ادائیگی قوی آمدنی پر جو سالانہ رپورٹ شائع کی جائے گی اس میں یہ تخمینہ کافی بدل جائے۔
 دو سیکڑا ان کے دوران میں قوی آمدنی میں حقیقی اضافہ ۱۹۷۶ء تھا۔ پہلے پلان میں یہی رقم ۱۸۷۵ء فی صد تھا۔ ۱۹۶۰-۷۱ء کا ۶۵
 فی صد اضافہ سالانہ اوسط اضافے کی شرح سے کافی زیادہ ہے جو کہ دوسرے پلان کے دوران میں ۱۳۷۹ فی صد رہی ہے۔

بڑے چھوٹے

”جی ہاں جی ہاں! امی سوچ۔ اب دیکھیں کون بڑا سوچ
ہیں کہ گاؤں کو چمکاتے ہیں مہاراج۔“
لوگے ہمارے کہنے میں بڑا ٹیٹھا طنز موجود تھا، لہذا کچھ شرمناک سی
جے چارہ ہمارے طرح اپنی ذات کے برہمن نہ تھے، بلکہ ہمیں تھے،
جی کی آج کے سماج میں کوئی عزت ہوتی ہو، ہمارے گاؤں میں بالکل پوچھ
نہیں۔ جی ہاں میں اپنے عجیب چھپانے والوں میں سے نہیں ہوں ہیں
اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارے اس چھپنے سے گاؤں شاگرد میں جس نے
پتہ نہیں کتنوں کے دل رنجیدہ بھی کئے ہوں گے، مگر کہاں شاگرد بخیر ہے
طرح طرح کے لوگ، بادہ پی، چھوٹے بڑے بھی، مگر آج تک یہ نہ ہوا
کہ بڑوں نے چھوٹوں کا دل رکھنے کی خاطر ان میں بھی اپنی طرح انسان
سمجھا ہو۔!!

مجھے اچھی طرح یاد ہے شہنشاہ تہ جی کے ہاں ایک بار بہت مہینے
دن آئے تھے۔ گاؤں کا یہ دستور تو ہمیشہ سے ہے کہ جیت زمیندار کی ہوتی
ہے اور بے چارے چھوٹے کا اشتکار ہمیشہ زمیندار کے مقابلے میں
پس جاتے ہیں جیسے چمکے کے دیوانوں کے مددگار کیوں۔ اس بار بھی
ایسا ہی ہوا، شہنشاہ تہ میرے اپنے تپائی کے قول دار تھے دینی تپائی
کی چمک میں بیٹھے والے گاؤں کا بے بس دانہ!!، تپائی کی زمین پر کاشت
کرتے تھے اور فطری طور پر ان سے دیتے تھے۔ اس سال فصلیں اسی
تباہ ہوئیں کہ گاؤں کی جان پر ہی گئی۔ حد یہ کہ وہ سال بھر کے بھو
اتاج گھروں میں منیت کر رکھ لیا کرتے تھے، وہ ملک نہ رکھ سکے۔

میں جید آباد سے بی۔ اے کا امتحان دے کر اپنے گاؤں شاگرد
لوٹ رہی تھی۔ میں نے سارے مسافروں کو گاؤں سے باہر ہی چھوڑ دیا
تھا، تپائی نے میرے لئے سواری کو گھوڑا اور دو نوکر بھجوا دیئے تھے
راؤ زمیندار کی بیٹی تھی نا؟ سفر کی ٹھکن سے میرا چہرہ مضمحل ہو
رہا تھا، میرا کنبہ جیسا رنگ دھوپ کی چشمتے ہتھے سرخ پڑ گیا تھا
اپنے منہ سے بالوں کو میں نے ایک ہرے رنگ کے رومال سے باز رکھا
رومال کی گرہ ٹھوڑی کے نیچے دے رکھی تھی۔ ہوا کے ہلکے روں سے میر
بال، رومال کی گرفت سے نکل نکل پڑتے، راکب میں میرے پاؤں
ڈولنے لگتے۔ میں ہر لمحہ سوچ رہی تھی کہ کب کھڑک پہنچتی ہوں۔
مجھے ہم کی پگڈنڈی سے ہٹ کر کھیتوں کی طرف والی پگڈنڈی کی
طرف مڑنے کے تو میری آنکھیں کچھ ناخوش سے منظر پر جم گئیں۔
”ارے یہ کھیت؟ اور اس کھیت میں یہ کام کرنے والے.....؟“
لوگوں میرا بوڑھا ظالم میری نظروں سے میرا مطلب جانپ گیا۔

مسکرا کر کچھ طنز سے بولا۔

”مالک یہ شہنشاہ تہ جی کے بڑے بیٹے کا کھیت ہے، امی جو جید آباد
سے زراعت کا بی۔ اے پاس کر لیا ہے اور ہر گھڑی گاؤں والوں سے
کہتا چرتا ہے کہ ”ٹھیکے کے ٹھیکے پاڑی کرو۔ حکومت کا ساتھ
دو۔“ اپنے خیالات بدلو..... اور لوگوں زور سے ہنسن پیا۔
”شہنشاہ تہ جی کا بیٹا۔“ لکھا سوچ۔ ”میں کھیت کی طرف
دیکھتی ہوں بولی۔“

آج کل کی

بالکل جہل آیا تھا کہ کرب پڑے لوگ ہیں اور ہم جوہٹے.....“
اور سن تیزی سے ود آیا تھا، اسی تیزی سے بیلا بھی گیا۔
میں نے آٹے سے ڈورنگ جالتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک کڑکھوتے
پرسور اور بوگی، چلتے چلتے جب ہم تینوں اس کے کیمیت کے پاس پہنچے
تو وہ سر جھکا کر ہوئے ایک مینڈک کے پاس ہماری طرف ہنسنے لگے کھڑا
تھا۔ میں نے گھوڑے کی بیڑ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

جیسے اپنے آئسوپتے ہوئے اس نے کہا: یہ گاؤں ہی کا نام شازنگر ہے، حقیقت میں شازکر دے والا نہیں۔ اس نے قوسداً ہم چھوٹوں کو آئسوپ ہی دے دیں۔ ہم یہ علاج بھی نہ پات سکیں گے۔"

میں پورے دھواس کے ساتھ بڑھی اور مسکرائی کہ۔ "بیکسی سوچو تم نے بھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ میرا نام چندا ہے اور چاند اپنی روحنی سدا سوچ سے مستعار بیٹا ہے۔"

شہری و دیہاتی آبادی کا تناسب

گزشتہ دس سالوں میں بھری آبادی میں سے زیادہ اضافہ آسام میں ہوا ہے ۱۱۷۴ فی صد اس کے بعد اڑیسہ (۸۷۰۲ فی صد) بہار (۹۰۸ فی صد)۔ عہد پریش ۷۷، ۷۷ فی صد اور آخر میں کیرلا (۲۰۲، ۲۰۲ فی صد) کا نمبر آتا ہے۔
دوسری ریاستوں میں بھری آبادی میں فی صد اضافے کی رفتار حسب ذیل رہی ہے:-
پنجاب (۲۰۳) مغربی بنگال (۲۸۸) دھلا (۲۷۹) ہماچل پردیش (۱۹۵) گجرات (۲۵۰) میسور (۱۶۵) آڑھہ پڑش (۱۵۱) راجستھان (۹۰) اور اتر پردیش (۸۷)۔

شکستِ آدم

رُخِ دوراں جھٹتا جا رہا ہے
 سوا نیزے پہ سورج آ رہا ہے
 بیابانِ جہاں کا یاد گولا
 قیامت کی طرح بل کھا رہا ہے
 تمدنِ وقت کو کنگن کے بدلے
 سہری تھکڑی پہن رہا ہے
 ہوس کی آندھیاں چُنکارتی ہیں
 مزاجِ عشقِ بجھتا جا رہا ہے
 وہ آدم جو کبھی عقہہ کُشا تھا
 وہی اب زلیبت کو الجھا رہا ہے
 فلک سے گرمِ تانیں جھڑپی ہیں
 کہ جیسے کوئی دیپک گا رہا ہے
 ستارے ٹوٹ کر گرنے لگے ہیں
 خدا خود اب زمیں پر آ رہا ہے

قومی یک جہتی اور جذباتی اتحاد

سفارتوں کے پیش نظر کئے گئے تھے اس لئے وہ اُس وقت کے معمر مملکتوں سے متعلق ہیں اور دوسری ریاستوں میں ان پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اصول مان لیا گیا ہے، البتہ اس میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ خاص مفہم یہ ہے کہ پیسے سے جو مہمیں بنائیں ہیں ان میں کم دیا جائے بلکہ جہاں کہیں ممکن ہو مزید مہمیں دی جائیں۔

(ج) ثانوی تعلیم: یہاں بھی ۱۹۵۶ء کے میوزئم میں مذکور عام اختتامی کونفرانس کی تجویز کا نگران نے اصولی طور پر جزوی مشقت کی ریاستوں کے فیصلوں کو بھی قبول کر لیا۔ ان اصولوں پر دیا۔ کونفرانس کے تعلیمی محکمہ کو اس لحاظ سے فوراً کرنا چاہیے کہ اپنی اپنی ریاستوں کے موجودہ حالات کے مطابق ان پر عمل کیا جائے۔ جہاں تک ثانوی درجہ میں زیر تعلیم کا تعلق ہے، دوسری زبان کے فارمولہ پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا۔ اس سطح پر طلباء کو زیادہ دینے کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ اسکول کی تعلیم کے بعد کو اپنی پیشہ اختیار کر سکیں اور اس سطح پر ان میں بنیادی تعلیم کی اعلیٰ تعلیم کئے بھی تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں دستور کے انٹرویو جدول میں دی گئی تعلیم و سائنس کے اداروں اور انگریزی سے کام لینا چاہیے۔ لیکن آسام کے پہاڑی علاقہ اور مشرقی بنگال کے دارجلنگ ضلع کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور ان کے لئے خصوصی انتظام کئے جائیں۔

کانفرنس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لئے مناسب نصابی کتابوں کی تیاری کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ عام طور سے یہ نصابی کتابیں ریاستی حکومتوں کی تیاری کرنا چاہئیں۔ یہ کام بھی انھوں میں نہیں چھوڑنا

۱۰۔ ۱۱ اور ۱۲۔ اگست ۱۹۶۱ء کوئی دہلی میں وزیر اعظم کے زیر صدارت ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس ہوئی تھی۔ جس میں قومی یک جہتی کے مسکریہ غور و خوض کیا گیا۔ وزیر اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں قومی یک جہتی سے متعلق تجویز، تشلیسی اور انتظامی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرقہ واریت اور سانی جھگڑوں سے متعلق مسائل کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے ہم قومی طریقہ کار کیا ہے۔ وزیر اعظم نے حکومت ہند کے میوزئم مجرمہ۔ ستمبر ۱۹۵۶ء کا بھی ذکر کیا جو سانی اقلیتوں کے تحفظات سے متعلق ریاستی سطح پر جاری کی گئی سفارشات پر غور کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا اور جس کو ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد شائع کیا گیا تھا۔ یہ میوزئم ایک ہندو مذہب کی صورت میں ہے جس میں سید، ریاستوں کی سانی اقلیتوں کو دینے جانے والے تحفظات کا ذکر ہے۔ کانفرنس میں اس میوزئم کے عام اصولوں کی توثیق کر دی گئی اور اتفاق رائے سے بعض تبدیلیاں منظور کی گئیں جو یہ ہیں:-

(۱) ابتدائی تعلیم: سانی اقلیتوں کی حق تسلیم کیا گیا کہ وہ ابتدائی تعلیم دوسری زبان میں حاصل کریں۔ دستور کی دفعہ ۵۱ الف کی رو سے اس حق کی توثیق بھی ہو گئی ہے اور صدر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مسئلے میں جب ضرورت دہایات جاری کر سکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم سے متعلق جزوی منطقہ کی ریاستوں کے فیصلوں کو اصولی طور پر منظور کیا گیا۔ چونکہ یہ فیصلے ریاستی درجہ کی کمیٹی کی

چاہیے۔ نعمانی کہتا ہیں اس وقت تک سے تیار کی جائیں کہ لہجہ کے ذہن میں ہندوستان کی وحدت، اجتماعی نقطہ نظر اور ہندوستان کے بنیادی ثقافتی پس منظر کا احساس پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان اور دیگر عالم کے موجودہ حالات سے بھی واقفیت ہم بخیر پائی جائے۔ ان نعمانی کتابوں کی تیاری کا کام قابل لوگوں کو سونپا جائے۔ مرکزی حکومت کو چاہیے کہ وہ ابتدائی اور ثانوی دو درجہ مدارس کے لئے نمونے کی نعمانی کتابیں تیار کرے۔

ہندوستان کی علاقائی زبانوں کی ترقی اور تعلیم میں ان کے تدریسی استعمال کو پیش نظر ضروری ہو گیا ہے کہ بچے اپنا مقصدی رشتہ لئے ایک گھر کی زبان کو تیزی سے ترقی دے رہے ہیں۔ یہ کام آپ تک انگریزی سے لیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ انگریزی اب بھی کچھ عرصے تک اس مقصد کے لئے استعمال ہوتی رہے گی، مگر ظاہر ہے کہ ہندی کی ترقی کئے قری اقدامات کئے جانے چاہئیں تاکہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس مقصد کو پورا کر سکے۔ ورنہ اس بات کا خطرہ ہے کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے مختلف زبانوں میں کوئی مستقل باہمی رشتہ نہ رہے۔

ہمیں الاقوامی رابطہ اور جدید علوم خاص کر سائنس، صنعت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہندوستان میں کسی بھی لائق زبان کی واقفیت زیادہ سے زیادہ ہو۔ اگرچہ یہ زبان کو بھی اہم یورپی زبان ہو سکتی ہے لیکن انگریزی اس مقصد کو زیادہ آسانی سے پورا کر سکتی ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں خوب سمجھی جاتی ہے اس لئے انگریزی پڑھنے کی اہمیت ظاہر ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر زبانوں کی اچھی طرح تعلیم دینا ہے تو انہیں ابتدائی عمر میں ہی سکھانا چاہیے کیونکہ اسی عمر میں بچہ آسانی سے زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کی تعلیم ابتدائی عمر میں ہونی چاہیے۔

کافرنس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں زبانوں کے لئے ایک مشترکہ رسم خط نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ایک قوی رشتہ قائم رہے گا اور اس سے یک جہتی پیدا کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ موجودہ حالات کے تحت ہندوستان میں ایسا مشترکہ رسم خط صرف دیہاتوں کی رسم خط ہی ہو سکتا ہے۔ انجمن

مستقبل قریب میں کوئی مشترکہ رسم خط اپنا، مشکل ہو گا۔ لیکن اس مقصد کو پیش نظر رکھنا اور اس کے لئے برابر کام کرنا چاہیے۔

حکومت ہند نے ریاست حکومتوں کے مشورے سے ایک سرکاری فارمولہ تیار کیا تھا تاکہ ثانوی مدارس میں سائنس میں کی تعلیم کے لئے اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ اس فارمولہ کو آسان بنایا جائے اور ثانوی درجہ پر زبانوں کی تعلیم کا انتظام اس رنج سے کیا جائے:

(۱) علاقائی زبان اور مادری زبان جبکہ مادری زبان علاقائی

زبان سے مختلف ہو۔

(۲) ہندی یا ہندی بولنے والے علاقوں میں کوئی اور ہندوستانی

زبان۔ اور

(۳) انگریزی یا کوئی دوسری جدید یورپی زبان۔

جن اسکولوں یا گروہوں میں اقلیتی زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے ریاست سے باہر کی یونیورسٹیوں یا دیگر اداروں سے افاق کا مسئلہ پیغمبر آیا۔ اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ زیادہ تر ایسے اداروں کا ریاست کے اندر ہی پرورش ہو رہے ہیں اور بورڈوں سے افاق کا انتظام ممکن ہو جاتا ہے لیکن جہاں کہیں ریاست کے اندر ایسے افاق کا انتظام کرنے میں ناقابل عمل مشکل پیش آئیں، وہاں ان افاق ریاست کے باہر کی یونیورسٹیوں اور بورڈوں سے کیا جاسکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی ریاست میں سرکاری کاموں کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ زبانیں استعمال ہوتی ہوں لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی ریاست جسے طور پر ایک سائنسی ریاست نہیں ہے اس بات کے پیش نظر تعلیم و ترقی کے لئے اقلیتی زبانوں کے استعمال کے انتظامات کو ترجیح دے گا۔ سرکاری زبان عام طور سے سرکاری کاموں کے لئے ہوتی ہے لیکن عوام سے رابطہ پیدا کرنے میں یہ مقصد پیش نظر ہونا چاہیے کہ عوام کی بھاری اکثریت جو کچھ ان سے کہا جائے اس کو سمجھ پائے۔ اس لئے جہاں بھی سلیٹی کی ضرورت ہو سرکاری زبان کے علاوہ اس علاقے کی مروجہ دیگر زبانوں سے بھی کام لیا جانا چاہیے۔

اگر کسی خطی کم سے کم سطح کی ہندی آبادی ریاست کی سرکاری

زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان پختہ یا استعمال کرتی ہے تو اس مسئلہ میں ریاست سرکاری زبان کے علاوہ انگریزی کو پکے اس زبان کو بھی سرکاری زبان مان لینا چاہیے لیکن اس مقصد کے لئے عام طور سے صرف انگریزی بڑی زبانوں کو مستعمل کرنا چاہیے جو دستور کے آٹھویں جدول میں دی گئی ہیں۔ لیکن اسام کے پہاڑی اضلاع اور مغربی بنگال کے دارجلنگ ضلع کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے کیوں کہ وہ ان آٹھویں جدول کی مذکورہ زبانوں کے علاوہ دوسری زبانیں مردم پر ہیں۔

اگر کسی نسل یا اس سے چھوٹے علاقہ مثلاً میڈیٹی یا عجم میں لسانی اقلیت کی آبادی کا ۱۵ یا ۲۰ فی صد حصہ ہو وہاں یہ مناسب ہو گا کہ ہم سرکاری اشتہارات، قواعد، قوانین کسی دوسری زبان یا زبانوں کے علاوہ اقلیت کی زبان میں بھی شائع کئے جائیں۔

اختلاف میرے اندر وہی فاطمہ فاطمہ پر پوٹ، مختلف سرکاری دفاتر کے مابین خط و کتابت عام طور سے ریاست کی سرکاری زبان میں ہی ہونی چاہیے۔ لیکن جہاں تک اختلافی عوام سے تعلق ہے ان کی درخواستیں وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی قبول کرنی چاہئیں اور اس بات کا بھی انتظام کرنا چاہیے کہ جہاں ہمیں ممکن ہو عوام سے موصول ہونے والے خطوط کا جواب انہیں زبانوں میں دیا جائے۔ یہ بھی اختلاف ہوتا چاہیے کہ دیاستوں یا نسلیوں میں یہاں نہیں لسانی اقلیت کی آبادی ۱۵ سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ہو، اہم قوانین، قواعد اور احکام کی برقی موٹی باتوں کا ترجمہ انگریزی زبانوں میں شائع کیا جائے۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے ریاستوں کی طرف اپنے صدر دفتر میں فرانسیسی، یورپ و دارالترجمہ، قائم کرنا مناسب ہو گا۔ جب کوئی غرضی تراسر دیا جائے حکومت کا کوئی حکم یا اشتہار عوام کی اطلاع کے لئے شائع ہو تو جس کے مفرد کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے ضلع یا میونسپل علاقہ کی مقامی زبان میں ان کا ترجمہ کروالیں۔

ریاست کے صدر دفتر اور ضلعوں کے مابین خط و کتابت کا کام اضلعی اشتہام کے تحت آتا ہے۔ چنانچہ عام طور سے یہ مناسب ہو گا کہ ریاست اور ضلع کے دفاتر کے مابین خط و کتابت ریاست کی سرکاری زبان میں ہی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے ریاست کی سرکاری زبان کے کئے جائیں گے سرکاری زبان کے استعمال کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔

یونین کی سرکاری زبان انگریزی ہوگی یا ہندی۔

ریاست حکومت کے تحت ملازمتوں میں بھرتی کئے جانے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے اس لئے ریاست کی سرکاری زبان کے علاوہ امتحانات میں انگریزی یا ہندی کے استعمال کی اجازت بھی دینا چاہیے۔ ریاست کی سرکاری زبان سے واقفیت کا امتحان انتخاب کے بعد ادا کرنا لازمی ہوگا کہ اس انتظام سے پہلے کرنا چاہیے۔

یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم کے مشربہ تفریق سے غور کیا گیا۔ یونیورسٹی میں علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا رجحان بعض اعتبار سے مناسب ہے، لیکن اس طرح ایسی یونیورسٹیاں بقیہ ہندوستان سے الگ تھلک ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک نئی ہندو زبان کی صورت میں ان کے مابین کوئی مشترک رشتہ قائم نہ رہے گا۔ اساتذہ اور طلبہ و آسانی سے ایک یونیورسٹی سے دوسری یونیورسٹی میں نہ سکیں گے اور مختلف لسانی علاقوں کے مابین مشترک رابطہ ہونے کی صورت میں تعلیم کے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ یونیورسٹیوں کے مابین اس مشترک لسانی رشتہ کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ یہ مشترک لسانی رشتہ انگریزی یا ہندی کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے یا ہندی ہی نہ رشتہ قائم کرے گی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہندی کو اس کا پہل بنانے کے لئے ہر طرح کوشش کی جائے۔ ہندی اور عام طور سے کسی علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا اس وقت مفید ہو سکتا ہے جبکہ یہ زبان جدید تعلیم اور خاص کر سائنسی اور ٹیکنیکل مضامین کی تعلیم کا ذریعہ بننے کے لئے ترقی کرے۔ اس مقصد کے لئے ہندی اور دوسری زبانوں کو ترقی دینے کی ہر طرح کوشش کرنا چاہیے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، انگریزی پر دستور قائم رہے گی، انگریزی کی جگہ ہندی یا کسی علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کام تقریبی ہو یا مضامین کے اعتبار سے اس کی تقسیم کر دی جائے۔ یہی سب تک ضروری ہو سائنسی اور ٹیکنیکل مضامین انگریزی میں پڑھائے جائیں اور دوسرے مضامین ہندی یا کسی علاقائی زبان میں۔ ہر صورت میں اسکولوں اور کالجوں میں ہندی اور انگریزی میں تعلیم کا مینار بہتر کیا جائے اور بلند سطح پر قائم رکھا جائے۔

جیسا کہ مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا ہے تمام سائنسی اور ٹیکنیکل

اصطلاحات مرتبہ بین الاقوامی اصطلاحات کی بنیاد پر وضع کی جائیں اور وہ سب ہندوستانی زبانوں میں یکساں طور پر پکارے جائیں۔

کانفرنس میں مرکزی حکومت کے اس اعلان کا غیر مستقیم کیا گیا کہ ہندو کے کئی ہندو سرکاری زبانوں پر جلسے کے بعد بھی کئی ہندو سرکاری مقامات کے لئے ہندو کے ساتھ ساتھ انگریزی کا استعمال جاری رہے گا۔ برٹین کی سرکاری زبان کے متعلق صدر کے حکم نامہ میں بھی اس کی مزید تصدیق کر دی گئی ہے۔

اس امر سے اتفاق کیا گیا ہے کہ لسانی آئینوں کے مفادات کے تحفظ سے متعلق پالیسی پر عمل درآمد کرنے اور قومی یک جہتی پیدا کرنے کا کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دستور کی دفعہ ۳۵۰ (ب) میں لسانی آئینوں کے کمشنر کے فرائض درج ہیں۔ تاہم یہ کہ کمشنر کی ان تفہیمات کو پورے کاروائی کے انتظامی کام نہیں سونپا جاسکتا۔ مگر اس بات پر زور دیا گیا کہ کمشنر کے ساتھ ساری ذمہ داریاں بطور حتمی طور پر تفویض کر دیں۔

لسانی آئینوں کا کمشنر نہ صرف سالانہ رپورٹیں ہی تیار کرے بلکہ اہم باتوں سے متعلق وقتاً فوقتاً اور رپورٹیں بھی تیار کرے گا۔ یہ جہیں متعلقہ وزرائے اعلیٰ اور وزارت داخلہ کو پیش کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ تمام وزرائے اعلیٰ کو یہ رپورٹیں بھیجی جائیں۔

منطقاتی کونسلوں کو ایسے علاقوں میں اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ مرکزی وزیر داخلہ کے زیر صدارت منطقاتی کونسلوں کے نائبین صدر پیشینہ ایک کمیٹی مقرر کرنا چاہیے۔ اگر

مزوری ہو تو مرکزی وزیر داخلہ، دوسرے وزرائے اعلیٰ اور وزیروں کے اس کمیٹی کے حلقوں میں شرکت کی دعوت دے سکتے ہیں۔ کمیٹی لسانی آئینوں کے مختلف تفہیمات پر عمل درآمد اور قومی یک جہتی برٹھانے کے کام پر نظر رکھے گی۔

قومی یک جہتی برٹھانے کی اہمیت کے پیش نظر وزرائے اعلیٰ اور مرکزی وزیروں کی مزید کانفرنس ہونی چاہئیں تاکہ یہ فیصلے کام کا جائزہ لیں اور حسب ضرورت مزید اقدامات تجویز کریں۔ اس مقصد کے حصول میں کامیابی کا اطمینان منتقل ہو، قومی اور تمام ریاستوں اور مرکزی حکومت کے مابین تعاون ہے۔

کانفرنس میں طے کیا گیا کہ قومی اور ریاستی یک جہتی برٹھانے کے لئے زیادہ اچھی طرح دیکھیں پہلے پرنسٹن واشنگٹن کی جائے۔ مرکزی وزارتات، اطلاعات و نشریات اس موضوع پر ایک نوٹ تیار کر کے وزرائے اعلیٰ کو بھیجے گی جس پر آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے گا۔

قومی یک جہتی کی اہمیت کے پیش نظر یہ قرار دیا گیا کہ اس کے لئے قومی پہلے پروگرام کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک وسیع تر کانفرنس ہونی چاہیے جس میں وزرائے اعلیٰ، مرکزی وزرائے اعلیٰ، وزراء کے علاوہ پارلیمنٹ کی مختلف پارٹیوں کے نمائندہ ممبرانہ دوسرے متعلقہ لوگ، ماہرین تعلیم، سائنس دان اور کاروباری لوگ شامل ہوں۔

مزوری گزارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھو۔

۲۔ غریب لکھو مضامین اسی صورت میں واپس کے جاتے ہیں جبکہ

متناسب سائز کا کاغذ اور ڈاک کے ٹکٹ ان کے ہمسارہ

ہوں گے۔ (ادارہ)

دو چراغ اور بجھے

مولوی عبدالجلی

۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق لاہور کی ۹۱ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مولوی صاحب ۱۹۱۲ء میں ترقی اردو سے وابستہ تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہی اس کے بانی تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے متعدد گوشوں میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیں اور اردو کے ادیبوں اور کارکنوں کی رہنمائی کی۔ وہ خود بھی اردو کے بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز ہوئے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہوا ہو جس نے اتنی بھی مدت تک ایک مجاہد کی طرح اردو کی خدمت کی ہو۔ مولوی صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے اور ان کی زندگی بڑی پاک و عتیق تھی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ اردو کی خدمت کے جنون میں بعض ایسی باتیں بھی کیں جن سے ہمیں اتفاق نہیں۔ پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے خادموں میں ان کی ہستی بے مثال تھی اور جب تک اردو زندہ ہے ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری

سید عطا اللہ شاہ بخاری جن میں ان کے عقیدت مندر شاہ جی کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ ۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء کو ملتان میں الملوک ہمارے ہو گئے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنی زندگی ایک مجاہد کی حیثیت سے گزاری۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں آپ نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ انھیں خدمت وطن کے اہنہاگ میں اپنی سبھید بھی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا ہے۔۔۔ ”میں نے تمام عمر اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے۔ ایک زندگی مستعار لیا تھا کچھ جلی میں کٹی کچھ دیل میں کٹ گئی۔“ شاہ صاحب ادب اور مذہبیت کا ایک نادر مجموعہ تھے۔ ان کے عقیدت مندا جن میں امیر شریعت کہا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ امیر خطا بھی تھے۔ اردو کا ایسا فیض مقرر اور خطیب شاید ہی کسی زمانے میں پیدا ہوا ہو۔ وطن پرستی ان کا مزاج تھا اور دلہنی راج سے نفرت ان کی گھٹی میں تھی۔ انھیں جذبات کو لے کر وہ ہزاروں آدمیوں کے جموں پر چھا جا کر کہتے تھے۔ قرآنی آیات کی قرائت اور بریل اشارہ کے پڑھنے سے نغز بردوں میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان میں ڈگے تھے۔ یہ زمانہ بھی انھوں نے خوش دلی سے نہیں گزارا بلکہ غم و فاقہ کے ان کے شامل حال رہے۔

عشر ملیانی

عزیز لکھنوی

ان کی ادبی و فنی پیشادہی تو پی سے اس رعب و جلال میں اور بھی اضافہ ہوتا تھا۔

اس کے بعد مولانا سے ملاقات کے اکثر موقع ملے رہتے۔ زیادہ تفصیلی ملاقات تو اس کے ہر موقع پر ہوتی جو گھر پر ملتا تھا۔ انہیں اپنی آباد اور مجھے حضرت گلے جایا کرتا تھا۔ نظر صاحب کے ساتھ مسلسل تلمذ کے باعث وہ مجھے برادرانہ شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ ایران کا سفر نامہ دیکھ کر بیٹھے بیٹھے ملازمہ پوریا تھا دھڑا دھڑا ملازمہ میں اس مقام پر پہنچے جہاں شاہ ایران کی کسی گھوڑی میں شرکت کا ذکر تھا۔ عبادت پڑھتی ہی ہنک اٹھے اور فرمایا ”دیکھو گھوڑی کی سیر کے لئے کیسا حسین لفظ فارسی زبان میں شاہ ایران نے استعمال کیا ہے شاہ نے تقریر فرمایا تھا، امروز بہ میرا سب دواقی رفیق“ اس لفظ ”میرا سب دواقی“ پر مولانا ٹو ہو گئے، ”اس رئیس کے لئے گھوڑی کے انداز کا نام تبدیل فارسی زبان میں اس دواقی سے زیادہ بہتر کوئی لفظ ہو سکتا ہے۔ فرمائے گئے ”زبان“ اس کو کہتے ہیں۔

مولانا عزیز کو میں نے مشاعرہ پڑھتے سنا ہے۔ مخصوص لکھنوی ترمیم میں پڑھتے تھے۔ اسی ترمیم میں قلم مولانا صوفی مرحوم بھی کلام فرماتے اور یہی انداز حضرت ثاقب مرحوم کا بھی تھا۔ ثاقب جب پڑھتے معلوم ہوتا تھا ایک جہنم جہنم رہا ہے۔ اللہ انہی بزرگ تھے۔ ان تینوں بزرگوں کے انداز شرفازی میں عجیب کیفیت تھی۔ ترمیم کا ترمیم اور مستانت

۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ اردو زبان کے تحفظ اور ترقی کے سلسلے میں لکھنؤ کے ادباء و شعراء نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ انجمن کی نشستیں انہیں آباد کے ایک بالائی کمرے میں منعقد ہوا کرتی تھیں یہ یاد نہیں کہ کس کمرے میں کسی اخبار یا رسالے کا دفتر تھا یا اراکین انجمن میں سے کوئی صاحب اس میں رہتے تھے۔ بہر حال انجمن نے میرے رہنمائے سخن مرحوم منشی ذہب رائے نظر لکھنوی سے اشتراک و تعاون کے لئے درخواست کی۔ بیماری کے باعث وہ بذات خود انجمن کی مجلسوں میں شرکت سے محذور تھے لہذا مجھے حکم ہوا کہ میں ان مجلسوں میں شرکت کیا کروں۔ چنانچہ جب پہلی نشست میں شریک ہوا تو اس میں کئی کالی فن ادیبوں اور شاعروں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں کو موجود پایا۔ انہیں ادباء و شعراء میں مولانا محمد اوی عزیز لکھنوی بھی شریک تھے۔ غالباً میں نے پہلی مرتبہ انہیں اسی نشست میں پایا ان کے علاوہ مرحوم حضرت یگانہ حضرت بہار سکرپری بزم بہار ادب نیز کچھ اور معتدرا درباب ادب بھی شامل تھے۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں میں ڈاکٹر بذل الرحمان اور پروفیسر کمال الدین تھے۔

مولانا عزیز سے میرا پہلا براہ راست تعارف اسی نشست میں ہوا۔ مولانا شروع ہی سے بڑے مہینے تھے اگر گھنگو کے دوران میں کبھی کوئی موقع بتسم کا آ جاتا تو صرف کئی سی سکرپری ہونٹوں پر دوڑ جاتا تھی۔ ہر شخص سے کھل کر بات نہیں کرتے شاید جتنی بات کا خیال رہتا تھا۔ مولانا کے چہرے سے رعب و جلال ٹپکتا تھا۔ ان کی وضع و قیام اور

کی مناسبت۔ اور ازیں بھی سوز تھا، کلام میں بھی گوار تھا۔ میں نے مولنا صنی کے دربار میں بھی کئی مرتبہ حاضری دی ہے۔ اتنی محنت سے پیش آتے گویا ایک شفیق باپ اپنے بیٹے سے پیار کی باتیں کر رہا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں یہ سلسلہ ملازمت میرا تبادلا لکھنؤ سے پہلے لاہور آؤ پھر وہی ہو گیا لیکن مولنا عربیہ سے ریلوے ضبط بڑھتا رہا گیا۔ اب اس سلسلے کی ایک کڑی یہ مولنا کے بموجب شاگرد اور ان کا بیٹا کے مرحوم باکمال شاعر، ادیب اور فلسفی جگت موہن لال دواں بھی بن گئے تھے۔ دواں مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات سنہ بھی بہت جلد خصوصی شکل اختیار کر لی تھی۔

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے میں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ حب دستور مولنا عزیز کے دولت کردہ پر حاضری دی۔ اسی ملاقات کے دوران میں نے عرض کیا ”مجدد ریخاں ہے کہ خواجہ آتش کے بعد مرثیہ ایک آپ کی ہستی مجھے ایسی خوش نصیب نظر آتی ہے جس کو اس قدر اعلیٰ مقام و فاضل شاگرد و میر ہوئے ہیں مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جعفر علی نا آفرین، حضرت تکیہ سورتی، حضرت شام موہن لال بکر مریدی نیز حضرت جگت موہن لال دواں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اپنے تمام شاگردوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کس کو اپنا بہترین شاگرد سمجھتے ہیں۔“

مولنا مسکرائے۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے متعلق انھوں نے کچھ قسم کی بھی رائے دینے سے احتراز کیا۔ مرثیہ اشارے سے اتنا ظاہر کیا کہ جوش جمع جاوہ شاعری سے بھجک ہے۔ غالباً مولنا مرحوم حضرت پریش کی بہتادوی روش، یا غیاث فطرت اور ان کی روش پرستی کے باعث ان سے خوش نہیں تھے۔ دونوں کے تعلقات میں کسی قدر بعد اوراق ہو چکا تھا۔ انھوں نے مرثیہ جعفر علی خاں اثر اور حضرت دواں کا ذکر خاص طور پر کیا اور فرمایا۔

”آثر و مانغ کے شاعر ہیں اور دواں کے یہاں دل داروں ہوتی ہیں۔ وہ دواں کے بڑے مداح تھے اور ان کے شرعی سلوک کے بھی گرویدہ تھے۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ منشی گوپی ناتھ آسن، ان کے چھوٹے بھائی گورن لال ادیب اور حضرت مسخر عشق آبادی بھی مولنا کے

تلامذہ ہیں تھے۔

ایک مرتبہ میں نے دریافت کرنے کی جرأت کی کہ مولنا اس قدر محلات کے باوجود آپ محض ان بادی اسکول کی منشی پریشان قالی میں آخر آپ کو حصول معاش کے لئے اس دروس کی کیا ضرورت ہے، آپ کے تلامذہ ہی آپ کی اتنی خدمت کر سکتے ہیں کہ آپ کو کسب معاش کھلے ٹکڑا کاوش کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی۔

دواں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ قبل کا جواب کچھ اس طرح دیا۔

”مجھے دواں بھی کئی مرتبہ یہی بات کہہ چکے ہیں لیکن کیا آپ لوگ مجھے اتنی حقارتی بہت آمدنی سے بھی محروم کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ میں خاموشی اور عزت و آسرو کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ان تمام سماعت مند شاگردوں کی استقامت و حق پرستی چہ ہوگی۔ کتنے دنوں تک اس پر مجھ کو کسے کیا جا سکتا ہے

حقا کہ باغی تبت دوزخ برابر است
دقتن یا فروری ہمایہ در بہشت
بات ٹھیک ہی تھی۔

مولنا عربیہ نے کسی زمانے میں حضرت صنی سے استفادہ صنی کیا تھا۔ بعد ازاں یہ سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ میں نے اس بارے میں بھی استفسار کی جرأت کی۔ اس سوال کا جواب بھی انھوں نے دیا ہی مسکرا کے ساتھ دیا اور حضرت صنی سے قطع تعلقات کی بنا منقطع حق کے قطع کو قرار دیا جس کے بارے میں وہ دنوں بزرگوں کے درمیان اخلاقی رائے تھا۔ مولنا نہایت خود اور تھے۔ عربی اور فارسی میں ان کی قابلیت مسلّم تھی میرے خلاف مرثیہ چھپن پر شاہ صدر لکھنؤ بھی ان کے قائل تھے۔ اگرچہ وہ ہر کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے۔ مولنا عزیز بھی جناب صدر کی عظمت تسلیم کرتے تھے۔ صدر صاحب فارسی میں پہلے حضرت آغا خان کے شاگرد تھے بعد مولنا عزیز الدین عزیز کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ استاد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ جب مولنا عربیہ نے علامہ اشرف آبادی اپنا مکان بنوایا تو جناب صدر بھی اس کی تائید کے لئے درخواست کی۔

صدر صاحب نے کئی تاریخی قاضیوں - علاحدہ ہوں سے
حضرت کے میرزا محمد اودی - تعمیر شراست ویز آباد شراست
بے ساختہ صدر لکھنؤی سال ۱۲۸۰ شت
دولت کڈہ عزیز آباد شراست

۱۳۳۵ھ

مکان عزیز است فرحت فزا
کہ تیر شہر از برای ع - عزیز
رقم کہ حضرت سرانے عزیز

۱۳۳۵ھ

ایضا
ع - عزیزاں میرزا کے مکتبہ پرورد
مکانے خوش بنا فرمود فی الحال
کیفے نیک خو، دلکش مکانے
بفرایش نمودم فکر تاریخ
نظارا آسمان آمد کہ اسے صدر
کہ آئیں سخن چنان چہ سست
بگو خرد کس پر سے زبان سست

۱۳۳۵ھ

اور مولانا کے اس مکان کی تعمیر کے تین سال بعدی صدر مرحوم کو
مولانا کی بطریقہ مری تاریخ وفات بھی نشان پڑی -

ان کی زوجہ وہیں جنت گورداں
صدر لکھنؤ سے الم سے تاریخ
کہ بھی پنج شنبست بن عزیز

۱۳۳۵ھ

چونکہ میں خود بھی مشاعروں میں کم آتا تھا میں نے حضرت عزیز
کو مشاعرہ چڑھتے شاہیہ پر ایک دو مرتبہ دیکھا ہے - مرزا یگانہ اور مولانا عزیز
کے باہمی تعلقات آخضر دم تک درست نہیں ہوئے - دونوں سببباز
اپنی اپنی جگہ کمال فن اور دیکھ کر دونوں تعجب نہ ہوئے جو اٹھایا تو کیا مثنوی
مولانا عزیز کے اس معررہ والی غزل پر مرزا یگانہ نے مولانا کے خلاف بہت
کچھ لکھا لیکن جہاں تک علم ہے مولانا نے براہ راست کبھی مرزا یگانہ
کے خلاف قلم نہیں اٹھایا - مرزا یگانہ نے صرف ان قوتام اپنی لکھنؤ کے خلاف
علم اجتہاد بلند کر رکھا تھا لیکن ان کا خاص نشانہ مولانا محمد علی عزیز پر
رہے - شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا عزیز مرزا غائب کے
پرستاروں میں سے تھے اور مرزا یگانہ بہت غائب نشین رہے -
مولانا عزیز سے جب بھی حضرت یگانہ کے سلسلے میں کوئی ذکر آیا

آپ بھی ان کے متعلق ایک لفظ بھی ایسا زبان پر نہ لائے جو تہذیب و ادب
کے دائرے سے خارج ہو - ان کی ایک روایتی سکراہٹ اپنے پہلو میں
لاکھوں جواب لکھتی تھی -

اردو شاعری کے دو مدبر اسکول بھی جس کے خاص نمائندے
حضرت امیر گوشتی اور حضرت جگر مراد آبادی تھے - شخصیات کے خلاف
قوت نہیں البتہ لکھنؤی مدبر کے خلاف ضرور تھے جگر مرحوم نے ایک مرتبہ
۱۹۳۰ء میں جب وہ بھوپال ڈاؤس واقع حضرت گچ لکھنؤ میں حضرت رضا
کے یہاں تھے خود بھو سے فرمایا کہ تمہارے کلام کو لکھنؤ کے رنگ نزل سے
کوئی نسبت ہی نہیں - ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ والوں نے مرثیہ کچھ بچے نزل
کو بھی مرثیہ بنا دیا ہے - اس سلسلے میں مولانا محمد علی عزیز کا یہ شعر اور
اسی کیفیت کے دوسرے اشعار عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں -

یہ سننا نا - یہ تاریخی بے اہد یا دیہ تجری
تھیں اسے سوسنے والوں کوں طرح آرام تاتے

جدید نظر یہ ہے کہ قلم کار ہادی شاعری سے زندگی کا روتہ جزیرہ پہلو نمایاں
ہوتا ہے اس کو نشانہ پہلو کا بھی نمائندہ ہوتا چاہئے - اہل لکھنؤ کے کلام
میں پیشہ جزیرہ رنگ پایا جاتا ہے اور کیا حقی کیا عزیز کیا محضر
کیا شام کیا - استاذی مرحوم عشق فزیت رائے نگران سبب بزرگی کے
کلام سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے - اہل لکھنؤ کے کلام میں جزیرہ رنگ
میں قاسم ہے اس مکتبہ پر مکتوب پڑا ہے بی ادب نے اپنے اس
ویباپت میں جو بدیادوں کے وہ پیشہ پرشاد کے مرتبہ حالات و کمالات نظر
کے لئے عالی میں لکھا ہے - تلمیذوں پر اس جزیرہ رنگ کا نفسیہ اثر جواز
پیش کیا ہے - لکھنؤ اسکول کا یہ تکریم کافی اہمیت رکھتا ہے اور آسانی کے
ساتھ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سوز و گداز ہی زندگی کی درجہ بے باقی
جس شاعری میں سوز و گداز کے عناصر جھڑکتے ہوں وہ حقیقی شاعری نہیں
بھی جاسکتی -

مولانا میں مولانا کی غزلیات ہی سے عمارت مستقیم ہوا ہوں - ان کے
یعنی اشعار کو تو میں اور دو شاعری کے سہ سرایہ ناڑ سمجھتا ہوں مثلاً
دوئے وقت بہت ارفی گوے طور کو
اموش اٹکے ہیں ایک سہری لکیر سے

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا جس

بوند ہی نہیں عالم تری آنکھ ادا کی کا

مقلوب و غائب جناب حکیم سید علی حسنی خاں آبدکنہ کی کسی وطن
میں رسالہ مینار نکالتے تھے جس میں ایک حصہ غزلیات کا یہ قابل قوافی
شامل ہوتا تھا اور اس زمانے کے اکثر اساتذہ لکھتے مثلاً مولانا حسنی،
آرژو، انور، بلین، ثروت، حامد، سحر، شفیق، شفیق، عزیز، بکرا، محب،
عشر، نضر، مفتی ذہب رائل، وحدت اور دھرم دھیرہ کے اشعار ہر کانچے
میں یک جادو جھومتے تھے۔ ذیل کے اشعار مولانا عزیز مرحوم کے
ارشاد و گراہی ہیں۔ بوقت طوالت تمام اساتذہ کے قابل اشعار و ج
نہیں لکھتے ہیں۔

جب تک رہی ہیں مجھ کی راتیں زمانے میں
مغنی تھی حق حشر مرے آتشیا نے میں
ہر پیر کے آ رہا ہے زماہ کشاں کشاں
کیا مرکز کی کشش ہے ترے آستانے میں
موجود ہوں کہ دھندل خانہ پہ خوشن رہوں
پہلو سکوں دل کا ہے ان کے ہونے میں
وہ بھی سر جھکائے ہوئے ساتھ ساتھ ہیں
یوں بھی کسی کی لاش اٹھی ہے زمانے میں
لوب شہب فراق کو ایسے میں دیکھ لو
اُم بھی ہوئی ہے زلفِ دلا ویز شائے میں
دل میسر کیا ہے سرتی معنوں عشق ہے
دوسرے یہ ہوسے لگے ہیں فشانے میں
مانا کہ ہے حضور کی چٹکی بھی ہوئی
دل بے خطا ہے، ہوگی خطا اس شانے میں

لیکن میری نگاہ میں ان کی جس قدر عظمت تھی اس میں اس وقت او
بھی اضافہ ہوا جب میں نے ان کے قصائد کا مطالعہ کیا مجھے مولانا کی
شخصیت غزل میں اتنی جاگرت نہیں نظر آئی جتنی محض دلا میں نظر آئی
محض دلا میں ایک بحرِ مکیان کا عالم آہیم تو ج پایا جاتا ہے۔ اس کا
لفظ لغت اپنی جہاد ادب کا ایک بوری نقش نظر آتا ہے۔ پتہ پوچھے تو

مجھے مولانا کے جس بحرِ شری کی اصلی روح ان کے قصائد میں نظر آئی اور
انہیں قصائد کے مطالعہ سے میں نے مولانا عزیز کو بھی اسی سورتہ اختیار
پر قارئین و ممکن پایا جو ڈاکٹر اقبال کے حصے میں آچکا ہے۔ میرا خیال
ہے کہ قصائد و لاکار عزیز غزل کے عزیز سے کہیں زیادہ بلند اور کامیاب
ہے۔ اب کوئی مجھے سے اس بارے میں تصدیق ہو یا نہ ہو یہ اور بات ہے۔
مولانا عزیز کی غزلوں کا بار الا متیازان کا سوز و گداز ہی ہے
سوز و گداز کے بغیر حضرت عزیز کی کوئی غزل نہیں۔ ان تمام باتوں

کا خاتمہ مولانا مرحوم کے کچھ مزید اشعار پر ہونا چاہیئے۔
نزع میں ہلتے ہیں میرے ہوش غور سے
یہ مری آواز ہے یا آپ کی آواز ہے
کہ کچھ برباد دل کو فکر کیا انجسام کی
اب ہیں دے دوئے مٹی ہے ہمارے کام کی
دل جھلا ڈالا ہوا پتی کر نکاو ناز نے
یہ گھنڈ سوزی تو دیکھو برقی ہوں آستانہ کی
شاعری کے بارے میں مولانا کے یہ الفاظ سونے کے حرف ہیں
لیکھنے کے قابل ہیں

ہو گئی یا زنجیر یا ران بے ذوق و شعور
شاعری ہو تھی مراد و منفی الہام کی
پختگی سمجھے ہوئے ہیں جو تناسب کو فقط
چاہئے، اصلاح ان کو اس خیالِ خام کی
ہے یہ نازک فن جو شایان تھی ہمیشہ نہیں
دورِ محسوس میں ہزرت کیا ہے خالی جام کی

شامِ فراق ذکر جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی
اب انتظار کیا ہے تجھے اے جراحِ پیش
پیری بھی انتہا بر جوانی میں کٹ گئی
دل چپ و دلِ زبیب ہے کیا میش بے تبا
دشیا کی عمر ایک کہانی میں کٹ گئی

ہاتھوں کو شغل کر یہ ہمیشہ رہا عزیز
 دریا کی ساری عمر دانی میں کھائی
 یہ ہم سے سرنانے سے وہ بیار کے بٹھے
 صد شکر کہ محمد پر کوئی الزام نہ آیا
 کوئی مریض غم کا دام دالیس نہیں
 اک جاں ہے سورہ بھی کہیں ہے کہیں ہیں
 تاجوں سے مرے دامین رحمت چھرا تو لے
 ان میں جاں نیتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی
 پہلے کچھ قدر نہ کی عشق کے بیساروں کی
 سرتوں بیٹھے ہیں اب صفت میں عزا داروں کی
 بے جز عشق کے آثار پر قدیر نہ شا
 جوش کھاتا ہے ہونو میں دیواروں کی

مشائذ لغویں میں کر آہستہ سنو رتے ولے
 سانس اکڑی ہوئی ہے دیر سے بیماروں کی
 میں تو ہیں کاوشِ فم ہے وہ بری چیز عزیز
 شکلیں دیکھی نہیں جاتیں مرے تم خواہی کی
 مولانا عزیزین جہاں اپنے ہی طرزِ نئی میں تعجب سے بالاتر تھے دل
 انھوں نے اپنی نظموں میں بھی مذہبی رواداری سے کام لیا ہے۔ مثلاً دے
 کے عہوان سے ان کی ایک نظم جنوری ۱۹۲۶ء کے زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ وہ بالکل
 ہندوستانی فضا میں ڈوب کر لکھی ہے۔ عرب اور فارس کے تمدن سے ملکہ
 ہو کر مولانا نے اس نظم میں جہاں نور جہاں اور جہانگیر کا ذکر کیا ہے وہاں
 ہرش چند اور شیخوایاں اور دھرمی۔ سینا اور رام۔ شراوردیاری،
 ستیہ وان اور سادتری، کرشن اور گئی کی میاری بہت کے بھی تعریف
 نہایت پاکیزگی کے ساتھ لکھنے ہیں۔

۱۹۵۹-۶۰ء میں اناج کی فصل خریف و ربیع پر اعزاز

باجل پردیش و مدھیہ پردیش نے ۱۹۵۹-۶۰ء کی بھی اترتیب خریف و ربیع کی اناج کی پیداواری بھوں کے عطیہ
 دراز شاکش، ۱۷۱۷ء حاصل کیا ہے۔ فصل خریف کی پیداواری ہم میں ریاستوں اور مرکزی علاقوں نے حصہ لیا تھا
 جن میں باجل پردیش میں اناج کی پیداواری سب سے زیادہ تھی۔ ۳۰ فی صد اضافہ ہوا جبکہ مدھیہ پردیش میں
 فصل ربیع میں ۵۰ فی صد زیادہ اناج پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ ان دونوں ریاستوں نے ۵۰-۵۰ ہزار روپیہ کی
 ایست کے اجتماعی اخراجات بھی جیتے ہیں۔

اجتماعی اخراجات کی سکیم پیداوار بڑھانے کی غرض سے ۱۹۵۸-۵۹ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے تحت
 خریف و ربیع کی فصلوں میں ۱۵ فی صد اس سے زیادہ اضافہ کرنے والی ریاستیں چاس چاس ہزار روپیہ کا اعزاز
 حاصل کرنے کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ فیصد اضافہ والی ریاست کو پانڈی کی شرفی 'راز شاکش' ملتی
 ہے۔ جن ضلعوں میں پیداواری میں ۱۵ فی صد اس سے زیادہ اضافہ ہوا ان میں سے ہر ایک کو دس ہزار روپیہ دیا
 جاتا ہے اور جن ضلع میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا اُسے 'راج کش' کا اعزاز ملتا ہے۔ ۱۹۵۹-۶۰ء کی فصل خریف
 کے لئے باجل پردیش کے علاوہ بہار، پنجاب، راجستھان، دہلی اور جزائر انڈیاں و گوبار کو بھی چاس چاس
 ہزار روپیہ کے اخراجات ملے۔

ترقیاتی منصوبہ بندی

مرا وطن ہے کہ زندگانی دھنِ بنی ہے سنگھار کر کے

شورِ بیدار ہو گئے ہیں کہ زلفِ مشکیں سنور گئی ہے
چراغِ روشن ہیں علم و فن کے کہ مانگتا دل بھر گئی ہے
ملا ہے مسرت نے رخِ یہ عازہ تو اور رنگت نکھر گئی ہے

حسین ماتھے پہ تاج جیسا حسین جھوم چکا رہا ہے
نقوشِ اجنام کے ہنس رہے ہیں کہ حسنِ فطرت بھلا کر رہا ہے
فضائے کثیر ہے کہ گویا فضا میں آچل لہک رہا ہے

یہ شوحِ چشموں کی جگلا ہٹ کر دیدہ و دلِ نکھر گئے ہیں
عمازلوں کی قطار ہے یا نقوشِ فطرت اُبھر گئے ہیں
یہ چمنیوں کا دھواں کہ جیسے فضا میں آچل بکھر گئے ہیں

یہ جھاکڑا کی شکستہ جوس کہ پائلیں چھین چھینا رہی ہیں
یہ نہرِ چنبل کی گنگا ہٹ کر دیو یاں گیت گا رہی ہیں
یہ کھیتیاں ہلہلا رہی ہیں کہ خشتیں سُکا رہی ہیں

یہ سویا ایکڑ کے سانچے یہ قوی جذبات کی نظیر ہیں
بھلائی کی مسندتِ درخشاں کہ آہنی عزم کی لکیر ہیں
ہزارِ قورخیاں بگم گئیں ہوا یک دھڑکے دل کو جبریں

نئی خشتیں کھنک رہی ہیں جدیدِ سخن گرج رہے ہیں
یہ کشِ رانی کے سیلے کہ دو چرخا بھی سچ رہے ہیں
اناج کی بالیوں کی لے پر فضا میں گھم گئے سچ ہے ہیں

یہ ریل کی پٹریاں کہ جیسے زمیں پر رشتہ کبکشاں ہے
یہ جالِ تہر کوں کہ جن رنگ میں زندگی کا ہورواں ہے
یہ پیار کی سرزمین کہ جس پر شبابِ فردوس کا کھان ہے

یہ صاف شکر ہیں تنگ پٹ یہ نہرِ تالاب پیار پیار ہے
یہ برق سے کاؤ گولِ روشن یہ شہر و قصبہ کے نظارے
یہ قلعے ہیں کہ آسمان اتر پڑے ہیں زمیں پہ تارے

مرا وطن ہے کہ زندگانی دھنِ بنی ہے سنگھار کر کے

بیدر

(دکن کا ایک تاریخی شہر)

بیدر کے تھی آرم (جو سترے واسے) بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ خاص کر بیدر کی آرمی، جسٹی آرم نہایت مشہور ہوتے ہیں۔ گلاب کی طرح خوشبودار اور ہندو سے زیادہ میٹھے ہوتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ سلطنت، ہمیشہ بیدر کے مشہور وزیر خواجہ محمد گاداں نے دھڑان کی کاشت بھی کرائی تھی۔ اہل ہندو کی قدیم کتابوں میں اس سرزمین کو جہاں ملک شرف تھی ہے ہندو رجیت، پوجا پریت کہتے تھے جس کا طول و عرض ۶۰ میل ہے۔ اس مٹی کی حالت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ریت بیدری کے کوہ و باڑا میں بچے چائے، داپی پر آپ کے کپڑے شرف گو دے آؤدہ ہو جاتے ہیں۔ بیدر کے من پچے شرف لچ لوگ کہا کرتے ہیں کہ خاک بیدر یا بخون عاشقانِ گل کردہ اندہ مگر انوس ہے کہ خواجہ محمد گاداں جیسے ذہین و ذہیر کے بے گناہ قتل نے اس کو بخونِ مملوایں گل کردہ اندہ بنا دیا ہے، جس کو تاریخ بھی جھٹلا نہیں سکتی۔

بیدر کے قدیم راجگان راجیشوراج حمارا جہ بگراما جیت دھرم پوجہ شواہ ایران کے آباد و جدا تھے جس نے کیشورج کے ساتھ اپنے سپہ سالار کش رائے کو تیسرے دکن کے بھیجا تھا جس نے مشہور راج کو محفوظ کیا اور راج ہوا۔ اس کی اولاد نے یہاں ڈیڑھ ہزار سال حکومت کی (سیر و مغلکت دکن) فرشتہ کا بیان ہے کہ راج بیدر نامی ایک شخص پانڈوؤں کی اولاد میں تھا جو ملک بیدر میں اس کا بھی حصہ تھا اس نے بیدر کو اپنے نام سے آباد کیا دیر ہندوستان، مگر پانڈو پانچ بھائی تھے اس میں بیدر کسی کا نام نہیں۔ لیکن ہے پانڈوؤں کی اولاد

سرزمین دکن ہندوستان کا قدیم ترین حصہ ہے جو جزائیہ وادوں کے قون کے مطابق دکن میں سرزمینِ بیدری ہے علاقہ تلنگانہ میں تو دلزلہ کے اثرات نمایاں ہیں۔ لیکن لاوا بڑے بڑے پتھروں کی شکل میں ایک پر ایک اس طرح دکھایا ہوا ہے جیسے کسی دیو یا جن، مافوق الفطرت ہستی نے اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ یہ سب آتش فشانی مادہ کا بھروسہ ہے۔

سطح مرتفع دکن جس کا ایک حصہ برادری دارا تسلط ہے، یہاں ایک قدیم سلطنت تھی جس کو 'بیدر بھا' کہتے تھے اس کا پانچواں تخت 'بیدر' موجودہ 'بیدر' تھا۔ سلطنت بیدر بھا موجودہ صوبہ برار سے دکن تر تھی۔ بیدر اپنے دور کے اعتبار سے ایک بلند مقام ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی ایک اہم مقام چکا ہے۔ کیونکہ مغلقت ملکوں کی سرحدیں یہاں طوق تھیں۔ بیدر کے چاروں سمت میں چار مغلقت زبانیاں بیٹھ چکی جاتی ہیں۔ سمتِ شمال (تلنگانہ)، میں تلگو، ملائی و دروازہ بیدر سمتِ مکہ و مغربی عربی سمت میں مراٹھی اور دوس دروازہ موجودہ فتح دروازہ گویا بخوبی سمت میں گھڑی پڑی جاتی ہے۔ موجودہ لسانی صوبہ کی تقسیم کی وجہ سے ضلع بیدر اب مختلف علاقوں میں بٹ گیا۔

بیدر کے مزب ہیں چھ کاس قصبہ خانہ پورنگ اور مزب میں بارہ کاسنگ جس میں قصبہ میں گھڑی (۱۶ میل) رہتا یادا و دار آباد کوہ انتہائی بڑی جہاں اس میں پورم ہے، بیدر سے ۵۰ میل تک شرف شہر زین بیلی ہوئی ہے جو نہایت لریز، ہمارا اور گھول کی پیادہ اور قس کے سواہ جات کے لئے نہایت موزوں ہے۔ خصوصاً

میں کوئی شخص جو۔ قیام سلطنت مہینہ سے قبل بیدار جان خانہ
 ایکٹیزاد زہلی، آئندہ ادریس کی بنیاد میں شامل رہا۔ آخر اندک کا پائے تخت
 یعنی قادیسی میں کھائی تھا جو بیدار سے ساتھ میل کے فاصلہ پر ہے
 دکن کے راجن زمانہ ماہرین علاؤ الدین علی اور سلطان محمد تغلق کے
 باجزار تھے اور بڑے بارو بیدار کا حاکم محمد تغلق کا داماد و مالک تھا
 اس کے بعد بیدار سلطان حسن لکھنوی کے ۱۰۶۵ھ کی سلطنت
 میں شامل رہا اور سلطان احمد شاہ بہمنی (۱۳۹۵ھ) کے ساتھ میں سلطان
 نے بیدار کی خوش گوار آپ دھوا کے قدر نکھار اس کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ ۱۳۹۵ھ
 تک سلاطین مہینہ میں آخری سلطان اکبر شاہ بہمنی تھا، اس کی حکومت تھی۔
 اس کے بعد بریدوں اور سلاطین عادل شاہ کی حکومت میں شامل رہا
 اور بالآخر جیشہ عالمگیر نے ۱۰۶۶ھ میں اس کو فتح کیا اور سب سے
 آخر میں سلاطین صفوی کی حکومت میں شامل تھا۔ اور اب یہ ضلع کچھ
 علاقہ بیورو میں اور کچھ علاقہ گارڈ آف اڈر اسٹیٹ میں شامل ہے۔

آثار قدیمہ

تقلعہ: قلعہ بیدار سلطان احمد شاہ بہمنی (۱۳۹۵ھ) کا بنایا ہوا ہے
 سن تعمیر ۱۳۹۵ھ۔ قلعہ کا دورہ ہم ہزار گز اور دیواروں کی بلندی
 ۵۴ فٹ۔ اطراف پہ در پہ تین خندقیں چوکان ہیں کھدی ہوئی ہیں
 اور قلعہ کے دیواروں سے چابی ہیں۔

قلعہ کے دیوار سے: قلعہ میں داخل ہوتے وقت پہ در پہ تین دروازے
 ہیں جس میں سب سے پہلا شہزادہ دروازہ (باب الداخل) ہے۔ اس
 دیوار سے ملک پہنچنے کے لئے، رہبان میں خندق داغ ہے جس پر ایک
 منیوہل بنایا ہے۔ اس کی درختیں یہ ہے کہ اس میں ایک گڑی کا
 شہزادہ ہے جس کی سواری ہو سکے ساتھ عشرہ حرم میں نکلتے ہے۔ یہ
 دروازہ میں دونوں جانب شان دار کمرے ہیں ہونے ہیں قلعہ کے محافظ
 نگاروں کے لئے بنائے گئے تھے۔ اب اس میں جو تان قلعہ احشام رہتے
 ہیں اس میں بعض سلاطین مہینہ کی تصاویر دیواروں میں اس دروازہ
 میں گزرنے کے بعد دسرا کھنڈ نادریوارہ ہے جس کی فصیل پر دو شیر
 چتر کے ہیں، یہ ہیں اور دیوار میں نقش در رنگیں ہیں اور خط لفظی
 ہیں ایک کتبہ بہت بلندی پر کتبہ ہے جس کا پڑھنا دشوار ہے۔ تیسرا

دیوارہ گنبد دروازہ، کہلاتا ہے جو بہت بڑا ہے جس کا گنبد سادہ
 ہے۔ اس کے تحت قلعہ کے خاص شای محلات شروع ہو جاتے ہیں۔
 شہزادہ رگین محل دیر۔ شہزادہ دروازہ پر عالمگیر کے زمانہ کا ایک گنبد
 ہے جس کی عبارت یہ ہے:-

”سنتہوں شہزادہ رجب پھار شہزادہ خٹا رغان ایسی ہزاروں“
 تخت محل: سب سے پہلی اور قدیم عالی شان عمارت مسند کردہ
 سلطان احمد شاہ بہمنی ہے۔ بڑے بڑے دالان اور کتبوں کا مجموعہ
 سیاہ پتھر کے تھے۔ دیواروں پر عربی کلام تھا۔ چیت میں اسکی
 درجے کے طاق نقش و نگار تھے۔ مرہٹوں نے جب بیدار کو تاراج کیا
 تو پڑی بڑی شہریتیں مرہٹوں نے تخت سترتا اور پانچ کے محلات
 میں کام آئیں۔ اس محل کا عایشان دروازہ اب بھی موجود ہے۔
 اس کے متصل بعض برج اور بھرو کے ایسے ہیں جن کے متصل ایک تالار
 تھا جس کا منظر بہت جلاظوم ہوتا ہے۔

تیرکشی محل: ہاویں شاہ بہمنی کا بنایا ہوا ہے اس کے بھرو کہ ہیں
 مذکورہ دیرہ کے گھوڑے آدینا کے چماتے تھے۔ خوشبو بھگت ہستی تھی
 اوپر کا حصہ خراب دستہ عمارت میں ہے۔ دوسرے ایک بڑی مٹی
 کمان نظر آتی ہے۔ اس وقت اس میں کلکڑی کا دیوار ڈھونڈ ہے۔
 گل محل: بانی خواجہ محمود گادان وزیر اعظم مہینہ زمانہ پرچ خانی کا
 پردیس ہزاروں خاں) اس میں سلاطین مہینہ کا دیوان خاص تھا۔

محل سلطان محمد شاہ الشہزادہ رشکری (۱۶۱۵ھ) عالی شان
 عمارت تھی جس میں پانی کی نہریں آبشار، فوارے موجود تھے۔
 رنگین محل: تعمیر کردہ سلطان علی برید اقل (۱۶۱۵ھ) اس میں
 سیپی کی منبت کاری ہے اور خاص قابل دید چیز علی برید شاہ کا
 شہنشی ہے۔ ناؤں پر طاقی کا کام ہے۔ خوش نما کتبے سیپی کے
 چمک دار حروف میں خوبصورت تخیلی بنائے دل کش ہیں۔ ہلکے گلابی
 اور اودے بھوڑوں نے طاقی کام میں دوسرے رنگوں کو مانکر دیا
 ہے۔ رشتہ نشین کے قریب ایک سنگ مرمر کی کتبہ ہے جس میں موم گویا
 میں گلاب کے پھول برسے رہتے تھے۔ گھڑکیوں اور کافوں پر سیاہ
 سنگ موٹی کا تھی ہے اور اس کی زمین پر فارسی اشعار سیپی کے

حرف میں کندہ ہیں۔

شاہ نشین چشم تن کی گرشت کے

جلد و ماست شاہ من ہے تو باد جائے تو

باب الادخلہ رکھا ہے 'یا مفتح الاولیاء' اور اس کے دائیں دایئیں جانب

یہ اشعار کندہ ہیں۔

دایئیں جانب :- عاشق شود نکس کو در آید ز رشت

گویا ز دور و نام تو ہی بار و عشق

بایئیں جانب :- ہر دو نہیں کو مصدق دادہ عشق

از ہر سز شاہ در گہست آرد عشق

اور عربی خط میں نیچے لکھا ہے :-

"المستقر انشد الملک الملک الحسن المکرّم والحاصل اکرم مرید علی"

مسیح سوسلھا کھمبا : ازردن تعلیمید، عاشق زاد کے کا مادی مزب

جانب واقع ہے جو غور محبت اور حسن ہے۔ یہ مسلمانوں کا خانہ شاهی

کی نماز کے لئے تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے اندر دو بیرون دالان سولہ

قیم گول ستون پر قائم ہیں۔ مسجد کا طول و عرض ۲۹۵ء فٹ ہے

جو مربع حلقوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک مربع حصہ پر ایک گنبد بنایا گیا ہے

جو گولہ خربق کی شکل مسجد کی طرح جو مسجد قرطیبہ کا نمونہ ہے بنائی گئی ہے۔

بعض درمیان کی گنبد منہدم ہو گئے ہیں۔ اس مسجد میں ایک کتبہ بھی نصب

ہے جو دراصل ایک سائبان سے متعلق ہے جس کو مسجد کے ایک عامل

سکندر خان نے بنوایا تھا :- مسجد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مسجد کی

چھت کے اوپر ایک حوض ہے اور اس کے عقب میں ایک باڑی ہے جس

پانی حوض میں بھرا جاتا ہے اور پھر وہاں سے نیچے مسجد کے حوض میں

آتا ہے۔

در رسمہ مسجد کوگا وال :- یہ بڑی شان دار تین منزلہ عمارت ہے۔

اس کا پانی سلطنت ہمشلیہ کا مشہور وزیر خواجہ محمود گاواں تھا۔ ترکی

عرب اداریہ طرز تعمیر ہے۔ یہ مدرسہ ایک مربع تین منزلہ عمارت

ہے جس کا ربعی عرض و طول ۲۰' ۸" بلندی ۵۸ فٹ ہے۔ شاهی

حصہ میں مسجد ہے۔ جنوبی حصہ کتب خانہ کے لئے مخصوص تھا۔ بیرون

حصہ کی دیواروں اور مئادیں پر زمینیں مینی کا کام تھا اور قرآنی آیتیں

کندہ تھیں، جس کا کچھ نمونہ اب بھی مینار اور مسجد پر موجود ہے۔ اندر کی

حصہ میں کافی بڑے اور چوڑے کمران، عمارت کے کونوں پر پشت پسند

اساتذہ کے چیمبر، لکھاؤ کے راقش کمرے مرکب دال ہیں اور درمیان

میں وسیع صحن موجود ہے۔ کچھ کمروں کی دشت قطع ہے

کو ہر ایک کمرہ میں ایک تنہی قہری چھوڑا ہے جس کے تین طرف اونچی

دیواریں ادا اور چمکند بنا ہوئے۔ ان کمروں میں ہوا اور روشنی کا متحمل

انتظام تھا جس میں موجودہ عمارتوں کی طرح دال میں بجلی کی دستشویی

ضرورت ہی نہ تھی۔

عمارت کے سامنے کے حصہ میں صددروازہ کے وسط میں سیاحی

جانب مسجد اور دوسری جانب بائیں طرف کتب خانہ تھا۔ میناؤں

کی بلندی سو فٹ تھی۔ اب ایک سامنے کا مینار اور شاهی حصہ کا

مینار باقی ہے۔ اس کے کتب خانہ میں تین ہزار عربی فارسی کلمی

نمایاں کتابیں موجود تھیں۔ سلاطین ہمنیہ کے کتب خانہ سے متعلق

تغییر کثافت کا ایک تنہی نسخہ میری نظر سے گزرا تھا جو بروی تیار ہو کر

کے کتب خانہ میں تھا۔ جہاں ایران، ایران و ہندوستان کے مشہور

علاؤ ماحول تھے۔

تخلیہ تاریخ تعمیر مدرسہ محمود گاواں :-

اس مدرسہ تاریخ محمود مینا تعمیر شدہ است قبلہ اہل معص

آٹا و قبول میں کہ تادمیشن اذ آیت "لن یثقل قلبہ حینا"

۸۴۶ھ

گویا یہ عمارت ۱۱۴۶ھ میں آج سے چار سو نو سال قبل تکمیل کو

پہنچی تھی۔

حصہ اولہ اور حصہ ہشتم بہت سے برج ہیں جن میں بعض

بڑے شان دار ہیں۔ ان پر پانچ تا سات گزری تو ہیں دیکھی ہوئی ہیں۔ مگر

یہ سب تو ہیں سلاطین مریدیہ کے زمانہ کی ہیں۔ شان ہمنیہ کی کوئی

توپ موجود نہیں۔

درہنچا کے مندر کے عقب میں ایک نو گزی توپ ہے جس کا

قہری ڈیڑھ گز کا ہے۔ توپ تاسم مریدیہ (وفات ۹۱۰ھ) یہ

حصہ ہشتم کے توڑ توڑ برج یا رخ برج پر دیکھی ہوئی ہے۔ عوام اب اس کو

مذہبوں درودہن اذہ پئے جنگ بود اذہاے کہ سرخم فرو بردگیں
حسب ذیل حروف مقطعات قرآن نغش ہے :-

منٹے برج کہتے ہیں۔ یہ وہ برج ہے جہاں شہنشاہ عالمگیر نے گولہ اندازی کی تھی۔ ملک مرزا نائب سلطان ابراہیم عادل شاہ بیجا پور نے اس میں

مردہ ہیں سوچوں اور متعین کے بڑی شان و شوکت سے واپس شاہی
ہامی مراتب - جنڈوں اور باجوں کے ساتھ آتا اور پھل پڑھاتا ہے۔
یہ قدیم رسم ہے۔ تاریخ سے اس کی اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ سلسلہ
کی ایک عام رودادی جو اپنی رعایا کے ساتھ جتنی اذیتا تازہ ہو جاتی
ہے۔ یعنی کچھ کھڑی زبان میں اسی کے قرب و جوار کی بادیوں میں
پائے جاتے ہیں۔

گنبد سلطان علی برید: ۹۴۹ھ میں عالی شان اور قابل دید ہے تاریخ
۹۸۹ھ ہے۔ ایک بہت بڑے اور بچے چوتھے پروانچ ہے۔ خصوصیت
یہ ہے کہ یہ گنبد برضات قدیم گنبدوں کے چاروں طرف سے کھلا ہوا
ہے۔ چاروں طرف سے ہمسایہ سبب کسی وفا شک کو اڑالے جاتی ہے۔
تقریباً کوئی بیسگ سوئی (سنگ گنیز) کا بنا ہوا ہے اور کھلم کھلم
کھڑی منقوش ہے۔ اس کے باہر چوتھے پر مغربی جانب ۵۰ ذاتی
گہری عمالت کی ہیں۔ مقبرے کی اندر طرف دیواروں پر مثلگوں زمین پر
سفید حروف میں سات فارسی روایات جرت انجیر کندہ ہیں۔

گنبد کے پائین میں ایک عالی شان عمارت ہے جو کتب خانہ
کے نام سے مشہور ہے اور اس کے متصل ایک مسجد اور مسافر خانہ بھی ہے۔
مکس ہے کہ یہ سلاطین برید پر کا کتب خانہ ہو۔ اور اس کے قریب جو
میں دوسرے سلاطین برید پر کا گنبد ہیں جو ایسے شاندار نہیں۔
یہ مقام کو گروہی کہلاتا ہے جو کہا جاتا ہے کہ الفاظ "جونی گروہی"
کی خرابی ہے۔

مشہور اولیا و اللہ کے مقبرے :- اندرون آبادی کا خانقاہ صوفیہ
حضرت چمن شاہ صاحب رح کے متصل، حضرت شیخ المشائخ شیخ محمد ثانی
بیدی کا مقبرہ ہے۔ اسی کے متصل آپ کے والدہ شیخ ابراہیم ثانی
کا مقبرہ بھی ہے جن کا سلسلہ طریقت کا فیض علما و عرفی علی تک پہنچا
ہے۔ بڑا عام نازل خانہ تھا۔ شیخ ابراہیم ثانی سے بڑا مزار سلطان
علاء الدین ثانی پہنچتے تشریف لائے تھے اور کاغذی اعتماد کے جڑ
پر موزوں ہے۔ سلاطین قنبر شاہیہ ابراہیم طریقت و محمدی قلب
کو بھی آپ سے اور آپ کی اولاد سے عقیدت تھی۔ آپ کی اولاد کے
مقبروں میں شیخ ابراہیم محذوم جی کاؤی کا عالی شان مقبرہ اور شیخ

بدالدین ثانی کا عمومی حصہ جو کندہ ہے۔ شہر کے باہر حضرت خواجہ الفیض
قدس سرہ اور آپ کی اولاد داغہ دے عالی شان مقبرے ہیں جن میں
حضرت قلب علی ثانی نیزہ اول الفیض کا مقبرہ مشہور ہے۔

حماد شہر کے جنوب مشرقی جانب حضرت شیخ نورستانی اور ان کے
سجادگان کے مزارات ہیں۔ کوئی گنبد نہیں ہے۔ فتنہ مغنی کنڈاج
داغہ اور شہر کے سمت باہر تھے۔ ان کا سلسلہ طریقت حضرت
میراثوت جہانگیرستانی قدس سرہ کچھ شریف تک پہنچا ہے۔ بنڈان
میں ایک بہت بڑا قبر جو موجود ہے۔ اسی خانان کے دوسرے بڑے
شیخ عبدالملک علوی تھے جن کا مزار شہر سے باہر صحت کوٹ میں واقع ہے
مغربی جانب بیلہ سادات سیدہ صغیرہ قدس سرہ کا عالی شان مقبرہ
ہے جو بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ مسعود کچھ شیخ بددا سلسلہ حضرت نظام الدین
حبوب الحق کے خلیفہ تھے اور اس کے متصل آپ کے صاحبزادہ کا مقبرہ ہے
ایک گرم باغی کا چشمہ بہاں شہور ہے جو چشمہ سادات کہلاتا ہے۔ اس کے
علاوہ اور بھی چشمے قلعہ شہور میں مثلاً پانیاس، زہبا سلسلہ کا چشمہ
قرع باغ۔

مشہور مقبرہ :- سید شاہ زین الدین کنڈیش جندی البنادی کا عالی شان
مقبرہ ہے جو سلطان علاء الدین ثانی کے زمانہ میں آئے تھے۔

شہر کے مغرب مشرق میں مقام شربت تالاب شہر کے مہاراجہ
سلطنت بہمنیہ خواجہ محمود گواں ماحر مولانا جی رح اور فیض علما بہمنیہ
کے مزارات ہیں جو اس وقت ایک چوکندہ میں واقع ہیں۔ گنبد
نیست و نابود ہو گیا۔ ہمارا جو مرکز پر شہر کے ایک نقشبندیہ کتبہ اس کے مزار
پر نصب کیا گیا تھا جس پر یہ شریک ہے :-

سالی نقش گر کے پرسد گو

۸۸۸ھ

دیا فی الانشاء اس کی شہادت کتبیت ہے جو شان ہو چکی ہے یہ کسی
انشاء پروازی کا ہی نمونہ ہے۔

بیدی کی خاص صفت طوط بیدی ہیں جن کی مالک مالک غریب
اثر کے وقیرہ میں بھی ہے۔ بیدی تھے پانڈان، ڈبیان، اگلارن
وقیرہ بڑے جو بصورت ہوتے ہیں۔

بالائی قلاؤں میں انسان کا سفر

۲۔ اٹلیا اور سلسلہ غلامی میں یہ چاند کی طرف حرکت کرتا رہا۔ اس کی رفتار ایک سینکڑی میل اور ایک گھنٹے میں ۲۵ ہزار میل تھی۔ اس رفتار سے اٹلے کے بعد یہ راکٹ ۴ ستمبر ۱۹۵۹ء کو رات کے بارہ بجے چاند پر پہنچ گیا۔ یہ راکٹ نہ صرف کامیاب ثابت ہوا بلکہ اپنے نشیمن راستے سے بے صرفت دو سینکڑا دھڑا دھڑا در سیدھا بارہ انچ کا تار اور چاند پر پہنچ کر ٹھیک اس جگہ اترا جہاں روس کے سائنس دان اسے اتارنا چاہتے تھے۔

اس راکٹ نے ثابت کر دیا کہ چاند تک سفر کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ قریب قریب اب یقینی ہے۔

۳۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو پہلے اسٹینک کی سال گرہ کے دن روس نے تیسرا راکٹ چھوڑ کر دنیا کو اور بھی حیرت زدہ کر دیا۔ یہ راکٹ چاند کے ارد گرد گردش کر کے نئے اڑا لیا گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق یہ راکٹ چاند کے پاروں طرف گھومتے لگا اور اس کی کامیابی کی سبب بڑی دلیل یہ ہے کہ اس راکٹ نے چاند کے اُس حصے کا ڈوڑا مار لیا جو زمین سے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ڈوڑی زمین سے زمین تک اُگیا اور روس نے اسے چھاپ کر ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا۔ اس طرح چاند کی ام فی صدی تصویر جو ہم بھی نہیں دیکھتے روسی سائنس دانوں نے ہم کو دکھا دی۔

۱۵۔ مئی ۱۹۶۰ء کو روس نے اپنا ایک بہت ہی ذہنی راکٹ اٹلیا۔ اس میں کئی کتے تھے۔ اس جہاز کو ۲۰ میل کی بلندی تک بٹانے کے بعد کامیابی سے نیچے اتار لیا گیا۔ کتے زندہ تھے اور بالکل صحت مند

۴۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو یہ خبر پڑھ کر تمام دنیا حیران رہ گئی کہ روسی نے اپنا پہلا مصنوعی چاند فضا میں اڑا دیا ہے۔ جب اس کے سنگین کی پیپ پیپ کی آواز آئی تو لوگ حیران ہو کر پکار اُٹھے کہ میرے سانس کی کمانی تو بچی ہو گئی۔“

ابھی دنیا کے سائنس دان اور عوام پہلے اسٹینک کے متعلق غور ہی کر رہے تھے کہ ۳۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کو روس نے اسٹینک نمبر ۲ اڑا دیا۔ یہ خبر اور بھی حیران کن تھی اس لیے کہ اسٹینک پہلے اسٹینک سے بہت مختلف تھا۔ اس میں ایک چھوٹی، سو فنی سی لیکن مضبوط گھنٹیا لٹا تھی۔ یہ گھنٹیا اسٹینک نمبر ۲ کے پورے ۵۰ چکر دیں کے بعد بھی زندہ رہی۔ اڑان کے ۱۰۰ گھنٹے بعد بیڑیاں ختم ہو جانے پر وہ کسی تکلیف کی وجہ سے مر گئی۔

۲۔ جنوری ۱۹۵۸ء کو روس نے ایک نیا راکٹ فضا میں اڑایا۔ اس کے اندر جو مصنوعی چاند رکھا تھا وہ انچ گول میں بہت اور پہنچ گیا اور پھر وہ نظام مٹی کا مصنوعی تیار ہو جانے پر سورج کے ارد گرد چکر لگاتے لگے۔

۳۔ جنوری ۱۹۵۸ء کو امریکہ نے اپنا پہلا مصنوعی چاند فضا میں اڑایا۔ اس کا نام اکپلورر تھا لیکن یہ روس کے مصنوعی چاند کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور معمولی حیثیت کا تھا۔

۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء کو روس نے اپنا دوسرا راکٹ اڑایا۔ اب کی بار منڈلی مقصود چاند تھی۔ یہ راکٹ دن کے ۱۲ بجے روس نے اپنی سرزمین

۱۹- اگست ۱۹۹۱ء کو روس نے دوسرا ذہنی جہاز فضا میں اڑایا۔ اس میں اسٹریل کا دریل کا نام کے دو کتے، دو کالے بچے، بہت سے سینپر بچے، کچیاں، بوندے، سپر جینز، لکھی ہوئی نقیصے، اس جہاز نے زمین کے ۱۸ جگہ گھٹے اور پھر اسے پیچے اتار لیا گیا۔ اس میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔

امریکے نے پہلا اسپیلور اڑانے کے بعد کئی اور اسپیلور اڑائے ہیں۔ اسے بھی اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

۱۹۹۱ء کے شروع میں روس نے پہلا ایک راکٹ اڑایا۔ اس کا نام ویشن راکٹ (نہرو سیاہ) کے نام پر تھا۔

راکٹ کے ذیلیہ خالی جہازوں میں روس مسلسل کامیابی حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اس کامیابی کے پیش نظر ستمبر ۱۹۹۱ء میں بزرگرم ہوئی تھی کہ راکٹ میں دو آدمیوں کو بٹھا کر روس نے خلا میں اڑا دیا ہے لیکن یہ خبریں صحیح تھیں۔

مارچ ۱۹۹۱ء میں روس نے دو بالٹک ترقی قسم کی اڑان کی مشق کی۔ ان پر داؤد کے دوران میں بالٹک کی سیٹ پر ایک بپتا اور اس کے مسئلہ وہ کیس میں دو آزمائشی جانور چوشکا اور دیز دچکا تھے۔ تیسرے بالٹک کامیاب ثابت ہوا۔ اس بات کی اب تقریباً مکمل تیار ہو چکا تھی کہ انسان پہلی بار خلا میں جائے والا ہے۔

۱۲- اپریل ۱۹۹۱ء کو روس نے انسان کو خلا میں بھیج دیا۔ بزرگرم ایک نام کی محبت رکھتی تھی اور بہت سی جہازوں تھی۔ دنیا کے بہت سے سائنس دانوں اور تجزیوں نے روس کی کامیابی کو سراہا اور اس کے کارناموں پر بے ماریک یاد کی۔

خلا پر داؤد انکم پر دو کامیاب گاہکین چلے گئے۔ ۱۰۸ منٹ میں زمین کے چاروں طرف واسٹوک نام کے راکٹ میں بیٹھ کر پورا ایک جگہ لگا یا۔ اس راکٹ کی زیادہ سے زیادہ اونچائی ۳۰۳ کلومیٹر اور کم سے کم ۱۸۱ کلومیٹر تھی۔ گاہکین اس کے وقت کے مطابق ٹھیک و جگہ منٹ پر اسے اور ایک دم سے جگہ ۵ منٹ پر ایک مینٹ پر روس کی مریضیں ہیں بالکل محفوظ اتر آئے۔

بحیرہ یوری گگن کا نام کا جہاز اڈا کر جیسے ہی اپنے علاقہ پر گزرتا

کرے لگا اٹھوں نے بے وزنی کی حالت میں کی۔ شروع میں حالات غیر معمولی تھے لیکن جلد ہی وہ اسے مانوس ہو گئے۔ بے وزنی کی حالت میں بھی گگن یوری بالکل ٹھیک رہے اور ان کے ہوش و حواس قابل ہیں رہے۔ ان کے سپرد جو کام کیا گیا تھا اور پرواز کا جو پروگرام تھا اس کے مطابق، انھوں نے خلا جہاز کے آلات کی کارکردگی پر نظر رکھی۔ انھوں نے دو سو دن میں سے مشاہدے کے ۳۰۰ کلومیٹر کی بلندی سے ان کے زمین صاف دکھائی دیتی تھی۔ سمندر کے ساحل، بڑے دریا، اونچے نیچے جنگل، پادلی اور ان کے سامنے اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان بالکل سیاہ تھا اور اس کے پس منظر میں ستارے اس سے زیادہ نمایاں اور روشن نظر آتے تھے جتنے کہ زمین سے نظر آتے ہیں۔ زمین کے گرد آسمانی رنگ کا بہت ہی خوب صورت ڈبہ ہے۔ آبی پرنسنگ دیتے ہیں، لطیف پگھلے نیلے سے گہرے آسمانی پھر گہرے نیلے، مبنشی اور پھر سیاہ آسمان۔ سامنے ہیں سے نکلتی ہوئی ایک روشن تاریکی دکھائی دیتی ہے جو کہ تمام فزق کے تمام دھولے سے گزرتی ہے زمین کے اُترتی ہوئی جاسکتی ہے۔

دنیا کے عوام بحیرہ یوری گگن کی کامیابی اور ان کے کارناموں پر خوشیاں منا رہے تھے اور روسی سائنس دان اس پر نڈان تھے کہ وہ اسپتک کی طرح انسان کو بھی خلا میں بھیجے ہیں کامیاب ہو گئے۔

امریکی بھی خلا کی اڑان کے مسلسل تجربے کر رہا تھا۔ چھوٹے بڑے جہاز سے زیادہ وحتوی یا نڈ اور راکٹ اور اڑا چکا تھا اور ان میں بھی تجربی بہت کامیابی ہوئی تھی۔ آخر کار ۵ ستمبر ۱۹۹۱ء کو امریکی سائنس دان نے بھی ایک آدمی کو راکٹ نام کے راکٹ میں بٹھا کر خلا میں بھیج دیا۔

یہ پہلا شپروڈ کے سر تھا۔ شپروڈ نے ۱۵۔ منٹ میں ۱۱۵ میل کی اونچائی تک پرواز کی وہ خلیج کنزاورل سے اڑا گئے تھے اور وہاں سے ۳۰ میل کی دوری پر بحر اطلانتک میں آئے۔ اپنے مرضی کی کیسوں کے گر پڑے تھے۔ چند منٹ میں ایک پہلی کو پڑنے شپروڈ کو پانی سے اٹھا کر ایک برس سے جہاز میں بٹھا دیا جو پہلی ہی سے ان کا منتظر تھا۔ اس طرح گگن یوری کی طرح شپروڈ بھی اپنی خلائی پرواز میں کامیاب رہے۔ امریکی سائنس دان خوش تھے کہ دوسرا انسان خلا میں بھیج کر انھوں

بھی زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ دنیا نے ان کی کوششوں کو سراہا اور
 محاذِ افریقہ شیرینیِ قرب کی۔ یقیناً وہ دوسرے انسان تھے جنہوں نے
 خستہ کام سفر کیا اور محاذِ افریقہ کی طرف امن لے بھی اور پرے زمین کا شاہد
 کیا۔ سمند دیکھا، جزیرے دیکھے اور انھوں نے بادل اور اپنے ملک کا ساحل
 بھی دیکھا لیکن چونکہ وہ صحیح جگہ کے بجائے ۹ بجے ۳۰ منٹ پر اڑے تھے
 اس لئے وہ آسان کام شاہد نہ کر سکے۔ تاہم سٹیوارے اور چاندان میں سے
 کسی کو بھی وہ نہ دیکھ سکے اور ان کا سفر بھی محاذِ افریقہ کے مقابلے میں مختصر تھا
 مگر سٹیوارے کی قحی اور ایک جگہ سے اڑ کر صرف ۱۱ میل وہ اڑے گئے اور
 ایک دائرہ بنائے ہوئے ۲۰ میل کے فاصلہ پر وہ سمند میں گر گئے۔
 بہر حال روس اور امریکا کی کوششوں سے خلائی سفر کا آفساز
 ہو گیا۔ پہلے یوگیا کر کے وہ فی کیفیت انسان برداشت کر لیتا ہے۔
 یہی پہلے جگہ اس حالت میں وہ رقیق، نیم رقیق اور طحس غذا کھاتا
 ہے۔ ساقی سے ساتھ اپنے پوش خراس ٹھکانے رکھ کر کھ پڑھ بھی
 سکتا ہے اور ریڈیو اور رسد رسائی کا سہل سہجی قائم رکھ سکتا ہے۔
 سوچا سمجھا کر اپنی آواز کو نشر بھی کر سکتا ہے اور خلائی جہاز
 کو بدستور چاہے گھا پھر اسکتا ہے۔ اب یہ توقع سے مستقبل
 قریب ہی میں بہت سے عملی مسائل کو حل کرنے کے لئے خلائی جہازوں
 کو استعمال کیا جائے گا۔

جمہوری طور سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روس اور امریکہ نے بیرونی فضا
 اور خلائی ملاء میں سفر کرنے کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ آخر وہ کون سا
 اصول ہے جس کی بنیاد پر امریکہ یا روس مسلسل کامیاب ہوتا جا رہا ہے؟
 اے۔ اے۔ جے۔ ۱۹۵۱ء کو روس نے دوسرا انسان بدستور جہاز خلا میں بھیجا
 جس کا وزن ۲۰ منٹ تھا۔ اس خلائی جہاز کا نام دوستو کا تھا اور یہ صرف
 اس میں سوار تھا۔ وہ ۲۵ گھنٹہ ۱۸ منٹ تک خلا میں رہے اور انھوں نے
 زمین کے گرد ۵ ایکر لگائے۔ وہ اپنے جہاز کو مدھماکے جتے گھا پھر سکتے۔
 تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ زمین سے ان کا رابطہ قائم رہا اور وہ
 براہِ پیغام بھیجے رہے۔ انھوں نے کھانا کھایا اور سونے بھی۔ پیراز کے
 دوران میں بڑی دیر تک ان پر پہلے وہ فی کیفیت ہی نہیں اس سے آگے
 کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ (ادارہ)

روس نے اپنا ایک راکٹ چاند پر بھیجا۔ تاہم راکٹ ہوا
 سے پہلے اس کے سامنے اداں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ زمین کی قوت کشش
 سے آنا نہ ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ راکٹ کو ۵۰۰۰ فٹ فی سیکنڈ
 کی رفتار سے اڑایا جائے۔ اگر اسے یوں میں ظاہر کیا جائے تو یہ قدرتی عمل
 فی سیکنڈ سے ڈرا ہی کم ہوگا۔

اس طرح جب دوسرا راکٹ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء کو کوہ ہوائی
 سے اوپر ۲۵ میل کی بلندی پر پہنچ گیا تو یہ چاند تک جانے کے لئے
 ۵۰۰۰ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار کی ضرورت تھی لیکن ۲۰ میل کی بلندی پر بھی
 زمین کی کششِ خاص قوی تھی۔ وہ راکٹ کو ۲۰ فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے
 نیچے کی طرف کھینچتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راکٹ کا ایندھن ختم ہونے
 کے ایک سیکنڈ بعد راکٹ ۴۱ ۳۴ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر چڑھا
 تھا۔ اس کے بعد دوسرے سیکنڈ میں اس کی رفتار ۲۴ ۳۴ فٹ ہو گئی
 تھی اور تیسرے سیکنڈ میں وہ ۱۳ ۳۴ فٹ رہ گئی تھی۔ مختصر یہ کہ راکٹ کی
 رفتار گھٹتی جاتی تھی اور وہ سیکنڈ بھی گھٹتا نہیں رہتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راکٹ اور زمین کے درمیان فاصلہ
 گھٹتا گیا اور زمین کی قوت کشش بھی کم ہوتی گئی۔ ۳۰۰۰۰ سیکنڈ تک
 یہی تقریباً ۳۰ گھنٹے کے بعد راکٹ کی رفتار رست ہو کر صرف ۱۲ فٹ
 فی سیکنڈ اس کے کچھ زیادہ رہ گئی تھی مگر اس وقت راکٹ چاند کی سطح سے
 ۲۳۰۰۰ میل کی دوری پر تھا۔ یہ فاصلہ زمین اور چاند کے درمیان کے
 فاصلے کا قریب قریب ۱/۱۰ حصہ ہے۔ یہ بہت کم ہے لیکن اس کی اہمیت بھی
 کچھ کم نہیں۔ اس میں زمین اور چاند کی کشش کا دورِ برابر برابر ہے۔ دوسرے
 الفاظ میں یوں سمجھو کہ زمین اور چاند کی قوت کشش فردوسی کی وجہ سے
 یکساں ہے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے اثر کو مٹا دیتی ہیں۔
 راکٹ اس حد پر پہنچ کر صرف چاند کو چلا اور کھوئی کھینچ جاتا ہے۔ اس
 یہ نتیجہ نکلا کہ اگر راکٹ میں اتنی رفتار باقی رہ گئی ہوگی کہ وہ زمین تک پہنچا
 بھی نہ سکے۔ چاند کو جو کر لیا ہوگا تو وہ چاند کی قوت کشش کی گرفت میں آگیا
 ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے قاطع چاند کی قوت کشش بہت کم نہ ہو
 ہے بھی ایسا ہی لیکن بہر حال کشش کو قائم نہ ہوتی ہے۔ پس راکٹ چاند کی طرف
 بڑھ گیا ہوگا اور مذکورہ حد کو پار کرنے کے ۵۰۰۰ سیکنڈ کے بعد چاند

اتر نے کا مسئلہ بالکل حل کر لیا ہے۔

اس قرعے نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم چاند پر یقیناً پہنچ سکے ہیں اور لاکٹ میں میچ کر سڑ کر نا مٹس ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ چاند پر جانے کے بعد اگر وہاں سے تین لاکھ ڈالیں آنا چاہی تو آسکیں گے یا نہیں ؟ اس مسئلہ میں روس اور امریکہ کے سائنس دان براہمقصد اور تجربہ کر رہے ہیں۔

۱۲۔ اپریل ۱۹۷۱ء سے پہلے ہی سچا جاتا تھا کہ پرواز کے دوران میں طویل بے وزنی کے اثر سے عضلاتی عمل کی اعصابی تنظیم میں خصوصاً دوران خون اور سہانی حرکت میں سخت خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن یورپی مگکارتین اور ’نیشنل سٹیپرڈ‘ نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے اعصاب کاغص بندی پر برقراما اور ان میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ سٹیپرڈ فٹ پانچ منٹ شبہ وزنی کی حالت میں رہے لیکن مگکارتین نے ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت بے وزنی کی حالت میں گزارا اور ان کے دوران خون کے نقلی نظام یا تنفس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ شروع میں خون کی گردش تیز ہوئی تھی، اس کا سبب وہی جڑا تھا اور میں بہت تیز چلنے لگی تھی۔ لیکن جی لینا بڑا تھا۔ خلیا میں سفر کرنے کی وجہ سے، ایسا ہونا قدرتی بات ہے لیکن بے وزنی کی حالت میں کئی کی مرٹھ کی پرواز کے بعد یہ افحال معمول پڑا کرتے تھے۔ پرواز کے بعد گلائین کاغصی معائنہ کیا گیا اور کئی دن تک ان کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر کے بے وزنی میں کیا گیا کہ وہ بالکل معمول کی حالت میں ہیں۔

پہلے اڑان کے دوران میں زمین کی طرف داپس آئے فالے راکٹ اور اس میں بیٹھے مسکون کو بچانا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ یہ مسئلہ دو طریقوں سے حل کیا گیا۔ ایک طریقہ یہ کہ خاص پیرا پشوت کی مدد سے کیپسول یا کیبن کے ساتھ چار فوجی زمین پر اتر آئے۔ دوسرا طریقہ یہ آزمایا گیا کہ پرواز کی مختلف بلندی پر چرب راکٹ زمین کی طرف داپس آ رہا تھا چار ذروں کو راکٹ سے نکل کر باہر پھینک دیا گیا۔ خلا میں سفر کرنے کے لئے ان کے لباس کے ساتھ چار پیرا شوت بندھے ہوئے تھے۔ یہ خود بخود کتوں کے نیچے پڑتے ہی کھل گئے تھے اور وہ آسانی سے بیچے پڑ آتے تھے۔ یوری گگارین کو جس طرح الجھنوں میں بیچے آتا رہا اس سے پتہ چلتا ہے کہ روسی سائنس دانوں نے پرواز کے بعد کچے

کائناتی جہاز خلا میں بھی کربہ وزنی اور کائناتی شخار ریزی کے قریبے کے کئے جا چکے ہیں جن سے انماذہ ہوتا ہے کہ انسان خلا کے حالات میں اپنے آپ کو ڈھالنے کا اور شخار ریزی کے اثر کو لباس کی مدد سے برداشت کرے گا۔

فزا کا مشلری کیم کام نہیں ہے۔ جو آدمی کائناتی چہستان میں بیٹھ کر خلا کو سفر کرے گا اس کے لئے غذا، باقی اور ہوا انتظام کافی مقدار میں لیون کر لیا جائے گا؟ حساب لگا کر معلوم کیا گیا ہے کہ کپتین سے لے کر پانچ افراد تک اگر ایک بھیجنے کے لئے خلا میں سفر کرنے جائیں تو ان کو غذا، باقی اور کبھی کی مقدار ایک ٹن لے جانی پڑے گی۔ اس کی وجہ سے جہاز کے اندر ذہنی کتنا بڑھ جائے گا جب کہ ستیا حوں کو اور بہت سے آلات کا بندوبست کرنا پڑے گا تاکہ سہولت ہو۔ لیکن عالمیہ قریات سے یہ مشل بڑی حد تک حل ہو گیا ہے۔

چاند پر جانے کے مسئلے میں بین مذہبی قہیں پہلی منزل وہ تھی جب کہ مصطفیٰ صیارسے اور اسٹینک اڑائے گئے۔ دوسری منزل وہ تھی جب کہ روس نے اپنا راکٹ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۹ء کو چاند کی سطح پر اتار دیا تھا لیکن اس میں ٹیلی ویژن ایئر سے اور دوسرے آئے ایسے مٹنے جو دہائی کی تفصیلات ذہن تک نہ پہنچتے۔ اس دوران میں جانوروں کو بھی خلا میں بھیجا گیا۔ انسانوں کو بھی خلا میں بھیج کر کامیابی سے نیچے اتار لیا گیا۔ اب تیسری منزل چاند پر پہنچنے کی ہے۔ امریکی نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۶۹ء تک وہ چاند پر سائنسی مرکز قائم کرے گا۔ روس نے کوئی اعلان نہیں کیا ہے لیکن بہت سے باخبر لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ امریکی سے بہت پہلے چاند پر انسان بھیج کر اپنی قریہ نگاہ بنائے گا۔ بہر حال جیسے ہی وہ سائنسی مرکز مکمل جائے گا چاند سے دوسرے ستیارسے پر جانے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے اور انسان عام طور سے خلا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر لے کرے گا۔ اس کے بعد انسان سب سے پہلے مریخ پر جائے گا اس کے بعد زہرہ، مشتری اور زحل پر قدم رکھے گا اور کائنات کا ستیارج بن جائے گا۔

مریخ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اس کی فضا بالکل خشک ہے اور

اس کی تہہ پتلی ہے اس لئے اس پر جاننا مشکل ہے۔ لیکن ایک سائنس دان نے تجویز پیش کی ہے کہ نیوکلائر انرجی (ایٹمی طاقت) سے مثنوی کا ایک چھوٹا چاند اس طرح اس کے مدار سے ملے گا کہ آئیں کو آئیں میں وہ مریخ سے ملے گا کہ پائش پائش ہو جائے۔ اس چاند پر مثنوی اور امونسیا کے ٹیکھیائی اجزاء موجود ہوں گے۔ یعنی کی مدت سے اس ٹیکھیائی صفت کو کہہ سکتا ہے کہ اس طرح مریخ کی فضا بدل دی جائے گی اور وہاں ہوا، پانی اور مثنوی فضا پیدا ہو جائے گی، پھر مریخ پر جب کہ انسان آباد ہو سکے گا۔ ایک دوسرے سائنس دان ڈاکٹر فریڈ ڈوشکی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ نہ صرف چاندوں کو بلکہ سیاروں کو بھی اپنی جگہ سے ادھر ادھر لٹایا جاسکتا ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ مثنوی اور زحل جو کہ سورج سے بہت دور ہیں ان کے ساتھ کو ٹکھٹا کر ایک سیارے کے برابر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد ان کو کھسکا کر سورج کے ذرا قریب ایسی جگہ لے جا کر رکھ دیا جائے جہاں سے سورج کی دھوپ ان سیاروں پر بھی پھیلے گی اور مثنوی کی نشوونما ہو سکے گی۔ اس کے بعد نیوکلائر انرجی (ایٹمی طاقت) سے ان کے ساتھ کو ٹکھٹا کر زمین کے برابر کر دیا جائے گا اور ان کے کرہ ہوائی کو بھی بدل کر زمین کی فضا کے مانند بنایا جا سکے گا۔ پھر انسان مثنوی اور زحل پر بھی جا کر آباد ہو سکے گا۔

ڈاکٹر ڈوشکی نے کائنات میں ستاروں کو بیٹے بھڑاتے خود دیکھا ہے اور وہ وہیں سے خود ان کا مشاہدہ کیا ہے اس لئے وہ ایٹمی قوت کی مدد سے ستاروں کی جسامت کو ٹکھٹا کر بڑا کرنا بالکل ممکن سمجھتے ہیں۔

افترض ستیارسے کو قابو میں کر لینے کے بعد ان کے درمیان خلائی سفر عام ہو جائے گا اس وقت انسان کائنات کو سفر کرنے کا پروگرام شروع کرے گا اور اپنے خواب کو مشر مندہ تعبیر ہوتے دیکھ کر پھولانہ سمائے گا۔

من و تو

غزل

سے انتخاب نہ ہی پر مہربان کا مہربان
خود جن ازل ہے مہربان کا خلیل
دلکش ہوں یاں جذبہ جنوں جذبہ پیدا
دلوانے کا دیوانہ ہو ہشیار کا ہشیار
خود گوش سراوان ہے دو شیزہ فطرت
میری رنگ ساس کی اندھے جھٹکا رہا
عرب حرم میں مہر افکار کے احتمام
میرا نہ عالم میں مری مستی کو دار
میں رہلندہ عشق میں کیا گرم ہنرمیں
صدیقیت قاف میں پریشان پر سر
ہر سانس مری تیشہ خراہ کا حاصل
سآہ مری تو یا شر باری کہن سار
مسک سے مرا غلبت آدم کا قاتل
یہ فر ہے حاکم ملک میں کا فر ہوں دیندار
یہ فر ہے حاکم ملک میں کا فر ہوں دیندار
تیرے لہجہ روشن پر یہ ابرو خمیرہ
یا صفحہ منوش رنگ پر یہ نیرنگی پر کار
یہ ساری فضا کیا ہے ترانہ جاوید
یہ سارا چین کیا ہے ترا پر تو رخسار
قامت ہے کہ رنگوں میں نہائی ہوئی
کھڑے کر یہانی و ہزار کا شکار
بکتی ہے فقط ایک تبسم میں جوانی
یہ آنجن ناز ہے یا مہر کا یا زار

الامان، یہ غم دنیا، حیرت

کاوش مرا جلوہ تھا سراج اور دلی میں

جس سے فرصت ہی نہیں ہے ہم کو

میں ارض و کن کا ہوں ابھرتا ہوا دکھار

نئی کتابیں اور رسالے

انداز سے

مستند فرائز گورکھپوری۔ صفحات ۲۰۶۔ کتابت، لطافت، جلد
جلد پیش عمدہ۔ قیمت پانچ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یہ فرائز گورکھپوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ فرائز صاحب ممتاز اور مستند شاعر ہیں۔ تنقیدی بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے اور مستند تنقیدیوں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کر کے تنقیدی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تنقید کوئی میکانیکی عمل نہیں اس میں جذبات اور عقل کی زیریں گہیاں بھی ہیں جس کی وجہ سے تحلیل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ پیش نظر میں اس کتاب کی تصنیف کی غرض وفایت بیان کرتے ہوئے لکھے ہیں۔۔۔۔۔ جو جالباتی، وجدانی، اضطراری اور جمالی اثرات قدما کے کام کے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں انھیں دوسروں تک پہنچا دہ کر ان اثرات میں حیات کی حرارت و تازگی قائم رہے۔۔۔۔۔ بلاشبہ یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

ادب اور ادیب

مستند ڈاکٹر اعجاز حسین۔ صفحات ۲۰۶۔ کتابت، لطافت
جلد، جلد پیش عمدہ۔ قیمت چار روپے۔

اس مجموعہ میں ڈاکٹر اعجاز حسین کے ۱۶ مضامین شامل ہیں جو قریب قریب سب ہی مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی اردو کے قدیم ادیبوں پر یکساں نظر ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بڑا سلیج ہوا ہے اور وہ کبھی بھی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ یہ مضامین انھیں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان مضامین کو ایک با شائع گو

ایک ادبی خدمت انجام دی گئی ہے۔

فیض مشرق

از ڈاکٹر محمد احمد مدنی۔ صفحات ۱۹۵۔ کتابت، لطافت، جلد
جلد پیش عمدہ۔ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

یہ مجموعہ ان چار مضامین پر مشتمل ہے۔ اسلامی علوم و فلسفہ کا ارتقائے ادب کے علوم اور فلسفہ پر، عربی تہذیب و خیالات کا اثر، یہ وفساد اطالیہ کی شاعری پر، ابو العلاء عمری اور اس کا فلسفہ، ابن خلدون اور اس کا مقدمہ۔ چاروں مضامین فاضل مصنف کے بڑے مطالعہ اور تحقیق کے منہر میں اور ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ عربی علوم و فنون اعلیٰ عرب نے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔

اردو سے ہندوؤں کا تعلق

مصنف رحل رحلی۔ صفحات ۱۰۸۔ کتابت، لطافت، جلد
قیمت ایک روپے پچاس نئے پیسے۔

مشرق میں علامہ عبدالحلیم شرر کا مقالہ ہندوؤں کا تعلق اردو، شامل ہے۔ اور اس کے بعد مصنف نے سرشار پریم چند، کرشن چندر، ویا شکر نسیم، چکیت اور فرائز کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف سے ان کا مستند یہ ظاہر کرتا ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ہندوؤں نے بھی برابر کا حصہ لیا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے یہ مختصر کتاب قابلِ قدر ہے۔

تعلیم اور زندگی

مصنفہ کے رشتہ منقہ۔ مترجم ڈاکٹر اقبال نرائن گرو۔
صفحات ۱۸۔ کتابت، لطافت، جلد، جلد پیش عمدہ۔

فیرنڈو کتاب میں تعلیم اور زندگی کے باہمی تعلق اور اس کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں مترجم کا بعیرت اخذ اور مقدمہ بھی شامل ہے۔ یقیناً فاضل مترجم کی یہ خدمت قابلِ فہمائیس ہے۔
چتر لیکھا (ناول)

مصنفت بیگم فخریہ اورما - ترجمہ سید سہروردی - صفحات ۲۸۰
کتابت، لمباغت اوسط - قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

’چتر لیکھا‘ ہندی کا مشہور ناول ہے اور ہندی کے افسانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مترجم نے اس کو اردو میں ترجمہ کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے جو بلاشبہ قابلِ تحسین بھی جانے گی۔

قصیدہ عطار

از محمد صالح الحق بھٹی شری - صفحات ۷۹ - کتابت، لمباغت جلد، جلد پیش عمرہ - قیمت روح نہیں۔

یہ شیخ فرید الدین عطار فرخ پور کی ایک فارسی قصیدہ کا منظوم ترجمہ ہے جس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ٹیپس لیمحات اور نکات کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ اس قصیدہ میں وحدۃ الوجود سے متعلق امر اور مودعہ بیان کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹرہ بالاساکن کتابیں ادارہ انیس اردو الہ آباد نے شائع کی ہیں۔

جدیتا جاکتا

مؤلف مترجم ڈاکٹر سید محمد یوسف - صفحات ۱۶۱ - کتابت لمباغت، جلد، جلد پیش عمرہ - قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے
طے کا پتہ - اردو ایکڈمی سندھ، ہندو ڈاکرائی۔

یہ انڈس کے مشہور مسلم فلسفی ابن الفیل کی تصنیف ’حقیق بن یعقوب‘ کا اردو ترجمہ ہے جس میں مترجم کا پیش نظر اور تفسیر بھی شامل ہے۔ اسلامی فکر اور فلسفہ کے طالب علموں کے لئے کتاب مفید ملنا ہے۔

گاماگ

مؤلف آغا جگر لکھنوی - ۸۸ صفحات کا یہ کتاب پچھتر سالوں کا ان پہلوؤں کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں کشمیر کے فن

سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ قسم اول اور قسم دوم کی قیمت بارہ آلے - طے کا پتہ - متروک پک ڈپو اینڈ بالکون (م۔ش)

چاندنی اور انگارے

اسلام روٹی کے تین ڈراموں کا مجموعہ - صفحات ۱۰۶
صفحات - قیمت دو روپے۔ کتابت، لمباغت اوسط - مجلد سہروردی پیش۔

روٹی صاحب کے یہ تینوں ڈرامے صرف اس لئے ڈرامے کہے گئے ہیں کہ ان میں ڈائلاگ (مکالمہ) ہے۔ موضوع بھی کوئی انوکھا پن نہیں۔ پہلا ڈراما چاندنی اور انگارے ایک ہیما یا نکی زندگی کے خطرات کے بارے میں ہے۔ دوسرا ڈراما ’فاصلہ‘ ایک طوائف کی لڑکی سے متعلق ہے اور تیسرا ڈراما ’لومیرج‘ ایک فیشن ڈو لڑکی سے شادی اور ناکامی کی داستان ہے۔ ڈراموں میں ’ڈراماٹ‘ بالکل نہیں اور مکالمے بھی بالکل سپاٹ ہیں۔

یو حنا

مصنفت کلیم عرفی - پنجم درہ دل (چنگیز خان) اور چراغ شب آخر دیو حنا، اور نگار خاندل (شاہجہاں) یہ تین ڈرامے کتاب میں شامل ہیں۔ زبان معنوی اور کچھ ایسی ہے جو خام ترجموں میں ملتی ہے۔ جیسے ”وہ اپنے منہ کے پھوٹوں سے بچے چوے تیرا نام عطر ریختہ ہے۔ کچھ کچھ گئے ہم نیلے پچھے دوڑ دیں گی۔ ہم تجھ میں شادمان اور مسرور ہوں گی۔“ (صفحہ ۷۲)

”قاہرہ قابی و توشیہ و توشیہ سے آراستہ نیم عاج، ہجر ارج، اہل اور یا قوت، شبنم اور موتی کے ٹکڑوں میں چھپے ہوئے شگفتہ سمجھوں کے خاموش شب خیز میر پر ہفت رنگ نمنوں کے آس پاس غریب زان، رفائے رفائے، رواں اور رواں (صفحہ ۳۸) ایک جگہ ’ترکاب‘ بھی لکھا ہے۔

ڈرامے کے فی وادیم کو برتے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے۔ کتاب کی قیمت دو روپے اور صفحات ۱۶۶ - صفحات - کتابت لمباغت اوسط ہے۔

بھرتی ہری

ترجمہ ہے کرنش پودھری۔ فہرست ۱۰۷ صفحات۔ قیمت

دروپے۔

بھرتی ہری سنسکرت کا مشہور شاعر گڑرا ہے۔ بے کرنش پودھری صاحب نے اس کے کلام کا اردو ترجمہ کر کے ایک مختصر مجموعہ (انجام دی ہے) ترجمہ دار اس اور پھر ہے کہیں کہیں ٹوک چند محرم کا منظوم ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ پودھری صاحب نے اس کیفیت میں فارسی اور اردو شعر و کلام کا مانتا جانا بھی درج کر دیا ہے جس کتاب کی فہرست میں اضافہ ہو گیا ہے۔

ضرورت ہے کہ سنسکرت کے ادب کا علم کا اردو میں زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے۔ پودھری صاحب اس کام کے اہل ہیں۔ خاکہ کے وہ آئندہ بھی ایسی کوششیں جاری رکھیں۔

ادبی جھلکیاں

مختصر۔ صاحب عابد حسین۔ صفحات ۲۱۱۔ قیمت تین روپے

پاس نے پڑھے۔ کتابت لطافت اچھی ہے۔

زیر نظر کتاب محترم صاحب عابد حسین کے دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہاں کہ فہرست مضامین میں تعداد ۱۱ درج ہے، جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ محترم ملک کی نامور ادیب ہیں اور ان کے مضامین ہمیشہ قدر اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں۔ دو مضامین غالب اور تین مضامین حالی سے متعلق ہیں بقیہ کے عنوان یہ ہیں۔ اردو شاعری پر ایک نظر، نذیر احمد کے ناول میں دہلی کی جھلک، شاہ کار سرتار، فیروزانہ آئے صدائے امید ہے یہ مجموعہ دل چسپی سے پڑھا جائے گا۔

ایک معمولی لڑکی (ناول)

مفتحت جوت سنگھ۔ قیمت چار روپے۔ فہرست ۲۲۲

صفحات۔ کتابت لطافت عمدہ۔

جوت سنگھ اردو کے صوبہ اول کے افسانہ نگار ہیں مگر ناول نگاری میں وہ پوری طرح کامیاب نظر نہیں آتے۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں کی اکثریت کا یہی حال ہے کہ ان کے

ناولوں میں وہ تیکھاپن، فن کاری اور سناٹا نہیں ہوتی جو ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔

ایک معمولی لڑکی، ایک سیدھا سادا ناول ہے۔ مگر پھر بھی جوت سنگھ لکھا ہوا ہے۔ اس نے کہیں کہیں جو نکاد بیٹے رائے جتے لے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام کتابیں ادارہ انیس اردو لکچر ہاؤس نے شائع کی ہیں۔

رسالے

ماہنامہ پگڈنڈی اترسر۔ سید سجاد حیدر علی، سید جہت پارسہ، سید جہت ۹۰ صفحات، مرتبہ۔ سید سجاد حیدر علی، رفت۔ لکھنؤ کا پتہ ادارہ انیس اردو لکچر ہاؤس۔ سید سجاد حیدر علی اردو کے بڑے ممتاز نویس تھے۔ رسالہ پگڈنڈی نے اسے مستقل ایک خاص پریشانی کر کے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے اور تربی کی کوشش برقرار رکھتے ہیں۔ (دش - ح)

سماجی تعمیر نو کا ترجمان

سرسیتا ماہنامہ

- سماجی اور گروپوں زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کتابیں
- اہم اور بڑے جدید سیاسی اور افرادی مسائل پر خیال انگیز مضامین
- ذہنی نشیں نظریں اور جذباتی غریبیں
- طنز و مزاح
- عورتوں کے سلبیہ ہوئے مضامین

فی شمار ۷۷ نئے پیسے

۷۷ سالانہ ایک سال ۲۱ روپے دو سال ۱۱ روپے

منیجر، سر سرتا اردو۔ بھنڈے والا، رانی تھانی سر۔ نوٹی دلی۔

مجھے اگلے شمارے سے ایک سال/ دو سال کے لئے خبردار بنائیے۔ رجسٹرڈ کے لئے وہ شمارہ دی جاتی ہے۔ پتی سے روانہ کیے۔

نام

پتہ

ڈال ڈال کے پات

غزل — حضرت سیاک مرحوم شاہجہانپوری تلمیذ داغ

نزدہ لطفِ گریہ و خونِ روا نہ وہ یادِ رشکِ پری رہی

نزدہ ہم رہے نزدہ دل روا نہ وہ غم سے زحرِ گری رہی

نزدہ ریاضِ خلدیں جی لگا نزدہ وسایلِ حور سے کچھ ہوا

دہی جوشِ وحشتِ دل روا دہی اپنی جامِ مدری رہی

شبِ وصلِ غلوتِ خاص میں جو جواب: پیچ سے اُٹھ گیا

تو ہیں رہے نہ وہی رہے جو رہی تو بے خبری رہی

بھی اب گریہ سے ترکیا کبھی خونِ دل سے بھرا رکھا

گرا پے غفلتِ مراد کی اک دہی سی بے نثری رہی

کیا مست بادہٴ عجب سے مجھے مانے ساتی دہرنے

جو شرابِ وصل کے خم میں تھی وہ الگ نہری کی دھری رہی

جو کیا ہے یا س نے حالِ دل کہیں کس سے جا کے حسین ہم

یہ وہ شبِ شہدے کہ شرابِ عشقِ جامِ جس میں بھری رہی

نہ صفتِ غزلوں میں جو کے کاغذ سے سیاہ کے پائے حقیقتِ نفسِ رکھا ہے (صاف)

’محبوبِ ہندو‘ یہ ایک ماہنامہ ہے جس میں اہم معاملات

وسائلِ وقت پر اہل ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب میں ہندوستانی

زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ”مسائل کا رسالہ“

اسی تحقیقی اساس پر ڈاکٹر ابوالایض صدیقی نے پچھلے کئی برسوں میں

کے ایک کتاب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

”جی پی سیڈ فیملر ایک اور لکھنؤ کے نام سے نکلا کرتے

تھے۔ ڈاکٹر کارسان نے اپنے مقالات میں اس کا نام کسی غلط فہمی کی وجہ سے

’محبوبِ ہند‘ لکھا۔“ (سب اس حیدر)

اُردو کا سب سے پہلا ماہنامہ — احمد راز نقوی

اختر شہنشاہی کی وساطت سے اردو کا پہلا ماہنامہ مرکلتیں

خیرخواہ ہند کے نام سے ۱۸۶۷ء میں نکلا جیب اردو معاہدہ کا ارتقا

دور تھا۔ مالک اس کے پادری نثر میں صاحب اور بہتم پادری تھا مسرتے

اگرچہ بیس شش برس سے نکلتا تھا۔ قیمت سالانہ دو روپے چار آنے تھی۔

چھاپہ خانہ آہنی تھا حرف پرچہ چار ورق کا تھا۔ اس سے زیادہ اس ماہنامہ

کے بارے میں ہمارا علم نہیں ہے محض قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسالہ

پادریوں کا تو فروغ تھا اور جس پرپس سے طبع ہوتا تھا وہ عیسائیوں کی اشاعت

اور تبلیغ کا مرجع تھا۔ اس تبلیغی مشن نے مذہبی اشاعت کی خاطر کافی زہر

خرچ کر ڈالا۔ بابتیں شش کا نمب ایسی عیسائیوں کے مذہب کو ہندوستان

کی زبان میں عام کرنا اور ہند میں عیسائی معاشرہ بنانا اور ہندوستانی

عیسائیوں کو فروغ دینا تھا۔ اس مدعا اور مقصد کے پیش نظر ’خیرخواہ ہند‘

کے چار ورقوں میں چھوٹے چھوٹے پروپیگنڈہ کے مضامین ضرور ہوتے ہوں گے

اگر باقی خبریں ہوتی ہوں گی۔ بس اسی طرح خیرخواہ ہند کے مسلک کا تئیک

تعارف ہو سکتا ہے اور اسی روش میں یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ماہنامہ

کم از کم زیادہ تھا۔ پھر چار ورق کا ماہنامہ میری بھی ماہنامہ کی قسمت میں

نہیں آتا۔ اگرچہ میعادِ حیثیت سے یہ ماہنامہ پرچہ تھا۔ اگرچہ ہول کے لوہے پر

ہم اس کو اردو کا لیے قاعدہ ماہنامہ کہیں تو بہتر ہو گا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ اردو کا قاعدہ ماہنامہ کون ہے؟ اس کی نوعیت اور حیثیت کیا ہے؟

ڈاکٹر کارسان دتاسی کی تحقیق کے مطابق اردو کے پہلے ماہنامے کا

تئیک ایک اور دوست ’خیرخواہ ہند‘ سے ہوتا ہے اس کا نام بھی خیرخواہ ہند

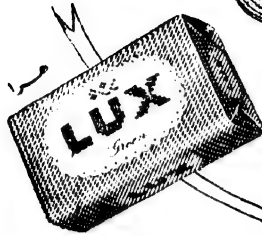
تھا اور پرچہ پرچہ ماہوار تھا۔ ڈاکٹر کارسان کا اس پرچہ کے سلسلہ میں

انتقاس ملاحظہ فرمائیے۔

”یہ فیملر یعنی اردو چندو داس علم دہلی کا، دو رسالوں کے

ڈاکٹر بھی ہیں ان میں سے ایک خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کا نام

لکس دھنک کے ہم رنگوں میں اور آپ کا دل پسند سفید بھی



’ہر رنگ میں
انوکھی جاذبیت۔
مجھے یہ سبھی بچل پسند ہیں!
جیستی مالا بہتی ہیں

دیکھئے! شہائے رنگوں میں لکس! اور آپ ہی رنگوں کے دلہن سرون!
اور سفید بھی! اور گہنی، چہا بن دی۔ آپ کا دل پسند تان لکس۔
آپ کے رنگ ڈوب کی رون!



نہی ستاروں کا لکس!
ملائیم چھانک والا
چمن کشش
صہا بن

باہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹- اسٹریٹ نمبر ۳۳- پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲- رنکون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵- بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا- ۳۱ گرینچ روڈ سنگاپور

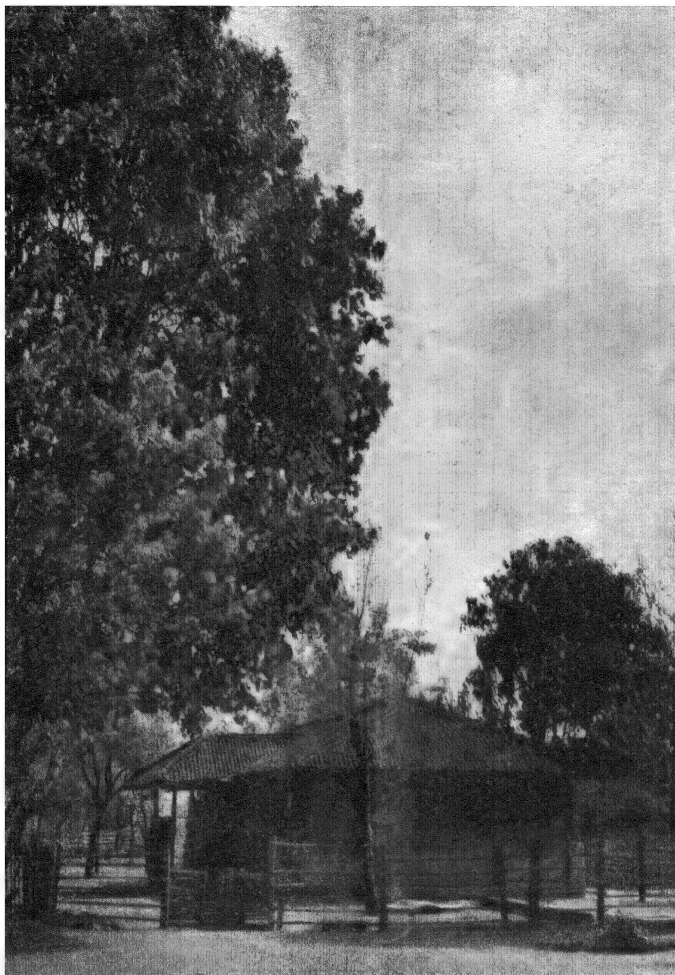
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں آج کل کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ بھیج دیں تاکہ وہ سالانہ کے نام پر دستور جاری رہے۔ غریبوں کی بہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انہیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریپلائی کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی خانہ پری کر کے سپرد ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے ڈی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

اذا راہ کرم چندہ بھیجئے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آج کل

Small University Libr.
STANFORD UNIVERSITY



کارتک شک سر ۱۵۵۳
نومبر ۱۹۶۱ء

نے پیم

ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نیدرلینڈز نہرو سے بات چیت	دور پیسے	۳۵ نئے پیسے
اولوالکلام آزاد	دور پیسے	۳۵ نئے پیسے
تیسرا بیچ سال پلان	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے

نمبر ۲۰-۳۰-۴۰-۵۰-۶۰

————— کے کاپی —————

بزنس منیجر پبلکیشنز ڈوٹیرن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی



» حِوَالِی !

”میرا دلپسند
دھنک کے
مہ رنگوں میں
اور سفید بھی
آشاپاکھ بہتی ہیں

فامی ستاروں کا خالص، ملائم جھاگ والا
چمن بخش صابن



میلے میں

“شعلہ تھوڑے سرنہ تھوڑے—بڈو

“نہنگارے شعلہ کھنڈے،

“نہنگارے تھوڑے شعلہ“ ننگارے..

“نہنگارے کھنڈے..“

سابل زبان کا یہ لوگ گیت دل کی تھی
خوشیوں اور خواہشوں کا آئینہ نہ ہے۔
نوجوان اپنی مجاہد سے کہتا ہے۔ سلم کے
میلے میں نے ایک بڑی خوب صورت
بڑی خوش رنگ ساڑھی دیکھی۔ سٹار می
بچنے والی وہ چھٹی ناز بچے نگر کے ساتھ کہ
یہ تھی، اسے میں نے اپنے کرگھے پڑنا ہے۔“



اردو کا مقبول عوامی مہینہ نامہ

آج کل دہلی

جلسہ ادارت

محمد مجیب چاند علیہ دہلی
محمد حسین قادری نور
گوبی ناتھ اسمن
خواجہ احمد فاروقی
دھرم داس
سری نگر

یو۔ ایس موہن راؤ ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس۔ ایس۔ راگھوون ڈپٹی ڈائریکٹر (ایڈیٹوریل)
جی۔ نیف ناتھ ڈپٹی ڈائریکٹر (پروڈکشن)
بال گندھرش ایڈیٹر شعبہ ادب (سیکریٹری)
ہری پرسون

اسٹنٹ ایڈیٹر:- منظر شاہ

ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
سالانہ چندہ :-
غیر مالک سے :-
ہندوستان میں :- ۴۰ روپے
پاکستان میں :- ۴۰ روپے (پاک)
غیر مالک سے :- اشٹلنگ یا ۵ سینٹ

ترجمہ و شائع کردہ

ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن فسطی آف انعامیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

۴	ادارہ	ملاحظات
۵	ذائقہ گوشت	غزل
۶	گیان چند	اردو کے جڑواں مہینے
۱۳	گوبی ناتھ اسمن	قوی اتحاد آزادی سے پہلے
۱۶	حرمت الاکرام	غزل
۱۷	عبدالقادر سروری	حافظ عبدالرحمن خاں احسان
۲۷	جیلانی یافو	نفسرت
۳۴	جموں لند عجیب	گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت
۳۸	منظر رام	غزل
۳۸	تبسم نظامی	غزل
۳۹	—	تیسرا پانچ سالہ پلان
۴۳	قاضی مزاج دھولوی	داستان حسن
۴۴	چند رکن سون رکا	نکست خواب

سرورق :- ایک دو شیزہ راجستانی لباس میں
رسالے کی قیمت پیر :- آئی دیوالی

کارنگ ٹنک ستمبر ۱۸۸۳

نمبر ۱۹۶۱ء

جلد ۲۰ - نمبر ۴

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال گندھرش طیبانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۴

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

بنیاد پر نیڈٹ نہرو کی صدارت میں ایک قومی یک جہتی کونسل قائم کی جائے۔ کیچڑ ۳۷ جمران پٹریشن ہوگی، اور قومی یک جہتی سے متعلق مسائل کا جائزہ دے کر ضروری سفارشاتیں کیا کرے گی۔ کانفرنس نے سیاسی جماعتوں کے لئے مناسب مابینہٴ اختلاف منظور کیا جس کے مطابق سیاسی پارٹیوں سے اپیل کی گئی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اختلافات بڑھیں یا مختلف مذہبی یا سیاسی فرقوں اور مختلف ذاتوں میں نفرت پیدا ہو۔ آج ہم قومی ترقی کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں لوگوں کے مابین کو ایک تئیں راہ پر لگایا جائے۔ یقینی ہے کہ کانفرنس کی مساعی کا بیابان ثابت ہوں گی، ملک میں تنگ نظری اور دیگر تعصبات کے لئے کوئی جگہ نہ رہے گی اور قومی اتحاد مضبوط بنیاد پر استوار ہو جائے گا۔

۱۸۔ ستمبر کو ہوائی تہاڑ کے حاشہ میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل میسر میرٹھ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت پر اسرار حالات میں ہوئی بلکہ وہ کانٹے کے مسائل کو سلھانے میں مصروف تھے اور کھانچے کے بیڑ میں شہر سے بے ملے جا رہے تھے۔ ان کی موت سے دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ وہ بڑے دیانت دار کارکن اور گونا گوں قوموں کے مالک تھے اور ہمیشہ اتحاد و اتفاق اور امن و سلامتی کے لئے کوشاں رہے۔

افسوس کہ مشہور ظرافت نگار حاجی تقی ق ۷۰ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کا نام اعلیٰ اعلیٰ جیسی تھا، مگر حاجی تقی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے سالک مرحوم کے ساتھ رسالہ قافس خیال نکالا۔ اس کے بعد مختلف رسائل اور اخبارات سے وابستہ رہے۔ اپنی مخصوص ظریفانہ نظر نگارش کے باعث حاجی تقی کا نام اردو ادب میں جیرفانی ہے۔

پچھلے دنوں یوگوسلاویہ کی واحد صافی ہزارہ میں ۷۵ غیر جانب دار ملکوں کے سربراہوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں ہندوستان کی یہ تحریر منظور کی گئی کہ صدر کنیرجی اور وزیر اعظم خرد و خفوت اس کے مسئلہ پر گفتگو کریں۔ اس کے علاوہ کانفرنس کے اعلان میں نوآبادیاتی نظام کو ختم کرنے پر بھی زور دیا گیا اور عالمی امن کی ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا گیا کہ جنگ کی تیاریاں اتنی بڑھ چکی ہیں کہ اگر انھیں روکا نہ گیا تو اس کا تحفظ ناممکن ہو جائے گا۔ جنگ اور سرد جنگ کے بے پراسی نقصانے ہم کے اصول کو اپنانے اور بین الاقوامی تعلقات میں ترقی خود ارادیت کو نیا قرار دینے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس نے اس کے نتیجے میں جو آواز اٹھائی ہے اس کا اچھا اثر پڑا ہے۔ روس نے بھگدیا ہے کہ وہ جنگ کو ناگزیر نہیں سمجھتا اور مغربی طاقتیں بھی جھگڑے چکناے کا واحد ذریعہ جنگ کو نہیں گردانتیں۔ آج دنیا میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عالمی امن و سلامتی کو کیسے مستحکم کیا جائے اور جنگ کے خطرے کو کیسے ختم کیا جائے۔ ہمیں امید کرنا چاہیے کہ بڑی بڑی طاقتیں ہولت کے ساتھ اپنے جھگڑے کے عام انسانیت کو جنگ کے خطرے سے نجات دلائیں گی۔

عالمی امن کی ترقی میں وزیر اعظم نیڈٹ نہرو کے زیر صدارت قومی یک جہتی کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ یہ اپنی وجہیت کی پہلی کانفرنس تھی جس میں ملک کے مختلف اعلیٰ لہذا رنگوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں سیاسی لیڈر، سائنس دان، ماہرین تعلیم، ادیب، مصنف، شاعر، مرکزی وزراء اور رہائے سقوں کے وزراء نے اعلیٰ اشغال ہوئے۔ کانفرنس میں قومی یک جہتی سے متعلق مختلف مسائل پر تبادلہٴ خیالات ہوا اور بہت سی تجاویز زیر غور آئیں۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ تعلیم کے ذریعہ قومی یک جہتی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ فرقہ واریت، ذات پات، تہذیب اور لسانی تعصبات کا تباہ کیا جائے۔ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ ویسٹ

غزل

بھی جب تری یاد آجائے ہے
 شہب یاس میں کون چھپ کر ندیم
 کوئی لاکھ اسے روکے لوکے، مگر
 حیرت میں اسے موت، اسے زندگی
 پلک پر پس ترکِ غم، گاہ گاہ
 کرم پر ترسے خوش تو ہوں کیا کروں
 بے بات چشمِ فوں گہ سے کیا
 تری یاد شہبائے بے خواب ہیں
 جو بے خواب رکھے ہے، تازہ زندگی
 نہ کہ مجھ سے ہمدرد مرا حال زار
 غزل میری کھینچے ہے غم کی شراب
 مری شاعری گو ہے جانِ نشاط
 مجھے چھوڑ کر جائے ہے تیری یاد
 غمِ عشق کیسے ہے گم گشتگی
 وہ آواز، ہو یا کوئی خاموشی
 مجھے گم سہی کا نہیں کوئی خوف
 دلوں پر گھٹائیں کچھ چھائے ہے
 مرے حال پر مشکرا جائے ہے
 دل اس کی لگی ہیں چلا جائے ہے
 مرا جائے ہے یا جیا جائے ہے
 ستارہ کوئی جھللا جائے ہے
 کہ آنسو بھی آنکھوں میں آجائے ہے
 کہ وہ بھی تو باتیں بنا جائے ہے
 ستاروں کی ڈتیاں بجا جائے ہے
 دہی غم کی دن سلا جائے ہے
 دلِ ناتواں سننا جائے ہے
 پیٹے ہے وہ جس سے بیا جائے ہے
 غموں کے خزانے لٹا جائے ہے
 کہ جینے کا اک اسرا جائے ہے
 مگر بعض کو نین پا جائے ہے
 تری ہی کہانی سنا جائے ہے
 ترے گھر کو ہر رات آجائے ہے

سنائیں تھیں داستانِ فراق

مگر کبھی سے سننا جائے ہے

اُردو کے جڑواں مصوتے

خفیف اے - مثال : مغل - کہتا - محل - بہن - چہر - اہل
خفیف او " تنہ - حسن - کرام - محرم - عمر متقی
چلبلیں - بہت

ان تینوں مصوتوں کے لئے 'I. P. A.' چارٹ میں علامات نہیں تھیں، اس لئے ان کے لئے ہم امریکی چارٹ سے علامات مستعار لیں گے۔ بعینہ دس مصوتے 'I. P. A.' کے مطابق رقم کئے جائیں گے۔ یہ کچھ کی ضرورت نہیں کہ قفع اردو میں 'اے' اور 'او' کو واحد مصوتہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اردو میں انہیں جڑواں مصوتہ کی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ ذیل میں اردو مصوتوں کو اردو، ہندی اور صوتیاتی تحریر میں درج کیا جاتا ہے۔

ا	ای	۱
آ	آ	۲
ۛ	ۛ	۳
ۛ	ۛ	۴
ۛ	ۛ	۵
ۛ	ۛ	۶

لہ اردو اور ہندی کا تلفظ انگریز اہم سیل - متر جبر چودھری محمد علی

اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

علا ہندوستانی صوتیات - نیا دور فروری ۱۹۶۱ء

جڑواں مصوتے سے مراد DIPHTHONG ہے۔ یہ فیئر جبرادھا درسوری نے زبان، درجہ ثانی میں جڑواں مصوتہ کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔ چودھری محمد علی نے اس کا ترجمہ غلطاً غلطاً مصوتہ کیا ہے۔ سرسوتی سرس صاحب کیفیت کے مطابق جامع الاثر میں اس کے لئے 'موقعی مصوتہ' کی اصطلاح رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'مطلوہ مصوتہ' سے مصوتوں کا وہ انضمام ظاہر نہیں ہوتا جو DIPHTHONG کی خصوصیت ہے۔ 'موقعی مصوتہ' میں اس کی طرف اشارہ ہے لیکن اسے پہل کر کے 'وصلی مصوتہ' کیوں نہ کر لیا جائے۔ DIPHTHONG کا ایک اہم مفرد مصوتوں کا جوڑ ہے۔ انگریزی سابقہ 'نملہ' ثنویت پر ہال ہے کیونکہ اس کے تشکیل میں تین مصوتوں کے مل کو TRIPHTHONG کہتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ اردو اصطلاح میں دو کے عدد کی طرف بھی کچھ اشارہ ہے۔ 'جڑواں مصوتہ' میں 'جڑنے' کا شور بھی ہے اردو 'دو' کا بھی، اس لئے عجیب تک کوئی بہتر اصطلاح وضع نہ ہو میں اسی کا استعمال کروں گا۔

جڑواں مصوتوں پر لکھنے سے پہلے لازم ہے کہ اردو مصوتوں کی شرح تعداد کی شرح کر دی جائے۔ عام طور سے اردو میں دس مصوتوں پر اتفاق رائے ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں اردو میں تین مصوتے

اردو ہیں -

خفیف اے - مثال :- ہیرا - ہیرت - محنت - غرض - دیو دل
واقفہ - جامعہ

۴۔	ا	وا	۳
۸۔	آ	و	۵
۹۔	اد	و	۶
۱۰۔	خفیف او	و	۷
۱۱۔	او	و	۸
۱۲۔	ا	و	۹
۱۳۔	اد	و	۱۰

عام پول چال کے مطابق ان میں بعض معصوتے طویل اور بعض خفیف کہلاتے ہیں۔

طویل معصوتے: ای - اے - آ - او - او - او
خفیف معصوتے: ا - خفیف اے - خفیف آے - ا - خفیف او

جڑواں معصوتہ ایک VOWEL GLIDE ہے یعنی اس کی اوڑاگی میں اعضاء نقلی ایک معصوتہ کے مزاج سے روانہ ہو کر تیزی کے ساتھ دوسرے معصوتہ کے مقام تک پہنچتے ہیں۔ یعنی یہ معنی دو معصوتوں کے اجتماع کے مترادف نہیں۔ اس میں کئی شرائط ہیں:

- ۱۔ دونوں معصوتے ایک کشش اور سانس کے ایک جھٹکے میں ادا ہونے چاہئیں اس طرح کہ سنتے ہیں وہ گویا واحد آواز معلوم ہو۔
- ۲۔ یہ ہمیشہ ایک رکن (SYLLABLE) ہوتا ہے۔
- ۳۔ اصولاً اس میں آواز کی گونج میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہوتا لیکن داخلہ ہے کہ اس کے پہلے اور آخری اجزاء میں سے ایک نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر ابتدا نمایاں ہوتی ہے تو اسے گراؤ دیا معروف کے ساتھ) جڑواں معصوتہ کہتے ہیں۔ اگر آخری جڑواں نمایاں ہوتا ہے تو اسے اٹھاؤ جڑواں معصوتہ کہتے ہیں۔ دوسری زبانوں کی طرح ان دونوں کے بھی تقریباً تمام جڑواں معصوتے گراؤ ہوتے ہیں۔
- جڑواں معصوتے کے تین ہی دو تیز تھوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔
- ۱۔ یہ ایک رکن ہوتا ہے۔ صوتیات میں رکن کی حد بندی اور

شناخت سب سے پیچیدہ امر ہے۔ جڑواں معصوتہ کے لئے ایک رکن ہوتا ہے۔ یہ معصوتہ شرط ہے۔ اگر لفظ میں دو ارکان ہونگے تو وہ معصوتہ خوش ہو جائے گا جڑواں معصوتہ نہیں۔ جڑواں معصوتہ کے دونوں اجزاء کو اپنی انفرادیت قائم کر دینی ہوتی ہے۔

۲۔ دو مختلف اخرج معصوتوں کے توازن کو ہم سہل بنانے کے لئے

یہ معصوتہ [و] اور [ی] کا سہارا دیتے ہیں اس موقع پر

ان معصوتوں کو GLIDE کہتے ہیں۔ اس میں انہیں لازمی کہا جا سکتا ہے۔ جب دو معصوتوں کے بیچ مزیدے کا عمل ہوتا ہے تو انہیں جڑواں معصوتہ کہنا درست نہیں کیونکہ جڑواں معصوتہ خالص معصوتوں کے امتزاج کا نام ہے یہ معصوتہ کا نہیں مثلاً

پیا۔ پیے۔ ہوا۔ ہوئے۔ سویا۔ کھویا۔ ان میں نہ صرف آخری معصوتہ سے پہلے تیز آتا ہے بلکہ یہ سب الفاظ دو رکن بھی ہیں۔ ان میں یہ معصوتہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہ معنی معصوتہ خوش رہتے۔ کیونکہ یہ نفس کی ایک جھونک میں ادا نہیں ہوتے۔ ان میں رکن کی حد بندی یوں ہوتی۔

i/a i/e u/a u/e o/a

دوسری سطر کے خوشوں میں i, a اور u کے متناہیں اعادہ اور ساقی ہیں۔ باقی خوشے بغیر تیز کے اسد میں

استعمال نہیں ہوتے لیکن ان میں سے کوئی جڑواں معصوتہ نہیں۔

ہندی کتاب راج رتی اچھی نندن گر تھیں ڈاکر کیلاش چند جانی

کا علامہ متالہ ہندی (کشر درسی) شاخ ہوا ہے۔ موصوف نے

ہندی (دندوستانی) رکن کے راز سریت کو ٹٹا ہے۔ اس میں نے

ایک سے لے کر پانچ ارکان تک کے متعدد الفاظ درج کئے ہیں اور

ان میں رکن کی حد بندی کی ہے۔ ہمارے لئے دو رکنی الفاظ درج

۵۹ تا ۶۹) سب سے زیادہ اہم ہیں کیوں کہ ان میں جہاں

ہیں رکن کا فصل دو معصوتوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔ وہ دونوں معصوتے

جڑواں معصوتوں کی تقریب سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ذیل کے محققات

کے ساتھ زیادہ اہم شکلیں درج کی جاتی ہیں۔

ہم مندرجہ بالا لیکنوں کا حل تلاش کر چکے ہیں۔ جڑواں معیوے

(اعت) دو خفیف معقوق ایکسا ہونا بھی لازماً جزواں معقوقہ کی پہچان نہیں۔ چند خفیف معقوقہ جزواں معقوقہ کے طور پر آتے ہیں یعنی ہر جزو اپنی اعزادیت بحال رکھتا ہے اور یہ دونوں اجزا ایک کوشش یا ایک مصلحت میں ادا نہیں ہوتے۔ مثلاً ذیل کے معقوقہ خوشے ملاحظہ کریں جن میں دونوں معقوقہ خفیف ہیں لیکن بعضیں ادا کرنے میں حالت دو مصلحت سناؤ دیتے ہیں۔

یاں اویا سویا کھوچا ہے	شان: سوت کھوت	خواہا	oa
ایا - لیا - دتیا جائے	دھلیسا لیسا	دھسا	ia
ایچہ - دیوگ چا ہے	ویرخواہ	دھو	io
ایچہ - دیچہ - لے چا ہے	لیا	دھ	ie
اوا - اوا - اچا چا ہے	دھوا	دھسا	ua
لے - لے - لے چا ہے	لےسا	دھسا	ea

استفہامیہ	KYA	کیا	۱۔
ڈاکٹر دھرنیو کے مطابق اِطلا	KIA	کیلا	۲۔
کرنا کا ماضی	KIYA	کیا	۳۔

جبراً اور معوتوں کی، انہیں نرا کہیں اور پھیل گئیوں کی وجہ سے
 ڈاکٹر دھر بندو راہ کھینچے پر مجبور ہوئے کہ وہ سچے جبراً اور معوتوں اور
 محض پاس میں آئے وہ دیا زیادہ معوتوں میں خواہ اسی نقطہ نظر
 سے امتیاز کیا جا سکے لیکن علاؤ دوں میں بھید نہ رکھنا ہے ... اسی
 یہاں جبراً اور معوتہ اور معوتی ختنے میں فرق نہیں کیا گیا ہے ...
 اگر وہ خفیہ معوتوں کے اجتماع کو کسٹیا جبراً اور معوتہ مانا جائے تو
 ادنیٰ سہی میں اسے اور اسی جبراً اور معوتہ مانے جائیں گے۔

۱۔	۴۲	دلو۔ ٹولہ۔ روڑی
۲۔	۴۸	کٹھی کھو۔ اٹلے سیٹو
۳۔	۵۰	کھے ڈ۔ سے ڈ

کھو اور سیٹو کے تلفظ کی دو سہل صورتیں مکی ہیں ۱۔ آخر میں نیم مصدو [و] بولا جائے ۲۔ آخر میں یوین او (ڈ) غلط کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دو تلفظوں سے بہت گہرے بھی مکی

۱۱۰

ہے کہ اے کے بعد خفیف او ہل سکیں۔ میرے لئے اس لفظ میں کوئی دشواری نہیں۔ یہ جڑواں معصومہ ہے جب کہ اوپر کی مثال میں پہلا معصومہ اوپریم معصومہ کا خوشہ ہے اور تیسرا ایسا معصومہ خوشہ ہے جو دو ارکان پر مشتمل ہے۔

لیکن [o] د [o o] د [o n] کی کیفیت مختلف ہے۔ ان میں پہلی اردو دوسری شکلیں لفظ کے اعتبار سے ہیں ہیں لیکن یہ جڑواں معصومہ نہیں۔ تیسری شکل جڑواں معصومہ ہے لیکن اس کا ادکارناہ خواہ اور غیر واضح ہے۔ اس کی آخری آواز کو جوں ہی واضح کیا جائے گا وہ [d] یا [d] جیسی ہو جائے گی۔ عام ہونے والا کوئی صوتیات کا آموختہ تو دہرنا نہیں۔ وہ پہلی یا دوسری شکل سے کام لے گا۔ اس لئے ہم ہر سکے ہمیں کہ اردو میں o n جڑواں معصومہ نہیں بولا جاتا۔ جہاں تک علم ہے ہندی میں جڑواں معصوموں کی کوئی فہرست نہیں ملتی۔ ڈاکٹر کاہنہ سیم نے ۱۹۲۱-۲۳ء کے درمیان اردو ادب ہندی لفظ سے متعلق ایک معقولہ لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے اردو میں ۵ جڑواں معصومہ قرار دیے۔

اے او ای (پچھلے لفظ گئی ہیں)
ا (انگریزی لفظ Pull کے معصومہ سے ملتا جلتا)
او (الہامی [u] یا فرانسیسی [ou] کی طرح ہوتا ہے)
حقیقت یہ ہے کہ ان میں تینوں کے سوا کوئی جڑواں معصومہ نہیں باقی چاہے واحد معصومہ تے ہیں۔

ڈاکٹر زورکی قہریم کتاب HINDUSTANI PHONETICS میں اردو کے جڑواں معصوموں کی فہرست ہے۔ ان کے مطابق اردو میں ذیل کے ۴ جڑواں معصومہ تے ہیں۔

- ۱۔ او مثال خوف
- ۲۔ او مثال تاؤ
- ۳۔ اے مثال لائے

۱۔ اردو ادب ہندی کا لفظ احواداد دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

۲۔ ص ۶۹

- ۴۔ ائی مثال قیاض
- ۵۔ او مثال شیو (siu) اردو ملٹی
- ۶۔ ۵۰ مثال meola نیلا اردو ملٹی

میری رائے میں پہلا واحد معصومہ ہے۔ یا پھر ان جڑواں معصومہ ہے لیکن اردو کے کسی لفظ میں اس کے دو جو کا پتا نہیں چلتا۔ مثال کے طور پر جو لفظ شیو دیا ہے اس کا جمع لفظ نیم معصومہ کے ساتھ ہے اس لئے وہ جڑواں معصومہ نہیں مانا جاسکتا۔ برہ ۵۰ دو ارکان پر مشتمل ہے جس کی وجہ سے وہ جڑواں معصومہ کی حدود میں نہیں رہتا۔ مثال کے لفظ نیلا کا لفظ بھی خلافت واقر ہے۔ اہل زبان اسے نیم معصومہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر زورکی فہرست میں بعض دوسرا تیسرا اور چھ جڑواں معصومہ ہیں وہ بھی اس شکل میں جب کہ ان کا دو سرا معصومہ خفیف بولا جائے۔

پچھلے ہندی میں گئے ہیں کہ اپنے کام کے سلسلے میں انہوں نے اردو میں جڑواں معصومہ سے لاتعلقی گئے ہیں۔ صفحہ ۱۰۰ پر رقم طراز ہیں۔
'DIPHTHONG' یہ دو معصوموں سے مل کر بنتا ہے۔ مثلاً
پائے۔ لائی۔ پیو۔ یوئے۔

ظاہر ہے کہ جڑواں معصوموں کے لئے بعض دو معصوموں کا اتصال کافی نہیں۔ پھر جڑواں معصومہ نہیں کیونکہ اس میں انگریز [ی] شامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ دور کئی لفظ ہے۔
اردو کے جڑواں معصوموں میں ایض بہت کم لفظ ہیں آتے ہیں اور بعض زیادہ ہیں۔ ذیل میں اول اہم اور پھر فراہم جڑواں معصوموں کا شمار کیا جاتا ہے۔

- ۱۔ ائی سیدہ بڑھی۔ قیاض۔ لفظ کے درمیان میں اس کے بعد ہمیشہ تازیہ آتا ہے۔
- ۲۔ ائے گئے۔ کون پوتلے حریف نے مروا لگی عشق
- ۳۔ او گو۔ کو۔ آمل۔ لفظ کے درمیان میں اس کے بعد ہمیشہ تازیہ آتا ہے

۱۔ اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

برخاست صوتیات قریر اردو تقریر مثال

- ۴- a i آئی ٹائی پڑھائی آئیے
۵- a e آئے غارہ۔ راتے۔ بانگاہ
۶- a n اُوں ناؤ۔ گھاؤ
۷- a u اُوں تاد۔ جڑاؤ۔ مکاؤ یہ جڑواں معصوتہ
غنائی شکل میں اندوک کے متعدد افعال میں
آتے ہیں۔
۸- o i اُوئی کوئی۔ روئیے
۹- o e اُوئے روئے۔ سوئے
۱۰- o u اُوڈ کھوڈ یہ جڑواں معصوتہ غنائی شکل میں
متعدد افعال میں آتا ہے۔ سلاو۔ بیٹیتے
اس کا مستقل شاذ ہے۔
۱۱- u i اُوئی چھوئی صوفی تقریر میں اس جڑواں معصوتہ
کا پہلا معصوتہ طویل لکھا جاتا ہے لیکن
بولنے میں اکثر شینیت ہی بولا جاتا ہے۔
اندوک کے پیرامی کم وائی ہوتے دے جڑواں معصوتے یہ ہیں:
- ۱۲- e i اے ی کیوں
۱۳- e n اے ڈ کیوں سیٹو
۱۴- e u اے ڈ جنیو
۱۵- e e اے اے رو پیے (RUPEE)
۱۶- u i اُوئی کیوں۔ ڈوئی

مندرجہ بالا مثالوں پر پیش محضر کو شہر ہو سکتا ہے کہ ان آخری
معصوتہ خفیف نہیں طویل بولا جاتا ہے۔ تاہم یہ کہ یہ الفاظ دونوں طرف
اداکے جا سکتے ہیں۔ اگر آخری معصوتہ طویل ہے تو جڑواں معصوتہ یاتی نہیں
رہتا۔ جڑواں معصوتہ کا تلفظ معصوتی خوشے سے کہیں زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔
ایلی زبان روانی سے ہوتے ہیں اس لئے اکثر مندرجہ بالا جوڑوں کا آخری
معصوتہ خفیف ہی بولا جاتا ہے۔ شہر میں یہ پہلو جو بقی واضح ہو جاتا ہے
اُوئی۔ اے اے اور اُوئی کے علاوہ باقی جوڑوں کا آخری معصوتہ طویل کر
باندھا جائے تو کچھ غیر فطری سا معلوم ہوتا ہے۔

پیرامی جڑواں معصوتوں میں سے پہلے چار کا وقوع آغاش :
ہے کہ اوپر جو مثالیں درج کی گئی ہیں۔ فی الوقت ان کے علاوہ اور کوئی
لفظ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ اے i اور اے u میں کوئی
بنیادی فرق نہیں۔ مہی الفاظ بعض اوقات ایک طرح اور بعض اوقات
دوسری طرح بول دئے جاتے ہیں گویا یہ دونوں جڑواں معصوتہ ایک طرح
سے آ زادانہ تیز ہیں۔ بولنے میں ہوسکتی کی خاطر اے u کو تیز
دی جاتی ہے۔ معصوتوں کے برعکس جڑواں معصوتوں کی تعداد میں کوئی
تخلیص نہیں۔ اندوک بعض علاقوں اور بعض محضرت کے تلفظ میں کچھ
اور بھی جڑواں معصوتے ہو سکتے ہیں لیکن کھڑی بولی کے علاوہ یہیں
مندرجہ بالا جڑواں معصوتے ہی سنتے ہیں آتے ہیں۔ یہ ظاہر کر دینا بھی
مناسب ہو گا کہ اردو میں ہندی کی نسبت جڑواں معصوتوں کا رواج
کم ہے۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اردو کا زیادہ عزیز نہیں۔

گیوں۔ کھاؤ۔ اچھاؤ۔ کھوڈ۔ بر دیکھاؤ۔ کھوڈا۔

جڑواں معصوتوں میں سے بیشتر غنائی شکل میں بھی ملتے ہیں۔
غنائیت جڑواں معصوتے کی ابتداء کے بعد بقیہ تمام جزو طاری رہتی ہے
ذیل کے جڑواں معصوتے غنائی حالت میں ملتے ہیں۔

- ۱- آئی کیوں
۲- آو مائی ع غمیں اور آئیں چاندنی راتیں دیروزن
فلن فلن نقل فوسن
۳- آئی ع آئیں بہت دنیا میں بہت رہی
۴- آے کچھ کائیں کائیں کر ہی نہیں
۵- ان کیمیا بھیچے چھوڑے گاؤں کا نام
۶- او بیتا ہوں دھوکے خسرو شیرین سخن کے پاؤں
۷- اوں تھے ایک اک کو کونو، کر
۸- او تیں کو ہر دو روئیں جو ذوقِ نخرے
۹- اوں تیرا ہوں دل کو روئوں کے پتیل بگر کوں
۱۰- اوں ہوئیں

۵:۷ شیخ روڈ - ہند روڈ

ان میں سے نمبر ۱۶ اور ۱۱ بہت کم نفلوں میں ملتے ہیں۔
 جس طرح دو معرکوں کے وصل سے بڑوں ممتوہ بن جاتا
 ہے، اسی طرح ایک معرکے اور نیم معرکے [و] کا وصل بھی جیسوڑوں
 ممتوہ سے باطل ہوا کرتا ہے۔ اصلاً حائیں جڑوں ممتوہ
 نہیں کہہ سکے کیونکہ DIPHIHONG دونوں اجزاء ممتوہ ہوتے
 ہیں لیکن ذیل کی صورتوں میں نیم ممتوہ بھی ہو گی کام انجام دے رہا
 ہے۔ اس موقع پر موصوتائی تقریر میں [و] کے لئے مملہ کی بجائے
 لکھنا زیادہ مناسب ہے۔

تیار	aiga
یاقب - قوم	aigu
اول	auwa
کوا - قوال	auwa
آئے	aixe
وہائیاں	aigya
بجایو	aigo
روئے	oigae
چرہ گئی	oigya
چرہ مگھو	oigyo
سویاں	u:igya
خوشوئیں	u:igyo
معتیں	u:igye
گوئیے - رو	awagie
روتہ - گویا	awagig
گوئیں	awagiy

ا: ۱	شیر	۱u:	شیر۔ رُوت۔ رُوت
۱a	اعادہ	۱a:	آئینہ۔ آئی
۱e	کھئی	۱e	آئے
۱a	میاد	۱o	آؤ
۱o	کھو	۱u	ناؤت۔ کاؤس
۱u:	جنو	۱a	سحق۔ حملق
۱a	واقتہ	۱o:	کوئی
۱a	یامہ۔ واقعہ	۱e	روئے
۱a	ریحان	۱o	سوؤ
۱a:	واقعی۔ حیدر۔ گئی	۱u:	روؤں
۱a	معا۔ گفت	۱u:	مئیں۔ پئی
۱a	سوات۔ مہاذاشد	۱e	پئے۔ کئی۔ پائی۔ چئے۔ گا
۱a	مواشانی	۱a	مہاشرے۔ مہادرہ

قومی اتحاد آزادی سے پہلے

اس صدی کے شروع میں جب میں نے لکھنؤ میں ہوسٹس سنبھالا تو دہرہ کے مروجہ پرمسلمانوں کی طرف سے برہمن کو پسپاؤ پر ہنسا کر شریعت تقسیم ہوا کرتا تھا اور عشرۂ ہوم کے روز ہندوؤں کی طرف سے سبیل لگتی تھی۔ یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن نفسیاتی پہلو رکھتی ہے، ایک ذہنیت کا پتہ دیتی ہے یعنی ہندوستان کے غیر میں رواداری سے ظاہر ہے کہ مسلمان رام چندری کو جھگڑائی نہیں مانتے اور کہ بلا کا واقعہ ہمارے ملک میں نہیں ہوا لیکن مسلمانوں کو ہندوؤں کی اور ہندوؤں کو مسلمانوں کی دل جوئی مقصود تھی اس لئے یہ پسپاؤ اور سبیل لگتی تھیں۔ اتحاد اور ادغام کا فرق سمجھ لینا چاہیے۔ ادغام میں جدا نہ رہتی باقی نہیں رہتی لیکن اتحاد میں جدا گانہ وجود باقی رہ جاتا ہے۔ اس کو کثرت میں وحدت کہتے ہیں۔ قومی اعتبار سے ہم ایک ہیں لیکن زبانیں الگ ہیں، صوبے الگ ہیں، رسم و رواج بہت کچھ الگ ہیں، مذہب الگ ہیں پھر بھی یہ علیحدگی اس یک جہتی میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ہندوستان میں یونانیوں کے آئے سے پہلے کا زمانہ تو عام طور پر زمانہ قبل تاریخ سمجھا جاتا ہے پھر بھی جھگڑاؤں بدھ اور جھگڑاؤں ہمارے عیسائی کے نام اس زمانہ سے پہلے کے ہیں۔ انھوں نے مروجہ دیرک دھرم کی بہت سی مدرج یا توں اور مقتصدوں سے اخلاقت کیا لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ جھگڑاؤں بدھ کی مورتی دلی کے لکشی نارائی مندر میں موجود ہے اور خود بدھوں کے سیسیا یا ذرت پر ہندو دھرم کا بہت اثر تھا۔ اس طرح امتداد زمانہ سے جینیوں

اور ہندوؤں کے اخلاقات بہت کم ہو گئے اور اب تو ان میں آپس میں شادی بیاہ بھی ہونے لگے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہندوستان میں ان کی آمد ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی لیکن عربوں کی آمد اس سے بہت پہلے کی ہے۔ کیونکہ دکنی ہندوستان کے علاقہ سے اور عرب سے وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ اس لئے مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو اس وسیع ملک کے ایک حصہ کے لوگ عربوں سے ماؤس ہو چکے تھے۔ اس طرح آٹھویں صدی عیسوی میں جب پارسی ہندوستان میں آئے تو وہ بھی بالکل غیر کی طرح ہندوستان میں نہیں آئے کیونکہ صدیوں پہلے سے ایرانیوں کی آمد ہندوستان میں جاری تھی۔ عیسائیوں کے قافلے بھی ہندوستان میں یورپ سے بہت پہلے آ چکے تھے۔ جو عیسائے ہندوستان میں مغربی ملکوں کے ذریعہ آئی وہ تو بہت لمبی اور تدریج سے محفلت چیز تھی لیکن حضرت عیسیٰ کے وطن سے براہ راست عیسائیت تو ہندوستان میں بہت پہلے آ چکی تھی۔ یہ میں نے ان مذہبوں کا ذکر کیا جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی زمانے تک تھے۔ سکھوں کا مذہب تو ہندوستان میں ہی پیدا ہوا اور گرو نانک کا جو مشی پذیر رہو میں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا اس نے سترھویں صدی عیسوی میں گورو کو بند سنگھ کے زمانے میں مذہب کی صورت اختیار کی اور یہ میرے ہوسٹ کی بات ہے کہ پنجاب کے گھڑیوں میں اکثر خاندان تو ایسے تھے

جو کھر میں سب سے پہلے پیدا ہوئے وہ نے لڑکے کو تو مسکند بنا دیتے تھے باقی ہندو رہتے تھے۔ مطلب کہ سکھوں اور ہندوؤں میں کوئی مخالفت نہ تھی۔ ایک دوسرے کے یہاں آزادی سے شادی بیاہ ہوتے تھے۔ اس اتحاد نے عملاً کیا صورت اختیار کی اس کے چند نئے عرصے کرتے ہیں۔

جین اور بدھ و ہرم کے عروج کے بعد جب دوبارہ ہندو دھرم کا عروج ہوا تو برہمن دھرم کے زمانے میں تاریخی کی کتابوں میں ایسا آتا ہے کہ وہ ہندو اور بدھ دونوں عقیدے رکھتا تھا۔ اور آج ہندوؤں میں اس کے پائندوں میں انسا کا جو بہت ذکر ہے یہ اُنھیں دونوں کا اثر سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے ایک زمرہ مشترک تمدن کی بنیاد پڑی جس کا سب سے بڑا یا سب سے پہلا علمبردار حضرت امیر خسرو کا جانا جاتا ہے۔ مسند میں مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں بسنے لگے تھے جہاں چرند و پھل وہ زبان ہے جو سب سے پہلے خط نسخ میں لکھی گئی اور سندھ میں ایسے بہت سے صوفی ہوئے جنھوں نے مخالفت اور جنگی کام پر چار کیا۔ آج تک سندھی بلا تفریق ہندو مسلم ان صوفیوں کے گیت گاتے ہیں۔ پنجاب میں کیا رھویں صدی سے مسلمانوں کا تسلط تھا وہاں مشترک تمدن کا سب سے بڑا علم بردار دودھوں کے جہد میں پیدا ہوا۔

یہ گردنا ملک تھے جنھوں نے فروعات دین کے متاع میں اصول دین پروردہ دیا۔ انکی عقیدت ہندوؤں میں بھی مقبول ہوئی اور مسلمانوں میں بھی۔ اس سے قبل ہی آریہ پیش میں جنگت کبیر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھگت اور نیک عمل کی عقیدت کی۔ اگرچہ کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی لیکن ان کا وہ کام جس میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پیش دیا کہ وہ ملی جل کر رہیں فروعات پر دوزخ دہی بلکہ یہ سب کے احوال کو نظر میں رکھیں اور ان کے مخالفت عمل کریں۔ آج بھی زندہ ہے۔ اگرچہ سکھوں کی طرح شیعہ ایک علیحدہ مت کی صورت میں قائم ہو گیا لیکن آج بھی دیہات اور شہروں میں لاکھوں ہندوستانی اس کے دوہے شوق سے گاتے ہیں اور جا بجا ہمیں یہ سنائی دے سکتا ہے کہ

بھرا کھنڈا ہزار میں سب کی مانگے غیر

نالا ہو سے دوستی نہا ہو سے غیر

مغلوں کے دور میں اس اعتبار سے کبیر کا زمانہ زریں دور کہا جاسکتا ہے۔ اگر کے دربار میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب مذہبوں کے علماء جمع ہوتے تھے اور فوجی ٹکٹوں کی تفریع کرتے تھے۔ آئین اگری کو پڑھیے تو اس سے وہ وسعت خیال ظاہر ہوتی ہے جسے انگریز مورخوں نے پوری طرح اُجاگر نہیں کیا ہے۔ یہ رجحان آرٹ میں جو سنل آرٹ کا رنگ نظر آتا ہے یہ سولہویں صدی عیسوی کے اس مشترک تمدن کا نشان سمجھنا چاہیے نہ صرف معنوی میں بلکہ موسیقی میں بھی یہی بات ہے۔ خیال کا گانا سیکڑوں برس سے ہندوستان کے بچے گاتے ہیں شامل ہے۔ نغف خیال کا مسرتی کا لفظ ہے جو خاکس سے ہوتا ہوا ہندوستان میں آیا۔ بچے گاتے دانی کے خیال سے خلعت وہ خیال بازی ہے جو نیم تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہے جس میں موضوعات حاضرہ مزیک لا کر شاعری کی جاتی ہے۔ اور ہزاروں انسان سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ یہ خیال کے اکھاڑے کہلاتے ہیں اور ان میں یہ کثرت ہندوؤں کے شاگرد مسلمان اور مسلمانوں کے شاگرد ہندو نظر آتے ہیں۔ ٹھہری کالا گانا بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول ہوا۔ مذہبی کی اس صنعت کا فروغ دربار اور دھرم میں قواب واجلی شاہ کے دور میں ہوا۔ خود واجلی شاہ غمگینان کہتے تھے جو نگر آخر کھنڈ کرتے تھے اس نے انھوں نے طہریں میں اترتیا کا نام ڈالا ہے۔ قدر پگڑائی سے قدر بیا کے نام سے طہریاں کہیں اس طرح داد را بھی گانے کی وہ صنعت ہے جس میں پنج پنج میں دہے بھی ہوتے ہیں اور اشار بھی۔ دلی میں مورشاہ رنگینے کے زمانے میں نکانے کی کئی فیتیں ایسی نکلیں جو اب تک رائج ہیں۔ جیسے آسان سن نے اگری کے زمانے میں کئی رنگ اکیاد کے متھے یعنی جہاں تک موسیقی اور معنوی کا تعلق ہے یہ دونوں فن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا یہ غیری نہیں بلکہ باعث بھی ہوئے۔ آج بھی کو قوالی کی مجلسیں کتنی کامیاب ہوتی ہیں جن میں ہندو، مسلمان اسکے سبب لطف لیتے ہیں اور امام رحیم کرشن کریم وغیرہ سے خلعت استعمال ہوتے ہیں۔ کبیر کا بھی ذکر آتا ہے اور نسبت خاز کا بھی۔

جہاں تک لباس کا تعلق ہے نہ قدیم ہندوؤں کی ویشاک ہی اپنے اصلی روپ میں رہی اور نہ مسلمانوں کی ہی۔ انگرکھا جو عام طور پر

اسلامی لباس بھی جاتا ہے۔ ہندی لفظ ہے جو اگت اور رکھا دونوں کا مرکب ہے۔ داڑھی رکھنا بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسان راغ قائم ان کے بزرگ تو دونوں ہی فرقوں میں داڑھی رکھتے تھے۔ ہندوؤں کی جو عظیم سستی مسلمانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ جگن کرشن کی تھی اور مسلمانوں کی جو عظیم ہستی ہندوؤں میں قابل احترام بھی گناہ حضرت حسین کی تھی۔ چنانچہ ظفر علی خاں، اہلسیاد خاں چوٹی، حضرت خوش بخت آبادی، سیاب اگر آبادی، ذاب سائل بدوی، حضرت آغا شاعر سب سے کرشن جی پر نہیں کھی ہیں اور ہندی میں تو نورس خاں نامی چٹان نے رس کھانے کے نام سے ایسی نہیں کرشن بھگتی پیگھی ہیں جو دوسریوں سے زیادہ عمر گزارنے کے بعد آج تک بڑے پریم سے لگاؤ کا حق ہیں۔ اسی طرح حضرت حسین کی شان میں نام کہنے والے ہندو بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ حضرت عسکرم جملوں میں اور جمل کے موثق پر ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ خضیکہ سوسیتی ہوا یا معصومی، افذا ہوا یا پوشاک، تو ہار ہوا یا تقریبات ہمارے ملک میں سینکڑوں برس سے ایک مشترکہ تہنہ چلا آتا ہے جو مختلف فرقوں کے بزرگوں اور اکابر کی میراث ہے اور ہے وقتی ہنگامے سے متا نہیں سکے۔

جہاں تک مذہب کے درمیان کا تعلق ہے معلوم ہیں آج سے پچاس سال پہلے یعنی پہلی جنگ عظیم سے قبل تک جو بزرگ ہوتا تھا وہ سارے حملے کے فوجاؤں اور لڑکوں کو اپنی ڈانٹ میں رکھتا تھا۔ ایک بوڑھے پنڈت جی اگر کسی مسلمان بڑے کو ڈانٹ دین تو کیا مجال کہ اس کے والدین زبان کھولیں یا اگر حملے کے مولوی صاحب کسی ہندو لڑکے کی تادیب کریں تو اس کے ماما پست بھی اٹھ اٹھتے تھے۔ البتہ ۱۹۱۷ء میں جنگ عظیم متروک ہوئے کے بعد ہندوستان کے دیہات اور پرانی بستیوں پر جو اثران فوجاؤں کا چڑا جو دوسرے ملکوں یا غصوں مغربی ملکوں سے واپس آئے اور جو دہان کی زندگی کا ذوقی پہلو دیکھ کر آئے اس سے سماجی زندگی پر اثر پڑا۔ مزارکوں میں ماسٹروں کا وہ رعب رہ گیا نہ ملکوں میں بزرگوں کا اور نہ گھروں میں والدین کا۔ دوسری جنگ عظیم نے اسے

اور بھی کم کر دیا۔ اب تو ایک جہتی کی صورت شخصی آزادی دنیا پر نہیں رہی بلکہ سماجی زندگی کی صورت میں بھی ۱۹۳۷ء میں جب مختلف قوموں میں تو قی حکم متین قائم ہوئیں تو بے پروگرام شروع ہوئے جس میں نسل، رنگ، مذہب و ملت اور ذاتیات کی کوئی تفریق نہ تھی مثلاً دیہات میں اگر تقریری کام متروک ہوا تو اس میں اس دیہات کے رہنے والے بلا امتیاز شریک ہوتے تھے۔ شہروں کے کچل پروگرام میں بھی یہی بات تھی، کلب کی زندگی کا بھی یہی مقصد تھا۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کچل پروگرام اور کلب کی زندگی میں صرف بالائی طبقہ یا متوسط سے کچھ بلند درجے کا طبقہ شریک ہوتا تھا جبکہ ان گاؤں کی محفوں میں جو کچھ یاوں پر ہو تو حقین بے پڑے کئے عوام جن کی ہندوئیں میں اکثریت ہے کرشن سے شریک ہوتے تھے اور شریک ہوتے ہیں۔

موجودہ صدی میں ہی بتی نے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور دیا وہ ہما تھا کا مذہبی تھے۔ انھوں نے ایٹرو انڈیز سے نام سب کو کشتی سے بھگنوں کا فائدہ لے لیا ہے لاکھوں کروڑوں انسانوں نے دہرایا۔ آج اگرچہ وہ ہستی ہمارے درمیان میں نہیں ہے لیکن اس کا یہ سن کر نہ صرف ہمارے ہوتے ہیں تمام مذہبوں کی یکساں عزت کرو، ہمارے ذہنوں پر محو طے بھی کچھ وہ دماغ کی کسی تہہ میں دب کر رہ جاتا ہے لیکن پھر اس کے نقش ابھرتے ہیں۔ تحریک خلافت اور کانگریس میں سترہ گروہ کی قریب و فوں کی ہٹائی ہما تھا کا مذہبی نے کی اور انھیں ملیعت افلاحت کر گیا لیکن ہمیں وہ مولانا عبدالباری کے یہاں فریض علی میں ٹھہرتے تھے۔ تحریک کے دؤں میں جب وہ دودھ کرتے تھے تو ان کے ایک طرف مولانا محمد علی اور دوسری طرف مولانا شوکت علی ہوتے تھے۔ انھیں کے ان کا یہ نتیجہ تھا کہ دنی میں جب گور رکھنا سمیلوں ہوا تو اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی کبھی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور ڈیٹر حکیم املا خان صاحب تھے۔ انھیں کے پیرو خاص پنڈت جواہر لال نہرو اور آچاریہ دتو جی ہما سے اپنے اپنے اٹار میں اس کا پرچار کر رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ سن سیاسی میدان میں تو ہما تھا کا مذہبی سے ملا لیکن ان کے والد ماجد پنڈت دتو کی لال نہرو سے گھر پر ہی انھیں ایسی ابتدائی تربیت دی کہ وہ ایک اور ایک جہتی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ (بہ شکریہ اہل انڈیا ریڈیو)

غزل

کس قدر سوز تمنا ہے جو اُن پچھلے پہر
روحِ احساس بھی ہے شعلہ بجاں پچھلے پہر

وقتِ تمنا بھی نہیں اور گزرتا بھی نہیں
ہے عجب چیز ہسانِ گذراں پچھلے پہر

لفظ و آواز کی سرحد سے گزر کر دیکھا
چاندنی رات بھی کرتی ہے فغاں پچھلے پہر

تڑپ اٹھتا ہے زمانہ مری خاموشی پر
عام ہوتی ہے محبت کی زباں پچھلے پہر

دھڑکنیں دل کی سناتی ہیں فسانہ یترا
کس قدر ہے مرا احساسِ جواں پچھلے پہر

جیسے ہر چیز سے اٹھتا ہے دھواں پچھلے پہر
جیسے ہر قدم پر ہے فرقِ دو جہاں پچھلے پہر

ٹل گیا مجھ کو مرے ذوقِ پرستش کا مصلہ
دل سے کیا کہتی ہے چشمِ نگراں پچھلے پہر

ہر تمنا کو ہے خوابوں کے جذبے کی تلاش
قلعے کا نبِ منزل ہیں رداں پچھلے پہر

روح میں تیرے یادوں کے نشترِ حرمت

ہو گیا اور سوا درِ ہسان پچھلے پہر

حافظ عبد الرحمن خاں احسان

ذکر کرتے ہیں۔ قاسم نے احسان کے آباد اجاد کے علم و فضل کی تھوڑی سی تفصیل دی ہے۔ ان کا سن ولادت قاسم یا کریم الدین کسی نے بھی نہیں لکھا۔ تاہم منشی کریم الدین کے ایک بیان سے ان کے سن ولادت کا پتہ چلا یا جاسکتا ہے۔ ۱۸۴۷ء میں احسان کے حالات لکھے ہوئے وہ ان کی عمر اسی برس بتاتے ہیں۔ اس حساب سے ان کی ولادت کا سن ۱۷۷۷ء قرار پایا ہے۔ قاسم کے تذکرہ کی ترتیب کے وقت (۱۸۷۷ء) میں ان کی عمر اڑتیس اسیالیس برس کی تھی۔ چنانچہ قاسم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:-

”جولے است متین بالکین، خوش اخلاق،
کشادہ پیشانی سراپا محبت، سرسبز پرانی“ ۱۷

احسان دہلی کے قین مگروں، شاہ عالم ٹاؤن، اکبر شاہ ٹاؤن اور بہادر شاہ ظفر کے درباروں سے متوسل رہے۔ دوسری رام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر شاہ کے دربار میں شاہ نعیر سے ان کے ملازمت بھی ہوتے تھے۔ منشی کریم الدین کے بیان کے مطابق احسان نے شاہ عالم کے ہرے شاعر شروے کی۔ ”قیامت شرعاً بند“ کی ترتیب کے وقت تک ان کے علم و فضل اور شریکسات کی شہرت عروج کو پہنچ چکی تھی۔ وہ پائختہ کے سربراہ اور شاعر میں گئے جاتے تھے اور ان کے علم و فضل اور شریک کمالات کی بنا پر بادشاہ نے انھیں ہنزادوں کا اتنا مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۷ ہشت شاعر ہند ۱۷۶۶ء جمود نوز، ۱۸-۱۹ء ۱۷ تھاؤ چادو، ۱۷۶۷ء ۱۷۶۸ء

حافظ عبد الرحمن احسان شاہ عالم ٹاؤن (۱۷۶۷ء تا ۱۸۰۷ء) کے ہند کے ممتاز اور ستم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں شاہ عالم کے دربار میں بڑا سونہ حاصل تھا اور شاہ عالم ان کے علم و فضل اور شریک کمالات کے بعد معرفت تھے۔ ان کی بدیم گوئی اور نوز گشتاری کا بڑا شہرہ تھا۔ لیکن یکے کے زمانے میں ان کے کلام کو وہ شہرت حاصل نہیں رہی جو ان کی زندگی میں تھی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کا دیوان چھپا نہیں اور اس کے محفوظ عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی شہرت کو ان کے علم و فضل کی شہرت نے مانڈ کر دیا۔ احسان دہلی کے ایک عالم اور متقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد میں اکڑ حافظ قرآن، علم دین کے مستند عالم اور فقہ کے ماہر گزرے ہیں۔ ان کے والد کے بارے میں قدت اللہ قاسم نے لکھا ہے:-

”پندش پر امامی حضور دلا عزت امتیاز داشت و
بود روح و قوی بقدر رحمتی گماشت“ ۱۸

قاسم نے احسان کے والد کا نام نہیں لکھا، لیکن نثار نے ان کا نام حافظ غلام رسول خاں بتایا ہے۔ احسان قاسم کے نو عمر مامری ہیں تھے۔ منشی کریم الدین نے بھی اپنا تذکرہ ان کی زندگی میں لکھا تھا۔ انھوں نے بیڑی عراقی اور کشمیری کے زمانے تک بھی زندہ رہے۔ اس کے باوجود ان کے حالات کسی نے تفصیل سے نہیں لکھے۔ منشی کریم الدین ان کے حالات لکھتے ہوئے زیادہ تر ان کے علم و فضل اور شاعری کے بارے میں ان کے تعلق کا

۱۸ جمود نوز، ۱۹-۱۷ء عطا متی شراہ وصلہ

دہلی کے اکبر امرا اور شجاعی انجین ایتنا کام دیکھتے تھے کہ انہیں کے بیان سے ہم کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ آستان شہر کے مزدبیں شہار ہوتے تھے۔ ان کے تذکرہ کا اقتباس درج ذیل ہے :-

”یہ صاحب بڑے پرانے استادوں مسلم اثبوت

شاہ جہاں فرزندہ بنیاد اور عمود اور امیروں

اس شہر لطافت بحرے شہار کے جاتے ہیں۔“

فنی کریم الدین نے آستان کو شہزادوں کا استاد بتایا ہے لیکن شہزادوں کے نام نہیں لکھے۔ نسخہ نے ان کے شاگردوں میں شہزادہ مرزا فرخندہ بخت کا نام لکھا ہے۔ دوسری رام نے مرزا صابر اور مرزا ثابت کا نام لکھا ہے۔ استاد بتایا ہے لیکن مرزا ثابت کا نام انھوں نے نہیں لکھا۔

مرزات ثابت کا نام مرزا الدین تھا اور وہ شاہ عالم کے چھوٹے فرزند تھے۔ وہ آستان کے شاگرد تھے اور ان کا دیوان انھوں نے ہی مرتب کیا تھا اس دیوان کے اب کیا ہیں۔ میرے علم میں ہیں محفوظ طور پر آگے ہیں، جن میں سے ایک سالار جنگ کے کتب خانہ رحید آباد میں محفوظ ہے دوسرا جمن لائبریری پٹنہ میں اور تیسرا انڈیا آفس کے کتب خانہ لندن میں۔ مرزات ثابت کے دیوان پر ایک بسیط دیا چھپی لکھا ہے، جو کئی اعتبارات سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے حافظ عبدالرحمن کی شاعرانہ صلاحیتوں پر بڑی عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اس شاہ عالم کی شہری محفلوں کے بارے میں بڑی اہم، دل چپ اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مرزات ثابت کا آستان سے تلمذ ایک دل چپ سلسلہ واقعات کا نتیجہ تھا۔ مرزات ثابت کہیں سے شاعری کا شوق تھا اور اردو اور فارسی دونوں زبانیں خیر کھنجا جاتے تھے۔ انھیں اس بات کی کوئی شک نہ تھی کہ ان کو کوئی ایسا استاد مل جائے جو شہر کے فنی ماہر ہو اور مسلم اثبوت استاد کا درجہ رکھتا ہو۔ اپنے والد شاہ عالم کی شہر دشمنی کی محفلوں میں وہ خیر ایک ہوا کرتے تھے۔ شاہ عالم کی شہری مجلسیں مجلس خاص کے نام سے موسوم تھیں ان کی تفصیل مرزات ثابت نے لکھی ہے کہ جب سب برائی دیوان عام سے

لے جاتے، اشتراک ہندہ ص ۳۵۶ شہر نما ۱۵۱ ص ۵۱

تہ عسکریات و دواہی شہر، ایکیناگ، بوم، بارٹ

سلام کر کے رخصت ہو جاتے تو شاہ عالم محل میں آ جاتے اور کھانے سے فارغ ہو کر دیوان خاص میں استراحت کی غرض سے آتے۔ اس موقع پر کئی عامین اور حافظ عبدالرحمن آستان ہوتے۔ شاہ عالم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شہرکتے تھے۔ جب وہ محفل خاص میں آتے اور کوئی شہریا معمر مودوں ہو جاتا تو حافظ عبدالرحمن کو سناستے بعض وقت صرف ایک معمر مودوں ہو جاتا اور دوسرا معمر مودوں ان کے ذہن میں دہاتا تو حافظ عبدالرحمن سے دوسرا معمر مودوں تلاش کرنے کی فرمائش کرتے۔ اس موقع پر حافظ عبدالرحمن جس سرعت کے ساتھ معمر یا خرمودوں کر لیتے، اس کے بارے میں مرزات ثابت لکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تو کیا پہلے سے ہی ہوتی مزل کے خرمین، جنہیں وہ سنا رہے ہیں۔ حافظ آستان کی اس سرعت فکر اور سحرزد مافی سے شاہ عالم بہت متاثر تھے اور ان کا بڑا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ انھیں ’حافظ جی‘ کہہ کر مخاطب کرتے اور اپنا استاد کہتے تھے۔ محمسن آزاد نے شاہ عالم کو مرزا سودا کا شاگرد لکھا ہے، لیکن حافظ عبدالرحمن کی طرف انھوں نے یا کسی اور تذکرہ نگار نے اشارہ نہیں کیا۔ مرزات ثابت لکھتے ہیں کہ :- ”الغرض ان ایشاں را استاد خود میفرمودند“

آستان سے مرزات ثابت کی ملاقات پہلی دفعہ اسی مجلس خاص میں ہوئی۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو تفصیلات لکھی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ فارسی اور اردو میں اچھی مہارت پیدا کر چکے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ مجلس خاص میں موجود تھے، شاہ عالم نے ایک معمر مودوں ہوا تھا پڑھا۔ معمر مودوں :
مجھ جی یوسف تو دیتا نہیں اسے ماہ بچے

دوسرا معمر مودوں سوچو نہیں رہا تھا۔ انھوں نے حافظ جی سے معمر مودوں کی فرمائش کی۔ آستان نے فی البدیہہ معمر مودوں پڑھا :

تا مناسب ہے میں وقت سحر گاہ نہیں

مجلس میں اس وقت ابو محمد خاں داندہ قاضی، اور نور علی خاں داندہ توشکی خاں جہادی حاضر تھے۔ انھوں نے خوب دادیں دیں۔ لیکن مرزات ثابت اس معمر سے مطمئن نہیں ہوئے اور یہ اعتراض کیا کہ اس معمر میں ”وقت“ اور ”گاہ“ دونوں ہی واقع ہوئے ہیں۔

دئے۔ اب کی پارتا بیت بھی قریب کے بغیر ذرہ کے اور کہا "استادوں کیلئے
ہی کو ستر اور بارہے جو اساتذہ کے کلام کا اس قدر متبع ہو۔" اب احسان
کے لئے اسناد کی کمکتہ بتانے کا موع بھی کیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "یہ درست
ہے اور اگرچہ میں نے بھی کہا ہے اور صاحب مجھے زبردست شاعر کی سند
موجود ہے، لیکن میرے نزدیک بغیر اضافہ کے ایسے اشعار تہہ فصاحت
سے گرسے ہوئے ہیں۔"

اسی مجلس خاص سے متعلق حافظ جو کے مستقر دماغ کا ایک
اور واقعہ بھی مرثا ثابیت نے بیان کیا ہے۔ بادشاہ نے یہ معرکہ فادسی میں
موتوں فرمایا تھا "تھا یا ذرا دم سوا تو کہے را" لیکن "سوا تو" کی ترکیب
پر انھیں شبہ تھا۔ استاد سے پوچھا "سوا تو" درست ہے یا نہیں؟ دوسرے
لوگ جو حاضر تھے کہنے لگے۔ "لفظ "سوا تو" صحیح ہے۔" اس پر بادشاہ
نے فرمایا۔ "میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔" حافظ جیسے کہا۔ "پیر و مرشد
درست ہے۔" سندیں شاقی کلکاپایہ شریعہ اے۔

من جان دم بکس سوا تو
تو دل نہ دی بکس سوا من
صاحبزادہ کی طرف سے اس پر جو اعتراض ہو سکتا تھا وہ ان کے ذہن میں
تھا، چنانچہ مرثا ثابیت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگرچہ یہ بھی درست ہے
لیکن میرے خیال میں فصاحت سے بعید ہے۔"

حافظ جیو کی طبیعت کے اس استحضار سے مرثا ثابیت کو استنا
متاثر کیا کہ وہ احسان کی شاکردی اختیار کرنے پر مائل ہو گئے اور ان
سے کہا۔

"دل میں خواہد کہ شرفا رسی درخت ہر دو گھنٹہ باشم"
فارسی شاعری کا ذوق اب تک الگ زمانہ کی یادگار کے طور پر باقی
تھا، لیکن احسان یہ جانتے تھے کہ اب فارسی کا دور در درختم ہو چکا ہے
اور ادھر سے بگے بڑھ رہی ہے اور فارسی کی جگہ لے رہی ہے
انھوں نے فرمایا۔

از جہدہ فادسی برآمدن خیلہ و خوار است۔ اشعار
درختہ فروودہ باشند کہ عز دل بیتہ اگر خوب باشند
بہتر از فارسی است۔"

یاد دہن "وقت چاہیے یا گاہ۔" احسان جیسا جہاں دیدہ اور کمزورہ کا
شاعر، صاحب زادہ کی اس حرف گیری کا کیسے متنب ہو سکتا تھا۔ انھوں نے
تہنم کیا اور کہا۔ "حضرت ابھی علم شہ سے نابینا ہیں اور یہ علم نیز استاذوں
کی مدد کے حاصل ہوتا دشوار ہی ہے۔" بادشاہ نے صاحب زادے کا اصرار
سے کہ حافظ جیو کی نائیدگی اور فرمایا۔ "حافظ جیو اپنے وقت کے استاد
ہیں نیز جانتے یہ لفظ نہیں کہہ سکتے۔" ثابیت نے پھر اصرار کیا کہ یہ لفظ
فارسی ہے جب تک ولایت کے کسی استاد نے نہ یادھا ہو، قابل اعتبار
نہیں۔ احسان نے صاحب زادوں کو مطمئن کرنے کے لئے سندیں مرثا صاحب
کا یہ شعر پڑھا۔

آدی پیر چو شد حرص جواں ہی محمد
خواب در وقت سحر گاہ گراں ہی محمد

بادشاہ کو احسان کی اسادی کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ فرمایا۔ "ہم نہیں
کہتے تھے کہ ان سے خطا نہیں ہو سکتی۔" لیکن مرثا ثابیت بھی آسانی سے
مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے عرض کیا۔ "بقدر عالم ایہ
شاعر ہیں خود تعینت کر کے بھی پڑھ سکے ہیں۔ اگر دیوان صاحب میں
دیکھ لے تو غلام کو اعتبار نہ آئے۔" اس ہٹ دھرمی پر بادشاہ
منعفی ہوئے اور فرمایا۔ "جواب جا ہاں باشد خوشی۔"

دوسرے دن احسان جب مجلس خاص میں آئے تو عیا کی گیلانی
شانی نظر اور اشرف قزوینی کے اشعار سندیں لکھ لائے اور صاحبزادہ
کو سنائے۔

ایک اور موقع پر بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔ شاہ عالم
نے فارسی کا ایک معرکہ محزون کیا تھا۔ پچھ مرثا ثابیت نے درج نہیں کیا
ہے جب احسان سے دوسرا معرکہ پکے کی فرائیگی تو انھوں نے فی البدیہہ
یہ معرکہ پڑھا۔

ذکر دم عشق کس پرگز چو من عاشق سنن باشم
اس معرکہ میں بھی استناد نہ گنتہ تھا اور مرثا ثابیت نے اسے تاثر لیا۔
بہتر سے حافظی کے کان میں کہا۔ "لفظ عاشق میں اضافت کیوں
حذف کردی۔" احسان نے پھر استناد شان دکھائی اور جواب دیا۔
"میں نے درست کہا ہے۔" اور مرثا صاحب کے تین شعر فرما دیں پڑھ

لالہ مرئی رام نے احسان کے اس قول کا آخری حصہ نقل کیا ہے
 ایک مرزا ثابت کا تذکرہ نہیں کیا۔
 مرزا ثابت نے بھی سیم خشک سنی سے استاد کا درجہ حاصل کر لیا
 تھا، اس کے باوجود احسان کے شری کمالات کے وہ ہمیشہ معزز رہے
 چنانچہ لکھتے ہیں :-

”حافظ عبدالرحمن خان احسان استاد اسی احقر العباد
 بنائے دینے انجمن دینہ اندک دو برسے ریختے
 ایشان ریختے کے دینے گو بسند خاطر آید میں شری
 سنی را اگر خسرو اعظم فصاحت و بلاغت تجویم دواست
 چون ملک سنی سنی تیرگیں دارد -“

ثابت سے ان چیزیات استقامت و تشکر کی صراحت بازگشت ہم کو احسان
 کی ایک مغزل میں ملتی ہے۔ ان کا شعر ہے :-
 غزل نہ کو کر پڑھوں دوسری کہ اسے احسان
 محکم آج ہے ثابت سا سہر بان میرا
 احسان کے علم و فضل کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، کریم الدین
 لکھتے ہیں :-

”نظر تحقیق الفاذ کی کتب درسیہ فارسی اور کچھ عربی
 پر طاری ہے۔“

مرزا محمداور الدین ثابت نے مجلس خاص کے جو واقعات ہمہ پہنچائے
 ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ احسان بڑے ماحر و مراد شاعر تھے اور
 اس تذکرہ کے بیشتر محض شرا فیض یاد تھے۔ اس کے علاوہ جنی شمس پر بھی
 ان کی نظر گہری تھی۔ اسی شاعر عالم ان سے اتنے مرعوب تھے کہ ان کے ہر
 کلمے کو سند کا درجہ دیتے تھے۔

تاکہ سیم احسان کی ملازمت کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی
 ہے، صرف اتنا لکھا ہے کہ :-

”در سلبک ملازمت پایہ تخت منسلک است“

شاہ عالم کے دربار سے ان کے لئے مشاہرہ مقرر تھا۔ ایک دو
 موقوف پر حسب مشاہرہ بروقت ایصال نہ ہو سکا تو انھوں نے تعلقات

لے تعلقات ۳۵۵

لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ایک قطعہ کے شعر ہیں :-

مید پای و مید دل مشا خوب ہے اور کچھ تہیں میوب
 جال ہوں اور شکار چھپی کا لیے ڈوبے کا ہے لانا خوب
 قلب صاحب تھے جب حضور گئے وہ دباہر ٹپ ہے میرا ڈوب
 اس کو بھی حکم ہو نکل آئے میرک تک ہو میں نہیں ایوب

احسان کے ایک قطعہ سے ہم کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ بعض محافل
 کی در اندازی کی بنا پر انھیں طعنے سے موقت کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر
 انھوں نے ایک قطعہ لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ جس کا
 اقتباس لالہ مرئی رام نے دیا ہے ۔

احسان کا تعلق شہزادہ ایزدکیش کی سرکار سے بھی رہا۔ چنانچہ
 ششی کریم الدین اور شیخہ دودن نے اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ
 کئی سال شہزادہ کی سرکاری خدمت کے کام پر مامور رہے۔ مرزا ایزدکیش
 فرخندہ بخت کے خطاب سے عن طلب اور درخانی کیش کے لقب سے مشہور
 تھے۔ احسان کے دیوان میں ایک ددغزین ایسی بھی ملتی ہے، جن میں
 شہزادہ کی مدح کی گئی ہے۔ ایک مغزل کے شعر ہیں :-

دردۃ التاج شہان فخر زماں ایزدکیش
 فخر ہے فخر تری طرح سرائی مجھ کو
 جس گھڑی ہوے گھوڑین ترادست کرم
 اتھ چھیلا کے ہے حاتم طائی مجھ کو
 ہے یہی دولت غنمی کہ میرے ہووے نصیب
 در دولت کی ترے نامہیں سائی مجھ کو
 ایک اور مغزل میں شہزادہ کے لئے دعا کی ہے :-

میرزا ششی مقمود سپہر نیلی
 تھ کو سرسبز رکھے خاق اسلام عالم
 دجہ اس نام کے رکھے کا یہ ہے تاکہ شہسا
 نیل چشم بدعا دے یہ نام عالم

لالہ مرئی رام نے احسان کے اس قطعہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو تجوڑاہ کی طلب
 میں اسی زمین میں لکھا گیا تھا جس میں غالب کا مشہور قطعہ لکھا گیا ہے۔

لہ نمبر ۱۰ ج ۱ - ۱۵۱۱ شہ گلشنیہ خار صفا

تختہ کی طلب میں لکھے ہوئے قطعوں اور غزل میں مدح سرائی کے آغاز کو دیکھتے ہوئے ایسا عروس ہوتا ہے کہ احسان کے یہاں غالب کے نقوش آواز دستیاب ہوتے ہیں۔ احسان نے طویل ہر پائی تھی اور غالب نے ان کے عروج کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ احسان اور غالب دونوں کو فارسی سے گہرا لگاؤ تھا اور یہاں تک وقتہ بستی کا تعلق ہے دونوں کی طبیعتوں میں بڑی یکساں گت پائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر غالب، احسان کے مخصوص انداز فکر سے متاثر ہوئے ہوں اور یہ اثر بیدری میں پرست نہیں ہو جاتی بلکہ غائب کے دیوان میں بعض غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو احسان کی زمیںوں میں لکھی گئی ہیں۔ ذیل میں احسان کی ایک غزل کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جس کی زمیں میں غالب نے دو غزل لکھا ہے:

ہم بھی جب مضطرب تھے، پھر یہاں سیلاب تھا
خانہ زاد اضطراب خاطر بے تاب تھا
شب عجب تھی تاں اس گلگی کی جس کے سامنے
ماو عالم تباہ بھی اک کرک شب تاب تھا
احسان کے سارے علم و فضل اور شری کمالات کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ دل سے زیادہ دماغ سے شاعری کرتے تھے۔ اپنے شعری کمالات کو ظاہر کرنے کی دھن میں وہ منتہوں کے باندھے اور لفظی رعایتوں کی نگہداشت کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ کیم الدین اور شیفتہ نے ان کی شاعری کی اس خصوصیت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ صنت تجیں، اشتقاق اور شبہ اشتقاق اور نکوار صوفی کے وہ دل دادہ تھے۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا:-

بب لب لب سے ترے جب لب پیما نہ ہوا
جان لب تہی مجھے کہہ میں ہوا یا نہ ہوا
میں تجھ بیز حیا ہل ہل کو بچی گیب
جم جم تو ہی کہ ہاں ترے باعث سے ہی گیا
کہیں کام میں وہ تو خود کام ہوگا۔ بیان کام آخر ہے وہاں کام ہوگا
کہتے ہیں دوست مجھ کو دشمن کتاب پڑھ تو
بیدا کروں ولیکن پڑھنے کی تاب کیوں کر

لفظی صنت گری اور شاعرانہ رکھ رکھاؤ سے قطع نظر احسان کے کلام میں ایسی چاندانہ خصوصیتیں کم ملتی ہیں جو اس کی حیثیت دوام عطا کر سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی فکر کے سادہ انداز کو دیکھ کر، دہلی کے اساتذہ فقیر کے کلام کا لفظ آجاتا ہے۔ مثال کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

پسینی کو ہاتھ پر رکھ کر بر نراکت۔ نو لے
ہاتھ ڈھٹے سے مرے ہاتھ کو اکثر توڑا
قدم قدم کی ترے جب تک ہے دم میں دم
میں پاؤں پر سے ترے سر نہیں اٹھا لے کا
بے تابی سے جوں مویہ سیلاب نہ بھسرا
ایک ہاتھ پر عاشق بے تاب نہ بھسرا
لگی ہیں جاتے ہو تم اس پری کے اسے احسان
گئے میں آپ کے لازم ہے مشفقاً، تعویذ

احسان کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں قنصل کی رمزیت اور صیت سے ہٹ کر انھوں نے خود اپنی ذاتی وارداتوں کو سمجھا ہے۔ ایک شعر میں اپنے سارے شعر میں اور زہد نقوی کو پالائے طاق رکھ کر: اپنے بقال پسیر کو بنیام بھیجتے ہیں،

بہرہ دو بقال پسرے کہ ہیرا دل سے کر
قصداخذ دل اغیار نہ ماں کیجئے عیا
ایک دفعہ وہ لکھنؤ بھی گئے تھے لیکن لکھنؤ کی فضا ان کو بالکل پسند نہ آئی۔ لکھتے ہیں:-

بھسرا ہے لکھنؤ کا لیکن لہو یا اللہ
موس جو دواں ہیں ان کو کبڑ نہاں میں دیکھا
دتی سے انھیں فطراً جنت تھی۔ دوسرے شعر میں وہ دلی کی توجہیت اس طرح کرتے ہیں:

دلی کے ہندوؤں میں ہیں اہل دلی ہزاروں
دلی ساہتر کس نے ہندوستان میں دیکھا
اپنے مخصوص انداز میں ایک اور شعر میں بھی انھوں نے دلی کی طرف اشارہ کیا ہے
دل سے دل پاس ہیں تو بھی بے دلوں کی خواہش
کیا دلوں کی کہیں دلی میں وکان کیجئے عیا

اس غزل کا ایک اور شعر ہے :

یار جب ساتھ سفر میں ہو کہاں کے روزے
روزہ روزوں ہی میں حیدر مضامین کیجئے گا
ایک طفل ہر کسی کا ذکر بھی ان کی ایک غزل میں آتا ہے۔ بچے رزمیت کے
پیرے میں چپانے کی گھاٹیں نہیں ہے۔ شر ہے :
اس طفل ہر کسی کی جنت میں دوستو
حاصل فرماؤ دل مجھے مشابہ نیکیں ہوا

احسان کی حیثیت کی روداد میں شبہ نہیں۔ ان کے دیوان میں اکثر غزلیں
طول ہوتی ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل پندرہ سطر کی ہے۔ دو غزل دس سطر
کچھ ہیں شاہ نعیر کو ایک نغمہ حیثیت سے حاصل ہو گئی تھی۔ احسان ان کے مامور
تھے اور وہ بھی اکثر دو غزل لکھتے تھے۔

احسان نے کچھ مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ ان کی طویل مثنوی 'یوسف نیا'
کا تذکرہ لاہری رام نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مختصر مثنویاں ان کے
کلیات میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی، احسان نے اپنے استاد
محمد تقی کے انتقال پر لکھی تھی۔ محمد تقی بڑے اچھے عالم تھے اور خاص طور
پر ریاضی میں ہمارت رکھتے تھے۔ احسان کو ان سے گہرا تعلق خاطر تھا
جیسا کہ ذیل کے اشارے سے ظاہر ہوگا :

اسے سپردِ ختمہ گر یہ ستم تو نے کیا کیا
رج و غم و اُم کا مجھے مبتلا کیا
میرا چہ سراغ دل کا ستم گر بھیجا دیا
و ا ن فراق مولوی مرثعی دیا
وہ یاد گار دورہ ماضی کہاں گیا
لہذا ماضی باغ علم ریاضی کہاں گیا

وہ عالم و محدث و حافظ کہ حیدر ہے آہ

کس طرح لکھیں آہ کہ بیٹیا جسگر ہے آہ

آخر میں وفات کی تاریخ 'تیرم الموات ان کا ہے پہلی وفات کی۔' سے
نکالی ہے۔ دوسری مثنوی میں میر محمد خاں سرور کے 'تذکرہ سرور'
کی تاریخ ترتیب لکھی ہے۔ یہ مثنوی ڈاکٹر شہینہ شکر کی نگرانی میں
مفتاخیر یونیورسٹی حیدرآباد کی نے اپنے اس مختصر مضمون میں نقل کر دی ہے
تو تذکرہ سرور کی تاریخ کی بحث کے سلسلے کے مضامین میں 'ہادی زبان'
میں شائع ہو چکے ہیں۔ کلیات میں شاہ عالم کے تحت ملاؤس کی تاریخ کا ایک
قدسی قطع بھی شائع ہے جس میں 'سریر شہنشاہ ہارون دادا سے تاریخ'
نکالی گئی ہے۔

احسان کے خاندان میں ان کے دو پوتوں اور ان کے فرزندوں کا
حال لاہری رام نے لکھا ہے ان میں سے ابو الحسن خاں دہلی میں منصف
جدہ پر مامور تھے اور لاہری رام کے دوست تھے۔

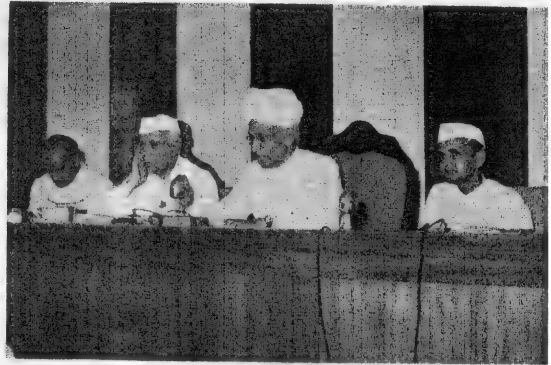
احسان کے شاگردوں کی تعداد کثیر بتائی جاتی ہے، لیکن ان میں سے
بہت کم ایسے ہیں جن کے حالات اب دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کا سبب
یہ ہے کہ ان کے شاگردوں میں عموماً شہزادے اور امراء شامل تھے۔ ان میں
اکثر شاعر کی حیثیت سے شہرت نہ پائی۔ مرزا ثابت اور مرزا ایزد بخش کے
علاوہ مرزا قادیان نے بھی شہرت پائی۔ وہ ایک تذکرہ 'گلستانِ سخن' کے تحت
تھے۔ احسان کے انتقال کی انھوں نے حبِ ذہن تاریخ بھی لکھی :

میں ہنگامِ الم میں مابہر دل گیر نے
اپنے دل کو قہام کر یا صغفم و یا صمد کیا
کی رقم اس مصلح احسان کی تاریخ وفات
دل گیا بیٹھ آہ جب عالم سے احسان اٹھ گیا (۱۲۷۴ھ)

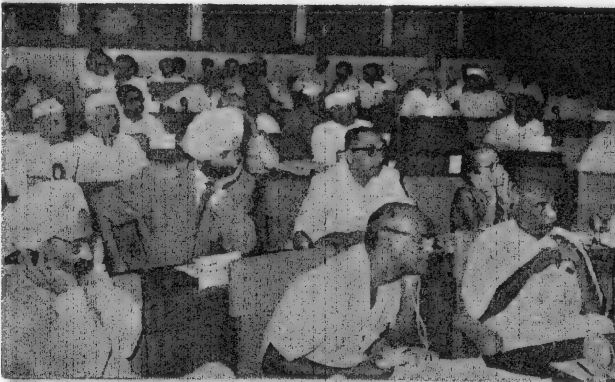


اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سٹہ پیر شولڈ
ہیں کا ہوائی جہاز کے حادثہ میں انتقال ہو گیا

دلی میں قومی یک جہتی کانفرنس

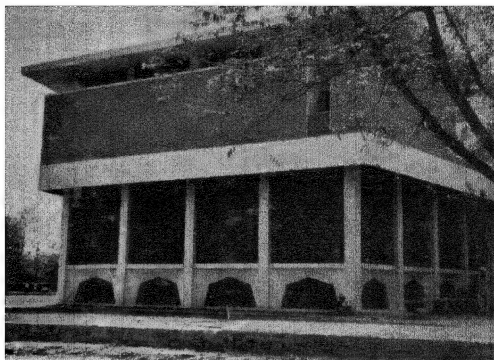


نائب صدر ڈاکٹر مادھو کرشنن
کانفرنس کا افتتاح فرما رہے ہیں

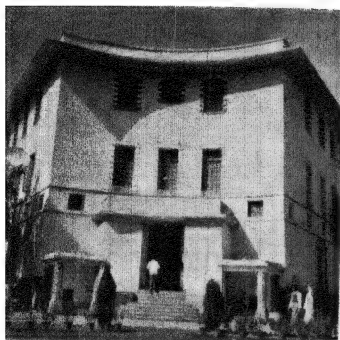


کانفرنس کا ایک منظر

دہلی کی چند

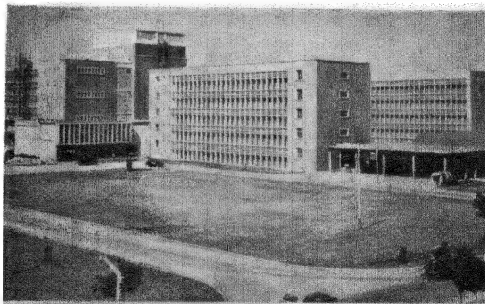


واہنہ درجنوں

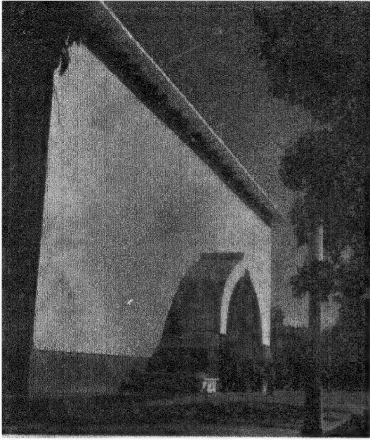


آئی انڈیا نیشنل انسٹیٹیوٹ
کرنیشن سائنس کی عمارت

آئی انڈیا انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی
کی عمارت



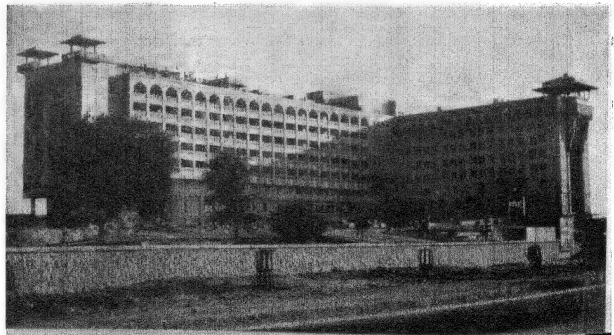
جدید عمارتیں



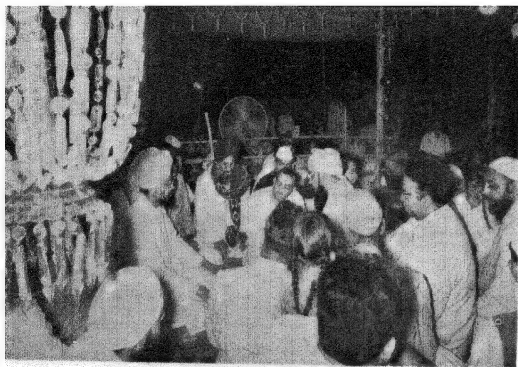
وگپن بیون



یوجینا بیون

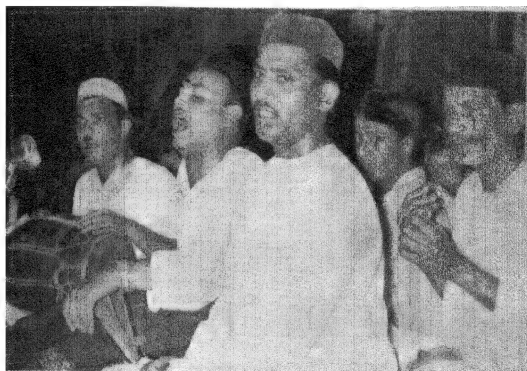


شوگ ہوسل



ماتس خوانی

مدرس
زیر خواجہ نظام الدین محبوب الہی



قواتوں کی ایک پارٹی



سامین

نفرت

کمدار

انیس۔ ایک خوب صورت اور تیز مزاج لڑکی
صفیہ۔ صورت شکل معمولی مگر بہت تیز طرار
طاہر۔ خوش شکل، احسن سا لڑکا۔ مگر بہت چالاک بڑے کی کوشش
میں معرود۔

داوی۔ عام دادیوں کی طرح۔
بچے خالو۔ جیسے کہ چھوٹے خالو حضرت ہو کر رہے ہیں

— متوسط طبقے کا ایک معمولی سا گھر جو معمول سے
ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ نیچے فرش پر چاندنی
پتھر ہے اور وہاں چاروں طرف کپڑے پھیلائے
انیس مٹی سے بنے ہیں معرود ہے۔ اس کے
پاس دیا رے ٹیک لگائے منیر بیٹی دو پٹے پر گوا
ٹھا کہ نہی ہے تخت پر دای یا ندان کو لے بیٹھی ہیں
اور چھایا کٹ نہی ہیں۔ ان کے سامنے کرسی پر
طاہر بیٹا کتاب کے مطالعے میں معرود ہے مگر
اس کا دھیان لڑکیوں کی طرف ہے۔

انیس۔ اب کی بار رائی تو ایسا ہی ٹائیڈن کا ایک دوپٹہ ضرور
لاؤں گی۔

صفیہ۔ مگر بہت ہنگامہ۔ پانچ روپے گڑے کم تو کوئی دیتا ہی نہیں۔

انیس۔ پانچ روپے۔ ۹ ادا۔ پھر تو ایسے دوپٹے کی حسرت دل

میں لئے مر جاؤں گی

داوی۔ (دھانی میں سر نہ رکھ کر) ذرا مجھے دکھا نا وہ پانچ روپے گڑ کا پٹا
(مصفیہ بڑی احتیاط سے دادی کو دوپٹہ دکھاتی ہے۔
طاہر بھی بڑے فورے دیکھتا ہے)

داوی۔ (پانڈان میں سے ٹینک نکال کر نکاتی ہیں، ٹوٹھ۔ بے حوا

کتے کا کٹنی پانچ روپے گڑ! میں سمجھی ڈھاکے کی مثل ہے۔

صفیہ۔ دادی یہ ٹائیڈن جالی ہے۔ امریکن کپڑے کو آپ کتے کا کٹنی
کہہ رہی ہیں!

داوی۔ یہ ایسا ڈھبکا تو ہیں جانتی نہیں مگر پانچ روپے گڑ تو بہت

ہنسکا پٹا۔ ہمارے زمانے میں تو پانچ روپے میں لکشی جوڑا
بن کر نکلتا تھا۔

انیس۔ (غصہ میں) بنتا ہوگا۔ آپ کو تو کبھی کوئی چیز پسند ہی نہیں
آتی۔ ہر چیز ہمنگی لگتی ہے۔

داوی۔ تو میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم پیاس روپے گڑ کا پٹا ہمنو

میں کون ہوں۔ بڑے میں بولنے والی؟ (غصہ میں پانڈان

بند کر کے نیچے کو ڈھکیں دیتی ہیں) باب بیارایتیں سو رہی
کھاتا ہے اور ٹیڈیا پانچ روپے گڑ کا دوپٹہ اوڑھے گی۔

انیس۔ (دھنپ کر) آپ سے تو بات کرنا معیبت ہے۔ طعن آتش

شروع کر دیتی ہیں۔

صغیر - دادی آغا کی اسی پردے کا فیش ہے۔ کالج میں بھی لڑکیاں ایسے دو پٹخ خرید رہی ہیں۔

دادی - آگ لگے تھارے فیش کو بی۔ جس دن سے یہ موافیشی شروع ہوا ہے۔ ہر چیز پر آگ برسنے لگی ہے۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا فیش ہے۔ ننھے سر یا زانوں میں ٹھوسے کا فیش ہے اور اب یہ موٹا کڑی کا چالا پسینے کا فیش ہے کہ سر ڈھکے نہ تھ۔

طاہر - انیسہ کو ایک دو بیٹہ منگوا دیجئے نادادی، میں نے صابرہ اور شاہدہ کو بھی دیے ہیں دو بیٹے لاکر دئے ہیں۔

انیسہ - اور صغیر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتی ہیں، دادی - (ناگوار سے) تمھاری برابری کون کر سکتا ہے میاں۔ تمھاری سہمی آدن کی کس نے ہاں آتی ہے۔

دیہیہ کو طاہر پڑی طہنیت سے مسکراتا ہے)

انیسہ - اور دن کتاب پڑھ چک تو مجھے دے کر جانا۔

طاہر - میں الماری میں رکھ جاؤں گا۔

انیسہ - نہیں جناب۔ آپ مجھے دے کر جائے۔ اس دن بھی آپ بھر گئے تھے کہ کتاب الماری میں رکھ جا رہا ہوں۔ مگر کہیں نہ ملی۔ آخر ایک ہفتے تک بھیل کالج جانا پڑا تو اس کتاب کی قیمت چکی تھی۔

طاہر - (افسوس کے ساتھ) اسے پچ پچ - و - چہ چہ - آخر وہ کتاب کہاں کھو گئی؟

دادی - جاتی کہاں؟ وہ بی بی گئی، جہاں اس سے پہلے میرے دس روپے تھے۔ گئے۔ احمد کو کٹ گیا، انیسہ کا قلم بھی۔ ایک چیز جو تو گواہی جائے۔ چودوں کو بیٹھے بھولے اسے چمک میں لیجا۔ طاہر - تجب ہے۔ ایسا دلبر کون ہو سکتا ہے جو سب کے سامنے سے چیزیں اٹھا کر لے جاتا ہے۔

انیسہ - میں تو اب تک جانے کتنی بار پوچھتی مگر دادی کو ہمیشہ دم آجاتا ہے۔

طاہر - (خوش ہو کر) دادی بچا رہی تھی رحم دل ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے

کو آج کل کی تعلیم انسان کو بے رحم اور دہریہ بناتی ہے۔
صغیر - شاید اسی نے آپ نے میریک سے آگے نہیں پڑھا کہ بچہ رحم نہ ہو جائیگا۔

انیسہ - بلکہ میریک پاس کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

صغیر - مٹنا ہے شاعری نے بھی طاہر بھائی کو بڑا روٹنگ بنا دیا ہے۔

انیسہ - اسی نے تو طاہر بھائی کو کون کی دو پہر اور کوسے کی آواز بہت پسند ہے۔

صغیر - اچھا طاہر بھائی پچ پچ بتائے آپ نے شاعری یگوں شروعات کی؟

طاہر - (جھنجھپ کر) اسے چھوڑیئے اس ذکر کو۔ یہ ایک راز ہے راز ہی رہنے دیجئے۔

صغیر - (ہنستی ہے) مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے میں آپ کو کسی نے شاعر بنا دیا ہے

طاہر - (مسکرا کر انیسہ کی طرف دیکھتا ہے) شاید آپ ٹھیک بہم نہی ہوں۔

(انیسہ جلدی سے سر جھکا کر شین چلنے لگتی ہے)

صغیر - اچھا تو طاہر صاحب! کچھ اتار پڑتے تو بتائیے کہ آپ کو کس نے چڑایا ہے۔

انیسہ - کوئی تلاش ہوگا جس نے طاہر بھائی کو چڑایا۔

طاہر - (دادی کے ساتھ) ناں شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھ جیسے بے روزگار تھیں کو کون چڑائے گا۔

صغیر - واہ۔ آپ بے روزگار کیوں ہوتے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ امپورٹ اکیسورٹ کا بہت بڑا بزنس ہے۔

طاہر - (دبست کر) جی ہاں وہ تو صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ میں نے

اس دن اپنے کاروبار کے بارے میں یوں ہی کچھ بڑھا چڑھا کر کہہ دیا تھا۔

انیسہ - صاف کیجئے کہ طاہر بھائی آپ اکثر باتیں یوں ہی کہہ دیتے ہیں ایک دن آپ بھر رہے تھے کہ کالج کی ہزاروں لڑکیاں آپ پر

عرق ہیں۔ اس دن فرما رہے تھے کہ عطر میب کا دھیرہ بی بی لگے۔

اور پھر شادی کر کے سنی مومن منانے کثیر جا رہے ہیں اور ابھی
بتا رہے تھے کہ مہو اور شدو کے لئے مٹائیوں کے دو پٹے
لائے ہیں۔

طاہر۔ (دست پٹا کر) جی ہاں۔ وہ بات یہ ہے کہ۔ ابھی میں نے
صفیہ صاحبہ سے کہا تا کہ آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ یا
پھر یہ کہ آپ مجھے جانتی ہی نہیں چاہتی ہیں۔

انیس۔ جیسے مجھے دنیا کا کوئی کام ہی نہیں کہ بیٹھی فغول باتوں میں
سرکھپاؤں۔

طاہر۔ خیر! تو اب ہم چلتے ہیں۔ وہ میرا سوٹ کیس کہاں گیا۔؟
یہ آپ کی کتاب یہاں رکھ دی ہے وہ کتاب میز پر رکھ کر سوٹ کیس
اٹھاتا ہے۔

دادی۔ یہ سوٹ کیس تھیں کہاں سے لی گئے۔ دیکھیں بالکل نیا مسلم
ہوتا ہے۔

طاہر۔ ملتا کہاں سے؟ آپ کبھی سمجھتی ہیں کہ میں کیس سے چسپا کر
لایا ہوں؟ ابھی اچھی دس روپے میں خرید لیا ہے۔

صفیہ۔ دس روپے ہیں۔! دس روپے میں کیس سوٹ کیس
ملتا ہے؟

طاہر۔ تو اور کتنے میں ملتا ہے؟ آپ کیا تیس روپے میں خریدیں گی؟
(انیس۔) (دس کرار، میرے خیال میں تو۔۔۔ طاہر بھائی نے یہ خسویدا
نہیں ہے بلکہ۔۔۔ بلکہ۔۔۔)

طاہر۔ دجلہ سے اس کی بات پوری کرتا ہے) بلکہ کیس سے چرایا ہے۔
سبھ میں نہیں آتا کہ میرے لئے سوٹ کے دل میں آستان زہر
کیسے بھر گیا ہے؟

صفیہ۔ جبکہ آپ کے دل میں انیس کے لئے شکر ہی شکر بھری ہوئی ہے۔
دادی۔ (غصہ میں) انیس میں نے تم سے کئی بار کہا کہ اپنی زبان
تقویٰ میں رکھا کرو۔

انیس۔ اچھا بیٹی! اب کبھی طاہر بھائی کے بچ میں بولوں تو زبان
کاٹ لینا بس؟

طاہر۔ دلگیر کر دیجئے، اب بڑھ گئیں۔ دیکھا دادی!

دادی۔ جھٹلے دو۔ کوئی ٹپے بھائیوں سے ایسا مذاق کر سکے۔ ہاں
تو سیان! اگر تم سے بچ دس روپے میں یہ سوٹ کیس لائے ہو
تو مجھے دے دو۔ میں انیس کے جہیز میں دوں گی۔

طاہر۔ انیس کے لئے جہیز کی کیا ضرورت ہے دادی! یہ تو یوں ہی
بہت قیمتی ہیں۔

دادی۔ ارے بیٹا آج کی شرت کل کی دیکھتا ہے۔ ایک روکا دو سو
روپے کا نوکر ہے اور پانچ ہزار روپے جہیز مانگ رہے ہیں۔

طاہر۔ صرف دو سو! آپ کی قسم دادی! تین چار سو روپے تو میں
خود ہی کالیتا ہوں۔ وہ تو ہمارے گھر کا کچر کسٹم ہی بھڑا
ہوا ہے کہ اسی بد نظمی بھلی ہمتی ہے۔ اگر انیس جیسی کوئی
سلیقہ مند لڑکی آجائے تو سال بھر میں ہم مکان خریدو لیں۔

انیس۔ (انگشت کی فٹہ میں) میں جناب میرا نام بار بار مست لیجئے۔
طاہر۔ جی بہت اچھا۔ میں خود بھی احتیاط کرتا ہوں کہ آپ کا نام
بار بار زبان پر نہ آئے۔ تو دادی اب میں جاتا ہوں۔

دادی۔ مگر سوٹ کیس کہاں لئے جا رہے ہو۔ یہ میں نے خرید لیا میں
ابھی قیمت دیتی ہوں۔

طاہر۔ دیکھتے بھائی یہ ہے کہ میں اسے شاہدہ کے لئے لایا ہوں۔ اگر
سوٹ کیس لے کر نہ گیا تو وہ خفا ہو جائے گی۔

دادی۔ میں کچھ دسوں گی۔ انیس بیٹی ذرا میری بٹاری میں سے دس
روپے تو لو دینا۔

(انیس دس روپے کا نوٹ لاکر دادی کے سامنے رکھ دیتی ہے)
دادی۔ (وقفیت۔ اب میں کچھ دسوں گی)

طاہر۔ دے بیسی سے سرکھتی تارے) اچھا تو صرف پانچ منٹ کی اجازت
دیجئے میں سوٹ کیس ابھی لا کر دیتا ہوں۔

دادی۔ اگتو تو یہ۔ دیکھتی۔ اپنی چیزیں نہیں لیجئے۔
طاہر۔ ارے آپ تو خفا ہو رہی ہیں۔ اچھا لے لیجئے۔ اب میں جاتا ہوں
آداب عرض۔

دادی۔ جیسے رہو۔ ہاں وہ کتاب کہاں رکھ دی!

طاہر۔ (دست پٹا کر) کتاب۔ کتاب تو ہیں نے ہمیں کہیں رکھ دی تھی

دادی - جی نہیں ہم نے نہیں خریدا۔ انیسہ کو کیا معلوم۔ طاہر مجھ سے
 کہہ گیا تھا کہ آپ آئیں تو دسے دوں۔
 نوجوان - طاہر صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ آداب عرض۔
 (چلا جاتا ہے)

انیسہ - (انتہائی غم سے) دادی آپ تھوڑا سا زبردست لگا کر ہم لوگوں
 کو کیوں نہیں دے دیتیں۔ پھر آپ کی ساری جائیداد کا مالک
 آپ کا بھتیجا ہو جائے گا۔

دادی - اوی، بیٹی میں نے تمہارے باپ کی کون سی کافی ٹا دی ہے۔
 آج ضرور دس روپے کا نقصان ہو گیا۔ مگر غیر آدمی کے سامنے
 اس کی عزت کی جاتی تو ہمارے خاندان کا نام ہی تو بدنام ہوتا۔
 انیسہ - اب تو ہمارے خاندان کا نام جھڑے پر پڑھا ہوا ہے نا۔ وہ
 تو سب کو اٹوٹا بنا چیتا ہے۔ مجھے ہم تو گدے ہیں کہ اس سے
 اپنا گھر بنادیں گے۔

صفیہ - تم اسے بے وقت کیوں نہیں بناتیں۔ مجھے کونسا ایسا دل
 شغف ہے تو اسے خوب لوگوں اور ایسی سزاؤں کو زد کی جھریاؤں
 رکھے۔ ٹھہرو تمہیں بھی ایک ترکیب بتاؤں
 (انیسہ کے کان میں کچھ کہتی ہے دونوں خوب ہنستی ہیں)
 پر وہ گرتا ہے

دوسرا منظر

[دی کڑھ ہے اودھمی ساڑو سامان۔ انیسہ منہ
 لیٹے بست پر دراز ہے۔ پاس صفیہ بیٹھی ہے۔ طاہر
 سامنے کرسی پر بیٹھا بہت بے چہری اور اداس نظر
 آتا ہے۔ آج وہ نہایت بڑھپا سوٹ پہنے ہے۔
 کانٹا پر بندھی ہوئی ٹھنڈی اور اٹلی میں جپتی ہوئی
 انگوٹھی بھی بہت لمبائی ہے]

طاہر - میں دو جینز ملک یہاں نہیں آسکا تو تم لوگ بھی انجان ہے
 مجھے خبری نہ تھی کہ انیسہ بیمار ہیں۔
 صفیہ - جیسے آپ تو انیسہ کو بہت یاد کرتے رہے ہوں گے۔

طاہر - اگر انیسہ بھول جائیں گے تو پھر کسے یاد رکھیں گے۔
 صفیہ - اچھا اگر آپ انیسہ کو یاد کرتے تھے تو اس کے لئے کیا لائے۔
 انیسہ - دمنہ کول کر، لمبے صفو تو کسی باتیں کرتی ہے۔ طاہر بھائی
 میرے لئے کوئی چیز کیوں لائے گے؟
 طاہر - بات یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ انیسہ خفا نہ ہو جائیں۔
 صفیہ - اچھا اب چھپائے مت بتاؤں کہ انیسہ نہیں دیتے کہ یہ انگوٹھی انیسہ
 کے لئے لائے تھے۔

طاہر - خوش ہو کر جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ مگر بات
 یہ ہے کہ کر

انیسہ - اری صفو یہ تجھ کیا ہو گیا ہے۔ میں اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں
 پہنوں گی۔ لگ گیا کہ انیسہ کے گھر طاہر بھائی نے مجھے انگوٹھی
 کیوں پہنائی ہے؟

طاہر - (جو خوش ہیں اگر) ارے لوگ کوک ہوئے ہیں ہمارے بیچ
 میں بے لگے والے۔

صفیہ - ہاں جی لوگوں سے کیا واسطہ۔ لایئے ہیں اپنے مبارک
 ہاتھوں سے انیسہ کو پہنا دیا۔

طاہر - لیکن یہ انگوٹھی اگر انیسہ کو پسند نہیں ہے تو میں دوسری
 لادوں گا۔

صفیہ - واہ پسند کیسے نہیں آئے گی۔ اتنی اچھی تو ہے۔

طاہر - جی نہیں کچھ اچھی نہیں ہے یہ تو معمولی سی تین بیٹیوں پر ہے
 کی انگوٹھی ہے۔

صفیہ - اب میں بے وقت مت بناؤں۔ یہ بہت قیمتی انگوٹھی ہے
 زبرد ہڑا ہوا ہے۔

انیسہ - تب اسے واپس کر دو صفو۔ میں اتنی قیمتی انگوٹھی
 نہیں لوں گی۔

صفیہ - کیوں نہیں لوگی۔ لاؤ ہاتھ میں پہنا دوں (انیسہ کی انگلی
 میں انگوٹھی پہنائی ہے) خدا تمہیں مبارک کرے۔ اب یہ
 تمہاری ہو چکی ہے۔

طاہر - ہاں، اب یہ انیسہ کی ہو گئی۔

صغیر - اچھا تو اب لایے ہمارا انعام راجہ پھیلا کر طاہر کے سامنے گھڑی ہو جاتی ہے،

طاہر - انعام - ۷۷ کا انعام - ۱

صغیر - ایچے آپ کو گویا جڑی نہیں کہ ہم نے کیا شاذ کارنامہ انجام دیا ہے۔ جیسے جیسے ایسی سیس جڑیں روکی سے نکلنے لگی کرادی۔

میں تو انعام میں کوئی بڑھیا سی چیز لوں گی۔

انیس - بڑھیا سی کیا چیز لوگی۔ اب طاہر صاحب تمہیں اپنی گھڑی تو دینے سے رہے۔

صغیر - رچونک (کون سی گھڑی - ارے یہ گھڑی - میں تو یہی لوں گی - لایے جلدی آثار یہی پیری گھڑی - اے اے اے کتنی خوبصورت ہے۔

انیس - ... اور اگر طاہر صاحب دیتا چاہیں تب بھی لے لو گے طاہر - نہیں ایسی بات تو نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے یہ گھڑی پرینٹ کی تھی۔ اور پھر تو مراد ہے آپ کے لیے میں ایک بیٹری رسٹ فارچ لادوں گا۔

انیس - تو کیا اپنے دھاکا کو نہ دکھائی میں دے گی اسے ؟

صغیر - تم کہہ بھی کہو گھر یہ گھڑی تو میری ہو چکی ہے (جلدی سے کھول کر اپنی لاکھ پرانہ تھپتھپاتی) فی الحال تو یہ میری لاکھ پر بھی بڑی نہیں لگ رہی ہے۔ آداب عرض طاہر صاحب

طاہر - جتنی دیکھو۔ تو اب مجھے اجازت دیجیے۔ پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔ اور ان - کہنا یہ تھا کہ ان چیزوں کو ایک کسی کو دکھائیے مست - خواہ زیادہ بات پھیلے گی۔

صغیر - آپ اہمیت نہ رکھیے کسی کو نہیں دکھائیں گے۔

طاہر - تو اب میں جاتا ہوں (دروازہ سے پرجا کر پھر واپس لوٹ آتا ہے) انیس - کیوں کیا بات ہے ؟

طاہر - کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں ایسا تو نہیں کہ آپ دونوں کو یہ چیزیں پسند نہ ہوں اور آپ میری خاطر لے رہی ہوں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے دے دیجیے۔ میں کل ان سے بھی اچھی چیزیں لادوں گا۔

صغیر - ہائے اے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں تو یہ دونوں چیزیں بے حد پسند کرتی ہوں۔ میں دوسری نہیں چاہتی۔

طاہر - اچھا تو میں جانتا ہوں - آداب عرض۔

صغیر - ضعا حفظ (طاہر بچے جاتے ہیں دونوں لڑکیاں اُٹھ کر دروازہ قہقہے لگاتی ہیں)

تیسرا منظر

[دی گرہ ہے - نیچے فرش پر انیس اور صغیر چپ کاؤ بیٹھی رنگ کر رہی ہیں - وادی ٹینک لگائے کچھ سی سی رہی ہیں - ان کے آس پاس کچھ دھول کی رنگ بڑی گڑبڑ پھیلی ہوئی ہیں]

انیس - افرہ - کتنی سردی ہے - کہیں باہر گھومنے میں پڑا مزہ آئے اس وقت۔

وادی - تمہیں تو باہر جانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہے۔ گری لگ رہی ہے اس نے باہر جانے میں۔ سردی لگ رہی ہے اس نے باہر جا رہے ہیں۔ برسات ہے تو باہر کی فکر - اے تو یہ ہمارے زمانے میں جوان لڑکیاں گھر سے باہر قدم نہ نکالتی تھیں۔

انیس - تو گھر میں بیٹھے کیا کریں۔ کال بند ہو گیا۔ کوئی ابھی سی کتاب بھی نہیں ملتی۔ سردی لگ رہی ہے۔

صغیر - اور طاہر بھی تو ہیں آپہ ہیں کیوں انیس - (انیس اشارے سے منہ کرتی ہے)

وادی - وہ پورا آتا ہے تو تم کب اسے نہ لگتی ہو۔ تمہیں تو اس کی ہر بات ذہن لگتی ہے جیسے تمہارا گھر لوٹ کر نہ جائے گا۔ صغیر - مگر وادی اب تو وہ ہے پارے کچھ نہیں لے جاتے بلکہ کچھ دے ہی جاتے ہیں کیوں انیس ؟

انیس - (دھڑکتے) چپ رہو وادی کو جڑ ہو جائے گی۔ میں کیا دے جاؤں شاید صغیر کو کچھ دے سکے ہوں۔ کیوں صغیر! تجھے کوئی انگوٹھی ویرہ تو نہیں دے سکے طاہر ؟ صغیر - چپ بے شرم - مگر تو سی - تیرا بیاہ اس آچھے سے نہ کروں

تو میرا نام بدل دینا کیجئے مرے میں شگ کی انگوٹھی پہنتے
بیٹھی ہے۔
ددنوں کیجئے لگا ہیں۔ خالو صاحب مجھ رائے ہوئے اند
آتے ہیں)

انیسہ اور صفیہ - سلام چھوٹے خالو۔

خالو - بیٹے رہو۔ بیٹے رہو۔ اچھا صغیہ ہیں۔ بھو مزاج کیسا ہے
تسلیمات عرض کرتا ہوں چھوڑو۔

دادی - جیتے رہو۔ آج کیجئے بھول پڑے اس طرف۔

انیسہ - چھوٹے خالو آج ہیں کوئی پکڑ دکھائیے گا۔ گھر میں پڑے
پڑے اور بگڑے ہیں۔

صفیہ - نہیں تو میں کوئی میں انس کیم ہی کھلا دیجئے۔

دادی - اری لڑکیو! ذرا حواس تو لینے دو۔ کوئی گھر میں آئے اور
تصادفی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ بھو چھوٹے میاں خیریت
تو ہے تھاری دھن کا مزاج کیسا ہے ؟

خالو - اب تو ٹھیک ہے۔ برسوں اسپیشل میں لڑا ہوا ہے۔

البتہ سنے کو ہمیشہ ہو گئی ہے ادھ چھوٹو کو تو پیٹ کا دڑ

چھوٹے تابی نہیں۔ گڑو کو ضرر نکلی ہے۔ پاپا کو کھانسی بخار

ہے۔ بیوہ بچا رے کو بدستھی ہو گئی ہے اور — گر آپ

نے کچھ اور بھی سنا۔ ؟ بچاری چھوٹی چھوٹی پر کیا مصیبت

کا پہلا ڈٹ پڑا۔

دادی - چھوٹی چھوٹی — کیا ہوا انھیں — ؟ اہلی خیر۔

کہیں ٹھانڈی پڑی تو پھر نہ کہیں بے لگتی — ؟

دانیسہ اور صفیہ بھی چونک کر (ادھر دیکھتی ہیں)

خالو - ٹھانڈی ہے اب۔ رات اس نے خود کھنی کھنی۔

دادی - دیکھتے ہو، ٹھانڈی ہے اب۔ کیا بکھر رہے ہو چھوٹے میاں۔ ہائے

میرے اندر (روئے لگتی ہیں) ہے ہے ایسا جوان نہیں

نہیں یہ جو بیٹا ہے۔

انیسہ اور صفیہ چونک کر (ٹھانڈی ہے اب۔ گھر ہو گیا۔)

چھوٹے میاں - کیا معلوم۔ مختلف روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے سانپ

نے کاٹ لیا۔ مان کہتی ہے انڈیا ٹل ہو گیا۔ رات اچھا خاما سرا

تھا۔ ہمیں بھی ہیں کسی دوست سے کچھ زبردانگ کر لایا

اور کھائی ڈالے۔ اب اس دوست نے پیرس میں اطلاع

کئی تو کچھ کھاکر سو گیا۔ مگر بہت بڑا ہوا۔ بچاری چھوٹی چھوٹی

کا بڑا حال ہے

صفیہ (روئے لگتی ہے) نہیں یہ بات بھوٹ ہے چھوٹے خالو۔ ایسا

نہیں ہو سکتا انیسہ اب کیا ہو گا ؟ دانیسہ انھیں پھاڑے

چھوٹے خالو کو گھور رہی ہے)

انیسہ - (دوڑتے ہوئے) صفو - صفو - یہ کیا ہوا — ؟ یہ ہم نے

کیا کر دیا ؟

چھوٹے خالو جانے کہاں کہاں آداریاں کرتا پھرتا تھا۔ کیا معلوم اصل جھید

کیا تھا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ کچھ عشق و شوق کے چکر میں آکر

اس نے ڈرکھ لیا۔

دادی - اے وہ بھی کیسی کوئی بڑا پرتا تھا کہ کچھ کھالیا۔ اس بچا

سے تو سب ہی نفرت کرتے تھے۔

(انیسہ اور صفیہ سر جھکا کر ساکت بیٹھی رہ جاتی ہیں)

اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا بین الاقوامی فلمی میلہ

اس سال ۲۰۰۷ء اکتوبر سے لے کر ۱۰-۱۱ نومبر تک وزارت اطلاعات و نشریات کے زیر اہتمام دوسرا بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوا ہے۔ یہ میلہ قومی

میں ۲۰۰۷ء اکتوبر کو شروع ہو گا۔ ۲۰۰۷ء (نومبر تک) مدد (۱۳ نومبر تک) اور بیٹی (۱۰-۱۲ نومبر تک) فلمی

سیکے منائے جائیں گے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۵۲ء میں منایا گیا تھا جس میں اقوام متحدہ کے ملازمین ۲۱ ملکوں نے شرکت کیا۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں

ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت

کو برکھنا ہوگا۔ ان کے بخونڈے رسوم، سادہ زندگی اور غریب دل چپ مشاغل سے منہ نہیں موڑنا ہوگا بلکہ ان کی قدر کرنی ہوگی کیونکہ یہ ہمارا ایک متبرک تہذیبی ورثہ ہے۔

تعلیم

اگر یہ صحیح ہے کہ زمانے کی ترتیبی تعلیم سے ہوتی ہے تو ہمارا ہندوستان ہزاروں سال پہلے تربیت حاصل کر چکا تھا۔ ہوتہری ایلیٹ اور اڈویس سے کہیں پہلے متہس ویدک لےنے ہمارے کاؤں میں کوچ چکے تھے اور زندگی کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے انہیں ہمارے لئے انشدر کہیں پہلے تیار ہو چکی تھی۔ کتا میں لکھنے اور چاہے کا اگرچہ کوئی انتظام نہ تھا پھر بھی ہمارے دل کے چھایا خانے اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار تھے۔ جھکشوں کے لئے مہاتما دیرہ کا ایک بار ہی اپریشن دے دینا کافی ہوتا تھا۔ دی بائین ازبر کے دہ دوسری جگہ جا کر قوموں کو تبتائے اور سننے والے اُسے اپنی لوح و لپ میں محفوظ کر لیتے اور اس طرح تعلیم و تربیت کا یہ چارہ ہوا کرتا۔

اس صدی میں تعلیم کو قطع کاٹرا رواج تھا تعلیمی اداروں کی کثرت دیکھ کر کہیں رشک ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آخرتے سارے تعلیمی ادارے کیونکر پیدا ہوئے۔ کس طرح چلتے رہے اور علم کی خیرات کس طرح بانٹتے رہے۔ شکشا اور تانندہ جیہ پونی ویشیوں میں ایسی کیا غیر معمولی کشش تھی جس سے بیوگ سانگ اور کتا میان جیسے لوگ اپنا ملک، اپنا وطن اور اپنا گھر بار چھوڑ کر علم حاصل کرنے کے لئے یہاں تک پہنچے اور اس التزام و اصرار سے

ہمدی عمر سے زیادہ تہذیبوں کی عمر ہو ا کرتی ہے۔ جھدمٹ جاتا ہے، تہذیب باقی رہ جاتی ہیں۔ تہذیبیں زمانے کے لئے نقش راہ کا کام دیتی ہیں کسی جہد کا دل ٹوٹے اور سراغ پالے کے لئے ہیں ایسا ہی دیدہ بینا کی ضرورت پڑتی ہے تو اس جہد کے بارے میں صحیح جہد سے کہے۔ اس دور کی تہذیبی زندگی کو ایک تعلیمی اور تقریبی روپ دے کے کیونکہ ہر زمانہ کو ہمدی کے بہت سے اہم پہلو ہوتے ہیں جس سے اس زمانے اور اس دور کے ہزارا پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان تصویروں میں صدیوں پہلے کے افراد ہماری نظروں کے سامنے چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہر دور اپنے دامن میں بہت ساری چیزیں محفوظ کرنا چاہتا ہے بالکل اس طرح جیسے ہر ماں اپنے ہر بچے کو ایک ہی سانس دینا چاہتی ہے لیکن نہ پہلی بات صحیح ہے اور نہ دوسری بات ممکن۔

زمانہ جو گزر رہا، زمانہ جو ہے اور زمانہ جو آئے گا۔ یہ سب اپنی اپنی مشرک قدروں سے منسلک ہیں اور ہر مشرک قدروں پر دور کے تہذیب و تمدن میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ زمانے کو سمجھنے کے لئے تہذیبی تمدن وہ واحد راہی ہے جو زمانے کے خدو خال کو پہچانتی ہے۔ اجداد ہمدی کو پہچانتے ہیں۔ مدد دیتی ہے کیونکہ تہذیبیں ایک دوسری میں نہیں بنا کرتیں۔ تمدن ایک دوسری میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا پودا ہے جو صدیوں سال کی محنت و مشقت کے بعد بار آور ہوتا ہے۔

یہ جتن ٹوٹے چھوٹے اور اترانشیدہ نقش ہیں جن کو ذہن میں رکھ کر کہیں سات سو برس پرانے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت

آئے جیسے طواف کوئے یاد کے لئے پہنچے ہوں۔

لکشی زحر، اپارکار اور دروہنا لکشیور جیسے ہونڈو کوئے زمریوں
اگرچہ مرث برہمنوں کی تعلیمی خدمات کا ہی تذکرہ کیا ہے۔ مگر ایسا نہیں تعلیم
کی دیوی گھر گھر اور دروازہ دروازہ پہنچنے والی تعلیم حاصل کرنا خسر
تک پہنچنے کا ایک راستہ تعلیم حاصل کرنے کے مقدس طریقے کو وہ
'پادوتیا' تصور کرتے تھے اور اسے چھوڑ کر باقی چیزوں کو اپنا دیتا
کا نام دیتے تھے۔

اس طرح کی تعلیمی زندگی مرث مذہبی کتابوں کو پڑھنے اور قصوں
ویروں کے اخلاک کو یاد کرنے پر مبنی ہو جاتی تھی بلکہ اس کے ساتھ
فلسفہ، سائنس، علم نجوم، موسیقی اور رقص کو بھی سیکھنے سکھانے کا رواج
تھا۔ استری چندر کا کہنا ہے کہ یہ بھی علوم ہونے لگے کہ رقص و موسیقی کے
درس و تدریس کا کم و بیش دیباہی رواج تھا۔ جو طہنا، موسیقی اور رقص
میں دل چسپی رکھتے تھے وہ استادوں کے گھر میں رہ کر تعلیم ہی کرتے۔
استادوں کے سامنے ریاض کرتے جو ان کی خوبیوں اور خامیوں پر ہر وقت
نقد کرتے تھے۔ استاد کے ہاں رہنے والا لالہ لپٹا ان کے اپنے بیٹوں سے
کم اہمیت نہیں رکھتا تھا یہی نہیں بلکہ اس کے کھانے پینے کی ذمہ داری
استاد ہی کے سر پر تھی۔

مشہور عالم شکر شرا نے رقص و موسیقی کے ذمے میں اچھوتوں کی
طریقہ و عداوت کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ علم بھی استاد کے
ساتھ ہی رہ کر سیکھا جاسکتا ہے۔ اور ویدک طریقہ و علاج کے ساتھ
ساتھ دھروید (فنی تعلیم) گندھروید (موسیقی و رقص) اور رقص شکر
و اشتھام حکومت میں بھی تعلیم و تربیت کا یہی طریقہ کار مقرر
ہو سکتا ہے۔

استادہ کی عزت اور تدریسی اس زمانے میں نہیں زیادہ تھی
استادہ بڑے قابل تعلیم سمجھے جاتے تھے۔ دھرم کر، گیڈ و خراور گیڈ، تھ
مزا مندھ و مرقہ ۱۰۲۴ء سے ۱۰۲۷ء کے درمیان تھے اور وقت میں
تبت گئے وہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔ مشہور چینی سیان فاپان نامزدہ
سے تحصیل علم کر کے جب وطن واپس ہوا تو اس نے یہاں کے حکام کو تذکرہ اپنے
وطن میں کیا جس کی بنا پر تقریباً گیارہویں صدی میں ہندوستان سے

تین اہل علم و حرم راکش، میتری جھدر اور سورہ یا ساس میں
گئے جہاں وہ ہندوستانی علوم کا درس دیتے رہے۔ اس طرح تبت
سے بھی بہت سے اہل علم درس و تدریس کی چاہ میں اس ملک میں آکر
بس گئے۔ تاریخ کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہوا یہ اہل سیارب (۱۰۵۹ء
۱۱۰۸ء) ہندوستان آیا اور کثیر کے مشہور عالم برہمت بھدر
اور جھاراج کے قدموں میں بیٹھ کر علم کی پیاس بجھا کر آیا۔

تغیرات

اس صدی میں تغیرات مرث دو چیزوں پر مشتمل ہیں اول شاہی محل
اور دولہ مندر۔ اس دور کے تغیرات کوئے نے ہمیں دونوں جگہوں پر بتے ہیں
تغیر کی خوش سلیقگی اس دور کے مگھو را پو اور گننا تھر کے مندروں کی
جان ہے۔ پتھروں پر کندہ و فرائیڈ کی تصاویر، روشنی کا انتظام کرنے
کے لئے پتھروں کو لاکھ کر جلیاں بنانا یہ سب فی تغیر کے بہت ہی
خوب صورت نمونے ہیں۔

موسیقی و رقص کی طرح اس فن کے شہیدانی لہذا اپنے اپنے
استادوں کے گھر جمع ہوتے اور اس کتاب فن کرتے۔
گیارہویں اور بارہویں صدی میں "سمارن گنسنتر اور حار"
اور "اسانا ساگر و پدھاتی" فی تعبیر پر دو مشہور کتابیں لکھی گئیں
جو سکریت زبان میں ہیں۔

نام لک

اس صدی کے تغیری مشغلوں میں سے ایک شخص نام لکھنا اور
دیکھنا بھی تھا۔ ویسے ناموں کے کھیل جانے کی نامی جگہ کو بادشاہ کا
دریاد ہی ہوتا تھا جہاں مرث بادشاہ اور ان کے امراء اور وزراء کی
لطف اندوز ہو سکتے تھے لیکن مندروں کے سامنے پہلے ہونے و سیر
میدانوں میں ہونے والے ناموں میں عام لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔
اس زمانے میں کھیل جانے والے ناموں پر عموماً مذہبی رنگ حاوی
ہوتا تھا جن کے موضوع مہا جات اور بائیس کے لئے جاتے تھے۔
نئی کی بہادری، جھگوان سری کرشن کی شجاعت یا سیمی موضوع ان
ناموں میں ضرور آتے۔ اس صدی کے نام لکھنا کاروں میں سے کئی
نام زیادہ مشہور ہیں شکر کسمندہ اور لہنا (کثیر) و سل و لوار سوم و

دراج پوتا نہ) نام چند اور لیش پال (دگرات) کو ی راج سکھا دھڑی (دیرہ دیرہ)۔

نام چند اور لیش پال نے اس موصوع پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ نام چند کی 'نویاس' اور لیش پال کی 'ترجمہ ہیم' یہ دونوں بہت ہی شہور کتابیں ہیں۔

ظاہر ہے اس زمانے میں آج کی طرح کوئی نامک گھر نہیں تھا۔ نامک کرنے کی دہی جگہ عیس۔ مندر اور راجا کا محل۔ مندروں کے سامنے پھیلے ہوئے میدانوں میں اسی وقت نامک ہوتا جب کسی خاص پوجا کا وقت آتا اور دور دراز سے لوگ اکٹھا ہوتے اور اس مکمل کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے۔ ان ناٹکوں میں خوب تر اور مردودوں ہی حمد لیتے تھے۔ ناٹکوں کو دل چاہتے بنانے کے لئے جگہ جگہ موسیقی سے بھی کام لیا جاتا۔ موسیقی میں جو ساز اس وقت استعمال ہوتے تھے ان میں سے ڈھول، ہار، اور باغیچہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

موسیقی اور نامک کے سرپرستی کی حیثیت سے چولیکھاٹنا کے مشہور راجہ شیشو راکا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔

شاعری

شاعری نے ہر دور میں انسان کو غم و اندوہ سے نجات دلائی ہے اس کے سامنے جذبات کی اس طرح آئینہ داری کی کوہ و اذہ کو بھول کر زندگی کو کسی تصور کرنے لگا۔ یہ شاعری کا عجز تھا۔ شاعری نے لطیف احساسات کے اظہار کو اپنا مقصد بنایا اور اس کو حاصل کیے انسان نے اپنی غم شدہ جنت حاصل کرنی۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں بھی شاعری کو خوش گوار بات پائی جاتی تھی۔ لالہ داس کی شہنشاہ اور بکھڑے دوتے کے ربات عاشقان میں سکون، اہلبیان اور اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ اور لالہ داس کے بعد اس مہدی کی مغل کو روٹی بچتے دے کو ی بلبل اور دکی سے دیو تھے۔ کوہی کی 'چودہ پنچ سیکھا' بہترین عشقیہ داستان کے آج تک رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کوہی نے دیو اس مہدی کا بہت ہی مشہور شاعر گزرا ہے۔ جے دیو کا سرپرست راجہ گمشو سینا تھا جو خود بھی شاعر تھا۔ جے دیو کے علاوہ گمشو سینا نے اور بھی دوسرے شاعروں مثلاً اوپائی دھر، سارن

اور گووردھی آچاریہ وغیرہ کی سرپرستی کی۔ جنہی منکر کشی ہے دیو کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ "گیت گووند" اس کے مجموعہ کا نام ہے۔

لیاس و ترانے

گیارہویں اور بارہویں صدی میں لیاس کے معاملہ میں لوگ اسی طرح خوش ذوق کا اثر دیا کرتے تھے جس طرح آج کی تاریخ میں بتاتی ہے کہ ہندوستان کا بنا ہوا پیکارا اس زمانے میں ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی گونج رہے تھے۔ تھیری شائیں اور کشمیری کسل ایران اور ہندو کے بارانوں کی خاص روٹی تھے۔ پکڑا تیار کرنے والے ہٹروں تو بہت سے تھے لیکن کوہلیہ نے اس سلسلے میں نمبر پورہ، بنگال، گجرات، حوڑا، اپرینا اور کنگ کا خاص طور سے تذکرہ کیا ہے۔ بنگال اس زمانے میں پرے کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور بخول پیری ملیس گنگا کے قریب کا ایک مشہور پیشی کیڑوں اور موہوں کی تجارت سے مالا مال ہو رہا تھا۔ اس بات کی تصدیق مشہور عرب سیاح سلیمان نے بھی کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "یہاں کے ہوتے پرے کی تحفہ کی طرح کی جاتے ہیں یہ اس قدر خوب صورت اور ہلکا ہوتا ہے کہ کوئی بھی درمیان سے پاس نہ کر سکتا ہے۔" (پیش ۳۶۱)

متمول اور غیر متمول طبقے کے لوگوں کے لیاس میں کافی فرق تھا۔ متمول لوگ کڑے ہوئے اور کامانی کے پرے پہننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ برہمنوں اس کے غیر متمول افراد معمولی دھوئی اور ساڑھیاں پہنتے تھے۔ "ادھمتا" اور "نولا" نام کا پکڑا لعاب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ حوروں کے علاوہ مرد بھی زیر پر پہنتے تھے۔ حوروں کی طرح مرد بھی اس زمانے میں کان میں آویڑے پہننا پسند کرتے تھے۔ بادشاہ کاٹن میں آویڑے پہننا ایک چھانگن سمجھا جاتا تھا۔ ایک عرب سیاح ابو ذبیہ نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

"اس ملک کے بادشاہ بہت قیبت لیاس پہننا نہ کرتے ہیں۔ انھیں میں قیبت پہننا پسند نہیں آتی۔ زیادہ تر شہر اور سڑک پر کڑے دیتے ہیں۔ یہ بہتر بہت ہی قیبت ہوتی ہے۔ دربار کے امراء حکام اور کارندے سبھی اپنی اپنی پند کے پتھر استعمال کرتے ہیں اور انھیں

انگریزوں میں حبشہ ڈال دیتے ہیں۔"
ہندوستان اور چین کے قدیم تذکرے (انگریزی ص ۳۵)

تہوار

ہمارے یہاں کے تہوار موسموں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں
گیارھویں اور بارھویں صدی ہندوستان میں چیت کا موسم بڑی خوشی
کے ساتھ منایا جاتا تھا اور یہاں تک کہ چیت کی گیارہ تاریخ کو قریب
مردوں سے انعام طلب کرتیں۔ اچھے سے اچھے لباس زیب تن کرتیں
اور اس موسم میں پندرہ دن تک کام دیلی کی پوجا کرتیں۔
فصل تیار ہوجانے پر بھی کچھ تہوار منائے جاتے تھے۔ مشہور
تذکرہ نویس لکشی دھرنے ایک ایسے ہی تہوار کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا
کہنا ہے کہ اس وقت کے ہمسے میں جب فصل لکھی تھی تو لوگ کھیتوں میں
جج ہوجاتے ہیں پھر ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر کھیت کے کچھوں پچ
کھڑا ہوجاتا ہے اور کوئی ساز بجاتا ہے۔ ساز کی آواز اس کے سارے
لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور گانے گاتے رقص کرنے لگتے ہیں اور
یہ سلسلہ کافی دیر تک قائم رہتا ہے۔

دیوالی کا تہوار ہندوستان کا بہت ہی پرانا تہوار ہے۔ اور
کی سیاہ رات میں لڑکے کے پھینچنے میں اس تہوار کی دھوم دھام
وہی جاسکتی ہے۔ بھوجے لے پئی کتاب راجا مارتنڈ میں اس تہوار
کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دیوالی کی
جو کو لوگ کھاتا نہیں کھاتے تھے۔ لکشی کی پوجا ملک کے طول و عرض
میں ہوتی تھی۔ چاروں طرف دے جا کر خوشی منائی جاتی تھی۔ کیا
گھر کیا دوکانیں کیا مشراور کیا دیہات سبھی جگہ دیوالی کے دے
جلا کر روشنی کی جاتی تھی۔

گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہندوستان میں سال
کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ایک سو اٹھائیس دن تہواروں کے
لئے ہوتے تھے۔ تہواروں کی آئین کثرت دیکھ کر لوگوں کو حیرت و حذور
ہوگی لیکن ان تہواروں کی زیادتی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس
مدی میں تفریح کے زیادہ مشاغل نہیں تھے۔ نہ اس وقت کوئی

کلب تھا، نہ سنہا تھے، نہ تھیٹر گینیاں تھیں، نہ پوٹل اور نہ
کافی ماؤس۔ لوگوں کو سماجی میل جول کے مواقع یہی تہوار فراہم
کرتے تھے۔ ان تہواروں کے موقع پر درود و نماز، مقامات پر پہنچا دے
رشتہ دار ایک جگہ جمع ہوتے، ایک دوسرے کی خوشی میں شریک
ہوتے اور محبت کے دائمی رشتے کو مضبوط کرتے۔

تہوار

ہندوستان کے تہذیبیاتی تہوں سے تاریخ میں وہ کارنامہ کرکھا یا
ہے جو کسی ملک کے سیر سے بھی نہیں ہو سکتا۔ گیارہویں اور
بارھویں صدی کے ہندوستان میں شمال سے لے کر جنوب تک مختلف
مقامات پر تہوار ہوتے تھے۔ جنوب کا رہنے والا شمال کی تہوار کا
میں ضرور عاجزی دیتا اور شمال کا رہنے والا اسی طرح جنوب کی
تہوار کا گھوم میں جانا اپنا فرض ادا نہیں خیال کرتا۔ یہ زیارت کرنے
والے ایک لاکھ سفر کا کام انجام دیتے۔ ان کی زبان "ان کا لباس
اور ان کی طرز و آئین مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے
اتنے قریب ہوجاتے کہ شمال و جنوب کا فرق باقی نہ رہتا۔

دیوالی

ہندوستان میں دیوالیوں کی بھی عجیب کمائی ہے
گو اب رواج بہت کم ہو گیا ہے لیکن گیارھویں اور بارھویں
صدی کے ہندوستان میں دیوالیوں کی کثرت سے ہوا کرتی تھیں۔
یہ دفاع کی طرح پیدا ہوا، اس طرح پر وہاں چڑھا اور اس کو
پر وہاں چڑھانے میں کسی کس کا ہاتھ تھا؟ اس کے بارے میں زیادہ
تو نہیں لیکن ایک عرب سیاح ابوزید الحسن نے لکھا ہے:
"عجیب کوئی عورت چاہتی ہے کہ اس کے کوئی اولاد
ہو اور وہ اولاد کے لئے منت مانگتی ہے۔ اگر اس کی
پہلی اولاد لڑکی ہوئی تو وہ مندر میں سے جاکر جھینٹ
کر دیتی ہے۔ وہاں اس کا کام مورتی کے گرد رقص کرنا ہوتا ہے۔"

یہ قہمی گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہندوستان کی تہذیب اور
سماجی زندگی کی جھلک۔ اپنے ناخانی کی شاندار روایت پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔

غزل

برخسہ ایک خالِ رخِ ماہِ وصال ہے

گننا حسین تسللِ ماضی و حال ہے

اے مجھ لطفِ خود بخودی! تجھ کو کیا خبر

بِتراجمِ ل، میری نظر کا جمال ہے

اسا بنِ اتفاقات سے مجروح ہو گئی

منہ و رُکسِ قدرِ مری چشمِ سوال ہے

ساقی! شرابِ ناب کے چھینٹوں کو کیا ہوا

اب تک رخِ حیات پر گردِ طال ہے

یہ دُورِ غم ہے تیرے قاف کا آئینہ

شامِ فسادِ ہے زیرِ صبحِ وصال ہے

ہشتنگیِ دل کو نہیں بے کسی کا غم

خودِ حسن بھی رفیق ہے، اُشفتہ حال ہے

اے حسنِ دوستِ تیری رفاقت پر پیشاد

اب جو مرا سوال ہے، تیرا سوال ہے

بخن مریے شور نے دل کو وہ غمِ امام

جو غمِ امامِ قافِ فلماں وصال ہے

غزل

نفس میں قوتِ گنستا رہم بھی رکھتے ہیں

خوش اک لبِ اہسا رہم بھی رکھتے ہیں

چمن کو ہم نے بھی دیکھنے کی طرح

چمن میں دیدہ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

ہمیں ہے ہم سے ہمارا خدا کا راز نہاں

کچھ امتیازِ لگی و خار ہم بھی رکھتے ہیں

ہمارا حال نہ پوچھا کسی نے ہم سے کبھی

اگر چہ دل میں غمِ یار ہم بھی رکھتے ہیں

ابھی تو اور بھی رخ ہیں تری تجلی کے

ابھی تو حسرتِ دیدار ہم بھی رکھتے ہیں

دماغِ نارِ کشی و مزاجِ مشکوہ گری

بقتدرِ لذتِ آزاد رہم بھی رکھتے ہیں

ہمیں چمن میں تبسم نہ کر، غمِ انداز

شہزادِ بہتِ گلزار ہم بھی رکھتے ہیں

تیسرا پنج سالہ پلان

مطلع نظر اور طریقہ کار

مقدمہ کی کامیابی کا انحصار دنیا میں امن رہنے پر ہے۔
ہندوستان کے چالیس کروڑ سے بھی زیادہ لوگوں کو اچھی زندگی
بتیا کرنا ایک بہت بڑا کام ہے۔ زیادہ فوری مسئلہ افلاس اور
اس سے پیدا ہونے والی دشواریوں کو دور کرنا ہے اور یہ صحت سماجی
اور معاشی ترقی سے ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس طرح حتمی لحاظ سے
ایک پختہ نظام پیش کرنے کا اور ایک ایسا سماجی نظام استوار ہو گا
جس میں ملک کے تمام شہریوں کو یکساں مواقع ملیں۔
منصوبہ بند ترقی

جیسا آزادی حاصل ہوئی تو ہجارت کو بہت بڑے مسائل کا
سامنا کرنا پڑا۔ وہی معاشیات کی کثیر نوعیت، اقتصادی ترقی کی
بنیاد رکھنے اور تعلیم اور دیگر سروسوں کو وسیع پیمانے پر
ملک کے لئے ایسی منصوبہ بندی بہت ضروری تھی جس میں اقتصادی
اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا ہو۔

پنج سالہ پلانوں میں ترقی کا جو ڈھانچہ مد نظر رکھا گیا ہے اس
کا بنیادی نصب العین مسلسل اقتصادی ترقی نیز منصفیت بخش روزگار
کے مواقع بڑھانے، مبادی زندگی کو بلند کرنے اور عام لوگوں کے کام
کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے ٹھوس بنیادیں فراہم کرنا ہے،
جیسا کہ لازمی ہے، اولین ترجیح زراعت کو دی گئی ہے۔ چنانچہ
زرعی پیداوار کو ۱۰۰٪ اضافہ تک بڑھانا ہے زراعت کی ترقی
اور انسانی وسائل کا فروغ دونوں یکساں طور پر منصفی ترقی کے ساتھ

ہندوستان کے تیسرے پنج سالہ پلان پر پارلیمنٹ نے اپنی
ہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس کے مطابق پلان کے بڑے بڑے
مقاصد درج ذیل ہیں:

(۱) قومی آمدنی میں زائد اضافہ پانچ فی صد کا سالانہ اضافہ
حاصل کرنا اور اس کے ساتھ ہی سرمایہ کاری کا ایک ایسا ڈھانچہ
تیار کرنا جس میں قومی آمدنی میں اضافہ کی یہ شرح آئینہ پلاؤں
کے دوران میں بھی برقرار رہے۔

(۲) غذائی اجناس میں خود کفیل ہونا اور صنعت و برآمدات
کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے زرعی پیداوار کو بڑھانا۔

(۳) فولاد، ایندھن، بجلی اور کیمیاؤں کا ایسی بنیادی صنعتوں کو
توسیع دینا اور پیشہ سازی کی صلاحیت استوار کرنا تاکہ تقریباً دس
سال کے اندر اندر صنعتوں کے فروغ کی ضرورتوں کو ملک کے اپنے ہی
ذرائع سے پورا کیا جاسکے۔

(۴) ملک کی افرادی قوت کے ذرائع سے پیدا ہوا خاموہ آٹھانا اور
روزگار کے مواقع میں بھی ترقی کرنا۔ اور

(۵) بتدریج ایسے حالات پیدا کرنا کہ ملک کے لوگوں کو ایک
سے مواقع ملنے لگیں اور زیادہ آسانی ہو۔ آمدنی اور دولت کے
فرق میں کمی کرنا اور اقتصادی طاقت کی اور زیادہ بہتر تقسیم کرنا۔
ہندوستان کی ترقیات کا بنیادی مقصد ضروری طور پر یہ ہونا
چاہیے کہ ملک کے عوام کو ایک اچھی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ اس

وابستہ ہیں۔ صنعتیں نہ صرف نئے کمالات فراہم کرتی ہیں بلکہ کاشتکار کے اندازِ فکر میں تبدیلی بھی لاتی ہیں۔ لہذا زراعت اور صنعت کو ترقی کے عمل کا لازمی حصہ سمجھنا چاہیے۔ سرکاری سطح کو تیسری دینی چاہیے اور ایک بڑا اور ترقی پذیر کارپوریٹہ سطح قائم کیا جانا چاہیے۔

اقتصادی نظام کی تیز رفتار توسیع کے ساتھ سرکاری اور نجی دونوں حصوں کے لئے ترقی کے وسیع تر مواقع پیدا ہوتے ہیں اور بہت سی باتوں میں یہ دونوں ایک دوسرے کے امداد کار بن رہے ہیں۔ نجی حلقہ میں نہ صرف منظم صنعتیں بلکہ چھوٹی صنعتیں، زراعت، تجارت، تعمیرات اور دیگر شعبوں کی بہت سی تعمیری سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔ اس حلقہ کو رفتہ رفتہ امداد باہمی کی شکل اختیار کرنی ہے۔ تیز رفتہ قومی منصوبہ بندی کی حدود میں رہتے ہوئے سارے سماج سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہے۔

ترقیاتی اسکیم میں امداد باہمی یا کوآپریٹو کا ایک اہم مقام ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اقتصادی زندگی کی کئی شاخوں میں بالخصوص زراعت چھوٹی صنعتوں، تعمیراتی کام، آبادی کے لئے ضروری کالائٹوں کی فراہمی میں امداد باہمی رفتہ رفتہ مادی حیثیت حاصل کرے گی۔ قومی معاشیات میں چھوٹی اور درمیانی صنعتوں کو نہایت اہم پائوٹ ادا کرنا ہے کیونکہ یہ صنعتیں عام استعمال کی چیزوں اور دیگر اشیاء کے علاوہ ایک بڑے پیمانے پر لوگوں کو روزگار فراہم کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ قومی آمدنی کی زیادہ منصفانہ تقسیم کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔

منصوبہ بند ترقی کی کوششیں شروع کرنے، نیز ترقی سے ترقی کرنے اور سوشلسٹ طرز کا سماج بنانے کے ارادش میں بنیادی اصول سائنس رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حیثیت مجموعی سارے سماج کو ارد گرد کے اس سے زیادہ مزور طبقوں کو فائدہ پہنچے۔

سوشلسٹزم کی طرف پیش قدمی

محلات کے چھالے بلانوں میں ایک بنیادی وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ جمہوریت اور عوام کے اشتراک میں کے ذریعے سوشلسٹ ڈھنگ سے جو ترقی ہوگی اس سے تیز رفتار اقتصادی ترقی، روزگار کی توسیع نیز منصفانہ تقسیم آمدنی اور دولت کی نابرابریوں میں کمی ہوگی۔ اقتصادی طاقت میں چھٹا افراد کے ہاتھوں میں جم نہیں ہونے کی اور

ایک آزاد اور مساویات پر مبنی سماج کے اقدار اور جہانات پیدا ہوں گے۔

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ سوشلسٹ طرز کے نظام کا نقطہ نگاہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی جانب ترقی پسندانہ ہونا چاہیے نیز یہ نظام اس تک پہنچا دینا چاہیے کہ ترقی پذیرہ کہ ایک ایسی سطح پر پہنچ سکے جہاں عوام کی غلامی و بے سود کا معقدہ منہ شکل اختیار کرے۔ دوسرے

سوشلسٹ نظام میں برابری کو برابر کا موقع دینا چاہیے۔ اس سمت میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ سب کو بنیادی ضروریات جیسا کی جائیں، خاص کر خوراک، کام، تعلیم کے مواقع، صحت و معاشی کی معقول سہولیات، مکانات کی صورت حال میں بہتری اور کم سے کم اتنی آمدنی جس سے معقول معیار زندگی حاصل ہو سکے۔

دوسرے، سوشلسٹ نظام کو ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جس سے اقتصادی و سماجی نابرابریاں کم ہوں، اقتصادی ڈھانچہ تیزی کے ساتھ بڑھے اور اقتصادی طاقت چند ہاتھوں میں جم نہ ہو سکے پائے نہ ہی اجارہ داری کو خدشہ ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ سماجی اقدار اور تمام طبقوں کے لوگوں میں مشترکہ مفادات اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔

مساوی مواقع

سب کے لئے برابر کے مواقع فراہم کرنے اور کم از کم حقیقی آمدنی کا ہونا ضروری ہے اسے حاصل کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو کام کا متقاضی ہو، منصفانہ بخش روزگار دیا جائے۔ اقتصادی ڈھانچے میں غامیاں ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ صنعتی بنیاد کو کافی مضبوط کیا جائے اور تعلیم اور دیگر سماجی ضرورتوں کو ترقی دی جائے اس کے بعد ہی اقتصادی ڈھانچہ تمام محنت کشوں کو کافی اہمیت دلا سکتا ہے۔ ان تمام باتوں میں دقت لگتا ہے۔ لہذا کچھ مدت تک بڑی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی نیز زراعت اور اقتصادی و سماجی ضرورتوں میں اضافہ کے پروگراموں کے علاوہ بڑے پیمانے کے وسیع پروگراموں کے ذریعے تکیلی ترین آمدنی والے طبقات کے لئے کام کے اضافی مواقع دینا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

سماجی مسروں میں تو سب سے بھی اسی قسم کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ خاص کر صنعت پر انگریزی تعلیم سے اعلیٰ اور بیشتر وراثہ تعلیم کے وسیع تر پھولنے سے وظائف اور دوسری شکلوں میں امدادی فراہمی سے محنت و مصروفیت کے حالات میں بہتری سے اور پائی کی ہم رسانی اور مکانات کی صورت حالت میں اصلاح سے۔ درجہ بہرست قابل اور جاتیوں کی بہبود اور دیگر فلاحی خدمات اقتصادی ترقی کی ایک کامیاب جزو ہیں۔

اقتصادی طاقت اور آمدنی کی تقسیم

اگر زیادہ اقتصادی طاقت مثلاً مٹاؤتھوڑے ہاتھوں میں جمع ہو جائے تو اس سے جمہوریت میں سماجی نظام پر بدباؤ پڑتا ہے اور یہ چیز اقتصادی برادری کو چیلانے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ چنانچہ سرمایہ پالیسی کا مدعا لازمی طور پر اقتصادی طاقت کے اجتماع اور اجارہ وراثہ مکانات کی نشوونما کی ایک نظام اور صنعتی تنظیم کے ایک ایسے ڈھانچے کو فروغ دینا ہو گا جس کے نتیجے کے طور پر پیداوار بڑھ سکے اور نئے شعبہ سے جا کر نئے دلوں، درمیانہ اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار اداروں اور امدادی پالیسی کی تنظیم کو قومی منصوبہ بندی کی حدود کے اندر پھیلنے چھوٹنے کا پورا پورا موقع میسر ہو گا۔

آمدنی کی نابرابری کے مسئلے کا ایک اہم پہلو دیہاتی اور شہری آمدنیوں کے درمیان تفاوت سے تعلق رکھتا ہے جو صنعتی اور اقتصادی ترقی کے ذریعہ اثر اور اثر خفہ لگتا ہے۔ یہ مفہوم زرعی پیداوار میں اضافے سماجی حرکات کے فروغ، زمین پر انحصار میں کمی۔ دیہاتی علاقوں کے اقتصادی ڈھانچے میں صنعتی توسیع کے ذریعہ گونا گونی اور زرعی پیداوار کی قیمتوں کی ایک ایسی پالیسی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے جو کسانوں کے مفاد کا پورا پورا تحفظ کرے اور شہریوں کے لئے بھی منصفانہ ہو۔

قدم بہ قدم

اگرچہ بہت کچھ خلا باقی ہے تاہم سوشلسٹ نظام کا ڈھانچہ تعمیر کیا جا رہا ہے لیکن اب اسے عملی اعتبار سے منسوط اور زیادہ یا مقصد بننا ہے۔ سرکاری تنظیم و نسق اور اقتصادی زندگی کے تمام شعبوں میں طے شدہ پالیسیوں اور پروگراموں کو زیادہ

منسوطہ ارادے کے ساتھ عملی جامہ پہنانا چاہیے اور جاری پیمانے کے زیادہ محنت طریقے اپنانے چاہئیں۔ مزید برآں ہمیشہ اخلاقی، انسانی اور روحانی اقدار پر، جو اقتصادی ترقی کو معنی بہناتی ہیں، مناسب زور دیا جانا چاہیے۔ اگر قوم خاطر خواہ اتحاد اور نظم و ضبط قائم رکھے، ترقیاتی کاموں کا بار برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہے اور لوگوں کے مختلف طبقوں کو اس بات کا شعور ہو کہ اس مرحلے پر ان کا کیا فرض ہے تو اقتصادی اور سماجی پیش قدمی کی رفتار تو تیز سے

ہیں زیادہ تیز ہو سکتی ہے۔ جن پالیسیوں کا پورا اٹھایا گیا ہے وہ ٹریڈ یونینوں، اتحاد یا اہمی کی تحریک، رضا کارانہ تنظیموں اور یونیورسٹیوں جیسے اداروں کو استحکام عطا ہیں اور دیہاتی اور شہری برادریوں میں تعمیری لیڈر شپ پیدا کر سکی۔ وہ اقتصادی طاقت کے اجتماع اور جاریہ داری کی نشوونما کے انسداد میں تیزی اور اقتصادی اتحاد کو بہرہ دار بنانے میں اور تجارت کے بہتری کو کام کے مساوی مواقع اور ایک کم از کم میانی زندگی کا حق دینے میں معاون ثابت ہوں گی۔

انجام کار اقتصادی ترقی محض ایک حصول کا ذریعہ ہے اور اس کا مقصد ہے عملی کوشش اور قربانی کے ذریعہ ایک ایسے سماج کی تعمیر جس میں مذہب و ملت اور دروہایت کو کوئی دخل نہ ہو اور جو قوم کے ہر طبقے اور ملک کے تمام حصوں کو گریختے پھرنے پھیلنے اور قومی بہبود میں متحد بنائے کے پورے پورے مواقع ہم پہنچائے۔

طویل المدت ترقیاتی کاربائے میں انداز نظر

ملک تین پلاؤں کی مدت میں اقتصادی ترقی کے تمام امکانات کو پورے اور موثر طور پر بروئے کار لانا لازمی ہے۔ تیسرے پلان اور بعد کے پلاؤں کے لئے جو حکمت عملی منظور کی گئی ہے وہ زراعت اور صنعت کے اقتصادی اور سماجی، ملکی اور مقامی ترقی کے ایک دوسرے پر انحصار اور اندرونی اور بیرونی ذرائع کی فراہمی پر زور دیتی ہے۔ زراعت کی ترقی جو دیہات کی افرادی قوت اور مقامی ذرائع کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر مبنی

ہے، ملک کی ترقی کی گنجی ہے۔

۷۷- ۱۹۶۱ء کے آثار

توسیع ہوئی اور تاج کی پیداوار میں ۶۶ فی صد۔ مصنوعات تیار کرنے والی منظم صنعتوں کی خالص پیداوار تقریباً ۱۰ گنی ہو گئی۔

پچھلے دس سال میں ترقی یکساں نہیں رہی۔ قدرتی اسباب، بین الاقوامی حالات یا ایمن حالتوں میں عمل درآمد کی غامضوں کے باعث تذبذب و فراڑ آتے رہے ہیں۔ آبادی کے اضافے نے بے روزگاری کا مسئلہ اور پیچیدہ بنا دیا۔ ناکامیوں اور غلطیوں، جن سے بچا جاسکتا ہے اور اقتصادی اور سماجی ڈھانچے کی ان کرداروں کے باوجود جو ابھی تک ہر طرف پائی جاتی ہیں نئی راہیں ہموار کر دی گئی ہیں اور پیشینہ ثابت تجربہ حاصل ہوا ہے۔

تیسرے پلان کی غرض و غایت خاص کر زرعی میشت کو مستحکم بنانا، صنعت، برقی قوت اور نقل و حمل کو فروغ دینا اور صنعتی سرفہر تیز کو جلد از جلد عمل میں لانا ہے۔ سادی موانع اور سماج کے سوشلسٹ ڈھانچے کی جانب نمایاں طور پر پیش قدمی کرنا اور کام کرنے والوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ان سب کو روزگار پر ہم بچنا ہے۔

ان مقاصد کا حامل ترقیاتی منصوبہ قوم سے دور رس تعلق کرے گا۔ یہ ضروری ہے کہ تیسرے پلان کے دوران میں ترقیات کا بار معماں طور پر پٹ جائے اور ہر سطح پر اختیار کی جانے والی اقتصاد مانی اور دوسری پالیسیاں عوام کی بہبود اور صحیح رہنمائی میں سدھار کریں۔

زراعت کو اولین ترجیح

تیسرے پلان کی ترقیاتی اسکیم میں زراعت کو اولین ترجیح دی گئی ہے۔ تیسرے پلان کے اہم مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دیہاتی علاقوں میں فوادی قوت کے وسائل کام لایا۔ دیہاتی علاقوں کی ترقی میں ذمہ داری اور تحریک عمل گرام نچا تیں، پچاسیت سٹیوں اور شعل پریشدوں کے ماتحت ہیں۔

دوسرے پلان کی طرح تیسرے پلان میں بھی بنیادی صنعتوں جیسے فولاد، ایندھن، برقی قوت اور شین سازی اور کیمیا کی صنعتوں میں توسیع تیز تر سماجی ترقی کے لئے ضروری سمجھی گئی، اور پوری میشت کی ضروریات اور تعلقوں کی اہمیت کے مطابق ان صنعتوں کے پھیلاؤ

انڈاز دہے کہ ۶۱- ۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے حساب سے قومی آمدنی دوسرے پلان کے اختتام پر تقریباً ۱۵۰۰ کروڑ روپے سے تیسرے پلان کے اختتام پر تقریباً ۱۹۰۰ کروڑ روپے۔ چوتھے پلان کے اختتام پر تقریباً ۲۵۰۰ کروڑ روپے اور پانچویں پلان کے اختتام تک بڑھ کر ۱۵- ۱۴- ۱۸ اور ۱۹- ۲۰ فی صد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تیسرے پلان کی مجوزہ رقم ۱۵۰۰ کروڑ روپے کے مقابلے میں چوتھے اور پانچویں پلان میں خالص سرمایہ کاری ۴۰۰۰ کروڑ روپے اور ۲۵۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوگی اور گھٹس بٹل ہوگی جو اس وقت ۸ فی صد ہیں تیسرے اور چوتھے اور پانچویں پلان کے اختتام پر برقی ازیب قومی آمدنی کے تقریباً ۱۱ فی صدی، ۱۵ تا ۱۶ فی صدی اور ۱۸ تا ۱۹ فی صدی تک بڑھنا ہوگا۔ پانچویں پلان کے اخیر میشت امنی مستحکم ہو جائے گی کہ بڑی سرمائے کی عام آمدنی کے علاوہ بیرونی امداد کے بیڑی کٹی میں وفادار نشرو نمایاں لگے گی۔

تیسرے پلان سے متعلق نفاذ نظر

پچھلے دس سالوں میں کل سرکاری اور نجی سرمایہ کاری، جو پہلے پلان کے شروع میں ۵۰۰ کروڑ روپے سالانہ سے زائد تھی، بڑھ کر دوسرے پلان کے اختتام پر ۱۶۰۰ کروڑ روپے ہو گئی۔ سرکاری امداد کی طرف سے سرمایہ کاری اس عرصے میں ۲۰۰ کروڑ روپے سے ۸۰۰ کروڑ روپے تک جا پہنچی۔ موجودہ قیمتوں کے حساب سے پہلے اور دوسرے پلان میں مجموعی سرمایہ کاری ۱۰۱۰ کروڑ روپے تھی یعنی ۲۱۰ کروڑ روپے سرکاری تھے ہیں اور ۹۰ کروڑ روپے نجی تھے ہیں۔

پہلے پلان میں زیادہ تر زرعی پیداوار میں ترقی کے باعث قومی آمدنی پر قدر ۱۸ فی صد بڑھی بلکہ اصل نشانہ ۱۲ فی صد تھا دوسرے پلان میں قومی آمدنی میں اضافہ ۲۰ فی صد رہا جبکہ اصل نشانہ ۲۵ فی صد تھا۔ زرعی پیداوار میں تقریباً ۲۰ فی صد

کے پروگرام تیار کئے گئے ہیں۔ تیسرے پلان میں بڑی اور چھٹی صنعتوں کے درمیان تعلق پیدا کر کے صنعتی ڈھانچے میں چھٹی صنعتوں کو کلیدی اہمیت دینے کی کوششیں جاری رکھی جائیں گی تاکہ صنعتی ترقی کے ناٹھے نصیبت اور دیہات کے لوگوں تک بھی پہنچ سکیں۔ اور ساتھ ہی دیہی صنعتوں میں جدید تکنیک کا بھی رواج ہو سکے۔

تیسرے پلان کے دوران میں ہماری قوم پانچ سال کی مدت میں اتنی ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے جتنی گزشتہ دس سال میں پہلے اور دوسرے پلان کے ذریعے حاصل کی گئی ہے۔ ہذا حال اوقات میں کھلے یہ پلان ایک بڑی اہمیت اور اقدیت رکھتا ہے۔ اس کے ابتدائی پہلو بھی اتنے ہی پیچیدہ اور وسیع ہیں اور ہر شعبے میں ایسا میار کارکردگی قائم رکھنے کی شدت ضرورت ہے۔ مؤثر عمل درآمد بھی

ملے گا جبکہ پچھلے ذرائع و وسائل سے زیادہ سے زیادہ کام نیا جانے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کی جائے اور ہمارے مرحلے پر عمل کر رہے ہو اور آئے والی مشکلات اور مسائل کا پورا علم ہو اور ترقی کے موقوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو اور سب سے بڑے کر کے ہر منزل اور پڑھے لکھے لوگ ذمہ داریاں اپنے سرے سکیں پلان چاہے کتنا ہی مفصل اعداد و ارقام ہو وہ صرف وسیلہ عمل کے موٹے موٹے خطوط کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ بہت بڑا چیلنج ہے جس کا مقابلہ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ ان کے تقاضوں کا شعور ہو اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے پیداوار کے نئے ذرائع کو جنم دیا جائے اور معاشی سہولیات اور سماجی انصاف کے لئے اہمیت کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت کو پیش نظر رکھا جائے۔

قانونی مراجعہ دھورپوری

داستانِ حسن

ہم سے خالی بشر سمجھتا رہتا حسن کا
سوئے کعبہ جا رہا تھا کاروانِ آرزو
جھک گیا مسجدوں کی خاطر اضطرابِ شوق میں
حسن لیلہ دیکھنے کو چشمِ بزموں چاہیئے
عالمِ بلا میں پہنچی جب نگاہِ خود شناس
جذب ہو کر اک نگار میں رہ گئے چودہ بلق
چہرہ زکرتنہا چلے جائیں گے سارے اقربا
سوئے کعبہ جائیں ہم یا سیرِ بیتِ فاخر کریں

ہم دیا معترض یہ کیا آپ نے اشعار میں

تھا بل خاموش پر بھی آج چہرہ حسن کا

شکست خواب

کھائیں مکیں ایک غریب مرد دہلی بھی ہیں اپنے سے گھر گھر کی سمجھتا ہے اور کیوں نہ سمجھے۔ وہ مزدوری کرتی ہے اپنی محنت جیتی ہے۔ محنت کا پھر میر کا میل ہے اور ہم لوگ فروخت کرتے ہیں جسم، عزت، پاکیزگی۔ اس کی کوئی برابری نہیں ہے۔ مگر زندگی کی دھندلی شام جب ہمارے تھکے ماتے جسموں پر پھریں ہیں کہ ابھرے لگتی ہے۔ تب ان خریداروں میں سے کوئی بھاگنے بھی نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ دودھ دے پیرا ہٹ سٹ کر اس کے کھانا کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسی ہی پکارا تھی جرمی آکر ان سے لپٹ گیا اور اس کے پیچھے بوڑھے استاد ہی داخل ہوئے۔

”بڑا اچھا تماشہ تھا“ اسی جوش میں جرمی بولتی تھی۔ ”ایک میری بربر کی لڑکی نے ٹھک ناچ دکھایا۔ اس نے تھے تھے پانزی کے لے اور ایک بڑی لڑکی نے بھرت تائب دکھایا۔ ایک سے ستا ہر شام کلیان بجایا۔۔۔۔۔۔ اسی میں بھی ٹھک سیکھوں گی اور تم مجھے اسکول پڑھنے کیوں نہیں بھیجتی ہو۔۔۔۔۔۔“

بچے کے سلسلہ کلام کو روکے ہوئے زہرے کہا۔ ”اچھا اچھا جا کر پڑھو بل اور کھانا کھا۔“

”ہنس پینے دودھ کر دو مجھے اسکول بھیجی۔“

”بچے دون کی بابا۔“ زہرے نے ہنسا چھوڑنے کی کوشش کی۔ جرمی اپنا ریشی غراہ سرسرا کر بھٹی اٹھ چلی گئی۔

”اب جلدی سے تندرست ہو جاؤ زہرہ بائی۔“ استاد جیسے حکم مندر

ہے ہیں کہا۔ ”سنگڑے قاقو پیا یا نہیں اور دودھ صرف ایک پیرا لیا واہ۔ اس طرح کہیں طاقت آسکتی ہے۔ ابھی یاد دیا پچھ سال تک تو تھیں اپنا

شام ہو چکی تھی۔ روپ بازار کے سب آباد کو بٹے جلی کے لال پیٹے ہرے نیلے قہقروں سے جھلکا اٹھے۔ دن بھر بے رونق رہنے والے کسے سے اس وقت سفید چاندنی، گاؤں کیے، پاتران، خامدان و غیرہ آواز سن کر بگڑے اور چوہوں سے ہلک اٹھے۔ کہیں سے گھنگھروں کی آواز آ رہی تھی کہیں جیلے کے ساتھ سازنی کے شرٹے جا رہے تھے۔ مگر زہرہ کا کھانا اس وقت بھی تاریک تھا۔ وہ کئی ماہ سے بیمار تھی اس لیے ہسپتال میں کئی شش پر مٹا لیا کرتے تھے، ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ ایسا نہ تھا کہ آستے کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ باناسی تمام تاجنے والیاں دھیراس کے پاس جمع رہتی تھیں۔

خدمت اتیار داری اور علاج میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ بوڑھے استاد ہی دن کا کافی وقت زہرہ کے پاس گزارتے تھے۔ تقریباً تین ماہ سے نوا کے نام پر ایک پیسہ بھی نہ ملے پیرا تادی نہ ہوئی کیا یہ سار لڑکی کو ناچ دکھانا سکھانے میں بھی تاخیر کرتے۔ لیکن شام سے آدھی رات تک روکا روکا وقت رہتا ہے اس لیے اس وقت زہرہ ابھی ہی رہتی۔ بوڑھی خادمر نے زہرہ پاور کابب جلا کر پوچھا: ”سیگم دودھ لے آؤں؟“

دودھ، نیاری اور دودھ۔ زہرہ کو دودھ کے نام سے چڑھتا ہوا تھی مگر دودھ نہ پیرے تو مزدوری کیوں کر دے سوجھ طاقت کا دوسرا نام من جو تائی ہے۔ دودھ تو بینا ہی پڑے گا۔ اس نے تھکے ہوئے ہلے میں کہا۔ ”سے آئیے۔“

گنڈے بستے پر لپٹی ہوئی زہرہ سوچ رہی تھی۔ کیا زندگی بہتر ہوگی۔۔۔۔۔۔ کیڑے کوڑے سے، جی بدتر۔ لاکھ غلو نہیں، سوکھا لیا

خیال رکھنا ہی پڑے گا۔ پھر جو ہی سہی تیار ہو جائے گی تو انشاء اللہ تعین کر کے کی ضرورت نہ ہوگی۔ واہ کیا خوب گلا پایا ہے۔ ادنیٰ پاؤں تو چلنے کی تھاپ کے ساتھ تھیں کر تھکتے ہیں جیسے پانی۔ میں کہتا ہوں دیکھنا تو جی سہ دن اپنی چوڑی نے منن میں قدم رکھا، سارے بازار کی روٹی سمٹ کر تمھارے کوٹھے پر چلی آئے گی۔“

”گر استاد ہی! میرا ارادہ جو ہی کو منن کی شش بست نے کا نہیں ہے۔“

”... تو...“ استاد جی چونکے، ہلکا سے ہوئے لوٹے کیا شادی کر دیتے کا ارادہ ہے۔ بائی جی اس خیال خام کو دماغ سے نکال ہی دیجئے تو تھپڑ ہے۔ کوئی شریف آدمی رند کی لڑکی کو اپنی دھن بنانے کو تیار نہ ہوگا۔“

”ہوں۔ آپ بھا فرماتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میری دلی خواہش ہے کہ وہ اگر کسی اچھے خاندان کی دھن نہ بھیجے تو کم از کم اس پیشے سے آزاد رہے۔“

”اس“ استاد نے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑھا چے میں تم کسبا کر کے گیگ؟ دو ہینڈوں میں دیکھو حال ہو گیا۔ مکان کا کرایہ، بنیا، دھیمی، دودھ والا، سب کی مقروض ہو گئی ہو۔ تم پر خدا کا کرم ہے اس نے چاندی سیٹی ملا فرمائی ہے۔ دھن دوسری ہم پیشہ خورتوں کی طرح ادھر ادھر لڑکی تلاش کرتی پھرتی۔ خاتم نے تھیں جو تو چار سو میں خریدا تھا۔ قلم دے کر تیار کیا پھر بڑھا چے تک آرام سے بان بجاتی رہی۔“

”کاش مجھے قلم کے بجائے ڈبر دے دیا ہوتا۔“ زہرے نے آہ بھری۔ ”نہیں استاد جی تو نہیں چاہتی کہ ہماری جو ہی برتن صاف کر کے دھ کر داسے مگر آنا ضرور چاہتی ہوں کہ باقی بیٹ کے لئے اپنی جوانی کی دھان نہ بنانی پڑے۔ مگر اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ تانپنا گانا بڑے بڑے شریف گھروں کی ہوشیاں کیلئے لگی ہیں۔ کوئی گیت ہی، دکامت کرتی ہیں تو کیا میری جو ہی ایسا ہی سکھانے پڑھانے کا کام کر کے گزر بسر نہیں کر سکتی؟ محنت کر کے کسی پڑنثار ہو جائے یہ بات الگ ہے مگر اسے بڑھنے کیلئے کا کتنی شوق ہے۔ میں اسے چڑھاؤں گی اور اپنے دے کی موسیقی سکھانے کی تاکہ وہ اپنے ہنر سے روٹی کھائے۔ اسے وہ

فرما حاصل ہو جو ایک مزدوری کیلئے والی پگ دامن عورت کو ہوتا ہے مگر ہماری ایسی عورتوں کو حاصل نہیں ہوتا، خواہ ہم بہت امیری کیوں نہ ہوں۔“ استاد جی نے سر کھینچے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے تمھاری مرضی۔ لیکن سوچ سمجھو۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ فوجی کلاب بائی کی مثل میں چلے پر سنگت کرنی ہے۔“

”سلام“

استاد جی دعائیں دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔

شریت بنے، ادھر کچھ جانے کی دھنا اور کسی شخص کی ہمیشہ ہو کر زندگی بسر کرنے کی آرزو نہرو کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ اپنی جو ہی کے لئے وہ اسی خواب کو حقیقت میں بدل دینا چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا خنجر میں کئی اسکول کھل گئے ہیں جہاں بڑے گھروں کے بچے پڑھنا سیکھتے ہیں۔ کھنگ ناچ کے مشہور استاد سے اس نے ان کی کراس کی لڑکی کو اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ وہ اس کو منن کے رقعے نہیں سکھانا چاہتی۔ استاد جی بھی جو ہی کو بھڑی، دادا اور دوتالی کے بجائے دوسرے تمام رنگ رنگین کی تعلیم دینے لگے۔ ماسٹر گھر پر پرکوس ختم کر کے اسے ساتویں جماعت میں شتر کے ایک ناٹی اسکول میں داخل کر دیا۔ جو ہی اس کو روزانہ آکر سناتی۔ ”ای میری بہت سی سہیلیاں بن گئی ہیں۔ انجنیر صاحب کی بیٹی آدھا تو مجھے آج اپنی موٹر میں سے جا رہی تھی۔“ ای ڈاکٹر جاہیر کی انداز کو بوسا ستر استاد سکھاتے ہیں وہ چالیس روپے ماہوار لیتے ہیں۔ ای ہادی شتی تھیں جی بہت اچھی ہیں۔ میں بھی پڑھ کر گھر آکر سناتی ہوں گی۔ ای گانا سکھانے والی بہن کی کوڈ پڑھ سوسو روپے ماہوار لیتے ہیں۔ میں بڑی ہو کر اپنے اسکول میں گانا سکھلاؤں گی۔ ای جب میں کھانے لگوں گی تب تم یہ گانا بنا بند کر دینا۔ مجھے یہ گانا سننے والے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ کیسی دواہیات باتیں کہتے ہیں۔“ ”بیٹی کی باتیں سن کر ذہن کا دل بارغ بارغ ہو جاتا۔

دن کو رات کے تین تین سال ہیں جو کمال کھنگ ناچ میں ہوئی نے حاصل کیا اس پر بندہ سارا دھنگ تھے۔ کلاس کی موسیقی میں کرشن بھگتی کے گانے جو اس غریب سے گاتی کہ استاد جی نے اس کا نام میرا رکھ دیا

تھا۔ سارا کچھ ملے کسی راستہ چلتے موقوفین جہیت لوگ رک کر کھٹے کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ زہرہ بیٹی کی اس لڑائی کو دیکھ کر بہت خوش تھی اور اس دن کے خواب دیکھ رہی تھی جب اس کی جوی موسیقی کا اپنا اسکول چلیے گی۔ شہر کے موزوں لوگوں کے بچے اس کی آواز پر بھی جی کہہ کر عزت کریں گے۔ شہر کے بڑے بڑے موسیقی کے جلسوں میں عزت کے ساتھ جانی جائے گی، محل کی دفاتر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے۔ اور اور پھر شاید اس کی قسمت جائے تو کوئی شریف دل والا کلا کا راستے اپنی رفیقہ بنائے پرامادہ ہو جائے۔

ایک دن جوی اسکول سے واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ ماں کے گئے ہیں یا ہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی۔ "ای تمہیں اجازت دی تھی چیسے گی۔"

"کسی بات کی؟"

"سول لائن جانے کی۔ تم مجھے میری پھیلیوں کے پاس نہیں جانے دیتی ہو نہ انھیں بلاتی ہو۔ مگر میں آج عدہ کر گئی ہوں۔ وہاں کے بڑے اور لڑکیاں مل کر دیوانی پر جو وراثتی شوکر رہے ہیں اس میں میں کھٹک ناز ناچوں گی اور سارا پر بھی میرا کدو بھی گاؤں گی۔ مگر انھیں جیلے والا نہیں لڑا ہے۔ میں اس دن استاد جی کو اسے جاؤں گی۔"

دیکھو اسی اب منہ ست کر دینا۔ وہاں ڈاکٹروں پر وفیروں اور وکٹوں کی لڑکیاں میری کتہ خوش دہا کر رہی تھیں۔

"اچھا! زہرہ نے کہا ہے شک وہ بڑے گھروں کی عورتوں میں جیسے کاتی کھچی ہے گھر کی بیٹی جی تو ان کے بچوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ سکتی ہے۔ وہ کچھ کاکٹول ہے اور اگر وہاں کے موزوں لوگوں پر اس نے اپنی دھاک جمائی تو سب اسکول کھلنے میں ہولمت ہوگی۔ شاید اسی دن سے کچھ صاحبان اپنی بیویوں کو کھٹک ناز کے فوٹو کے لئے منظور کر لیں۔ زہرہ کا دل اس خیال سے کھل اٹھا۔

خوب تیاریاں لی تھیں۔ انجیر صاحب کے بڑے لان میں سینکڑوں گریں پڑی تھیں۔ دیباں بھی تھیں۔ ہواؤں کا پانی پینیا جا رہا تھا۔

والاں بھی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا اور بیٹی پردوں سے ڈھکا ہوا پیش ہوا شان دار رنگ رہا تھا۔ سات بجے سے وراثتی شوکر پروگرام تھا اور والاں بھی سے شہر کے قلمی یافتہ، ہتیب، موزوں اور دولت مند لوگوں سے گھیرا تھا۔ یہ تو ان کے بچے بیویوں کا پکڑل پروگرام تھا دیکھنے کیلئے آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادے پر مودہ یا جو کر ڈاکٹر گڑھی تھے، عمر بھی مورت سترہ سال کی تھی، ہنر پریشان تھے۔ گرین روم میں کوئی ان سے سو نہیں ٹیک کرنا تو کوئی صاف بندھوٹے کی جلدی کرتا۔ لڑکیاں کریم پاؤڈر بندھی اور دھ کے ساتھ ہولی کھیل رہی تھیں۔ مگر جیلے والا بھی ٹک غلام تھا۔ پہلی بار وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا شوکر رہے تھے۔ یوں تو اس کو لالوں میں پر ڈیسروں کی ہدایت کاری میں ان سے بہت سے بچے چھپاں اور کاری کر چکے تھے۔ یہ ذمہ داری ان پر پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ سات بجے۔ پرمودہ بیچ اٹھا۔ "ارے شیشلا تم ابھی تک مسروٹی بن کر تیار نہیں ہوئیں۔ اوشا، سندھا، کلا، جیلے پر لائن بنا کر کھڑی ہو۔ رعیش تم پردے کے پیچھے سے من مٹن گاؤ۔ یہ لڑکیاں بیچ میں بھول گئیں تو سب گڑ پر ہو جائے گا۔"

"جیلے والا نہیں آیا۔ راجند نے گھبرا کر بتایا ہیں ہے پوچھا۔ اور سیکھا تیری سکھی جوی کہاں ہے جس نے کھٹک ناز کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اب ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ اس کا گھر تباہ تو کسی کو بلائے بیچوں۔"

"گھر کا مجھے پتہ نہیں۔"

"کس کی لڑکی ہے؟" وادیہ بھی پتہ نہیں۔ ناز کے بغیر پروگرام خراب ہو جائے گا۔ تو جی بے وقت ہے۔ تین سال سے کھٹک اسکول میں جاتی ہے گراسٹریج پر آنے کے نام سے ناٹی مرتی ہے۔"

باہر پردہ کھلوانے کے تباہیاں بج رہی تھیں۔ کسی طرح پردہ اٹھا بیٹھ دیکھنے کے گانے سے سب سرے لگ رہے تھے۔ پھر بھی "تباہیاں ہیں، دادی کیوں کہ جی کی حوصلہ افزائی کرتی مردی تھی۔ ایک لڑکی فیم ہوئے گڑھیکے سے، اٹھڑے ہوئے سے۔ پرمودہ گرین روم میں جھٹلا کر کہا۔ "سور کھیا کیا سٹیج پر جا کر سکھایا پڑھایا سب بھول گئی ہے تمہاری سکھی جوی کہاں غائب ہو گئی۔" جیلے والا کہاں مر گیا ۹۹؟

AMOUNT	NO.	DATE	INDIA
ICE OF ORIGIN	NO.	DATE	INDIAN POSTS AND TEL
SS AMOUNT			INLAND TELEGRAM
ICE OF ORIGIN			SENT AT
DE	SERVICE INSTRUCTIONS	BY	
ELETE CATEGORY NOT REQUIRED) OR PRIMARY/EXPRESS/MON-STATE/STATE/		(SENDER TO WRITE BELOW THIS LINE)	
ECIAL INSTRUCTIONS BY SENDER R. G. "REPLY PAID", ETC.	NAME BANERJEE	TF 31670	
	ADDRESS TELEGRAPH OFFICE	NEW DELHI	

تاریلی فون نمبر کے پتہ پر بھیجئے

تارسانی کی اس سروس کے لئے آپ کو پتہ میں بس اس آدمی کا نام ہے
آپ تار بھیج رہے ہیں اس کا ٹیلی فون نمبر اور ڈاک گھر کا نام ہی تو لکھا ہے۔ ٹیلی فون نمبر
سے پہلے بی ایف ضرور لکھئے۔ بی ایف اور ٹیلی فون نمبر کو ایک ہی لفظ مان کر دہرا لکھتے
جاتے ہیں۔

آپ کا تار جلدی پہنچے گا



آپ فون پر بھی تار تک کہہ سکتے ہیں۔ اس کے لئے
براہ کرم ڈوگرام کا نمبر ڈائل کیجئے

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمہ ڈاک و تار

باہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹- اسٹریٹ نمبر ۳- پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲- رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵- بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۳۱ گرینچ روڈ سنگاپور

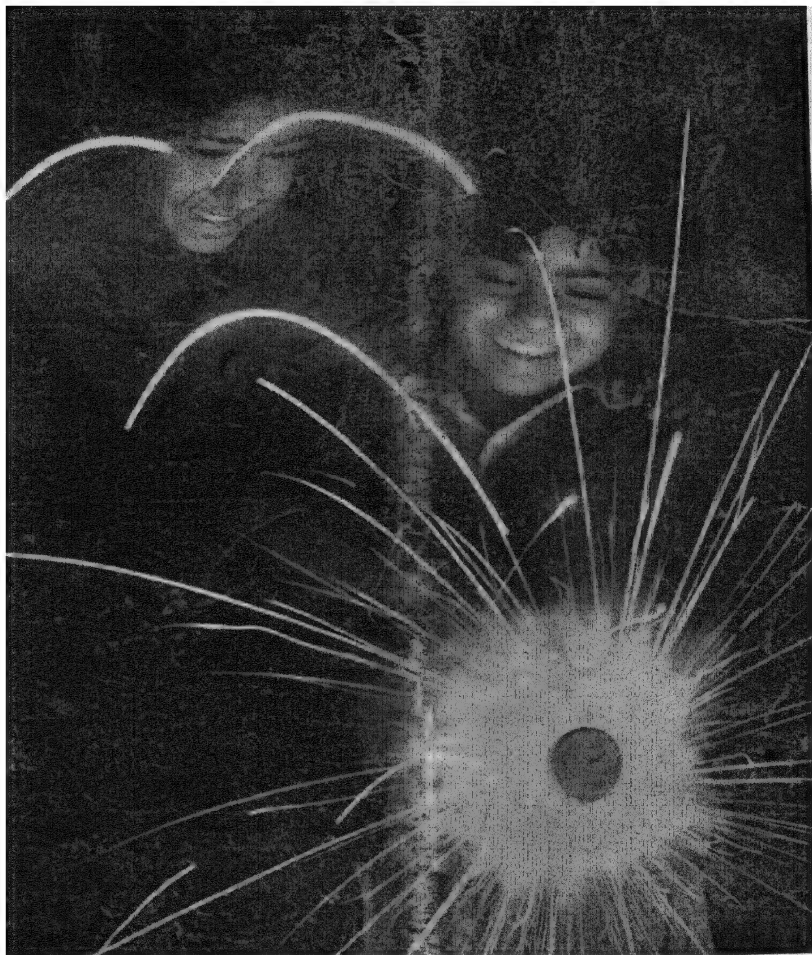
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں آج کل کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ بھیج دیں تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی سہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تھری ماہ پہلے ہی انہیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریسپانڈ' کارڈ بھی بھیجا جائے گا جس کی خاموشی کر کے سپرد ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے وی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ادارہ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

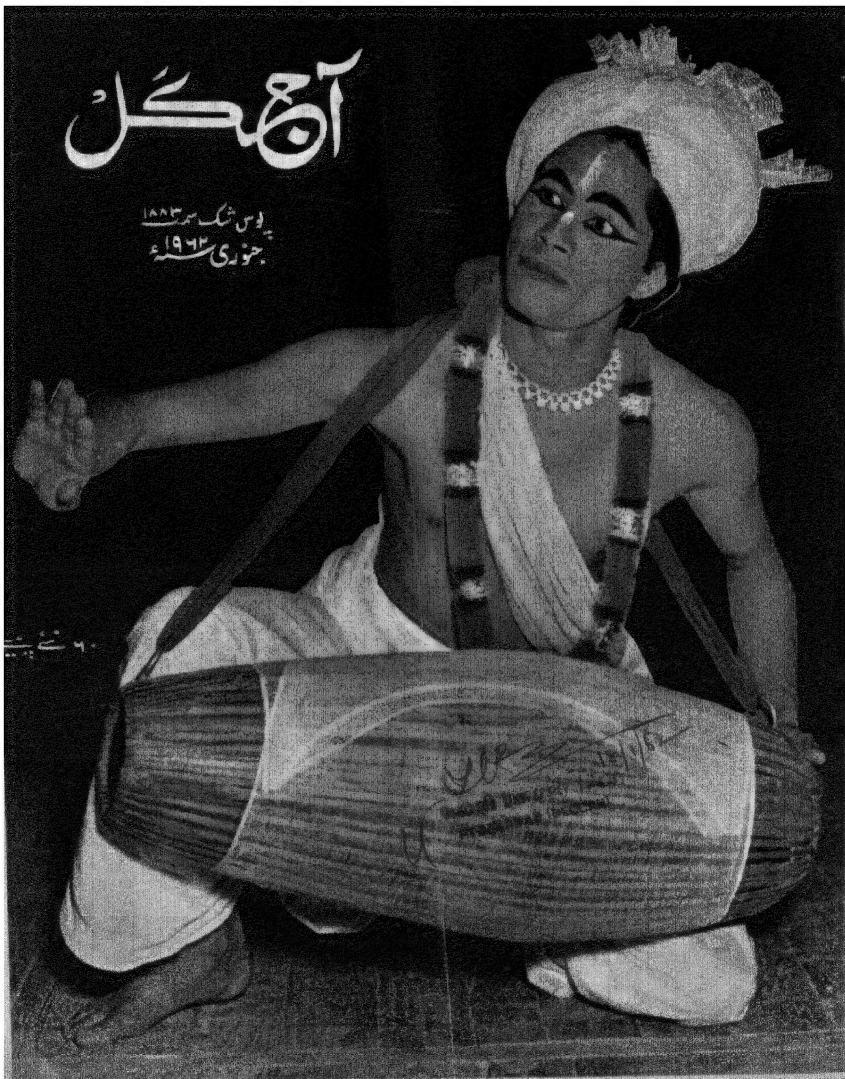


Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آه گل

پوس شک ۱۸۸۳
جنوری ۱۹۶۲ء



ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نہایت تہر و سے بات چیت تیر منڈی	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
ابوالکلام آزاد	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
تیسرا پنج سالہ پلان	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ٹاپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے
نمبر ۱-۲-۳-۴-۵	(دفتر)	(دفتر)

لے کا پتہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈوٹیرن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

ملاحظات

تہذیبوں کا سنگم رہا ہے اور مشترکہ ثقافت کی نمائندگی کرتا رہا ہے۔
 وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے افتتاحی تقریر میں
 امید ظاہر کی کہ مورخین تاریخ کو صحیح طریقے سے پیش کرنے کی کوشش
 کریں گے اور خصوصاً ایشیائی مورخین ایسی غلط باتوں کو دور کرنے
 کے لئے ضرور کوشاں ہوں گے جو مغربی مورخین نے ایشیائی تاریخ
 میں بھر دی ہیں۔

آج جبکہ دنیا میں نظریوں کا اختلاف بڑھتا جا رہا ہے
 اور اس کا ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں پوری دنیا ہی نہ ختم ہو جائے
 تاریخ دانوں پر بیڑی بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ ان کا
 فرض ہے کہ وہ ایسی تاریخیں لکھیں جو نفرت کی بجائے محبت،
 جنگ و جدل کے بجائے صلح و آشتی، شک و شبہ کی جگہ اعتماد
 اور یقین پیدا کریں مقصد یہ نہیں ہے کہ واقعات کو ٹوڑ مروڑ کر پیش
 کئے جائیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان باتوں کو زیادہ آ جا کر کیا جائے جو دنیا
 کو طاق رہیں اور ان کو کم اہمیت دی جائے جو اختلاف اور اشتباہ
 پیدا کرنے کا باعث ہوں۔

مشرقِ رسمِ اللہ کے باب میں تحقیق و ترقی ہمیشہ جاری رہی ہے۔
 ساری دنیا کو ایک ہی ریاست بنانے کا خواب ابلیغِ نفردیکھ رہے ہیں
 یہ خواب شرمندہ تکمیل نہیں ہو سکتا جب تک دنیا بھر کی زبان ایک

دوسرے کے دوسرے پہنچنے لگتی ہوگی ہندوستانی کونسل
 اور ہندوستانی بین الاقوامی مرکز کے زیرِ اہتمام ہی دہلی میں پہلی ایشیائی
 تاریخ کانفرنس منعقد ہوئی اس میں ہندوستان اور برصغیر ملک کے
 سوسے زائر مندوبین نے شرکت کی۔

یہ کانفرنس کئی لحاظ سے بڑی اہم ہے۔ آج ایشیائی ملکوں
 میں جو بیداری پیدا ہو رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ باہم مل بیٹیں
 اور ایسے نظریات اور واقعات کو جو خطوں میں جو ان میں مشترک
 ہیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی اور بیداری پیدا ہو۔
 دوسرے یہ کہ مغربی مؤرخین نے ایشیائی جو تاریخی مرتب کی ہیں وہ
 عام طور سے صغیر شہرہ ہیں اور ان میں حقائق اور واقعات کو ٹوڑ
 مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ایشیائی
 قوم گویا کسی مغربی قوم کی منتظر تھی کہ وہ آکر انھیں تہذیب اور
 شائستگی کا سبق سکھائے۔

پروفیسر ہالین کیر نے اپنی ریزلمندی تقریر میں ٹھیک ہی
 کہا ہے کہ تہذیب اور انسانیت کو آگے بڑھانے میں ایشیائی
 ملک کا نمایاں ہاتھ رہا ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے کہ پہلی
 کانفرنس ہندوستان میں ہو رہی ہے کیونکہ آج ایشیائی جن باتوں کا
 علمبردار ہے ان کی جھلک ہندوستان میں شاید دوسرے ہر ملک
 سے زیادہ نظر آتی ہے۔ پچھلے پانچ ہزار برسوں سے ہندوستان مختلف

اور رسم الف لک دھرم۔ یکم عبدالقدیر انصاری پرنام بیٹ علاقہ
 دھاس نے اس باب میں غامض تحقیق کی ہے اور سلسلہ رسم الف لک کی
 بین الاقوامی پیسینجیوں کا ایک مستقل حل نکالا ہے۔

- ۱۔ دیکھئے میں جاذب نظر ہو
- ۲۔ لکھئے میں آسان دھواں ہو
- ۳۔ پڑھتے وقت اٹال میں دھوکہ نہ ہو
- ۴۔ ہر زبان کے لفظ کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھے
- ۵۔ لکھاؤ چھپائی اور ٹائپ کرنے میں سہولت ہو

انھوں نے اردو رسم الف لک کی خامیاں اور غریب پستی کی ہیں
 انگریزی حروف تہجی کو بھی جائزہ لیا ہے اور ان میں سے گیارہ
 حروف C G Q W X Y A I E O U
 کی خامیوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔

خبردار رسم الف لک کے لئے انصاری صاحب نے انگریزی
 حروف تہجی میں ہی اصلاح و ترمیم کی ہے۔ اس سے ایک فائدہ قدیر
 ہے کہ انگریزی حروف تہجی کو ماہر رسم الف لک کی حیثیت رکھتے ہیں
 اس لئے مشرقی رسم الف لک کی تجدید ایک بہت بڑے طبقہ و علم میں
 پسندیدگی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

اصلاح و ترمیم کے بعد انیس حروف صحیح قائم کئے ہیں اور
 اعراب کے پانچ حروف ان میں شامل کر کے جملہ حروف کی تعداد
 چوبیس ہے اس کے بعد جن حروف کے لئے حروف نہیں ہیں ان
 کے لئے انیس حروف کو بلا غریب الحزج حروف نقلوں اور گھروں
 کے فرق سے تشکیل دی گئی ہے۔ اس جوڑہ رسم الف لک میں کل بیالیس
 حروف ہیں۔ ایک کتاب مشرقی رسم الف لک کے نام سے انصاری صاحب
 نے شائع کیا ہے۔ اس کے متعلق اہل علم نے بہت اچھی رائیں
 دی ہیں۔

ہر زبان میں آوازوں کی تعداد محدود ہے۔ کچھ آوازیں
 ایک زبان میں پائی جاتی ہیں کچھ دوسری زبانوں میں۔ حروف صحیح

کے علاوہ حروف علت اور زیادہ دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن
 انصاری صاحب نے بڑی کاوش سے حرکتوں کی اونچ نیچ اور
 ہئیت، انشام و امانہ اور عارضہ کے باب میں محققانہ بحث کی
 ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا جوڑہ رسم الف لک مکمل ہے لیکن
 اس قابل ضرور ہے کہ اہل علم ان کی تحقیق کا بغور مطالعہ کریں اور
 اگر ان کے نزدیک تجدید منبہ ہوں تو اس کے رائج کرنے کی
 کوشش کریں۔

ملک کی خوش حالی اور ترقی کا دار و مدار ہماری تعمیری کوششوں
 پر ہے اور ان کے نتائج کو کسی دیکھ کر انکار نہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا
 ملک کسی رفتہ رفتہ کی ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس فائدہ سے مستمال
 حوصلہ افزا ہے اور ہم ترقی کے میدان میں برابر گمے بڑھ رہے ہیں۔ حالیہ
 میں وزیر اعظم بنڈت ہرو کے ماتحت بھاکرہ بنڈ کے بانیس جانتا ہوا
 پاور ہاؤس کا افتتاح ہوا جو ایشیا کا سب سے بڑا پاور ہاؤس ہے
 اور جس کی تعمیر پر ۲۲۰۲۲ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اس سے دور
 دور تک برقی قوت پہنچ جائے گی۔ بھاکرہ بنڈ سے راجستان کے میلواڈ
 میں باقی پہنچانے کا انتظام کیا گیا ہے اور اس طرح یہ ریگستان فی علاقہ
 بھلتاے کھیتوں کی صورت میں بدل جائے گا۔

اخریٰ کے ملکوں میں آزادی اور خود مختاری کی ہر کسی آہنی ہوئی
 ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ملک آزاد ہوتا رہتا ہے۔ ۹۔ دسمبر کو
 مشرقی افریقہ کا علاقہ ٹانگانیکا بھی آزاد ہو گیا اور بلاغی دولت مشترکہ
 کی برادری کا رکن بن گیا۔ یہ علاقہ کوئی چالیس سال تک برطانوی حکومت
 کے زیر انتظام رہا۔ اس کا تقریباً تین لاکھ بارہ ہزار میل ہے اس
 کی آبادی ۹۰ لاکھ افریقی، ۷۷ ہزار ایشیائی اور ۲۱ ہزار یورپی باشندے
 پر مشتمل ہے۔ بیس امید ہے کہ ان ٹانگانیکا بھی ایک آزاد ملک کی حیثیت
 سے ہمہ جہت ترقی کرے گا اور آزاد دیندوں کی برادری میں اپنا جائزہ
 مقام حاصل کرے گا۔

موسیقار اعظم

۱ جنس پوکھلا دیا۔

جب ان کا ریاض دس بارہ گھنٹے سے نچاؤ کر گیا تو ان کی آواز گویا بالکل ختم ہو گئی۔ گانا تو کئی وہ بات کرنے سے بھی معذور ہو گئے یعنی ان کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ کئی ہی کوشش کرتے مگر آواز نکلنے سے باہر نہ آتی۔ وہ مایوس ہو گئے۔ مگر ان کے استاد اس تیز سے ڈرامی پریشان نہ ہوئے۔ انھوں نے ہدایت کی کہ ریاض اتنی ہی دیر کرتے رہو خواہ آواز قطعی نہ نکلے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب جو آواز نکلے گی تو وہ زندگی مبر خراب نہ ہوگی

لہذا خان صاحب اسی تندرستی سے ریاض کرتے رہے۔ چند دنوں بعد ان کی آواز یکایک کھل گئی اور ان کا ریاض بارہ گھنٹے سے بڑھنے لگا۔

یہ سچے میں گھنے ہنگ جاپہنچا۔

ان کے استاد کا کہنا درست ثابت ہوا۔ اس وقت سے اب تک خان صاحب کی آواز نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

اب ان کی تعلیم تقریباً مکمل ہو چکی تھی اور وہ حیدر آباد سے رام پور آ کر قلاب خان صاحب کے دربار میں ملازم ہو گئے تھے۔

قالب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے معاذ سے قالب رضا علی خان صاحب کے مشنرین ہونے پر بھی خان صاحب وہ بار بار اپنے متعلق رہے۔

قالب رضا علی خان صاحب ہی کے ذمے کا واقعہ ہے کہ سوان کے پینے میں جب یارشی کی آمد آتی تھی۔ قالب صاحب ہونٹوں سے حب و دُور

بیگمات کی سادھی منانے کا رستم کر لیا۔ جملہ بیگمات، کنیزیں، خواجہ سرا

مشائخ عین خان صاحب ۱۸۷۹ء میں اپنی آبائی وطن ہسٹری رپ۔ پی۔ میں پیدا ہوئے۔ جب دس سال کے برس کو پہنچے تو اپنے والد ملکی خاں (جو اس فن کے بڑے ماہر تھے) سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی جس کا سلسلہ چودہ برس کی عمر تک جاری رہا۔ ۱۸۹۲ء میں عنایت حسین خان (جو چچا زاد بھائی تھے اور آگے چل کر جن سے خرا کرشتہ ہو گیا تھا) کے پاس ریاست نیپالی چلے گئے۔ جہاں ان سے اور ان کے بھائی محمد حسین خاں بہن کا راور حیدر خاں اور ان کے معاذ زاد فدا حسین خان (جو مشہور موسیقار نثار حسین خان کے والد تھے) سے اور حاتی برس تک فن کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد ہسٹری چلے آئے اور اپنے چھوٹی زاد بھائی امداد حسین خاں (جو بدو خاں گویا کی کے شاگرد تھے) سے علم موسیقی حاصل کیا۔ پھر مدت کے بعد اپنی تنہا فخریہ ارتدوی (ضلع علی گڑھ) جا کر اپنے تین خاں اور محمد بیگال درس سے (جو اس دور کے نامک تھے) ایکس برس تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہاں سے عنایت حسین خاں کے پاس (جو اس دوران میں قالب خان رضا علی خان صاحب والی رام پور کے ہاں ملازمت حاصل کر چکے تھے) رام پور چلے گئے۔ اور ان سے مزید تین سال تعلیم حاصل کی۔ پھر جب عنایت حسین خاں (قالب فخر بیگ بہادر کے ملاوے پر حیدر آباد گئے) تو خان صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہاں دس برس نہایت لگن کے ساتھ اپنے فن کی تکمیل میں لگائے۔ اس دس سالہ مدت کے دوران میں ان کے فن کی تکمیل کے سلسلے میں ایک ایسا انقلاب نمودار ہوا کہ جس نے

اور فوج کے کئی ہی جوانوں کے ساتھ قزاق صاحب اپنے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ درمیان پر چھوٹے ڈال دیئے گئے اور بادشہ کی بوجھار کا اختیار رکھا جاتے تھے۔ بادل کسی حسین سوخ کی طرح آتے اور گزر جاتے مگر بارش نہیں ہوتی۔ اسی طرح آٹھ دن بیت گئے۔ مٹی ٹھوس رعد قزاق صاحب نے خان صاحب کو بلانے کے لئے گنگوڑا لگائے تاکہ ماکہ دیا تاکہ پانی برس سکے۔ خان صاحب نے منہ کر گھبرا گئے کیوں کہ آج ان کے فی کا امتحان تھا۔ اور اس امتحان میں کامیابی کی انہیں ہر دم امید بھی نہیں تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے میکر راگ الاچیت سے بادل کے سوتے ٹھنڈے چائیں گے۔ لہذا انہوں نے بعد از امتحان عرض کیا "مغور کی تہیل ارشاد سے قادم انکار کی برأت نہیں کر سکتا لیکن دراصل وہ اس کا اہل نہیں۔" مگر قزاق صاحب نہیں مانے۔ ساز منڈائے گئے و دیگر دیواری گیسٹہ اور اہل دربار اکٹھا ہوئے اور ایک کمرے میں بغل سرود کا اہتمام کیا گیا۔

خانصاحب اس وقت مدد پر متناظر تھے۔ ان کی انہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ کر تیس اور وہ عالم خیال میں اللہ تبارک تعالیٰ سے اس امتحان کی کامیابی کے لئے گڑا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد خانصاحب میکر ہلے آگئے بیٹھے۔ مہارزی نے ان کا رنگ آج بالکل بدلا ہوا پایا۔ آواز کی غنائت اور اس کا چادو حد کو تجاوز کر گیا اور وہ خود دنیا و فانی سے بے خبر ہو گئے تھے۔ ان کی آواز کی سحرانچہ نے ہر سامع کو مسحور کر دیا۔ ہر شخص پر وجدانی کیفیت طاری تھی اور سب اپنے گرد و پیش سے بے خبر۔ پھر سب لوگ اس وقت تیند سے جاگے جب روش دان کے راستے پاؤں کی بوجھار کمرے میں آئے گی۔ اب کیا تھا قزاق صاحب کا چہرہ مکمل اٹھا اور مہارزی کی آنکھیں پیر سے پیر کی پلکیاں جھپکنا شروع ہوئی اس وقت جتنی مسرت ہوئی ہوگی اس کا اتنا نہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آج انہوں نے اپنے فن کی مسماح پالی تھی۔ اس واقعہ کے نگہ بگ میں برس بعد ۱۹۵۴ء میں دوسری بازار کلرڈ ریٹ کان پیر میں آپ کو میکر راگ کانے کا اتفاق ہوا۔ جس وقت آپ نے اسے شروع کی تھی۔ ملنے بالکل صحت تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ سارے جھللا رہے تھے۔ ادھر آپ کانے کے بعد ادھر

خدا جانے کہاں سے بادل کے ٹپوٹے آسمان کو گھیرتے رہے۔ اور جب آپ نقطہ عروج پر پہنچے تو ایک ٹوک بارش ہوئے گی۔ بال میں جھرتے ہوئے لوگوں کو میں میں منیٹ نامور موسیقار تھے بارش کا علم اس وقت ہوا جب بارغ میں بیٹھا ہوا مالی اورچ کیدا بارش سے بچنے کے لئے کمرے میں شمرعت سے داخل ہوا۔

اس کے علاوہ چند بار اور بھی آپ نے میکر راگ کا مظاہرہ کیا جس میں ہر مرتبہ اسی قسم کی صورتیں پیدا ہوئیں۔

قزاق صاحب کے دھندلے رنگ کا کامیاب مظاہرہ کر کے خانصاحب نے دام پور کے درباری گوتیوں میں صرف پہلا نمبر حاصل نہیں کر لیا بلکہ قزاق صاحب کے دل میں اپنی قدر و قیمت حد سے زیادہ بڑھائی۔ یہی اب بھی آپ اپنی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ لہذا وزیر اعلیٰ میں کار سے (جو خوشامدہ دیکھنے کے دربار کے مہارنہمت خان سردارگ کا دلدادہ ہیں سے تھے) ادھر دھندلے کے تعلیم پیتے رہے۔

۱۹۲۵ء میں گنگوڑا میں منقطع ہونے والی میڈک کانفرنس میں آپ نے پہلی بار شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ہندو ریاستوں سے ممتاز ذہنی کار آئے تھے اور ادوہ کے تمام نڈو ساساں مجلس میں شریک تھے۔ تمام فن کاروں نے اپنے کامات کا مظاہرہ ان کے دوبند کیا گرامیائی کا ہرا خانصاحب کے سرور اور آپ کو ایک گونڈ میلل ادوایک سرٹیکٹ پیش کیا گیا۔

۱۹۲۶ء میں گنگوڑا کی دوسری کانفرنس میں شمولیت کی۔ جس میں آپ کے فن کو بہت سراہا گیا اور اعام و اکرام اور ادوایکس سے توازی کیا۔

کچھ دنوں بعد ریاست درہیلڈ ملے گئے۔ جہاں "سنگیت ہوش" کا خطاب حاصل کیا۔ اس کے بعد گنگوڑا پر ورتی ہوئی میں ایک منظم سرود ختم ہوئی جس میں ادوہ کے راج گان اور دیو سستی کے لہجہ، کے علاوہ اور کئی سو افراد شریک تھے اور یہاں آپ کو "غز موسیقی" کا خطاب پیش کیا گیا۔ اسی اثنا میں کلکتہ کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے جہاں سے "غز موسیقی" کا خطاب پایا۔

۱۹۵۳ء میں اس سال کے بہترین سنگیت کارنیلیم کے لئے

جن اچے صدرِ محمود نے ایک بڑا درویش، ایک، بیش قیمت کھیری دوشالہ ایک طلائی قمیض اور ایک سندھ علی کا۔

۱۹۰۵ء میں دوسری بار صدرِ مہتمم نے خانِ نصاب کو ملک کا بہتر ترین موسیقار قرار دے کر انشادِ پیچیدہ میں پیچیدہ و محوش کا خطاب اور ایک سہری قمیض نیز ایک سندھ سے لواکر ان کی عزت و احترام کی۔

سب سے پہلے آپ نے دہلی ریڈیو سٹیشن سے اپنا سلیکٹ مین کیا اس کے بعد ملک بھر کے ریڈیو سٹیشنوں سے آپ کا پروگرام وقتاً فوقتاً نشر ہوتا رہا ہے۔ آپ کے ریکارڈ ہندوستان بھر کے ریڈیو سٹیشنوں سے پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ ملک کے سینکڑوں چھوٹے بڑے مقامات پر اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

اس فن سے آپ کی وابستگی کا زمانہ پندرہویں صدی کے قریب ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال کی ہے اور دس سال کی عمر سے آپ اس فن سے وابستہ ہیں۔ ہنسی، فن کی وجہ سے 'جمادیہ اکبریہ دہلی' تین برس سے آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

خانِ نصاب کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ یوں تو ہندوستان بھر میں ان کے شاگرد بکھرے ہوئے ہیں لیکن جسدِ رام آباد رام پور، دہلی، کلکتہ اور کان پور وغیرہ مقامات پر خانِ نصاب کے شاگرد زیادہ تعداد میں ملیں گے۔

خانِ نصاب کے چند مشہور شاگردوں کے نام حسبِ ذیل ہیں:-
اشفاق حسین خان (ریڈیو سنگر) اسحاق حسین خان (نواب صاحب رام پور کے مخصوص گویے) اشفاق حسین خان (ریڈیو سنگر) محمد نیازی دیمبرک پروڈیوسر کھنڈ ریڈیو سٹیشن، افغان جبین نڈی ریڈیو سنگر غلام تقی، غلام صادق (ریڈیو سنگر)

سازوں سے متعلق خانِ نصاب کا کہنا ہے کہ ہر ایک ساز کی آواز انسان کو مسحور کر سکتی ہے۔ بیشک یہ کہہ دینی کے قابل نہیں ہو۔ بریل (سازنی) آپ کے نزدیک سب سے بہتر مگر مشکل ساز ہے۔

موصوف ہر کسی ایک صنفِ موسیقی پر قادر نہیں ہیں بلکہ آپ پوری و صہریہ، ساوا، دھار، بچہ، خیال اور محشری کے ساتھ ساتھ دیگر رنگ لگاتے ہیں بھی یہی طوطی دیکھتے ہیں۔

آپ کا کہنا ہے کہ یوں تو صرحِ طور پر کسی ایک رنگ کو بھی گانا آسان نہیں لیکن جتنا مشکل خیالی ہے اتنا کوئی دوسرا رنگ نہیں ہے۔ جس نے خیال گایا وہ ہر ایک رنگ کو بخوبی گان سکتا ہے اور موسیقار کہلانے کا معنی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ ملک میں ایسے موسیقار چند ہی نکلیں گے جو خیال گانے میں ماہر ہوں۔ موصوف کو اس رنگ پر اتنا ہی کمال حاصل ہے اور دیگر رنگ تو خانِ نصاب کے علاوہ دوسرے کسی فن کار کو اس دور میں گانے سنائی نہیں گیا۔

آپ کے خیال کے مطابق وہی شخص ایک اچھا موسیقار نہ بن سکتا ہے۔ جسے کسی استاد کا ملے فیض حاصل ہو۔ جس کی آواز میں شہر دہے موسیقی کی اصطلاح میں الینور کہا جاتا ہے) ہو۔ جو بڑے فن قدرت رکھتا ہو اور جسے رنگوں سے پوری واقفیت حاصل ہو۔

موصوف نے جن جن فن کاروں سے اس فن لیلیٹ کو حاصل کیا ہے۔ اور جن کے اسما و گرامی اور بڑے گانے چکے ہیں۔ وہ سب کے سب اس فن کے آفتاب و ماہر ہیں۔ آپ آواز کے آنا و بڑھاؤ پر صری قدرت رکھتے ہیں وہ مشکل سے ہی کہیں اور ملے گی اور آواز کا نہ ٹھٹھٹہ والا سلسلہ اتنی زیادہ دیر تک قائم رکھتے ہیں کہ اس پر حیرت ہوتی ہے۔ خانِ نصاب کے گانے کی خوبی یہ ہے کہ سامن پر ایک عورت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

اکثر موسیقاروں کی طرح آپ نے بھی کچھ جدید رنگ، رنگینیاں ایجاد کی ہیں۔ مگر آپ پرانے رنگ اور رنگینوں کی کئی قابل ہیں۔ یوں تو آپ کا تعلق سدا رنگ سے بھی ہے۔ لیکن آپ درحقیقت تان سین ہی کے خاندان سے متعلق ہیں۔

اس طرح آپ کو ایسا رنگ کے مشہور گھرانے کے ایک کامیاب ترین نمائندے کہلائے جاتے ہیں۔

مدرسہ محمود گادواں بیدار

ملک میں پھر سے زندہ کیا اور ان کا بنایا ہوا مدرسہ طحا، دکرہ شہیلہ، اجین اور امراتو کی جامعات کی طرح درس گاہوں کے سلسلہ کی آخری کڑی بنا اور ہندوستان میں مغربی طرح کی جامعات بننے سے پہلے یہ ہندستان کی سب سے بڑی آخری جامعہ ثابت ہوئی۔

خواجه محمد الدین محمود گادواں اپنے وقت کے بہت بڑے تاجر تھے، بہت بڑے سیاست تھے، بہت بڑے وزیر سلطنت تھے، بہت بڑے سپہ سالار تھے، بہت بڑے عالم تھے، یہ سب باتیں اب تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔ لیکن ان کا ایک کارنامہ جس نے ان کے نام کو جاوداد بنا دیا ہے، وہ ان کا بنایا ہوا مدرسہ ہے۔ جب تک یہ مدرسہ اس سرزمین پر باقی ہے، آنے والی نسلیں کے دلوں پر اس کی عظمت کا سکڑا رہنما ہوتا رہے گا۔

آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے ۱۳۸۵ھ میں جب یہ عمارت خدو وزیر مملکت خواجه محمود گادواں کی راست نگرانی میں بن کر تیار ہوئی تو وہ آج کے ویران اور شکستہ مدرسہ سے بالکل ہی مختلف تھی لیکن آج بھی یہ ویران عمارت دیکھنے والے کے دل پر اپنے دیدار جلال اور اپنے سنگھوہ و عظمت کا ان مٹ نہ سکتا نقش ثبت کر دیتے پر قندار ہے۔

خواجه محمود گادواں نے اپنے دوا میں دولت سے وابستہ اور آگے چل کر عجب پورے کے عادل شاہی فرماں روا خاندان کے بانی امیر و بہت عادل خاں کے مشورے سے اپنا مدرسہ ۱۳۸۵ھ میں بنواتا شروع کیا۔ یہ بھی سلطنت کے تیرہویں فرماں روا سلطان جلال الدین محمد شاہ شری

شہر بیدار (ریاست میسور) بہمنی بادشاہوں کا دوسرا دارالسلطنت رہا ہے اور اپنی صحت بخش آب و ہوا، اپنے جزا قسب کی محل وقوع اور اپنی شان و آوا و خوب صورت عمارتوں کے فائدے سے ہمیشہ کے پہلے دارالسلطنت بگلوگر پر ہر طرح فوقیت رکھتا ہے۔ بگلوگر صرف ستر پچیس سال تک دکن میں ایک، بھرتی ہوئی مملکت کا دارالسلطنت رہا لیکن بیدار کو تقریباً ڈیڑھ دو سو سال تک مغربی ہند کی سب سے وسیع اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت کا دارالحکومت بنے رہنے کا امتیاز حاصل رہا ہے۔ بیدار میں یوں تو وسیع و عریض تختہ رہی ہے، مستحکم شہر بنایا ہی ہے، عظیم برج بھی ہیں، بلند بالا مقبرے بھی ہیں، پرستشگاہ مسجدیں بھی ہیں لیکن ان سب پر چھایا ہوا بھی سلطنت کے سب سے زیادہ مقتدر اور باقتدار وزیر مملکت خواجه محمد الدین محمود گادواں کا بنایا ہوا مدرسہ ہے جس کی تعمیر جہاں ہندوستان کے پورے خول و عرض میں منکشی سے لے گی۔

ہندوستان میں اقامتی جامعات قائم کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ طحا، دکرہ شہیلہ، اجین اور امراتو کی عظیم الشان دارالعلوم ہندوستان قدیم کی شہرہ آفاق جامعات ہی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اس طرح کی جامعات کی رسم قریب قریب ختم ہو گئی مسلمانوں نے اپنے ڈھنگ پر مسلمانوں کے ساتھ مدرسے قائم کئے اور مغربی مساجد ہی یہ ایک وقت عبادت گاہ اور مدرسہ کا کام دیتے لگیں۔ خواہیہ محمود گادواں نے مسجد سے الگ مستقل اقامتی جامعہ قائم کرنے کی رسم کو اس

بہن کا جسدِ حقاس کی وزارتِ عملی کے عمدہ جلیلہ پر خواجه فاضلہ نے۔ ہا
 عظیم الشان عمارت کو مکمل ہونے کے لئے تقریباً یکبارہ سال کی طویل مدت
 درکار ہوئی۔ اس کا نقشہ بنانے اور اس کی تعمیر میں خواجه محمد گاہر
 امورِ مملکت کے زبردست معروفیت کے باوجود دشمنی اور پردل چسپی
 لی اور خود اپنی راست نگرانی میں اسے تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر کے دوران
 میں کتنے ہی بار لوگوں نے انھیں اہم امورِ مملکت سے متعلق اس وقت بچا
 کر اس کی خدمت میں پہنچانے کی کوششیں کیں اور کتنے ہی موقعوں
 پر تعمیر کاروں نے ان کی راست ہدایت سے استفادہ کیا۔ ۱۷۷۷ء میں
 مدرسین کو بھیجا تو اس جگہ کے ایک قاری کو شاعر ساقی سے غزلہ کا ریز
 بکہ کر خواجه کے حضور میں پیش کیا۔

ای حیدر رخ و محمد بست تعمیر شدہ است قبلہ اہل صفا
 از کعبت سنا لقتل متنا

۱۷۷۷ء

اس عظیم الشان مستطیل عمارت میں تین منزلیں ہیں۔ اس کا
 طول شرقاً غرباً (۲۰۵) فٹ اور عرض شمالاً جنوباً (۱۸۰) فٹ ہے۔
 وسط میں سورج فیت کا ایک صحن ہے۔ مشرق کی طرف ایک نہایت
 کشادہ اور چھت ٹھک بلند باب الداخلہ بنایا گیا تھا جو باب باقی نہیں رہا
 عمارت کے باقی تینوں ضلعوں کے وسط میں بھی ایسے بلند و بالا طاق
 بنائے گئے ہیں اور اصل میں یہ درس کے بڑے بڑے عالم ہیں۔ اعلازہ
 ہے کہ یہاں کے فرش پر قریب قریب ایک ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔
 ان طاقوں کے اوپر بچے بنائے گئے ہیں جن کی وجہ سے عمارت کے تنکھ او
 اس کی دل آویزی میں بڑا خوش گوار اضافہ ہوا ہے۔ مدرس کے سامنے
 کے حصے کے دونوں گوشوں پر دو شان دار مینار بنائے گئے تھے جن میں
 ایک مینار باقی ہے۔ یہ مینار ایک سو فٹ بلند ہے اور اپنی
 وضع تلخ کے خلاف سے پورے ہندوستان میں پس اپنی آواز نکلتی ہے۔ ان
 میناروں کی وجہ سے عمارت کی عظمت اور شان درہ بالا ہو گئی تھی۔ مدرس
 کے سامنے کے حصے کو سفید، نیلے اور زرد رنگ کی کاشی کاری سے مزین
 کیا گیا تھا اور میناروں کو بھی اسی کاشی کاری سے اوپر سے لے کر نیچے تک
 سماں گیا تھا اور اس میں بل کھا پیڈین بنائی گئی تھیں۔ سامنے کی دیوار

آج کل دہلی

پر چھت کے قریب کاشی کاری میں کلام اللہ کی آیتیں لکھی گئی تھیں۔
 مینار اور چھت کے قریب کے قریب کے حصے پر آج بھی اس سے نیکر اور دل ناز
 کاشی کاری کے آثار کا ایک بڑا حصہ باقی ہے۔ اس کا مینار چنی ہوئی
 گلی کاری، ہندی ششکوں اور پاکیزہ خدائیں میں لکھی ہوئی عبارتوں
 کاش اور ان کی دل آویزی ہیں۔ لیکن یہی سے تعلق رکھتی ہے۔ عبارت
 کے حروف تہجین میں ٹیٹ کے قریب لیے اور چھ چھ پانچ کے قریب چوڑے
 ہیں۔ کاشی کاری کے ان دل آویز نمونوں کو دیکھ کر اعلازہ دغا ہا جاسکتا
 ہے کہ جب یہ پورا حصہ مکمل اور راستہ ہو گا تو اس کا منظر انھوں کی کسی
 تراوت اور کسی خندک بخشنا ہو گا۔

درس کے سامنے کے حصے میں باب الداخلہ کے ایک طرف
 مسجد اور دوسری طرف کتب خانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کتب خانے میں
 مدرسہ نفس، انیاب اور انوار کتبہ تہجین جس کی کئی تھیں۔ بچے میں کہ خود
 خواجه محمد گاہر ہی کے ہمدیں اس کتب خانے کی کتابوں کی تعداد
 تیس ہزار سے زیادہ تھی۔

محمد گاہر کا بیٹا یو ایچ مدرسہ ایک تاقی جامعہ تھی۔ اس میں
 طالب علموں کے صوا اساتذہ کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ مدرسہ کی
 عمارت کے اندر ایک ہزار کمرے بنائے گئے تھے۔ عمارت کے گوشوں
 میں بے ہونے وسیع اور کشادہ کمرے جن کے اندر کتابیں رکھنے کے لئے
 شیلٹ بھی بنے ہوئے ہیں، اساتذہ کے لئے مختص تھے۔ باقی کمروں
 میں طلبہ رہتے تھے۔ یہ سب کمرے اتنے روشن اور ہوا دار ہیں کہ آج کی
 ہماری اقامتی عمارت کے اقامت خانوں کے رہائشی کمرے بھی شاید
 اس سے زیادہ روشن اور ہوا دار نہ ہوں گے۔ مورخ فرشتہ کے جلد
 نمک بھی یہ مدرسہ پر طرح کا ہوا تھا۔ ایشیا کے دور دراز ملکوں تک اس
 مدرسہ کی شہرت پھیل گئی تھی اور دور دراز جہان کے طالب علم اس مدرسہ
 میں پڑھنے کے لئے آتے تھے۔

مدرسہ محمد گاہر میں نہ صرف لہیا و کو تعلیم مفت ملتی تھی
 بلکہ ان کے خورد و نوش اور ان کے لباس کا اہتمام بھی مدرسہ ہی کے
 ذمہ ہوتا تھا۔ اساتذہ کیلئے ان کی علمی خدمت کے ماحول میں کراں قدر
 تھا وہیں مقرر تھیں۔ مدرسہ کے احاطہ میں ایک اور دارالافتاء بھی

بنا گیا تاج کو تترہ گئے تھے اور اس میں تترہ یا تین طالب علموں کی رہائش کا انتظام تھا۔

مدرسہ کے اس مہتمم یا ناظم خراج کے لئے خواجہ محمود گاہاں نے نہ صرف اپنی ذات سے کافی بڑی جائداد وقت کی حق بلکہ ہمیں بادشاہوں نے بھی اپنے ہمد میں اس مدرسے کے لئے فقیرانہ ماحاش مقرر کر رکھی تھی اور اس کے اخراجات کی پامنائی کے لئے بعض دیہاتوں کی آمدنی بھی وقت کی حق - ایسے ہی ایک وقت اور مدد ماحاش کی سند جناب سید محمود صاحب مورخ بیدی کے مجموعہ نوادرات میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ سند سلطان محمود شاہ بہمنی کی عطا کردہ ہے اور اس میں مدرسہ کے لئے بیس سو چالیس تنک سالانہ بطور مدد ماحاش اور ایک گاؤں کے وقت کا ذکر موجود ہے۔ بہمنی بادشاہوں کے علاوہ سلطنت کے صوبہ داروں میں احمد نگر، بیجا پور اور گولکنڈے کے صوبہ داروں نے بھی بڑی بڑی جاشیں اس مدرسے سے لئے وقت کی حقیں۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد یہ امدادیں جاری رہیں لیکن جب ہر صوبہ دار نے اپنے اپنے صوبے میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور آپس کی فغانہ جنگیاں بہت بڑھیں تو یہ امدادیں بھی بند ہو گئیں اور مدرسہ ویران ہو گیا۔

دسہ بننے کے بعد خواجہ محمود گاہاں نے اس کی حدرات کے لئے اس ہمد کے ایک بہت بڑے عالم اور فارسی زبان کے آخری بڑے کلاسیک شاعر مولانا عبد الرحمن جاسی کو ایران سے بلانا چاہا لیکن اسباب کی بنا پر وہ اس پیش کش کو قبول نہ کر سکے۔ اس مدرسے میں پڑھانے کے لئے مدرسوں کا انتخاب ان کی دورہ و نزدیک تک پھیلی ہوئی علمی شہرت کی بنا پر کیا گیا اور جن جن کہ اپنے اپنے معنائیں کے باہر اور لگے نہ روڈ گاہاں ہی کو پڑھانے کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ خود خواجہ محمود گاہاں ریاضیات اور علم ہیئت کے بہت بڑے عالم اور ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی کثیر معروفیات اور اپنی کرسی کے باوجود اس مدرسہ میں ریاضی اور علم ہیئت پڑھانے کی خدمت اپنے ذمہ لے لیا۔ ۱۷۴۰ء میں بنا اور انھوں نے ۱۷۴۱ء میں شہادت پائی۔ اس طرح وہ نہ صرف تین صدیوں سے اس مدرسے کی خدمت کرتے رہے بلکہ

اپنی شہادت تک لگاتار دس سال اس مدرسے میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو ضرور ملیں گی کہ کسی صاحب ثروت یا صاحب اقتدار نے اپنی سماعت سے ایک بڑی درس گاہ بنا کر کھڑی کر دی، لیکن اپنی نوکانوں معوقین میں سے وقت نکال کر اس میں درس و تدریس کی خدمت بھی وہ انجام دے، اس کی مثال دھونڈے سے شاید ہی ملے گی۔

اس مدرسے میں عربی عرف و نحو، منطق، ریاضیات، ہندسہ، ہیئت، علوم معقول و منقول، طب اور ادب پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مدرسہ میں پڑھنے والے طالب علموں کے نام ایک خاص رجسٹر میں درج کئے جاتے تھے۔ اس رجسٹر کو "روزنامہ ہمایوں" کہا جاتا تھا۔ پڑھائی کے دودرے تھے۔ پہلا درجہ "حلازم" کا ہوتا تھا اور دوسرا درجہ "مدرس" کا۔ پہلا امتحان پاس کرنے کے بعد طالب علم کو حلازم کی سند دی جاتی تھی اور اسے مدرسے کے درجہ میں ترقی دی جاتی تھی۔ حلازم کے نصاب کے دودرے تھے۔ ان درجوں میں بلاغت اور کلام کی چوٹی کی کتابوں کے سوا اصول فقہ، قانون حدیث اور عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حلازم کی سند رکھنے والے کو دوسرے درجے کا قاضی یا بڑے شہروں میں ناٹب تاقی مقرر کیا جاتا تھا۔ دوسرے درجے کے مدرسے کے لئے کوئی نصاب یا امتحان مقرر نہ تھا۔ حلازم کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک مدت تک اوپنی جامعوں کو پڑھانے پر ہی "مدرس" کی سند عطا ہوتی تھی۔ مدرسے کے بھی بلحاظ تعلیم کئی درجے تھے۔ ناٹب، ششی، مولوی اور ملا۔ اسی درجے سے ملا عزیز، ملا نظام الدین، ملا سراج الدین صدر المصوہ سلطنت، بہمنیہ، احمد محمود صدر جہاں و وزیر ملک، بہمنیہ جیسے عالم قابل اور ماہر قارئین پڑھ کر نکلے اور اس مدرسہ کی عظمت میں چاہا نہ مانگنے کا باعث ہوئے۔ ایک مدت دراز تک اس مدرسے کے فارغ التحصیل ملایا ہی تھے۔ بہمنی سلطنت کو اور اس کے بعد اس کی جانشین احمد نگر، بیجا پور، بیدار اور گولکنڈے کی سلطنتوں کو ماہر علم، فقہاء، قاضی، معلم و مشائخ سلطنت سربراہ ہوتے رہے۔

یہاں یہ خیال نہ کرے کہ محمود گاہاں کا مدرسہ خالص دینی یا

ذہنی تعلیم کی تدریس کا مدرسہ تھا۔ جسے مشیر اس مدرسہ میں خاص اسلامی علوم جیسے قرآن، فقہ اور حدیث بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسے علوم بھی تدریس پڑھائے جاتے تھے جن پر کسی دین یا دھرم کی چاپ نہیں لگائی جاسکتی، فلسفہ، منطق، ریاضیات، ہیئت اور طب کی خاصی مذہب کی مرآت نہیں۔ یہ مدرسہ اپنے زمانے میں علم کا ایک بہت بڑا مینار تھا جو اپنے دور کی ساری علمی، ریاضیاتی اور سائنسی معلومات کا ذخیرہ عام میں پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خواجہ محمود گادان کی قائم کی ہوئی یہ افتاحی جامعہ مکہ و مینہ دو سو سال تک ہمارے ملک میں علم کا نور جھلکتی رہی۔ اس کے بعد چھر جو اس کی تباہی و بربادی کے دن آئے تو یہ بالکل ہی اجسڑ کر رہ گئی۔ اس کی بربادی و بربادی کا سبب سے بڑا سبب تو ہمیں سلطنت کا زوال بنا۔ اور اس زوال کے نتیجے کے بعد چھر جو طوائف، الملوکی، پھیلی تو اس کو ملنے والی ادا ادا ہیں بند ہوئیں۔ چھر یہ بریل کے بعد ہیں جب چاروں طرف سے بیدار ہو کر ابلیس اٹھ اٹھ، بجا پڑا اور گول کنڈے کے گلے ہوئے لگے تو اس نے مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے بیداری مخالفت کے لئے اس شہر کی عایشان عمارتوں، اداؤں اور محلوں کو دکھار کر ان میں لگے ہوئے حقروں اور تھولوں سے تفصیل رسد اور حصار تعمیر کئے۔ اس تباہی سے مدرسہ محمد گادان بھی نہ بچ سکا۔ اس کی اصل عمارت تو ایک عظیم عفو ذریعہ لیکن اس سے ملحق تمام عمارتیں تو زدی میٹیں اور تعلیم و تعلم کا سارا انتظام دہم برہم ہو گیا۔

عراقی دستکاروں کی اہمیت

بھارتی دستکاروں کی روایات بجا طور پر باعث فخر ہیں۔ وہ ماضی اور حال کے رشتے کی پوری کام دیتی ہیں۔ آج بھی بالمشبہ بھارت میں ہندی ادبے میار کی دستکاری کے ثبوت موجود ہیں جو ہماری عظیم وطن سے دنیا کے کبھی حصے میں تیار ہونے والے دستکار کے بہترین نمونوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ بھارتی دستکاروں کی صنعت اپنی تمام خامیوں کے باوجود آج بھی ملک کے صنعت کشوں کو نوڈی ہتیا کرے والا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آج دس لاکھ صنعت کش کئی اور جہتی منڈیوں کے لئے نہایت ہی خوبصورت اور دوزخہ کے کام کی چیزیں تیار کر رہے ہیں۔ آج منت نئی شکلوں کی چیزوں کی مانگ بڑھتی ہے اور ہمارا آج کا دستکار اس کا لاکھوں ایک کمر کر فیس رنگ دار چیزیں، خوش نیا پورے، بعض بعض خوشبوئیں اور چینی مٹی کی دکانیں بنانے میں مستعدی دکھاتا ہے۔ بھارتی دستکار ایل گاڑیوں کے دورے کر رہے ہیں جہاں کے اس نفلنے میں بھی کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس میں اسے اپنے پرانے فن میں مضامین ہیں سادہ سی تبدیلی سے کام لینا پڑا ہے۔

۱۰۷۶ء میں اورنگ زیب نے بید کو عادل شاہیوں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ مدرسہ کی عظمت، رفعت اور اس کے شکوہ سے وہ بہت متاثر ہوا اور اس کے دوست کر نے اور اس میں دوبارہ تدریس شروع کرنے کا فتوٰی بہت انتظام میں اس خروہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے اس مدرسے کے ایک مدرسے سے بارود خانہ کا بھی کام لیا گیا۔ آج سے تقریباً دو سو سال قبل رمضان ۱۱۰۷ء میں اس مدرسے کے ایک مدرسہ پر رات کے وقت بجلی گری اور بارود میں آگ لگ گئی۔ اس کی وجہ سے مدرسہ کا ایک مینار، کتب خانہ، باب الداخلہ اور مسجد سب ڈھیر ہو کر گئے اس کے بعد یہ عالی شان عمارت ایک مدت تک اپنی کس پرستی میں پڑی رہی۔ لوگ اس کے دروازے، چھت کی ٹائیں اور اینٹ پتھر ٹھاکر لے جاتے اور اپنے مکانوں کی تعمیر میں استعمال کرتے رہے۔ باقی عمارت آج بھی یوں کی توں کھڑی ہے اور اپنی عظمت رفتہ کی ماتم کر رہے۔ سابقہ دریا ست چدر آباد میں جب آثار قدیمہ کا محکمہ قائم ہوا تو اس کے نامور ناظم ڈاکٹر ظلام کینڈانی کی کوشش سے اس کے تحفظ اور اس کی مرمت پر توجہ ہوئی۔ اور آج جس عالم میں یہ عمارت دکھائی دیتی ہے اسے اس سابقہ دریا ست کا ایک فیض اور بدوستان کے اس قابل فخر ماہر آثار قدیمہ کی مساعی جملہ کا احسان سمجھنا چاہیے۔ حکومت ہند نے بھی اس عمارت کی اہمیت سے مرعہ نظر نہیں کیا ہے اور آج اسے قومی اہمیت کے آثار کی فہرست میں ایک ستارہ مقام حاصل ہے۔

کھیتوں میں چڑھ کر بری کی جھاڑوں کے علاوہ میٹھی سوسڑوں کے بیڑ
 بھی ہوتے تھے۔ دیڑھ چن کے ساتھ وہاں جا کر وہ بیڑوں کے ساتھ کانٹوں
 کا مزاج بھی کھیتی۔۔۔۔۔ مارے درو کے سی کرتی پھر بھی ریکہ اٹے جاتی۔
 سوسڑوں کا تو بھلا ہنسی کیا۔۔۔۔۔ ان بھی سوسڑی کی پس دار ٹھٹھی تھو سے چھل کر
 تھن میں ایک جاتی تو کھانے کنس کر اس کا چہرہ لال ہو جاتا۔

اس کام سے فرصت پا کر وہ سب بچے مدار کے پودوں کے پاس
 جا کھڑے ہوتے اور ان پر لگے ہوئے کسی کام میں نہ آ سکتے تھے۔۔۔۔۔ پھر ایک ایک کسی
 بڑے اور موٹے پتے پر بیٹھا ہوا بی بی بانٹوں والا برسے رنگ کا لڑا اٹھیں
 گھوڑا دکھائی دیتا۔۔۔۔۔ وہ ٹٹک کر کھڑک لیتے جیسے وہ بڑا نہیں چوکیڑ
 ہو جوا نہیں شے تو شے پر بڑا نہیں چھٹکانے لگے گا بڑا، جس بھی ایسی جینگی
 کے گھر سے جاتا ہے اس نے سبھی دید اور پران گھٹ کرچ رکھے ہوں۔

جب وہ مٹی کی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی دیواروں کی ٹھنڈی چھوٹوں
 نے کھینچی تو شایہ ہی کوئی راخیں ایسا ہوتا جو اسے بڑھ کر رک نہ جاتا۔

یوں تو سبھی اسے بتا کر دیتے تھے لیکن ان میں تین بوڑھے سب میں
 پیش پیش تھے۔ یعنی پھنگا سنگھ، لنگا سنگھ اور جھڑا سنگھ ان میں سے
 سب سے چھوٹا ستر سال کا اور باقی دو اسی سال سے کچھ ادھر یا ادھر۔

ان تینوں بوڑھوں کی آپس میں کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ وہ الگ
 الگ گاؤں میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے زمانے کا نامی ڈاکو رہ چکا
 تھا، دوسرا بڑا کھانا تھا اور تیسرا لفظ بازی کی چیزیں شادا میں، پھنگ
 چرس وغیرہ ایک موہے سے دوسرے موہے پہنچا یا کرتا تھا۔ اب یہ بڑے
 دھندے چھوڑ چھاڑ کر، داؤد خور نام چاہے، جبار کرتے تھے۔

ان بوڑھوں کی ڈاڑھیاں بہت گتھی، بہت لمبی اور زبرد قریب
 سفید تھیں۔ سر پر جاری بھاری پٹوہ بانہ تھے جیسے پودا خان بیٹ
 رکھا ہو۔ گلے میں کھد کے کڑے اور گڑوں کے نیپے نیپے، ہرے اور لہو رنگ
 کے تہبند۔ کچنے کو بوڑھے لیکن دیکھتے ہیں تو بے چارے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے
 ہاتھ، مضبوط بازو، چمکدار آنکھیں جن پر سفید جھونپلی پڑتی تھیں۔ ان
 تینوں کا ایم کھانے کا بیجا تھا۔

مر لڑھا کا کو بہت چاہتا تھا۔ ان کا اپنا آگاہ چھپا۔۔۔۔۔ جو کوئی

آتا کا کو کے لئے کھولنے، مٹھائیاں اور کپڑے لاتا۔ کاوان میں سے کھی کو کھی
 لیتی تو دھرمی سے جلا اٹھتی۔ "باپو!" اور تب اپنے نفعے سے بازو سے
 دوڑ پڑتی اور میرا چھل کنگے میں بائیں مائل کرتی۔۔۔۔۔ بوڑھے ہی اس
 سے کم کر اس قدر خوش ہوتے کہ ان کی آنکھیں ٹرم ہو جاتیں۔

ہر تیسرے بچے تو روز ایک نازک بوڑھا آتا رہتا۔۔۔۔۔ اکثر
 ایسا بھی ہوتا کہ کاوا ایک بوڑھے کی گود میں چڑھ کر گدیوں کی سیر کے بدلے
 تو گھر پر دو سرا بوڑھا اٹھتا رہیں جیسا ہوتا بھی وہ تینوں کے بعد دیگرے پہنچتے
 اس دن کا کو کی خوشی کا ٹھکانہ نہ ہوتا کیونکہ اس روز اسے زیادہ سے زیادہ
 نفعے اور مٹھائیاں ملتی تھیں۔

ایک روز شام کو جبکہ اندھیرے کی سیاہی کافی گہری ہو چکی تھی چھکا سنگھ
 کا کو سے ملنے کے لئے آیا۔۔۔۔۔ ایسے موقعوں پر کاوا اکثر ڈوڑھی میں اپنے تپ
 کے ساتھ بائیں کرتے دکھائی دیتی تھی یا بھی سے اس کے پیچھے کی ڈاڑھ
 کیا کرتی تھیں۔۔۔۔۔ لیکن آج اس کا کچھ ریتہ نہ تھا۔ درش سنگھ کی بی بی جاس
 ٹٹک رہا تھا۔ چھکا سنگھ کاٹ پر بیٹھے ہوئے بولا "کاوا کہاں ہے؟"
 درش سنگھ نے سرا پر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "وہ بیار ہے
 ۔۔۔۔۔۔ ریشہ (ڈکام) ہو گیا ہے اے۔"

"ریشہ" چھکا سنگھ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
 اب کے درش سنگھ کچھ نہیں بولا تو چھکا سنگھ کھد کر انہر چلا گیا۔ کاوا
 پچھلے چھوٹے سے کمرے میں اپنی نئی سی چارپائی پر لیٹا ہوئی تھی۔ سرسوں
 کے تیل کے چراغ کی چڑھ چڑھ روشنی میں وہ بائیں موم کی صورت دکھائی
 دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ شمر تھا، آنکھیں بند تھیں، ناک بھی بند تھی۔
 آج اس کی ناک کی ٹوک بھی ہونٹوں کی طرح شمر ہو رہی تھی امدادہ منہ
 سے سانس لے رہی تھی۔ اس کے کپڑوں کے سے ہونٹوں میں سے دھواکت
 دھبے دھبے چمک رہے تھے۔

چھکا سنگھ نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا اور پھر
 بھاری آواز میں کاوا کی ان سے پوچھا۔ "بچا! کاوا کب سے بیار ہے؟"
 کاوا کی ان پیار میں میٹھی روٹی پکائی تھی۔ گھونٹنے کی آڑ سے
 روٹی کھلی مچے۔

"کوئی دوا مارو؟"

”یکم کی کاڈھا چلا رہے ہیں۔“

پچھلے سنگھ نے کچھ دیر سوچا اور پھر تبہ بند کر پڑے اپنی ایفون کی ڈبیر نکالی اور چیک کیا ہی تھوڑی سی ایفون نے کراس کی نئی سی گولی بنائی اور پچھلے سے کاڈھے اگلے منہ میں سرکا دی... پھر پڑے امپینٹن سے بولا۔ ”پیکر نہیں... کل صبح تنگ ٹینک ہو جائے گی۔“

یہ ہم کردہ جھکا اور اس نے کاڈھے چھوئے؟ بچے ہاتھ پوجا اور بھاری قدم اٹھاتا ہوا بائیں لگا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایفون بہتے ہوئے رہنے کے پانی کو سکھ کر تک متسلک کر دیتے ہے اور زکام دم دبا کر صباگ جاتا ہے۔ اس نے اپنی حرکت عملی لاکھی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ اسی میں لگی تھا کہ جب صبح سب لوگ کاڈھ کا ایک دم ٹھیک ٹھاک دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر پھر دیکھا سنگھ نکلا۔ اسے جب پتہ چلا کہ کاڈھ بائیں لگا رہا ہے تو وہ بے بسی ہوا تھا۔ تبہ پھر پھر جاتا ہوا وہ کاڈھ کا کئی کھات کے پاس پہنچا۔ اسے کچھ دیر تک پڑم آنکھوں سے دیکھتا رہا... بائیں میٹھاں سے ادھر ادھر کے سوالات کئے۔ آخر جب اس نے بیاری کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تو عجیب ٹول کر ایفون کی ڈبیر نکالی اور اس میں سے نئے نیچے کے نئے مناسب خوراک نکالی اور اس کی گولی بنا کر پیاری کاڈھے پیارے منہ میں ڈھکا دی۔ اب نئی پیچھے سے اپنا کام کیا کہ نہ وہ جانتا تھا کہ دوادار کے معاملے میں کاڈھے ان باب یا کل کر رہے ہیں۔

وہ بھی پڑے امپینٹن سے رخصت ہوا۔

بائیں سے ہنڈا سنگھ کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کی لاڈ کی کاڈھ ہار ہے۔ گھر کے لوگ سوئے جا رہے تھے کہ اس نے آئی دو روزہ ٹھیک ٹھاکا یاد اور پھر اندر پورچ کر بولا۔ ”بھئی درشن سنگھ صاف کرنا کاڈھ کی بیاری کا حال سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا... جھکا چلا گیا۔“ پھر وہ کاڈھ کی نئی سی کھات کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ کاڈھ کو معص ریشہ ہے تو اس نے اعلان کیا کہ یہ تو معمولی بات ہے... اس نے بھی کمال منفا سے والدین کی آنکھ

بچا کر ایفون کی مناسب خوراک اس کے منہ میں ڈال دی۔

جاتے جاتے کہنا۔ ”میں تو ڈر گیا تھا کہ نہیں کوئی کھاس بیاری نہ ہو... ریشے بگڑانے کی کوئی بات ہی نہیں... صبح تک اچھلنے کودنے لگی...“

اس کے بعد ”ناچوڑوئی کا کھانصر اور ناچوڑوئی کی منہ کا قرہ لگا کر وہ خوش خوش ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جب دوسری صبح سورج دیوانے فور کا پہلا بنزہ پھینکا تو صبح کا تارا دور ہی سے گڈٹ بھاگا اور نفلوں سے غائب ہو گیا پھر کسان کی نیلا ہٹ، ہٹلی پڑتی چلی گئی۔ بڑے پستل کے پتے تالیاں جاتے لگے۔ پتلے نیلے آسمان میں ایک سفید کوڑو پیک پھیرا لیتا ہوا یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے چاندی کے ورق میں جان پڑ گئی ہو۔ کوڈوں کی کاش کاش کے شور میں کسان لے لے کر کھیتوں میں جا پہنچے۔ لہڑی کی زون ٹوں سے ساری فضا گونج اٹھی۔

ان سب چیزوں کو دیکھ دیکھ کر بچکچکے اور تالیاں جھانے والی کاڈھ اس وقت تک مچی تھی۔

درشن سنگھ کو پہلے تو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کیسے جب اسے محسوس ہوا کہ کاڈھ پرچ ایسی مری ہے کہ کوڈ کر نہیں آئے کی تو وہ جھوٹ جھوٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا ”نہیں نہیں میں اپنی لاڈ کی کوئل پر ہواہ نہیں کروں گا۔ میں تو اسے باقاعدہ چتا میں جلاؤں گا اور پھر اس کے پھول (ہڈیاں) ہر دوادار سے جا کر نکلیں گی میں ہبساؤں گا۔“

اس صبح کاڈھ کو گرد و دوارے میں طوے کا ناشتہ کرتے نہیں گئی۔ کوئی کافی سیواں بہت دیر تک کراہ پرشاد اٹھوں میں بٹھے کاڈھ کا انتظار کرتی رہی۔ کہیں دو پیر تک کسی نے اسے بتایا کہ بیاری نئی کاڈھ تو داہوڑو کال پرکھ کے چوٹیوں میں پہنچ چکی ہے کافی سیواں کاڈھ کی کھات پر کھرا پیار تھا۔ وہ اس کی موت کی خبر سن کر بہت اداس ہوئی۔ شام کے وقت اس نے گوردوارے کا سارا مین جھاٹو سے صاف کیا۔ گر نئی بی کی بیوی اور بچوں کی روتے

اس نے سب سے بڑی درمی میں بچادی۔ چونکہ اس روز کوئی
تہوار تھا اسی سلسلے میں یہ سب تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

جب رات ہو گئی تو مائی سیمیاں سنگت کے جوں کی حفاظت
کرنے کے لئے گوردودار سے کے برے پھانک کے باہر اے جوڑے
پر بیٹھ گئی۔

رفتہ رفتہ لوگ آگے آئے۔ سنگت جمع ہو گئی اور مشہد پر گھرنے
شروع ہوا۔ پچھلے سنگھ دیر سے آیا۔ جب وہ مائی سیواں کے پاس
ہو پہنچا تو کا کو کے سلسلے میں دکھ سکھ کرنے کے لئے وہیں بیٹھ گیا۔ اس
کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔ کا کو کا ذکر آتے ہی اس کی آنکھیں پر آب
ہو گئیں۔ بے چاری مائی سیواں اشاروں ہی اشاروں میں اسے
تسکین دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلے سنگھ نے ایمنوں والی بات
بھی بتادی اور یہ بھی کہا کہ سلام ہوتا ہے کہ اس نے لا کو کو ایمنوں کی
غواہت دلا کر ہی دی۔ اگر تھوڑی سی اور دے دیتا تو شاید وہ بچ
جاتی۔

اس کے بعد وہ آنسو پونچھتا ہوا سنگت میں جا کر بیٹھ گیا۔
پھر پچھلے سنگھ اور چند سنگھ بھی یکے بعد دیگرے آئے۔ تھوڑی تھوڑی
دیر کے لئے مائی سیواں کے پاس بیٹھے۔ انھوں نے بھی ایمنوں والی بات
بتادی۔

اب مائی سیواں پر یہ بات کئی کہانی پیاری لا کو کو ان بدھوں
نے کس قدر غصوں اور پیار کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔
مائی سیمیاں دنیا کے بہت دکھ جھیل چکی تھیں۔ وہ بڑی لمبی
نہیں تھی لیکن اس پر وہ اچھوٹا کال چڑھ کر خاص کر باہمی۔ وہ گورڈ

کی باقی کو اپنی طرح سمجھتی تھی۔ اس کے دل میں ان گھوڑوں کے فوری
کھٹکھٹکے کرتے کرتے تھے۔ وہ چانتی تھی کہ سنسار میں کئی ایسی
چیزیں ہیں جو نئی نئی چیزوں کی طرح ہیں یا رنگین پردوں والی تیلوں
کی طرح۔ وہ پرہیز اور تنگیاں انسان کی ذمات کی ذمات۔ اس
کی چالاکی اور فطرت کی عقل نہیں ہو سکتی۔ وہ انسان
کی ذمات کی شدید جدت کے مقابل آتے ہی مر جاتا اور گھسلا کر
زیریں پر گر پڑتی ہیں اور جس و خاشاک کا حشر بن جاتی ہیں۔

صحن کے برے سرے پر دیوار کے ساتھ مہیں گاڑی کا
بھاری بھرم پڑ گیا ہوا تھا۔ پاس ہی گورڈ اور غلاخت کے ڈھیر
سے بدلوں ٹھہری تھیں۔ صحن کے اس سرے پر چھیلی کے پھول ہوا کے
شاخوں کو خوشبو سے پھیل کر رہے تھے۔ وہ تینوں بوڑھے
اب بھی کچھ کچھ دھنکے کے بعد اپنے آنسو پونچھتے گئے۔ وہ
چھوٹ چھوٹ کر دوتا جا چکے تھے۔

گوردودار سے کی بھلاؤی پر اندھیرا پھیلنا ہوا تھا۔ وہاں
اس تاہی کی میں بھوت تار رہے تھے۔
مائی سیمیاں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اچھلے اچھلے تار
اسے یوں لگے جیسے وہ سفید سفید پھول ہوں اور کسی آن جانے ناقد
نے دھرتی پر ان کی بارش کر دی ہو۔

پھر نہ جانے کیوں۔ وہ پھول۔۔۔۔۔ اچھلے پھول۔۔۔
داستے میں ہی ملتی ہو گئے۔ اب وہ نہ تھپتھپتے
ہٹ سکتے تھے اور نہ دھرتی پر ابر رحمت کی بوندوں کی طرح
برس سکتے تھے۔

غزوری گزراوش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے۔

۲۔ فریلیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں

بلکہ مناسب سائز کا کاغذ اور ڈاک کے ڈاکوں کے

(ادارہ)

بمسواہوں گے

کی اصلاحوں کو مختلف عواذوں کے تحت مرتب کر دیا ہے۔ قواعد، محاورہ، متروکات، لغات، تلفظ، انکسار، دبستان، دلی و لکنؤ، ہدایا، بیسیوی اردو، بیویب، اخلافت، ایسے معنی، تحسین، لطیف زبان، اجتہاد، استاد کی عبارتیں۔ ممکن ہے کہ میں نے کسی ایک عنوان کے تحت جو اصلاحیں لکھی ہیں ان میں دوسرے عقائدوں کا شاہد موجود ہو۔ ب سے برقی اردو سے داغ مراد ہیں۔

قواعد

برقی (ب) میری تربیت پر نشانی کئے گئے اے ساقی

سنگ بھی لاکے لگانا دیر میں ملے گا

داغ (د) دیر خانے کا نہیں ہو سکتا، یہ خانے حفظ اردو ہو گیا اس پر امانت نہیں آسکتی۔

(ب) گلیساں کریں گے ہم عبادت یہ قید رسد کبھی کیلے

د۔ "تافیر ذرا لگنا، مالا وغیرہ، کہا الٹ کے ساتھ اردو ہو گیا۔ پیر مضافت الیہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

(ب) سینہ زبانی کیا کس کا ترسے تیروں نے

شور ہے واہ کیوں کر لب سوطاروں سے

د۔ لب سوطاروں کی اضافت کیوں کر ہوگی، سوطاروں اردو ہو گیا

محاورہ

ب اچھیرا چھایا ہے آنکھوں میں اسے ماہ

دکھاؤ دلاؤئے روشنی تمہارا

د اس ترکیب میں تمہارے کی جگہ اپنا چاہیئے۔

ب۔ مدت ہوئی ٹکڑا کر باہم دلوں کے ارمان

عصر ہو اے صاحب ہو کر دوچار ہم تم

د۔ ہو کر دوچار ہم تم، نہیں ہو سکتا، یہ زبان کے خلاف ہے

ب ح سناؤں دہر دہر دہاد میری

د۔ اپنی چاہیئے

ب مجھ معلوم ہے بنیاد میری

د یہاں بھی اپنی چاہیئے ح

د گرد خاک بھی بنیاد میری

(ب) خود جانتے ہیں اپنی ہمنامیے دل کا

کسیب عرض کر دیں اور ادا دہر سے دل کا

د۔ اس جگہ اپنے کہتے ہیں۔

ب۔ کو پڑ رنگ پری کی ہے ہما بانھی ہوئی

کس طرح جنت میں جھڑے جان مضطر ہر مرگ

د۔ ہما بانھی کا یہاں محاورہ نہیں

ب (مزمع خود) سے یہ جا کر بول دے۔

جوترا ایسا رتھا سوئے عدم جاتا رہا

د۔ گیا، یہ فعل اس کا ہے

ب۔ ہر بات پر ٹوٹنے کی طرح آنکھ پری کی

یہ چال بڑی ہے جسے اس دھک پری کی

د۔ کیا بڑا متعلیٰ کیلے اور کھو، آنکھ پری کرتا یہ زبان خدا جانتے کہاں

کی ہے، تمام عربی آج مسئلہ ٹوٹنے کی طرح آنکھ پری، یہ محاورہ

ب۔ دھوکے میں آکے دھوکہ تو لیں گے یقین ہے

خدا بھیجے ہیں آج نئے آدمی سے ہم

د۔ نئے آدمی کے ساتھ چاہیئے۔

متروکات

(ب) بہت خاک ڈالی مرے توی پر

پہ شہرت گھر گھر یہ گھر ہوئی

د۔ در بدر۔ گھر یہ گھر متروک

ب۔ زنجیرے پاؤں میں لگے ہیں بے حقوق

جودلنے کی اس کا شیخ پایا

(منقول مغامیل مغامیلی خاں عارف مرتبہ)

د۔ لفظ پاؤں ہمزہ کے ساتھ متروک

ب۔ چال وہ چال ہے اس فتنہ و فتنہ کی دلا

د۔ در دولت پر قیامت بھی پڑی ہوتی ہے

د۔ ساتھ ہو رہی ہے جب گھر سے نکلے ہیں وہ۔ دلا متروک

ب۔ شرح ہتھاب پر چھوٹنے کی بھائی اے جرنج

جلوہ دکھلائے اگر وہ مس کالی اپنا

۲۔ دوم عالم کا قاضی میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر دیکھا ہے تو یاد نہیں۔
سند دو، داد بالمشق ہے کہ نہیں

انکسار

- ب۔ جھوٹے ہیں جو میل و مصنفہ میں یہ کلمات ہے شانہ پاسکری
د۔ ملک مؤنث کسی نے پانڈھ چاہے تو افلاخ دینا
مرتبہ (ردق) کی علاؤنوں کو ملک ادا کیا عاشق کو تھنہ شفق جفا
عجیب اتفاق ہے کہ اصلاح کے وقت اپنے استاد و ذوق کا یہ شعر
داعی کی نظر میں نہیں تھا
ب۔ ہم دل میں آگیا جب بے کسوں کے عالی پر
و حاکم کر منہ و امین تجھ سے فانی چھس گیا
د۔ اگر دامن تجھ پر آپ کی نظر سے گزرا ہے تو
دبستان دق و لکھنؤ
ب۔ بھگوانا دھنا شب بھر کی کسی کے پاؤں تھے اور سر کی کا
د۔ میں نے بھی شب بھر نہیں کہا، رات بھر لکھنؤ لے شب بھر
ہکتے ہیں۔

ب۔ کیوں کر کل کے خاندول سے یہ جانے کا

- درد عالم حضورؐ کا کچھ میرا نہ تھا
د۔ حضورؐ بادشاہ اور بزرگوں کو کہتے ہیں۔ حضورؐ مثنوی کو لکھنؤ
والے کہتے ہیں۔ تم کہاں کے ہو۔

میسوری یا مدراسی اردو

- ب۔ چیکے نہیں تو قرض تو دے گا ضرور برق
پیر منساں تمھارا بڑا دشمناس ہے
د۔ دے گا نہ مفت، چیکے دینا محاورہ نہیں ہے۔

ب۔ غریب کو بھی بتاتے ہیں عورت بھی بھی
نہواتے ہیں وہ دشمن کی دولت بھی بھی

د۔ دکھاتے

- ب۔ نزع میں بھی یاد ہیں ابرو کی دے دستو
تیر پر لکھ دو عوض ڈالی کے تجھ بدمرگ
د۔ کیا میسور میں تیر پر ڈالی چڑھاتے ہیں۔ ہم نے تو چھل چڑھاتے

دیکھے ہیں۔ اس کا حال کلمہ
مرتبہ۔ میت کو دفن کرنے کے فوراً بعد قبر پر کسی ہرے بھرے بیڑی ایک ڈالی
توڑ کر لگا دیتے ہیں۔ یہ قادی ہے اس امر کا کہ میت قبر میں سرسبز
رہے۔ پھولوں کی چادر دیتے یعنی فائدہ سوم کے دلہن پر چڑھائی
جاتی ہے۔

- ب۔ نہیں کچھ سوچتی ہے اچھی نہیں جنت بھری تیری مٹی سے
د۔ تیرے سے اچھی، یہ زبان نہیں۔
ب۔ دل میرا تیرا تھا کیا کہ اچھا تم تھو میں نے لے دیکھنا تھا
د۔ یہ زبان مدراس کی ہے۔ تم کو اسے
ب۔ ٹوٹے ہیں تارے گرد دل غم پر افشاں وہ جب جلتے ہیں
د۔ جماتے، چناتے ہیں خلافت زبان، چناتے یا جیتے جا بیٹے تھا
ب۔ گل خوشی کی طرح سے آپ ہر وقت منہ پھرتے ہیں
د۔ منہ چھپرتے ہیں جا بیٹے تھا
ب۔ یہ بوجھ بھی اٹھتا نہیں نازک لمروں سے
پشما بھی نہیں باندھتے وہ میرنگی کا

۳۔ میرے کی کئی۔ میرنگی کیا چیز ہے
مرتبہ۔ ایک قسم کا سونق پڑا جس کی بافت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں ابھری
ہوتی بندکیاں نظر آتی ہیں۔

ب۔ پشما احمد نے اپنی کمر میں بندھا ہے فور

عقدہ کھلا ہے ہم یہ یہ احمد کے میم کا

- د۔ کیا آپ کی زبان میں باندھے کو بندھا کہتے ہیں
ب۔ شہید نازی کی تربیت پر مرد باندھ جاتا ہے

بنا کر چاندنی آڑے ہوئے پھولوں کی

د۔ چادر سی ہے۔ چاندنی مراد پر نہیں سہ۔ یہ کیا ہے الملاحہ۔

مرتبہ۔ پھولوں کی چادر کو میسور میں پھولوں کی چاندنی کہتے ہیں۔

ب۔ نہیں پس لینے کو دیکھو گیسو مٹھو جوں یہ کاتے ٹھہریں

دطرر زبان دہلی بابت ۲۰ جنوری ع ٹولے نے عشق دا بچہ ہے،

د۔ لینے کو دیتے یہ گزاردی زبان ہے۔

ب۔ ہو گئے سنے کی سننے آگ جھاگ میں نے جب پوچھا مزاج اچھا تو

د۔ آگ وہ ہلک جاک یہ کہاں کی زبان ہے۔
مترقبہ۔ یہ میری زبان بھی نہیں۔

ب۔ ہمراہ مدد آج وہ آئے بھی گئے بھی

شوگر سے مری قمر ٹائے بھی گئے بھی

د۔ تبرؤ منطہ ہے اس کی قبر ٹائی بھی آئے گی۔

ب۔ نظروں میں سلیا ہے مری لوگ عالم

وہ جسدہ دیدار دکھائے بھی گئے بھی

پھر حال پریشان مرا اگر نہیں دیکھے

دو بارہ لاکھ وہ بنائے بھی گئے بھی

د۔ اس ترکیب میں خاص مدد اس کی زبان ہے

یعوب

ب۔ فعل خوشی کی بزم طرب ہے سچی ہوئی

ٹہری ہے کہ خدائی مرے ذریعہ کی

د۔ ٹہری ہے کہ خدائی اب اس ذریعہ کی۔ سب یگر پڑیں

خیال نہیں کرتے۔

ب۔ ہرگز کوئی دوست تو فرمید ہے نالہ

سب چھوڑ کے بیٹھے ہیں ہر دوسرے دل کا

د۔ بایں جو ہے آہ۔ یگر پڑی

ب۔ کہ پرندہ جہاں نہ پرارے میرے دلبر کا گھر وہاں ہے بترق

د۔ اک پرندہ الخ۔ کات بیا تیر شروع مصرع۔ یہ ایسا یاد آگیا ہے۔

ب۔ نہ دیکھا اوس کو دوزیہ خطر سے

نہیں دیتے ہیں دہل ہم خوشی سے

د۔ خطر سے، خوشی سے، تعالٰی لدیفین ہوا۔

ب۔ کون سے دن خون آنکھوں سے مری بہتا نہیں

پاؤں تیرے جوئے کو کب حیا آتی نہیں

د۔ خون آنکھوں سے مری بہتا نہیں کب رشک سے۔ تعالٰی لدیفین

ہوا اس کو نکال ڈالو

ب۔ جی ادھے ہم تری خیال کی کس کر آواز

روح داخل ہوئی پھر حتم ہیں ہی کر آواز

د۔ اس سے مرنے دہشتی تھی کبھی بہتر آواز۔ مطلب میں ہی کر آواز
سہی کرنا تیر کیوں کر ہوگا۔

ب۔ وعدہ تو وفا تم نے کیا آئے کا نیک

سوچو ڈرا باقی ابھی اقتدار بہت ہیں

د۔ سوچو تو ہسی ادب بھی آخر ادب بہت ہیں۔ ذرا کا اہت دیتا ہوا

نہ کیا کرے

ب۔ کیا کام تھا پھر ترک وہ کس لئے آتے

لاٹھے پر مرے اشک بہائے بھی گئے بھی

د۔ ترک وہ، اس میں تک کا لاف گر گیا

ظرافت

ب۔ دین و ایمان جان و دل دے کر تبت لڑی کو آج

بترق جو مرد مسلمان تھا نصرا ہو گیا

د۔ اللہ پیر مسلمان کرے

ب۔ کیا کہیں ہم گلشنِ وحشت کی پیر کیا تھی ہمار

یا ز تھا ہمسراہ تھی سیرِ گلستان رات بھر

د۔ باغ میں رات کو چور چایا کرتے ہیں

ب۔ زخمِ خنداں سے مرے چپ دل پہلے کوٹکا

سیر کردن غالی کئے اوس نے مکداں رات بھر

د۔ رات کی کوئی قید نہیں

ب۔ سور ہے ہیں جو روش کے ساتھ دل کو خواب میں

شو روئل کرنا نہیں اسے صویرِ عشرت کے پاس

د۔ کیا دلوں ایک جگہ دفن ہوئے۔

پے معنی

ب۔ جس طرح آئینے سے عکس ہو دور یوں ہوا ہوتے ہیں وہی دل کے

د۔ میں اس شکر کے حق نہیں سمجھا۔

ب۔ ہم بے نعل میرے اگر وہ فوجاں ہو جائے گا

تیرا قدم کچھ کے اک دن میں کان ہو جائے گا

د۔ میں نہیں سمجھا

ب۔ مہتمم کو دکھائے کوئی مہتمم ہے کسی کی آئینہ دل میں بھی کھنڈ ہے کسی کی

مى كون ٲون

خانۂ دل ٲى مراىك نٲسا خانۂ راز ٲردۂ ٲسن ٲى مىرۂ لئۂ اك ٲردۂ سائز
مىرى ٲطرت مىں ازل سۂ ٲى مٲت كا ٲىر زانكى مىرى ٲى دنسا مىں سرا ٲائۂ نياز
دو فون عالم كى ٲٲىقت ٲى نطس ٲى مىرى بزىم گىٲى مرى نطرون مىں ٲى اك بزىم ٲماز
مىں نفوس بشرى مىں ٲون ٲٲىقت كى نو دٲركۂ ٲردۂ اجسام مىں ٲون سحر طراز
مىں ٲى گل زار مىں ٲون ٲى نفوس شبنم و گل مىں ٲى نٲون كى ٲسٲم كى ٲون دل كٲش آواز
مىرۂ جذبات نۂ بٲشا ٲى مٲت كو فروغ ٲسن كو مىں نۂ بساىا ٲى سرا ٲا امانز
گلشن دٲرىں گل كا رٲصرف ٲون مىں مىں نۂ ترتيب دىا قمصۂ عمود و اىاز

مىرى ٲٲىل نۂ دنيا كى روشنى بدلى ٲى ٲى

مىں نۂ انسان كى سٲىٲى كى طلش بدلى ٲى

مىرى مصل مىں معنۂ كا ترٲم كىا ٲى منطق و آواز ٲى كىا زور نٲلم كىا ٲى
مىرۂ گلشن كى مقابل ترۂ ٲىولون كى قري ٲىن دٲركۂ نٲون كا ترٲس كىا ٲى
مىرى ٲىروٲ نٲىل ٲى ٲىروقت رواں مرۂ آگۂ ٲىرافشانى قلمزم كىا ٲى

میری ہستی کے ہیولے سے ہے آغازِ ازل مجھ سے پوچھو کہ یہ اشیاء کا تقدم کیا ہے
میری نظروں میں ہے آئینِ جہاں بائی و ہر عدل کیا چیز ہے اور شانِ ترحم کیا ہے
ایک آئینہٴ غیرت ہے مری برہمِ حیات مجھ سے پوچھو کہ یہ ہستی کا توہم کیا ہے
مجھ سے پوچھو کہ یہ ہنگامہٴ کونین ہے کیا اور جذبات و تخیل کا تعادل کیا ہے

میں ہر اک ظاہر و باطن پہ نظر رکھتا ہوں

اپنی ہر بات میں پائیدہ اثر رکھتا ہوں

وسعتِ عالم کو نین میں لیکتا ہوں میں حسنِ اخو و زجہاں رونقِ دنیا ہوں میں
میری تابندہ جبین پر ہے زمانے کی نظر زینتِ جلوہ گر چشمِ تماشا ہوں میں
غیر محدود تجلی کا ہے پر تو مجھ پر ہر نظر میں جو سما یا ہے وہ جلوہ ہوں میں
کس نے دیکھا ہے مرا نقشِ قدم میرا مقام برہم و نیا کے ہر اک حُسن سے بالا ہوں میں
غالب و تیرمعی ہیں حسرت و اقبال بھی ہیں ہم سخن تھے یہ مرے ان کا سرِ بیا ہوں میں
منزلِ شعروادب ہے مرا ہر نقشِ قدم الغرض رہبرِ اُردوئے مظلّٰ ہوں میں
خود ہوتا دے گا زمانے کو مرا طرزِ کلام میرا انداز ہے کیا کون ہوں میں کیا ہوں میں

گلشنِ عالم لاہوت کا طائر ہوں میں

دونوں عالم مرے قبضے میں ہیں شاعر ہوں میں

میرزا نامہ - از میرزا کا مران

مقدمہ

تلفی مناسب ہے کہ وہ بادشاہ ہمایوں کا چھوٹا بھائی میرزا کا مران
ہیں ہے۔ کیونکہ جیسا خود مولوی صاحب نے فرمایا ہے اس رسالہ
میں جس انداز سے میرزا رفیع شیرازی کی قابلیت اور علمی استعداد
کا ذکر آتا ہے اس کی امید میرزا کا مران (شہزادہ) سے نہیں کی
جاسکتی ہے۔ شہزادہ کا مران کی موت کے وقت میرزا رفیع شیرازی
کی عمر صرف سترہ سال ہی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کم عمری میں وہ
یہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ شہزادہ کا مران ایسا خود بین آؤ

سنہ ۱۹۱۳ء میں مولوی ہدایت حسین صاحب مسلم پریزینٹی
کالج کلکتہ نے قصبہ جگدہ (ضلع ٹانوا) کے رئیس قاضی محمد محمود کے
ذاتی کتب خانہ میں ایک خطی رسالہ 'میرزا نامہ' (فارسی) دریافت
کیا تھا۔ رسالہ کے سرورق پر معیت کا نام میرزا کا مران دیا ہوا
تھا۔ مولوی صاحب کے بیان کے مطابق یہ رسالہ بہت خراب
شکست میں تھا جس کو انھوں نے نہایت محنت اور عرق لہریں کر کے
بہر صاف کیا۔ انھوں نے 'میرزا نامہ' کی اصل عبارت اور اس کا
انگریزی ترجمہ ایک چھوٹے سے دیباچہ کے ساتھ 'جرنی آف
ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' کی سنہ ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں
چھپوایا۔

میرزا نامہ کے مضمون سے اس بات کا صاف پتہ نہیں چلتا
ہے کہ یہ رسالہ کس زمانے میں تصنیف کیا گیا۔ ایک جگہ معیت
نے سنہ ۱۴م میں اپنے لاہور سے گردنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک
اور جگہ میرزا رفیع شیرازی کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جیسے
وہ معیت کا معمر ہو۔ ان دو اطلاعات کی بنیاد پر اس قدر
اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 'میرزا نامہ' کی تصنیف ۱۰۱ھ کے
مک جگ ہوئی ہوگی۔

'میرزا نامہ' کے معیت کی بابت مولوی ہدایت حسین کا یہ فیصلہ

۱۔ سنہ ۱۰۱ھ میں جب میرزا رفیع شیرازی نے اپنی کتاب
ذکر الملوک لکھی تو ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ اس طرح اندازاً
ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۹۴ھ قرار پاتی ہے۔ دیکھو مولوی
ہدایت حسین جرنی آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۱۳ء
صفحہ ۷)

اگر معیت دو اصل رفیع شیرازی کا معمر تھا تو ظاہر ہے اس
نے اپنے کھیر سے لاہور پہنچنے کی جواہوری تاریخ (سنہ ۱۰۱ھ) دی ہے
اس سے مقدمہ ۱۰۱ھ ہوگا۔

'میرزا نامہ' کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ معیت نے
سفر کھیر کے فوراً بعد یہ رسالہ لکھا تھا۔ اس لئے اس رسالہ کی تاریخ
تصنیف سنہ ۱۰۱ھ کے قریب قرار پائے گی۔

ماجب علم اے دنیا کا قلیل ترین انسان اقسام کر لیتا۔ ملاوہ ازیں
 یہ نام لیا گیا ہے کہ اس رسالہ کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۱۱ھ کے
 قریب ہے تو جبرکی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ
 ہاتھوں کا بجائی میرزا کا مرزا سنہ ۹۶۴ھ میں مر گیا تھا۔

۱۔ میرزا نامہ کا مصنف ایک جگہ لکھتا ہے: ”میرزا پر واجب ہے کہ مہاجرین وقت میں قاضی زادہ ہروی، میرزا رفیع شیرازی اور علی اردستانی کو قابل ترین مستیابانے“

اگر نامہ اور وصیعت ابھی میں کاروان بیگ گیلانی ہی ایک منصب دار کا دیکھتا ہے، تو شاید عبدالرحیم خان خاں کے ملازمت میں تخلیق کردہ الہائی تہذیب و دینی جس نے عبدالرحیم خان خاں کے حکم پر اس کے کارناموں اور خاندانی حالات کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی، نے بھی کاروان بیگ گیلانی کا ایک جگہ ذکر کیا ہے۔ ”اُپنی ابھی ابھی میں ابوالفضل نے کاروان بیگ کا نام دو صدی منصب داروں کی فہرست میں دیا ہے۔ کاروان بیگ عبدالرحیم خان خاں کے ماتحت ۹۹۹ھ تک گزرتا ہے۔“

تعمینات رہا۔ سنہ ۱۰۰ھ اور سنہ ۱۰۰۰ھ میں جب خان خاں دکن کی کمپریگیا تو وہ دہلی میں اس کے ساتھ تھا۔ میرا مہم ہے کہ کاروان بیگ گیلانی اور ”میرزا نامہ“ کا مقصد میرزا کاروان ایک ہی شخصیت تھی۔ کاروان بیگ نے سنہ ۱۰۰۰ھ کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ ”میرزا“ کا لقب استعمال کرتا شروع کر دیا ہوگا۔ ”میرزا نامہ“ کے مصنف نے خود فیصلہ کیا ہے کہ وہ پیدائش میرزا ہیں، تھا بلکہ اس نے یہ درجہ ”اپنی ریاست اور اخلاق کے لیے برعالم کیا تھا۔“

Cynical خیالات پر سے مضمون میں ایک قسم کا انداز و تنقید پیدا کر دیتے ہیں۔ مصنف اپنے رسالہ کی ذہنیت بیان کرتے ہوئے ابتدائی چند فقرہوں میں خود ہی یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کی تحریر میں ہزل اور

۵۸۱-۴۱۲۵۵۸۳
 ۳. دیکھو۔ عبدالقیاد ہندوؤں کی تاریخ۔ ایشیاٹک سوسائٹی
 جلد دوم۔ صفحہ ۲۶۲
 ۳۔ آئین گری از اوالو الغفل۔ اول گزشتہ تاریخ صفحہ ۱۶۴

جلد بازی کا عنصر شامل ہے۔ میرزا کامران کے چھوٹے چھوٹے جھلسوں میں پیچھے ہونے لہز و مزاج کے ذریعے فحش تر اس بات کا صحت پتہ دیتے ہیں کہ اس نے سماجی زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ زمانے کے سرود گرم دیکھتے ہوئے تھا اور سترحویں صدی عیسوی کے مثل مائترو کی ڈھنکے رنگوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرزا کامران کے بعض محلے تو بالکل پورا دیکھتے داسے ہوتے ہیں۔ اس کا نڈر بلکہ بے ڈھب اغلاز فکر اور سماجی مساوی پر روا یا قی اقدار سے اغراض کر کے دانے زنی کرنے کے تھوڑا سا جہد کے ادنیٰ ادنیٰ تاریخی نڈر پیچیدہ ہیں ایک انوکھی چیز ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اس قسم کے مشورے دیتا ہے: "جہاں تک ہو سکے میرزا جنگ سے دور رہے۔" "بہنوں کو پہنانے لیکن ان کی بڑائی کا تہ نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا خلاف حکمت ہے۔" "میرزا ملکہ سے تازہ نگے بھونکے غائب علم سے علمی بحث نہ کرے ورنہ اس کا ذہنی سکون ختم کر دے گا۔" "بحث میں مخالفت کمزور پڑے تو اسے پوری طرح لگ پہننے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے۔ مگر صورت حال یہ ممکن ہو تو فوراً بدعتیہ کی بات مان لے۔" ان جملوں کو پڑھ کر یہ اختیار جارج میرزا دشا کی

The Revolutionists

Handbook یاد آجاتی ہے۔

سترحویں صدی عیسوی کی تہذیبی زندگی اور متون کے سیاسی اور سماجی اداسوں کے متعلق افلاعات کے ماخذ کی حیثیت سے "میرزا نامہ" کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ تہذیبی اور سیاسی اداروں کی متعلق اعداد و شمار اور اس دور کی افلاقی قدروں اور سماجی زندگی کے اصولوں کا بیان تو اکثر داتا ہے۔ اس لحاظ سے "میرزا نامہ" کے اندر کوئی خاص نئی بات نہیں ہے۔ جو چیز اس رسالہ کو منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ان اقدار اور اصولوں کو رد و نرمی کی زندگی کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ بات ہمیں اہد و دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ ایک عام مثل ایمر کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری تصور کیا جاتا تھا کہ بقول میرزا کامران "اس کا نشن چہالت کی نمائندگی ہے" "نزد ہر۔" لیکن عمل میں اس تعلیم کا مہنوم کیا جاتا تھا اور اس کا جواز داتا میرزا کامران کے چند جملوں سے ہوتا ہے۔ وہ شاید مومن کو

کتاب میں چھان کر بھی نہ ہو سکتا۔ اس کا خیال ہے کہ "ایک میرزا کو عربی، فارسی، ہندی اور ترکی زبانیں آتا چاہئے۔" اس کی طبیعت میں ایجاد اور تخیل کا مادہ ہو اور وہ اپنا کام بھرتی سے کر سکتا ہو، حساب کتاب میں بھارت رکھتا ہو لیکن لکڑیوں کی کسی عادت اختیار نہ کرے میرزا کو فلسفہ کے مدارج سے واقفیت ہونی چاہئے لیکن جبر و اختیار اور قضا و قدر کی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہئے کیونکہ ایسی بحثوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ فلسفہ کے دیگر مسائل سے بس اسی قدر واقفیت کافی ہے کہ وہ کہے کہ "میں جانتا ہوں۔" اسی طرح میرزا نامہ میں ہمیں ہستی، دل چپ اور سنی نیز جھلکیاں مومن شہداد کے معیار زندگی، فوجی انفراد اور امتوں کے درمیان سماجی تعلقات کی نوعیت اور مذہبی اخلاعات کے مظاہر ملکتے ہیں۔

"میرزا نامہ" کے معنوں سے اس جہد کے مذہبی اختلافات اور مباحث کی بابت یہ تو اذادہ نہیں ہوتا ہے کہ کیا مسائل درپیش تھے۔ اس کے لئے دوسرے زیادہ اہم اخذ موجود ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ سترحویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان فطریاتی تاثرات اس حد تک موجود تھا کہ لکڑیوں میں مٹیں ہو مگر قی معین بن میں اکثر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ اور سنی فرقوں کے درمیان اختلافات اس زمانے میں کافی شدت اختیار کر گئے تھے۔ اور اس سلسلے میں کہ لوگ انتہائی احمقانہ تنگ نظری کا ثبوت بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے میرزا کامران کی طرح کے لوگ بھی تھے جو تنگ نظری کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ مذہبی مباحث کو ممنوع حرکت سمجھتے تھے اور دوسروں کو بھی یہی صلاح دیتے تھے کہ اگر آٹھ یا ڈھائی کی سلامتی چاہتے ہو تو مذہبی مباحث سے دامن چاؤ ان کا نظریہ حیات اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ کھانا پیو اور خوش رہو۔ یہ تمباکو، شراب، بھوا، لواطت، "پیر جام" "حب شفت" رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا پرست بھی تھے بلکہ انسان کی خدا شناسی سے ہی اس کے کمالات کا حقیقہ کرتے تھے۔ لیکن ظلاً اور ضمنی کا خاکہ اڑانے سے بھی نہیں ٹوکتے تھے۔ میرزا کامران

ایک جگہ بڑی صفائی سے اعلان کرتے ہیں۔ ہندوستان میں جو اپنے سروں پر بڑے بڑے عمامے باندھے گھومتے ہیں (دیرزا) ان سے حق کی امید نہ رکھئے۔

گو کہ اس رسالہ کا فارسی معنوں اور انگریزی ترجمہ اب سے لڑائی میں برس پہلے چھپ چکا تھا، لیکن اب تک اس سے کسی نے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا۔ ڈاکٹر کنوڑی صاحب نے اپنی کتاب "لائسنس اینڈ کنڈیشن آف دی پیپل آف ہندوستان" میں اس رسالے کا سرسری تذکرہ فرود کیا ہے، لیکن ان کا موضوع دی سلطنت کا بعد تھا اس لئے وہ "میرزا نامہ کی طرف کافی توجہ نہ دے سکے۔ اس رسالہ کا اصل استعمال تو وہ اسکا لری کر سکے گا جو ہندوئیت کی لچل اور سوشل تاریخ پر کام کر رہا ہو۔ بہر حال یہ امید کی جاسکتی ہے کہ "میرزا نامہ کا مندرجہ ذیل اردو ترجمہ تاریخ سے شغف رکھنے والے اہل علم حضرات کی دل چسپی کا باعث ہوگا۔

توجہ

شکر اور حمد اس خدا کی جس کی ذات مخلوقات کی تسخیریت کی محتاج نہیں اور درود بے نہایت حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتد مسو پر۔ ارباب حق کو معلوم ہو کہ سنہ ۱۱۸۱ میں یہ جو بزرگ شیریت نشان کی سیر کے بعد ادا لہام ہندوستان میں داخل ہوا (کہ قسمت کا گنہگار تھا) اور دار السلطنت لاہور سے گزرا، اتفاقاً زمانہ میں کہ کچھ سنہ ۱۱۸۰ میں لگوں نے اپنی خصلت کے مطابق بہت سراٹھا رکھا تھا اور میرزائی کے دعوے دار بن بیٹھے تھے۔ جن کو ہندو کو مرزا کہلاتے تھے۔ حاصل ہے اس نے میری قیادت میں یہ گوارہ کیا کہ میرزائی کے رسم و قواعد میں ایسا انقلاب آؤ فوراً واقع ہو۔ معاملہ کی بہت بڑی پیش نظر ہو جا کہ اس مسئلہ پر ایک ایسا رسالہ لکھوں جو اہل دود گاہ کے لئے دستور العمل بن جائے اور کوئی غیر مستحق اس امر (ان کا یعنی میرزائی کا) دعوے دار نہ ہو

سنن بسا روای انہ کے گوئی

یکے واحد موصدا یکے گوئی

معلوم ہو کہ ہندو نے اپنی بیا ضمت اور اخلاق کے بل پر میرزائی کا دھبہ حاصل کر لیا ہے اس لئے جو کچھ بھی میں کہتا ہوں وہ سچ اور حیرت سے عبارت ہے۔ اگرچہ میرے بیان میں ہزل اور جمل بازی کا آغاز آگیا ہے لیکن اس کتاب سے چند ایسی نصیحتیں نکلی ہیں جن کو لوگ اظہارِ اذہن اور بوعی کی رہنمائی اور اعادہ کرنے کے بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اگر کوئی کوثرِ نظر اپنی حق سق کی بدولت میری باتوں کی اہمیت نہیں سمجھتا ہے تو کیا پروا۔ سوچ لو کیا فکر کہ چنگاؤں کی طرف توجہ نہیں کرتا اور ایک کوہِ گران پایہ اس بات سے اندیشہ مند کیوں ہو کہ ایک جنگی چوہا اس کو دھج قرار دیتا ہے۔

بے ہنر چند زخود بے خبر جیب پسند نثر بن عم ہنر دود شوخندہ ادا بدنامی رسد باد شوخندہ ادب براتی رسد اگر کسی شخص کے دل میں میرزائی کی ہوس ہو تو اس کو چاہیے کہ جو کچھ اس رسالہ میں درج کیا جاتا ہے اس کے مطابق عمل کرے۔ اور اگر وہ ان باتوں پر عمل نہیں کرتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ ایسی خطرناک حرکت کا مرتکب ہو کہ دینی میرزائی کا کھادار بن کر (لوگوں پر اپنی نیچی اوقات اور کم ظرفی کا مظاہرہ کرے معلوم ہو کہ تاؤن میرزائی کے دس خاص اصول ہیں اور چند ضروری شرائط ہیں۔ تمام اصولوں میں اول یہ ہے کہ "دیرزا" خدا کو پہچانے کیونکہ انسان کے کمال سے اس کی خدا شناسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دینیم یہ کہ علم و فہمیت حاصل کرے تاکہ اس کا نفس جہالت کی منت سے آزاد ہو اور اسے بے جا تاؤس کی ہوس نہ رہے۔ ابتدا میں صرف اور فو کا سرسری مطالعہ کرے اور ان دو عظم سے واقفیت اس مذہب کا ضروری تقوید کر جائے کہ وہ (یعنی میرزا) لکھتے اور لوتے میں قیاسی اور عربی کے الفاظ صحیح استعمال کر سکے۔ محلوں میں میرزا کو دس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے منہ سے غلط الفاظ نہ نکل جائیں کیونکہ ایک میرزا کے لئے گفتگو میں غلطی

لے فارسی عبارت یوں ہے، "و صد لشیخ بجا طرش منلو و تاشد"

کرنا بہت بڑا عیب ہے۔ سوم یہ کہ تیس سال کی عمر میں مرزا کو شیخ سیدی کی گفتگوں اور پستان تم کو کہنے چاہیے۔ چہاں یہ کہ وہ دینی مرزا (مردم شناسی ہو چکر) اعلیٰ ترین حالات میں سے ایک ہے اور ہر اس باوقافی اور دھوکہ باز شخص کے دھوے پر بے یقین نہ کرے جو یہ کہے کہ وہ مجھے باہرین قلوب میں کر چکا ہے، تاآنکہ یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ بلکہ اس کے باوجود شبہ کی گمان نش ہے کیونکہ اہل کشف (اس طرح) اپنے حالات ظاہر نہیں کرتے ہیں اور اس قسم کے دعوے اہل حق کو دھوکہ دینے کے لئے وہی لوگ کرتے ہیں جو دراصل کچھ نہیں جانتے ہیں۔ بہم یہ کہ مدرسہ سے نوازہ نکالے ہوئے طالب علم کے ساتھ دیر مرزا علمی بحث نہ کرے کیونکہ وہ اپنی عکاسی سے مرزا کا ذہنی سکون تم کو دے گا، ششتم یہ کہ ہر ایسے جڑے سے بات نہ کرے اور صرف اپنے برابر کے لوگوں سے گفتگو نہ کرے۔ ہفتم یہ کہ وہ عربی، فارسی، ہندی اور ترکی زبانیں جانتا ہو۔ ہشتم یہ کہ اس کی طبیعت میں ایسا اور ذہن کا مادہ ہو اور اپنا کام بھرتی سے کرتا ہو کہ سرسبز، بڑ چدرورہ ہے۔ نہم یہ کہ حساب کتاب میں ہمارت رکھتا ہو لیکن اس کو دینی مرزا کو، لکڑیوں کی سی باتیں نہ اختیار کرنا چاہیے۔ دہم یہ کہ مرزا کو فلسفہ کے مختلف مدارج سے واقفیت ہوئی جا بیٹے لیکن اسے جبر و اختیار اور قضا و قدر کی بحث میں نہ پڑنا چاہیے کیونکہ ایسی بحث سے کوئی فائدہ نہیں نکلتا ہے۔ فلسفہ کے درجہ سائنس سے اس قدر واقفیت کافی ہے کہ وہ ہر کے "میں جانتا ہوں۔" فردی مشراطل کا باب

پہلی بات یہ کہ مست احمق اور مرزا کے درمیان ایک فوشگ کا فاصلہ درمنا چاہیے۔ اگر صحت کے برتن بیتر یوں تو وہ سوتے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا اور میوہ نہ کھائے اور اگر مٹی کا برتن اٹھائے تو چھین کے برتن میں پانی نہ پیے۔ اگر ایک گھر میں دس آدمی ہوتے

لے خادسی عبادت یوں ہے، ہم آٹھ در علم سیاق و قافیہ و بہرہ داشتہ باشند اما عزت و طبیعت نباشد؛

ہوں اور ان میں سے ایک نما آدمی ہو تو میرزا کو ان دسوں سے ملنے جلنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ہرزا کا نام اگر حلال الدین یوسف رکھا گیا ہو تو اس کو چاہیے کہ اتنا لہذا نام نہ لکھ کرے بلکہ اپنے آپ کو صرف میرزا یوسف کہلوئے۔ میرزا کو اگر کوئی چیز خریدنی ہو تو اس کی قیمت پرسود اگر دلی طرح حجت نہ کرے۔ اس کو چاہیے کہ یا قوت کو سب سے بہتر سمجھتا، پانی کو سب سے بہتر سوار اور خربوزہ کو سب سے بہتر میوہ سمجھے۔ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور سر تڑوانا نہیں چاہتا ہے تو تشکر کے ساتھ کھینچ کر نہ جائے۔ خشک اور چٹائی کو تمام دوسرے کھانوں سے بہتر سمجھے۔ "عشق پاک" کو اپنے حلق میں رکھ دے اور اس سے ہمینہ دور رہے۔ جس مہین کی طبیعت میں شرارت ہو اس کے پیچھے بھی نہ لگے۔ اور تمنا کو زیادہ نہ استعمال کرے۔ ہندوستان کے دوران قیام میں جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو بیاباریوں سے بچائے رکھے تاکہ میرزا کو اپنے افسر کے حکم کا سامنا کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ جس جگہ میرزا کی جان چھپانے لے شہر کی کبک کو عموماً "شکر" کہا جاتا تھا۔

تھے "خشک یا مماغ" کا مطلب مولیٰ ہدایت صین ماد بے معاملہ کے ساتھ اباے ہوئے چاول لباسے لیکن خشک اباے ہوئے سادہ چاول کو کہتے ہیں۔ میر خیال میں خشک یا مماغ "سے میرزا کا امران کا مفہوم خشک اور چٹائی یا خشک اور سان سے ہے رشایدہ ایک میرزا کہنے خشک اور چٹائی بہترین غذا قرار دے کر سادہ رہیں جس یا صوفی بنشی کی "طیعت کر رہا ہے۔ اوپر بھی ایک ایسا ہی جملہ کیا ہے جس میں قیق برتن کے استعمال نہ کرنے کی صلاح دی گئی ہے۔

تھے فارسی عبارت یوں ہے۔ "وہ مندرجہ ذیل آواز خود از ہا رہا سما خفت نما یہ کہ روئے حبیب منصب دار شہنشاہ دید۔" مولیٰ ہدایت صین نے اس جملہ کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا، اس میں "حبیب منصب دار کے لئے" یعنی "شہنشاہی حبیب" لکھا ہے جو غلطی ہے۔ یا کل داخ ہے کہ یہاں پر میرزا کا امران کا اشارہ اس حبیب کی طرف ہے جو شاہ بدیر پڑے منصب دار کے علم میں شامل رہا کرتا تھا اور اس کے ماتحت انہوں نے بغیر ٹوٹ الگے صغر پر خط لکھے،

Court Physician

ہو جائے وہاں تین مرتبہ جانا چاہیئے۔ ایک مرتبہ پہلے وہ کہ اس روز طاقا ہوئی۔ دوسرے روز سلام دعا ہو کر اگر گھر میں داخل ہو لیکن تیسری مرتبہ اگر گریز سلام بکواسے ہی بلایا جائے تو چلا جائے گریز بلا دے کے وہاں جا کر نعت نہ اٹھاے کیونکہ حرمت ایک بار اٹھتے جاتے تو واپس نہیں جاتے۔ وہ دین مرزا لاہور کو ہندوستان کے تمام شہروں سے برترائے اور اگر وہ کے قتل کو دنیا کے تمام قتلوں میں کیسا سمجھے ادا اگر اس بات پر زیادہ غامض نہ ہو تو صفیان کو ایمان کے بہترین شہرہ میں شمار کرے۔ بیڑ بھاڑ میں میرزا کو لوگوں کی ہنوں میں چھی ہوئی۔ علماءوں کی طرف سے جبردار دہتا چاہیئے۔ اس کی آمدنی کم سے کم اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ میں روپیے تک پالکی اور درویشوں پر خرچ کر سکے۔ (دیرزا) سرائے میں کمرے سے کچھ دیر کے اس طرح طبیعت بغیرا بن جاتی ہے۔ جان کو عزیز کے اور جنگ کے قریب نہ پھلے۔ اور اگر جنگ پر جان ہی پڑ جائے تو پھر ایسا جگہ ٹھہرا ہو جہاں توپ کے گولے نہ پہنچ رہے ہوں۔ اگر جنگ میں فتح ہو تو وہ شکست خوردہ لشکر کے قاتل ہیں نہ جاتے۔ لیکن اگر جنگ کا نتیجہ برعکس ہو تو سپر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میرزا کا کلام یا مثنیٰ ہوتا چاہیئے تاکہ وہ کم الفاظ میں دسیت منہموم ادا کر سکے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر میرزا اودھ سروں میں فرق ہی کیلئے۔ نرگس، انجمن اور نابھی جہاں ننگرا میں میرزا کو چاہیئے کہ ان میں حاصل کرے۔ وہ ہر دوں کو ہموالے لیکن ان کی قربانی کا ذکر نہ کرے کیونکہ ایسا کرتا خلاف حکمت ہے۔ اس کو جوا کھینا آئے لیکن وہ جوا ہی نہ پئے۔ شہرچ میں ہزاروں کی پانی بھی نہ ملے۔ وہ مشکل اشعار سے درجعت نہ کر کے اور اس کے معنی تلاش کرنے میں وقت نہ خراب کرے کیونکہ یہ غریبان چاندی ہر دوں کوئی ہے۔ اگر کوئی ہم سفر اپنے گھوڑے کو تیز یا بک رہا ہو تو میرزا کو

دقیقہ فٹ نوٹ پچھلے صفحہ سے آگے) اور سپاہیوں کی حفاظت و محبت کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ دراصل یہ ایک نئی اور بہت دل چسپ اقدار ہے جو محلوں کے فوجی نظام کے ایک اہم پہلو کو روشن کرتی ہے۔

چاہیئے کہ اس کے ساتھ نہ چلے۔ اس کا ساتھ چھوڑ دے تاکہ وہ جہاں جانا چاہتا ہو چلا جائے۔ کوئی طاقا تو میرزا سے دریافت کرے کہ قصاری تنخواہ کیا ہے تو اس کو بتا دے لیکن اس ہی صورت میں جب کہ میرزا کو یقین ہو کہ وہ اس کی جگہ نہیں لے سکتا ہے۔ لیکن ماطر پر عکس ہو تو میرزا کو چاہیئے کہ اس شخص سے بچ کر دور بھاگ جائے۔ اگر سترخان پر میرزا کے قریب کوئی مفتی بیٹھا ہو تو میرزا کے لئے مناسب ہوگا کہ (کھانے سے اٹھ کھینے لے۔ وہ بھوک سے مرجھی گیا (تو کوئی حرج نہیں) کیونکہ اس کو بڑا ثواب ملے گا۔ اگر میرزا کی شکل و صورت اچھی ہو اور کھانا بھی خوب پایا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو ایک آدھ چیر سنا دے۔ اگر گانے کی عادت مزدیت سے زیادہ ہو تو پھر اس کو اپنے کھانے پینے کے برتن عطیہ کر لینا چاہیئے کیوں کہ وہ (اب میرزا نہیں بلکہ) گویا ہے۔ میرزا پر واجب ہے کہ کامرین وقت میں کامی زادہ بڑی میرزا ریش خیرازی اور جلالی دوستانی کو کتابی ترین ہستیاں ملے لیکن جب ان لوگوں پر کوئی اعتراض کرے تو بحث نہ کرے۔ میرزا کو کسی ادیب کی عقلیت کا اندازہ اس کے کچھڑوں سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کسی شخص سے میرزا کی بحث ہو جائے اور اس بحث میں مخالفت کھڑو پڑے تو میرزا کو چاہیئے کہ اسے قوی طرح دھک پہنائے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ اگر محودت حال برعکس ہو تو پھر (دوستانہ) برتاؤ کی بات مان لے۔ اگر میرزا بڑے لوگوں کی محبت میں بیٹھا ہو اور وہاں لے میرے خیال میں یہ تمام جلال الدین دوستانی ہے۔ شاید ہونوی ملازمین نے قلی سونو کی عبارت پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ خراب شکست میں لکھے ہوئے 'جلال الدین' کو 'جلالانی' پڑھا جا سکتا ہے علیہ جلال الدین محمد دوستانی عبدالبرکی کا ایک مشہور طبیب تھا۔ سنہ ۱۵۹۹ء میں نظام الدین عیسیٰ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ 'آپ بک اعلیٰ حضرت' (اکبر) کی ملازمت میں ہے۔ 'ابا معلوم' ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۱۱ھ میں جب 'میرزا ناصر' تعینیت کیا گیا تو زندہ تھا کیونکہ اس کا ذکر ایک ہمسری حیثیت سے کیا ہے (دیکھو۔ طبقات اکبری انجمنی ترجمہ الاشیاء ک سوسائٹی۔ جلد دوم صفحہ ۷۱۳)

ہر کوئی اپنی آمدنی اور قابلیت کا ذکر کر رہا ہو تو اس کو چاہیے کہ موضوع بدلنے کی کوشش کرے۔ یہ ممکن ہو تو نہا در نہ معاملہ صاحب خانہ پر چھوڑے اور خود سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے مگر سیر کرے کہ دیکھنے کے قابل جگہ ہے۔ اگر کہیں سکونت اختیار کرنے کا خیال ہو تو شام کو دھلی بنائے کیوں کو دن اٹھ رہا دھلیاں پنیر اور پیٹھے فروزے دے (افراہ) ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ چیزیں رافضیوں کی (مخصوص) غذا ہیں۔ یہ چیزیں ایک پتے مسلمان میرزا کو دستیاب ہوں تو ان کے کھانے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہندوستان میں چاکشتو بھی زیب تن نہ کرے اور زیادہ باتیں کرنے سے پرہیز کرے۔ محفل میں لوگوں کے ساتھ بحث نہ کرے۔ خصوصاً مذہبی بحثوں سے بچے۔ جو کچھ بھی اس کا مذہب ہو اُسے غصہ نہ لگے ورنہ ہو سکتا ہے کبھی اس کی پٹائی ہو جائے۔ اگر میرزا کو کمر بیٹھے تو جب تک وہ پانچ سو کے منصب پر نہ پہنچ جائے اپنے ٹھکانے کو ہان نہ لائے۔ مصیبت کے دنوں میں چھوٹے لوگوں کا احسان نہ لے (اور ان کے گھر سے ہمان نہ لے) کہ اس میں ذلت کا امکان ہے۔ کوئے کو دنیا کے تمام کیلوں میں بہتر سمجھے۔ کبھی کی عزت اور ناموس کی بابت غیر مددارانہ باتیں نہ کرے۔ ہر ایریسے غرض سے مذاق نہ کرے اور نہ ہی اسے اپنے سے مذاق کرنے کا موقع دے۔ دستوں سے کبھی کبھی لے اور اپنی طرف سے کوشش نہ کرے کہ دن میں ایک سے زیادہ بار ملاقات ہو۔ اپنی سوردیہ یا ہمان نواہ میں سے دس روپے پٹلے اور چیرہ بادل پر خسر چ کرے۔ اگر یہ دو دونوں چیزیں اس کے افسر نے اسے دی

۱۔ ایک تم کے حوتے

۲۔ فارسی عبارتیں ہیں ہے :-

"عاشق حوت خود نیاشد"

۳۔ چیرہ۔ یہ مٹی صاف۔ بادل ہندی لفظ ہے یہ مٹی تار نقرہ بالما۔ بظاہر چیرہ بادل سے مطلب ہے کار چوٹی صاف

مولوی ہدایت حسین نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

embroidered badge

ہوں تو حیران کو سمجھنا نہیں چاہیے بلکہ اور اگر وہ چاس روپیہ سمور پر خرچ کرے تو یہ فعلی فرجی نہیں بھگنے گی۔ جب لوگ پوسر کھیل رہے ہوں تو بات نہ کرے۔ لطافت کو لے کر کسی خبر کے گھرنے جائے، خصوصاً ایسے آدمی کے یہاں جو میرزا سے زیادہ استعداد والا ہو اگر میرزا کے روئے مبارک پر دھول جم گئی ہو تو اس کو نمک اور سرکہ سے دھونا چاہیے۔ تارک الدینا در دین کے علاوہ میرزا کو کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ شہر سمیت پورا پڑھنا چاہیے۔ حق ملے اگر آسان اور شیر ہو تب ہی اس کو دہرانا ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک معرہ پڑھ رہا ہو تو یہ مناسب نہیں ہے کہ میرزا اس سے پہلے دوسرا معرہ پڑھ دے۔ ہندوستان میں اگر میرزا مکان سے تو اس کے دروہام کی خوبصورتی سے زیادہ استحکام کی طرف توجہ دینا ضروری ہے تاکہ رسات میں بے اہل نہ رہتا۔ بیک حمام میں بوڑھے تمام کو اپنا بند نہ چھوئے دے مگر حجام کے بیٹے کے ساتھ ملائمت سے پیش آئے کبھی ایسے عوض میں نہانے کے بعد بھان کئی آدمی کو لے لگا رہے ہوں میرزا کے لئے یہ مناسب ہے کہ غسل خانہ میں جا کر تھوڑا سا صاف (پانی سرے ڈال لے۔ اگر نہ پانی چاہتا ہے کہ سخت نہ اٹھا لے تو بالائیشی کا سودا اپنے سر سے دور کر دے۔ ہندوستان میں جو لوگ اپنے سروں پر بڑے بڑے عمامے باندھے گھومتے ہیں ان سے عقل کی امید نہ رکھے۔ اگر میرزا کو اپنی عزت بھاری ہے تو ایسوں سے کوئی توقع نہ رکھے جو اٹھتے بیٹھتے اس طرح کی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ یوں فلاں بڑے آدمی سے ملوں گا۔ وہ مجھے ہزار روپیہ اور بہت انعام اکرام دے گا۔ ہندوستان میں لوگوں کے گھروں پر جا کر بھرتی اور پالادہ

۱۔ محل منصب دار اپنے ماتوں کا تنخواہ کا ایک حصہ پرانے کپڑوں اور دھرمہ کے استعمال کی دوسری چیزوں کی صورت میں دیا کرتے تھے۔ دیکھو مالکی سٹوڈیو ڈی ہوگر۔ انگریزی ترجمہ جلد دوم صفحہ ۳۷۷-۳۷۸۔ اس الحاح کے لئے میں نے اپنے قلم دو اوستا مٹی سید

المہر علی صاحب کا شکوہ اس میں جی کی کتاب

جلد ششم چھوٹی ہے۔

Anurag's Reign

جنوری ۱۹۷۶ء

کھانے کی عادت نہ ڈالے کیونکہ ان چیزوں کے کھانے سے انسانی کمال
ہو جاتا ہے اور پھر بے عزتی ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ منصب صدی پر
رہتے ہوئے میرزا کو اپنے حقہ کا سر پرش اور گھوڑے کی نگاہ مغزی
نہیں بننا چاہیئے کیونکہ یہ چیزیں (زیادہ دن تک) اس کے پاس
نہ رہ سکیں گی (یعنی جوتا پڑیں گی) اگر میرزا اپنے اصرار کے ساتھ سفر
کرنا نہ چاہے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے گھوڑے کو کم کے نہ نکلے دے لیکن
جب تک چر سے گزرتا ہو تو آگے ہو جائے (اور سلامتی کے ساتھ چل
یاد کر کے پھر پیچنے کی طرح اپنا گھوڑا پیچھے کرے۔ اگر میرزا کی حالت
ٹوٹی ہوئی ہو اور اس کو عمدہ برتن دستیاب نہ ہوں) پھر بھی وہ
پیش کے برتن استعمال نہ کرے کیونکہ ان کے کناروں پر نقش بنے ہوتے
ہیں جن میں جا بجا میل آسانی سے صاف نہیں ہوتا ہے۔ اگر ممکن ہو
تو پیشی خان کی سرائے کے دروازے پر میرزا اپنے تختے سے کوئی بات
دنگے کیوں کہ وہاں کی بات دنگ بھی رہتے ہیں۔ اگر میرزا جا ہوتا ہے
کہ نقصان نہ اٹھائے تو چند چیزوں سے دور رہے۔ اگر کوئی آدمی

بھی کسی نسانی مشورے کو اس کے چکر میں میرزا کو نہ پڑنا
چاہیئے کیونکہ وہ کسی گفتگو کا میل خانہ ہے جس سے باہر
نکلنا مشکل ہوتا ہے) کی بحث سے تبادلاً خیال بھی مناسب نہیں
ہے کیونکہ اس میں سراسر تکلیف ہے۔ جہاں تک ملک ہو سکے
ممد مار بیگ فریسنڈ اور میرزا افضل بیگ سے دوستی کرنے
سے گریز کرے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی گفتگو کرنے اور گپ مارنے کے
بہت عادی ہیں۔ کسی مجلس میں جہاں بہت سے لوگ مدعو ہوں
میرزا کو سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ
اگر سب سے پہلے پہنچ گیا تو تمام ہاتھوں میں سے جو کوئی
بھی داخل ہو گا اس کی تواضع کرنی پڑے گی (یعنی ٹھٹھے ہو کر
معاف کرتے کرتے تاکہ دم آجائے گا) ان باتوں کو
"چارو حصے اختلاط" کہتے ہیں۔ بہر حال اگر کسی کے سر میں
میرزا کی کا سودا ہے تو اس رسالہ کی طرف رجوع ہو۔

معقول اردو کے جڑواں معوتے (آج کی ذریعہ فارم) کا غلط نام

صفر	۴	۳	۲	۱	۰	صفر	کام	سفر	غلط	صحیح
طاہرین درج ہیں۔ ان میں سے غلط نمکی ہندی شکلیں غلط ہیں۔										نیم معوتوں
صحیح غلطیوں درج ذیل ہیں:-										
۱۔ خفیف اے	ع	۸	۱	۷	۰	۷	۷	۷	۷	۷
۲۔ اے	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۳۔ خفیف آے	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۴۔ اے	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۵۔ آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۶۔ آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۷۔ آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۸۔ آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۹۔ آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۱۰۔ خفیف آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
۱۱۔ آ	ع	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷
ان کے علاوہ ذیل میں چند اور غلطیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔										

پہنچن

مرا جی کے منہ پر یہ شا عر شری دی۔ اہم۔ کلکری کی ایک نظم ”مہر شایس“
(آئینا سے اکاڑاؤ ترجمہ ان کی پرنٹس اجازت کے ساتھ۔ (خاوند)

میرے مرے ہسارے	میرے نرم پنکھوں کی	میرے پل کے
میرے پیار کے سائے	دہ حبسِ جنت بھی	میرے لے بھی ہیں
میں تیسری مخالفت ہیں	تیسری تیز آنکھوں میں	اب مرے مقدر ہیں
کتنائے مکر اتنا تھا	مامت کی شدت بھی	گرمی سفر بھی ہے
کھل کے چھپاتا تھا	اب کہاں سے پاؤں گا!	زورِ بال و پر بھی ہے
خوب گیت گاتا تھا	اپنی پو پو میں دانے	میں بھی اڑکے جاؤں گا
پہ نکلے ہی، لیکن	دور دور سے لا کر	گیتِ فتح کے اپنی
اب مری نگاہوں کے	کون اب بھرائے گا	رفقوں پہ گاؤں گا
سامنے اڑائیں ہیں	میری بھوک کا، اتنا	پھر بھی اک ”پہنچن“ میرے
آسمان کی دست ہے	دھیان کس کو آئے گا	دل کو گدگدائے گی
اور کھلی فضا میں ہیں	یہ جبا کہ، اب بھسکو	ہمدردشیاں کے، وہ
بیسراں خلا میں ہیں	اپنے پختہ پسنکھوں کو	دل کش دھیں لے
میری گود کے وہ دن	اٹھ کے پھل پھڑانا ہے	نقش ہیں جو اس دل پر
اب ہیں، خواب کی باتیں	آسمان پر جانا ہے	یادگار ہیں، تیسری
آج دل کی قسمت ہیں	میرے دل میں اب روشن	بیسراں محبت کے
افسردہ کی باتیں	عزم کے دئے بھی ہیں	مامت کی شدت کے
		پھر کہاں سے لاؤں گا!

چند گراں مایہ خلوط

(بنام حضرت نفیس)

رکھا گیا ہے۔ اسی صورت میں حضرت نفیس کی ذات اس کلمہ سے کیے
مستحق ہو سکتی تھی؟ یہ خوش قسمتی ہے کہ فیضِ غما میں علم و ادب نے
حضرت نفیس کو نہ صرف اردو کا ایک مایہ ناز شاعر سمجھا بلکہ ایک محقق فن
کی حیثیت سے آپ کا وہ تسلیم کیا۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ فی مملکت
اور دوست مطالعہ کے اعتبار سے والد مرحوم زبان و ادب کے تمام پہلوؤں
پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔

میں تو حضرت نفیس کو فصاحت و جملہ جلیل مائیکوری سے شرفِ تلمذ
حاصل تھا لیکن ان کے فکر و نظری گہرائی و گہرائی اور وجدان و شور کے قبضے
و نفیس نے یگانہ جگیزی، عربیہ لکھنوی، آرزو لکھنوی، اہلسر ہاؤس
آف لکھنوی، عربیہ نازنگ، نور نادوی، اسن ماہروی اور نالین لکھنوی
دعوت سے بھی راہ و رسم پرینہ لگائی تھی۔ سو موت نے ان مشاہیر سے خوب
استفادہ اور ان کتاب علم و فن کیا۔ حضرت نفیس کی تہذیب و ادب کا علمی
میں آپ کا ایک مجموعہ کلام ہے جس میں زندانِ کیفیت اور بے پناہ سرتی
کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جن عروض پر ایک رسالہ ”میزانِ سخن“ ”مکتبہ قدیم“
”اصطلاحاتِ جلیل“ ”تحریراتِ نالین“ (مکمل) اور ادبی خطوط و دستنما
بڑی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں۔ بہر حال بقول جسدا ہوا دی وقت
خیر آذاد۔

”جنونی ہند کے حضرت نفیس کی ذات منتکات کی

حیثیت دکھتی تھی۔ آپ نہ صرف ایک بہترین شاعر اور

اردو میں کوتاہی ادب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کاتب و مکتوب الیہ
کی نفسیات، ان کی شخصیت کے خدوخال، ان کے افکار و امیال اور ان
کی زندگی کے اصلی روپ پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔
شاید اسی لئے ڈاکٹر جاس نے کہا تھا۔

A man's soul

lies naked in his letters

’ایک آدمی کی روح
اس کے خطوط میں عریان نظر آتی ہے‘ اس بقریہ و تخیل کے دور میں
ادب اور ادیب کے درمیان ایک مربوط و منظم رابطہ قائم کیا جا رہا
ہے اور ان کو ایک نئے زاویہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس حیثیت سے
خطوط اس باب میں اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اردو کے مکتبہ باقی ادب
اس کی روایات اور تاریخی ارتقا و پرستار ادا کرتے بڑی جان و
مالخ آرا کا اظہار کیا ہے اور اس کو نئے نئے معنوں اور نئے ادبی شعور
سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور حد یہ ہے ع
یہ کہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت

والامعالمہ ہے۔ ذیل میں جن فرہم و خطوط کا تعارف کرایا جا رہا ہے
وہ میرے والد مرحوم حضرت نفیس بنگلوری سے متعلق ہیں۔

حضرت نفیس اگرچہ اپنے علم و فضل اور ادبی شاعرانہ صلاحیتوں
کے باوجود وہ شہرتِ عام حاصل نہ کر سکے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔
اب ان اسباب و علل اور نتائج پر غور کریں تو پھر اس کے ادراک کیا ہو سکتا
ہے کہ ہر ملک میں تہذیب و احیاء فن و کمال کے ساتھ ایسا ہی سلوک نہ

لکھنؤ میں ہیں۔

علم
عسکری

(۷)

خط مرزا یگانہ چنگیزی لکھنؤی

والد مرحوم نے ماہنامہ چمنستان دہلی بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں مرزا یگانہ چنگیزی کی ایک غزل دیکھی۔ والد صاحب کو اس غزل کی ہرکے متعلق کچھ شبہ سا ہو گیا اور اس باب میں یگانہ مرحوم سے اختلاف رائے کیا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے یہ مکتوب تحریر فرمایا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۴۲ء

بندہ نواز تسلیم

..... بلے جیسے ملحق انسان لوگ میدان میں آکر شہر کاؤن

حاصل کر لیں تو پھر علم عروض کو جاننے اور اس کے خواہیہ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہی اب موزوں و ناموزوں کی بحث بے کار ہے۔ البتہ میں نے اب تک اس فن کا فائدہ رکھا ہے مگر ہر شاعر و مترادف کے بعض زعماءات کے حلیہ باہمی کو میں نے جائز سمجھ لیا ہے زیادہ کیا عرض کروں اور آپ ڈھونڈیں گے تو اگلے اساتذہ کے ہاں بھی عروض کے بعض اصول کی خلاف ورزی کا ثبوت مل جائے گا ایک دھموتے میں جو جان بوجھ کر بعض زعماءات کے حلیہ باہمی کو جائز قرار دے بیٹھے ہیں اور ایک دھموتے میں جو بے سمجھے اور بے وجہ ایک وزن سے دوسرے وزن میں بہک جاتے ہیں ان دونوں میں فرق ہے

بمختصر

مرزا یگانہ چنگیزی لکھنؤی

سب رجسٹرار باورگروہ

لے لیا زمرہ میں نے دور حاضر کے چند شعراء کے نام لکھے ہیں جن کا تذکرہ میں مناسب نہیں سمجھتا۔

خوش ناسی تھے بلکہ فنی معلومات اور دوستی مطالعہ کے

اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ دوستوں

میں ایک بہترین دوست، شاعروں میں ایک بہترین

شاعر، شاگردوں میں ایک ہمدرد استادین کو آپ نے

ایک مثال قائم کر دی ایسی ایک باشعور شخصیت کا انتقال

کر جانا قلم کے لئے ایک نقصان عظیم سے کم نہیں۔

آخر روشنی کا یہ مینار جس نے اپنی ضیا پانچویں سے ملک کی ممتاز ذہنیاتیہ تفسیلاتوں کی آنکھوں کو کھیر دیا تھا ۱۹۵۱ء میں بجھ گیا، زمانہ کی قدرناشک دیکھ اے معافی نے اس ناز و گرامی شاعر اور محقق فن کو قفسِ گنجنا میں ڈال دیا۔

توفیق زلفک آمدہ بودی بچوں مسیح

پاؤں رنج و کس قدر توفیق و رنج

آپ کے ادبی سرمایے سے شاعر کے کچھ خطوط دیدے تا ظہیر ہیں۔

(۱)

خط لسان اہلتر حضرت عذریہ لکھنؤی

لکھنؤ اشرف آباد عزیز منزل

۱۶ مارچ ۱۹۴۲ء

مکرمی السلام علیکم

محبت نامہ پہونچا، آپ کے حسنِ خلق کا منت پذیر ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے کہ بے مددِ عید (حضرت رہتا ہوں۔ بندوستان کے مختلف مقامات سے پرکرت ایسے خطوط آتے رہتے ہیں اگر یہ ایسی خدمت کو انجام دیتا ہوں تو شاید اپنا کوئی کام نہیں کر سکتا، مجبوراً میں نے وقت کا سوا حصہ مقرر کیا۔ آپ شاید اس کو بد اخلاقی پر محمول کر سکیں مگر میں اس طریق پر مجبور تھا۔ تفصیل کبھی پھر تحریر کروں گا۔ آپ سے میری یہ خواہش نہیں کیونکہ آپ کا کلام نہایت پاکیزہ ہوتا ہے اور یہ اندوہی خوش قسمتی ہے کہ ایسے مقامات پر بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ آپ کی غزلیں فرصت کے وقت دیکھ کر بیچ دوں گا۔ مرزا رستم صاحب کا بیٹہ عثمانیہ یونیورسٹی والا لاہور جید آباد ہے۔ دیکھنا صاحب کا بیٹہ خیر آباد ہے۔ مگر آج کل....

(۳)

خط حضرت آزاد و لکھنوی

۲۷ فروری ۱۹۱۹ء

حبیب دل فانا!

سلام مستون ہو پیچے۔ کارڈ ملا۔ شکر کے متعلق اطلاع دی کہ
شکر یہ۔ ”سچ“ معنی میری نظر سے نہیں گزرا۔ انشاء اللہ نشان آزاد
کی آئینہ اشاعت میں یہ مطلع نکال دیا جائے گا

میزان اخراجات کے نہ پہنچنے کا تعجب ہے آج اوار ہے کل انشاء اللہ
اس کی کفی سبیل کی جائے گی۔ آج کی ملاقات کا سلسلہ جاری ہے۔ ملازمت
کے فرائض انجام دینا ہی پڑتے ہیں۔ لہذا بغیر امور کی طرف توجہ کرنے کا موقع
ذرا کم ملتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنی خیریت اور حالات سے مطلع کرتے رہیں گے۔
از حریت پرتو تسلیم و نیاز

غیر طلب

آرزو لکھنوی

(۴)

خط فصاحت جنگ جلیل مالکپوری

از معید آباد کوٹ

دل فانا!

سلام مستون، دلت کے بعد آپ کا لاوازش نامہ ملنا۔ سدا خط سے
آپ لکھیں روش ہوئی اور دل مسرور ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔
الوداع کے عرصہ پر جو حاشیہ آپ نے لکھا ہے اس کا نوڈ میں نے دیکھا۔ منہ
بے بہتہ ہے۔ دو مراد سادہ و عرق جو آپ نے مرتب کیا ہے اس کا نوڈ
بھی عجیب، قویں دیکھ کر اسے قائم کر سکوں۔ ولادت فرزند مبارک ہو

لے دیوان فصاحت جنگ جلیل مالک پوری

لے حضرت جلیل مرحوم کے ”رسالہ عروض“ پر والد مرحوم نے حواشی لکھے
تھے خط میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

تہ خود والد مرحوم نے عروض پر ایک کتاب ”بیرانی“ بھی مرتب کی ہے۔

انشاء اللہ تاریخ فعال کو بھیجوں گا۔ نام آپ نے تسلیم احمد رکھا ہے۔ اگرچہ یہ
میرے ایک فرد کا نام ہے مگر غیر جو آپ کی رائے ہو۔ حضرت اختر مینائی
سلام کہتے ہیں اور سب اطفال خوش تمنائی تسلیم گزار رہیں۔ علی سلمہ
اپنی غزلیں بھیجیں گے۔ والسلام

فصاحت جنگ جلیل کان انشاء

(۵)

خط نواب عزیز یار جنگ

عزیز منزل

۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء

کوٹ

آپ کا خط ملا، اس معرہ میں (دل مرا جان مری داغ سویدا اپنا)
”اپنا“ اور ”میرا“ کا اجتماع شکر گریہ ہے۔

گر بیاں اپنا جا مرگی کا دامن کوہ مہر کا

شعر دست جڑوں سے سب پر زخم ہونے والے ہیں دائرہ مینائی
عجب کچھ عالم دشت میں حالت ہو گئی اپنی

کہ رو تانہوں تو رو تانہوں جو ہنستا ہوں تو ہنستا ہوں (د لکھنوی)
ان میں ”اپنا“ اور ”اپنی“ کا لفظ ”خود و خویش“ کے معنوں میں استعمال
ہوا ہے۔

گوئے جا ملی میں مہار اپنی کہیں میرا دل شیدا فی ہے
جلیل (فصاحت جنگ)

اس شعر میں ”اپنی“ کا لفظ ”خود“ ”خود و خویش“ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
میں خود سے عصیان کے جتا ہوں نہ مڑتا ہوں
ہے مجھ پہ عیاں حال از خود رہا اپنا (اختر گینوی)
میں ”اپنا“ بمعنی ”میرا“ آیا ہے۔

ان اشارے سے شکر گریہ کا کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ والسلام
عزیز یار جنگ

لے میرے برادر مستم تسلیم احمد مینائی کے متعلق لکھا ہے۔

تہ علی احمد علی حضرت جلیل مرحوم کے ایک صاحبزادے ہیں۔

جنوری ۱۹۲۰ء

سری جو کثیر خط حضرت انٹر لکھنؤی

۱۸- جولائی ۱۹۰۷ء

گہری تسلیم

خط کا شکریہ، مگر افسوس ہے کہ ہمیں کم ہو گیا اور تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ اگر رحمت نہ ہو تو امور استفسار طلب دوبارہ تحریر فرمائیے

کسی خط میں آپ نے لکھا تھا کہ عروض پر آپ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے اس کا اشتیاق ہے۔ یہاں سے ملے ہو وہاں حکم دے دیجئے کہ ایک جلد میرے نام وی۔ پی کر دی جائے۔ خدا کرے آپ مجھ اجازت ہوں۔

نیا زمرد

آخر

(۴)

خط مولانا قاضی گلادھنوی

جونا بلی روڈ، ناگپور

مورخہ ۱۲- مئی ۱۹۰۷ء

مولوی صاحب! السلام علیکم

مزاج شریف! آپ کے خط کا جواب اور قطعہ دیکھ کر اپریل

کے دوسرے ہفتہ میں اور کتابی سوالات مہتمم شہزادہ ابیات ۲۴- اپریل کو روانہ ہو چکا ہوں جس کے لئے پوسٹنگ سرٹیفیکٹ بھی لیا گیا تھا

امید ہے کہ دونوں آپ کو مل گئے ہوں گے۔ ہوں گے ہیں تو رسیب کا منظر نہیں آیا جس سے کتاب کے متعلق کو نہ توثیق ہے کہ اگر نہ ملی ہوگی تو میری کو روز کی محنت برباد ہوگئی۔ میں نے سبھی اصلاحات کے متعلق آپ کو جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا آج سے اس بارہ میں خط و کتابت کیجئے اور ان کا پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ اب یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میں انھیں لکھ دیا ہے کہ مولانا نفیس بنگلوری کا کوئی خط آئے تو انھیں مزور جواب دیجئے اور انھوں نے قبول ہی کر لیا ہے۔ دوسری یہ بات میں آپ کو لکھنا بھول گیا تھا کہ گزشتہ سال جگر مراد آبادی کے خود کردہ انتخاب کے اول پاسس اشعار پر جو نگار میں جنوری نمبر میں شائع ہوئے تھے اخبار کارمان، بمبئی میں مسلسل اعتراض کئے گئے تھے جن میں مدنی و ممزی دونوں غلط پرشور کے ذیل میں جدا جدا بتائے گئے ہیں۔ یہ فائل مولانا شا کر کے پاس بھی موجود ہے اگر آپ ان سے حاصل کر کے نقل کر سکیں تو جہاں ورد مجھے کیجئے میں بھی دوں گا ان اعتراضات کو سارے نمک لے کر مانا ہے۔ بہر حال جواب بواپسی دیجئے کہ کتاب کی رسید کے متعلق ایسٹان ہو۔

والسلام

ناظم

شہزادہ ابیات غالب

استاذی علامہ رشک کرناٹلی پروفیسر جامعہ دارالسلام عمر آباد

غزل

مرا رفیق بروزِ ازل رہا ہے چاند
سمٹ رہی ہے سیاہی، نکل رہا ہے چاند
تھی ہوئی ہے شبِ انتظار آؤ بھی
کہ اضطراب میں کر دٹ بدن رہا ہے چاند
نگاہِ نازیقِ تینا دھرا اٹھی ہوگی
بہت قریبِ رگِ جاں چل رہا ہے چاند
تمہاری آنکھ میں آنسو مری تباہی پر
کہ سردِ آغ میں اپنی گھل رہا ہے چاند
شبِ وصال کو زلفیں بکھیر لیے دو
ابھی قریب رہا آؤ کہ مل رہا ہے چاند
فلک پر آج اندھیرے کندھیں کی گے
غریبِ شہر کے ہمراہ چل رہا ہے چاند
نیا سوال اٹھایا ہے رات والوں نے
سحر کی بات نہ بچھڑو کہ ڈھل رہا ہے چاند
ترے خیال سے پھر دہ کی ہسرا بھری
کچھ اس ادا سے کہ دل پر پھسل رہا ہے چاند

شبِ فراق منظر بڑی جہانک ہے

حبیبِ ابر کا ٹکڑا نکل رہا ہے چاند

نئی کتابیں

غالب

انزوشیدالاسلام - پبلشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔
تفصیل ۲۲۱۸ صفحہ ۲۸۰ کاغذ، کتابت، لطاعت، جلد، جلد پیش
عمدہ - قیمت چھ روپے۔

اس کتاب کا موضوع غالب کا ابتدائی دور ہے۔ معنیٰ نے
بڑی کاوش سے غالب کے ابتدائی کلام پر اس کے پس پردہ کے اثر
کو ثابت کیا ہے۔ وہ پیشرو ہیں شوکت، ابیر، بیدل، عفی، نامہ علی شاہ
اور ناز - ان حضرات کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے۔ اس کے بعد غالب کے
آزاد کا دلکش شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالب پر اب تک جو کچھ
لکھا جا چکا ہے اس کتاب کا اندازہ تحقیق اس سے الگ ہے اور یقیناً یہ
کتاب غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ محض آنتہی نہیں بلکہ اس
مطالعے سے اردو شاعری کو سمجھنے کا ایک نیا انداز آئے گا۔

گل رعنا

رعنا جی کی رہا جیوں اور تعلقات کا مجموعہ - ناشر مکتبہ بریل
اندولہ لارم علی - تفصیل ۲۲۱۸ صفحہ ۲۳۲، کتاب صوری اور
منوی حسن کی حامل ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

رعنا کلاسیکل انداز کے شاعر ہیں لیکن سادگی کے ساتھ
نئے نئے نغموں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان بہت شگھا ہوا ہے
زبانی جیسی صنف میں انھوں نے پرکاری کا ثبوت دیا ہے۔ تعلقات
جی خوب ہیں :-

نغمات سے تو زیر نکل آتی ہے زہراب سے اکیڑ نکل آتی ہے
تقریب کے پرے ہی سے اکڑ رہا تھا اک صورت تمیز نکل آتی ہے
ان کا کلام اور انداز زندگی ظاہری نمائش سے آلودہ نہیں اور انیس
اپنے جو ہر کام میں احساس ہے۔

کب ذات صفت سے متبر ہوئی ہے مرہون ہر تقدیر ہر ہوتی ہے
ہوتا نہیں خورشید سو کا محتاج خورشید کا محتاج سو ہوتی ہے
ما سطر ام چندر اور اردو و شری کے ارتقاء میں ان کا حصہ
مولفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر - ناشر ایوان کلام آزاد اور نیش
ر سیرج انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد - تفصیل ۲۲۱۸ صفحہ ۲۱
قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔ کتاب مائٹ میں بھی ہے۔

ما سٹر ام چندر ان نغمہ ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے
پہلے پہل اردو مضمون نگاری کی بنیاد رکھی - مولوی ذکا بھٹ اور
نذیر احمد ایسے اردو کے مشہور مصنفین آپ کے شاگردوں میں سے
ہیں - یہ علوم سائنس اور ریاضی کے ماہر تھے - انھوں نے سماجی
اصلاح اور ترویج زبان کے لئے رسالے جاری کئے، مضامین
لکھے اور تصنیفات کثیرہ سے اردو کا دامن لالما ل کیا۔ کتاب
میں ان کے دل چسپ حالات زندگی اور ان کے مضامین درج
ہیں - حالات زندگی میں مزید واقفیت ہم پہنچائے جانے کی
محنت شائستہ ہے - ان کے خود نوشت سوانح حیات سے غالباً قارئین
نہیں اٹھایا گیا۔

چند یا سنت نامور

نامور کادوری کے کلام کو اردو ایڈیٹر سید محمد کراچی نے از سر نو بڑے اہتمام سے شاہجی میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ستارہ حسن کا فاضلہ مقدمہ ہے اور ہم ہی اس کے مرتب بھی ہیں۔ دو دو کا گودنی محفوظ کلام نامور کے داسے سے حق تاریخ کوئی ادا کیا ہے۔ نامور نے انگریزی نغموں کے بہت ہی خوش آئند اور سلیس ترجمے کئے۔ وہ اور ان کا بڑا کلام اس کتاب میں شامل ہے۔ اس جہاں مرگ شاعر کو اگر مزید مہلت زندگی ملتی تو اردو ادب کو اور بہت کچھ ملتا۔ کتاب بڑی تلیق کے ۵۵ صفحوں پر مشتمل ہے۔ بہت خوب صورت چھپ ہے اور دیدہ زیب جلد پوش اور مضبوط جلد کی حامل ہے۔ قیمت دس پیسے۔

اقبال اور اس کا عہد

معتمد جگن ناتھ آزاد۔ نامور ادارہ انیس اردو الرام یاد۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ یہ کتاب جگن ناتھ آزاد کے تین مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات 'شہر اقبال کا ہندوستانی پس منظر'، 'اقبال کے کلام کا متغیر فائدہ'، 'اقبال اور اس کا عہد'، 'جوتی و کشیداری' اور 'دستی سری' کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔ آزاد نے اقبال کا مطالعہ بڑے دور فکر سے کیا ہے اور یہ مقالات 'اقبالیات' کے ضمن میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

داستان زبان اردو

معتمد ڈاکٹر شوکت سز داری۔ نامور ادارہ ایڈیٹر سید محمد کراچی۔ قیمت پانچ روپے۔ کتاب میں جلد کی حامل ہے۔ کتابیت و لطاعت اوسط، صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۲ پیسے، ۷۲ پیسے۔ تاریخ اردو داستانیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ فہرست مطالب سے کتاب کے موضوع پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ ہے۔۔۔ اردو، لسانی سرمایہ، مختلف نظریے، اردو اور پنجابی، مولود و خشا، اغذہ و استغذہ، عرفی و نثری و نثری، خراج و مہاج، ارتقائی مدارج، اردو کے قدیم۔

تنکے

غزوان چند بسیم کے کلام کا مجموعہ۔ اس کتاب میں کچھ غزلیں

ہیں اور کچھ نغلیں بسیم صاحب بڑے خوش گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں پختگی ہے۔ آغاز بیان پرانا لیکن انداز فکر پرانا نہیں ہیں امید ہے یہ مختصر مجموعہ مقبول ہوگا۔

تغیبتی زیادہ

از ڈاکٹر عزیز احمد۔ پبلشرز: شاہجی پک شال سری نگر کثیر۔ سلسلہ تغیتی کی کتاب اول ہے۔ قیمت چار روپے پچھتر نئے پیسے۔ فہمات، ۱۱۰ صفحات، کتابت، لطاعت اوسط۔

معتمد نے اردو میں تغیتی کی ایک مستند اور مستقل تغنیف کا ارادہ کیا ہے۔ یہ ارادہ مستحسن ہے۔ اس جلد میں شاعری پر بحث ہے۔ دوسری زبانوں یا لغویوں پر بھی لیا توں میں جو سیمار تغیت ہے اس کو پیش نظر رکھا ہے اور تغیت کو ایک فن کی حیثیت سے پرکھا ہے۔ غلطہ تغیت کو مختلف موضوعات میں تقسیم کیا ہے جو شاعر ایک عام قاری کی سمجھ میں نہ آسکیں۔

امراض شلم

ڈاکٹر چمن لال پرگم کی تصنیف ہے۔ موضوع کتاب تمام ظاہر ہے۔ فہمات ۱۳۳۲، صفحات ۱۲۰، تغلیق ۱۲۰ پیسے۔ قیمت پانچ روپے جو کتاب کی فہمات کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ انگریزی کی عبارتیں اگر ناہٹ ہیں تو کمزور کے شائع کی جاتی تو بہتر ہوتا۔ موضوع کے اعتبار سے کتاب پر حقش کی جی رہنمائی کر سکتی ہے۔

رگ جاں

غوشید اسلام کے کلام کا مجموعہ۔ نامور اشاعت ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ تغلیق ۱۲۰ پیسے، فہمات ۱۱۲ صفحات۔ کتاب شاہجی میں چھپی ہے۔ جلد اور جلد پوش عمدہ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ غوشید اسلام تغیتی میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے فکر کا نیا اسلوب اور بیان کا نیا انداز ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔

کوئی فریب تراش کوئی حیران جلاؤ

یہ ایک نام کی طور سے اسر کر جاؤ

زندگی کے ساتھ مصاحبت کی تلقین ہے۔ اسی مصاحبت کا نام روحانیت ہے، ان کی نغموں میں ارتقاء ایک تازہ، اور تفسیر پر

بہت پسندیدہ نظیں ہیں۔ غزلوں میں وہ رلودگی اور بے ساختگی تو نہیں جو غزل کا طرہ امتیاز ہے بلکہ گرسے فکر اور خود کے آثار پر مرکب نظر آتے ہیں۔

نغمہ صوم

دہشتی حروف ہیں) اردو کی ۱۰ شاعرات کے حالات زندگی اور کلام - از ایوب حیات پراساد گوٹی - ناشر بھارتیہ رگیاں پبلی، کاشی تقی ۲۰۰، صفحات ۲۷۲، قیمت چار روپے - کتاب بہت قیمتی و عیس شاہ ہوئی ہے اور مرتب کی محنت قابلِ داد ہے - (ج-م)

جوانی زندگی کی دل چسپ باتیں

مؤلف ڈاکٹر ایس۔ این عمن، محترمہ عابدی - ناشر ملک اردو الاڈی برائے سائنس و تاریخی جبرہ آباد دکن - قیمت چار روپے جلد مع گرد پوش - صفحات ۲۰۸

اردو میں سنجیدہ موضوعات خصوصاً سائنسی موضوعات پر کتابیں بہت کم ہیں اور لکھی بھی کم جاتی ہیں۔ ذریعہ تفریح کتاب مرث اس لحاظ سے قابلِ قدر نہیں ہے کیونکہ جوانی زندگی سے متعلق ہے بلکہ اس لئے بھی کہ جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ بڑے دل چسپ اور عام فہم انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ پندرہ خور کر دی، ادبلاؤ، شہد کی مٹی، چپاڑی گوریلا و سیل اور اس طرح چھوٹے بڑے جوانوں کی ۲۴ تصویبات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ مختلف عوامانہ قارئین کے جوانوں کی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے جیسے جوانوں کے جذبات، ان کی ذہانت، ان کی ماستا وغیرہ سے متعلق بڑی دل چسپ اور معلومات افزا باتیں رقم کی گئی ہیں اور اس کے لئے ڈاکٹر محترمہ عابدی لفظاً قابلِ مبارکباد ہیں۔ دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کتاب ناٹپ میں بھی ہے اور بہت اچھی چھپی ہے۔

حیثیت و عرفان

مفت یوسف اجیری، مرتب و فاضلہ سدری - محدثت اور مشقیت کا مجموعہ - ناشر مکتبہ اشاعت اردو کوثری جیلہ آباد (پاکستان)

حیثیت ۷۷ پیسے - ضخامت ۲۲ صفحات -

دین حق

مفت پر فیر سید قلاب علی - ناشر حشانیہ پک ڈپو نمبر ۱۰ لورجیٹ پورٹ، کلکتہ - ۱ - قیمت ایک روپیہ - صفحات ۸۸ - جلد مع گرد پوش - لغات اور کتابت اچھی ہے - جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کتاب مذہب اسلام سے متعلق ہے - پانچ ابواب اسلام، قصص قرآن، انبیائے کرام، حضرت خاتم النبیین اور تعمیل دین پر مشتمل ہے۔

مناجاتِ مبتول

مولانا اشرف علی تھانوی نے قرآنی اور عربی دعاؤں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ مولانا عبدالمجید ریلادی نے ان دعاؤں کو ترجمہ اور شرح کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ یہ کتاب بھی مشائخ پک ڈپو کلکتہ نے شائع کی ہے۔ قیمت دو روپے جلد مع گرد پوش لکھا چھپائی اچھی ہے۔

شہر دل

عس زیدی کی غزلوں کا مجموعہ - ناشر مرکز ادب ۸۹۷۱ نیا محل پل گلشن دلی ۶ - قیمت دو روپے - صفحات ۱۳۶، جلد مع گرد پوش - لکھا چھپائی اچھی ہے

عس زیدی نوجوان شاعر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں بڑی پختگی ہے اور کلام فنی اس مقام سے پاک ہے۔ پیش نظر میں سیرا احتشام مبین کہتے ہیں، ”عس زیدی کے ہاں میں ایک دھماکا ہے، ہلکی ہلکی آہ سے گوی پیدا کرنے والی ایک کیفیت ہے جو ان کے گمراہ ذہن سے آشنا کرتی ہے۔ یہاں جذبات کی کارفرمائی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ سطر پر موم کی رفتار بہت تیز نہیں معلوم ہوتی لیکن سطر کے نیچے اچھا خاصہ سماں نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ انھوں نے گائیوں سے بہت کام لیا ہے۔۔۔۔۔ راجائیت اور تشریح کے بجائے اشاریت نے پچھلے سے کچھ کہہ کر اثر پیدا کر لیا ہے۔ میں بڑی مدد دی ہے۔“

عس زیدی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس رائے سے

پورا پورا اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اس جہاں سالی شاعر سے ہیں پڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ امید ہے اہل ذوق اس مجموعے کو تسکیدی نظر ہوں سے دیکھیں گے۔

مشورہ یک ڈپو نام نگہ، پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی ۷۶ نے اردو میں پانکٹ یک لایا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی تمام کتابیں اچھی لکھی چھپائی اور گفٹ اپ کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود قیمت فی کتاب صرف ایک روپیہ ہے۔ یقین ہے کہ یہ سلسلہ مزید مقبول ہوگا اور اس طرح ناشران کی بہت افزائی ہوگی کہ وہ اعلیٰ ادبی معیار کی کتابیں زیادہ تعداد میں شائع کریں۔

اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں معمول ہوتی ہیں:-

- ۱۔ کیوں کا مراد (ناول) ٹٹا کر پونھی
 - ۲۔ زخم (ناول) الیاس احمد گری
 - ۳۔ بوند اور سمندر (ناول) کرشن گپال فاید
 - ۴۔ بھر گئے پستے (ناول) منشی صدیقی
 - ۵۔ وی (ناول) اکرم آبادی
 - ۶۔ چند (افسانے) سادات حسن منٹو
 - ۷۔ تیری ممت میری آنکھیں (ناول) ہندو ناتھ
 - ۸۔ چاندنی (ناول) عادل رشید
 - ۹۔ دیوان درد خواجہ میر درد کا دیوان
 - ۱۰۔ رہا جیات عرفیام حد سونم مترجم پروفسر واقف
- تمام کتابیں مندرجہ بالا پستے سے طلب کی جاسکتی ہیں۔

(ش-ح)

موصولات

مرآۃ الخائب دیوان غالب کی مشرق از بخود دہلوی دنیا ایڈیشن) ناشر عثمانیہ یک ڈپو بزم ۱۰۔ اور حیت پورہ روڈ کلکتہ۔ قیمت پانچ روپے۔
 اویس، نیچے اور درمیان دنیا ایڈیشن) سادات حسن منٹو کے مضامین کا مجموعہ۔ ناشر عثمانیہ یک ڈپو بزم ۱۰۔ اور حیت پورہ روڈ کلکتہ۔ قیمت چار روپے

سایح کو اریخ۔ شوکت تھاقوی کا ناول۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے ملے کا پتہ:- عثمانیہ یک ڈپو کلکتہ۔

میری ماں۔ داستان اسلام احمد۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔

صفت ۴۴۔ مجلہ۔ ملے کا پتہ:- دفتر اقتصاد ٹیٹہ م

چینی کے مسلمان۔ چین میں مسلمانوں کے مصائب کی داستان ناشر نیشنل اکاڈمی ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔ قیمت ۷۵ نئے پیسے۔

انتظام کتب خانہ۔ کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم اور کتابوں کی تنظیم سے متعلق معلومات کا مجموعہ۔ مصنف شیخ محبوب قریشی ناشر مجموعہ کارخانہ جلسہ نازی، حیدر آباد کالونی ۱۶، کراچی۔ قیمت ایک روپیہ چالیس پیسے

ستاروں کی سیر اور خرم گوش کا پسینا۔ بچوں کے لئے کرشن چندر کے لکھے ہوئے ناول۔ ناشر مکتبہ جامعہ ملینڈر نی ڈبلی قیمت دو روپے ۷۵ نئے پیسے۔

آغا فتح۔ بہار کے نوجوان اور خوش فکر شاعر نادم بلخی کے کلام کا مجموعہ۔ ملے کا پتہ:- نیشنل بک سنٹر ڈائریکٹ گنج۔ پلاویں (بہار) قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے۔

ذکر غم۔ حق تاریخ گوئی اور حضرت شاد سے پوری مرحوم کا اجمالی تذکرہ۔ ملے کا پتہ۔ مکتبہ اردو ۱۵/ا جی سٹریٹ ملینڈر لائن کراچی۔ قیمت ۷۵ نئے پیسے۔

معمودہ دل۔ رونق جود چھوڑی کا مجموعہ کلام۔ ملے کا پتہ:- رونق جود چھوڑی مقابل سندھی اسکول، جھورانی، کائی روڈ حیدر آباد۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

آغوش گل۔ اس مجموعے میں ایسے خواہ کلام شامل ہے جو شاعر کے رہنے والے ہیں یا طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ مرتب۔ راجندر ناتھ بھیر۔ ناشر بزم ادب شہر۔ ملے کا پتہ:- انڈین بک ڈپو۔ دی مال شہر ۱

میرنگ تفرق۔ رمی علی امیر صاحب کا مجموعہ کلام قیمت ۲ روپے۔ ملے کا پتہ:- ویکائی دلا۔ حایت نگر، حیدر آباد داے۔ پتی

ہر ایک کے لئے
آمدنی میں ۵۵ روپے کا اضافہ

کافی خوراک

لگ بھگ دو گز اور کپڑا

مفت اور لازمی پرائمری تعلیم

زیادہ ہسپتال، دواخانے

دیہات میں پینے کا صاف پانی

اور

۱۴۰ لاکھ نئی نوکریاں

پلان کو محنت، لگن اور ہمت سے
کامیاب بنائیے

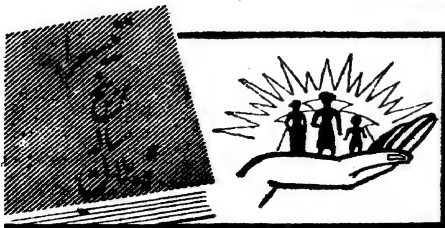
ہر شخص کے لئے اچھی زندگی



پلان

سے
کیا

ہوگا



نوشی کی تقریب

اور خوشگوار بنائیے

نیک خواہش یعنی ہوں یا مبارک باد کے پیام۔ تہنیتی تار گر ٹینگز کی گرم

سے بیجے۔ مبارک باد کے تار با تصویر غلام پر اور دل کش و خوب صورت عفا نے میں پہنچائے جاتے ہیں۔

ملکت ڈرائی اور سماجی تقریبات کے لئے بہت سے موزوں محلوں کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس میں سے آپ اپنا پسند کا جگہ منتخب کر سکتے ہیں۔ مبارک باد کے عام تار کی کم سے کم انیس دہائے پے پے ہے۔ ہر اضافی خطہ کئے، نئے پے مزید ادا کرنے پڑتے ہیں۔

دہی کس سرورس

اگر آپ اپنے تار میں زیادہ اثر اور خوبصورتی دیکھ کر نے کے تو اپنی مندرجہ ذیل کس سرورس سے استفادہ کیجئے۔ تہنیتی تار ج چاہیں سوچیں مگر حاجات کے خاص کام میں مندرجہ ذیل کس سرورس کیجئے۔ آپ کو پیام ایک خاص تہنیتی تار پر پہنچایا جائے گا جس کے بلے تار کی تمام نہیں کے ساتھ آپ کو صرف ۱۲ سٹے پیسے ۱۵ کرنے ہوں گے۔

مبارک باد
گر ٹینگز
یا
دہی کس تار
سے بھیجئے

باہر کے ملکوں میں آج کل کی اچھنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹- اسٹریٹ نمبر ۳۲- پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲- رنگون

• بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵- بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۳۱ گرینج روڈ سنگاپور

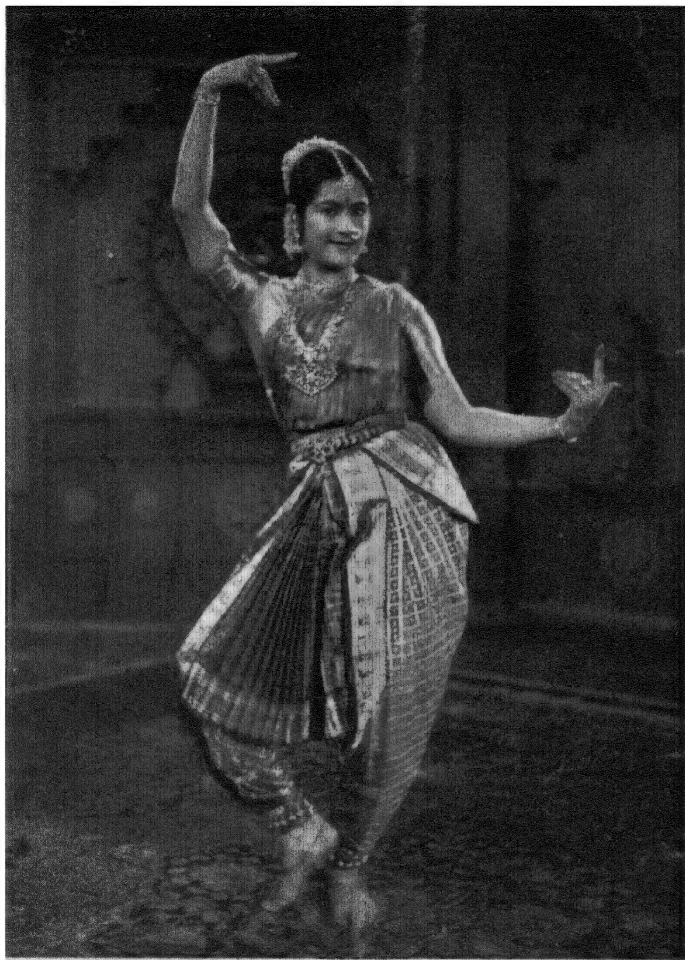
بزنس منیجر پبلکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں آج کل کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ میچ دین تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی بہوت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انھیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریپلائی کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی غلط فہمی کر کے سپرد ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے وہی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ادارہ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

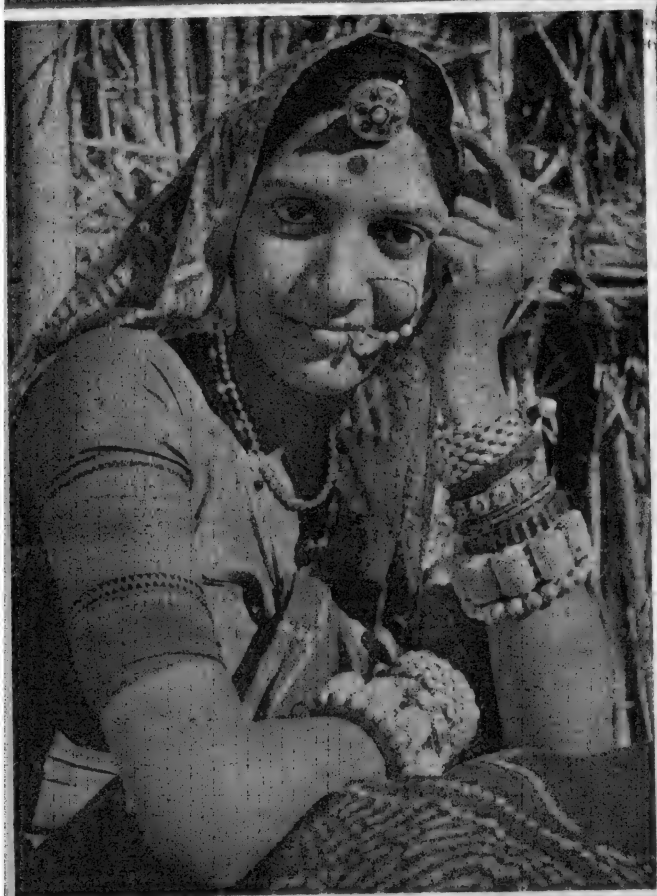
بزنس منیجر پبلکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آه کل



ماده شک سرست
فروری ۱۹۳۷ء

ہماری کتابیں



ڈاک خرچ	قیمت	نام کتاب
۳۵ نئے پیسے	دو روپے	نڈت نہرو سے بات چیت ٹیبرمنڈی
۳۵ نئے پیسے	دو روپے	ابوالکلام آزاد
۲۵ نئے پیسے	ایک روپیہ	تیسرا پنج سالہ پلان
۲۵ نئے پیسے	ایک روپیہ	ہندوستان کا دستور
۲۵ نئے پیسے	ایک روپیہ	بھارت کی لوک کہانیاں
۲۰ نئے پیسے	۴۵ نئے پیسے	دیس دیس کی لوک کہانیاں
۲۰ نئے پیسے	۴۵ نئے پیسے	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں
۲۰ نئے پیسے	۴۵ نئے پیسے	خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی
۱۵ نئے پیسے	۶۰ نئے پیسے	ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں
۱۵ نئے پیسے	۴۰ نئے پیسے	کیلنڈر کی اصلاح
۱۰ نئے پیسے	۳۵ نئے پیسے	ناپ تول کا میٹری نظام
۸ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے	جواہر لال نہرو کی تقریریں
(دفتر)	(دفتر)	نمبر ۲-۳-۴-۵-۶

مجلس کا یہ سہ

بزنس منیجر سلیب کی نشاندہی کرتے ہیں اور سیکرٹریٹ میں

اردو کا مقبول عوامی دستور یا ہستیا

آج کل دہلی

جلسہ ادارت

محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی
 محی الدین قادری زور جید آباد
 گوپی ناتھ اس دہلی
 خواجہ احمد فاروق دہلی
 رحسان ملہ سری نگر
 یو۔ ایس۔ موہن رام ڈائریکٹریلیکیشنز ڈوئیرن
 بی۔ ایس۔ رائیون ڈی ڈائریکٹریلیکیشنز
 بی۔ نیگما خنہ ڈی ڈی ڈائریکٹریلیکیشنز
 ہالی گنڈویشن ایڈیٹر شمشیر احمد سیکریٹری
 مدیر مسئول

اسٹنٹ ایڈیٹر۔ منظر شاہ

تقریب

ادارہ	ملاحظات
۲	غزل کیا ہے؟
۳	غزل گو کی پوری
۴	غزل
۸	منہ دور میں حکومت اور سماج
۱۲	کتاب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب
۲۱	تاثیل ادب میں اسلامی عناصر
۲۴	غالب پر پہلا اہم مضمون
۳۲	غزل
۳۳	بچوں کی غزلیں
۳۵	غزل
۳۶	حسوت خان
۴۱	آرٹس ہینگوٹ اڈاس کا فن
۴۴	غزل
۴۵	گو کی آزادی

سردی ۱۔ حسین راجستان
 رسالے کی پشت پر :- سنی ناکام

ماگھ شک ۱۸۳۳
 فروری ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ - نمبر ۷

ہندوستان میں :- سات روپے
 پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
 غیر ملک سے :- اشٹلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ روپے
 ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
 پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
 غیر ملک سے :- اشٹلنگ یا ۱۰۰

مناہین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
 بال گنڈو عرش ملیا فی ایڈیٹر شمشیر احمد (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶
 شمشیر احمد کے دفتر کے پتے پر ڈاک کی گارنٹی
 مرتبہ و شائع کردہ
 ڈائریکٹریلیکیشنز ڈوئیرن شمشیر احمد (اردو) ایڈیٹر بال گنڈو عرش حکومت ہند
 ڈی۔ بی۔ لیکیشنز ڈوئیرن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

۱۹۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ہندوستانی فوجوں نے گوآ کو کی موسمی کی پرتیزی غلامی سے آزاد کرایا۔ آخر میں ولس نے وائس منڈی سے ہندوستان کو آزادی دی اور اپنے اقتدار کو ختم کیا۔ فرانسیسی نوآبادیوں کو بھی خود فرانس نے ہلے ہوئے حالات کے تحت ہندوستان کے حوالے کر دیا لیکن پرتیزی سے ساحل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ہندوستان کے پاس فوجی اقدام کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ اس کا ثبوت پرتیزی و وزیراعظم سالارکار کا حالیہ بیان ہے کہ وہ ہندوستان کو فوجی اقدام پر مجبور کر کے اس کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ خود پرتگال کی سیاست ہی بے نقاب ہوئی۔

تباہی کے بالا اثرات بارود و آواز الہام نے ایک ادارہ میں بھارت کی سرزمین پر پرتیزی نوآبادیوں کے خاتمے پر تبصرہ کرتے ہوئے نو مزید آواز اٹھلائی رہے۔ وہ ہندوستانیوں کے خلاف انتقامی اقدامات کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ بھارت میں پرتیزی علاقوں کا خاتمہ مسرت کا مقام بھی ہے اور گہرے فکر کا بھی۔ مسرت کا اس لئے کہ جنگ آزادی نے نوآبادیاتی نظام کے نیچلے سے ایک اور علاقے کو چھڑا لیا ہے اور نکلے کا اس لئے کہ نوآبادیاتی نظام اچھا مرنے سے نہیں بلکہ اس وقت پسپا ہوتا ہے جب اس کے سر پر انقلاب کی تلوار ٹسک رہی ہو۔ ”جو ریہ مقدمہ عرب پر یہی کیا موقوف ہے دنیا کے بہت سے ملکوں نے بھارت کے اس اقدام کو سراہا ہے۔ مغربی ممالک میں برطانیہ کا مذہب زیادہ مستحکم نہیں رہا لیکن اس لئے بھی کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جس سے معاملہ سمجھے۔ اب تو امریکی مدبرین نے بھی جتنا صاف اعلان کر دیا ہے کہ بھارت کی گوا میں پیش قدمی سے امریکہ کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور امریکہ بھارت کو اقتصادی ترقی کے لئے جو امداد دے رہا ہے اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ پہلی بار ہے کہ پرتیزی کی سیاست دان اور وہ لوگ جو نوآبادیاتی نظام کے حامی ہیں بائوں سے جتن حاصل کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو امن کا سامنا بھی دینا پڑے جو غلامی کا بھوجنا کرنا آزادی کی فضا میں دم لینا چاہتے ہیں۔

۲۰۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کے آخری نصف میں آئندہ پرتگیزیوں کو اندو کا فرنس کا اجلاس جیٹا بادیچ منقطع ہوا۔ اس وقت پرٹگیزی ہندی، امریکی اور ہندی زبانوں کے بھارتیوں نے غیر سرکاری تقریریں کیں۔ بھارتی تاریخ دان اور ادیب ڈاکٹر سارا چند نے کا فرنس کی صدارت کی۔ آپ نے اپنے عالمانہ خطبے میں بھارتی، پہلی اور قاری کے ہندوستان کے ساتھ سکرت، آپ پرتگیزی اور گھڑی پٹی کی تخلیق دار کا ذکر کیا۔ انہوں نے پرتگیزیوں کے اس اعراض کو غلط قرار دیا کہ اردو ادب پر ہندوستانی تہذیب کا رنگ بھینکا ہے۔ کان فرنس نے قومی یک جہتی کو ہندوستان کے لئے ضروری قرار دیا اور مشیر مقررین کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ اردو قومی یک جہتی کا ایک نہایت ہی اچھا نمونہ ہے۔

۲۱۔ اس سال ماہ فروری میں میلہ عام انتخاب ہوا۔ نتیجہ برے پیمانے پر دنیا بھر میں کہیں انتخاب نہیں ہونا۔ اس قبل دو عام انتخاب تھا خوش اسلوبی اور پرامن طریقے سے انجام پا چکے ہیں۔ امید ہے کہ اس انتخاب میں بھی پہلی روایات قائم رہیں گی۔ کسی ملک کی ذہنی اور مادی ترقی کا اندازہ اسی بات سے لگ جاتا ہے کہ اس کے دو طرفہ اپنے دوٹ کے حق کو کس قدر قبول استعمال کرتے ہیں۔ انتخاب میں مخالفت تو ہوا ہی کرتی ہے لیکن اگر وہ مخالفت محض اصولی ہو اور ذاتیات ملک نہ سمجھے تو اس ترقی دہائی میں بھی دوستی کا ہی مزاج رہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انتخابی پارٹیاں اپنے اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتے وقت متانت اور سنجیدگی کو نہیں چھوڑیں گی۔

۲۲۔ ہندوستان کی کرکٹ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ایم۔ سی۔ سی۔ کے گلے کا ٹیسٹ میچ جیت کر بھارتی ٹیم نے بھارت کو نئے سال کا تحفہ دیا تھا۔ اس کے بعد ملائیشیا ٹیسٹ جیت کر کرکٹ کی جیت لیا۔ بھارتی ٹیم قابل مبالغہ باد ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بھارتی ٹیمیں اور اقتصاد کار ترقی کی طرح کھیل کے میدان میں بھی تیز رفتاری سے ترقی کرتا جائے گا۔

غزل کیا ہے؟

بنائیے۔

کسی ایک موضوع پر قصیدہ کہنے کا طریقہ کاریہ ہوتا تھا کہ بہت سے ہم قافیہ وہم ردیف اشار کہتے چلے جاتے اور جب شاعر یہ بھرسے ہوئے اشار کافی تعداد میں کہہ لیتا تھا تو اس کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا تھا۔ یہ ابتدائی اشار بہ ظاہر غیر مسلسل ہوتے تھے لیکن ان میں داخلہ طور پر ایک تسلسل ہوتا تھا اور ان اشار کو قصیدے کی اصطلاح میں تشبیب کہتے تھے۔ تشبیب کے اشار کہہ چکے کے بعد شاعر اسی ردیف میں اور اسی قافیہ میں قصیدے کو ایک نیا موڑ دے دیتا تھا۔ اس نئے موڑ کو گریز کہتے تھے گریز میں اصلی موضوع پر براہ راست اشار کہے جاتے تھے۔

غزل نامیوے اور غزل کے امکانات قصیدے کی تشبیب میں پٹہاں تھے۔ تشبیب میں ایسی چیزوں کا ذکر ہوتا تھا جو عام طور سے انسانوں کی دل چسپی کا موجب ہوں مثلاً حسن و عشق، زندگی، مناسقہ قدرت ایسی آپ بیتی جو جگ بیتی ہو اور دیگر مرکزی جذباتی رد عمل تشبیب کے مضامین محدود نہیں ہوتے۔ بشرط صرف اتفاق ہے کہ ان مضامین میں ہمرنگی ہو اور ہماری انسانیت کے لئے ایک ایسی پہلی پوچھ ہم تہذیب کے ہر دور میں اپنا سکیں۔ زندگی بدلتی رہتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کے ذریعے دیتے رہتے ہیں، زندگی کے نمونے بدلتے رہتے ہیں، زندگی کی بہت سی قدسیں بدلتی رہتی ہیں ایسی قریبی اس ہمرنگی کے باوجود زندگی میں ایک تسلسل بھی قائم رہتا ہے جو

غزل سے پہلے قصیدے نے ہم نبیا۔ قصیدہ کسی آدمی یا کسی اور موضوع پر مسلسل اشار سے مرتب ہوتا تھا۔ ان سلسل اشار میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ہوتی تھی۔ بہت سے قصیدوں میں صرف قافیہ ہوتا تھا ردیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ مشن صحن عربی شاعر شی فارسی میں آئی اور فارسی سے اردو میں۔ ایک قصیدے میں بسا اوقات صد اشار ہوتے تھے۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں ردیف اور قافیہ کی یہ پابندی ناممکن ہے کیونکہ دوسری زبانوں کی لغات میں دو دو تین تین سو ہم قافیہ الفاظ ہیں ہی نہیں اور ان کے صرف دو دو تین ان صد ہم قافیہ الفاظ کو ایک متعینہ ردیف سے ملا کر باندھا جاتا ہے۔ جلیل مانچوری کے ایک قصیدے کا یہ معرہ ہے

شب غم لاکھ طوفانی ہو تر دکا ہو ہی جاتا ہے
اس قصیدے میں "تو کا" قافیہ ہے اور "ہم ہی جاتا ہے" ردیف ہے۔ اس قصیدے میں سیکڑوں ہم قافیہ الفاظ آسکتے ہیں جن میں 'ہو ہی جاتا ہے' کے ساتھ ہا نہا جا سکتا ہے مثلاً ایسا ہو ہی جاتا ہے، تھا را ہو ہی جاتا ہے، اچھا ہو ہی جاتا ہے، کسی کا ہو ہی جاتا ہے، پیارا ہو ہی جاتا ہے، ہدیہ ہو ہی جاتا ہے، اشار را ہو ہی جاتا ہے، خوب کرتا ہو ہی جاتا ہے، سبھا ہو ہی جاتا ہے، دھوکا ہو ہی جاتا ہے، ہمارا ہو ہی جاتا ہے، شناسا ہو ہی جاتا ہے، دورا ہو ہی جاتا ہے، دلارا ہو ہی جاتا ہے، جلا ہو ہی جاتا ہے کی ردیف کے ساتھ ہا ملے جا سکتے ہیں۔ ان قافیوں کو آپ خود سوچ پیچھے اور ان کی ایک فہرست

اعتبار زندگی اس تسلسل کی حامل ہوتی ہیں وہی موضوعات غزل ہیں۔ یہ موضوعات کبھی کبھار نہیں ہوتے بڑا سہاگ اور سدا بہار ہیں۔ جاگیردارانہ تہذیب کی پیداوار شعرا کے کچھ اشعار میں ملتا ہے، یوں کیا میں اور جیسی کے انتقاد کے بعد یہ اشارہ پاس ہو گئے اور کیا انقلابی دوس اور انقلابی چین کی نئی انسانیت ان اشعار کو پاس سمجھے گی۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے رایتیں اس کی ہیں
پیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
تو اور آرائشِ خم کا کل ہیں اور اندیشہِ مائے دورہ دراز
زندگی یوں بھی گذری جاتی کیوں تیرا وہ گزریا دیا (غالب)
ہر عمر کا تو قدرِ زویم و زلفتِ ریخِ خسارِ ما

چہ تیا س کی نہ زری سی زکست را بہ کست را (بیدل)
دردِ لبِ ماحمِ دنیا غمِ مشوقِ شوق
باوہ چوں خام بود چہ کتہ کشیدہ (عرفی)
در میانِ فقر و ریافتستہ بندم کردہ ای
بازی گوی کر دامن ترکش ہشیار باش (حافظ)
دل پر خون کی اک گھلائی سے مگر ہر دم رہے شرابی سے (میر)

کھنٹی تھی آنکھ تجی ازل کو تیرے سے
آخ کو تیاچ نہاں کے ناچار سو گئے (خواجہ میر درد)
زمانے کے ماحول سے چار نہیں ہے
زمانہ ہمارا تھا را نہیں ہے (چتر گورکھپوری)
موت ماحول کو طے آرزوئے خواب کچھ
ڈوبتے جادو کو دریا لے پایاب مجھے (دوست)

کیا یہ اشعار جو اب سے بہت پہلے کے تھے۔ مارکس، اینسٹائن،
کے سائنس دانوں اور جدید ترین فلسفہ اور علوم اور نظریوں کے فلسفہ
یا سائنس دانوں کے فلسفہ بھی سچی دے کثیف ہو سکے ہیں۔ یہ اشار
تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کے تسلسل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہی
حال اور یہی حقیقت دیرِ مقدس سے آج تک کے آفاقی اشعار میں ہم
پلتے ہیں

نئی سو برس سے اچھی کل تک لفظ غزل کے معنی محبوب سے

بات چیت کرنا بنائے جاتے تھے۔ غزل کی یہ تعریف نہیں سنسکرت کی اس
مشہور کہاوت کی یا دو لاق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شاعر کی کسی پیارے
دوست کو نصیحت کرنے یا سمجھانے کا نام ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اب
سے کچھ دنوں پہلے غزل کے لیے اس سے بھی گھرے اور مؤثر مفہوم کا
پتہ چلا گیا۔ جب شکاری شکار کرتے یا دوسرے خود را جا فور شکاری میں ہیں
کا پیچھا کرتے ہیں اور جب ہن بھاگے۔ بھاگتے کسی ایسی جھڑی یا کسی
اجے شام میں آکر حشر جاتا ہے جہاں سے وہ بھاگ نہیں سکتا اور
جہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ شکاری کتے یا دوسرے درندے آئے
ماروا ہیں تو اس کے گلے سے لپکا، ہتھائی درد بھری آواز نکلتی
ہے مجھے غزل کہتے ہیں۔ غرضیکہ حقیقی معنوں میں غزل کی شاعر وہ
ہے جس سے ہمیں درد بھری اور انشوں میں ڈوبی ہوئی دل کی گرائیں
سے نکلی ہوئی آواز سنائی دے۔ غزل بڑی کسی کٹھالی، بڑی کسی ایسے
واقعا ذکر کے ہوئے جس میں ظاہری طور پر کوئی پردہ بات ہوئی ہو
کم سے کم معنوں میں درد میں ڈوبی ہوئی بات سنائی دے۔ ہم دیکھتی
باتیں یوں سننا چاہتے ہیں، ہم درد بھرے اشار کو کیوں پسند
کرتے ہیں اس لئے کہ اگر درد سچا اور پکا ہے اور اس میں خلوص
ہے، مصومیت ہے، نری ہے اور نرم ہے تو ایسا درد ہمساری
ڈھارس بندھاتا ہے، گھرے سے گہرا اطمینان اور توانائی بخشا ہے
اور حیات و کامنات کے لئے ہمارے اندر محبت کے جذبات پیدا کر
دیتا ہے۔ سنسکرت میں دور رسوں کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے
کہ تھوڑے اور شانت رس سے بجا اور رس ناخون ہیں، میانہ
تنگوں میں، کہا میں یوں اور بڑی کٹھالی میں بھی ہیں مناسب
موتوں پر مل جاتے ہیں لیکن غزل مو قہ اور واقعی دستِ نگر
نہیں ہوتی۔ غزل براہِ راست ایک مختصر سی بات بیش سادہ
بول چال کے الفاظ میں کہہ کر اثر پیدا کر دیتی ہے مثلاً پوری
رامانج کی کہانی جو ہزار ما صغوں پر پھیلی ہوئی ہے اس ایک شعر
میں سمٹ آتی ہے

دہر لپ ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

دیکھئے رام کی آپ بیتی کس طرح جنگ بیتی بن گئی یا یہ شریعہ سے
 رام ہوں یا ہوں کونسنی کہ جنوں بام تم
 ملن کے بعد بھوک جنگ کی ریت یہی
 غزل زمان و مکان میں بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے واقعات کا
 نسبت یا جوہر لائق ہے اور ہر قسم کی آپ بیتی کو کھلتی بتا دیتی
 ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی خاص کہانی کی خاص روایت یا کسی
 خاص نام کا سہارا لیا جائے۔ مثلاً یہ اشارہ سنئے۔

مجھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
 ارے وہ دردِ رحمت ہی تو کیا مر جانیں

یہی کہہ کر ستاروں کو کب رخصت شب و وہ
 کہ جس کا آسواختہ شام سے اب تک نہیں آیا
 بکھو کر تکیے کے چلے گئے دھرم کے بھرے کچلے گئے
 ترے کو چپے ہم بکھوئے بھی تو ہمارے کچلے گئے

ماحول اور واقعات کا ہمارا تو غزل میں بہت کم لیا جاتا ہے البتہ
 غزل میں کچھ علام (دروپک) ایسے لائے جاتے ہیں کہ ان کی تعداد تو
 تھوڑی سی ہے لیکن ان کے ذریعے ہزاروں اشارہ کرنا ترس (سوز و گدلی)
 سے بھرے ہوئے ایک بھر دے گئے ہیں۔ ان میں سے خاصہ دو ایک
 یہ ہیں ۱۔ (۱) گل و لیل اور ان کے شعلات مثلاً عتیاد، دام،
 آتشانہ، بجلی، اسیری، آزادی (۲) ہمارے غزل (۳) ساقی و
 سے خازن اور ان کے شعلات مثلاً جام، ساغر، مہر، رند، مستی،
 نشہ (۴) منج و پرواز (۵) کاروان (۶) دیوانہ (۷) صحرا
 (۸) منزل (۹) وطن (دلیں) (۱۰) غربت (پرویں) (۱۱) ہوش
 اور دیوانگی (۱۲) زمان (۱۳) زنجیر (۱۴) کبہ و بیت خانہ
 (۱۵) گناہ و ثواب و جزا و جزا۔ ان روپوں یا علام کے سہارے
 غزل کے برے شاعر نے مقررہ میں بہت کچھ کہہ دیا ہے
 چند مثالیں پیش کرتا ہوں

قفس میں مجھ سے رو داد چمن کچھ نہ ڈر ہم
 گری سے جس پر کل بجلی وہ میرا آشتیاں کہیں ہو
 بید خاے میں رہ کر گھر کی بریادی یا گھر پر کئی مصیبت آنے کی

جرحتی دردناک ہوتی ہے اس کی تصویر غالب نے مندرجہ بالا
 شعر میں کھینچی ہے۔ ایک اپنا شعر حاضر کرتا ہوں
 کچھ نقشب کی تیلیوں سے چھن رہا ہے فورس
 کچھ فضا کچھ حسرت پر داز کی باتیں کر د
 دوسرا شعر جگت میں لالہ دکان کا ہے
 اب پس میں بھی کسی صورت سے ہی لگتا نہیں
 ہاں مگر جب تک نفس میں تھے نفس پر نام تھا
 تیرا کیا یہ شریعت ہے

رات بھرتش سر کو مٹھتی رہی کیا تپنگ نے امتاس کیا
 دارغ فراق صفت شب کی جلی ہوئی
 اک نشہ رہ گئی حق سو وہ بھی خوش ہے (غالب)
 چھٹ کے گھر آگے اسیر تھے بیکی اب ان کو کون پہچانے
 کچھ موج ہو یا بیجاں ہے تیر منظر آئی

شاید کہ ہمارا کئی ذخیرہ نظر آئی
 بیکی علام یا روپوں کا سہارا لے لیں بھی غزل میں نہایت پُرورد
 اور بہت تاثیر شاعرانہ کے ہیں
 ہم سے کیا ہوسکا جنت میں خیر تم نے تو بے وفائی کی
 ایسے دشتی کہاں ہیں اسے فریاں تیر کو تم جنت اداس کیا
 دل نے دنیا کی بنا ڈالی اور یہی آج تک جبر ہوئی
 آج آنکھوں میں گاتے شب بھر عساری پڑی ہے سولیت
 وصل میں رنگ اڑ گیا میرا کیا جہان کو منہ دکھاؤں گا
 دور بیٹھا غبارِ تیرا اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا
 جب نام ترا بیچے تب آنکھ بھر آئے
 اس زندگی کرنے کو کہاں سے بگڑ آئے

جاتا ہے آسمان سے کو پچے سے یار کے
 آتا ہے جی بھبرا دردِ دیوار دیکھ کر

کر تہ ترس یا سوز گداز میں جب پٹنگی آ جاتی ہے تو غم، غم نہیں ہوتا
 بلکہ ایک روحانی سبیدگی میں بدل جاتا ہے۔ غزل کی شاعری میں
 غم اور خوشی، امید اور ناامیدی، محبوب کی ہر بات اور ناہواری

آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہو جانا یا ان کا باروز ہونا دکھ اور دکھ موت اور زندگی، بھوک اور بھوک غرغہ زندگی کی وہ خفت یکتی جو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں ان سب کا سنگم ہو جانا ہے اور ہر سب مل کر زندگی کی پوری یک اکائی بن جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر غزل کی شاعری وہ مقام حاصل کر لیتی ہے جس کی طرف کرشمی بگوانے نے کیسا تیس اشارہ کیا ہے اور جسے میں نے ظاہر کرنے کی ایک نظم میں کوشش کی ہے ان الفاظ میں

بصیرت، عقل، ہمدردی، صداقت اور خدا ترسی
شجاعت، خوف، ہستی، نیستی، نیکی، ریاکاری
سکون قلب، دلکوشی، نیک نائی اور بد نائی
مرے ہی دور کی کہیں ہیں یہ یکختیں ساری

غزل کا مومنہ کیا ہے۔ کچھ لوگ تو اس خیال کے ہیں کہ صرف حسن و عشق کے معاملے اور واردات ہی کو غزل میں جگہ ملتی چاہئے لیکن فارسی اور اردو کے معیار میں غزل کو شاعرانے حسن و عشق کے علاوہ حیات و کائنات کے ان سدا سہاگ مسائل و موضوعات کو بھی نہایت رچاؤ کے ساتھ غزل میں جگہ دی ہے جو ہماری زندگی کے مرکزی رشتے عمل اور دل چسپیوں سے متعلق ہیں اور جو زندگی کے دائمی اقدار کے حامل ہیں۔ حسن و عشق کے موضوع ہی کو بے مجھے شہوانی اور نفسانی خواہشات و محرکات سے عشقیہ شاعری مشورہ ہوتی ہے لیکن جب عارضی لذت سے گزر کر محبوب کا خیال اور اس کی یاد یا اس کی شخصیت عاشق پر اس قدر چھا جائے کہ جتنی لذت حاصل ہوتے ہیں جی محبوب کا خیال خود سے نہ آجے تو بھوک و لاس لڑتی کر کے شوق بن جاتے ہیں۔ محبوب کا ایسا تصور عشق کی دوسری منزل ہے اس کے بعد محبوب کا تصور حیات و کائنات اور پوری زندگی، پوری تاریخ و تمدن، علوم و فنون تمام فلسفیانہ مسائل کے ایک ایسے تصور کو اپنے آغوش میں لے لیتا ہے جو انسانی زندگی اور اس کے ادراک کو رس اور جس سے ہمروہیت ہے۔ یہاں پہنچ کر ایک مختصر شاعر ساری کائنات کی شاعری بن جاتا ہے۔ غزل اس نازک کام میں اس پیرے کے ذریعے کامیاب ہوتی ہے جو بہت

شکل سے ماہر آتا ہے اور جس کے لئے ایک داخلی روحانی ریاضت یا سادھنا اور تقویٰ عینی کی ضرورت پڑتی ہے۔ لامحدود وجود کو انسانیت کی خدمت علما کرتا کائنات کو انسان بنا دینا اور اس طرح ایسا کر سکنا کر دل پر دائمی اثر پڑے یہی غزل کی غرض و غایت ہے۔ علم و فلسفہ، اخلاق و مذہب، تہذیب و تمدن، جذبات و کلی سب اس انسانیت کی تخلیق کے لئے کھا دیا کام دیتے ہیں جو حیثیت انسانیت ہے اور جو ان سب کو ہم کر کے ہماری مہمیت ہیں پیرے واپس دے دیتی ہے۔ غزل وہ ناسری ہے جسے زندگی کی طبعی بین ہم نے نہیں کھ دیا تھا اور جسے غزل کا شاعر کہیں سے پیرے سے ڈھونڈھ لیتا ہے اور جس کے پیرے سے کریم کو ان کی آنکھوں میں جو انسانی کے لئے محبت کے آئینہ آ جاتے ہیں۔

سرسیتا ماہستا سماجی تعمیر نو کا ترجمان

- سماجی اور گھریلو زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کہانیاں
- اہم اور بے چیدہ سیاسی اور انقلابی مسائل پر خیال انگیز مضامین
- دل نشیں نظموں اور جذباتی غزلوں
- طنز و مزاح
- عورتوں کے سچے ہوتے مضامین

فی شمارہ ۷۵، نئے پیرے

زمرہ سالانہ ایک سال ۶ روپے دو سال ۱۱ روپے

مینور، سریتا اردو، چنڈی دھڑے والا، رانی جھانسی روڈ، نئی دہلی۔

مجھے انکے شمارہ سے ایک سال کر دو سال کے لئے خرید لیا۔ بتائیے۔ زچہ کے لئے وہ شمارہ دی۔ پی۔ جی۔ سے روانہ کیجئے۔

نام

پتہ

غزل

چھوڑتی نہیں مجھ کو دل کی یہ لگن تہنہ
 کون بزمِ ہستی میں غم مرا سمجھتا ہے
 اے نسیم بے پروا! کون سی یہ منزل ہے
 قصہ شبِ ہستی کہ کے اڑ گئی شبنم
 اُن کی کیا خطا اس میں، وجہ اس خرابی کی
 ختم ہو نہیں سکتے معرکے محبت کے
 عشق کی یہ جرأت بھی فین ہے ترے غم کا
 صورتِ صبا نکلی بوئے گل بھی آوارہ
 یوں تو داغ پائے ہیں کچھ گلوں نے بھی، لیکن
 مدتوں سے چپ سی ہیں وہ غزل فریاد نکلیں
 ہوں ترے قصور سے خود اک انجمن تہنہ
 جی رہا ہوں ہسہ ہسہ کے درو کی چٹین تہنہ
 پھر رہی ہے راہوں میں بوئے پیرن تہنہ
 رہ گئی پھولوں پہ صبح کی کرن تہنہ
 ہے مری طبیعت کا واہسار پن تہنہ
 کوہِ بے ستوں لاکھوں، چان کوہکن تہنہ
 صحن کے مقابل ہے دل کا یا نکین تہنہ
 رہ گئی ہے اک بلبلِ عمر چمن تہنہ
 آئی اپنے حصّے میں عشق کی جلن تہنہ
 لے کے پھر رہا ہوں میں تہمتِ سخن تہنہ

اب تو دور پہنچی ہے اپنے فن کی رسوائی

دوشش پر اٹھاتا ہے بارِ فکر و فن تہنہ

منغلیہ دور میں حکومت اور سلج

مشہور تاریخ دان ڈاکٹر تاراچند نے آل انڈیا ریڈیو سے پہلی میسوریل میگزین کے سلسلے میں تین تقریریں پہلے سال انگریزی میں لکھی تھیں۔ ذیل میں دوسری تقریر کے چند دل چسپ اقسامات کا ترجمہ موجودت کے شکر ہے کے ساتھ درج ہے۔ (ادارہ)

درج ہے :-

”دنیاوی معاملات کا مذہب سے کیا تعلق! مذہب کے معاملات میں تعصب کا کیا فعل! تمہارے لئے تمہارا مذہب ہے، میرے لئے میرا دکم دیکم دین۔ قرآن - اگر کا تو وہ شریعت پر عمل کیا جائے تو یہ ضروری ہوگا کہ تمام راہزواؤں اور ان کی رعیت کو ہم کر دینا چاہیے۔“ — اس کا بھی قول تھا ”ہمارا کسی دوسرے مذہب سے کیا واسطہ؟ مسلمان اپنی راہ میں اپنی راہ“

دور وسطی کے بادشاہوں کے اقدامات اور ان کی پالیسیوں کی حوت ان کے مذہبی عقائد یا مذہبی قوانین کی روشنی میں تشریح طلب کرنا نہ تو ممکن ہوگا اور نہ مفید۔ اس کے علاوہ بہت سے دیگر وجوہ تھے خاص کر اقتصادی اور سیاسی وجوہ، جو ان اقدامات پر اثر انداز ہوئے۔ مگر بہت سے ان پر پردہ پڑا ہوا ہے، کیونکہ اس زمانے کی تاریخیں زیادہ تر علمائے مذہب لکھیں، جنہیں مذہب سے خصوصی دل چسپی تھی۔ وہ مسلمان حکمرانوں کی فتوحات کو چارچار لگاتار اور ان کی مذہبیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔

آئیے ان باتوں کے پیش نظر ہم ازمنہ وسطی کی حکومت کے وجود اور اس کے خرافات کا مطالعہ کریں۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اس وقت کی حکومت بالکل ملحق انسان نہ ہوتی تھی — درحقیقت اس کا دائرہ اختیار دو عمل

میں اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ هندوستان میں مسلمان حکمرانوں اور علماء کے مابین حکومت، خاص کر حکومت اور عوام کے تعلقات کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ امتحان کے زمانے سے لے کر بسنے ملہا کر یہ تجویز قبول کرنے سے مسز وہی ظاہر کی جاتی کہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر لیا جائے، بلکہ علاؤ الدین خلجی، محمد تغلق اور شیر شاہ سنگھ قریب قریب سب ہی حکمرانوں کا یہی نظریہ رہا کہ مذہب اور حکومت کو یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر، بنگال اور دکن کے صوبائی مسلمانوں کا بھی یہی نظریہ تھا۔

منلوں نے اس منہی تصور کو ایک اجماعی اور قطعی پالیسی کی شکل دینے کی کوشش کی۔ بارہ مرتے وقت ہماروں کو نصیحت کی جاتی کہ وہ ہندو مسلمان میں کوئی امتیاز روا نہ رکھیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں جو جرات مندانہ کشمکشیں کیں وہ سب جاگتے ہیں۔ بہانہ میں یہی جرات توڑ جاتی، مگر وہ بھی اپنے باپ کے راستے سے نہیں ہٹا۔ اور شاہ جہان بھی کہہ نہیں وپیش کے بعد جمہوری طور سے اسی راہ پر چلتا رہا۔ افوسس کہ اورنگ زیب نے وقت کے دھارے کو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ مذہب اور سیاست کو ملانا نہ تو مفید ہے اور نہ مناسب۔ اورنگ زیب کے ایک محبوب افسر حیدر الدین خان نے، جو ”ہینسٹہ ماٹریسی“ کے (مضام نام سے مشہور ہے، احکام ماٹریسی میں لکھے تھے۔ ان میں ایک جگہ عبارت

ہنا خود خاک و آتش کی سی ہی مجسم میں خود غم کی لہریں پاسکتی تھی۔ قافیہ اعلیٰ
میں ہر دو صدیوں کی آفریں مسلم حکومتیں مانت تھیں مگر وہیں میں
خلیفہ کے فرمان کے ذریعہ اختیارات حاصل ہوتے تھے اور اسی کے
نام کا خلیفہ پڑھا جاتا تھا۔ جنگوں کے پناہ فرج کر بیٹے کے بعد بھی برسوں
تک یہی رسم حیثیت قائم رہی۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم کا مشد کا
اختلال ہو چکا تھا اور ایشیا میں اب کوئی خلیفہ نہ رہا تھا۔ اس کے
بعد جب ترکی کے عثمانی سلطانوں نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تو
ہندوستان کے محل بادشاہوں نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا بلکہ
انہوں نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا کہ خودی خلیفہ کا لقب اختیار کر
لیا اور ان شرائط کا کوئی لحاظ نہیں کیا جو اس منصب کے لئے ضروری
سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے شدید نتائج مرتب ہوئے کیونکہ اس نے جہتیں دین
کا ایک نئے نادر اض ہو گیا، جو اس مسئلہ میں مثری قوانین کا سختی سے پابند
تھا۔ اگر کی مذہبی حقیقت کی تلاش اس مسئلہ سے شروع ہوئی۔ وہ اس
غلام کو پھر کرنا چاہتا تھا جو بغداد کے باغی خانان کے قتل ہو جانے
سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہی خاندان قانون شریعت کے مطابق منصب خلافت
کا جائز وارث ہو سکتا تھا۔ اگر کہ اسلامی فہم کے چاروں کتابتین کر
سے تعلق نہ رکھنے والے تانہ ملا کو چھوٹا کیا کہ وہ کوئی راستہ تلاش کریں۔
لیکن ان لوگوں نے اس کی مشکلات دور کرنے کی بجائے آپس میں
ہی کے بحث شروع کر دی جس سے اکثر نارض ہو گیا اور عقیدہ پرست
علماء کے مذہبی عقائد اور اعمال کے بارے میں شک کرنے لگا۔ بیشتر مگر
فیضی اور ابراہیم فضل جیسے علماء کی مدد سے اس نے ان لوگوں سے
ہیچا چھڑا لیا اور خود امام عادل کا منصب اختیار کر لیا۔ یہی
سے ملا عبد القادر بدایونی جیسے متعصب لوگوں نے اس کو بدنام
کرنے کے لئے چکے چکے بہتان تراشیاں تھیں جو کہیں اور بدترک فراسای
عقائد و اعمال اس سے منسوب کرنے لگے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے
کہ آج بھی مگر تاریخ نے ان الزامات کا کوئی گلا پی ثابت کر دیا ہے
بدایونی کے حامی ان کے قائل ہیں۔

اگر اسے اصل عمل کے بارے میں خود کچھ نہیں کہا جائے، مگر اس
حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت جب صورت حال

پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ خلافت کا منصب مسلم سوسائٹی کے لئے
معمول کی حیثیت رکھتا تھا اور اس منصب کے ختم ہونے سے اس
کی آفاقیت بھی جاتی رہتی تھی۔ انیس کتر صدیوں کی سب سے بڑے کر
اب تک اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نہیں مل سکا۔

لیکن قانون دستور عدیت سے قطع نظر منقطع حکومت
کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ آج ریاست کا سب سے بڑا کام
قانون سازی ہے۔ یہی اس کے اقتدار اور عمل کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن
قانون سازی کا سب سے بڑا ذریعہ قانون ساز اسمبلیاں ہیں لیکن
ازسب سے پہلے ہندوستان میں نہ تو قانون سازی ہوئی تھی
اور نہ کوئی قانون ساز جامعہ تھی۔ چنانچہ جہاں تک
قانون سازی کے معاملہ میں خود مختاری کا تعلق ہے اس
فہم سے اس زمانہ کی ریاست بالکل کمزور اور نامتناہی تھی
جس کا سبب ہے۔

ہندو اور مسلمان دونوں ہی تمام معاملات میں اپنے اپنے قوانین
کے ماتحت تھے جو آسانی سمجھے جاتے تھے۔ یہ ضوابط بطرح کے قوانین
پر مشتمل تھے۔۔۔۔۔ سیاسی اور دستوری، دیوانی اور افتاری، فوجداری
اور مذہبی۔۔۔۔۔ یہ قوانین مقدس سمجھے جاتے تھے جو کسی آسانی
طاقت نے ودیت کے رٹے۔ کوئی انسانی ادارہ ان میں رد و بدل
نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انہیں غیر فانی، مطلق اور عیدل کہا جاتا تھا۔
نظریاتی اعتبار سے یہ قوانین تمام اہل دین کے لئے تھے
لیکن عملی طور پر ان کا نفع محدود تھا۔ جہاں تک سیاسی خواہد کا تعلق
ہے حالات نے ان کے نادر کو مشکل بنا دیا تھا۔ خلافت یا قانونی اختیار
سے مرکزی طاقت ختم ہو چکی تھی اور اس نے خلیفہ اور سلطان کے
باہمی تعلق اور اختیارات سے متعلق شرائط اور ناقابل عمل ہو کر رہ
گئی تھیں۔ وہ اصولوں میں ملکر ان اور رعایا کے حقوق و فرائض
کی وضاحت کی گئی تھی اور جن کی بنیاد عربوں کے رسم و رواج اور
سنتیں پر رکھی تھی۔ اگر کے ایک پر قائم تھی، وسط ایشیا سے آئے ہوئے
قانون کے رسم و رواج سے بالکل منقطع تھے اور اس نے ان پر چلنے
کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان اصولوں کی ایک اہم دھڑہ میں

یزملم علیک مرتبہ اور حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے ان امور کو غلط سمجھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ فری سردار جو فاتحوں کی دل یا قائم شدہ حاکمان کا مذاق کے سربراہ تھے، ایسے لوگ تھے جن کی مادی زبان بولی نہ تھی اور چونکہ ان کی تنظیم بھی عمومی تھی اس لئے وہ عام طور سے ان منوالہ کے احکام ان کی تشریحات اور علامہ کی صفت تفسیرات سے براہ راست واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر چونکہ ان کے زیر حکومت آنٹی بڑی آبادی تھی، جس کا مذہب، رسم و رواج، زبان اور لُغافت جداگانہ تھی، اس لئے حکومت کی عملی ضرورتوں کی وجہ سے بھی بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پالیسی کسی ایک، نہج پر قائم نہ رہ سکی۔ بعض بادشاہوں نے جزیہ لگایا، بعض نے اس سے احتراز کیا۔ بعض نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز برقرار رکھا، دوسروں نے ایسا نہیں کیا۔

دیوانی اور افتادہ قوانین کے معاملے میں بڑی کمجبین پسیدا ہوئیں۔ ہندوؤں کے اسلامی کے دائرہ سے باہر تھے مگر مسلمانوں میں بھی ایک بہت بڑی تعداد، خاص کر فوسلم، اسی رسم و رواج کے پابند رہے جن کو وہ خود دیان کے قریبی اصدا اسلام قبول کرنے سے پہلے ماننے لگے تھے۔ یہ لوگ شادی اور وراثت کے معاملے میں پرانے بدعتی قوانین کی پابندی کرتے تھے۔ ہندوؤں میں اپنی ذات کے لوگ شاستروں کے احکام ماننے لگتے تھے، لیکن ایک بہت بڑی تعداد جو تہی ذات سے تعلق رکھتی تھی اس کے اپنے دیوانی قوانین تھے۔

مسلمانوں کے قانون فی جہادی میں بڑی سخت سزائیں رکھی گئی ہیں اور مقتدرہ کی کارروائیوں کو قبول ہوتی ہے۔ لیکن اس قانون کا ایک حصہ بلا امتیاز مذہب و وقت سب پر نافذ تھا۔ لیکن جہانگیر نے منشا کا تعلق ہے سزائے موت بہت کم دی جاتی تھی اور عام طور سے ۲۰ تا ۳۰ سزائیں دی جاتی تھیں۔ سخت سزائیں ایسے جرائم کے لئے مخصوص تھیں جو حکومت کے خلاف سرزد ہوتی تھیں اور ان میں رجم کے لئے گناہ نہ تھے بلکہ ان میں بادشاہ کی اپنی مرضی اور خوشی سے فیصلہ ہوتا تھا قانون کے لحاظ سے نہیں۔ قانون سازی کے بعد دوسرا اہم رتبہ عدلیہ گسٹری کو حاصل ہے

ازمرد و سلمی میں عدلیہ گسٹری بادشاہ کا سب سے اہم اور محبوب رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ سب بادشاہ بھی جانتے تھے کہ عادل کسلا میں۔ ’میزان عدل‘ اس بات کا نشان تھا کہ بادشاہ رعایا کے فلاح و بہبود کو عزیز اور خوف خدا کو ملحوظ رکھتا ہے۔ ان باتوں کو دیکھ کر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں نظام عدلیہ بہت ہی منظم اور مضبوط ہو گیا۔ لیکن قویٰ خیز حقیقت یہ ہے کہ عدلیہ کا ایک بڑا حصہ حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا انھیں اپنے دیوانی اور افتادہ مقدمات کے لئے پنڈتوں اور شاستروں کی بھی عدالتوں یا برادری یا گاؤں کی پنچایتوں میں جانا پڑتا تھا۔

ساری رعایا کے فی جہادی مقدمات اور مسلمانوں کے دیوانی مقدمات کا تھیں کی عدالت میں جاتے تھے۔ حکومت میں ایک ایسا محکمہ قائم تھا جو ان امور سے تعلق رکھتا تھا۔ بادشاہ اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ کا تقرر کرتا تھا۔ صوبائی قاضی اس محکمہ کی طرف سے مقرر کرتے جاتے تھے جن میں ضلع اور پھر گز کے قاضیوں کے تقرر کا اختیار حاصل تھا۔ اہل دیہات میں ریاست کی طرف سے شاید یہ کوئی قاضی نہ ہوتا ہو۔ قاضیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھیں بلکہ انھیں گز و اوقات کے لئے ایسی زمینیں مل جاتی تھیں جن کی مال گزاری نہیں کی جاتی تھی نظام تھا جس میں کوئی دوسرے ہندی نہ تھی۔ اپیلوں کا بھی کوئی ناکارہ نظام نہ تھا۔ اہل دیہات بعض اوقات کسی ایک قاضی کے لئے خود مقدمات نظر ثانی کے لئے دوسرے قاضی کے پاس بھیج دئے جاتے تھے۔ جو لوگ مقامی قاضی کے فیصلے سے مطمئن نہ ہوتے تھے وہ نا انصافی کے ازالہ کے لئے صوبائی گورنر کے پاس جاسکتے تھے۔

بادشاہ ہر مشہور عدلیہ و انصاف سمجھا جاتا تھا، صرف اس لئے نہیں کہ وہ دیوانی اور فی جہادی مقدمات سن کر فیصلہ صادر کرتا تھا، بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کا مدافع ہوتا تھا۔ ان حالات میں جگہ سرکاری حکام، امیر اور طاقت ور لوگ جو چاہے کر سکتے تھے، بادشاہی مظلوموں کا ہمارا تھا۔

منزل موٹھو نے بہت سی ایسی مثالیں بیان کی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہوں نے عموماً کو سخت ترین سزائیں دیں۔ باہر

نے محمد زمان مرزا کا مذاکرہ کیا تھا کیونکہ اس نے حاجی محمد خان کوئی کے باپ کو متعلق کر دیا تھا۔ مرزا پر کا بہت ہی قریبی رشتہ وار تھا۔ بکر دولت خاں، میں خاص دربار کیا کرتا تھا جس میں اپیلیں سنی جاتی تھیں۔ چپبے عدالت پیشی تو لقا رہے مگر لوگوں کو اطلاع دی جاتی تھی۔ اگرچہ اپنے دودھ خربک جہاں احمد خان کو اپنے ساتھ سزا دلائی تھی جس نے الکاحاں کے قتل کی سازش کی تھی۔ اگرچہ اس کو مذاکرہ کر کے سر کے بل قتل کر دیا اور دیواری سے نیچے گھرا دیا تھا جس سے اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

گجرات کے گورنر خان اعظم مرزا عزیز کو کا کا واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔ خان اعظم نے اپنے تلامذہ کو مرزا دیا تھا کیوں کہ اس نے ایک عامل کو جان سے مار ڈالا تھا مگر اس عامل کا باپ اس سزا سے مطمئن نہیں ہوا اس نے گورنر کے خلاف شکایت ہو چوائی۔ اگرچہ مقدمہ کی سماعت کا حکم دیا اور خان کو ایک بری ریڈمٹ ہو کر جرم سے بے نیاز کر دیا۔

جہاں علی نے ایک سوئے کی زنجیر لگا کر بھی تھی جو تین تکرار بھی تھی اور اس میں ساتھ گھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس زنجیر کا ایک سرائقہ آٹھ کے شاہ ہریچ کی فیملی سے بڑھا ہوا تھا اور دوسرا راجا کے کتارے ایک پتھر کے چھچھے میں لٹکا ہوا تھا۔ جب کوئی مظلوم عدالتوں سے انصاف پانے میں ناکام ہوتا تو اگر اس کو بھینپنا اور اس طرح گھٹیاں بجا کر فریاد کرتا۔ جہاں علی ہفتہ میں ایک بار دیوانی اور دیواری مقدمات سمجھنے کے لئے دہلیا گیا کرتا تھا۔ وہ جرموں کو سخت ترین سزائیں دیتا تھا جیسے جیلوں کے بیرون سے چلوانا، شیشوں سے پھینکا دینا وغیرہ۔

شاہجہان الہ خاں کو جرت ناک سزائیں دیتا ہو ظلم کرتے تھے۔ گجرات کا گورنر تاج مرزا خان بڑا ظالم تھا۔ واقعہ ذیلوں کو رشوت دیتا تھا کہ شہنشاہ اس کی فحوت سے واقف نہ ہونے پائے۔ چند مظلوم سوداگر کسی طرح آگے پہنچنے اور انھوں نے شاہجہان کے سامنے ایک درم گھٹیاں میں گجرات کی بدنامی لافتنہ کھینچی گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر شہنشاہ کو برا تعجب ہوا اور اس نے تحقیقات کی۔ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد اس نے تاج مرزا کی جائداد ضبط کر کے اس کو دہشتاں سرگرمی کے قتل میں قید کرنے کا حکم دے دیا۔

شاہجہان نے مخبر کے نام اور دیگر دوا صوبیدار مفتاح خان کے ساتھ جو سولگ کیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ غصے تھا۔ اس صوبے دار کے ظلم اور رشوت شناسی نے وادی کھنڈ میں ہنگامہ مریدا کر دیا تھا۔ جوں ہی شاہجہان کو کھنڈ کے حالات کا علم ہوا، اس نے صوبیدار کو پکارت کر کے اس کی جگہ خزانہ کو مقرر کر دیا اور اس کا اطلاع کر دیا کہ اس نے اپنے جو بیٹے شروع کی تھیں وہ غمزدگی ہو گئی ہیں۔ شاہجہان نے اپنے احکام ایک سنگ مرمر کی سل پر کندہ کر کے اس کو جامع مسجد کے صحنہ دروازے پر نصب کر دیا تاکہ تمام ہندو متنبہ رہیں۔

اورنگ زیب عدلی گسری کے لئے بڑا سرگرم عمل تھا۔ وہ دربار میں منظر سناتا اور فیصلے صادر کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک ذرا بی مظالم بھی قائم کیا تھا جہاں ایسے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ اس کے حکم سے ضابطہ قوانین مستحکم بھی تیار کیا گیا تھا۔ اس نے شیخ نظام اور محمد دیو فقیہوں کو اس کام پر مورکب کو قافلوں و مالٹوں سے متعلق صورت حال کا جائزہ لے کر تافانی فیصلوں کا قاعدہ غلامہ اور تافانوں کی صحیح تقریر مرتب کر دی۔ چنانچہ سات سال کی محنت کے بعد یہ کام پورا ہوا اور شہنشاہ کے نام پر اس کا نام دیا جائے گا علی گڑھ رکھا گیا۔

بادشاہ کا حکم دے دیا اور امراء کے ذریعہ چننا تھا جس طرح میں حمد سے ہوئے تھے۔ درحقیقت عدلیہ کو چھوڑ کر جملہ افسران فوجی حمد پر راہی ہوتے تھے۔ اس نظام کو منصب داری نظام کہا جاتا تھا اگرچہ سب سے پہلے یہ نظام قائم کیا گیا تھا۔ منصب داروں کی تحفہ یا تو شاہی طرز سے ادا ہوئی تھی یا انھیں کچھ زمینوں کی مال گزاری مول کرنے کا اختیار ہوا کرتے تھے اور اپنی جائگہ کی پوری اراضی کی آمدنی میں سے ریاست کا پورا حصہ یا اس کا کچھ حصہ وصول کیا کرتے تھے۔ اس لئے زمینیں و محضوں میں مشتم تھیں۔ خالص زمین، جس کا انتظام براہ راست حکومت کے ہاتھ میں رہتا۔ اور جائگہ زمین، جس کا انتظام منصب دار یا تو اپنے کارندوں کے ذریعہ یا سرکاری اور گڈوں

سرور کی معرفت کیا کرتے تھے ان دو دونوں کوئی مقررہ تناسب قائم نہ تھا۔ بعض بادشاہ مداخلت نہ کرتے جنھوں نے جاگیروں کو محدود رکھنے کی پوری کوشش کی۔ بعض بادشاہ لا پرواہ ہوتے تو انھوں نے خالص زمین کو بھی جاگیر دانوں کے قبضہ میں جاعے دیا۔ اگر بے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں جاگیریں ختم کرنے کی کوششیں کی تھیں لیکن بعد کو ناگزیر سی کی دھنوں کے ذریعہ تو انھیں دینے کا طریقہ برقرار رکھا۔ مگر اس نے یہ اجازت نہ دی کہ افراد اپنی مخصوص جاگیروں پر مستقل طور سے قابض رہیں اس لئے اس نے جاگیروں کو ادلتے بدلتے رکھنے کا حکم دیا۔ منصب دار کے انتقال کے بعد اس کی جاگیر اور اطاک حکومت کے قبضہ میں آجاتی تھیں۔

لیکن ریاست کے فرامین میں صرف امن وامان کا نظام اور مالک اندازی کی دھنوں ہی شامل نہ تھی، ہمسایہ حکمرانوں کی طرف سے حملے کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ کوئی ایسا قدیم زمانے کی سیاست سے متعلق جو کہا جاسکے وہ بات از سب سے پہلی میں بھی ثابت ہوئی تھی۔ سرحدی حکومتوں سے دشمنی رہا کرتی تھی اور ان کے خلاف دو دروازوں کو تختوں کو طبعیت بنایا جاتا تھا۔ سرحد پر کوئی نہ کوئی تنگ سر پر پار بناتا تھا اور سرحد کی حکومتیں برابر حملہ کرنے کی تاک میں رہا کرتی تھیں۔ ان حالات میں خود حملہ کرنا ہی دفاع کا سب سے اچھا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی یہی صورت حال تھی اور مسلم حکومتیں قائم ہونے پر بھی قائم رہی۔ چنانچہ ہندورا جہ انضمامیہ جیگر کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ ان کی قربانیاں ہمسایہ حکمرانوں کو کامیابی سے زیر کرنے پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ ہمیں وہی دشمنی دہرہ کے دہرے میں دن شروع ہوتی تھیں جب بادشاہیں ختم ہو جاتیں اور فوجوں کے اگلے بڑھنے کے لئے راستے کھل جاتے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کو ہندو فرماں انجام دینا ہوتا تھا۔ لیکن کایہاں باقی اہد جہاں گری۔ جہاں گری کے لئے وہ خود اپنی فوج کے ساتھ اپنی ہمسایہ حکومتوں پر چڑھائی کیا کرتے تھے۔ مثل در باز اردوئے مملکت کے نام سے مشہور تھا، لیکن یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ مملکت حکومت ایک فوجی کمپ تھی۔ اگر حسیہ فوج کو

بڑی اہمیت حاصل تھی، لیکن ان کی مستقل فوج کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی، ان مروتوں کے وقت منصب داروں کی فوجیں جیسے کہ اس میں اضافہ کیا جاسکتا تھا۔ فوجوں کی تعدادوں اور کئی زیادہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ بہت سے ایسے لوگ بھی فوجوں کے ساتھ ساتھ چلتے تھے جو لڑتے نہیں تھے۔ دراصل لڑنے والی فوج کی تعداد بہت زیادہ نہ ہوتی تھی۔

ہم مملکت حکومت کی پولیس حکومت بھی نہیں کہہ سکتے، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ حکومت سماج کے معمولی کاموں میں بہت کم دخل انداز ہوتی تھی۔

پھر مذہبی ریاست بھی نہیں کہ جاسکتی کیونکہ مذہبی لوگوں کو کوئی بالادستی حاصل نہ تھی اور شاہ بھی ان کے زیر اثر نہ ہوتے تھے۔ وہ سماجی حکم کے مطابق حکومت کرنے کا دم نہ چرتے تھے اور نہ اس کا کوئی سوال تھا کہ وہ سماج کے مذہبی قائد تھیں۔

دعا سے متعلق بادشاہوں کا بنیادی فرض یہ تھا کہ اس کے لئے مذہب اور اپنی زندگی کے مواقع پتہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مروت زندگی گزارنے یا جوانی زندگی گزارنے کا مطلب بھی زندگی نہیں ہو سکتا۔ ذہنی انسانی فن و ادب اور موسیقی میں آمد کو پاتا ہے اور اس کے لئے وہ لطافت و نفاذت کی تلاش میں رہتا ہے۔ اکثر مملکت بادشاہ علم و ادب کے شہساز تھے۔ ہر بزرگ زبان کا بہت اچھا شاعر تھا اور اس نے بے مثال سوانح عمری لکھی ہے۔ ہادیوں کو تعلیمات اور اشیائے علم کے علاوہ کثرت و تنوع و تاروں کی گردش دیکھتا رہتا تھا۔ اگرکہ مذہب اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی تھی اور مختلف مذاہب کے رموز کا پتہ لگاتے ہیں وہ راہیں گزار دیتا تھا۔ جہاں پر مصلحتی کا دل دادہ تھا اور اپنے دربار میں دعوتیں کچھ لگاتا اور رہتا تھا۔ شاہ جہاں کی قوت عمل نے اسی عمارتیں تعمیر کرائیں جو غرق فیض کی مالک ہیں۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا داراشکوہ ایک جہاد عالم تھا۔ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت زبانیں جانتا تھا۔ اس نے سچا سچ دانشوروں کا سنسکرت سے فارسی میں بڑا اچھا ترجمہ کیا تھا اور انجمن البرہین کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندو اور مسلمانوں کے صدیقیانہ عقائد کی یکساںیت ظاہر کی گئی ہے۔ یہاں تک

کہ اورنگ زیب جیسے متحکم و مزاج بادشاہ بھی زیر دست عالمِ آدمِ مسلم، بشدت
نزدک تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب بادشاہ شاہِ کرگرہ سے ہیں۔ آخری من
بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھوڑا اور برج بھاشا کا بہت اچھا شاعر۔
آج ہشتادہ نہیں رہے لیکن ہندوستانی ثقافت میں ان کے
کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے، ان میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اکثر جدید
ہندوستانی زبانیں ان کے ذہن میں ادا تھیں کے زیر سایہ پروان چڑھیں۔
ہندی کے وہ مہتمم شعرا سیڑھیوں میں پیدا ہوئے۔ سورہ اس اور کسی داس، غلام
خان، انگریز کا امیر الامراء تھا۔ وہ خود بھی اعلیٰ درجے کا ہندی شاعر
بہت سے شاعروں کا سرپرست تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مسلمان
بادشاہ ادا ادا ایسے گزرے ہیں جو علم و فضل و کرم کی سرپرستی کیا کرتے
تھے۔ لیکن میں یہی مسلمان جسے دوش خیالِ ادا علم و ادب کے سرپرست
تھے۔ مسلمان محمدی قلب شاہ دکنی اردو کا عظیم شاعر گزرے۔ جو پڑ
کے ختی یاد شاعر تھے۔ اپنے بادشاہیں بہت سے شاعر اور ادیب جسے کر
رکے تھے۔ بنگال کے نادر شاہ نے بنگالی ادب کو ترقی دی اور اسی کے علم
سے ہمارے کاتبان بھی ترقی پزیر ہوئے۔ وہ دہلی کے دوست تھا۔ جیسٹ
نے پلا دھرا سو کو ”جنگوت پرائی“ کا ترجمہ کرنے پر مانگ کیا تھا۔
منی بادشاہوں کے زیر سایہ ادب کے علاوہ بہت سے سائنسی
علوم کی ترویج ہوئی۔ علمِ طب بھی ان میں شامل تھا۔ اگر نئے ملک بریں
بہت سے ہسپتال قائم تھے، اسی طرح جہاز، شاہِ جہاں اور
اورنگ زیب نے بھی ہسپتال کھولے اور ان کے اخراجات کے لئے
جامدادی دفت کی تھیں۔ ان میں سے بعض ہسپتالوں میں یونانی اور

یورپ کے دونوں طریقہ علاج سے کام لیا جاتا تھا۔ ایسی طبی کتابیں
ترتیب کرنے کی بھی کوشش کی گئی جن میں دونوں طریقہ ہائے علاج
کے اصول درج تھے۔

دیباچی اور علمِ نجوم کو بھی خوب ترقی دی گئی۔ اس موضوع پر
لکھی ہوئی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں اور عربی کتابوں کا سنسکرت
میں ترجمہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مختلف علوم سے بھی سنسکرت کتب
کا فارسی میں اور فارسی اور عربی کتابوں کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ
کیا گیا۔ لاطینی کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جو غلام
تھا اس کو پڑھنے کی کوششیں کی اس طرح جو مصلد افرائی کی گئی اور
ہندو مذہب و فلسفہ کی اہم کتابوں کو فارسی میں منتقل کر دیا گیا۔
غزلیہ طبع میں معتمدی، فخریہ اور موسیقی پر غاص و تبحر دی
گئی۔ اس دور میں فنِ فیضیہ کے میدان میں ہندوستان نے جو
ترقی حاصل کی اس کی وجہ یہ زمانہ یورپ کے دورِ نشاۃ ثانیہ یا
یونان کے دورِ درخشاں کی طرح مہیا جاتا ہے بادشاہ ان سب فنِ فیضیہ
کے بڑے قدردان تھے۔ معتمدی کو عام طور سے دیباچی فن بھی سمجھا
جاتا تھا۔ باہر اور ہمایوں کو وسط ایشیا سے اپنے ہمراہ اس فن کے
استاد لائے تھے اور اگر جہاں گیر اور شاہِ جہاں کی سرپرستی میں
اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ اورنگ زیب کے دیباچوں کی
دیکھا دیکھی موبائی گورنمنٹ، راجستھان کے ہندو راجاؤں اور
پہاڑی ریاستوں نے معتمدی کے مقامی اسالیب کی پرداخت
وپرورش کی۔

فروری گزشتہ

۱۔ کاغذ کے ایک طرے لکھے۔

۲۔ فریڈرک مہنیں اسی صورت میں واپس کے جاتے ہیں
جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا ڈاؤر ڈاک کے
”کٹ ہوں۔“

(ادارہ)

غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب

مٹی مہیش پر شادآجہبی کے سرے جنہوں نے کچھ خطوط تاریخیں اختیار سے ترتیب دے کر خطوط غالب کے نام سے طبع کئے۔ مولانا غلام رسول نے جملہ خطوط کو بلحاظ تاریخ ”خطوط غالب“ ہی کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا اور لاہور میں طبع کرائے جن میں خود ہندی اور اردو خطی کے علاوہ مختلف رسائی میں مبلوہ خطوط بھی شامل ہیں۔ دو مجموعے ملائیپ غالب از مولانا عرشی، نادرات غالب از آفاق دہلوی بلحاظ تاریخ مرتب کئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا کوششیں قابلِ عین ہیں کیونکہ ان کی بدولت آئے بڑھنے کا راستہ ایک حد تک صاف ہو گیا ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ترتیب دیے میں جس محنت کی ضرورت تھی اس کے لئے غالب ان بزرگوں کو خدمتِ نعلی اور ترتیبِ دھت تاریخی میں تاحال غلطیاں موجود ہیں۔ متن میں افادگی غلطیاں الگ پاؤں جاتی ہیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے صحیح طور پر مرتب کروا جائے تو بہت سے واقعات پر کماحقہ روشنی پڑ جائے۔ بالخصوص ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور جن کو غالب نے اپنے خطوں میں بیان کیا ہے ایک ترتیب تسلسل کے تحت ہمارے سامنے آجائیں (خواجہ حسن نظامی نے اس قسم کی کوشش کر کے ”غالب کا رد و تاج“ مرتب کیا تھا لیکن چونکہ خود ہندی اور اردو کے خطی میں خطوط کی ترتیب درست نہ تھی اس لئے اس میں یہ غلطی باقی رہی اور آفاق تسلسل قائم نہ ہو سکا۔

غالب کے زمانے میں کسے خبر تھی کہ غالب کے خطوط ادبی حیثیت سے بلند مرتبہ ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی دستاویز کا کام بھی دیں غالب جودان کی اشاعت و طباعت کے نمائندہ تھے بیکنی جب ادبی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے خود طباعت کے کام میں مدد دی اور اپنے خطوط کی نقوی فراہم کرنے میں مرتبہ خود ہندی اور اردو خطی ۱۸۶۷ء بٹایا۔

غالب کے زمانے میں صرف ادب طوفا تھا۔ اس وجہ سے کسی نے بھی تاریخی اور ادبی درستی کی طرف توجہ نہیں کی نیز ترتیب میں بھی تاریخی حیثیت کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ خود ہندی اور اردو کے خطی میں خطوط بکھرے ہوئے ہیں۔ اردو کے خطی میں صرف مرتبہ نے اس امر کو ملحوظ رکھا کہ پہلی رقاقت حصہ اول میں جمع کے اور شکل رقاقت حصہ دوم میں شامل کر دے لیکن جب ۱۹۶۲ء میں مجیدی پریس کانپور کے کارپروڈان نے اردو کے خطی کی طباعت کا اہتمام کیا تو سووی محمد میر صاحب نے، دوڑوں حصوں میں ہر کتابت الیہ کے نام سے خطوط طبع کئے، سب کو یکجا کر دیا، لیکن بلحاظ تاریخ ترتیب نہ دیا۔ اردو کے خطی لاہور میں وہی قدیم ترتیب قائم رہی۔ البتہ شیر محمد صاحب سرخوش نے مولانا حسرت موہانی کے رسالہ ”اردو کے خطی“ علی گڑھ میں مبلوہ خطوط نام قدر دیگر اگلی و لطیف احمد بیگڑی بلوچ میر شال کر دئے۔ تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے کی ادلیت کا سہرا

غالب کے جملہ خطوط پر اگر نظر ڈالی جائے تو بالفاظ تاریخ وہ دو نوعیت کے ہیں

(۱) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت ہے :-

(۲) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت نہیں ہے :-

(۱) تین تاریخ کا قریب موجود ہے (ب) تین تاریخ کا کوئی قریب موجود نہیں۔

(۲) ایک تاریخ کا قریب موجود ہے (ب) ایک تاریخ کا کوئی قریب موجود نہیں۔

”ج“ خطوط غالب کے پہلے مکتوب المیر، امین الدین خاں کے نام جتنے خطوط ہیں ان پر بطور مثال روشنی ڈالی جاتی ہے۔ خطوط غالب اور اردو نے پہلی میں ان کے نام صرف پھر خط ہیں اور دو خط رسالہ نقوش کے مکاتیب نمبر میں شامل ہوئے ہیں گویا جمعی تعداد خط ہے۔ اردو کا نمبر (۱۹۳۲) ہیں یہ خطوط ۴۵ صفحہ ۲۹۶ تا صفحہ ۲۹۷ اور اردو نے پہلی لاہور (۱۹۳۰) میں ۲۸۶ صفحہ ۲۸۷ تا صفحہ ۲۹۰ میں ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں پہلے اور آخر میں خط برکوی تاریخ نہیں۔ چھ خط کی تاریخ بجز سب سے پہلے ایک ان تینوں میں تین تاریخوں کے قرائن موجود ہیں۔

(خطوط غالب میں پہلا خط ”بھائی صاحب کو تم میرے ارغ“ ہے۔ اس برکوی تاریخ درج نہیں ہے لیکن تین تاریخ کا قریب موجود ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کا قریب زمانہ تحریر کیا ہے ؟ خط مذکور میں غالب نے اپنی ایک تہ لکھی ہے :-

میری زوج بہناری ہیں، میرے بچے تمہارے بچے

ہیں۔ خود جو میری خستہ جیتی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری

اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکہوں کے واسطے

جہاں راجا جاگوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں تمنا

یہ ہے اور انشا اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور

تم دونوں دین الدین و ضیاء الدین کے سامنے ہیں

لہ یہاں نہ کہ بعد صرف ہوتا چاہیے جو نہ معلوم کس وجہ سے تمام نسخوں میں نہیں ہے۔

محبوں تاکہ اس خط کو اگر کوئی نہ دے کہ تو جینے

دو گے۔ اور اگر جینے نہ دو گے اور بات نہ پھر گئے

میری ملا ہے میں تو موقوف اپنے قصور کے مرتے وقت ان

نکد دہوں کہ تم میں نہ ہوں گا۔“

غالب اس زمانے میں تامل کی زندگی سے بڑھاتے اور وہ تجسہ کی زندگی گزارنا چاہتے تھے ان کا ارادہ کسی ریاست میں جے جانے کا تھا۔ حکیم محمود خاں کے پاس غالب کا قیام تھا وہ ریاست پشاور میں راجہ کے حبیب خاص تھے ان کی تحریک بریا خود ہی غالب پشاور جانے کے خواہاں تھے لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، کیونکہ اس منگلا مشہور کے بعد ان کے تعلق کی کفالت کرنے کی کسی میں بھی استطاعت نہ تھی

جب حکیم صاحب ۲۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو پشاور چلے گئے تو حکیم غلام نجف کے پشاور چلے گئے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں :-

”بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو تم موقوف اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک کو تنہائی سے نفور ہے

ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تامل میری موت ہے میں

کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پشاور جانے

میں ایک سبکی اور لذت تھی اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی

حیرت آتی، لیکن اس انتہائی چند روزہ اور قریب انتظار

کی کیا خوشی۔ عدالت لاولد رکھا، شکر بجا پایا تھا۔ خدا

نے میرا شکر مقبول منظور کیا یہ بلا بھی قبولی داری

کی شکل کا نتیجہ ہے۔ بڑھ چس لوہے کا طوق اسی ہے

کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں لہ

خط مذکورہ بالا ۱۸۵۸ء کے بعد لکھا ہے۔ کیونکہ اگر پہلی کے

خط میں حکیم احسن اللہ خاں کی خدمت بند کی ختم ہونا اور ان سے ملاقات

کا نہ ہونا تحریر ہے اور اس میں ان سے بعد نظر بندی ملاقات کا ہونا

مذکور ہے اس لیے حکیم غلام نجف کے نام کا یہ خط و سطر اپریل

کا ہے۔

لہ فوق سے مراد بھائی اور ہتھکڑیوں سے مراد سپرنٹنڈنٹ عارف (حسین علی شاہ) ہیں جن کو غالب نے پایا تھا۔ خط کے خطوط غالب صفحہ ۲۵۰ لاہور

خط بالا سے اس کا اندازہ ہوا کہ غالب تامل کی زندگی سے بیزار
تھے یا لغوی غدر کے زمانہ میں جبکہ پیش بھی بزم سوئی تھی۔ چنانچہ
دستوں کے خاتمے میں لکھتے ہیں:-

”پیش سابقہ اگر مل جائے تو بھی کچھ نہیں ہوگا اور اگر
نڑے تو حال تباہ ہوگا۔ یہاں کی آب و ہوا کھڑورہ
کے لئے بہتر ہے۔ شہر سے بھاگ جانا چاہیئے اور
کسی دوسری بستی میں رہنا۔ اختیار کرکے چاہیئے۔“

یہ عبارت ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کی ہے غرض وہ دلی چھوڑ کر جانا
چاہتے تھے صرف مسئلہ اہل غازی کی کائنات کا تھا۔ دلی میں سے دے کر
ان کے اعراب میں خاندان بونارو تھا لیکن اس خاندان کے سربراہ غدر
کے طرہ میں ہیں شامل تھے، پے گنا ثابت ہو چکے تھے لیکن جبر بھی
نظر بند تھے اور جاگیر سے دور۔ ایسی حالت میں اہل و عیال کو کس
پر چھوڑ کر ہڈا پٹیا لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ امین الدین خاں
وضیاء الدین خاں کو راجست پر جانے کی اجازت گنت میں ملی تھی
کیونکہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو شہاب الدین خاں کو لکھا ہے:-
برای تو یہ جاہتا گراہ و خط تہیں لکھوں،
اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ میرا رک ہو تب سے
اب و ہم (امین الدین خاں وضیاء الدین خاں)
نہ افر جاگیر کو روانہ ہو گئے۔

اور جب دستبرخیز کیے گئے تھے پھر دی اور جرح و اطلاع دی کہ قریر
نہم کردی۔ اس کا آخری حصہ نقل کر کے بھیجا تو جرح نے بادشاہ دلی
اور امین الدین خاں وضیاء الدین کے حالات کے اندراج کے متعلق سوال
کیا تو جواب میں لکھا:-

”امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا مال اور بادشاہ
کی روانگی کا حال نوکر لکھتا ہے ان کو جاگیر گنت میں

لی، بادشاہ اکوٹہ میں گئے۔“

اگست میں جاگیر کی آواہیں الدین خاں وہاں گئے ان کے والد علاؤ الدین خاں
اور دیگر متعلقین وہیں تھے۔ ضیاء الدین خاں اپنی والدہ کو اپنے بونارو
گئے وہیں۔ اس خلیوں غالب نے اس کی اطلاع بھی دی ہے اور ان کے
کے لئے بھی لکھا ہے:-

”جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور
ضیاء الدین خاں اسی واسطہ وہاں پہنچے ہیں۔ سنو لید
تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں
کوتہ المباء، صحت احیاء۔ تنہائی سے مزمل رہو،
حرف و حکایت میں مشغول رہو گے۔ آؤ، آؤ، شتاب
آؤ، جانی۔“

جب یہ سب دلی آ گئے تو غالب نے پھر اس مسئلے کو سب کے
سامنے پیش کیا ان کے مندرجہ لکھنے کے بعد علاؤ الدین خاں علانی لکھا:-
”اپنا مقعود تمہارے والدہ ماجدے اور تمہاری
جیدہ ماجدہ اور تمہارے ہم عالی مقام سے کہہ چکا
ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کریم تباری
قوم کے ہیں مجھ سے لے کر میں اب اس بوجھ کا
متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں
کے بونارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا
قصد سیاحت کا ہے۔ پیش اگر کھل جائے گا تو وہ
اپنے صوف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہاں رہ
گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا، چلی دیا۔“

یہ خط بنام علانی ۲۳۔ اگست ۱۸۵۸ء کا ہے۔ ضیاء الدین کی
آمدورفت و قیام بونارو کا عرصہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ یوم
مقرر کیا جاسکتا ہے اس لئے خلاصہ یہ بحث بنام امین الدین اگست
۵۸ء کے عشرہ ثانی کی ابتدا ۱۱۔ اگست ۱۵۔ اگست کا قرار
دیا جاسکتا ہے۔

۱۔ خط غلط غلط غالب ص ۲۷
۲۔ خط غلط غلط غالب ص ۵۵

۱۔ تب ہے غالب رائے ائق کو مع قرار دیتے تھے۔ ع-م
۲۔ کلیات تذکرہ مبلوم ۱۸۸۸ء
۳۔ خط غلط غلط غالب (لاہور) ص ۱۰۷

یہاں ایک پہلو تشنہ رہ جاتا ہے کہ جب امین الدین خاں کو جاگیر پر جانے کی اجازت انگست میں لی اور وہ اپنی جاگیر پر غدر کے بعد انگست ہی میں گئے، تو اتنی جلدی واپسی کیوں ہوئی۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رہیں تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے۔ اول یہ کہ علاؤ الدین خاں وغیرہ ریاست میں بے خوفہ کچھ بھال کر رہے تھے لہذا امور ریاست میں کسی قسم کا خلل نہ تھا اس وجہ سے ریاست کی دیکھ بھال کی طرف سے بے فکر رہتی تھی۔ دوم یہ کہ امین الدین خاں بیکار تھے جیسا کہ زیر بحث خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ ”سولہ تہذیبی اکاب و ہوا و قائلے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت المباد، صحبت احباء“ لہذا جلدو اپس آجنا کوئی تعجب کی بات اور امر عجیب نہیں۔

مندرجہ بالا شاید و قرائن کی روشنی میں یہ خط انگست ۱۸۵۸ء کے عشرہ ثانی کی ابتدا کا لکھا ہوا ہے۔ خطوط علاقہ (خطوط غالب) کی تاریخوں میں جزوی اختلاف، خط علاقہ کی تاریخ عیسوی خطوط غالب میں ۲۴ جون ۱۸۶۰ء ملے ہوئے ہے لیکن خطیں ۱۰ یوم انجیس ۱۴ محرم ۱۲۸۱ھ و ص ۱۰۰ تاریخ ہجری کی مطابقت تاریخ عیسوی سے کرتے وقت صرف جزئی کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور دن کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یوم انجیس (جہرات) کو جون کی ۲۳ء واقع ہوتی ہے لہذا یوم انجیس ۱۴ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳ جون ۱۸۶۰ء صحیح تاریخ ہے۔ کیونکہ جہری ہسینہ کی تاریخیں بعید ہلال پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے غالب کا لکھا ہوا دن درست ہے۔

خط علاقہ کی تاریخ اندوئے معلیٰ کا پتھر میں جمع ۲۲ مئی ۱۸۶۵ء غلط چھپی ہے۔ پچھ اور دو کے ہفتوں میں جنہیں خطی کی بنا پر عموماً انتہاس واقع ہو جاتا ہے۔ ۲۴ جون ۲۲ کا تب نے بتا دیا کیونکہ عبارت خط میں ۲۵ مئی جمع ہوجاے، نیز جمع ۲۴ مئی واقع ہوئی ۲۲ نہیں اس لئے خطوط غالب اور اندوئے معلیٰ لاہور میں ۲۴ مئی ۱۸۶۵ء صحیح تاریخ ہے۔

خط علاقہ کی تاریخ اندوئے معلیٰ کا پتھر میں چہارشنبہ ۱۲ ربیع الاول

۱۲۸۲ھ اور اندوئے معلیٰ لاہور و خطوط غالب میں چہارشنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ ملے ہوئے ہے۔ خطوط میں ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء سے مطابقت دکھائی ہے۔ اندوئے معلیٰ کا پتھر میں تاریخ غلط ہے کیونکہ بموجب رواج، یکم ربیع الاول لکھا جاتا چاہئے تھا اس کو ہسوکا تب خیال کیا جائے اس طرح خط علاقہ کی تاریخ بھی اندوئے معلیٰ کا پتھر میں ۱۵ نومبر ۱۸۶۰ء غلط نشانہ ہوئی ہے۔ اندوئے معلیٰ لاہور اور خطوط غالب میں ۱۵ نومبر ۱۸۶۰ء صحیح ہے۔ اس کو بھی ہسوکا تب پر محمول کرنا چاہئے۔

خط علاقہ کے آخر میں اندوئے معلیٰ کا پتھر لاہور اور خطوط غالب میں کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ عبارت خط میں صرف ۲۲ جون مرقوم ہے۔ مولانا ہرے حاشیہ میں لکھا ہے۔

”میرا اندازہ ہے کہ یہ خط جون ۱۸۶۰ء کا ہوگا اس میں امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا سے گفتگو کا مفاد درج کیا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۱ء میں ہوئی اسی لئے انہیں باشت پھر کا لڑکا بتایا گیا ہے۔“

مولانا نے اندازہ لگانے میں صرف فرخ مرزا کی عمر کا لحاظ رکھا اور مندرجہ خط کو نظر انداز کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ خط ۱۸۶۵ء کا ہے کیونکہ اس خط میں گری کی شدت کے ساتھ علاؤ الدین کا مدہ اہل و عیال دہلی میں مقیم ہونا اور اپنے والد امین الدین خاں سے نا اتفاق تذکر ہے۔ اور یہ امور ۱۸۶۵ء سے متعلق ہیں۔ شہزادہ طاعن ہوں :

(۱) غالب کے خط سے مترشح ہے کہ گری کی شدت ہے اور علاؤ الدین خاں مع اہل و عیال دہلی میں مقیم ہیں۔ چنانچہ غالب گری کی شدت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

”غریب فصل سے قلع نظر ایک کوک غریباً اولیٰ کے اختلاط کی گری کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانور نہیں بلکہ دل آفر ہے۔ پر سوں فرخ مرزا آیا۔ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔“

لے خطوط غالب حاشیہ ص ۳۵

علاؤ الدین خاں لوہارو سے ہم کی کب آئے اس کے لئے یہ اقتباسات
ملاحظہ ہوں۔ غالب علاؤ الدین کی آمد کے بعد منتظر تھے۔ چنانچہ
انہیں لکھتے ہیں :-

”رجب بیگ، شہان بیگ، رمضان بیگ یہ نامو
مجھے ہیں سوغائی گئے، شوال بیگ آئی کا نام نہیں سنا
ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس چب عید سے اور
روڑ سید ہے تو کیا بید ہے کہ بکلاف مشہور شلاؤ فاضل
اس پہنچے ہیں تم آسکو، (۷-۳-۱۸۶۵ فروری)“

علاؤ الدین خاں غالباً اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں دہلی آئے ہوں
ان کی آمد کے بعد ۲-۴-۱۸۶۵ء کو انہیں الدین خاں کو لکھا ہے :-

”ریگن کے ملک (لوہارو) سے ایک سردار زادہ
کثیر الحال، عیر، مال، عوی، قاری، انگریزی تین
دیاؤں کا عالم دلی میں والد ہوا ہے، بی ماروں کے محلے
میں پڑا ہے۔“

دہلی میں ان کا تیاہم آخر جولائی تک لیتے اور ستمبر ۱۸۶۵ء تک
ہے غالب نے علام غوث خان، یحییٰ خان، جولائی ۱۸۶۵ء کو اسے خط
میں لکھا :-

”بھائی! میں الدین خاں کے امرائے خسرو کی فریاد پر
ایک سفر لکھی ہے۔ علاؤ الدین نے اس کی نقل ان کو بھیج
دی ہے۔ میں دیوان پر نہیں چڑھتا۔ سروسہ عیبت
ہوں، تعزیم و تباہیوں سے ملنا ہی موقوف ہے۔
گرمی کی شدت سے حواس بجا نہیں مہلتا، امراض جسمانی
و آلام روحانی ہے۔“

اور ۲ جولائی کو میں الدین خاں کو لکھا :

”ذیل حاضر باش رہا اسد علی بن علاؤ مولائی
نے اپنے مولیٰ (دین الدین خاں) کی خوشنودی کو اسلے

فقیر کی گذشت پر سوار ہو کر ایک اندو کی غزل لکھوائی
اگر پسند آئے تو مطلب کو سکھائی جائے اور جھنجھوٹی کے
اوپرے میں میں راہ رکھوائی جائے۔“

اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ جون ۱۸۶۵ء میں علاؤ الدین خاں
دہلی میں مقیم تھے۔

(۲) علاؤ الدین خاں کی اپنے والدین الدین خاں سے کسی معاملہ
میں شکر کرنی ہوگی تھی۔ غالب نے صلہ کرانے میں کوشش کی اور
علاؤ الدین خاں کی خوب وکالت کی ہے۔ خط ۱۸۶۵ء ایک اور خط
زیر بحث میں یہ ذکر موجود ہے۔ خط ۳ مورخہ ۲۴ مئی ۱۸۶۵ء
میں اقتباس بالا کے بعد لکھا ہے :-

”بی ماروں کے محلے میں پڑا ہے۔ بحسب ضرورت
حکام شہر سے مل لیتا ہے باقی گھر کا دروازہ بند کر
بیٹھا رہتا ہے۔ گماہ، زہرا شاہ و دیگرہ، غالب علی شاہ
درویش کے تکیہ پر آجاتا ہے۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھاتا
کہاں سے ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ یہ باپ سے پھر گیا ہے
میں جانتا ہوں کہ یہ سبب باپ کی نندوں سے کر گیا
ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو غالب علی شاہ کا قول یہ
ہے کہ کل کا بھلا ہو۔“

خط ۵ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء میں یہ فرولی
”میں ہوں شاکر جہاں بھہرے جہاں اوس“ بھیجی ہے اور تائید طلب
کی خاطر علاؤ کا ذکر کیا ہے کہ اس نے لکھوائی ہے اور ہمارے لئے
لکھوائی تاکہ علاؤ کے مسئلے پر احساس پیدا کیا جائے کہ وہ ہمسایہ
کسی قدر خیال رکھتا ہے۔ اب خط زیر بحث میں ہی امر دیکھیں فرغ کرنا
پڑے اور نصیحتی بات ہے کہ انسان بچے سے بہت محبت کرتا
ہے بالخصوص دادا دوتے کو بہت پیار رکھتا ہے۔ میرزا فخرت الاسافی
کے بہت بڑے نواسے تھے انھوں نے غنیمت ڈروٹ نگاری سے کام
لے کر فرغ کرنا کہا نہ بنایا۔ اس کی گفتگو پیش کر کے باپ بیٹوں میں
صفا کی کرانے کی کوشش نہایت ہی عودہ پیرا ہے جس کی ہے۔ خط کا یہ
حصہ قابل غور ہے۔

لے خط ۵ م ۸-۲۳-۱۸۶۵ فروری ۶۵ء

لے خط ۳ م ۹-۳-۱۸۶۵ خط ۱۸۶۵ء

”پرسوں خرغ مرد آہا اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کیوں صاحب میں تہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟“ آخر چوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرا دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تہااری تنخواہ کتنی ہے؟ کہا جناب عالی، ۱۲ کاجان کی تنخواہ آگئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا تو تہارے جانے تو تنخواہ پائے کہا، حضرت میں تو آکاجان سے روز گنتا ہوں کہ تو بارہ پلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں لی گئے؟“ بس ان شاء بخت میرا لڑکا اور یہ فہم درست اور فیہ تسلیم۔ میں اس خونی خور خرغی میرت پر اس کو خرغ سیر کرتا ہوں۔ مصاحب بے بدل ہے تو اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے؟“ مگر عیاں غلام حسین خان مرحوم کے متبع ہو کر نہیں اخلاقیین و جید ریس اور ان کی اولاد کو بھی تہ نہ لگایا۔ علاوہ الدین خان جیسا حبش مندوہہ دانی بیٹا۔ خرغ تیر جیسا دانشور، بزرگ اور شیریں سنی پوتا۔ یہ دو خطیہ و خطیہ د مہبت کر رہی ہیں تہاارے واسطے من جانب اللہ۔

اگر دیا فتی برداشت یوسس

وگر غافل شدی اخوس افوس

آہ ۲۲۔ جن کی ہے آفتاب سرطانی میں آگیا۔ نقطہ انقلاب سیفی جن میں گئے لگا چاہئے کہ تہارا حقیقت و غضب ہر روز کم ہوتا جائے۔“

خط کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ اس خط کا تعلق خط سے ہے۔ یہ خرغ مرد کی گھٹنگ کا انداز اس کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب نے نسیات شناسی سے کام لے کر اس طریقہ خطاب خرغ و کلمات کو اختیار کیا ہے۔ تاکہ بچی کا توں پر محبت جوئی میں آئے اور صلہ صفائی ہو جائے۔ اس وقت خرغ مرد کی ہر چار سال سے زاید تھی۔ اس عمر کا بچہ اگرچہ میں ہوں تو اس قسم کی باتیں اس سے بچہ لید نہیں ہیں۔ باپ بیٹوں میں شکر دینی باقی رہی۔ امر کار سب کے مہربان ہیں باپ بیٹوں کی مصلحتی

یلم اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ملائی کو مغل کی مبارک باد اس طرح دی ہے، ”شکر ایندو کرتا با پدرت مغل فتد“ جو ریاں رتس کن اس سفر شکرانہ زند

تھرسباں بردعائے تو دالا بدلت
قرعہ قال بنام سن دیوانہ زند

یہ تمام غلو و افغانی تسلسل کے حامل ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انیس مئی ایک بنا پر یہ خط میرے نزدیک ۲۲ جون ۱۸۶۵ء کا ہے اور ترتیب میں اس کا چوتھا نمبر ہے۔ ۱۸۶۵ء کا نہیں ہے، کیونکہ اس زمانہ میں علائی دہلی نہ تھے اور غالب سے اٹھنا ٹھیننا دشوار تھا۔ دلائل خط کو خط بنام سنیاح (ص ۹۸ م) مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۵ء اس کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ غالب نا تو ان پر کیا گز رہی تھی۔ ان چھ خطوں کے علاوہ دو خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں شروع ہوئے ہیں۔ پہلے خط ۳۰ مارچ ۱۸۶۵ء درج ہے اور دوسرے خط پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ ممتاز الدین آرزو نے ۱۸۶۲ء ۱۴ م ۱۸۶۲ء زمانہ تقریر متین کیا ہے لیکن تعین تاریخ کا کوئی خاص قرینہ نہیں پایا جاتا۔ صرف کلمات زند کے ذکر کو اس سلسلہ کے قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کلمات کے تعلق غالب لکھتے ہیں:-

”جانی سے دوسراں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعہ نوحے

خاتمہ کو کیا کروں وہ بھی تھا اس حقیقت پر کہ

لول کشور قاب ضیاء الدین خان سے واسطے التباہ

کسے گیا جب یہ واقعہ نہ ہوا تو اب اس کو نکال ڈالو

اور اس کی جگہ جو کچھ نثر میں اور ہیں وہ لکھ دوں۔“

حقیقت یہ ہے کہ کشتی فکشتور آخر دسمبر ۱۸۶۳ء کو دہلی پہنچے خط بنام علاء الدین خان مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء میں ان کی آمد کو ہے اور خط مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء میں ان کی روانگی کو جا رہا ہے دن کا عصر بتایا ہے گویا وہ سات یا آٹھ دسمبر کو دہلی سے گئے اور ان کے ہونے اور کلمات نثر اپنے ہمراہ لیاوت کے لئے

۱ خط ص ۸ ص ۹۹

نے مجھے اس نے یہ خط ۱۸۶۳ء کا نہیں ہو سکتا۔ اب اگر کلیاتِ نظم کی لمباعت کے عرصہ کو پیش نظر رکھا جائے تو غالب کم از کم ایک سال بعد اس کی لمباعت سے باہر ہوئے ہوں گے اس نے یہ خط ۱۸۶۴ء کے بعد کا ہو سکتا ہے۔ پہلے کا نہیں۔ حالانکہ کلیاتِ نثر پہلی بار جلد ۱۸۶۵ء میں مطلق رمضان ۱۲۸۴ھ میں شائع ہوا تو کیا پانچ سال بعد اس کی لمباعت ممکن ہوئی۔

کلیاتِ نثر میں ایک خط بنام غلام بابا سورتی شنبہ ہفتہ ۱۸۶۴ء کا موجود ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۱۸۶۴ء تک غالب کلیاتِ نثر میں خود اضافہ کرتے رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ کم از کم ۱۸۶۴ء میں لمباعت سے ناامید نہیں ہوئے ہوں گے۔ ایترا ۱۸۶۵ء کا کچھ عرصہ گزرنے پہنچا۔ بعد ہوئے ہوں گے جیسا کہ خطِ تبریح سے ظاہر ہے۔ پس یہ خط ۱۸۶۵ء کا ہو سکتا ہے یا اس کے بعد کا قرار دیا جاسکتا ہے۔ مختار الدین اردو کا تیسرا عرصہ درست نہیں ہے اور مندرجہ بالا کی روشنی میں اب امین الدین کے جملہ خطوط کی تاریخیں

۱۔ ذکرِ غالب ص ۱۲۴

اور ترتیب حسبِ ذیل ہوگی۔

خط ۱۔ بھائی صاحب ساٹھ برس سے اٹھ، اٹا ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء

خط ۲۔ اٹھ کرم کے عدام اٹھ، یوم الفیس ۱۷ عرم ۱۲۸۱ھ

مطلق ۲۳۔ جون ۱۸۶۴ء

خط ۳۔ برادر صاحب جمیل المناقب اٹھ، جمہور ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

خط ۴۔ جیل المناقب میم الاحسان اٹھ، ۲۲ جون ۱۸۶۵ء

خط ۵۔ برادر صاحب جمیل المناقب اٹھ، ۲۶ جون ۱۸۶۵ء

۲۔ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء

خط ۶۔ بھائی سے دو سوال اٹھ، ۲۵ مئی ۱۸۶۵ء (مطبوعہ نقوش)

مکاتیب نثر

خط ۷۔ بھائی صاحب آج تک اٹھ، ۱۵ دسمبر ۱۸۶۶ء

خط ۸۔ اے میری جان کس وقت اٹھ، ۳۰ مارچ ۱۸۶۸ء

(مطبوعہ نقوش، مکاتیب نثر)

میرے پیش نظر تاریخی ترتیب کا ایک اور پہلو ہے یعنی جملہ خطوط

کو بلا لحاظِ ترتیب ایہم بلحاظِ سن مرتب کیا جائے۔ اس کا ایک نمونہ

یہ ہوگا کہ واقعات میں تسلسل قائم ہو سکتا ہے۔

تیسرے پلان میں دستکاروں کی تربیت

تیسرے پلان کے پہلے سال میں ملک ہری دستانکاروں کی تربیت سے متعلق مختلف منشی اداروں میں لگ بھگ ۲۲۵۰۰ نشستیں ہینا کی جائیں گی۔ اس طرح کل طاکر ہرسال ۵۰۰۰ دستکار تربیت حاصل کر سکیں گے۔

صرف انکو تربیت پنجاب، بہار، اتر پردیش، اڑیس، بہار، اتر پردیش اور تری پورہ کی ریاستوں میں قائم مستفہ منشی تربیتی اداروں میں مزید ۱۲۰۰ نشستیں ہینا کرنے کی منظوری دی گئی تھی۔

تیسرے پلان میں موجود تربیتی اداروں میں تو سیک کے ذریعہ اور بہت سے نئے تربیتی فونڈ قائم کر کے لگ بھگ ۵۰۹۰۰ مزید دستکاروں کو تربیت دینے کی تجویز ہے۔ دو روزہ تربیت سے متعلق مرکزی ڈائریکٹوریٹ جرنل کے پلان کے مطابق یہ نشانہ چالو پلان کے پہلے تین برسوں میں پورا ہوجائے گا تاکہ پلان کے آخر تک منشی تربیتی ادارے ہرسال لگ بھگ ایک لاکھ دستکاروں کو تربیت دینے کے قابل ہوجائیں۔

دوسرے پلان کے خاتمہ پر سالانہ ۲۰۰۰ کے قریب دستکاروں کو تربیت دینے کی سہولتیں موجود تھیں۔

تامل ادب میں اسلامی عناصر

اس حقیقت کا غماز ہے۔

یوں ہی تامل کی مدوجہ تمام اسناد ادب میں مسلمان اہل قلم کی تخلیقات ملتی ہیں۔ مسلمانوں نے تامل ادب میں جن نئی اصناف کا پھانز کیا ان میں مستنزیہیں ایجاد پڑائی پور رجز نامہ ہے۔ تامل ادب میں مسلمانوں سے پہلے اس صنعت کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ تامل ادب کو مسلمانوں کی یہ بہترین تحفہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس صنعت کے موجد حسن علی پلور ہیں۔ ان کی ایک تصنیف ایڈوڈائی پور پانچ رجز نامے) ہمت مشہد ہے۔ اس میں پانچ اسلامی جنگوں جنگ اہد جنگ بدرا جنگ مہلی اعز وہ خندق و غیرہ کے حالات اجمل مضمون کے ساتھ ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۸ء) میں لکھی گئی۔ اسی منت میں ایک اور تصنیف سنہایت پڑائی پور حضرت عمرؓ کے زمانے کی ایک جنگ کا مضمون خاکہ ہے۔ اس کے مصنف کجھ موکو پلور ہیں یہ ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۷ء) میں لکھی گئی۔

متذکرہ بالا دونوں رجز ناموں میں عربی اور فارسی رجز ناموں کا نتیجہ کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی میں جتنے رجز نامے تھے ہیں ان میں دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے۔ چون کہ یہ معتف عربی اور فارسی پر مبنی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تامل رجز ناموں میں عربی اور فارسی کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

لہ پلور۔ تامل زبان میں شاعر کو کہتے ہیں۔

ہندوستان کا پھر ایک رنگ رنگ بچر ہے جن کو مختلف قوموں ستوارا ہے۔ لیکن اس رنگ رنج کے باوجود اس کی روح ایک ہے۔ کثرت میں وحدت جلوہ گر ہے اور یہی اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اسی طرح یہاں جدید اور قدیم زبانوں کا بھی گویا سنگم ہے۔ یہاں دنیا کی جدید سے جدید زبان بھی پائی جاتی ہے اور قدیم سے قدیم زبان بھی ملتی ہے سنسکرت کی طرح تامل بھی ہندوستان کی قدیم زبان ہے۔ اس کا کلاسیکی ادب بڑا ہی جان داد ہے۔ اس میں چند ایسی کتابیں بھی ہیں جن کی سبھت لگائی ہے۔ ”تزدکول“ و ”تباکی حکیم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو ۶۰۰ سال قبل لکھی گئی۔ اس کے تراجم دنیا کی بیشیز زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

یہ بات مسلم ہے کہ مسلمان فاتحین سے قبل مسلمان تاجر ہندوستان آئے جنہوں نے اپنے ہمن غلوں سے مقامی لوگوں کے دلوں کو سحر کیا۔ ان مسلمان تاجروں کے کئی خاندان ہیں جس میں رس بس گئے اور انہیں کے ہونے سب سے پہلے ان تاجر پیشہ لوگوں نے طابار اور تامل ناڈ کے سوا مل کو اپنایا۔ طابار میں کجھیں اور تامل ناڈ میں کایہ پٹن ان کے مکس بنے۔ یہ ایک کئی بڑی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کا ادب یہاں کی پسے والی مختلف قوموں کے متاثر فکر کا مہرہ منت ہے۔ تامل ادب بھی اس سے کچھ مستثنیٰ نہیں ہے۔ جس طرح مسلمانوں نے دوسری زبانوں کے ادب کو اپنی گراں قدر تخلیقات سے مالا مال کیا۔ تامل ادب کو بھی انہوں نے بہت کچھ دیا ہے خصوصاً تامل کلاسیکی ادب

ان کے علاوہ بھی چند ایسی اصناف کا اضافہ کیا ہے جو عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں۔ مثال کے طور پر (۱) مناجات (۲) قصہ (۳) مقالہ (۴) نادرہ وغیرہ ان میں سید محمد عالم کی مناجات مانی گئی، علیہ عرصہ صاحب پوری "میسوب فی قصہ"، قصہ میغوب علیہ السلام، سید محمد آغا درہ پے کی "مژگنہ"، سید محمد آغا درہ پے کی "نور نامہ" نامزد تصانیف ہیں۔

تاکلیسی کی ادب میں غزل کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ غزل سے ملتی جلتی صنف کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ اردو فلموں سے متاثر ہو کر جدید تالی شاعروں نے غزل کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ حرف شنوی، بی اکبر، شعراء کے اظہار خیال کا ذریعہ بنی ہے۔ محمد عرصہ صاحب کی "شہزادہ قاصد" تصنیف "سیرا پرانہ" بھی اسی صنف میں شامل ہے "سیرا پرانہ" دو مختلف زبانوں کے دونوں کامرکب ہے۔ "سیرا" عربی کے لفظ "سیرت" سے ماخوذ ہے "پرانہ" سنسکرت کے پرانی یا پرانہ سے ماخوذ ہے۔ عرصہ صاحب نے متعلق تحقیقات جاری ہیں اب تک ان کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ حرف آشنا معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اجداد جو عرب کے تاجرو تھے صوبہ مدراس کے قلعہ رامنات کے ایک گاؤں "کیلا کرائی" میں اکبرس گئے تھے۔

"سیرا پرانہ" تالی زبان کی بہت ہی اہم تصنیف ہے۔ اس میں حضور صلی علیہ وسلم کی سیرت کے خرد و خال خوبصورت پیرائے میں منظوم مانی گئی تالی زبان میں ڈالیا ملا کہتے ہیں۔

آرٹیکل - آرٹیکل زبان میں ہزار کے صفحے میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی کے برعکس مقالہ کی شکل تالی میں باطل بدل گئی ہے۔ "آرٹیکل" میں سوال و جواب کی شکل میں درجی مسافر پر ہزار سوالی اور ان کے نمونوں جوابات موجود ہیں۔

کے گئے ہیں۔

شعروں میں عرصہ صاحب نے اپنے زمانے کے مشہور ہندو شعروں کو بطور سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

"سیرا پرانہ" تالی زبان کے ایک عظیم شاعر کہیں کی ایک لافانی تصنیف "راہنامہ" کے طرز پر لکھی گئی ہے کہتا ہے کہ اس تصنیف کے لئے عرصہ صاحب کو شیخ صادق اللہ صاحب نے جو اس دور کے بڑے شیخ زمانے جاتے تھے، مواد فراہم کیا تھا۔

کہیں کی راہنامہ اور عرصہ صاحب کی "سیرا پرانہ" میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ کہیں کی اندھی تقلید میں عرصہ صاحب سے وہی علمی سرزد ہوئی ہے جو کہیں نے کی ہے۔

کہیں اپنی "راہنامہ" میں "اودہ پاک" کے ماحول کو پیش کرنے کی ناکام کوشش میں جوڑی ہند کے ہندو دراکے ماحول کو پیش کرتے ہیں۔ عرصہ صاحب عرب کے ماحول کو پیش کرنے کے زعم میں اپنے وطن کے ماحول کو پیش کرتے ہیں۔

کہیں اودہ حیا کے جزائز سے ناواقف تھے اور عرصہ صاحب کو عرب کے جزائز کا علم نہ تھا۔

زبان کے لحاظ سے یہ ادب اور شاعر سپ کے سب یکساں سطح پر نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان بھی وہی ہے جو ان کے اور ہمعصر شعراء کی ہے۔ ان سب نے تالی کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔

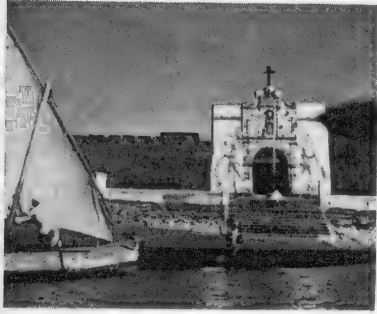
جن شاعروں اور ادیبوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی کئی ایسے ادیب ہیں جو اب تک متعصہ ہندو پر نہیں آ سکے۔ تحقیقات جاری ہے شاید بہت جلد اور کجراں قصور تصانیف دستیاب ہوں۔

گوآ کی جھلکیاں

۱۹- دسمبر ۱۹۵۵ء کو گوآ پر تنگلی سامراج کے پٹے سے آزاد بھارت کا ایک حصہ بن گیا۔



گوآ کے پھیرے



چمن کا قلعہ



گوآ کے مند

بندرگاہ ماراگوآ کا منظر



۱۹۵۵ء میں گوآ کو آزاد کرانے کے لئے سنیہ گری گوآ میں داخل ہوئے تھے۔ گاؤں والے ان کا استقبال کر رہے ہیں۔



گوآ کا ایک لوک ناچ



سینٹ فرانس زیوئر کا مقبرہ



ملایا کے حکمران اعلیٰ اور ان کی ملکہ، جو حال
ہی میں ہندوستان کے دور سے پر آئے



روس کے صدر میٹر پرنٹیف اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ہندوستان کے دور سے پر تشریف لائے۔ استقبال کرنے

غالب پر میلہ اہم مضمون

کمی جاسکتی ہے کہ رتن پرکاشن کا مضمون ہر اعتبار سے سب سے اہم اور سب سے ممتاز ہے۔

یہ مضمون رتن پرکاشن کے ایڈیٹر محمد حسین خاں نے لکھا تھا۔ انھوں نے غالب سے اپنی ذاتی واقفیت کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن غالب کے حالات اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے وہ یقیناً باخبر تھے۔ غالب کی فارسی کی تنقید و تخریج اور ان کی اردو شاعری کی تصدیق و تہلیل سے بھی محمد حسین خاں کو کافی واقفیت تھی۔ ان کی باخبر نظری کا واضح اور ناواقفانہ ثبوت ہم کو اس جگہ ملتا ہے، جہاں انھوں نے غالب کے ”دیوان ربیعہ“ کے مستقیل سے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے بڑے ہرماں افاضیوں کو لکھا تھا کہ:

”بھینے قیاس ہیں کے نزدیک مرزا غالب ایک دیوانہ تھے کے دوسرے اردو زبان پر حکم نہیں چلا سکتے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ چالیس چالیس برس بعد ۱۰۰۰۰ وہ لوگ آج مرزا صاحب کو اردو کا حاکم کہیں گئے، ان کی اولاد ابے شک و شبہ تسلیم کرے گی کہ زبان ربیعہ پر مرزا صاحب کے احسان ہیں اور شیال کی گنجائش اردو میں کس زبردست کلام کے مدد سے پایا بیشت کو بہر پرچ گئی۔۔۔“

(رتن پرکاشن جلد ۲، نمبر ۱۰، مئی ۵، مارچ ۱۸۶۹ء)

جس مضمون کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے، اس کو نقل کرتے سے پہلے ”رتن پرکاشن“ کا جانی ذکر کر دینا ہے عمل نہ ہوگا۔ ”رتن پرکاشن“

غالب کی وفات کے تین دن بعد ”رتن پرکاشن“ رتنام کی اشاعت مورخہ ۵-۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء میں نجم الدولہ و میرا ملک ذوالاسلاموں سالہ نظام جنگ تخلص پر غالب کے عنوان سے (ایک مضمون شائع ہوا تھا جو کہ اعتبار سے اہم اور قابل ذکر ہے۔ غالب کی زندگی میں شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے، ان سے اگر قریب نظر کر لیا جائے تو ”رتن پرکاشن“ کے اس مضمون کو غالب پر پہلا مضمون بھی ہم قرار دے سکتے ہیں۔ ’ احوال غالب‘ مرتبہ مختار الدین احمد) میں سید سوسن صاحب رضوی نے ایک مختصر سا مضمون ’ذخیرہ باگوبند‘ سے اخذ کر کے شائع کیا تھا اور اسی کو غالب پر پہلا مضمون قرار دیا تھا۔ ’ذخیرہ باگوبند‘ آگے کا ایک ایسا اور رسالہ تھا اور یہ مضمون مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت کی یہ تاریخ کا تقابلی اب ہمارے لئے ناممکن ہے بلکہ ہے کہ اوایل مارچ میں شائع ہوا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اواخر مارچ میں شائع ہوا ہو۔ مارچ کے شروع میں اس کے شائع ہونے کا امکان کم ہے۔ رتن پرکاشن ایک ہفتے وار اخبار تھا اور ذریعہ مضمون ۵-۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہی مضمون پہلے شائع ہوا ہو۔ ”ذخیرہ باگوبند“ اور ”رتن پرکاشن“ کے مضامین کی تقریم و تاجروں پر بیشت ڈال کر ان تمام تذکروں پر، جو غالب کی زندگی میں مرتب کئے گئے تھے اور ان دونوں مضامین پر، جہاں کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے تھے، اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بلا غلط تردید

رتنام کا ایک ہفتہ وار دواچاشنی " اخبار تھا، جس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی بوقتِ قحی اور ہندی رسم الخط کے مطابق اخبار پائین طرف سے شروع ہوتا تھا یعنی اردو کے مطابق اخبار کا پورا خری صفر پہنچا جاتے تھا، اور اخبار کا پہلا صفحہ ہوتا تھا، یا موم ایک ہی فردوں نے ان لوں میں بھی جاتی تھیں، لیکن کچھ ایسے مضامین بھی ہوتے تھے جو مرت اردی میں یا مرت ہندی میں لکھے جاتے تھے۔ غالب سے متعلق معنون بھی مرث اعدی میں درج کیا گیا تھا۔ اس کے برابر کے کالم میں ہندی کا ایک دس معنون ہم کو ملتا ہے۔

یہ اخبار ملے رتنام میں مولوی محمد حسین خاں کے انتظام سے چھپ کر شائع و شہرت ہوتا تھا۔ محمد حسین خاں کے حالات کا ہم کو کم نہیں ہے۔ رتن پیکاش کے ایک شمارے میں ریاست رتنام کے حقان سے ریاست کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

" اس نیاز مند کو اینڈلس ہے جس تیر سے اتفاق سیریت کا بہت را۔ اگرچہ بدنامی گرای ہندوستان میں اب وہاں کی کشش سے اتفاق بود پاش کارا۔ ہر ہر لگی وضع اور برتاؤ دیکھنے ہالے کی مال خواہش رہی۔ اب بد پانچ بھر برس سے ملک دکن میں آ پڑا ہوں۔ یہاں اکثر ریاستوں میں نوکری کی۔ کچھ زمانہ حیدر آباد دکن میں وقت کشا۔ تھوڑے سے جمہور کی نگینوں کی خاک چھانی تین برس کے قریب احمدی کے در سے ہیں غالب ملوں کامیاں صفحہ بنارہ۔ آٹھ بیٹھنے کے عرصہ سے حب قریب جناب نیوٹ پرانی ش صاحب ناظم عداوت رتنام اور حب غلب جناب میر شہباز مست علی خاں صاحب بہادر پرنسپل ڈپٹی ریاست رتنام کے یہاں آ پڑا۔ جناب موصوف نے کمال قدر شناسی اور ذرہ نوازی سے مجھ کو ملے رتن پیکاش رتنام کا انتظام سپرد کیا۔۔۔۔۔"

(رتن پیکاش - جلد ۲ - نمبر ۴)

مورخہ ۱۲ - مئی ۱۸۹۹ء)

نجم الدولہ ویر الملک قلاب اسدا لدغاں بہادر نظام جنگ تختہ سے غالب

اعمال الاخبار سے معلوم ہوا کہ جناب مرزا آفرید صاحب غالب تختہ سے پانچ سو وچم فروری ۱۸۹۹ء کو دوپہر ٹھٹھے کی دین وفات پائی اور ہندوستان کے میکانہ شاعروں میں سب سے روشن چراغ محو ہو گیا۔ انھوں کا مقام ہے کہ اس زبردست صاحب قلم کی سوانحہ (دکھن) عمری سے ہم کو تفصیل و ادراکیت نہیں اور نہ اکمل الاخبار سے کچھ مدد ملی۔ گو انھوں صاحب سے اس قسم کی توقع رکھتی بہت معقول اور واجب نظر آتی ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت کی اصل خاندان چشتیہ تھی۔ گو فی الحال تو فقط دوران کے رئیس زادوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ تین ذی بیہر آپس کے بزرگوں میں ذریعہ نام آوری رہی چنانچہ حضرت کے والد ماجد مرکز کارزار میں کام آئے اور فرزند بزرگم سنی کی وجہ باپ کے جینے ہی تو قدرت ہدی کی سعاد سے محروم رہا مگر بیٹی کی حالت میں فرزانگی سے لے کر مشہور تعمیر دین منائی صورت دکھلا کر باپ کے نام کو بچا دے گیا۔

قولہ

زاد ہی کر گشت گوہر میں در جہاں تہیم
ہر بیج ساگی شہام چاکر حضور
باید شہید را ز را میں ان بارگاہ
کافی بود شاہدہ، شاہد عزت
افضل باپ کے سپہبدی سے مرزا صاحب کو پانچ برس کی عمر میں تہیم آؤ پنشن دار بنا دیا۔

آگرہ آپ کا مولد ہے اور دی سکین دل پسند تعلیم کا انتظام مختلف اویسوں کے سپرد رہا۔ مگر حضرت کے نفس نا اطمینان نے ایک بارسی نامی شہر ہرم کے تعلق کو اختیار کیا تو یہاں چنانچہ آپ کے کلام میں جو ماہر اہل بیلیات کے اشارات جا بجا نظر آتے ہیں یہ سب اسی زور شفیق فرزند کی محبت کا نتیجہ ہے، گو ماہر تو پہلے سے موجود تھا۔

انگریزی سرکار کے انتظام نے سپہبدی کو ہندوستان والوں کے لئے
بے فیض اور بیکار کر دیا تھا۔ تو رانی پہلو انوں کے وارث نے زمانہ کی
مزدورت سے تیرنگ کو میان اور علم کو قلم کیا۔ چنانچہ پیشہ دھرم و فقی کی مفاہمت
کا رنج ایک داد طلب رہائی کی صورت میں اس طرح ادا ہوا ہے

قول

غائب بجز زودودہ زاد شتم زان رو بصفائی دم تیغ است دم
چوئی فست سپہبدی ز دم چنگ پش شہر شکستہ نسبا کان تقلم
پھر حضرت نے اگر سے دتی کو بہرت کی اور وہاں کے خوش باشی پر ایسے
فحش ہوئے کہ ہر کی بڑی بڑی ریاستوں میں پیش قرار تو انہوں پر بھی
ولی سے دور رہنا گوارا نہ کیا بلکہ ۱۸۵۷ء کے غلامی جب سب دلی والے
بشر سے نکل جانے تو حضرت اس سرزمین کی موت کے اشتیاق میں ہیں
کے وہیں آئے رہے، اور اس لحاظ سے تیری ہی کسی طرح کا مضر آپ
بہم اظہر کہ پہنچا۔

پشتی کی آمدنی ضروری خبر کو بھی کافی نہ ہو سکتی تھی کہ اس میں
بھی کوئی نئے رشتہ ڈالا اور خیالی شاعر کو چارنا چار ملی دنیا میں اوتار پڑا
مغرم برہما اور حضرت داد خواہ کی حیثیت سے دتی چھوڑ کر گورنر جنرل بہاؤ
کے پاس پہنچے اور اسو بشر کرامت ہر کی مفاہمت کا وہ شواہد
کے حضور میں اس طرح ادا کیا۔

قول

پہر اندوہ بخرو و خرو آفتند بچو خود گواہم کہ ز دلی بچر عووان رفت
ہم بیکر لغت ز کین خدای آفتیشدم ہم دل آندوہ نجہم خورشان فتم
اضطراب آیت پرواز جلاست و است ذہل فتم ازان بقول ہی از جان فتم
کلمتہ میں بیٹے ادا نشان سوسے حضرت کو تاحی ق کیا۔ آپ
مقدمہ لڑائے کے متھے کہ پوری ان سے لڑے۔ گویا دتی کا سنوڑ ہونا
بھی مدت سے فتم میں داخل تھا گو محبوب ہمیشہ عمو دے۔ حضرت نے
فعلائے کلمتہ کے اعراض کا جواب ایک مثنوی میں فاما لغت نام کی
صورت میں پسر اس پر ہیں لکھ کر چھینک دیا اور اس واسی جمعہ کی
حالت میں دتی کی راست بازی اور صلاحیت روی کا خاکہ بیان ملک روا
کہ اس مثنوی میں ایک زحمت رسیدہ تشریف کی صورت سے فرماتے ہیں

قول

نہ ز اور دشمن بیان ترسم من و ایمان من کراں ترسم
گرس از من رسا ہما فی دراز بزبان نامز این حکایت باز
کوشیغہ رسیدہ بود این جا چند روز آرامیدہ بود این جا
با بنرگان ستیزہ پیش گرفت زحمت دادہ راو خویش گرفت
ہم سیفہا نہ شکوے داشت ہم خرابیا نہ ہوئے داشت
ہمک و تیانہ سازد میش بود ننگ دلی و سرزمینش بود
آہ زان دم کے بعد رفت من خون دلی بود بچہ دلی مہی

پس کبنا تلوار مارنے کے برابر ہو گیا۔ حوالی مواہب میں مقدمہ نگار
دیا اور دتی کی عزت کا حامی غالی فاتحہ دتی کو پھرا۔ طرح طرح کی گردوش
و تلخی۔ پھر گورنر جنرل بہاؤ نے خاص دتی میں سات پارچہ خلعت دیا
اور خاتم اسلامیں متلیہ سے تاریخ نویسی کا منصب عطا کیا اور
میان دتی کی وفات کے بعد اپنا دستا بنایا۔ ۱۸۵۷ء کے غلامی
آپ دتی میں رہے اور اپنے غامی روز نامہ سے ایک کتاب لکھتے رہے،
جواب دستہ کے نام سے مشہور ہے۔ فساد میں کے بعد تھوڑے سے دتی
کے لئے رام پور کو تشریف لے گئے تھے، گردل نہ لگا اور والی رام پور
نے محبت اور قدردانی کی راہ سے کچھ وظیفہ دتی ہی میں مقرر کر دیا پشتم
۱۸۶۱ء ہجری آپ کی سال گرہ کا روز تھا اور پانز دھم فروری ۱۸۶۹ء
روز وفات ہو گیا۔ عرق ریب اکھتر برس کے ہوئی اور نزع کی حالت میں
بھی حکیمانہ استقلال قائم رہا۔ چنانچہ آٹھ روز پہلے کھانا پینا سب چھوڑ
دیا کہ روح بہت سہویت اور اطمینان کے ساتھ علیلہ ہو جائے۔
بہت سی کتابیں آپ سے یاد گار ہیں۔ دقیقہ شناسان سخن کے حسن قی
پر ملے لگایا کریں، لیکن اس میں کچھ مشک نہیں کہ حضرت اپنے زمانہ
کے بعد پیدا ہوئے تھے اور اسی وجہ سے دتی ہو کر جڑاتے تھے۔

قول

ہمچہ با شوق تلایم نہ فتر مرگست ہرچہ بولے گوارا نہ بود جان فرست
فانہ از یل سفیدہ بود اربیل بہا آتش از آب بیزد و اگر آب بقا
ایکروں کی بزم کے قائل تھے۔ اکثر کتاب کے بعد میں دنیا کو دیکھا۔
نام جوئی کا شوق ہی حد تھا، مگر میدان بہت ہی ننگ اور ہی قطع کا

نہلے۔ اگر آدمی کا کام عموماً دل کا مزہم قرار دیا جائے تو حرقا قابیہ کے عالی موصوفہ ہونے میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں۔ انسان کی عظمت کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا، چنانچہ ایک جگہ شہنشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں

قوله

بچتم کم منکر کجسب خاک زہ توام کہ اگر وہ دیام میں خلافت گاہ کمال میں کہ بدین غشتر ہائے جان فرسا ہر نیکو کہ بدین ہائے طاقت کاہ مرتی ختم میں یا بیداری فسر ز نلیج میں پوشیدہ شہائے خاطر باخیز غیش زبدہ فروم از اسٹا کہ بودہ ام تھد سے دیر تریاں دگوہ نزول میں یہاں لیر کجنا رو دیت نہلو رسد رسد و پیش سدد و پنجد ستی ز غلظت مرانیاں آہی چہ کئی چون بوی عبد توام ز خوش گواہ کون تو شای دین دین گون گال ز رشت دور نظری و جہد ارشاد جو صاحب قابیہ نے کام سے مرزا نوشہ کا میدان دل دریافت کر کے ہیں یہ خود دیکھ لیں گے کہ حوصلہ کسی پیار پر تھا اور حسرت کس مقدار پر۔ آپ کا دیوان جو مبلغ اودھ : خیاباں میں چھپا ہے برشعی خرید سکتا ہے اس کا دیبا چہ حضرت کے غضب ناظم کی کینیت بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ کس حسرت و درد سے کہتے ہیں :

قوله

باب غدا ؛ درد ناواقی کالا دل را ان چنان فردن نہ گرفتہ کہ تن بہ زوئی درد و دم و دیریں آمد و منت بر خوشی تن نہم کہ یارب پس از من چوں بگرہ سرا یا گفتار گردیدہ بیا فری کا دوارسد کہ دیوار کاں والا سے سختی و رنج یا بیا نہ است و منر شہد کجیاں میں دران فراز شتای بگراست و زدہ بند

شعر

ذوقیت ہموی بر خفاں بجز درد شہد غار دہست ہپا سے عربین انجیل باد آپ کی رزم کا قیاس تو صرف اس استھلال سے ہو سکتا ہے کہ جو ایام قدیمیں آپ کی جانب سے ظہور میں آیا۔ لیکن آپ کی بزم سب دلی دے ملتے ہیں۔ کجما نہ ظرافت شاعرانہ نمک کے ساتھ آپ پر ہمہ تنی اور رزم شمس مذہب کی کہ حضرت ہر طرح سے دیبا ہند کے قابل ہونے

پر تشریح کہ ہندوستان میں شخصی حکومت نہیں اور انگریزی زبان ذریعہ کار قرار پاتی۔ قابیہ نے دیکھا ہی تھا کہ یہ واقعہ کجماں ہو رہی ہے اور فیضی کو وہ جان اور ایک قابیہ کی صورت میں دیکھنا ہو تو مرزا فرشتہ صاحب کا کام فی الجملہ کسی تصویب کا کام دے سکتا ہے۔ اخلاق میں تو افش خریجوں کی خود داری کے ساتھ جتنی اور نام جوئی کا شوق امیرانہ منت کا پابند نہ ہوام کی طرف آپ کا خطاب تھا اور نہ عوام آپ کے کام سے بہت ساختا یا بہت سنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جس شخص کو الفادہ کی شرفی کا اتفاق معنی کی نزاکت کے ساتھ دل نشیں معلوم ہو اس کے واسطے حضرت کے کام میں دل لگی کی دل لگی ہے اور فائدہ کا فائدہ۔ آپ کی طبیعت کا میلان اویں جوئے تکلفات کی جانب نہ تھا جن کی ظاہری بیگن سے جھوٹی امت و اسے اصل صورت کے عیب چھپایا جا چکا ہے۔ اور اسی میں کوہ حوا کا بھی دے جاتے ہیں۔ یہ سادہ موصوفہ پر شاکیں جو غضب کر جاتے ہیں گونا گونا جھوٹے کما لیں گے رہے ہیں صورت میں بگاڑا کریں۔ قوله - نہ ترانہ صرف اتھقام بر لب است و نہ مزہ نہ سلیب و ایجاں مریاں۔ نہ جون مریم بکری است و نہ نقیصہ قاسم برودش، نہ ابلہ پائے جاہد منا ایم و نہ گور کاسے زشتہ بدایح - کیا بکری اتش ہے دود پارسیم و خراب تلخی پیر زور میں آتھن گدہ کا دسیاں بجم را سمندرم۔ سوہنیں ہم از من پرس و گلزار نعل بندیاں پارس را بلبلیم شور میں ہم از من جوی فعد

جب آپ کا مذاق اس قسم کا ٹھرا تو ظاہر ہے کہ عوام آپ سے کیوں کر خوش ہوں اور آپ عوام میں کس طرح راضی رہیں۔ نہ بڑے رفعت و نہ جاسے مازن کا نقشہ آجما۔ قوله - سبز و دامادہ ابراست و گلشا نہ باد - جیون و دستہ بستن کینز صنعت است و پاراں پیشہ درد آری بیکار نشاید نیست - نفس و رشہ بارہ کا شتی است اور باں دردنا نہ و دردوں - و رگ رفت و ہم از خودی بر گزشت شکر غفرت عادت است - و ما اندرین ہنگام مریم ایچھا از خودی می توان مرد

درد ہر حرف غالب پیدہ ام سنجائے سما ز دیوانہ کمر تر سخی خوابش

اگر حسب میرا اچڑا دیا روت سے اوڑھا دیا رہے لیکن اس لمحہ مگر رے وقت میں ہی دس پانچ زبردست نفس ایسے موجود تھے کہ ایرانوں نے ان کے سسڑ کو مانا۔ چنانچہ ایک مرتبہ دربار ایران کا ایک امیردہ میں آیا اور شاہ کے کلاہ ایران فتح علی شاہ قرزی غزل ایک مجلس میں فریڑ بھی اور کرتینا کہا کہ ایران کے شاعروں نے شاہ کی غزل پر غزل نہ لکھی۔ زمین شکل ہے اور فقط قافیہ بندی صحت کی خوبی کے بغیر بے سہی اور اہل بلاغت کے مذاق کے خلاف۔ مرزا غالب اور مولانا جہانگیر نے فریڑ فتح علی شاہ کی غزل کا جواب لکھا اور مرزا آصف صاحب نے اسی جواب میں ایرانی کا کیا یہ جواب کسٹا یہ میں دیا۔

اسے کوئی سخن از کلمتہ سرایان ہم ہرج ماضیت بیا رہی از کم شان
بندرا خوش فغاند سوزد کہ رود یاد و دولت شان مشک نشان از کم شان
موتن و شیرد جہاںی و علوی آن کہ حقیقت اقتدرہ و آرزوہ بود علم شان
غالب سوختہ دل گرچہ تیرد فغانا بست و رزم من ہفتن ہوشم شان
ہر چند بیضے ہاں قیاس کے نزدیک مرزا غالب ایک دیوانی زبانی

کے زور سے اندرون قاف پر حکم نہیں کر سکتے لیکن اصل یہ ہے کہ جب چالیس چالیس برس بعد صبر عمری کا حصار و تعصب اپنے آپ غارت ہو جانے کا اور اردو ہر اچھی صفت، بولی ہے، زبان کا منصب حاصل کر لے گی، تو وہ لوگ جو کہا مرزا صاحب کو اردو کا حاکم نہیں سمجھتے ان کی ہی اولاد ہے شک و شبہ تسلیم کر لے گی کہ زبان زبیرت پر مرزا صاحب کے کتنے احسان ہیں اور خیال کی گمانش اندوہیں کس زبردست کلام کے صدقہ سے پایہ غرور کو پہنچ گئے۔ جن لوگوں کو مرزا صاحب کی اردو میں قافیہ ہے وہ خوب یاد رکھیں کہ زبان داس کے مذاق کی خصوصیت اردو میں لگانا نادانی میں زہیہ اور اسان کا فرق ہوتا ہے۔ بہادشاہ کا زمانہ دینی میں عجیب زمانہ ہو گیا ہے۔ سلطنت کی رزم باقی داری تھی، مگر جس لوگوں سے سلطنت کی بزم کو رونق ہوتی وہ سب کے سب موجود تھے تھیں ہندی، آرزو، دہلوی، امروا مدافن طوی، مولانا جہانگیر، جلیکم موتس خان، شاہ تعمیر، میان ذوق، میر موصوف، مولانا فضل حق یہ سب کے سب مرزا غالب کے رقیب اور رفیق تھے۔ اور اس خسر کا رزم کو دہم بہم

کر گئے۔ دلی کے پارسی شاعروں میں مرزا صاحب کو خاتم اشعار کا لقب اچھی طرح سے عطا ہو سکتا ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ خلفا میں کوئی خلیفہ ایسا نکلتے کہ رواج طرز کے نام کو دینی نہ دے اور دوزخ و رنک اپنا عمل پھیلائے۔ اگر انگریزی سرکار ہندوستانی زبان میں اردو کی کرتی اور ضرورت تھیں سے اردو کو بالنا مندوب دینا پڑتا تو قریب سب لوگ ایسے تھے کہ اردو بولی کو زبان زبیرت رکھتے اور حضرت ملکہ کو گویا کی رعایا کو یہ محبت نہ ہوتی کہ حاکم یورپ کا تقیہ و افعال انگریزی کی تقیہ کے بغیر معلوم نہ ہو۔

جو کچھ مرزا صاحب کا حال ہم کو معلوم تھا وہ تو ہم نے لکھ دیا یعنی ایک روز بپیا ہوئے اور ایک روز مرگے مگر آدمی کی سواخت رکنا، عمری کی تقیہ کے لئے طریقہ مذہبی کا اظہار ضرور ہے۔ حضرت کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ادنیٰ کیوں تھے جو دنیا کو عالم خیال قرائت کے بہرہ و دست کا نقشہ جانتے ہیں اور اس رابطہ معنی پر اعتقاد رکھتے ہیں جو باعث اور بغیر میں تو ہے مگر باعث اور بغیر سے علوہ کچھ بھی نہیں۔

تولد

ہم دیرین فضل کہ سارہ سنہ ی گزرد نکتہ چند سلام ز جو ب و احسان
صورتوں خطوط است و سہوئی صفر صفت حقاقت ہے کوئی زلف و شان
ہستی معنی تیر نہ بیزیر نہ ہزار حرف آلاں کہا کاں از اس صغر و شان
متن گفت کہ میں آچہر آفتاب صورت علیہ از علم شب بدیر لیاں
یہ توفیق و دلت نہ دانی کہ بود خوش موع و گرداب نہ بکی کہ بود جان
عالم از ذات جلا نہ بود نہ بود جلا ہم چو راز سے کہ بود در لقا نہ نہاں
لیکن یہ بھی اس کے ساتھ ہے کہ حضرت مذہب صریح پر قائم رہنے کو بھی ضرور سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ شتر

غالب شان زہل کیش گزشتہ اندر ہے و انھے کہ لغتہ بر اہل کتاب زہ
بعض صاحب مرزا غالب کا بیان طریقہ زہوش کی جانب قرائت ہے۔ خطا
جہانگیر کیا معاملہ تھا، اور حضرت قویہ ہی فرماتے ہیں۔

تولد

کاری عجب افتاد بدین شیفہ مارا مومن بود غالب کا فرخواری گفت

دنیا میں بے عیب تو وہ ہو سکتا ہے جس کا نام مود سے سنو
 کھر آنکھ سے نہ دیکھو۔ طریقہ مذہبی کچھ ہی ہو لیکن اس میں شک نہیں
 کہ بہت بڑا زبردست آدمی دنیا سے اٹھ گیا اور ایک صورت خاص
 میں ہندوستان کو بھی بے چراغ کر گیا۔ شاعری کو بھی اپنا خزانہ بھلاؤ
 دل کی سادگی کو مصنوعی ہنر پر ترجیح دی۔

قولہ

ہر چند میں غم بہ رنگِ خواہی
 دل کی طلبِ دوستی وہ نشئی خلق
 بانیک دہرہ ہر سری رود اما
 لب تشوہوں اندر چہ اعلا چاہا

اُم کہ رہا عی ز غنفل یا ز ندام
 ذوقِ کودمانیدہ و لب سبزہ گفتار
 ترکا نہ زوم زمرہ مدح و ثنائیت
 ایں پادشہ سادہ ز آرائش دھوی
 دودا ز اشعریدہ و بحث و ستیزہ
 در عرض ثنائیت نقسم جوہر سمنی
 سیراب سفام زَم رستمہ کوثر

تاریخِ پستی نشیسم زمعت
 مدحِ کودمانیدہ بدلِ رشیدِ احیا
 در منطقِ اجلاؤ نہ بر مسلک آیا
 دینِ بزرگی پاک ز آرائشِ خوفا
 منظور نگاہِ دل و جان بخش تو بادا
 در بزمِ ولایتِ لقمِ قابلِ شیدا
 گلپوشِ مزاجم نہ بجوم بچے موی
 (دین پر کاغذ)

ما فی القادری

غزل

درد کیوں اٹھتا ہے اسے دل اسے تو کیا جانے

کیوں خفا ہے مجھ پر عسیرہ جو کیا جانے

سے لگو رنگ کی مستی دل خود رشتہ سے پوچھ

جام کیا جانے اسے اس کو سیر کیا جانے

حسن کی پردہ دہی کتنی ہے کیوں فعلِ بہار

چنے غنچے کو ہے کیوں ذوقِ نمو کیا جانے

کون سا جلوہ دیدار منظر آئے گا

آنکھیں کیوں کتنی ہیں اشکوں سے وضو کیا جانے

کلی حق جس بزم میں تری جیسا قاف ماتی

آج کیوں اس میں ہے اک عالم ہو کیا جانے

بچوں کی فلمیں

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کتاب، اخبار، ریڈیو سے کہیں زیادہ اثر پہنچنے کے کردار اور نفسیات پر سینما کا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سینما کے پردے پر دکھائی گئی فحش زندگی بھی دیکھنے والوں کو اور خصوصاً بچوں کو اصلی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال بہت اہم ہو جاتا ہے کہ بچوں کو کون سی فلمیں دکھائی جائیں اور کن فلموں سے ان کو بچایا جائے۔

جہاں تک سنسر کا تعلق ہے وہ اس مسئلے کو ایک منفی طریقے سے حل کرتے ہیں یعنی بعض فلموں کو 'اڈلٹ'، 'سٹریٹیکٹ' دے کر بچوں کو ایسی فلمیں دیکھنے سے روک دیتے ہیں لیکن وہ بھی یہ نہیں بتاتے کہ کچھ دیکھیں تو کون سی فلمیں دیکھیں۔

لیکن دوسرے ملکوں میں براہ راست فلمیں بنائی جاتی ہیں جو خاص طور سے بچوں کی دل چسپی اور ان کے فائدے کے لئے ہوں۔ ان میں ایک تو تعلیمی فلمیں ہوتی ہیں جو ایک دل چسپ طریقے سے بچوں کو تاریخ یا جغرافیہ یا سائنس بڑھنے میں مدد دیتی ہیں۔ موجودہ تعلیمی رجحانات کے مطابق ہر اسکول میں ایک پروجیکٹر کا ہونا اتنا ضروری ہو گیا ہے جیسے ہمارے اسکولوں میں بلیک بورڈ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

بچوں کے لئے ایسی تعلیمی فلمیں ہمارے ملک میں اب تک باقاعدہ طور سے نہیں بنیں۔ صرف بعض اچھے اسکول دوسرے

ایک مشہور متدوستانی فلم پروڈیوسر سے پوچھا گیا۔ "آپ بچوں کے لئے فلمیں کیوں نہیں بناتے؟" انہوں نے اس سوال پر بڑے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میری تو ساری فلمیں بچوں کے لئے ہی ہوتی ہیں۔" ان کا مطلب تھا کہ ان کی سب فلمیں بچکار ہوتی ہیں یعنی یہی ہوتی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں، جن میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس کو سمجھنے کے لئے کسی خاص کچھ پوچھنا یا سوچنا محسوس کی ضرورت پڑے۔

دس برس ہوئے ملی ووڈ کی فلموں کے بارے میں ایک جانے بوجھے امریکن فلم کریٹک "نے کہا تھا کہ ان کی ادنیٰ سطح بارہ بیڑہ برس کے بچوں کی سمجھ پر چرے زیادہ ادنیٰ نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے تو گھٹیا فلم کہ بچوں کی فلم کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر بچکار فلم نہ تو بچوں کے لئے دل چسپ ہوتی ہے اور نہ ان کے لئے مفید ہی ہوتی ہے۔

ان میں بہت سی فلمیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کو دیکھنے سے بچوں کے دل اور دماغ بھر پور اور کبھی کبھی بڑا خطرناک اثر ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ فلمیں جن میں بڑے بھیا نک میں دکھائے جاتے ہیں یا وہ فلمیں جو خون، قتل، ڈکیتی اور دوسرے جرموں سے متعلق ہوتی ہیں۔

فلوں کی تعلیمی فلمیں ملنا کر بچوں کو دکھاتے ہیں اور ان کے پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر مل کر کہتا ہے کہ بچے بڑے شوق سے ان فلموں کو دیکھتے ہیں اور اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ لیکن یہ فلمیں دوسرے فلور کے مزدوریات اور ان کے ماحول کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔ عام مہتر و شوقی بچے خصوصاً وہ جو چھوٹے قصوں اور دیہات میں رہتے ہیں ان کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں نہ ان سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے مرکزی اور صوبائی عہدہ تعلیم اس طرح پوری توجہ دیں اور اپنی نظریاتی میں اچھی تعلیمی فلمیں بنوائیں اور ہر اسکول میں ان کو دکھانے کا انتظام کیا جائے۔ کم سے کم ہفتوں کے ہر اسکول میں ایک چھوٹا سینما کا پروجیکٹر تو ہونا چاہیے۔ جہاں تک گاؤں کے اسکولوں کا تعلق ہے وہاں چلتی پھرتی سینما گاڑیوں کے ذریعے ان تعلیمی فلموں کو کم سے کم ہفتے میں ایک بار دکھایا جاسکتا ہے۔

لیکن بچوں کو تعلیمی فلموں کے علاوہ تفریحی فلموں کی بھی ضرورت ہے۔ ایسے فلم جن کو وہ دل چاہی سے دیکھیں جن کو وہ لیکر ان کو مزہ اچھی آئے اور جن سے وہ کوئی اچھا سبق بھی حاصل کر سکیں۔ ایسے فلم بنانے کی ہمارے ملک میں بہت سی کم کوشش کی گئی ہے۔۔۔

مثلاً رام صاحب کا پروڈیوس کیا ہوا اور نوجوان ڈائریکٹر رام گپتا نے کاڈرٹ کیا ہوا فلم ”چھوٹا اور گلیاں“ جس کو کچھ برس پہلے بچوں کی بہترین فلم نامی تھی۔ تو بلا لیکن اس کو دکھانے میں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کا وہ حقدار تھا۔

مشکل یہ ہے کہ عام سینما کے مالک صرف وہ فلمیں دکھانا چاہتے ہیں جو بڑوں، بچوں سب کی دل چاہی کی ہوں۔ ان کو صرف بچوں کی فلمیں دکھانے سے کوئی دل چاہی نہیں ہے اور نہ بچوں کی فلمیں دکھا کر وہ اتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے بڑوں کی فلمیں دکھا کر۔ اس لئے بچوں کے لئے فلم بھی سمجھ رہی جاتی ہے تو اسے دکھانے کے لئے سینما والے تیار نہیں ہوتے۔ اس سے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ہفتہ اور بڑے قصبے میں کم سے کم ایک سینما ایسا ہو جو صرف بچوں کی دل چاہی کی تقویریں دکھاتا ہو اور جس کے پروگرام میں ماں باپ اپنے بچوں کو اس ایڈمٹن کے ساتھ

بیچ سکیں کہ وہاں جو فلم دکھائی جائے گی وہ سچ ان کی دل چاہی اور ان کے فائزے کی ہوگی۔

سرکاری مدد سے ایک پلانڈرز فلم سوسائٹی بنائی گئی ہے اور اس سوسائٹی نے کئی فلم بچوں کے لئے بنائے ہیں جو میں چننا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی تک اس سوسائٹی کے بنائے ہوئے فلموں کو دکھانے کا بھی پورا انتظام نہیں ہے۔ فلم تو بن جاتے ہیں لیکن برسوں گزر رہے ہیں ابھی ملک کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بچے ان فلموں کو دیکھ نہیں پاتے۔

اس سوسائٹی کے لئے میں نے بھی ”عید مبارک“ کے نام سے ایک چھوٹی سی فلم بچوں کے لئے بنائی تھی۔ اس کا سکرین پلے مشق پریم چند کی مشہور کہانی ”مید گاہ“ کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹے سے بچے اور اس کی دادی کی کہانی ہے۔ مجھے اس فلم کو ڈائریکٹر کرتے ہوئے بڑی ہی مسرت ہوئی۔ مہتر اس لئے کہ مشق پریم چند کی کہانی بہت ہی خوب صورت اور انسانی جذبات سے بھر پور ہے۔ اور اس کی بنیاد پر اسکرین پلے لکھتے ہوئے آخر مرزا صاحب نے پریم چند کی کہانی کی خوبصورت کو تا تم رکھتے ہوئے اپنی طرف سے نئے سین بن چھائے۔ وہ بھی خوب تھے اور پریم چند ہی کے خیالات پر مبنی تھے، جیسے وہ سین جس میں عید کے دن ایک گواہ دادی سے دودھ کے پیے نہیں لیتی اور یاد دلاتی ہے کہ دیوالی پر دادی نے بھی تو اس سے سلائی کے دام نہیں لئے تھے اور اس طرح

ہمارے گاؤں کے سماج میں جس بھائی چارے سے مہتر و مسلمان رہتے ہیں اس کی جھلک بڑی خوب صورتی سے دکھائی ہے۔ کہانی کے علاوہ میری خوش قسمتی سے اس فلم میں مرکزی کردار کرنے کے لئے مجھے ایک بہت ہی اچھا عجب مل گیا تھا۔ جس سے کام لینا آسان تو نہیں تھا مگر بہت دلی چپ ضرور تھا۔ دراصل کسی بچے سے فلم میں اچھا کام لینے کے لئے ڈائریکٹر کو خود بچہ بننا پڑتا ہے تب تکہیل کھیل میں مشکل سے مشکل سین چلیں میں ہو جاتا ہے۔

ہمارے دلش کے بچوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے
 بہرہ دان منزلی جو اہل ہندو بچوں سے اتنی محبت کرتے
 ہیں اور ان کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش
 کرنے کو تیار ہیں۔ تب ہی ان کی سالگرہ کا دن سارے دلش
 میں بچوں کا دن منایا جاتا ہے۔ اس برس میں امید کرتا ہوں
 کہ اس شہدہ دی پر نہ صرف ہمارے دلش کے بچے، چھیلیں

دیکھ سکیں گے بلکہ آئندہ کے لئے ایسی تدابیر اختیار کی جائیں گی
 جن سے ہمیشہ بچوں کے لئے اچھی، دل چاہی اور مفید
 فلمیں بنائے اور دکھانے کا مستقل انتظام ہو جائے گا
 اور تیرے فلموں کو نہیں بلکہ سب سے اچھی فلموں کو
 ”بچوں کی فلم“ کا درجہ دیا جائے گا۔

خُذ قُرْبَتِي

غزل

چھاگئی گنگوہر بدلی جھوم کر بادل اٹھا
 تشنگی پیاسوں کی زاہد کچھ تو بھنی چاہیے
 تیس کے آنسو تھے یا پچھلا ہوا سونہرے
 اسے برس ہی اب بھی مٹ سکتا ہے ایچ آن کا فرق
 یہ تو کوئی ناہی پڑے گا یہ تو ہونا ہے مزور
 پیسے ہے گھوسے کے بھی دن الٹ دیتا ہے پلٹ
 رات اندھیری راہ ناہموار، منزل دور تر
 آج ہر طرف مزارِ غارت بائٹ ہے
 محنت بیت بدل، ساغر اٹھا، بوتل اٹھا
 میں مرا جی ماتھے میں لیتا ہوں تو چھانگ اٹھا
 آگ محسوس کی سارا بیباں جل اٹھا
 شیخ زمزم ماتھے میں لے اور تو گنگا جل اٹھا
 تو باطل زلیت اپنی آج اٹھا یا کل اٹھا
 ہو گیا جنگل میں تنگ جب کوئی پاگل اٹھا
 دہر و ہستی احوال تیرے کر مشعل اٹھا
 چاہے جس کا عرس کر چادر چڑھاندا اٹھا

ہوئی کس قدر ذہانت ہم نے دنیا میں زندگی

پھینک لے چاکر کہیں اس کو کھڑا ہو چل اٹھا

حتو خاں

بیل چٹکی، گو گھرو اور نیت کے سینے ٹانگے پر چھو بیٹھے اور سال سال پر
شقت و ریاقت کرتیں اور غیہ دیتی، مری و مگر ڈنگرے اور جال کے
وہ وہ ناو اور دلطف نمونے پیش کرتیں کہ سبھی اللہ! تب جا کے کہیں
جوڑا تیار رہتا، جو دو ایک بار پہن کر تو شغافے کی ذہنت ہی جاتا اور
پھر کسی جدید صنعت کی تیاری شروع ہو جاتی

حتو خاں بازاری سے گیات کے لئے سودا سلف لاتے اور ڈیڑھی
پر حاضر ہوتے واسے تاجروں، متاعوں اور دیگر اہل حرفہ کی ہنگامی اور
بجرا عرض کر کے ان کا مال برائے ملاحظہ و انتخاب مقرر میں پہنچاتے اور
سودا گروں سے شروع دستور لے کر کے اسی مناسبت سے اس کے
حسن و طرح پر تنقید کرتے، غرض کہ اسی خوش دہی اور خوش گزرائی میں
ان کے آقام بسر ہوتے، تاہم اگر اقبال و درون اور خوش گزرائی گارنے
وہ ڈیڑھیاں سوئی اور بدیل کر دیں اندھ سر کا بیڑا!

حتو خاں اپنی زیرہ بیچ پر چار سو سہارے بی بی مٹائی کوئے اپنے
دلن و بافت ابو سرا کے آئے جو او دھ کے قیوم دارا سلطنت شہر
قیس آباد کے مضافات میں شرفا کی ایک چھوٹی سی بستی ہے تا حیات
بی مٹائی اندھ اپنے آبائی مکان میں رہے، اور جو کچھ اندھ خیر تھا اس پر
بسر اوقات کی، مٹائی کی رطبت کے بدتر ہائی سے گھبرا کر گاؤں کے
زمیندار میر صاحب کی ڈیڑھی پراگتا اختیار کر اور وہیں سے
سفر آخرت اختیار کیا۔

بیستہ قد کے مخم سے آدمی، مرغھار مرغھ؛ ہونٹوں پر پان کا لاکھا،
آنکھوں میں شوقی اور زرافت کی چمک، سر پہ لمبے بالوں کے گنگناہنی
پٹے، دھوپ چھاؤں کا مزہ دکھاتے، شہری شہزیب کا کرتا، سبز مشرو
کا گھٹنا، سیاہ مڑا کے کی گڑھی پہنے والے ان میں گھڑے سکرارے ہیں،
ان سے ملے یہ ہمارے حو خاں ہیں۔

عمر کا بہترین حصہ تو آجین اور بیگات گھنڈی سرکاروں میں بسر
ہوا۔ مشرقی تہذیب و تمدن کی اس اجڑی ہوئی مٹلی کی یادگار، جس کے
نقوش اب قریب قریب مٹ گئے۔

حتو خاں اگر چہ مکتب میں کر سب، مامیتان کے درس سے
آگے نہ بڑھے، مگر گھنڈی کی فیض بخشید سے اپنا دامن بستر
ہونے، تیز طرار، کڑھے ہونے انسان، گھنڈی کی ڈیڑھیوں اور
عمل سراؤں سے تازہ زندگی والہ بیستہ وہ کران کی شوکت و شہرت رفتہ
کی شام یا بزمِ شمس دیکھے ہونے، اپنے وقت میں دربان و معمار
سے تکرار و تکرار اور خواجہ سرا کی ہنگ کی خدمات انجام دیں۔

ان کی بیوی افسری خانم؛ عمل سرا کے اندر مٹائی کی خدمات
انجام دیتی، وہ بیگات اور عمدتات عالی مقام کی پیش دست قیس،
خصوصاً ان کی پوشاک کی تراش و تراش، نئے قسمنے انداز و اسلوب
سے اس کی سلائی، آراستگی اور زیبائش کا کام انھیں سپرد تھا۔ ایک
ایک باج سے دو چٹکی حاصل تیار کی، اور ان پر مسالجات چکا، چٹھا

وہ ہمدرد اور ماضیت ستیم کی ایک مہیا جانچ پاؤ گا کہ
حقہ ان کا سال وقت مزاج لطیف اور حاضر ہی حق کے ساتھ خوش خیل
اور خوش فکر ہیں۔ یہ ہر ہوتا۔ وہ محل نور و نغمہ کی صحت آگیاں یاد سے
سامعین کے دلوں میں ایک پرمزہ رومی کی، ایک معزز لذت و رو
پیدا کر دیتے۔ وہ حق کے پڑے پرستار تھے، فرشتے، حق ہمیشہ
لافت پرست ہے، وہ جہاں اور دین حال میں بھی ہر ایک دل سے
ہرے نیا زکا کا طالب ہے۔

در معققت نظر آؤ وہ ہفتے ہفتے والے آدمی تھے، جس حق
میں بیٹھے اپنی طاقت لسانی اور جاوہر بانی سے اس پر چھاجاتے اور
اس میں زندگی اور تازگی کی ایک ہر دواد بیٹے۔ حاضر بیان کی بلکہ خیل
کے علم سے سمجھ ہوجاتے ہر فرد و ہر بزرگ، ان میں پیو پیو کر اس
قسم کی دل چسپیوں پر آمادہ کرتا، چھوٹے بڑے کیساں ان کی شینہ بانی
اور ان کے طرز ادا سے محفوظ اور مسرور ہوتے۔ کہیں فرنگی بول چال
کی نقل ہے، انگریزی انداز گفتگو کا ہو، ہوسوی صوفی چر آتا رہا جاتا،
تو کہیں کوثر سے۔ علمی ہوئی، گیاتی زبان میں دیار سمنوری کی جاتی۔ سنبل
و ریحان سے زیادہ تازک اور لطیف کٹائے، کوثر و سیلی سے زیادہ
صاف اور رواں لیس ت۔ کہیں شمس خانہ ویرنا بکے اہتمام کی منظر کشی،
تو کہیں گیاتی کی انتہائی سادہ لفظی اور معصومیت کی مثالیں اور ان کے
صنوار اپنی فرد حساب کی پیشی کے مرتھے، کہ تو بول میں دس روپے میں سے
مجھ دور روپے کی بالائی مرغی اور دور روپے کی بالائی دالے کو دسے۔
دور روپے کی شیاں ہیں اور دور روپے ان کی تیار ہر برعت ہوئے، بغیر
دور روپے کے بزرگات، درگا، حضرت عباس ہیں نیاز دلا کر نفع راد اور
سایہ کو قسیم کرے۔

ان کی تشبیہات کی ثمرت دتا نگاہ اور چھوٹے پن سے سامعین نشتر
من جاتے۔ وہابی کی فطرت عینیت اور جہت الہی میں بیان کرتے ہوئے
غیر امام ہادہ صحنی کا یوں ذکر فرماتے، کہ اھمعت اللہ دے نغمہ حسین
ہیں جس قدر آئو ہوا ہے تھے امام ہادہ اھمعتی ان میں سے صرف ایک
آئو ہے جو میں قبول سے مجید ہو کر ہر شہزاد میں گیا ہے، یہی صحنی شاہ کے
زہد و ریاضت کا ذکر کرتے ہوئے یوں چر افشاں ہوتے کہ حضرت نعل سبحانی

نے ہمیشہ قوبورق کا خواب، کچھ کر اس کی تمثیل امام ہادہ حسین، آباد
کی صورت میں تیار کرنا ہی حق جو اپنی لطافت و پاکیزگی کے اعتبار سے سلوم
ہوتا ہے کہ انسانی فاقوں سے نہیں بنایا گیا بلکہ اس نے ہر قدرت سے
مثی ایک فوش نما پھول کے نشوونما پائی ہے، جس کے متغ و تغد میں
نہ معلوم تھے، یہ چین دون کی دھڑکنیں اور اپنی ہی ہوتی ہیں جو
یوم نشور کو قلب مومن کا وسیلہ نجات ہوں گی۔

بکھی شب، ماہ میں کد میں بیگات کے گل گشت کی قصو پر میں
کھینچے۔ کہ وہ خرام تازا جس سے موسیقی کے بہترین نغمات سیکے جاسکتے
ہیں، اور ہر سیمی پر چاند کی شفاف روشنی کے، الکاس کا در لہسی
نظارہ، ایسا معلوم ہوتا کہ موتیوں کو کہنتی خراب میں علی کر کے
فرش مرمر پر پھیلا دیا گیا ہے اور چاند نے اپنی جلی سے سارے عالم
کو غرق تویر کر دیا ہے اور فطرت اس دریا سے توڑیں نہا نہا کر
نچر رہی ہے۔ ہنر کے پانی پر کھول اور اس کے صفت لفظ ہے اس طرح
پڑے وٹ رہے ہیں تیس کس پر، کا، ٹوٹ کر سیلے آپ بکھر
گیا ہو۔

بکھی اپنے ہمدردانہ دروہان کی یاد اور علی سرا کی گیز گشتی سے
اپنی چھڑ چھاڑ اور شراؤن کا ذکر کر کے اس لطف سے اس کا سراپا
کھینچے کہ غلام گردش میں چھپ کے چھپے سے "باؤں" کر کے جوا سے
ڈرا دیتے اس کے ہوں سے جنس شلہ و تکلم کہہ سکتے ہیں ایک پیچہ نعل
جاتی اور عالم اضطرار ہیں اس کے گیسو کھل کر انہوں پر اس طرح بھسور
جاتے جیسے عیارہ حروں میں کوئی روشنی دل آویز شا عراذ نیل نہاں ہو
اور پھر حقیقت حال سے مکا ہو کر جب وہ سکراتی تو اس کے ہوں کام
دلوں کے لئے زید سر رہن جاتے۔

اگاز کے زیر و بوم اور طرز ادائیگی اور بے ساختگی سے وہ اپنے
نمودار کی خود جہم تصویر بن جاتے، اپنی مخصوص ہیئت کڑائی اور
اعضا و جوارح کے فشار و انتشار سے جب دل خواہ فنا کی تخلیق
ان کا ادنیٰ شرمش، وہ ہنسا اپنے ڈرامہ کے ہر نمودار کی تمثیل وہ خود
بن جاتے اور اپنے الفاظ سے وہ منظر کشی کرتے جو آدمی آپ درنگ
سے بے نیاز اور بے غلو بالا ہوتی، وہ اپنی عقل کے ہر گویا کو غاموش اور

ہر ناموش کو گویا تاجیۃ اور گویا افسنت و درجہ میں بدل جاتی ۔

حروس ابلا و گھنٹو کے اس چھوڑ رنگ و شباب میں فنون لطیفہ کا خدایا عام تھا۔ ہر کہ دمہ قدر دالیں نہ تھا ، حشوشاں بھی مرہیق کے بڑے دلدادہ اور سبیلہ کے محفل و سرود میں تریں ان کی پوئی پوئی پڑنے لگتی اور وہ اس دنیائے آپ دہ کی بے و درگی نشانی دنیا میں پہنچ جاتے وہاں سلطان کے سوا کسی آپ و تہود کی حد بندیان نہ تھیں جو جاتی ہیں۔ جس طرح ہی کھول کر وہ ایک محفل کی شان سے نہی کی داد دیتے ، اسی طرح اپنی کھول پر وہ ہیں برہمیں بھی ہو جاتے تال و شری خفیفہ کے ہونے ان کے سامنے لطیف پروا رہتی اور مقرر پڑنے پر وہ بڑے سے بڑے کلاؤنٹ و موسیقار کو نغمہ دیتے ہیں نہ پڑھتے۔ رنگ رانی کے اصل روپ اور حث سے وہ بڑی آشنائے اور ایک فن لاری حیثیت سے اس پر منتیرو تبصرہ الکا محبوب شغل تھا۔

گھنٹو کے ایک عظیم الشان تاریخ جیلے کا مال وہ بڑی حسرت اور بڑے چاڑ سے مرے سے کہ بیان کرے کہ حضور ! اچھی کوئی پانچ اوپر دوپہی سال کا ذکر ہے چوک میں ہوا آٹھن کی چودھراں ماہ منیرہ بدو منیر کے یہاں جو عرب عام میں تھا اور اچھے کے نام سے مشہور تھیں ان کی فزائیدہ بچی رنگ و منیر کی سالگرہ کا جلسہ تھا ، جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر کے مشہور خانے ، نامور بچے اور ساز کا رہو تھے۔ برادری کے ناتے سے اس تقریب میں فن کاروں کا ایسا زہرہ دست اجتماع تھا جو اس سے پہلے سر دین گھنٹو پر کسی جگہ نہ دیکھا گیا تھا۔ اگر ایک طرٹ لگتے والی گوہر منہ انجمن ہی ہوتی تھی تو دوسری طرف بیٹی اچھے پور ، الجا اور بدو بدو و بچہ کے مشہور خانے اور گویا اور دینی محفل تھے۔ چودھرائی کے ساتھ گھنٹو کے دیگر فن کاران آدھا بچے ، بھونے والی جیدہ ، جلی خوشید ، ملکہ حنیوان ، بھوی جان اور استاد کا لکا و بندادین ، خوشید علی خاں اور نجیر الدین خاں دیگرہ خرائیں میر باقی بڑے خلوص اور تپاک سے ادا کر رہے تھے۔

جلہ شبان روز تین دن تک قائم رہا۔ اردو م کیش کے خیال سے چودھرائے اٹلا گونڈی کی رفاد عام والی عادت میں جلسہ کا انعقاد کیا تھا جس میں علاوہ دس بارگہ کے ہماروں کے قیام کے بھی کافی

گنجائش تھی۔ تو آجیں ، راجگان اور نغمہ دانوں کے کوشن خانے کے کوشن خانے ڈھل اٹے تھے۔ بیش قیمت شیشہ آلات ، بھڑا فانس ، دوی ، ابرائی قالیوں ، کارچی مسندوں اور رنگ پر دلوں سے ساری عمارت چمک رہی تھی ، کراٹش و اہتمام کا سلسلہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ کسی برادریش نے بیچ کا کٹا روپا کر زنگیوں کا جلسہ ان کے سرکاری مکان میں ہونا چاہی سہی داد ! "مجھے چشم زدن میں سارا کیا دھرا کارت ہو گیا ، انجمن کے سکرٹری "سکرٹریوسف ہاسٹل" سے اس باب میں کچھ بیچ بھی ہوئی ، جنوں نے ادا جلسہ کی اجازت دے کر لید میں بدھدی کی تھی۔ طرانت و امرت بے جا کو مارنے لگی حقت ! اس میں شہری موزن چودھرائی کی ذلت و سبکی کا پہلو مل گیا ، بس غنیمت ہی تو ہو گیا۔ فاولن اللہ شیلے نے جلسہ گاہ کے لئے اپنی محل مراش خالی کر دیئے کی پیشانی کی ، ادھر چن کر موزن چوہریوں اور کستور گون نے اپنی کوشیاں ہانوں کے قیام کے لئے خالی کر دیں ، بالآخر پیش منوس رفاد عام کے بجائے چودھرائی کی بارہ دی چوکھی میں منایا گیا۔

پورے چوک میں گول دروازے سے تا بہر کی دروازہ سالانہ سیرتوں اور بندن دانوں سے راستہ کیا گیا جا بمانش عراب اور گلی پوش چھانک تیار کر کے ان پر فوٹ خانے قائم کے گئے ، جن پر شہنائی فزائیدہ فن کے کمالات دکھا رہے تھے۔ بریشی قشوں اور قشوں سے سارا راستہ بختہ فزائی ہوا تھا ، راستہ میں ہانوں کی فشن پاکی ، ہوادار ، محافلے اور کھ پال کا تانہ بندھا ہوا تھا اور کہاںوں کی ہٹو بچو سے کان پڑی آواز سنانی نہ دیتی تھی۔

جلہ کی بارگہ اور اس کے اندر گئے نوتراؤوں میں فزاول کا سبب تعارف مجب تو تم پیدا کر رہا تھا ، جا بوقت مجبوں میں عود و صندل سلگ رہا تھا اور بھول والی کی ساری متاع رنگ بو ایوان و بارگہ محفل پر شاہی گئی تھی۔ اسلوسی ایوان میں داخل ہوتے ہی نگاہیں ادھی ادا تانی کے ایک مسند میں غول زن ہو جاتیں۔ وسط بارگہ فارس کے پانی میں رنگین روشنیاں اس طرح شکس ہو تیں گویا فوس قرع کو پارہ پارہ کر دیا گیا ہے اور ایک دریائے نور و عجبی لداں ہے۔

اس سقز بیب میں لکھو کے کاٹھنوں کے سوا کھلکے والی کو ہر آدمی کو ہر
 منی جان، ڈیرو اور کھلک، علی گڑھ کی ڈاب پٹی، دلی کی کوہ پرتاج، ڈیرو میں
 اور غور شید، بنارس کی برادری و لاجپتی، اندھا کی چھین چھسری،
 پیڑھ حکیم آباد کی مشتری اور منس بالہ، اندھوں کے صاحب، اردو کے
 استاد فیاض خان، گروا ہار کے کھانڈے رائے، اور علیکم الدین خان، اور مہر
 کے بندہ من، فرنگہ کام نام تک سمنے سے جا ہیں سارے ہندوستان کے
 نامی لوگ، کاؤنت و عسیتا رہنے پنے کے جوہر و کمالات دکھانے کے لئے
 جیتے۔

ان کی روایات کی عظمت و بے کا دار و مدار تھا۔

بہرہ رہے تھے۔

مفضل بن قیس کی جگہ بھی باقی رہی تھی۔ نامور راجگان و قلعہ داران اودھ، فوجی اور شہزادگان کے سوا رؤسا و عامین شہر بہ تعداد کثیر رونق افروز نہ ہوئے۔

فصل رقص و ننگاری میں استاد کلا و بنیادین کی شاگردی راہنمائی و اداکاروں نے وہ سحر آگین سانس پیدا کر دیا کہ حاضرین بزم سحر ہو گئے۔ عالم رقص میں ان کی گرہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ مرہمیں جن میں شراب اور خواف جبری ہوئی ہے۔ ان کے رقص کا ہر دائرہ قوس قرمز نظر آتا۔ ان کی لٹائی پانچویں کے ٹھونکرو اپنی جینا کلا سے روح کو مرتعش و جھنجھک کر رہے تھے۔

صد آرزو اور افغانوں کے تالیم میں بلاخرہ استاد کلا و بنیادین کے فن رقص و ننگاری کے شاہکار یا حریف آخری صورت میں رونق مفلح بن کر بیسے کمال فن کی نمائندگی شروع کی۔ بنیادین بہت رقص سیاحتی کا ایک بیکر تصویر بن گیا اور کلا اس کے نازک و لطیف کنایات پر غزل خواں! اس کی مشرق رقص و کنایات بجائے خود ایک مرتع غزل بن جاتی۔ وہ قلم

کے کنایات کی تفسیروں کرتا جتنوں پر نقشہ ملاحظہ ہو!! نقاشی ازل سے کیا عالم تصویر بنایا ہے، وہ تصویر!! جس میں مصور نے اپنے مرقم کی مناسم جالی بن کر ان کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ دامن نقاب جلوہ بے حجاب زیادہ دل کش اور نیم نکلی نگارہ بے حجاب سے زیادہ ہلک سوتھی ہے۔

ہنگام رقص گھر گھر کی آواز پر وہ قدرت کہ جتنے ٹھونکرو کھڑے اتنے ہی بولیں، ایک خزاں کا وہ عالم کہ بتائے پر سے رقصاں گزر رہا محال کیا کہ ایک بتائے بھی چھوٹے۔

سارا جوان طرب شائقین کی دادرشیں سے گونج رہا تھا، ہر طرف صدائے مریحہ کھان اللہ بلند ہو رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے ایک ایک خواب ہے، ایسا خواب جس میں جنوں کی عمرت نہاں اور بنی بی دل چٹا ہو کر اس خواب نوشیں سے کہی ہیرا رنہ ہو۔

عزیز کھٹواں بجائے خود ایک مستغرق نگارہ بن گئے۔ غم فردا کی کورٹوں سے پاک، جس سے ہر مرقم کی سیری و آسودگی ہوتی تھی اور مشرقی تہذیب و تمدن کا ایک ایسا مرقم تھے جواب ہر شاخ و فن ہو گیا ہے اور جس کے اب نام لیا بھی باقی نہیں رہے نام اللہ کا!!

کثیر منسی انقلاب کے دروازے پر

گزشتہ چند برسوں میں ریاست جمن و کثیر نے منسوق لٹا سے جیت انجمن ترقی کے کئی ایک نئے نئے منسوق کارخانے قائم کئے گئے اور پرانی منسوق کو دست دی گئی۔

نئی منسوق کو پرائیویٹ سیکڑ میں کافی فروغ ملی رہا ہے اور حکومت کی طرف سے کارخانہ داروں کو کافی سہولیات دی جا رہی ہیں جن میں مالی ایسکریل اور کارکننگ ہوئی ہیں پرائیویٹ سیکڑ کی ترقی کے لئے حکومت نے بجلی، زمین اور پانی ایسی سہولیات ہم پہنچائیں تاکہ وہ ریاست میں زیادہ کارخانے نکلیں۔ ریاست میں منسوق ترقی کا جائزہ لینے کے لئے حکومت نے ایک انڈسٹری ڈویلپمنٹ بورڈ قائم کیا ہے اس کے علاوہ ایک انڈسٹری ایڈوائزری بورڈ قائم کیا گیا جس کے ممبر گروہ کارخانہ دار ہیں تاکہ وہ حکومت کو منسوق ترقی کے میدان میں مشورے دے سکیں۔ کھجور میں دو سو فیصد پکڑا پختہ کی ملیں جن میں ایک لاکھ ۷۲ ہزار ٹکڑوں کی قوت موجود ہوگی۔ اور پین وینٹری کا سامان بنانے کا کارخانہ بھی حکومت اور پرائیویٹ ادارے کے اشتراک سے بنایا جا رہا ہے۔

حکومت کا فہم بنانے کے دو کارخانے قائم کرنے کے مستحق خورد غرض کر رہی ہے جس میں ایک کثیر کی وادی میں ہر گا اور دوسرا صوبہ جمن میں قائم کیا جائے گا۔

آرٹسٹ ہمنگوسے اور اُس کا فن

کے معلوم تھا کہ یہ ناموری اس کے لئے کافی نہ تھی اور وہ ایک ادیب اور خطہ نگار بن کر چلے گا، مگر محنت اور مشق کو گویا بھٹے جو اچول کو بدل دے اور بچا تلوار شاہ بھی غلط کر دے۔ لوگ اس کو مرو میدان ہی سمجھتے رہے۔ اور یہ وادی موت کا بہرہ بھی نکلا، ایکس اس کی تابانیوں کا ایک نیا ستارہ اچھی طرح ہونے والا تھا جس کی روشنی میں اس کا اصلی چہرہ نکلا اور وہ تلوار سے زیادہ قلم کا مصنی ثابت ہوا۔

اقدار کے دن علی الصباح گرجوں میں عبادت کے گھنٹے بج رہے تھے۔ اس وقت اس کے گھر بھی ایک گھنٹی بجی، اس کے ہاتھ کی گھنٹی بھٹی۔ وہ اپنی شکار ہی بندوبست صاف کر رہا تھا کہ موت آچنی۔ اس نے بھی بار موت کو دیکھا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ بالکل اجنبی تھی۔ اس نے آتے ہی داڑی پر بچھا۔ اب ہلست کہاں تھی۔ بندوبست کے منہ سے گولی نکلی اور یہ ڈھیر ہو گیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس مہاد کی موت خود اپنے ہی ہاتھوں ہوئی۔

تینشہ بڑ مرزا سکاگو کی مسد

مرگشتہ شمار رسوم و رواج دیتا تھا

وہ طبیعت کی آفتاب اور دل کی گلی سے عبور تھا۔ اس نے ناموری بھی حاصل کی اور نہرت بھی دیگی۔ یہ اس کی شجاعت اور بہادری تھی کہ بڑھاپے میں پیر توڑ کر نہ بٹھا۔ غمزدہ میں عیش و آرام کی خاطر نہ ٹھہرا اور حواؤں اور سمندر دے گرد چکر لگاتا رہا۔

متعلق صورت، مقنن ڈاڑھی، ترے ہوئے لب اور حیران آنکھیں، بڑھاپے میں جان و چوبند اور نیم فوجی لباس زیب تن، یہ تھے آرٹسٹ ہمنگوسے، ایک صاحب طرز مصنف، جن کی داستان حیات ان کی محنت بانی اور قلم کی روانی پر نیم ہو گئی۔ اب دنیا بھر کے آرٹسٹوں کے لئے نقش قدم پر چلے اور یاد رکھے۔ وہ اپنا کام پورا کر چکا

باب صاف، بیٹا سپاہی، بچپن سے شکار کا دلدادہ، موٹوں میں کالی کا شکار، بڑھاپہ اور جوان ہوا تو مرد میدان اور ہرگز آواز نکلا۔ دنیا کی دو بڑی جنگوں کے درمیان وہ متعدد مرکوں میں شریک رہا۔ پھر شجاع اور بہادر لیاک جان کی پرہیز نہیں۔ کہیں ہوا اور کسی کام میں ہو، بھل کی آواز کان میں پڑے ہی یہ جنگ کے لئے روانہ۔ موقع آگیا اور موجود محنت سے محنت محرکہ ہو، یہ پھٹے والا نہیں۔ بڑے سے برا حال ہو، یہ مقابلے سے باز نہ آئے۔ فرانس کے محاذ پر سگھرائڈ لائی کی خون ریز جنگ میں، ۱۸ دن تک وہ محسوس کیڑا بن گیا جو پیش کر دیں جو ان کے پیچھے چھوٹ گئے۔ تین ہزار کے لشکر میں ۲۰ ہزار سے زائد سپاہی زخمی و مارے ہوئے۔ ساری جمیعت پریشان و منتشر ہو گئی۔ موت اس کے بھی سامنے تھی۔ اپنی آنکھوں سے ہزاروں کو گرتے اور دم توڑتے دیکھا مگر اپنی جگہ اٹھا رہا۔ اس کے قدم نہ اکھڑے وہ سپاہیوں میں ایک نشان تھا جو شجاعت و بہادری کے نام سے پکارا گیا۔ ایک

وہ اپنی سخت جانوں اور مشکل پسندی کے لئے مٹنا دارا طلب ہے اس سے زیادہ زبان و ادب میں ایک نئی کشف پیدا کرنے کے لئے مستحق مبارک باد ہے اور یہ امر کسی قدر موجب افسانہ ہے کہ وہ جن مراحل کو اپنی زندگی میں طے کر سکا اب مرے کے بعد ان کی طرف اقدام کیا جائے۔ چنانچہ اس نامور ادیب کی رحلت پر جناب کینڈی صدر امریکہ نے یہ تاثرات ظاہر کیے ہیں:-

”سٹریٹو کے لئے صرف ذاتی رحمان اور اپنی جدوجہد سے وہ خدمت انجام دی ہے کہ موجودہ ادب کا پلٹ گئی۔ ان کا نقطہ نظر اور انداز بیان ادبی اور حیاتیاتی سائنس کے لحاظ سے اپنی نئی شہرت ہوا ہے جس سے نہ صرف اعلیٰ افراد مروجہ زندگی کے تصور بدلے بلکہ ان کے تصورات سارے عالم پر چھا گئے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ادب کی تخلیق ہو یا اس کی نگہداشت۔ دونوں ہماری ضرورتوں میں داخل ہیں۔ جو کچھ پہلے گزرا اس کے ذکر سے غرضی ہوتی ہے۔ ہم اپنے پیش روؤں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اپنے منہ بولے باز دھتے ہیں تو ان سے مدد لیتے ہیں، ان کی محنت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر کرواتے سے وہ باز رہے ان سے بچتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں اور وہاں ان کے دم و دم کا نشان ملتا ہے وہاں اپنی استقامت و کامیابی ڈھونڈتے ہیں۔ ایسی ہی داستانیں یادگار زمانہ ہوتی ہیں مگر ان کے اقبال اور کارسے زبان پر چڑھتے چڑھتے قرب الملک ہو جاتے ہیں جن سے گفتگو میں جان آتی ہے۔ وہ ہمارے اندر کیف و وجدان پیدا کرتے ہیں اور ہم ان سے روشنی اور جوش عمل حاصل کرتے ہیں۔ سادگی اور سچائی ادب کی جان ہے اس میں کسی تعسف و آرائش کی ضرورت نہیں زبان، خیال کے ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے۔ جتنے اور جیسے بھی افسانہ ہے عجیب زبان پر آجائیں خیال کو ظاہر کرے بیٹے کے سنے کا کافی ہیں۔ ان میں موتی، لہجہ اور قدروقیمت ہوتی ہے۔ آورد اور بوز کوڑ سے خیال مکدر ہو جاتا ہے۔ بیان کو خیال کا باندھ ہونا چاہیے۔ خیال تپتی

آسانی سے برآمد ہو بہتر ہے۔ زبان کی قربی کے لئے خیال کو جبر و کرنا مناسب نہیں۔ لکھی ہے بدلتی سے عبارت زور دار ہو جائے لیکن خیال پس باز رہ جائے گا افسانہ کا بوجھ بار خاطر ہوگا۔ سید سے سادے افسانہ سادہ سے گزرد کر دہیں پروا دہوتے ہیں اور ان کا معنوم دل میں آ جاتا ہے۔ اس زمانہ میں انسان اور مختصر لکھی کی طرف خاص رغبت ہے۔ چونکہ زندگی کے مشاغل گونا گوں ہیں اور فرصت کے لحاظ بہت تھوڑے ہیں اس لئے ضخیم اور سلسلہ دار کتابوں کے مطالعہ کی سہولت نہیں۔ اس کی کو خلاصوں اور مختصر افسانوں سے پورا کرتے ہیں۔ روزانہ اخبارات کا مطالعہ اس جہد کی بڑی خصوصیت ہے۔ جبر و ادب متناہی کی خوش بینوں سے جو بجز ناتجربہ آتے رہے وہ ”ذاتی ادب“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ادب بروقت اور سرعت پیش کیا جاتا ہے جو ذوق مزورقوں سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں بناوٹ سے زیادہ حقیقت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی نگارش اور انداز بیان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بیماری ناکہ سے اعلیٰ ترین نہ ہو مگر اس میں وقت کی روح جلوہ گر ہوتی ہے اسی لئے وہ دل کش اور دل نشین بھی ہوتا ہے۔ اس کا لب و لہجہ خواہ اخباری ہو یا انسانی بہت تند و تیز ہوتا ہے لیکن یہ ہمارے خیالات کی سچی مددی نمائندگی کرتا ہے۔

اسی ادب اور احوال کی ممتوری سٹریٹو نے بھی کرتے رہے۔ وہ اس جہد کے مشیم ناول لکھتے تھے۔ م ۱۹۵۰ میں انھیں ادب کا نوبل انعام بھی ملا۔ پہلی مرتبہ ان کی بین الاقوامی شہرت ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ جب ان کا ناول ”مقام بھی بلند ہوا“ شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے مشیم ناول شائع ہوئے جن میں ”اسکون کو اوارا“ ”موت کا گھنٹہ کس گھنٹے ہوا“ اور ”لوٹھا اور سمندر“ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ چھوٹے چھوٹے افسانے بھی لکھتے رہے جو بے حد مقبول ہوئے۔ مگر ان کی زندگی بے قرار تھی۔ وہ شملوں کی طرح چلنے اور شر کی طرح قطع منزل کرتے رہے۔ اپنی زندگی کے ۶۳ سال میں سب سے طویل قیام انھوں نے کوآبا میں کیا جو صرف ۵ سال کی مدت تھی اور وہ بھی مسلسل نہیں۔ ۱۹۶۷ء میں لندن

آئے اور امریکی صحافتی شریک بن گئے۔ پھر کوہاکی واپسی پر ہم ۱۹۵۵ء میں جبکہ وہ ایک لیبارہ کے حادثے کے بعد، جو افریقی علاقہ یوگنڈہ میں پیش کیا، ابھی وہ علاقہ ہی تھے کہ ان کو ذیل انجام پانے کی مسرت حاصل ہوئی۔ یہ مسرت انھیں بڑی محنت اور شفقت کے بعد ملی۔ کیونکہ لکھے کی مشق کو جاری رکھے اور کامیاب بنائے ہیں انھیں ایک اپنی عزم سے کام لینا پڑا۔ اپنے افسانوں میں وہ خاص طرز کے موجود تھے اور اس جدت کی خاطر وہ اصولوں کو بھی نظر انداز کر جاتے۔ ان کو کسی مقولہ و منقول سے غرض نہ تھی۔ وہ صرف تاثرات کو سہجہ کہہ جانتے تھے اور انداز کی بھر مروت دل میں اتارنا چاہتے تھے۔ شاید یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہو۔ ان کے افسانوں کا ترجمہ کیا جائے تو اجڑائے نثر میں اصلی واقعہ کی اہمیت ماحولی کی عکاسی اور سادگی بول کے سوا کچھ نہیں۔ پس یہی، بالکل کام، استدلال اور ذوق فلم بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی نقل کرنے سے ہم کوئی فوٹیت نہیں پاسکتے۔ ہمیں اپنے کمال کے لئے اپنی ہی راہ نکالنی چاہیے۔ جس کا نتیجہ شدید شکستہ یعنی تھی اور یہی شدت ان کی شہرت کا باعث ہوئی۔ ان کو وہ تمام کامیابی و شہرت زندگی ہی میں مل گئی تھی جس کے لئے دوسروں کو موت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ وہ کس شہرت کا سبب خود بتاتے ہیں :-

”ہمارے فعل سے، پہلے موت چند آدمی ہمارے ہوتے ہیں۔ لیکن اس فعل کو جب ہم سلسلہ کرتے ہیں تو اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور وہ اس کا ذکر اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔ اس طرح سے بڑھتا رہتا ہے۔ ایک سنس سے دوسری سنس تک۔ پہنچتا ہے۔ اور جب یہ تذکرہ کتابی شکل اختیار کرے اور کتاب مقبول بھی ہو تو وہ ایک بڑی مدت تک قائم رہے گا۔“

یہ تصورات تو جینگو کے ابتدائی نقوش ہیں جو شہرت و کامیابی کے حدود سے کٹے نہیں پڑتے۔ لیکن میرے نزدیک ان کا آخری زمانہ بہت بعد میں گزرا کیونکہ خیال کا وہ بڑا پوچھ ہوتا ہے۔ تبدیلی اور تغیر اس کو ہلاکتی ہے۔ امید آگے بڑھاتی اور اعتدال پر صحت

قائم رہتی ہے۔ اگر خیال آگے نہ بڑھے تو ہلک بن جائے۔ طبیعت پر اس کی گزراں باری تو اس سے سخت غریب لگتی ہے۔ اس کا ذمہ نہیں بھرتا اور ایسی قوموت ہی ہے۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ جینگو سے کی آخری فوٹیت کسی سیلاب یا خیال میں ڈبانے کی حرکت ہوئی یا ایسی سے کام تمام کیا۔ یہ بھی مشبہ سے غالی نہیں کہ انھوں نے باپ کی طرح خود کشی کرنی۔ ڈاکٹر کلازش کی موت بھی اسی ماحول میں ہوئی جس کا عکس بیڈ کی موت کا عجب بن گیا ہے۔ ہجران اتنا مزور ہے کہ ان پر شدتوں کا بڑا غلبہ ہوا۔ ان کے اعضاء ذکی افسانہ اور غزور ہو چکے تھے۔ بدن میں روشنی نہ ہو، مگر انھوں میں جنبش ہوئی اور قابو نہ چھ سکا۔ اب دم آنکھوں میں تھا۔ کوس رحلت ہوا اور دوسری دنیا کا سفر شروع ہو گیا۔ جہاں کی پرواز زمانہ و مکان کی پابندی تھی۔ گھر جینگو سے کا۔ غائبین ہو گیا۔ ان کی نگاہیں فضا سے سیدھا کو چرے آگے بڑھیں۔ اور خیال کی گنجائش میں زمانہ کی وسعتیں گھس گھس گئیں۔ وہ دن کی گھڑائیوں میں ڈوبا تو تناثرات کا سمندر سے کھلا اور عالم بالا میں گم ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا۔ پھر اس خاک کی پتلی کی حقیقت ہی کیا تھی؟ اس کو ہمیں چھوڑا اور آگے بڑھا۔ وہ اس قید و بند سے تنگ آ چکا تھا اور چند دنوں سے خبر شنواری طور پر اپنے پرواز کی ایک نئی دنیا ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ کس کا جام کریمین ہوا؟ اور یہ گھنٹی کس کی موت کی بجا رہے۔“ انتظار کی جن امانتوں کو کھار کر پڑے وہ دوسروں کے لئے مشترک غم کی وجہ ہو سکتی تھی۔ اپنے لئے اس کے اعتدالی مینائی کی تکیوں۔ وہ ساری زندگی موت سے بڑھا رہا تھا۔ سکون کا ہی ذریعہ جو موت اس کا دل بے خبر موقوف تھا۔ اب وہ ایک نئے ماحول کے متبادل کی تلاش چکا تھا مگر مہلت نہ ملی اور وہ یہی کیا۔ اس میں جس ان کی بوجھ بیکر۔ کامیاب کتنا محنت تک ہے گیشم کے پہاڑی میں بنی۔ اخبار نویسوں سے فرماتی ہیں :-

”تم ہندوں۔ ایک بڑا ذخیرہ جنگ میں محفوظ ہے اب ان کا ارادہ تھا کہ انھیں مکمل کر کے شائع کر دیا جائے۔ میں انھیں کیا معلوم کہ صبح ہو تو یہی وہ اس دنیا سے سفر

کرتے دالے ہیں۔ زندگی کی آخری بات کا کھانا اٹھانے
 بڑے المیہ ناک ہے کھانا۔ ادھر موت حرکت گھنٹوں کی منتظر،
 ادھر گھر ہیں سکون و مسرت موجود۔ کھانے کے بسا دودھ
 دانتوں میں خلل کرتے ہوئے پراسا دے جس آئے۔ جیسے
 تھرمیس ہمارا کوئی تھرمیٹش کر دیں "اور ایک اٹھائی گیت
 گانے لگی۔ اب دانت صاف ہو چکے تھے۔ میں جب گیت
 کے آخری حصہ پر پہنچی تو وہ بھی میرے ساتھ گنگناٹے

لگے۔ یہی رات، موت کی صبح ہونے والی تھی۔ بتلائیے ان
 صورتوں میں یہ سا نہ لگتا سخت و درد ناک ہے!"
 بیٹنگوٹ کی بڑھ کا پُر درد بیان تنگ آمد و سخت آمد کی ایک
 ذمہ دہنت مثالی ہے۔ جس کی پوٹ سخت سے سخت دل بھی عموماً
 کرے گا۔ ان تمام مسودوں کی اشاعت بھی ہوگی۔ مگر اپنی شادی
 پر المیہ ناک کا سانس لینے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا ہے۔

قاسم شبیر نعمتی تعبیر آبادی

غزل

نغمہ عشق میں کن شکلوں سے آیا ہے	بھی انھیں تو کبھی خود کو آزما یا ہے
مصلحتیات کا اس طرح دل نے پایا ہے	نفسِ نفسِ غمِ الفت کے کام آیا ہے
جنونِ عشق، کبھی یوں بھی رنگ لایا ہے	تیرے خیال میں خود کو لگے لگا یا ہے
طرح طرح سے متناسق فریب دیتی ہے	سمجھ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں بھلا یا ہے
یہ دل نہیں کے ڈروں پر کرسکا نہ لگا	یہ دل فلک کے ستارے بھی توڑ لایا ہے
نکاح عام تھی گم رنگ و بول کی منزل میں	نکاح لاؤنے کا ٹھول میں من پایا ہے
نئے نئے نکل آئے ہیں پہلوئے غم دل	بھی جو ترکِ محبت کا وقت آیا ہے
یہ دردِ عشق، حیاتِ آخر میں ہی آدیت	مگر یہ درد ہمارا سب کو راس آیا ہے

مرے لئے تو وہیں تک ہے زندگی قاسم

جہاں تک ایک نکاحِ کرم کا سایا ہے

دے دیں۔

پھر حرم نمک پرتھوی ہندوستان میں تجارت کے ذریعہ اپنے قدم جما رہے تھے۔ یہاں کے مسالجات کی تجارت سے وہ روز بروز مالدار ہوتے گئے۔ آخر ایک طور پر ہندوستان میں اپنے پاؤں جما کر کے ۱۵۱۰ء میں نئے وائسرائے اٹالسوڈی۔ ایلمورٹن کی سرکردگی میں پرتھویوں نے ہندوستان پر ایک زبردست ویشیا برطانیہ کی اس حملے کے انھوں نے گولکے ساحل پر کھڑی موزوں ترین جہازیں اٹالسوڈی کے بیجی مارچ کو انھوں نے پرتھویوں کو لیا۔ دو ماہ بعد بیجی مارچ کو اب یوسف عادل شاہ نے گولکے کو آزاد کرانے کے لئے ایک بھاری فوج بھیجی جس نے پرتھویوں کو مار بھگا یا مگر نومبر میں خود جہازوں کا ایک فوقی پڑھ لے کر انھوں نے پرتھویوں کو پرتھویوں کو لیا۔ اس وقت کی اطلاع حسب ذیل اٹالسوڈی ایلمورٹن نے اپنے وطن کو بھیجی تھی۔ ”میں نے پرتھویوں کو جلا دیا ہے اور انھوں نے تمام حکم دے دیے ہیں۔ کئی دن سے پرتھویوں کی فوجیں بہہ رہی ہیں۔ ہم نے پرتھویوں کو مار مار کر لیا ہے اور ایک سالانہ بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ ہم ایک چھ پرتھویوں کو لیا ہے۔“

پرتھویوں نے ۱۵۰۵ء میں دیر اور ۱۵۰۹ء میں دمن کو بھی فتح کر لیا۔ اور اس طرح انھوں نے ہندوستان میں باضابطہ قدم جمائے۔ ۱۵۱۴ء میں یہاں پرتھویوں سے بڑے ہونے لگے جہاں پہلے سے انھوں نے یہاں باقاعدہ حکومت کی سرپرستی میں عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ ۱۵۱۵ء میں ایک پرتھوی گورنر لکھا۔ ”پرتھوی ہندوستان میں ایک ناقص تھاوار اور دوسرے ناقص تھاوار میں صلیب کے پرچے ہیں گریہاں لقاوار سونا دیکھ کر ان کا عقیدہ متزلزل ہو گیا ہے اور انھوں نے صلیب ایک فرحت رکھ کر عیسائی پرتھویوں کو شروع کر دی ہے۔“ تاہم پرتھویوں کا تسلط انھیں مقامات تک محدود رہا۔ وہ برطانوی اور ولندیزی استعماریت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انھوں نے گولکے اور چیرچ اڈے بنائے اور اپنی تجارت اور حکومت کے ذریں دور میں گولکے مشرق کا سب سے زیادہ میں تجارتی ڈالا۔ لیکن برقی کے اس دور میں بھی مقامی باشندے غریب اور غفلت الماں رہے۔ ان کی حیثیت

تلاشوں میں بھی تھی اور یہاں کی محنت کے سارے کام انھیں کا لے لوگوں سے لئے جاتے تھے۔

ہندوستان میں مورخین کا کہنا ہے کہ ان سارے چار سو برسوں میں وہاں پچاس سے زائد عوامی بغاوتیں سر اٹھیں ہیں۔ سب سے پہلی بغاوت ۱۶۵۴ء میں ہوئی تھی۔ اس کا بانی ایک ہندوستان کی دہلی کا رہنے والا تھا۔ اس کے بعد انھیں مدی میں ان دنوں کا سلسلہ تیزی سے قائم ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں ایک سربراہیہ دہلی کی رائے کی سرکردگی میں دہلی بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ دہلی کے ساتھیوں نے کئی مقامات کو فتح کر لیا۔ خود وائسرائے کو اس کی سرکردگی کے لئے آنا پڑا اور پرتھویوں نے اپنی حکمت عملی سے پندرہ ہفتوں کو اپنے ساتھ لایا اور مدیوں کو فتح میں ملازمین بنے گا و عسکر گھسپا۔ باغیوں کو مارنے کی شہرت تسلیم کرنی پڑی۔ مگر جہاں جہاں دہلی کے قتل گشتی پرتھویوں نے فلم و زنیات کا سلسلہ پھیرا شروع کر دیا اور دہلی سے مراعات واپس لے لیں۔ ۱۸۶۰ء میں ایک عام فوجی بغاوت ہندوستان میں ہوئی نے بڑے زور شور سے کی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے پہلے ملک سے سینتیس ہائی لائے پڑے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں ہندوستان کی فوج نے ایک اور زبردست بغاوت کی۔ اس بغاوت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سپاہی افریقہ کی ہم پڑی جہاں جا رہے تھے۔ جو سپاہیوں نے اپنے مذہبی عقیدے کی آڑ لے کر مسندوں کے سفر کا بہانہ کر ڈالا۔ لیکن غالب ہے کہ وہ افریقی لوگوں پر کئے جانے والے ظلم کا ذریعہ بننا چاہتے تھے۔ اس کے بعد سے بنا وکوں کا ایک سلسلہ جاری رہا مگر بغاوت فرعونیت نشہ کے بعد وہادی جاتی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ گولکے کے سربراہیہ ہند بھی اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور انگریزوں کی نسبت یہاں آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے زیادہ درندگی اختیار کی جاتی تھی۔ تاہم آزادی کی جدوجہد کے اگلے فلم و زنیات کے سیلاب کو کچھ مٹنا پڑا اور ۱۹۵۵ء تک دادا اور نرہوجی کا علاقہ آزاد ہو گیا۔ ان علاقوں کے آزاد ہونے کی حکومت نے وہاں چار پانچ تین قائم کیں، اسکول اور ہسپتال کھولے اور دیگر کافوقان فلم و زنیات کے کچلنے کے لئے یہاں سرکاری بنائی گئیں

جہاں پہلے مرث جا رہا ہے تھے وہاں اب پچاس ہزار سے گھٹے ہوئے ہیں۔
یہ تمام مراعاتیں اور آزادیاں مرث اسی وقت ممکن ہو سکیں جب وہ
غلامی سے چھٹکارا پائے گا۔

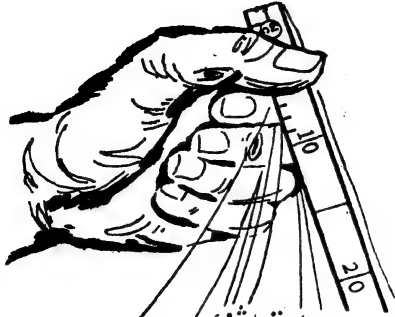
دادستانہ اور نگر جوہلی کی آزادی کے بعد گوا کے باشندوں کو آزادی
کی نعمت کا پیرا پیرا حاس ہوا۔ گوا کے باشندے اپنے ہندوستانی
جانبیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کے پنج سالہ
جلاوطن اور یہاں کی انفرادی اور کالونی آزادی کا مقابلہ اپنے یہاں کی
اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور حکومت کی سختی سے کرتے تھے اور دل ہی دل
میں یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنے قدیم
جانبیوں کے گھٹے سے لگ جائیں گے اور غریبی اور غرض من ماحول سے
نجات حاصل کریں گے۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۵۵ء سے انہوں نے آزادی کی ہم
تیز کردی۔ پہلے پراسن جوسن پر گواہاں چلائی گئیں۔ ستیہ گروہیں پر نظام
ٹوڑنے کے لئے خاص قسم کے تربیت یافتہ کتے لانے کے جو پراسن ستیہ گروہیں
پر لپکائے جانے لگے۔ مگر ہندوستان کی امن پسند حکومت نے چرچا مبر و سکون
سے باہمی گفت و شنید کے ذریعہ آزادی کی کوششیں کرتی رہی۔

بہر حال اس تمام ظلم و ستم کا پتہ نہ دینی لگتا جو ستیہ گروہیں کا
فرمان تھا۔ ۱۹۔ دسمبر کی گوا گوا ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔ گوا میں
رتقبہ ۱۳۱۲ میل ہیں۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء
کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۶۳۸۰۰ ہے۔ ہندوؤں کی تعداد
۶۱ فی صد ہے اور عیسائیوں کی ۳۷ فی صد۔ دس سالہ رتقبہ ۲۱۱ میل
ہے اور دیو کا رتقبہ ۱۲ میل ہے۔ پہلی اور گوا کے درمیان ۳۳۰ میل کا
فاصلہ ہے۔ گوا کا دارالخلاہ پانچم ہنتر ہے۔ تجارتی اعتبار سے یہ ساحلی ہنتر
بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ان تینوں نوآبادیوں میں تدریجی وسائل پڑی گزرتے سے پائے
جائے ہیں۔ یہاں معدنی اشیا اور مقررہ زمین پائی جاتی ہیں اور اس کے اندر

سمنہ زمین چھپائیاں بکرت طبع ہیں۔ یہاں کے جنگلات میں عمارتی لکڑی بکرت
پائی جاتی ہے۔ یہاں کی زرخیز زمین اور گرم سمنہ ری آب و ہوا اور تیز بارش
اور دیگر دوسانے کے پیش نظر سموری کوشش اور پلاننگ سے لوگوں کا
میانہ زندگی بڑھتی ہوئی ہو سکتا ہے اور مرث قومی حالت میں
مکمل ہے۔ یہاں کے باشندے چاول اور تاریل کی کاشت کرتے ہیں۔
باوجود اتنا زرخیز زمین کے یہاں کے کسان غیر سموری آغا اس کا شکار ہیں
اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس زمین کے قلعے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ آبادی کے بیشتر افراد کے پاس سرے سے زمینی ہے ہی
نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہاں کے باشندے اپنی کاریگری میں اپنی زمین
دیکھتے تھے یہاں کے باشندوں کی قدیم دستکاریاں بنائی، طبع سازی اور
پہچان نقش کاری وغیرہ جن کا ایک زمانہ میں بڑا ہنتر تھا، جدید ماحولیاتی
پن کر رہ گئی ہیں۔ ان علاقوں کی اقتصادی زندگی کی سب سے بڑی چیز یہاں کی
معدنی منبت ہے۔ گوا کی زمینوں میں انجمن اور نل کی دھاتیں پائی جاتی ہیں
یہاں کی سب سے زیادہ اہم معدنیات لوہا اور منگانیز ہیں۔

ہندوستان بنیادی طور پر ایک پراسن ملک ہے۔ دنیا میں
نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے لئے ہندوستان نے جو آواز بلند کی اس کے
پیش نظر یہ ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کا چرچہ بڑی طرف سے پاک ہو۔
گوا کی آزادی کا مطالب ہے وہاں کے باشندوں کی لینی، سیاسی
اور اقتصادی آزادی۔ گوا ملک وہاں منصوبہ بندی یا تربیتی پروگراموں
کا کوئی پس منظر تھا۔ پرتیوی استمار پرست وہاں کی دولت کا خری قلعہ
ملک بنوڑنے کی فکر کر رہے تھے اور وہاں کے عوام کا میانہ زندگی تیزی سے
پست ہو رہا تھا اب قومی حکومت میں گوا کے باشندے اقتصادی اور تیزی
طور پر ترقی کر سکیں گے وہ اپنے مفرد کے خود مالک ہوں گے۔ وہ
دور نہیں جب ہم ایک پچھلے ہوئے کو اپنی آنکھوں سے خوش حالی
سے بن کر پوچھتے دیکھیں گے۔



میٹر ناپ کو اپنائیے

یہ اکتوبر سے لگائی ناپنے کے پیمانے کے روپ میں میٹر کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔ ایک سال کے بعد حکومت اپنچ کا استعمال نافذ نہیں کرے گا۔
پھر سے پراب میٹر کا نشان بنایا جاتا ہے۔ اور قیمت بھی میٹر کے حساب سے بتائی جاتی ہے۔

میٹر گز سے پلاس اپنچ لب ہوتا ہے

میٹرک ناپ
کے مطابق
خریداری کیجئے



جاری کردہ تجارت سرکار

بچت کی بچت جلدی کی جلدی



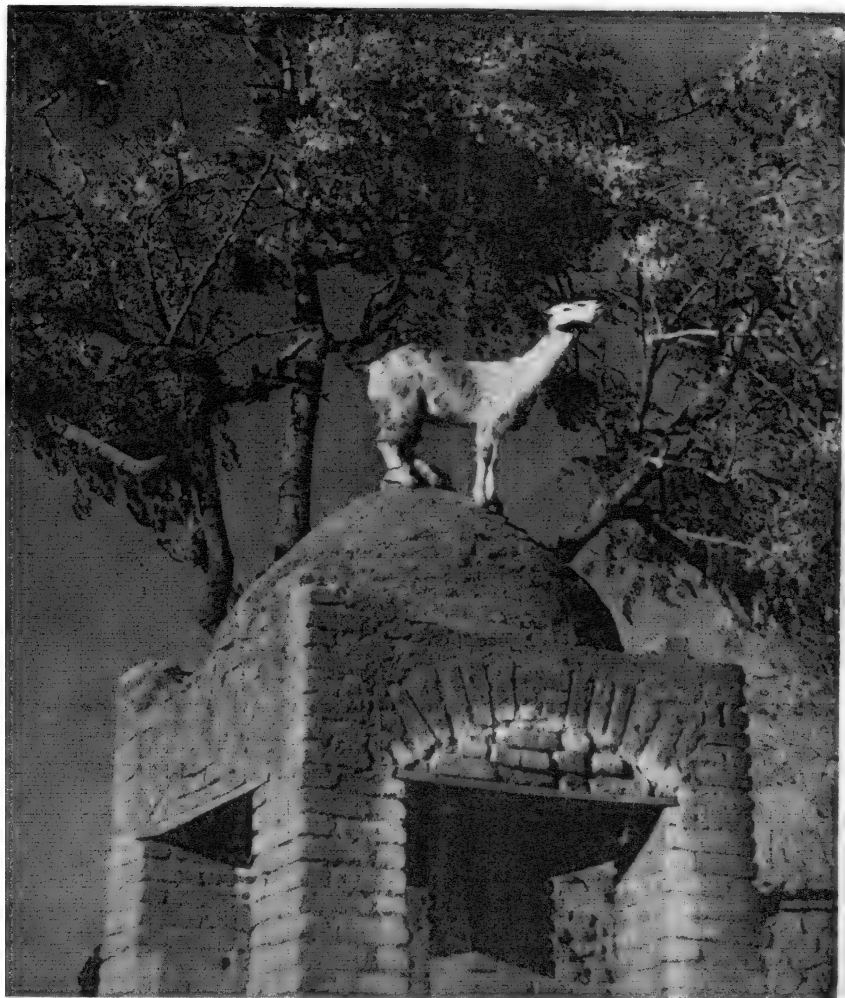
کام بہت ضروری ہو جی تو آپ تار بھیتے ہیں۔
تو پھر پتہ پڑا کیوں نہیں نکلتے۔ پتہ پورا ہونے
سے تار قشیاً جلدی پہنچتا ہے۔
پتہ اٹھو رہونے کی صورت میں تار کے دیر
سے پہنچنے کا امکان ہے۔

آپ پیسے بھی بچا سکتے ہیں اور تار بھی مل سکتی
ہے وہ کیسے؟ تار پہلی ذن نبر کے پتہ پر دیجئے۔
پتہ یوں لکھئے شہر، راج، ڈسٹرکٹ، ایف۔ ۱۰، ۱۶
دلی، جیسے ہی تار دلی پہنچے گا اُسے پہلی ذن پر
پڑھ کر سنا دیا جائے گا۔

پتہ ہیں ”ٹی۔ ایف۔ ۱۰“ کو ایک ہی لفظ مان کر دام لگائے جاتے ہیں۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

مسکرو ڈاک و تار



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آہ کل

پہلا نمبر شیک سہ ماہی
مارچ ۱۹۶۲ء



ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پیٹر تہروے بات چیت ٹیئر منڈی	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
اوالکلام آزاد	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
تیسرا بیچ سال پلان	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
بجارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ٹاپ ٹول کامیابی نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے
نمبر ۱-۲-۳-۴-۵	(دفتر)	(دفتر)

————— کے کاپی —————

بزنس منیجر پبلکیشنز ڈوٹیرن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوامی مقرر یا ہفت نامہ

آج کل دہلی

مجلسِ ادب

محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی

بی ایچ اے قادی زور سرگرمی

گوپی ناتھ احسن دہلی

خواجہ احمد رقی دہلی

جیدالقا دوسرو دہلی

بی۔ ایس۔ موہن رائے ڈاکٹر محمد علیکیشیز ڈوئیزن
بی۔ اے۔ ایس۔ رائے ڈاکٹر ڈاکٹر محمد علیکیشیز
بی۔ ایس۔ ناتھ ڈاکٹر ڈاکٹر محمد علیکیشیز
بال مکند عرش ڈاکٹر ڈاکٹر محمد علیکیشیز
ڈاکٹر محمد علیکیشیز

اسٹنٹ ایڈیٹر۔ مغلترستہ

ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
اشلیک یا ڈیڑھ ڈالر
ہندوستان میں :- ۶۰ روپے
پاکستان میں :- ۶۰ روپے (پاک)
ہندوستان میں :- ۶۰ روپے

مترجمہ و شاعر محمد

ڈاکٹر محمد علیکیشیز ڈوئیزن سرگرمی، فائنل ایڈیٹر ڈاکٹر محمد علیکیشیز

محمد علیکیشیز ڈوئیزن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

۲	ادارہ	علامت
۳	حکامہ کو	بیل کی کتاب ڈنگی کا آخری ورق
۵	دینا بیتی	ہشزادی زریب النساء بیگم
۱۲	نجیب رامش	قدم لاکے جلیں
۱۳	صابر شاہ آبادی	ادب اور مقصدیت
۱۹	میرزا لکھن احمد	فتح آدم
۲۰	دعوی عارف	جھکیاں
۲۱	عزیز علیانی	کرکٹ
۲۴	من موہن تلخ	لبرٹیکٹ آرٹ
۳۲	سمادیت نیکر	غزل
۳۳	نریندر لوتھر	دل فنت، فنت
۴۰	ہنس راج نہر	ترتیب
۴۲	اندربیت لال	ایچی قاتالی
۴۶	عزیز جادوید	غزل

سرورق :- تجسرات کا ایک ٹکڑا کالا
رسالے کی پشت پر :- سورج کمی

پچاس گنک ۱۸۸۳

مارچ ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ - جبرہ

مناجیہ سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش علیانی ایڈیٹر آف ایڈو (ادب) سیکرٹریٹ دہلی ۶

ملاحظات

زیادہ تن دہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ وزیراعظم رہتے ہوئے شاید یہ فریقہ ادا کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد بڑا مفید رسانی، ادبی اور ثقافتی کام کر رہا ہے۔ اس ادارے کے اہتمام سے ہرسال یوم تقی قلی شاہ منایا جاتا ہے۔ اس وفد بھی ماہ جنوری کے دوسرے ہفتے میں یہ تقریب منائی گئی۔ تاجداروکن ہونے کے علاوہ تقی قلی شاہ شہر حیدرآباد کا بانی اور اردو زبان کا سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہوا ہے۔ اس موقع پر بڑا رنگارنگ پروگرام پیش کیا گیا ادارے کے متقدرو، ازی ڈاکٹر شریلی الدین قادری زورنے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں ادارہ ادبیات کی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔

اس سال یوم جمہوریت کے اعزازات میں اردو کے صف میں پدم بھوشن کے دوا اعزاز آئے ہیں۔ ذاب جعفر علی خاں انٹرکلمنوزی اور جناب نیا زلفی پوری مدیر نگار کو یہ اعزاز ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ملا ہے۔ دونوں بزرگ مدتِ عمر سے اردو ادب و صحافت کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ امید ہے کہ اردو کے معلقین ان بزرگوں کی قدرا افزائی پراکھار اہمیتاں کیا جائے گا۔

ڈاکٹر حفیظ سید الزماں پوری ورثی کے شہید اردو سے ملت ٹمک متعلق رہے، اب ریٹائر ہو چکے تھے، مالی میں ان کے انتقال بھٹال کی خبر آئی ہے۔ موصوف مختار فیل سوائس سے بھی تعلق تھا۔ بزرگ مرزا خان قمر کے وندرانسان تھے۔ آج کل کی ان کے مشاہیر شاعر ہوتے رہے۔ ان کا انتقال ایک ادب دوست اور شریف انسان کا انتقال ہے۔ ادارہ آج کو ان کے لواحقین سے ملدی ہمدردی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ افریقہ کو تاریک براعظم کہتے تھے لیکن ہندو کے مصوب آزادی کے بعد افریقہ کے گروڑوں غلام خوابِ فعلت سے اٹھے اور آزادی کا نورِ مستار لگائے لگے ہیں۔ افریقا میں سات سال سے جنگ و علیل کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ آخرا ب حالات یہاں تک پہنچے ہیں کہ فرانس کے صدر جرنل ڈیگال نے اعلان کر دیا ہے کہ افریقا کے قوم پرستوں کے ساتھ گفت و شنید اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ افریقا میں جدا سن قائم ہو جائے گا۔

سامراجی نظام جہاں بھی ہے اُسے جلد ختم ہوتا ہے۔ اس دورِ جمہوریت میں کوئی قوم زیادہ دیر تک غلام نہیں رہ سکتی۔ لاٹو میں حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے کارروائی کر کے وہاں بھی سامراجی نظام کے ماتحتوں میں کھیلنے والوں کی سرگرمیوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ کانگوا سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ بلیٹی فینین اور کچھ یورپ لوگ کانگوا کی لاٹو سے الگ رکھنے میں مشغول رہے۔ لیکن مقامِ مسرت ہے کہ مشغول ہے اب راوا راست پر آ رہے ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ لاٹو کی سالمیت قائم رہے گی۔ شونجے کے بعد لومبا کے سامع گرننگا نے لاٹو کی مرکزی حکومت کی مخالفت کی لیکن اب وہ راست میں ہیں۔ اور لاٹو کے وزیراعظم ڈولانے اعلان کیا ہے کہ ان پر بناؤ کے جرم میں مقتول چلا جائے گا۔ مشرا ڈولانے اقوام متحدہ کی اس دوسری تقریر کی ہے اور جو قومی مدد لاٹو کو اقوام متحدہ نے دی ہے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ٹانجیانا آزادی ہو گیا۔ آزاد ملک کی یاد دہی میں ایک اور ملک کا اضافہ رہا۔ اس کے قوم پرست بیڑہ نیریری نے وزیراعظم کے جبر سے استعفیٰ دے دیا ہے لیکن یہ استعفیٰ وزارت میں کمی اخلافت کا نتیجہ نہیں بلکہ موصوف قادری اور ملکی بک جتی کا کام

بیدل کی کتاب زندگی کا آخری ورق

بیت قدیم سے

جانان پر قمار خانہ زندگی جیت نہ

برنسیہ و نقد ہر دو عالم خستند

بہر حال یاس کی حالت طاری ہوتی رہی یہاں تک کہ محل کو جان کر گھو
ہو گیا بتاریخ تم۔ صفر روز پنجشنبہ ۱۱۳۳ھ دن کے چھ بجے انتقال کیا
اور اپنی ہی حویلی کے صحن میں اس قبر میں دفن ہوئے جو دس سال پہلے
ہی سے اپنے لئے بنواری کی تھی۔ یہ حویلی نواب شکر اللہ خان اور نواب
شاگرخان نے دہلی دروازہ کے باہر محلہ کھیکر پان گذرگٹھ کے کنارے
جو لطف علی حویلی کے نام سے موسوم تھی منج پانچ ہزار میں خرید کر کے
تعمیر بیدل کی اور ان کا دو پیر یوسیر مقرر کیا۔ بیدل اس حویلی میں
۶۳ سال بے فکر کی کے ساتھ رہے۔ ان کا مکان مرجع خلائق تھا جن
میں فیروز پوریا نشین بھی تھے اور صاحب تاج و نگین بھی۔ مسکن نے
بیدل کا سترہ وفات عقد فرمایا میں ۱۱۳۳ھ میں تھا۔ یہ معنی غلط ہے
بیدل نے اپنی ہی زندگی میں اپنے کلیات کا ایک کئی نسخہ جو مصری
کھڑا کیا تھا اور اس کے ہم وزن دو پیرے اور چار ہرات نیرات کے
تھے۔ اس کا وزن چودہ سیر ہوا۔ اس کلیات میں تقریباً ایک لاکھ
اشعار تھے جن کی تفصیل خوش گو نے دی ہے،

مثنوی عرفان دوجہ حدیقہ سناؤ

۱۱۰۰۰ ابیات

۴۰۰۰

مثنوی لعل جوت

بیدل نے کافی عمر پائی۔ دور شاہجہانی میں ۱۰۵۰ھ میں پیدا ہوئے
لفظ "انتخاب" سے ولادت کی تاریخ برآمد ہوتی ہے اور دور محمد شاہی
میں ۱۱۳۳ھ میں وفات ہوئی۔ میٹر بیدل از عالم رخت، وفات کی
تاریخ ہے، خوش گو نے کیا اچھی تاریخ لکھی ہے جس سے روز تاریخ
اور مہینہ سب ظاہر ہوتا ہے۔ "یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر برٹش
میوزیم میں بیدل کی رہائش کا ایک نقلی نسخہ ہے جس میں کتابت نے
دوران کتب پر یہ لکھا ہے کہ آج بتاریخ تم۔ صفر بیدل کا انتقال ہوا۔
بعض تذکرہ نگاروں میں ۳۰ صفر بتاریخ وفات ہے، یہ غلط ہے، ممکن ہے
یہ اختلاف روایت کی وجہ سے ہو۔ خوش گو سے بڑھ کر شہادت اور
کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کو بیدل سے بڑی عقیدت تھی، دن رات ان
کی خدمت میں با نریاب تھا خود اپنے سفینہ میں لکھتا ہے کہ ہزار سے
زیادہ بار وہ بیدل کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ بیدل کی وفات کے
وقت وہ دہلی میں تھا اور قاتر سوم میں شریک تھا، بقول خوش
بیدل ماہ محرم ۱۱۳۳ھ میں، بکار پرستہ، بکار کیا، چار پانچ دن بکار
رہا۔ پھر تزکیا، غسل کیا۔ غسل کے دو سرے دن ۳۰ صفر چہارشنبہ
کی شام حرات پھر عود کر آئی، رات بھر بکار رہا، نواب بخت خان
صلابت جنگ جن سے بیدل کا بیاہ نام تھا رات بھر بیدل کے ساتھ
رہے۔ ان کا بیان ہے کہ کبھی افتادہ ہو جانا اور کبھی بے ہوشی طاری
ہوتی۔ افتادہ کے وقت بے اختیار اندہ ہستی آگے لگتی۔ یہ مصداق

شعری طور معرفت	۳۰۰۰ ابیات
محمد اعظم رسالت نامہ	۳۰۰۰
شعری تفسیر الم بوہیسی	۱۰۰۰
ترجیح بند	۱۰۰۰
قصائد و ترکیب بند و غیرہ	۴۰۰۰
برایات	۳۰۰۰
رباعیات (۴۰۰۰)	۸۰۰۰
چهار علم نمبر مقدار	۱۰۰۰۰
غزلیات و غیرہ تقریباً	۵۰۰۰۰
	۱۰۰۰۰۰ ابیات

یہ کلیات ان کے مراد پر رہتا اور سالانہ عرس کے موقع پر شاعر ہوتا اور ابتدائی ہی کی کسی غزل سے ہوتی۔ کچ نہ اس جوی کا پتہ نہ مراد کا۔ خواجہ حسن نظامی نے غلط فہمی میں غائبی دوسرے مراد کی مرمت کرادی۔ فردوس ہے کہ اس مراد کا شعرا نے کیا جانے اور ان کوئی یادگار قائم کی جائے۔ فخر نسیم کے دن ان کے بستر کچھ سے جو ایک تازہ غزل اور ایک رباعی برآمد ہوئی تھی خوش گو نے بیدل کے ماموں زاد بھائی مرزا محمد سید کے پاس دیجی اور اپنے سفینہ میں منجانبہ نقل کی ہے۔ بیدل کے ماموں کا نام مرزا عباد اللہ تھا۔ ان کے بیٹے مرزا محمد سید بیدل کے جائز نہیں ہوئے اور عرس اور شاعر کا اہتمام ان ہی کے سپرد تھا۔ بیدل کا یہ کلام آخری ہے جو ان کے زبانِ قلم سے نکلا غزل کی ایک خاص فضیلت اور کلام کی ہم آہنگی ان کے آخری وقت کے دلی جزبات کی ترجمان ہے۔ یہ یادگار تختہ پیشیا خسرمت ہے۔

پشینی، مچ، اچ، غلستان نشاندہ جو شاعر غبارِ خود را
 حرق جو سیلاب از جبین رفت و ماندہ تجویم کار خود را
 ز پاس ناموس تا قافای جو سایہ ام تا گریز طاقت
 کہ ہرچہ زبیر کار دہان گراں شہیدوشم آگاہ پار خود را
 بر عمرو ہوم فکر خدمت فرو دمد پیش و کم ز رفعت
 تو گریبا ر اہل مزگری نفس چہ داند شفا ر خود را

قلم بہ مدد شہادت و در کشادی لہ لہ در گوشت افشاوی
 فلان بر فیض نفس نادای لمیست بے سوار خود را
 بلند می سر مجیب پتی است اعتبار جان پتی
 چراغ این ہر دم تا سرگاہ زندہ وارد مراد خود را
 ز شرم سستی قدر نمی گویا مرغ مستی ہم خون کن
 قوای حجاب از طرب چہ داری پر از عدم کن کما بقول
 بخوشی گر چشمی کشودی چہ موی دریا گرہ بنودی
 چہ سحر کرد کردی گوہر کفہ کردی بہار خود را
 اگر دست زنگ کیس زارید غلاب خلعت نہ پیش آید
 صفای آئینہ شرم دارد کہ خردہ گردہ دو چار خود را
 تو شخص آزاد پرشتی قیامت است ایک غمخوار فانی
 فرد خود دارد است برنگی کہ سرنگ کردی شرار خود را

و داغ آرائش نہیں کن کہ شرم دامنِ حرم ہیں کن
 مرزا بنگ از جوی شہرت جو نام عنقاؤ فار خود را
 بدوزن اند عاج تبدیل ز اہبت دم پرچ بگل
 بر آستان امید باطل محسوس کن انتخار خود را
 بیدل جن سے چار ہزار رباعیاں کہیں اور سداوند گشتی کا یہ
 قول ہے کہ رباعی گوئی بیدل کا حق ہے۔ اس کی آخری رباعی بھی اس
 بیٹے جس کے بعد بیدل کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی ہے
 بیدل کاف سیاہ پوشی نہ شوی تو پیش گھوڑی نو کو کشتی نہ شوی
 بر خاک میرد و بچہ باد مرگت سبک است باروشی نہ شوی
 یہ غزل اور یہ رباعی ان کے عام قلمی دیوان کے نسخوں میں نہیں
 اس لئے نمایاں ہے۔ بیدل کا کلام ان کی زندگی ہی میں بہت مقبول ہو
 گیا تھا، گزشتہ ان کے کلام کے نقلی نسخے سارے ہندوستان اور
 یورپ کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ ورسیلیا میں پرنٹسٹ کے
 کتب خانے میں ان کا رنگی دیوان جو ان کی زندگی کے آخری
 سال میں مکتوب ہوا تھا میری نظر سے گزر رہا ہے۔ بیدل افغانستان
 اور ترکستان میں بھی بہت مقبول تھے۔ روس کے اکثر کتب خانوں
 میں ان کا کلیات موجود ہے۔

شہزادی زین النساء بیگم

زین النساء کی ولادت

زین النساء اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اس کی ماں جس کا نام دہرس یا فوجیگم تھا جو شاہنوازخان صفوی کی بیٹی تھی شاہ قوازا کا اصلی نام بدیع الزماں تھا جو ہمایوں کے زمانے میں معزز حیدروں پرست نہ ہو کر شاہ قوازاخان کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ شاہ قوازاخان نے شاہجہان کے زمانے میں بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دئے، چونکہ ذاتی لیاقت کے ساتھ ساتھ عالی خانان بھی تھا اس لئے شاہجہان نے جون ۱۶۳۹ء میں اپنے بیٹے اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی دہرس یا فوجیگم سے کر دی۔ چار لاکھ اشرفی ہر ہاندھا گیا۔ ع

دو گریہ ایک عقدہ دورا کی شہید

زین النساء شادی کے دوسرے سال پیدا ہوئی اور شہزادیوں کی طرح شاہی عیالات میں تربیت پائی رہی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

عالمگیری اعزاء میں عاتیت اللہ خاں نہایت مہذب و عہدہ دار تھا۔ اس کی ماں کا فخر مریم نہایت ہی ذہین، کمال اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ چنانچہ جب زین النساء پڑھنے کے قابل ہوئی تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لئے حافظ مریم کو متعین کیا۔

جس نے حب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ زین النساء نے پہلے قرآن شریف تائخرہ ختم کیا اور اس کے بعد دو سال پارامہ کی خدمت میں حافظ مریم ہی کی مشگر دی جس قرآن پاک حفظ یا کر لیا جس کے بدلے میں اورنگ زیب نے حافظ مریم کو تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔ اس خوشی میں شاہ بدشمن بھی منایا گیا۔ ملک کے طول و عرض میں بینم خانے اور لنگر خانے کھولے گئے۔ عزبا اور ساکین میں اشرفیائیں تقسیم کرائی گئیں۔ حافظ مریم نے شہزادی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی ہمسری تو جردی۔ یہاں تک کہ بڑے سال کی عمر میں شاہی آداب و قوانین کے ساتھ وقار و تابعدار اور حلیہ تاریخ سے جوئی واقف کرادیا۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کچھ اس سہل و سہل پر دی گئی تھی کہ میاں بیگم اور املا تقسیم کے معمول میں شہزادی کو کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے مستحق اراٹے ہیں کہ زین النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی اور بڑے بڑے علماء اور فضلاء اس کے دربار میں رہتے تھے اعلیٰ تعلیم

اورنگ زیب کی طرف سے یوں تو شہزادی کے لئے کئی استاد رکھے گئے تھے لیکن اس کے استاد میں سے زیادہ مقرب اور

لے سروا زاد تذکرہ ملا اشرف

لے ملازمہ جلد دوم ص ۶۴۰-۶۴۱

اور باریاب ملا سید اشرف باثرمدانی تھے جو ملا سید تقی مجلسی کے
 دوسرے تھے۔ عالمگیر کے آقا زجلوس میں ایران سے ہندوستان آئے
 اور عالمگیر نے ان کو زبیب النساء کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ اس
 وقت شہزادی کی عمر اکیس سال کچھ ماہ کی تھی۔ اس سے اٹھارہ
 سو گنا بے کتیوریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر
 بلند تھا۔

زبیب النساء نعم اور نرذ میں ملا سیدی سے اصلاح
 لیتی تھی۔ ملا اشرف ان فاضل استادہ میں سے تھے جن کی بیعت
 اور ہمہ دانی کا سکھ دمانے کے دنوں پر مہیا ہوا تھا۔ علاوہ
 علوم رسمہ کے وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور پایہ ہففس
 مرثیہ بھی تھے۔ ملا اشرف تقریباً چودہ برس تک شہزادی موصوفہ
 کی تعلیم کے سلسلے میں رہے۔ اس دوران میں شہزادی نے موصوفہ
 سے علوم عامہ میں دستگاہ کامل حاصل کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ،
 لغت، فنی غرضیکہ ہر ایک فن پر مہور کامل حاصل کرنے کے
 بعد شہزادہ ذوق بھی پیدا کیا مگر استاد محترم کا اشارہ بیز واد
 بیز گوار کے اندر کو سمجھنے کے بعد شہزادہ کی ہر کوفی خاص توجہ
 ملا۔ مگر اس میں کوفی شبہ نہیں کہ شہزادی زبیب النساء نے
 فنی شاعری کے بنیادی اور اعلیٰ منازل پر کامل دسترس حاصل کی
 تھی۔ محدودت لکھنے کا شوق تھا۔ لغت اور اعلیٰ قیامت پر بھی
 زبیب النساء کے اشارے تھے۔ مختلف یہ کہ فی سہر و من و
 بلاغت پر شہزادی موصوفہ کو کامل طور تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے
 کہ وہ صاحب دیوان نہ تھی۔

ملا سید اشرف باثرمدانی کی وطن کو مرا جعت

جب شہزادی نے علوم رسمہ اور علوم فروریہ میں کافی
 بہارت حاصل کر لی تو ملا صاحب نے وطن عزیز کی مبادت کا
 ارادہ کیا۔ مگر شہزادی استاد کے فیض و برکت سے محروم نہیں

ہوتا چاہتی تھی۔ اس لئے درخواست پر اس نے چندان توجہ نہ
 دی اور انتہائی کچھ فیض و برکت سے محروم نہ فرمایا جائے۔
 ملا سید چونکہ کافی منہیت السرمہ رکھتے تھے اور وطن کی حبشہ
 میں کافی زمانہ گزر گیا تھا۔ اس واسطے انھوں نے ایک قصیدہ
 لکھ کر شہزادی کے پاس بھیجا۔ قصیدہ وہی میں شہزادی کے
 حضور میں پیش کیا گیا جس کے چند شریعہ ہیں:-

یکبار اندوہن نواں برگرفت دل

و در غم ترا چہ فردا است اعتبار

پیش تو قرب و فید تفاوت نمی کند

گو خدمت حضور نیاز شد مرا شہاد

نیت چون باغی است چو دی چہ اضمحلال

دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ تہران

پورے استاد کی اس گزارش پر شہزادی کا دل ہنس آیا اور
 شرف قدوسی حاصل کرنے کے بعد پچاس ہزار دینار اور
 خدمت شہزادہ کے ساتھ وطن جانے کی اجازت دے دی گئی۔
 شہزادی کو ملکی سیاست میں دخل تھا

شہزادی زبیب النساء نے سیرت کی تعلیم پائی تھی اور خود
 اس کا مذاق طبیعت جس قسم کا تھا اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے
 کہ وہ پالیٹکس سے بالکل نا آشنا تھی تاہم عالمگیر کے پرنسپل
 دیرعلی مہتمم کے گونا گوں واقعات نے اسے سمجھ کر دیا تھا کہ وہ
 سیاست سے دل چسپی پیدا کرے۔ چنانچہ شہزادی نے اپنے
 دادا، شہنشاہ الدین محمد شاہ، چچا، جہاں نرا بیگم اور
 چچا دارا شکوہ و غیرہ کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کا بھی عمیق
 مطالعہ کیا اور بعض فروریہ املا میں اپنے چھوٹے بھائی شہزاد
 ابکر کو بھی خاکے ڈرے لکھ مشورے دیے مگر شہزادہ ابکر فوج
 کی ایک جمیعت کے ساتھ راجپوتوں کی بنادت کو دبانے کے لئے
 جودہ پور گیا ہوا تھا اور راجپوتوں کے بہانے سے باغی ہو کر ابکر

لے سرور زاد تذکرہ ملا اشرف

لے مقالات ششماہی جلد پنجم دہلی ۱۹۶۷ء

زبردست طاقت کے ساتھ عالمگیر کے مقابلے کے لئے مہیا تھا۔
 زیب النساء اور شہزادہ اکبر دونوں حقیقت بھائی بہن تھے۔
 دونوں میں یہ بے خط و کتابت رشتہ تھی چنانچہ اس وقت شہزادی
 کے جرنیلوں کے لئے یہ بہتری موقع تھا۔ شہزادی کا خط اورنگ زیب
 کے سامنے پیش کیا گیا۔

شہزادی کی نکل بڑی اور جاگیر کی فیصلی

جب اورنگ زیب کو یہ معلوم ہوا کہ شہزادی زیب النساء
 شہزادہ اکبر کی بہن ہیں مثالی ہے اور اس کے خطوط پڑھے
 گئے ہیں تو اس نے فوراً حکم صادر کیا کہ شہزادی کو قلم سلیم گڑھ
 میں نظر بند کر دیا جائے اور اس کی تنخواہ جو ساڑھے چار لاکھ ہے
 بند کر دی جائے۔ علاوہ ازیں عمل اور اس کے جملہ مال و متاع کو
 ضبط کر لیا جائے۔ اس تقاضی کا عملی حکم کی تسخیر سے تعمیل کی گئی
 مگر جب اورنگ زیب کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ زیب النساء
 بے گناہ ہے اور خطوط میں افلاقی تہمت پر لکھے گئے ہیں جو شہزاد
 و قاریں اضافہ و تفریع کے ضامن ہیں تو اس نے دھرت شہزادی
 کو آزاد کر دیا اور اس کی تنخواہ اور جاگیر مال و متاع واپس کر دیا
 بلکہ شہزادی کے مخالفوں کو قراقرظ سزا دی تاکہ آئینہ دہش کو
 اس قسم کی جرات نہ ہو سکے۔ گاڑ عالمگیری کے مطالعے سے پتہ چلتا
 ہے کہ شہزادی کی نکل بڑی کی مدت تقریباً چھ سال تو بچنے تک
 تھی۔ اس خط نے شہزادی زیب النساء کا وقار باپ کی نظر
 میں اور بھی بلند کر دیا۔

شہزادی زیب النساء کی عظمت بادشاہ کی نظر میں

حقیقت کے بموجب شہزادی زیب النساء بے گناہ
 ثابت ہوئی تو اورنگ زیب کی نظر میں بھی کی تو قیام اور بھی
 بڑھ گئی۔ چنانچہ ۹۰ھ میں جب شہزادہ کام بخش
 اورنگ زیب کا سب سے چھوٹا بیٹا کی شادی ہوئی تو
 شادی کی تمام رسمیں زیب النساء ہی کے عمل میں ادا ہوئیں

لے کاثر عالمگیری ص ۲۰۶

اور اورنگ زیب کے حکم سے تمام اراکین دربار زیب النساء کی
 ڈیوٹی میں لگ پائے گئے۔ بادشاہ نے شہزادی کو جملہ امور
 میں آزادی دے دی بلکہ اکثر و بیشتر امور میں خود بادشاہ
 شہزادی سے مشورہ لیتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ
 زیب النساء کا وقار بادشاہ کے دل میں کس قدر تھا۔ جب
 بھی وہ باہر سے آتی کہ بادشاہ خود استقبال کے لئے جاتا ورنہ
 شہزادوں کو بھیجتا۔ ہمیشہ سفر ہوا حضر اس کو ہمراہ
 رکھتا تھا۔ کثیر کے دن اور گز اس سفر میں شہزادی زیب النساء
 بادشاہ کے ہمراہ تھی۔ مگر جب اورنگ زیب دکن گیا تو
 زیب النساء نے غالباً اپنی علمی معروضیت کی وجہ سے پائے تخت
 چھوڑ دامناسب نہ جانا اور اورنگ زیب نے بھی اسے مجبور
 نہ کیا۔ چنانچہ اس سفر میں زیب النساء کی چھٹی بہن نیتھ النساء
 بیگم اورنگ زیب کے ہمراہ گئی۔

زبیب النساء بیگم نے شادی نہیں کی

زبیب النساء کو باپ، بھائی اور بہنوں سے اس درجہ
 محبت تھی کہ وہ ان سے بے ہجر کے لئے بھی جلا نہیں رہنا چاہتی
 تھی۔ شہزادہ شہزادہ ہے۔ "بیٹی ماں ہوتی ہے۔" زیب النساء
 نے اس مقولہ کو یقیناً کما حقہ پورا کیا اور پوری زندگی
 باپ کی خدمت کے ساتھ ساتھ بھائی بہنوں کے لئے ماں
 کے فرائض انجام دئے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے
 اس قدر محبت کرتی تھی کہ تا زندگی ان کے لئے ایک مشفق
 سرپرست بنی رہی اور ان کی غلط اوریے جا روضوں پر
 مشفق والدین کی طرح تڑپاؤ آہیں سرزنش بھی کرتی رہی۔
 اس میں کوئی شک نہیں کہ زیب النساء ایک قابلہ
 اور امور مملکت کو سمجھ والی دور اندیش مدبر اور اعلیٰ
 درجے کی ذہین شہزادی تھی مگر وہ شادی کے قیود سے آزاد
 رہنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شادی کے رشتے
 میں منسلک ہو جانے کے بعد، جن خدمات کو افسانہ
 دینا چاہتی ہے وہ شہزادہ قبیر زہوں کے اس لئے اس لئے

وجود الدین دگادگ تا کیر کے شاہی ذکی اور مرتے دم تک
دوڑے باپ کی رفیق کار اور بیانی بہنوں کے حق میں مان بائی
ہی رہی۔

اس نے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں ذبذہ النساء بیگم اور
زینت النساء بیگم کی شادی بھی اپنی مرضی نیز والدین دگادگی
اجازت سے سپہر شکرہ اور ایردو بخش (سپر شہزادہ مراد)
سے کر دی جس کا مصل بیان کاثر عالمگیری میں ملتا ہے۔ شہزادی
کایہ انتخاب منلیہ خواتین کی نگاہوں میں سخیس امر قرار پایا۔
مذکورہ صفات کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہزادی
کس قدر بلند کردار اور پاکیزہ نفس تھی کہ جس کی باطنی ساد
زندگی میں عیب کا کوئی برندا داغ نہ نظر نہیں آتا۔

زینب النساء کی وفات

دورِ خلیفہ کایہ آباد راجہ جس کی شخصیت بذات خود ایک
بیت العلوم (دادی) کی تھی باطنی سال کی عمر میں ۱۷۰۱ء
میں جبکہ عالمگیری کی تحت نشی کا اثر تیسوں سال تھا، دخیل
نگار ایرضوں بھا۔ تہیز و کھنن کے داجبات دلی ہیں اور پورے اور
’ادھی جنتی‘ مادہ تاریخ نکلا۔

اورنگ زیب پر شہزادی کی وفات کا اثر

زینب النساء بیگم کی وفات کی جرحیب اورنگ زیب کو بہت
توختہ غمزدہ ہوا۔ اس زمانے میں وہ فتوحات دکن میں معروف تھا
آنکھوں سے آنسوئیں پڑے اور باوجود انتہائی درجہ میرد استقامت راج
کے مہر کی تاب نہ لاسا۔

بیتا امجد خان، حافظ محمد خان اور شیخ علی اللہ کے نام مکم صادر
ہوا کہ ایساں جواب کے لئے ذاکہ دیرات دیں اور مورحمدا میرہ
تیا دگائیں۔

خانی خانسزہ ملکہ ملکیت میں زینب النساء واثام اور
اس کے واقعات ۱۷۱۰ء بمطابق ۱۱۲۷ھ تک آتے ہیں۔ لیکن یہ مری
علی ہے۔ کاتبوں نے علی سے زینت النساء بیگم کی جگہ زینب النساء بیگم
لکھ دیا ہے۔ شہزادی زینب النساء بیگم کی تاریخ وفات ۱۷۰۱ء مطابق

۱۱۱۳ ہجری ہے۔ کیونکہ اورنگ زیب کی وفات جملہ مورخین کے نزدیک
۱۷۰۷ء ہے اور کاثر عالمگیری کے مطابق یہ حقیقت پائے ثبوت کو
بہت پہنچ چکی ہے کہ شہزادی زینب النساء کی وفات اورنگ زیب کی
زندگی میں ہوئی جبکہ وہ فتوحات دکن میں معروف تھا۔ وفات کی خبر
پر اس کے دلی جذبات کا بھی اظہار کیا جا چکا ہے۔ نیز تہیز میرہ
کی اطلاع کاثر عالمگیری صفر ۶۲۷ھ پر موجود ہے اس لئے میں مکن
ہے کہ ۱۷۰۱ء میں ہی تک جو نام خانی خان کے بیان کے مطابق آیا ہے وہ
زینب النساء کا نہیں بلکہ اس کی چھوٹی بہن زینت النساء بیگم کا ہو۔
مورخین یورپ کی کل کاریاں

ہم یورپ کی علمی فیاضیوں کا شکر یہ ادا کرتے کرتے تک جانتے
ہیں لیکن یورپ اپنی فیاضیوں سے نہیں تھکتا۔ اس نے قید ترین زمانے
کے جو فوارات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں اس سے کسی بھی ہند
ملک کو انکار نہیں۔ مشرکت اور دین کے علاوہ فارسی کے قدیم طریقہ
کو ہتیا کرنے کے سلسلہ جو یورپ کر چکا ہے اور مشہور کرتا رہا ہے
وہ یقیناً قابلِ مسأخرین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کی
علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آپ حیات برسا رہا ہے۔

دنیا کی تمام قوموں کے مردہ علوم و فنون تاریخ اور یادگار ہیں
زین کے بھٹے اثاثہ کر لکھ جا رہے ہیں اور دنیا کی نمائش ہیں
ان گم شدہ جواہرات سے اس طرح سہائی جاری ہے کہ گویا پھل زامہ
اسی سرسماں کی صفائے دوبارہ بہت جلد سامنے آئے والا ہے۔

گر جہاں یورپ کے اہل علم نے علم و ہنر کے یہ شہر پیچھے بھاٹیں
وہاں یورپ ہی کے سبہ دعوام قوم اور مستعبد راجہ کاروں سلاطین علیہ
کی غفلت شکاری، عیش پرستی اور سبہ کاری کے واقعات کو اس
بلند آہنگی سے تمام عالم میں شہرہ کیا ہے کہ مورخ اور تذکرہ نویس
تھوڑی دیر کیلئے غلطی کشکار ہو گئیں تقلید پرستوں نے توان کی
ہم آہنگی کو مستور زندگی بنا لیا ہے۔

انویز منسین کے غلابیائی جو عالمگیر جوقا ہی اس کی
ہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اسی کی پردہ دہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے
تو اسی حق دبان میں جس کی غصیہ ترک نہیں ہوتی۔ اس لئے

سلسلہ درہ غلط نہیں پہنچ گئیں اور ان سے سلاطین منبر کے اخلاق و عادات کی نسبت عوام میں ہماریت ہی غلط خیالات پیدا ہوتے گئے۔

سلاطین کی تصویر پر اثر عام

عام لوگوں میں مشہور ہے کہ سلاطین کی تصویر لڑکیوں کی مشادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو روپیں سفینیں نے بہت زیادہ شہرت دی ہے اور اس سے ان کو شادی بیاہت کی بدنامی پھیلنے میں بہت مدد ملی ہے لیکن یہ قسمہ سرسے ہی سے بنیاد ہے۔ تصویر جاہ و جلال سے جو بھی واقف ہے وہ بڑی آسانی سے فہم کر سکتا ہے کہ مثل سلاطین کس کردار کے حامل تھے خصوصاً ظہیر الدین محمد بابا بادشاہ سے لے کر محمد اقلین محمد رنگ زب و شاہ قازی تک کے سلاطین تو بلاشبہ تصویر جاہ و جلال کے مستحق و ملبرور تھے۔

ایشیائی کی تصویریں

برطانیہ اس کے ایشیائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں صرف جنگ و جدل، بغاوت اور خون ریزیوں کے واقعات کو ہی لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے تاریخیوں کو قصائی کی دوکان بکنے ہیں اور ان کا ہنسنا کسی عزت کا بجا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اگر ان تاریخیوں سے اس جیسے تمدن، شائستگی یا شہساز طرز معاشرت اور دیگر مستحقات زندگی کا پتہ لگانا چاہیں تو بہت کم کامیابی ہوگی۔

اس سلسلے میں ہمیں تسلیم دلائی کے ساتھ ثابت کر سکتے ہیں کہ گیدرن، بیگم، جہاں آرائیم اور شہزادی زیب النساء وغیرہ کے بارے میں جو فرضی افسانے تراشے گئے ہیں وہ محض فلفلہ ہیں۔ ان کی پاکیزہ دنیا، عالی حق، شاندار وقار اور بے پناہ لیاقت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مذکورہ شاہی خاتونیں دورِ ماضی کے وہ آپ دار و بوق ہیں کہ جن کے نام ہی اور اعلیٰ کردار پر تاریخ از متمدن دونوں بجا فخر کر سکتے ہیں اور اس میں جو کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بیگم تہ پاکیزہ ادب اور فن تاریخ کے گڑ سے کا حقدار واقف تھیں۔ کیونکہ ان کی ذائقہ تعالیٰ بیگانہ کی ٹرائی میں جس قدر تعالیٰ توجہ و محبت آئیں۔ ان سے اس زمانہ کی تہذیب و تمدن

بیشمارت کی مقمل تاریخ خاتون کے آئینے میں صاف صاف نظر آتی ہے۔

اخلاق و عادات

شہزادی زیب النساء اپنے بدنامی اخلاق و عادات کی بدنامی پر اورنگ زیب کی نظر میں حدود پر مقبول تھی۔ اسے شاہی اعرار کے ساتھ ساتھ باپ کی حقیقی شفقت پوری طرح حاصل تھی۔ وہ فطرتاً پاکیزہ خیال بدنامی اخلاق اور دراصل فاتح ہوتی تھی۔ احکام شریعت کی پابندی میں وہ بھی غافل نہ رہی۔ بیٹیوں اور سائیکس کی پرورش اس کا خصوصی کردار تھا۔ بیسواؤں اور بابا بھوں کی وہ متقی المقدور عطا کرتی تھی۔ اس کی دربار عادت غربا میں دشروں سے کم نہ تھا۔

علم پوری

شہزادی زیب النساء مذاہب اعلیٰ اور دینی کی فاطمہ تھی۔ اس نے علوم و فنون کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ اس کا دربار ایک ترقی یافتہ بیت العلوم تھا جسے علوم و فنون کی ایک پرمیاری اور ترقی پسند ادا کی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علماء اور ماہرین فن پرورش پاتے تھے۔ زیب النساء نے خود کوئی تعینیت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اس نے اپنی ٹرائی میں اہل علم و فن سے بہت سی عہدہ اور مفید کام میں تعینیت کرائیں

شہزادی زیب النساء کے متعلق عشق و محبت کے فرضی افسانے شہزادی زیب النساء کے متعلق بہت سے غلط اور زبردستی افسانے مشہور کئے گئے ہیں جو کوئی عین پرور نہیں ہے اور بھی لڑا وہ آپ درنگ و کہ پیش کیا ہے قبول شاعر ع

فریاد و درحکایت و راز ترنگت

اوپر چمے ہمارے ذہن میں خاتون میں سرگوشیاں کرنے والے بد اخلاق لوگوں کے بعد روشنی قبول کیا گیا۔ عہدہ میں اس حقیقت پر کلمہ و نیز عہدہ کا تذکرہ ڈالی کہ جس میں شہزادی کو وہ منزلہ رہے ہیں اس میں شہزادی نہیں بلکہ شہزادی ہے جس کا شہر عرف انیس ہی نہیں بلکہ ان کی آئے والی نسلیں کو بھی عاقبتی سے کوسوں دور لگ گئی۔ وہ بھی عہدہ کو بھی نہ سمجھیں کہ ان کے درختی مستحق کے لئے مستحقین نے

کیا کیا فون پسند نہیں رہا۔

زیب انشاء بیگم بھی پانچ سو روپے دامن اور پاک نعلین خانوں پر جان بہت سے فرضی افسانے فروغ نے تصانیف میں ان میں عاقل خان دلازی اور ناز علی خان کا فرضی نقشہ بھی دکھلایا گیا ہے۔ عاقل خان کے بارے میں یہاں تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کہ زیب انشاء اسے چوری چوری علی میں ہلاقی تھی۔ چنانچہ ایک گیزر نے اس کی اطلاع اورنگ زیب کو کر دی۔ اورنگ زیب اچانک زیب انشاء کے محل میں داخل ہوا۔ شہزادی کے لئے جب کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تو عاقل خان کو حامی کی دیگ میں چھپا دیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے انجان میں کڑی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ عاقل خان نے باز کے ظاہر ہونے کے انزلی میں دم مارا اور جل کر رہ گیا اور مرنے کے وقت اپنے خون سے دیگ کی دیوار پر یہ مطلع لکھ دیا تھا

بعد مری زینتے تو اگر یاد کنم

از کھن دست بروں کرم و فریاد کنم

صدائوس ہے ایسے عقل و دانش پر کہ ہنوز ہمارے قارئین میں اکثر و بیشتر ایسے محفرت طیس گئے جو ان فرضی افسانوں کو حقائق کی حد پر لکھ اس سے بڑھ کر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس دور میں جس قدر بھی پر مہیا کرتا میں کھیں گیش اور جھیں ہمارا حلقہ ادب مستور کتاب کا درجہ دیتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی اس قسم کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا۔ عالمگیر نامہ کا ترجمہ گیری، آثار الامارہ۔ فرہ ازمانہ سرمد آزاد اور سہیلینا ویرہ ویرہ میں ایک جوت بھی اس واقعہ کے شائق نہیں ملتا۔ حالانکہ اس کی واقعات کا تذکرہ سب سے ملتا ہے جو، ۱۱۰۱ میں واقع ہوئی۔ اردو میں بھی ایک کتاب محض تبارقہ مناد کو تذکرہ لکھ کر عاقل خان دلازی اور شہزادی زیب انشاء بیگم کے نقشہ پر ناول کے انداز میں شائع ہوئی ہے جس کا نام مردم سال عرف زیب انشاء بیگم رکھا گیا ہے۔ دوسرا بہتان شہزادی پر ناز علی خان سے عشق و محبت کا ہے جس میں شاعر اور مناد پر مست تاجروں نے ادنیٰ میاں شاعروں کے معیار کو پامانی یا اثری کے

چند ٹکڑوں کے عوض خرید لیا ہے اور ان کے چند شمس و ن کو زیب انشاء کی طرف منسوب کر کے اور عاقل خان کی طرف سے خاطر خواہ جواب دوا کر شہزادی کی پاک دامنی پر بدنامی داغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ زیب انشاء یہ مصرعہ کہا

ع ازہم نمی شود ز سلوات جلالیم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے مگر دوسرا مصرعہ اس کی جولا نہیں ہوتا تھا چنانچہ ناز علی خان کے پاس کچھ کر بھیجا۔ اس نے جبرست کہا کہ

ازہم نمی شود ز سلوات جلالیم

شاید رسید بر لب زیب انشاء دلم

لیکن جو شخص تیویوں کے جاہ و جلال اور آداب و آئینے سے ذرا بھی واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ غریب ناز علی کو خواب میں بھی اسی گنتی کی کجرات نہیں ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ اگر وہ دوسری جرات کر بھی کر سکتا تھا مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پاک دامنی شہزادی کی عصمت اور پاک دامنی سے گستاخی کی جرات کرتا۔ چند کتابوں میں یہ بھی دیکھے ہیں کیا ہے کہ معروف تاجی کے خلاف شہزادی کو عصمت ختمہ کیا اور اس نے ناز علی کو کچھ کر بھیجا کہ

تا مر علی بنام علی کردہ پینا

درد بردا لقا ریحی مر برید ممت

مگر یہ سب سے واقعات میں سے ایک ہے کہ غلطی میں جن کا کوئی مستقل ثبوت نہیں ملتا۔

شہزادی صاحب دیوان نہ تھی

دیوان صفی کے نام سے جو کتاب قطبی ہوئی ہے اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شہزادی زیب انشاء ایک اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھی اور شاعری میں عمیق تفہیم رکھتی تھی۔ چنانچہ اس سے منسوب کر کے ۲۱۸ صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں تقریباً ۵۰۰ م غزلیات درج ہیں۔

کتاب جناب شمش بٹن نارائین صاحب بھارگو، لکھنؤ و لکھنؤ لکھنؤ کی زیر سرپرستی شائع ہوئی ہے۔ طباعت کی تاریخ جولائی ۱۹۶۹ء ہے اور شائع کنندہ جناب مولانا عبد الباقی آفیس لکھنؤ ہیں۔

یہ اہم موضوع بحث ہے کہ میں ہندوؤں کی موصوفہ کے بارے میں
مقبول تاریخی حوالوں کے ساتھ یہ ثابت کر سکوں کہ زیب النساء کے پاس
میں علقہ علم و ادب میں جو علقہ فہم و فہم ہیں ان کو دور کیا
جائے اور ان تمام لوگوں کو دندان شکن جواب دیا جائے جس کا
سراپا معلومات تمام تر بآزاری قصہ ہیں جو معنی بے سرو پا ہیں اور
جنہیں صرف بجاوق غرض سے لکھا گیا ہے۔ جو بلاشبہ ہندوؤں کی موصوفہ
کے بلند کردار پر بدنامی ہے۔ جس کا عالمگیری کی کسی تاریخ یا تذکرہ
میں یہ نہیں ملتا کہ زیب النساء ایک اعلا درجے کی شاعرہ تھی اور
محققہ تھیں کرتی تھی۔ اس دور کی سب سے بہتر اور پڑھاؤ تحقیق کتاب
فرسین الزماب ہے جسے احمد علی غریبی نے لکھا ہے۔ مگر اس میں
بھی کوئی نکتہ ایسا نہیں ملتا جس کو درست دی جائے۔ شکر کہ لینا
ایک انگ بات ہے اور صاحب دیوان ہوتا ایک الگ حقیقت
ہے۔ البتہ ہندوؤں کی تعریف میں سے زیب النساء کی انمشآت ایک بہتر
کتاب کا بیج جلتا ہے جو ہندوؤں کی زیب النساء کے خطوط و رقعات کا
مجموعہ ہے اور یہ عین حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے اپنی سرپرستی میں
اہل فن سے بہت سی عہد کتابیں تصنیف کرائیں۔
چونکہ ہندوؤں کی ادبیات ایک نہایت ہی نایاب اور نادر
قسم کا بیجیت العلوم تھا جس میں ہر علم و فن کے علماء اور فضلاء و فک
تھے اور جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ ہندو
جس قدر کتابیں بھی اس اکیسویں سے شائع ہوئی ہیں وہ ہندوؤں کے
نام سے موسوم ہوتی تھیں۔ لیکن ان کتابوں کے نام کا پہلا جز "زبان" کا

فصل ہوتا تھا۔ اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اور
ان لوگوں نے ان کتابوں کو زیب النساء کی تصنیفات یا تصانیف میں
شمار کیا ہے حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔
زبان النساء سے تصنیف و تالیف کا جو محرک قائم کیا تھا اس
کے ساتھ ایک غلیظ نشان اور عیاری کتب خانہ کا ہونا بھی ضروری
تھا جس سے معنی میں فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ ہندوؤں کی موصوفہ
نے ایک نہایت ہی غلیظ نشان اور عیاری کتب خانہ قائم کیا۔
محققہ آثار عالمگیری کا بیان ہے کہ جو کتب خانہ ہندوؤں کی
زبان النساء نے قائم کیا اس کی تیسرے کی نظر سے نہ تو رہی ہوگی
محققہ موصوفہ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

”در سرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ منظر بیچیک
در قیامہ باشند (ص ۵۳۹)“

تذکرہ حالات کی روشنی میں ہمارے فاضل ناظرین ہندوؤں کی
موصوفہ کے بارے میں بہتر سے بہتر رائے قائم کر سکتے ہیں۔

اس مختصر مقالے کی تیاری میں درج ذیل کتابیں زیر مطالعہ رہیں
آئینہ الامراء۔ آثار عالمگیری۔ تذکرہ ملا اثرات۔ وقایع عالمگیر۔
رقعات عالمگیر۔ عالمگیر نامہ۔ خزائن عامرہ۔ تذکرہ نفرت علی خان۔
مقالات شبلی، دیوان معنی۔ ہندوستان پر مغلیہ حکومت۔ دارالاشکوہ
(رلفسن اینڈ ورکس) معتمد بکساجیت حسرت۔ پرنسپل موزم د
عیاری مقالات و رسالات اردو۔

ہندوؤں کی گزارش

- ۱۔ کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھے
- ۲۔ جو خطبہ مضامین اسی صورت میں واپس لکھ جاتے ہیں
بلکہ مناسب سا لفظ اور لفظ ان کے ہمراہ ہوں۔

قدم ملا کے چلیں

پگل نہی ہے شفقِ عارضِ تخیل پر
دلوں کے بھول فرام سے اڑ پڑ نہیں
افنی پڑ ہونڈھ رہی ہے ذہنِ نقیضِ قدیم
نگاہِ فکر کے پنوں میں اب اسیر نہیں
ہر ایک موجِ بوجھل میں آج رقصاں ہے
کسی کی ذلتِ مسلسل سے کم شریہ نہیں
وہ روشنی سی برسی جتنی چو بھاگدہ، سن کر
اب آفتاب ہے، کروڑوں کی اک لکیر نہیں
پہلے رملے عروسِ بہار کا آغوش
کسی کی آنکھ میں اپنی نگوں کا زیر نہیں
فلک سے جھپکے مانجے گپ گھاؤں کی
ہم اذیت دے کے بجادی کوئی فیروز نہیں

ہمارے ہاتھ پر رقصاں رہی ہیں تعبیریں
جو چھو بھی ہیں تو بہیں پتھروں سے تویریں

زمین کی گود بھریں روشنی کے پھولوں سے
فضا کو راگینوں کی مدھر دھنوں سے بجا رہیں
سیاہی شبِ حیران کو مات دے آئے
جلا رہی تھیں علی روشنی کے شہر رہیں

بہارِ اللہ و گل سے نقاب اٹھا کے چلیں

یہ راہ راہجوں ہے قدم ملا کے چلیں

•

یہ دیس امن و اہتسا کے دیوتاؤں کا
یہ دیس رشیموں کا، گندھروں کی نساؤں کا
یہ دیس بھجوں کا، میلاد کا، کتھ دؤں کا
یہ دیس ہر دؤں کا، ہنسوں کا، خاتاؤں کا
یہ دیس ہیروں کا، رانجاؤں، رطلوں کا
یہ دیس غلوں کی گیتوں کی ایسراؤں کا

یہ سرزمین کہ جہاں لوگ گیت کا جا دو
پکارتا ہے کہ سیلے میں چاند چمکا لو
پیام دیتی ہے نازک کھڑکیوں کو شفق
گدازِ مانتوں پر ہندی کی آگ دہکا لو
کتھالی کی تھریک اچھائی کرتی ہے
یہ روشنی کا وطن ہے نظر کو بھٹکا لو
ملاش کرتی ہے خلوتِ بسنت کی باللا
یہ میگھ دوت کی دھرتی ہے جام بھٹکا لو

یہ سرزمین جو ہے گیتا کی ادھر پڑاؤں کی
شباب پر ہے کسی جنگی ہرن کی طرح
تسے کھڑے ہیں جس بھت مثلِ قوسِ قزح
ہمک رہی ہے فضا بونے پیریں کی طرح

سے 'افنی' پڑاؤ ناؤں میں اُجالا ہے
سیاہ رات کے ترکش میں کوئی بیز نہیں
خارج لینا ہے ہر سنگِ پیرس سے جنوں
جنوں سے مرید جنوں مافی العزیر نہیں

ادب اور مقصدیت

اس لئے انھیں کے بطن سے نکلے ہوئے ادب کا مقصدی رائے اختیار کرنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر چونکہ ادبی مباحث میں بھی ملک پر غرض اور بنیاد نقطہ ہائے فکری کی اور انہماک جذبات کی بہت ہے اس لئے ادب کے ساتھ مقصدیت کا یہ قدیم تعلق اب بھی سب کے لئے دیکھ قابل قبول نہیں ہے۔ حالانکہ ادب نگاری ایک شعوری عمل ہے اور ہر شعوری عمل کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا لازمی امر ہے۔

چونکہ اکثر مقامات پر ادب کا آغاز شعری سے ہوا ہے اور تندر ابتداً داخلی جذبات کی کارخانہ رہا ہے اس لئے یہ مان لینا چاہیے کہ شکر گوئی کے ذریعہ اجتماعی مقاصد کے حصول کا جذبہ ابتداً لاسعوری طور پر ہی نمودار ہوا ہوگا۔ چنانچہ عرب کے دور جاہلیت میں شعراء شاعرانہ کے ذریعہ اپنے فزیری جذبات کی اظہار کو نہتہائے کمال خیال کرتے اور سامعین کی داد سے مسرور و ملبس ہو جاتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ عربی شعراء میں شکر کے ذریعہ اجتماعی مقاصد کے حصول کا جذبہ تلبیہ تھا بلکہ قیامی طرز زندگی کے زیر اثر پس پردہ باتوں کو بھی بے باکانہ ظاہر کر دینے والے آزاد جذبے کا شکر کی فنی وجود منظور کرتا اور رفرغ شعراء کی آزاد لہجہ کا شعری سنوئی کیفیت سے ’عجز دفعتاً دگ‘ جیسے متضاد میلان کو لازمی قرار دینا اور چال مشاق کا اپنے محبوب کے لئے سرودھڑی بازی دینا ظاہر کرتا ہے کہ شعراء کے سنجیدہ لہجے نے غلطی کے جذبات پر جب شکر کی اہتماماً تیز چلنی ہوئی تو شعراء کے اس فزیری و مفید پیش قدمی سے بدل کر شکر کو

ادب چونکہ ایک لطیف فن ہے اس لئے اس کے ساتھ مقصدیت کا جامد تصور لٹا برعکس سامعین ہوتا ہے مگر چونکہ تاریخ ادب کو سب مقصد قریب نہیں بتاتی اس لئے مناسب یہی ہے کہ ادب ماضی کا سرسری جائزہ لے کر ادب کو مقصدیت سے ہم کنار کرنے والے قدیم اسباب پر سنجیدگی سے غور کریں اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں۔ یہاں سنجیدگی میں نے اسی لئے کہا ہے تاکہ مقصدیت اسے کسی ایسی شے اور جامد افادیت ہی کا تصور نہ کیا جائے کہ پھول کی لطیف افادیت مشکوک اور مقصدیت کا مفہوم محدود ہو جائے کیونکہ ادب شعری طور پر کسی مخصوص مقصد سے ہمنما رکے جانے سے قبل بھی اپنی باطنی و لطیف افادیت کے اعتبار سے مقصدی ہی رہا ہے خواہ وہ مقصد داخلی ہم کر خارجی افزادی ہو کر اپنی ہی۔

ظاہر ہے کہ کسی بے مقصد قریب کا مذہر رہنما کی شکل سے یہ ایک وہ مدیں تک داغ رہے اور عالمگیر حیثیت سے مشہور و مقبول ہو کر نہ تہذیبی بھی ہو اور ذریعہ انقلاب بھی۔

سامی روایت کے مطابق ادب کی ابتدا آدم کے کلام حوزوں سے ہوئی جس کے پس منظر میں ان حد لڑکوں بائبل و قابیل کی متضاد طبیعت اور ایک کے انھوں دوسرے کا قتل تھا، مگر فرزانہ آدم کی یہ طبع تعلیم شکر گوئی یا ادب کے لئے حوزوں ہونے تک محدود اور موسیقی و وجود ہی پہنچے تھے، گوینا ادب ان کے بعد ظہور پذیر بن سکتا ہے۔ اور چونکہ موسیقی و موسیقی سے ابتدا میں برسوں تک مذہب ہی وابستہ ہی کام ہی لے گئے ہیں

یورپ کے برخلاف ایشیا چونکہ سو سو پہ صدی مسیحی میں اسی
شاہی دور ہی سے گزر رہا تھا اس لئے ایران کے ادب میں انتہائی مختصر
کوئی واقعہ اور گہری تنقید لاشعری نہیں ملتی اور ہند کے ہندو
ادب میں کوئی نادیدہ و مقصدی جہد و جدوجہد نظر آتی ہے اور مشرقی سمجھے
یونان کے ہندوستان کا فارسی ستروادب ابتداً ایران ہی کے اثرات قبول
کر رہا تھا بلکہ انھیں ان اثرات کے تحت کئی ایرانی شواہد و سرشتان مل گئے
تھے جن میں سے کچھ اگر وہاں خاندان کے دوبارے شاعر ہو گئے اور کچھ
لوگوں نے اور یہی پوری سلطنتوں میں پس گئے۔ ہندوستان میں فارسی
ستروادب اور تعلیم و فن کے بنیادی اسباب یہی حالات اور دوبار
کے فارسی شاعر ہوتے جو درمیان رفتہ عوام تک پہنچ گئے اور ادب و
بھی چونکہ کچھ زمانے بعد قریبی یا غرض زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی
اس لئے فارسی مشاعروں کے ساتھ ساتھ ادب و شاعری بھی شروع
ہو گئے۔

مارچ ۱۹۶۲ء

سے جہاں اخلاقی حیثیت سے اہم و نفع کا جذبہ عام تھا اور شعری پس
خبریات و تعلیمات کی داروغہ بنی پڑی وہیں اس کے لیے تیز ہونے سے
مقصود ادب کی غلبہ سے قطع نظر ظفر اور انایت کا شکار ہوئے یہی
دلفریب و رفتہ رفتہ انفرادی فضا جگہ تھی اور صوفی شرا و کی مصلحت، امیز
خاموشی و سنجیدگی کے غزل پر نوازان ہو گئی۔ اس نوازان کو ظفر حافظ
نے لطافت، عشق اور عجب تہویر سے دست، جس کی وجہ سے عسقل
برقی کرتے کرتے ہندوستان تک پہنچ گئے۔ ایمان شرا و ہی عسقل کی

کا اہم مقام و استعارہ اسلوب سے ماہر معلوم ہونے لگا، بلکہ اس لحاظ سے اور کچھ دوسری زبانوں کے متعلق ہیں اور شاعری کی بے باغی کے خیال سے خصوصاً محسوس آزاد اور عالی کو ادب میں ایسا ہمراہ اور فائدہ دینا اور انقلاب کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی جس کا ادبی نتیجہ اصلاحی نوعیت، تخلیق آزاد اور مقدمہ شہرہ و شہرہ کی ہر طرف میں رونما ہوا جس کے اثرات اس لحاظ سے یقیناً مفید ثابت ہونے کے مستند و اہمیت کی بنا پر کھلی ہوئی مگر مٹی مٹی کی نظم میں بدل کر سیاسی مقصدیت سے بھرا ہوا ہوئی اور جیسے جیسے مقصدیت سے تیز ہوئی گئی دینے والے شعراء ادب میں سیاست درآئی گئی۔ چنانچہ رشتہ رشتہ آقبال، اکبر صریح، جوش، فرات، اور سیاح و غیرہ نے شاعری کے ذریعہ سیاسی کام کا آغاز کیا۔ اس سیاسی گیر کار آمد کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب پر بھی بڑا چٹان پر تنگ شاعری کے لئے ٹیڑھے کچھ عرصے میں لائیں اور مرثیہ اور گنتی شاعری کے لئے بھی اپنے طور پر رنگ و روپ اختیار کیا، بلکہ مرثیہ شاعری تو اس سے قبل ہی اپنے آپ کو تادریست و تادریست سے جانے اور 'ماہل' سے بھرا کر کھٹے کھٹے ٹھوس پے پے لگی جس کے نتیجہ میں بھیگتی 'شاعری' کی جگہ 'شاعری' وجود میں آگئی مٹی مٹی کے دو مقصد پسند اور ماہل پرست مضامین پھار ڈال دلاؤنی بہت مقبول ہوئیں چومرثیہ کتابوں میں کام کر سنا جاتی تھیں۔

فرح ملک پر انٹرویو کے قلم کار اور اسلامی قریب کے ذرا اثر عام ادبی فضا مقصدیت کی طرف کھینچ رہی تھی۔ چنانچہ مذہب، سماج، تعلیم و تربیت، ادب، فن اور تہذیب و تمدن بلکہ ہر شعبہ حیات پر تنقید کی نگاہ پڑنے لگی۔ لہذا اس تغیر کا اثر اردو تنقید پر بھی پڑا جو اب تک بعض تذکرہ نگاروں کی حد تک محدود رہی تھی مگر کوئی منفرد و تنقیدی مقام نہ تھا، چونکہ حالات بدلنے سے شاعر 'ہلم فہم' یعنی وارد تنقید منصب سے اتر کر عام سماجی افراد کی صف میں شامل ہو گیا تھا اس لئے تذکرہ نگاروں پر بھاری دھن چارچہ ہو کر کے ساتھ ساتھ 'شعر' کو شاعری و زندگی کے پس منظر میں دیکھنے کی پابندی بھی عاید کردی گئی جس کے کچھ اثرات آزاد کی 'اہم حیات' میں جھلکے ہیں تذکرہ نگار یا ناقد پر اس پابندی کا اثر تو مفید نکلا کہ شعراء چونکہ

گئے اور شعر میں کھلی داخلیت کے جگہ حقیقت پسندی کا رواج شروع ہوا ایسی ہی اچھا نہیں ہوا کہ شعر کو دنیا پر لانے کی بجائے مقصدی آمد سے ناپنے کی وجہ سے 'تنقید' — فن میں — تخلیق لطافت و تاثیر پیدا کرنے کی بجائے مقصدیت کی رو میں آئے 'تخلیق' کی رہی سی لطافت و جاذبیت کو بھی جبر و زوری سمجھ کر ختم کرنے لگی جس کی وجہ سے تنقید و تنقید کی روایت طبع اور بھی دینے اور بلند ہونے لگی جواز کے لئے کے اعتبار سے قابل مذمت ہے۔ میں، ناموں میں گرد و تنقید کے اتنے عرصے بعد بھی تخلیق جاذبیت و کشش سے دور ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے اردو شعری طرہ اردو تنقید کو ایران یا عرب سے مدد مل سکی کیونکہ خود ایران ماہر شرقی اختلاف کی بنا پر عربوں کے فن نقد سے استفادہ نہ کر سکا تھا تاہم اردو تنقید کی سرابی کے محدود ہونے اور فاضل خورشید کے تنقید پسندی سے دور ہونے میں یہاں کے ناقدوں کی شد پر مقصدیت پسندی کا بھی خاصا دخل ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب شاعری میں داخلی مضبوط ادب اور تنقید بھی مقصدیت سے بھرا ہو چکی تھی، ایسے حالات میں ناممکن تھا کہ اردو ناول متاثر نہ ہوتا مگر موزوں کی ایک ذائقہ افکار رنگ کی صنعت ادب بھی اردو میں سے ہندوستان کو حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ رقیق تا قدر شاعر کو سرمد انیسز کا ناول اور عبد الحلیم شرر کو اسکاٹ کا ناول ٹیڈس پڑھنے کے بعد ہی ناول نگاری کا زیادہ شوق ہوا اور چون کہ ناول کے ذریعہ بلکہ چھپنے چھوٹے مقبول اور مسموم یا مسموم پسندوں کے ذریعہ بھی مرثیہ میں سیاسی و سماجی کام کیے جاسکتے تھے، اس لئے ناممکن تھا اردو کے ناول نگار خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد ادبی مقصدی فضا میں ناول کے ذریعہ اجتماعی کام دیتے۔ لہذا تذکرہ نگاروں میں تو تیز انصاف، عراۃ، نوکوس اور فاضلہ بیگم، اور مرثیہ کے ناولوں میں شاندار جام مرثیہ اور سیر کسار میں رحمانت اور زندگی کے عملی مقصدی حقائق کی ترجمانی ہوتی ہے لہذا اسی کے ساتھ جس طرح حالی سنے مسدس کے ذریعہ اور بعد میں حالیہ شاعر سیتل مرثیہ نے اپنی

نظم، بہت بجا دقت کے ذریعہ کارنامہ لائے اسلاف شاہراہ اپنی خوابیدہ قومن میں جہد و جدلی کی نئی روح پھونکنا چاہی اسی سلسلہ ۱۸۵۴ء کے حالات میں مسلمانوں کے دہشت گردانہ قبیلوں اور انتہا و اضطراب کو قوت ملی سے دہشت گردانہ شہر سے قدیم مسلم تاریخ کو اپنے ناولوں کا موضوع بن کر ایک حرکت دی گئی کام انجام دیا اور انقلابی حالات میں قواؤں پیدا کرنے کے لئے سرسید اور ان کے رفقاء کا انجام دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں بنگال میں ٹیکم چنڈ اور مرہٹوں میں آپٹے نے بھی ناول نگاری کوئے اور افادی طریقوں سے چکا کیا۔

اس دور میں آزادی کے موضوع پر ڈرائے بھی لکھے گئے لیکن کچھ حنفیت ڈرائے کے تمام ضروری پہلوؤں سے پر اعتماد واقفیت نہ ہونے اور کچھ پیش قدمی نہ ہونے کے سبب یہ ڈرائے مشہور و مقبول نہ ہو سکے۔ ان کا ایک ابتدائی سبب اردو ڈرائے نگار کی مغربی ڈرائے کی سرسری و سطحی تقلید بھی تھی۔ تاہم مقصدیت کے اعتبار سے بغول اشتیاق صاحب مشقی رامیشور پرشاد کا ڈرائے 'آزادی' قابل دہلی کا 'محاشی کی رانی'، شیر محمد خان کا 'سکینا جارت' اور سکیم احمد شجاع کا 'جارت کالال'، لائق ذکر ہیں کہما جانا ہے کہ محمد عیسیٰ آزاد نے بھی ایک ڈرائے لکھا تھا جو تاں کہ رو گیا در نہ وہ ادبی اعتبار سے اندو کا پہلا ڈرائے کہلاتا۔

چونکہ آزاد نگار کے باب میں بھی ہندستان بڑی حد تک مغرب ہی کا منظر تھا اور پھر اس وقت تک یورپ میں آزاد نگار کے بھی عجیب اور مہیا سال کے دوراں سکول مسٹر سید اختیار کر چکے تھے اس لئے ان کا اثر جدت یافتہ آزاد نگار پر بھی پڑا۔ اس اثر کا ایک سبب عجوبت کی عینیت کہانوں کی فضا بھی تھی جو ہندوستانی فضا سے ممانعت رکھتے تھے جس کے زیراثر ابتداء میں کچھ انگریزی کہانوں کے تراجم ہوئے اور پھر ان میں سے بعض ذاتی کاوش کے جوہر دیکھنے کی فضا عام ہوئی۔ اس سلسلے میں سجاد جیلانی، جلیل ندائی، اختر عیسیٰ راستے پوری اور ہندوئی گوکھپوری کے نام لے جا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مقصدیت کا سلسلہ اور پہلے رنگ پر چاہئے جنوں میں نئی اور تکنیکی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں میں یورپ کے رومانی ادب سے متاثر ہو کر لیفٹ احمد اکرام بادی، تیار خٹخٹ پوری اور حجاب امتیاز علی نے بعض ایسے افسانے لکھے جن میں مقامی و قومی فضا کی بجائے جماعت، خنایت، پائی جاتی ہے۔ لیکن ابھی یہ رومانی افسانے کوئی مستقل حیثیت اختیار نہ کر پائے تھے کہ سرسید صدی کے سیاسی تقاضوں نے شعور عام کو پھر مقصدیت کی طرف متوجہ کر دیا اور افسانوں میں بیرونی اثرات کی بجائے مقامی حالات کو سمونے کے میلانات ابھرے گئے۔ چنانچہ پریم چند نے روایت پیری کے باوجود اپنی کہانی نئی لکھی جس میں بیرونی اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں اور جس میں مقامی حالات حقیقت پسندانہ صورتوں کو کئی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، اس سلسلے کی قابل ذکر گریٹاں سندھی، اعظم گریوی اور علی عباسی ہیں۔

دیکھ کر شعور و فکری طرح ناول اور افادی تفہیمات میں تاریخی و ادبی اختیار پسندی جھلکتی ہے۔ چنانچہ شہر نے ناولوں کے ذریعہ سراسر مورخانہ درپہانہ کام لینا چاہنا اور شعری راہشور اور لائق دہلی نے ڈرائوں کے ذریعہ کیرا انقلابی اور ان کے برعکس تیار و حجاب و فرہ نے سراسر رومانی و جمالی، ہندو اں پریم چند نے پھر وہی ملی و مقامی کام لینا چاہا جس کی وجہ سے ناول، کہانی اور افسانوں کے مستقل اتنا کشیز موادم ہونے کے باوجود وہ ادبی اعتبار سے ایسا نہیں ہے کہ جس کی روشنی میں ان اصناف کے مستقبل کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔

فرخ ۱۸۵۴ء کے سیاسی تیز کی وجہ سے کئی سال تک شعروادب کی دنیا میں مقصدیت کی کٹ کٹ کشن جاری رہی۔ لیکن مقصدیت کی اس جذباتی زندگی میں ادب کی فنی و جمالی پابندیوں کا خیال نہ کرنے سے ادب ادبیت سے قروم ہو کر سپیٹا ساہونے لگا اور علی گئے اس غیر فنیاتی 'انارخیا سانی' سے دل اندر

عہ قاضی معنوں نگار اس راستے سے پیش اپنی اور کو اختیار داوار

یہ اندر بچے اور بچانے کا ٹیکہ اسی مشہور عامرڈل کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہو سکا تھا کہ ۱۹۳۶ء میں انہی ترقی پسند مصنفین کے قیام سے شہر وادب کی دنیا میں مقصدیت کی خاطر پھر یہی ۱۸۵۷ء کا ساففلر ٹھا۔ ان دونوں فرقوں میں فرق محض اتنا ہے کہ وہ تحریک ملک میں سیاسی انقلاب پیدا کر دے حالات میں قانون پیدا کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی اور یہ انقلاب پیدا کرنے کے لئے اس کے پیش نظر داخلیت کی تردید اور صداقت پسندانہ ادبی ترقی تھی اور اس کے پیش نظر سرمایہ دارانہ نظریات کی تردید اور اشتراکیت کی اشاعت و تشہیر۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے بدھ ۱۹۳۶ء سے پہلے کے ادبی موضوعات ہی میں سرمایہ دارانہ ذہنیت دیکھی بلکہ اس کے اسباب بیان میں بھی انہیں غیر جمودی لگتی محسوس ہوئی۔ یہاں میں نے "فرہموری" داستان کہا ہے، لیکن ان اسباب سے بغاوت اگر ان کی ایسا ہیثیت کی بنا ہو، پھر یقیناً ترقی پسند کے نئے نظریات کی مکمل وضاحت کے متافی تھی تو قطعاً کم از کم اپنے نظریات کی وضاحت کے بعد ایسا ہیثیت پر بازی سے باز آتا اور پرانے اسباب اپنانا ٹیکہ ایسا ثابت نہ ہو سکا بلکہ وہ اپنے نظریات کی تعمیل و تشریح کے بعد بھی اس اسلوبی بغاوت پر ڈٹتا رہا۔ چنانچہ شہر وادب میں ادبی انقلاب اور استعارات و تشبیہات کی مخالفت اس نے بعد ازاں بھی کیا بجائے سرمایہ دارانہ ذہنیت پر دھکی۔ حالانکہ کم از کم استعارات و تشبیہات کا قطعاً کسی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے قطعاً غلط داخلی جذبات کی رنگارنگی و پیچیدگی کو کم سے کم ان الفاظ میں دلنشیں طور پر ظاہر کرنے سے ہے۔ اس سداقت سے ظاہر ہے کہ ان کا مقصد ادب میں سادگی، بیان کے سادہ سے میں تسلیم و صحت مند روایات کی مخالفت اور اشتراکیت کی تشہیر و اشاعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تنقیدہ جہتوں نے ادب میں سادگی، بیان اور حقیقت پسندی کو منہ خیال کرنے کے باوجود ترقی پسند نظریات کا ہر پیرہہ مقدم نہیں کیا۔ اس گزرتے کہ جس میں ترقی پسندوں کا مثال انجی عناصر لب و لہجہ اور ان کے نظریات کی روایت پر بازی بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر بات کے کہنے کا ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ نہیں

ہوتا تو شیخ اور تاج اپنی باطنی ہمدردی و رفاقت کے باوجود بدنام ہو جاتے ہیں اور ترک مشرب پر آمادہ رندی بھی مشعل ہو کر تہذیب و شراب کی سوچنے لگتے ہیں۔ کچھ یہی حال سادگی پسندی و حقیقت پسندی کی تائید میں ترقی پسند کے بعض نئے نفسیاتی بیانات کے سبب ہوا۔ چنانچہ یہی تقدیر پسند نے سادگی، الفاظ کو منہ خیال جاننے اور ان کے باوجود ادق و انصاف کی ایسی عجیب عجیب تاویلیں کر خدو کی بنیادیں جس کی وجہ سے بہت دنوں تک ادبی مباحث کا کافی مقبرہ اور اہلستان نشین ترقی پسندوں کا مرکز تھے، نئے نظریات، ٹھٹھکے ہوئے۔ اس ادبی انقلاب کا کسی ایک طبقہ کو ذمہ دار ٹھہرانا انصاف نہیں ہے۔

ترقی پسندوں کی ایسا ہیثیت پر بازی سے خصوصاً غرضل کچھ دنوں تک متاثر اور نظم منبری اور دفتر رفتہ" شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل کی "کافیانہ" نے تیرہری۔ لیکن کچھ دنوں بعد نظم کی بے جا اور انکا دینے والی روایت اور خشک و بد مزہ تفصیل کی وجہ سے غزل کی اداسی دہری ہے اختیار زیادہ لگے گی اور ترقی پسندوں نے بھی جڑ بکھرا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ ابتداء میں غزل کے ذوقی نمونہ دوران کے پڑے میں ایک طرح سے غزل کی مخالفت ہی کا کام لیا۔ تاہم کچھ دنوں بعد غزل پوری توانائیوں اور جوان خط و خال کے ساتھ ابھر کر سامنے کے مستقل ادبیات سے ہم کنار ہوئی۔ چنانچہ اپنی ترقی پسندی کے باوجود خصوصاً فراق، فیض، مجاز، جہیز اور جرج و جرجہ نے غزل میں نئے دور ان کے ساتھ ساتھ جرج جان کو بھی لٹھ لٹھا۔

گھر چوگر اپنے مٹا مٹا اشتراکی تصور رکھنے والی یہ ادبی و سیاسی تحریک مجموعی طور پر اس ناقابل نہیں تھی کہ وہ پیچیدہ زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو سکے اس نے وہ آزادی کے کچھ سال بدھتم ہی ہو گئے۔ لیکن یہاں یہ بات ماننا پڑے گی کہ اس ادبی تحریک کی بدولت ادب میں بنیادیں، اعتبار سے سادگی اور انادیت پسندی کا میلان عام ہوا، ادبی موضوعات کو دست اور شاعری کو کچھ "نئی" بحری ضروری لگش جی کی اقدایت سے انکار کرنا انصاف نہیں ہے۔

اس تحریک کی عدم کامیابی سے ظاہر ہے کہ ادب نئی و جمالی قیود سے بغاوت کر کے اور وجدانی پہلو پر مقدمی پہلو کو ترجیح دے کر اپنے

مقام میں کسی حد تک کامیاب ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۳۶ء کے یہ مادی سیاسی تحریکات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور ادب کو ماحول کے تاثر سے بنائے دیں ہیں بطور خاص پیش کے پڑتے ہیں لیکن اگر عارضی تحریک سے یہ افادہ کرنا درست نہیں ہو گا مادی تحریک یا ارتقا کے بغیر مغل و نغز کا ارتقا ناممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جدیدیاتی مادیت کا فلسفہ فخری و حقیقی کہلاتا لیکن تاریخ کے بعض اہم ادوار اس فلسفہ حیات کی صحت اور اہمیت کی نفی کرتے ہیں جس کے متعلق متنازعہ عرض کر چکا ہوں۔

ادب کو صد فی صد ماحول کے تاثر یا کسی سیاسی نظریے کا پابند بنادینے کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ ماحول کے بدلے پر بدلے ہوئے ماحول کا ادب اس کا بل نہیں رہتا کہنے ادب کا دامن اس سے باز رہنا چاہئے اور ادب کہنے ظاہر ہے کہ یہ تسلسل لازمی چیز ہے۔ فرض کیجئے ہم ادب کو سادہ فرض میں لطیف لائق پر لو کہ مرثیہ ماحول کی سودگی کا ذریعہ بنا دیتا چاہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ماحول کی سودگی کے بدر ہم ادب سے کیا کام لیں۔ کچھ کہیں کہ فخر ادب روک دیا جائے گا اور پھر ماحول کی سودگی کے بغیر فحاشیا کی طور پر تیزی سے اُبھرنے والے ان لطیف تھاموں کی تکمیل کے لئے کس سے مدد چاہئے گی جواب تک ہجوک کی وجہ سے قسمت الشوریں دے پڑے تھے اور جن کی اہمیت عاشق تھاموں سے قطعاً کم نہ ہوگی۔ خود کچھ کیا ماحول ادب کو پرکھنے کے لئے دشنے کے ہوئے وہ اقتصادی پیمانے ان لطیف احساسات و جذبات کو ناپ سکیں گے اور کیا اس طرح تنقید اتنی مختلف النوع ہو کہ تخلیقی جا ذہنیت پیدا کر سکے گی کیونکہ ظاہر ہے کہ ماحولیات و دروہیات جیسے متضاد احساسات کو جوڑ دینے والے ہر مشترک کی تخلیق آسان کام نہیں۔ خاص بات تو یہ ہے کہ ماحول کی زندگی حاصل کرنے کی جدوجہد میں صنف ادب جو یقیناً ہجوک اور فاقہ کے لیے جان اذکار سے آگاہ ہو گا کیا ان عالمک کے کوئی کوئی علم نہ ہو کہ کس طرح ماحول خوشامی کی وجہ سے ہجوک کے ساتھ ہماری طرح شدید تعلق بن رہا ہو اور کیا ہمارا ادب اس سے باہمی اور عدم تنوع کے باوجود آفاقیت کا دعویٰ کر سکے گا۔

ہجوک کی تکلیف سے قطعاً عاجل، انکار نہیں لیکن ہجوک کے وقت جتنی ضرورت خدا کی فراہمی ہے اتنی ہی ضرورت ان جذبات لطیف کی حفاظت کی بھی ہے جو ہمارے رات دن جذب و تشنگ سے رہنے سے فنا ہو کر مدوح کو تاریک بنا سکتے ہیں۔ یہ زمان کی منتیں، ملت، ملکی ان سے گھر کر "ذوق گلستان" فراموش کر دینا ماحول پسندی کی بجائے "رائی" کو بے لطف اور زندگی کو چرن کر دیتا ہے۔ اگر قسط کے زانوں میں ہمارے اسلاف غزل کی طرف نسبتاً کم ہی توجہ دیتے تو شاید غزل آج باقی نہ رہتی اور نہ ہم اس سے آسودگی "ذوق" کے ساتھ ساتھ سماجی کام لے سکتے۔

کیا حالانہ اسی سے غزل کے بغیر آؤ گا دنیا دیا تھا کہ ادب منحہ پیر کر پیر اسی دائرہ جبر میں آج رہے۔ کیا ادب کو مطلقاً ماحول کی ترجمانی یا وقتی ترجمان کے پابند بنادینے سے بیزار شدہ یہ نقصان ہمارے چوکنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ غرض ماحول نہ ہونے کی وجہ سے مرتعہ، عقیدہ اور غرض کی دشمنی حیثیت اختیار کر کے نہ باوجود آج کوئی پوچھے والا ملک نہیں ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے غزل کی زندگی کو دیکھئے جو نئے نئے قتل و برباد حادثات و تحریکات کے باوجود دم توڑنے کی بجائے "ضعیف ادب" کے دائرے سے عمل کر جز و تہذیب ہو چکی ہے۔ آخر کیوں اس لئے کہ اس نے اکثر مستقل اور آفاقی احساسات و جذبات ہی کی ترجمانی کی ہے اور مقصدیت کے ساتھ ساتھ "ارٹ" کا بھی غلط رکھا ہے اس لئے ادب کو اتنی کامیابی دست خرد دی جاتی چاہیے جو زیادہ سے زیادہ اور مختلف النوع ادوار کے احساسات کو ناپ سکے۔

ادب دراصل علمی و فادائی چیز ہی ہے اور حاشیائی ہی۔ اس لئے اس میں موضوع کی بھی اہمیت ہے اور اعلیٰ بیان کی بھی۔ یقیناً "کیا کہنا ہے" کا سوال "کس طرح کہنا ہے" سے زیادہ اہم ہے لیکن جب تک کہنے کے ڈھنگ سے کہتے والے کا مقصد دل نشیں طور پر ظاہر نہ ہو، مقصد کی نوعیت اور اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب مقصد کی اہمیت ہی واضح نہ ہو تو پھر اس کے ذریعہ سماجی و تاریخی میں عملی قریب کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے۔

یہی درجہ ہے کہ بعض شجرہء غریب فکر تو ہوتے ہیں لیکن اعلاذہبیان
کی طرف توجہ نہ کرنے سے خوش گو نہیں مانتے جانتے — اگر ادب
میں اسلوب کی اہمیت و وقعت نہ ہوتی تو ماہرین فن پر کام کو حالت
متفقہ حال کے مطابق بنانے کے لئے علم معاشی کی ترتیب و قیاس

میں اتنی مزگناں اور عسوق رہیں کہ شیش نہ کرتے اور نہ غریب
ریخ و ناصح تو گویا اور ہمدی کے باوجود اپنے تیز و طنز پر لبہ ہر
کہوہ سے بیتام بہتا اور نہ "ساق" اپنی ایمان سوز ذہنیت کے
باوجود شیریں بیانی سے ہر دل عزیز ہو سکتا۔

میرالدین احمد

فتح آدم

عزم

زنجِ عسالم آجست جا رہا ہے
مرے قدموں تلے چاند آ رہا ہے
گل و گلزار کا ایک ایک پتہ
ارم کے باغ کو شہر مار رہا ہے
تمدنِ وقت کے داغ جیسے کو
ستارے کی طرح چمکا رہا ہے
ابھی ہے آدمی کی فوجِ آفاقی
کہ یہ دیوانہ پن دکھلا رہا ہے
مزا بچ عشقِ تیری پیشتگی ہے
بسی شش بھی گزرا رہا ہے

حقائق کی بدل جائیں گی قدریں
یہ عسلم و آجگی کا مشتبہ ہے
خلافتِ متفقہائے نعلینِ آدم
یہ سازِ آفرینش کی صدا ہے
یہی تعویذِ منسوبِ حق بشارت
کہ فرخِ فیض جس کا ارتقا ہے
جہاں ہے علم و عقل و عزم و ہمت
وہیں جلوے میں دیدارِ خدا ہے

جھلکیاں

ادھری رنگ بہار نکل دھکڑا رہے آج
دیکھنا ارض وطن خلیہ خطر ہے کہ نہیں
جن جمہور کا ہر جلوہ ضیا بار ہے آج
دیکھنا بند کے آنگن میں سحر ہے کہ نہیں

آہنی عزم کا ہے نقش بھلائی کا جلال
روڑکیلا کی حسیں شوح کرن کیا بچھے
یہ کراؤ نکل ورہیا ہند کا یمن و جمال
اہلہا تم سوئے کھیتوں کی چسبن کیا بچھے
جھلکیاں کر کے متبید یہ ہوئی صورت جمال
جگمگاٹھے ہیں محسوس اور چمن کیا بچھے
کا مگھاروں نے کیا مل نئے آئین کا سوال
کے لیے پہنچے گا کہاں جذبہ فتن کیا بچھے

آج مستقبل روشن کی تمنا ہے یہی
توڑ دیں دام ہو بس جن نظر عام کریں
آگے بڑھتے ہوئے لمحوں کا تقاضا ہے یہی
ساتھیو آؤ کہ بل جیل کے کوئی کام کریں

ہر نظر آئینہ جلوہ غم ہے لیکن
ہر نفس حوصلہ دل تو بڑھا جاتا ہے
ہر قسم میل حوادث کا کرم ہے لیکن
تافلہ جانب منزل تو بڑھا جاتا ہے

کوئی کیفیت غم مٹی نہ مٹرتی کا سرور
زندگی جبر مسلسل کا نشان مٹی پہ پہلے
کشتہ درد تھا اخلاص و محبت کا شعور
زندگی سلسلہ آہ و فغاں مٹی پہ پہلے
رات دن درپے آزار تھا بال بال کا غرور
زندگی روح صداقت پہ گراں مٹی پہ پہلے
مرکز سعی و عمل سے رہ تسمیہ سے دو
زندگی مایہ بنے تاب و توان مٹی پہ پہلے

نیا انداز لے عظمت کمر دار ہے آج
وہیچنا منظم ہیں زیر و زبر ہے کہ نہیں
وہ ذرہ مرہ و اختر کا طلیعہ رہے آج
دیکھنا و ذوق تجسس کا اثر ہے کہ نہیں

کرکٹ

افغانستان اور ہندوستان کے حالیہ میچوں کے پیش نظر

میں ٹھیکر سٹ اور ٹال بہت اچھے گیند چھینکے والے ہیں۔

ہندوستان نگ بنگ تیس سال سے اپنی الا قوامی کرکٹ کے میدان میں ہے۔ جہاں اس کے کھلاڑیوں نے بڑے بڑے کارنامے نمایاں کئے ہیں وہاں بدستی سے زیادہ جیت اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ ٹیسٹ میچوں میں ٹوڑی لینڈ سے ہم نے دیر جیتا تھا۔ پاکستان سے بھی جیتا، لیکن آسٹریلیا، جزائر عرب، ہند اور انگلینڈ سے کبھی دیر نہیں جیتا تھا۔ آسٹریلیا سے کان پڑ میں ٹیسٹ میچ جیتا تھا اور انگلستان سے مداس میں۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان حالیہ کانچ ٹیسٹ میچوں میں تین میچ مار جیت کا فیصلہ ہونے پر غرور ہو گئے۔ دوسرے ہندوستان نے جیت کر دیر جیت لیا۔ یہ ہماری کرکٹ کی تاریخ میں ایک تاریخی کانچ تھا۔ یہ کانچ میچ بالترتیب بمبئی، کان پڑ، دہلی، لکھنؤ اور مداس میں کھیلے گئے۔

فیل میں ان میچوں کی مختصر تفصیل درج ہے :-

بمبئی کانچ نومبر ۱۹۵۱ء کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ دونوں طرف کا

اسکور یہ ہے :-

ایم۔ سی۔ سی (انگلینڈ) پہلی انگلر آؤٹ وکٹ پر ۵۰۰ دوڑیں

دوسری انگلر پانچ وکٹ پر ۱۸۴

پہلی انگلر ۳۹۰

ہندوستان

دوسری انگلر پانچ وکٹ پر ۱۸۰

یکمیل مار جیت کا فیصلہ ہونے پر غرور تھا۔ انگلینڈ کے کھلاڑی یہ گھٹنے

۱۵۱ دوڑیں بنائیں اور وہ آؤٹ نہیں ہوئے۔

کرکٹ کا کیل بڑا دل چاہ ہے۔ کسی طرح کے انجام تک پہنچنے پہنچتے رہتے، آنا چرھا جاتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عام گیم ہے۔ آسٹریلیا، انگلینڈ، ہندوستان، پاکستان، جزائر عرب، آسٹریلیا، جزائر عرب، ہند اور نیوزی لینڈ میں یہ گیم بہت مقبول ہے۔ بعض کھلاڑی بلیک لیٹی ڈوڑیں بناتے ہیں مگر ہوتے ہیں بعض بلیک لیٹی گیند چھینکے ہیں۔ بعض ان دونوں چیزوں میں اچھے کھلاڑی ہوتے ہیں ان کو آل راؤنڈر کہا جاتا ہے۔

ٹیسٹ میں انگلستان کے ہینڈر، اسٹن، اے، کاوڈی اور بیکنس قابل ذکر ہیں۔ آسٹریلیا کے ڈان بریڈمن، ماروے اور فیل۔ پاکستان کے حفیظ، امتیاز احمد سمیت، جزائر عرب، ہند کے فوڈل، ڈالاک، وکس، سوپر سن اور کھٹا اور نیوزی لینڈ کے شعلت، ہندوستان کے کھلاڑیوں میں دلائی، ولیپ سنگھی، پاٹودی، سی کے ٹائیڈو، امرتا تھ، شتاتی علی، وجے مرچنٹ، ہڈارسے، سنگھ، امری گرو اور بھوگر کار دیکارڈ قابل رشک ہے۔ مداس میں فوجان فاب آف پاٹودی نے ۱۰۳۱ دوڑیں بنا کر شہرت کمائی ہے کہ ان کا مستقبل بھی شان دار ہے۔

بولنگ میں آسٹریلیا کے اورلی، مینو، ڈوڈسن اور لینڈ وال، انگلستان کے ویبرٹی، کارک، ٹروین، سٹیٹم، پاکستان کے فضل محمود اور ہندوستان کے ناراج، امر سنگھ، امرتا تھ، ورن سنگھ، غلام احمد، جوہلی، سمبھاش کچھ قابل ذکر تھے ہی حالیہ میچوں میں سلیم وردانی نے اپنے کمالات سے پہلی صفت میں جگہ حاصل کر لی ہے۔ جزائر عرب، ہند

کا چڑھا کر بھی اس رحمت کا فیصلہ ہوئے بیخبرم ہوا۔ ہندوستان
نے پہلی انگلینڈ کے خلاف شکست ۱۷۵۷ء و دوسری تیارکھن کو کھینے کے بعد اعلان
کردیا۔ ایم۔ سی۔ سی۔ جیم پیسٹرا انگلینڈ میں حوت ۲۴ م دوسری
بنانکی۔ ہندوستان اعدائے انگلستان کے درمیان ۲۴ م ٹیٹ بیچوں
میں پہلی بار آجستان کو کاواؤن دیا (۱۸۱۷ء انگلینڈ کے فوراً دوسری
انگلینڈ کھینا) کا سات کرتا ہوا۔ (۱۸۱۷ء دوسری انگلینڈ میں انگلینڈ نے
پانچ وکٹ ۱۷۵۷ء دوسری بنا۔ اس میں ہیں امری کرتے ۱۷۵۷ء
دوسری بنا۔ اور وہ کوٹ نہیں ہوئے۔ انگلستان کی طرف سے
پکرتے ۱۸۱۷ء برکھن نے ۱۷۵۷ء دوسری بنا۔ کینا کو کھینے
۱۷۵۷ء دوسری بنا۔ اور وہ کوٹ نہیں ہوئے سبھا شجئے نے پہلی
انگلینڈ میں انگلینڈ پانچ وکٹ ہے۔

لکے۔ کراچی جیتنے کے بعد ہندوستانی میم کے واسطے بڑھ گئے تھے۔
 کیونکہ اگر مدراس ٹیٹھ برابری رہتا تو جی ہندوستان کی جیت تھی۔
 لیکن مدراس ٹیٹھ جی ہمارے کھانڑوں نے جیت لیا۔ یہ پچھلے آخر
 دم تک دل چاہی کا موجب بنا رہا۔ ہندوستان نے پہلی انگڑی میں
 ۳۸ مدراس بنائیں۔ پانچویں اور گیارہویں سیرس وکٹ پر
 ۱۰ مدراس بنائیں۔ گیارہویں اور پانچویں ۱۰ مدراس بن کر
 آٹھ ہوئے۔ ناکارہ اور اخیر نے با ترتیب ۳۳ اور ۳۵
 مدراس بنائیں پانچویں پہلی ٹیٹھ تھی۔ انجینڈر نے پہلی انگڑی میں ۳۸
 مدراس بنائیں جن میں ۱۷ بے کسی ہوئے، ۲۱ مدراس قابل ذکر ہیں پہلی دوٹی
 ۳۳ اور ۳۵ کے درمیان لگے۔ ۱۱ اور ۱۲ کے درمیان تھے جن کوئی مدراس نہیں بنی۔
 دوسری انگڑی میں ہندوستانی میم صرف ۱۵ مدراس بن کر
 آٹھ ہو گئے۔ ۳۵ میں مٹا بنا تے اور انجینڈر کو پچھلے جیتنے کے لئے
 صرف ۳۳ مدراس کی ضرورت تھی جو اتنے وقت میں کوئی مشکل
 نہیں تھا لیکن انجینڈر نے صرف ۲۰ مدراس بنائے۔ اس طرح یہ
 پہلی ہندوستان نے ۱۲ مدراس سے جیت لیا۔ دوسری نے دوسری
 انگڑی میں چار وکٹ لئے۔

ایڈیٹر ٹکٹ آرٹ

برس پہلے کی بات ہے گریو پ میں منابرِ فطرت کی معبودی دم ٹوڑنے لگی اور Cubism کی ترکیب نے ان معبودوں کی صفوں میں زبردست انتشار پیدا کر دیا تھا۔ ایسے عالم میں ہر حساس معبود نے اپنے آپ کو احساسات کے ایکسا لیٹ ووقی صوا میں گھسے پایا جس کا اور پورے تصور میں نہ ملتا تھا۔ اس وقت فن کار کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اس صوابی کھوکھلی ہو جائے یا ایک ہی جنت میں اُسے پناہ جائے۔ یہ ایک ہی جنت فن معبودی میں ایڈیٹر ٹکٹ آرٹ کے نام سے منسوب ہوئی۔ نیز یہ تو ہوئی اٹا کوئیں مشاعرے۔ لیکن جب کوئی عام سوجھ بوجھ کا شخص اور عام کردہ ہو ایڈیٹر ٹکٹ آرٹ کے فن داؤدا سے قتل ہے بہرہ ہو ایڈیٹر ٹکٹ آرٹ کے نزدیک فائنش دینے جاتا ہے اور وہاں پہلے بھی دیکھتا ہے اور اس کے دل دو مانگوں میں جھجھکتا تو پیدا ہوتا ہے وہ کچھ اس سے مختلف نہیں ہوتا کہ آرٹسٹ نے کیونٹس پر بے محابا پرش پیر دیا ہے، انہاں ہی میں کیا رنگ کے کوپ لگائے ہیں، ٹیڈس بیڑی لکریں، بیچ دی ہیں اور اور فرانس کے ایک ممتاز Surrealist مسٹر کاروہ لطف دہی میں تازہ ہو جاتا ہے جس کے تھر جوی ہو گئی تھی۔ پولیس انٹرک اس سوال پر کہ کیا آپ چور کے بارے میں کہتا سکتے ہیں۔ حضرت نے دو لفظ کی ہلکت مانجی اور دو لفظ بے حجب روپہ اسٹو ڈیو نے ٹانگ پولیس اسٹیشن کی طرف چلے تو ان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا کیونٹس

”انگریزیت سے مراد حاصل نہ ہو تو لیتیں بازو میں کی برش کو ناخیز نہ لگائیں۔“ (دوان گانگ)

دوان گانگ کا یہ قول کیا معنی رکھتا ہے اس کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف رائے پیش کی ہیں۔ لیکن شاید اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ دوان گانگ کے یہی الفاظ ایڈیٹر ٹکٹ آرٹ کی مکمل تشریح پیش کرتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فن کے بارے میں مجموعی حیثیت سے دوان گانگ کے اس بیان کو درست تسلیم کر بھی لیں تو سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مرثرت کس صورت میں تخلیق کا حاصل ہو سکتی ہے۔ مرثرت معبود پچانگی کہتا ہے کہ کوئی بھی فن حقیقی مرثرت کا حامل اسی وقت ہو سکتا ہے جیسا کہ انقلابی جمہور پیر ہوتا رہے۔ پچھ ہم فن میں مرثرت ڈھونڈتے ڈھونڈتے انقلابی باتیں بھی کرتے گئے۔ لیکن بات پچانگی کی۔

نیز بعض میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے فن کار کو انمول روایات اور قدروں سے کیلنا پڑتا ہے۔

جہاں تک ایڈیٹر ٹکٹ آرٹ کی تاریخ کا تعلق ہے یہ بہت غلط نہ ہو گا کہ یہ ترکیب کسی نہ کسی صورت میں معبودی کے ہر دور میں موجود رہی ہوگی۔ لیکن اس صدی کے آغاز ہی سے اس نے ایک مسلم ترکیب کا روپ اختیار کیا ہے۔ تاریخ اقتدار سے مرثرت اس کے غایت تھے جنہوں نے کہا:۔ ”فن کار کا مقصد تشریح کو نا نہیں ہے بلکہ بعض اشیاء کے ادھنگ سے مرثرت حاصل کرنا ہے“ اس کے کوئی پچاس

تھا۔ اس کیس کو پریس انکیوٹی کی زیر دیکھت ہوئے انھوں نے فسر دیا
"میں نے اپنے فن میں چوکی شخصیت کو پیش کر دیا ہے۔"

یہ لگے انھوں آپ ہی اس چوکی جو مری شخصیت کی ایک
حکایت حاضر فرمائیے۔ اس تصویر میں آپ نے ایک ٹوٹی ہوئی کشتی
(بر مراد چوکی ذہنی کیفیت) پر سرسری رنگوں میں دیکھیں ساحل
(بر مراد چوکی زندگی کا جہد) اور ایک پتھر پر ٹوٹی ہوئی فٹسٹی
(بر مراد چوکی سنگ) دی اور وقت سے بے خبری دکھائی تھی۔

اس تصویر کو دیکھ کر وہ قسمت کا مارا پولیس انسپور کے بارے
میں جو کہ سمجھ سکا ہوگا وہی کہ ایک عام انسان ایسٹریٹ آرٹ دیکھ
کر سمجھا ہوگا۔ کیوں کہ مسعود نام میں تو پھر بھی کوئی ناکافی واضح شکل
بنا جاتی ہے، ایسٹریٹ آرٹ میں تو صرف رنگوں اور گروڈ کی ہم آہنگی
ہی ہے اپنا مقصد بیان کرنا ہوتا ہے۔ یہاں کوئی واضح شکل تو بنائی ہی
نہیں جاسکتی۔ یہ الفاظ دیکھ کر ایسٹریٹ آرٹ ہیئت کی ہر قسم سے ملتی
آزادی کا اعلان ہے۔

اس اعلان کی ترتیب کا سہرا ممتاز روسی مسعود کاؤنٹسکی
جو انقلاب روس کے بوفرانس چلے آئے تھے) اور پائیٹ مونڈریان
کے سرے سے۔ جن دونوں کاؤنٹسکی (ما سکو ۱۸۷۷-۱۹۱۵) پیرس میں ۱۹۱۵ء
میں اپنے عروج پر تھا اس وقت یورپ میں مسعودی کی دو قسم کی
برے ذہن شہر سے چل رہی تھیں۔ انہیں **Expressionism**
اور **Cubism** کاؤنٹسکی ان دونوں سے متعلق نہ تھا۔
۱۹۰۸ء کے لگ بھگ اس کے فن میں ایک عجیب و غریب تبدیلی رونما
ہونا شروع ہوئی۔ یعنی اس وقت وہ اپنی تصویروں میں ہمیت کا اتنا
باندھنا نہ تھا۔ لیکن یہ تبدیلی تیسری تھی کہ کاؤنٹسکی کا فراق مسعودی کی
شخصیت پسندی سے بھی متاثر ہو گیا اور آخر ۱۹۱۰ء میں اس نے پہلی
بار ایک ایسی تصویر بنائی جو غیر مربوط خطوط کے زبردست ٹکڑوں اور
فکلی طور پر بنی ہوئی غیر متعلقہ آئینہ کش کا مجموعہ تھی۔ اس نے اسے
ایسٹریٹ آرٹ کا نام دیا۔

فن مسعودی میں ایسٹریٹ نقطہ کے دو مفہوم لئے جاتے ہیں۔ ایک
تو یہ کہ ایسٹریٹ نقطہ بطور فن استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مسعودی کے فن

موضوع سے دور ہٹ کر اس کے کسی ایک پہلو کو اپنا موضوع بنالیتا ہے۔
دوسرے یہ کہ ایسٹریٹ کو بطور صفت استعمال کیا جاتا ہے یعنی
ایک ایسا فن شاہکار میں کامل موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مجھے
فن مسعودی میں ایسٹریٹ آرٹ سے یہی مراد ملی جاتی ہے۔ انگلستان
کے ممتاز دانش ور لٹنڈ اور ہرٹ ایڈر اس مفہوم کی وضاحت یوں
کر رہے ہیں۔

"ایسٹریٹ آرٹ یاد کی عکاسی نہیں ہے بلکہ یاد
سے شخصیتوں کو خارج کر کے اسے فن میں تفصیل
کرنے کا نام ہے۔"

تو کیا ایسٹریٹ آرٹ فن میں حیران کن اور سراور ہے؟ جی ہاں۔ یہ ہو ہو
فن برائے فن ہے۔ یوں تو ہر زمانے میں فن برائے فن کا عنصر ہر
مردم خنصر کے پہلو پہلو موجود رہا ہے اور چاہے اس پر مطلق
نقد لگائی جائے، یہ کتنی ہی تنقید کیوں نہ کی جائے اس حقیقت سے انکار
ممکن ہی نہیں کہ اس خنصر کے کامیوں نے بھی فن کی اتنی ہی خدمت
کی ہے جتنی اس کے مخالفوں نے۔ لیکن ایسٹریٹ آرٹ کے شاعر
ہمارے لئے ایک شکل پیدا کر رہے ہیں۔ یعنی ہم سے یہ امید جاتی
ہے کہ تصویر کے ذریعہ نہیں بلکہ تصویر کے حوالے کے ذریعہ فن کار جو کہنا
چاہتا ہے اُسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن جب ہم کوئی فن شاہکار
دیکھتے ہیں تو ہمیں اس وقت فن کار کے ذہنی متبادلات سے دور کا
بھی حلق نہیں ہوتا۔ ہم اس کی تخلیق سے وہی مفہوم اخذ کر سکتے ہیں
جو اُس نے خود جذباتی طور پر محسوس کیا ہو۔ اور اگر فن کار اپنے ذہنی
رجحانات کو اپنے اندر بذاتی جذبات پر غالب آئے دیتا ہے یا ترجیح دیتا
ہے تو پھر وہ ناظر اور پسند رعمیان اپنے ذہنی عقیدے کی بت پر
ایک ایسا دیوار کھڑی کر لیتا ہے کہ نہ نام و نسب کا ذریعہ نہیں
رہ جاتا۔

فن کی بنیادی طور پر جذبات کا پتلا ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے
جذبات کی شدت اور ذہنی کی محدود دست کو ہم آہنگ کرنے میں
کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا فن بیان کا ہی ہوجاتا ہے۔ اب فن کار
فن برائے فن کا ہی ہوجاتا ہے۔ برائے زندگی کا دونوں ہی صورتوں

میں جمادات اس کے فن میں تاثر پیدا کرے گی وہ اس کے احساسات کی شدت اور قوت بیان ہوگی بھی جیسو کا **Cubism** ، سویا ڈائی کی **Surrealism** دونوں میں برہنہ نظر آ رہے کیوں کہ ان کا اسلوب زندگی کی نقائصی کرنا ہے۔

لیکن جب جدید آرٹ کے خالق سیزن نے پہلے کہ **ایمپریوٹک آرٹ** حقیقت کی عکاسی نہیں ہے بلکہ ایک ادبی عمل اور نئی منطق کی مد سے اپنی حقیقت کو تخلیق کرنا ہے تو بھی جدید **ایمپریوٹک** مصوروں نے اس تشریح کا ہمارے کراہی تصویروں کو گوکہ دھندلانا کے رکھ دیا۔ تاہم کہ **ایمپریوٹک آرٹ** سے شاید کوئی بحث نہ ہو لیکن جس طرح اس طرز فن کے حامی اس منطق کا ہمارا جیتے ہیں وہ ناقابل فہم ہے۔ ایک فن تو آپ اپنی تصویر میں کوئی بھی واضح شکل بنانے سے حراہی انکار کرتے ہیں اور دوسری طرف، جس تصویروں پر ایسے ایسے عنوان جاتے ہیں جو فلسفہ آمیز ہوتے ہیں، آپ کیوں نہیں اپنی تصویروں کو کمپوزیشن برائیک اور دو قرار دیتے؟ کیوں نہیں تصویر کا عنوان، معنی، ایک تصویر، رکھ دیتے۔ یہ سوال ایسا ہے کہ اگر اس کی نہ تک پہنچا جائے تو دونوں کا جوڑ مل جائے۔

آئیے پہلے ہم اس حقیقت کا جائزہ لیں کہ جدید **ایمپریوٹک آرٹ** کسی بھی واضح یا مبہم شکل سے مزین کیوں ہوتا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کے فن کاروں کے ذہن میں ہم سب کا ہیں کے بدلے ہم سب کیوں ہیں؟ کا سوال بڑی شدت کے ساتھ ابھرا۔ اور جب اس مشکل سوال کا تھیں کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو انھوں نے بیکار و افحہ پر ایسے اظہار سے ستم مٹوایا۔ اس سوال کا جواب ملنا کہاں سے؟ دو عالمگیر جنگوں نے یورپ کی سماجی قدروں کو دھواں بنا کر اٹا دیا تھا۔ دوسری جنگ کے بعد جس صورت میں یورپ کے فن کار نے اپنے آپ کو تباہ محسوس کیا تاریخ میں، کسی کی مثال نہیں ملتی۔

اگر ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر کسی فرد کو سماج میں خوب تشوادر سے دیا جائے تو اس میں ایسے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی قدروں کو بڑے اٹھارے پھینک کر پھیل جاتا ہے۔ اور جب

یہ کیفیت کسی فن کار پر طاری ہوتی ہے تو اس کا رد عمل ایک عام فرد سے بہت زیادہ شدید ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوت تخلیق سے حقیقت کو سرے سے مٹا دیتے، پرتل جاتا ہے۔ اور جب حقیقت چھپنے ہی جنگ کی نذر ہو چکی ہو، جب ایک دوسرے پر اعتبار تو کیا خود پر بھی اعتبار دیا جاتا ہو تو من و خدا کو ہی مسخ کر کے اختتام لیتا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں فن برائے فن کا نظریہ **ایمپریوٹک آرٹ** کی صورت میں یورپ پر چھا گیا اور اس میں ایسی شدت آئی کہ وہ اپنی ہی حدود سے تجاوز کر گیا۔ فرانس میں عجیب و غریب فن کاروں نے جنم لیا۔ ہر قریب کے گزشتہ قریب کو اس طرح مٹا دیا جیسو کہ وہ بھی وجود میں آئی ہی نہ ہو۔ یورپ کے فن کاروں کے ذریعے اپنے وجود کا جواز دھونڈ رہے تھے اور اس تلاش میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ اپنے خیالات کے بجائے اپنے ذہنی معیثوں کو پیش کرنے پر آمرا گئے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ **ایمپریوٹک آرٹ** کے مخالفوں نے **ایمپریوٹک** مصوروں کے تشریحات اور عقاید کی آڑ لے کر ان کے فن کو بھی معجزہ نیز بنا دیا۔ جب **ایمپریوٹک آرٹ** کو رجعت پسندانہ تحریک قرار دیا جانے لگا تو **ایمپریوٹک** مصوروں نے ایک نئی تفسیر **Non-Objectivity** کے نام سے پیش کی۔ یہ سب سے زیادہ قابل کرنے والی دلیل تھی اور اس کے جواز میں **ایمپریوٹک** مصوروں نے شکیب کا نام لیا۔ یہی تھیں بلکہ اس ضمن میں فطرت کی معنوی اور فنیہ حیرت م کے معنوی کا بھی حوالہ دیا جائے گا۔ دان ٹاگ، گولڈن، ٹرنر، ماتیس اور کیو وغیرہ مصوروں کا نام ایک ہی سانس میں دے دیا۔ لیکن بات وہی رہی اور **ایمپریوٹک آرٹ** کی جنگ تصویروں کے ذریعے نہیں بلکہ قریوں کے ذریعے اور بھی شدت سے لڑی جانے لگی۔

انگلستان کے عظیم **ایمپریوٹک** معتمد و گولڈن سوسرٹو ٹائمر لندن کے ادبی سلیٹ بناتاریخ ۵۔ فروری ۱۹۶۵ء میں **ایمپریوٹک آرٹ** کیا ہے؟ کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

”ایسٹرکٹ آرٹس نے معنوی اور سنگ تراشی کو مقصدیت کے اعتبار سے دو ذریعہ عطا کیا ہے جو کئی کو حاصل ہے۔ ایسٹرکٹ آرٹ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا فن برائے فن کا تخیلیہ۔ یہ فن برائے فن کوئی شئی قریب نہیں ہے۔ یہ قریب فن کا کوئی شے کی شقیں مستحق ہے الگ تفہیم کرنے کی بجائے اسے بھرپور دعوت دیتے ہیں کہ وہ تخلیقی فن کی سطوت زیادہ سے زیادہ توجہ دے۔“

اس حقیقت سے کہ فن کا کارنکار کر سکتا ہے کہ انھوں سے کچھ اور سمجھ جانے والے بریک فن کی تاریخ میں حیثیت کے معاملے میں جس قدر آزادی سے کام معنوی اور فن سنگ تراشی میں لیا گیا ہے ایسی اور نہیں لیا گیا۔ لیکن شکایت کو کیوں کر یہاں ہی گھسیٹا جا رہا ہے جب کوئی موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے تو کیا آپ اس وقت اس کے شکایت سے اس کی شخصیت کو خارج کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو میرے غیر مقصد کیا چیز ہے؟

دکڑ پائسمول اس شغلی کے جواب میں ہندوستان کے ممتاز معتمد سیتیش بگال کہتے ہیں ”اگر آپ معنوی کو موسیقی کے اصولوں پر ترتیب دینا چاہتے ہیں تو خراب آپ کی مرضی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ڈھول کا آہنگ موسیقار کے قریب بات زندگی کا حامل ہے یا اس آہنگ کی خود کوئی اپنی جداگانہ حیثیت ہے؟ اصل بات یہ نہیں ہے کہ کوئی تصویروں کے آہنگ پر قائم ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ تخلیقی فن بنیاد انسان کے قریب بات زندگی پر ہے یا فن کا انداز پر؟“

سیتیش بگسال کی یہ تالیفات بھی یکدم یورپی ایسٹرکٹ آرٹ سے نکال کر ہندوستانی ایسٹرکٹ آرٹ کی دنیا میں لایا ہے۔ ہندوستان میں یہ قریب صرف ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی اور ابھی اپنے ابتدائی مرحلوں میں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ ہندوستانی معنوی میں ایسٹرکٹ کو کس منہک دخل ہے؟ آج تک ہمیں یہ حیثیت قوم بحق طور پر دیا جانے کا خطرہ لاحق نہیں

ہماری جیسا کہ یورپ کو ہو چکا ہے۔ لہذا ہم اندرونی طور پر اس شقت سے ہم کیوں ہیں، کے سوال کا رد عمل اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ مینا یورپی معنویوں نے کیا۔ پیرامارے فان سابی یا روحانی قدس ایسی دو دیت کی کمی نہیں پر لکھی جاتیں۔ لہذا ہم معنوی میں داخلہ لہا رہے سے موزوں کر معنی رنگوں اور لکھوں کی ہم آہنگی سے کہاں تک تاثر پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارے فن کاروں نے یہ قریب تو یورپ سے مستعار لے ہی لی لیکن ٹریڈ یو یہ پوچھئے کہ یہاں اس قریب میں جان ڈالنے کے لئے زبان کی کچھ تصویریں ہی اپنائی گئیں۔ چونکہ ایسٹرکٹ آرٹ بعض تاریخی حادثات کا نتیجہ ہے اور ہم ان حادثات سے دوچار نہیں ہوئے لہذا یہ ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ تاہم قریب قریب ہمارے کسی نامور معتمد اس قریب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بعض فن کاروں نے ہمارے کارنامہ، انہوں نے سامنت، اینرل ڈے اور یوانی فرشنا اور کشن کھنڈر جیسے ترقی یافتہ طور پر اس اسلوب کو اپنا چکے ہیں۔

تو سیتیش بگال جو اس قریب کے بہت نکتہ پس ہیں اپنی حالیہ تخلیقات میں اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ گوا تیش خود اس سے انکار ہے۔ جب میں نے ان کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جو بہت حد تک ایسٹرکٹ فن کی تو کہنے لگے، ”ہر تخلیقی فن پارہ کسی نہ کسی حد تک ایسٹرکٹ میں بردار دہار دکھتا ہے کیوں کہ تخلیقی نام ہے حقیقت اور خیال کے امتزاج کا۔ ایک تخلیقی فن کے لئے یہ نا ممکن ہے کہ معنی حقیقت کو پیش کرنے پر اکتفا کرے۔ وہ ہمیشہ پر کوشش کرتا ہے کہ حقیقت کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کا جو گھرے۔ چنانچہ میری بھی یہی کوشش ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ میرا ایسٹرکٹ آرٹ یعنی فن برائے فن کی طرف آگیا ہوں غلط فہمی ہوگی۔ صبراً میں یہ دیکھوں گا کہ میرے آرٹ میں تاثر اور کیفیت نہیں بلکہ یہ لکھوں اور رنگوں کا آہنگ ڈھونڈنے لگا ہوں اس دن میں معنوی ترک کر دوں گا۔“

ستیش کرال کے اس بیان سے ایک بات تو واضح طور پر ظاہر
 سامنے آجاتی ہے کہ ایسٹریکٹ آرٹ کو بطور اسلوب اپنانا نہیں
 چاہیے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایسٹریکٹ آرٹ میں کسی فارمی
 کو دخل ہو بلکہ تصویروں میں محض کا ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان کے نو جوان ایسٹریکٹ معاصر شری مہن سامنت
 جو آج کل امریکی میں مقیم ہیں۔ اب اپنی تصویروں سے اشاریت
 Symbolism کو بھی خارج کرچکے ہیں۔ مہن سامنت

نے ۱۹۵۱ء میں نیویارک کی میٹم ویلڈاؤس گیلری میں جب اپنی
 ایسٹریکٹ تصویروں کی نمائش کی تھی تو امریکی منظم آرٹ نقد
 ایسٹریکٹینار نے ہیرڈرٹس برولین میں ان سے پہلے "Arrived"
 کا خطاب دیا وہ تھا بلکہ یہ آہنیچے کی منزل دنیا سے تھی
 جہاں تھی کارکے تبدیل تھی اوسیں شگبیل ہے وہاں دشمار تریں
 گھاٹی بھی ہے۔

ہندوستانی معنوی کے متنازعہ مشری اجمیت مری نے
 آگے سے پانچ سال پہلے اپنی کتاب "فائل آرٹ ان انڈیا" میں
 چند معنوں کے حق پر بحث کی تھی جن میں مہن سامنت بھی شامل
 تھے۔ مشری مری اس کتاب میں لکھتے ہیں۔ "جدید ہندوستانی
 آرٹ ایک بھری دور سے گزر رہا ہے اولاً ہستہ آہستہ اپنا لاقوی
 آرٹ کے وسیع حلقے میں شامل ہونے کی سخت جدوجہد کر رہا ہے۔
 آج ہم ایک ایسی آہستہی ہوئی نسل سے دوچار ہیں جس کی ذہنی
 صلاحیت اپنی منزل کو پانچنے کی جاں لیما لگ دود میں سرگرم ہے۔"
 لیکن تعجب کی بات یہ نظر آتی ہے کہ اگر ہمارے ایسٹریکٹ

معنوں کی منزل ایک ہی ہے یعنی ایسٹریکٹ آرٹ کی تحصیل تو وہ
 ایک دوسرے سے کوسوں دور کیوں نظر آتے ہیں؟ ان کی تصویروں
 سے ایسا یوں نظر نہیں آتا کہ یہ مری معنوں کے سامنے کوئی نہ کوئی بڑی
 ہے۔ اس وقت ان باتوں کا یہی جواب دیا جاسکتا ہے
 کہ مری دوسال کے عرصے میں یہ تحریک کسی رعایت کی بنیاد نہیں
 ڈال سکتی۔ اسی ہمارے فی کار ایک عجیب و غریب ذہنی کرب

اندھا جس کا شکار نظر آتے ہیں۔ نیز یہی تو ایسٹریکٹ آرٹ
 کی پہلی دہائی ہے۔ جب آپ حقیقت کی چیرچا کر رہے گے اولیک
 نئی انداز میں منظر کی رو سے اپنی حقیقت خود تخلیق کر رہے
 تو ظاہر ہے کہ آپ اپنے ہی ذہنی تناؤ سے نہیں بچ سکتے گے۔ لیکن
 کم سے کم یہ تو ہو کہ ہمارے فی کاروں کے انفرادی تجربات کسی نہ
 کسی حقیقت کی نشان دہی کر سکیں۔

اس وقت ہندوستانی ایسٹریکٹ معنوی کے میدان میں میری
 آنکھیں رام کمار پر لگی ہوئی ہیں۔ رام کمار اپنے فن میں جس طرح ترقی
 کرتے کرتے ایسٹریکٹ آرٹ تک پہنچے ہیں اس سے یہ بات ثابت ہوتی
 ہے کہ ہر وہ فن کار جو اپنی تخلیق میں سرگرم ہوتا ہے اس کا تھک کرپ سے
 بھی دوچار ہوتا ہے جسے کسی ایک دور سے منسوب نہیں کیا جاسکتا بلکہ
 ہم رام کمار کو سمجھنے کیلئے ہر وقت کے کارے کو اذکار آتنا تو عقائد کہہ سکتے ہیں
 کہ اگرچہ یہ تحریک ہی تو کبھی ان کی تصویروں میں ان کا اپنا ہے تو
 نظر آئے۔ یہ ترقیاتی دور سے مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ اس قسم ایک کی
 بڑی ہی ذہنی دہی میں نہ ہوں۔

ہم اس بات کے قائل نہیں کہ کسی فن تحریک کو دو ایک سال
 کے قلیل عرصے میں مروجہ میا پر پرکھا جائے۔ لیکن یہ مطالبہ تو کر سکتے ہیں
 کہ وہ تحریک بذات خود ہمارے فن اور زندگی کے مسائل میں اضافہ کی توقع رکھ
 تھی قدوں کی تخلیق بھی فن تحریک ہی کرتی ہے۔ کیا کوئی بھی ہندوستانی
 معنوی دائرہ یا ایسٹریکٹ آے بات دو سے کہہ سکتا ہے کہ ہماری
 ایسٹریکٹ معنوی یورپ اور فرانس کے ایسٹریکٹ فن شاہکاروں سے
 آگے بڑھ جائے گی؟

اس ضمن میں دو ایک نے جس یقین کے ساتھ جو کہہ کیا ہے اس کو
 نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دو ایک قدیم قدوں اور رعایا کی موت
 کرتے داؤں میں سے ہیں لیکن فن میں جڑت کے بھی قائل ہیں۔ وہ جانتے ہیں
 کہ کیا کوئی شخص یہ بات پورے دھوکے سے کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۵۸ء سے
 لے کر اب تک یورپ کے ایسٹریکٹ معنوں نے جتنی بھی تصویروں بنائی
 ہیں وہ سب کی سب شاہکار ہیں؟ دو ایک کے نزدیک فن اعتبار سے
 سو برس پرانی تحریک بھی بعض اوقات قابل قدر شاہکار پیش کرے

میں ناکام رہ سکتے ہیں اور اپنی ابتداء میں کوئی ترکیب جو سہل ہو سکے ہے۔

میرے کہ بات دیو ایک نے بڑے پتے کی کہی ہے۔ جس دن فنی میں سبز در کا رونما ہوتا بند ہو جائے گا اس دن فنی ختم ہو جائے گا ، آرائشی جمال کی داستان ختم ہو جائے گی ۔ انسانی روح کی نفاست کسی زمینی مادہ کے ذریعے اثر سے بر بار ہو جائے گی۔ خیال کی وسعت لامحدود ہوتی ہے اور انسان کے ذہن کی اوج اس کی شخصیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اب اس لامحدود وسعت اور ذہنی اوج کا مناسب نتائج اگر فنی کا ذکر حاصل ہو جائے تو وہ میرے دھکا سکتا ہے ورنہ جیب بد حالی کا شکار

ہو کے رہ جاتا ہے۔ کیا آپ کا اس امتزاج کی کوئی ٹھوس اور قائل کرینے والی مثال چاہیے ؟ تو لیجئے حاضر ہے

بے حد کے میدان میں پڑا کھیرا سوئے اب یہ بے حد کا میدان ہی وہ امتزاج ہے ، وہ آدھش ہے جس سے دوچار ہوتے ہیں اگر فنی کا پرچ اٹھا تو نہ فنی برائے فنی نہ فنی برائے مذہبی۔ کوئی نظر اس کے کام نہیں آئے گا اور اگر گہری طرح مست آت ہو کر اسی میدان پر چھا جائے تو اس کی تخلیق کو کوئی نام دے دیجئے۔ لڑی ہوئی یا اہل ہادیہ۔ تاثراتی یا قصورتی۔ اس کی تخلیق خود پکاراٹھے گی۔ وہ کسی محنت کا شکار نہ ہو سکے گی۔

سجادت نیکر

غزل

(تغذیہ حالی)

چمن میں ، دشت میں ، کوٹے بتاں میں
ذرا سی روشنی ! اے غنڈہ گل !
سبب میری تروپ کا کچھ نہ بوجھو
یہ جینا بھی کوئی جینا ہے اپنا
بہیں بگی ، بہیں ہے آتشِ بگی
حیاتِ مشق کا حاصل وہی ہے
یہ اک اجماعِ زُلفت ہے وگرنہ
ترے نعروں کا جادو ! اللہ اللہ !
سکون ان کا ہے میرے ضبطِ غم سے
مری دشت ہوئی رسوا جہاں میں
کو ظلمت ہے فضائے گلستاں میں
کہ اک نشتر ہے یادِ زلفاں میں
قص میں ہم ہیں ، دل ہے آتشاں میں
چراغوں کا سماں ہے گلستاں میں
جو حرفِ غم ہے میری داستاں میں
اثر آتنا کہاں میری زباں میں
کہ گلِ کھلنے لگے فضلِ خزاں میں
بڑی تاثیر ہے ورنہ خفاں میں

سناؤ آپ بیٹی ! اے سجادت

حلاوت کیسا حدیثِ دیگران میں

دل لخت لخت

خود بخود ہی ہے۔ اس محبت کا کیا مزا جس میں محبت کا نہ ہو، کس کشش نہ ہو، جدوجہد نہ ہو اور نہ اس کا عشق بھی بالکل پیچھا نکلا۔ اس نے کیا کیا دھڑکے کئے تھے۔ انداز کے لیے وہ ہر قربانی کرنے کو تیار تھا۔ لیکن یہ کیا! اس کے والدین نے اس سے قربانی کا موقع بھی چھین لیا تھا۔ والدین نے اس کی محبت کی فائدت نہ کر کے اس کے عشق سے عظمت کا جزو ہی خارج کر دیا تھا کہ ان کو کچھ نہیں رہ گیا تھا اب اس کے عشق میں؟ اس کی شادی ہی اب ان روایتی ٹھنڈی شادیوں میں سے ایک ہو گئی تھی جن کی تصویروں سے ہمیشہ دارا شہزاد بھرے پرشے ہوتے ہیں۔ میں اس وقت جب کہ اس کی اتنی اہم مانگ پوری ہو رہی تھی، اٹھ آیا محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کبھی نہ کہیں نہ کہیں کسی نے دھوکا لگایا ہے۔

لیکن شادی سے گزرنے پر وہ صرف اس کے عشق کا پھیکا پس بھی تو نہیں تھا۔ کچھ ادھی تو تھا۔ دو سال ہو گئے تھے اس کی مانگ کو پورے ہوئے۔ لیکن یہ اچانک اس نے شادی کی بات سے کتر انا کیوں شروع کر دیا تھا؟ پہلے تو فکری کا سوال تھا وہ بھی اب پورا ہو چکا تھا۔ ایک انگریزی کمپنی میں اسے اچھی نوکری مل گئی تھی اور اچھا تنگہ اور نوکری چاکر موٹر فریئر سب کچھ تھے۔ ان حالات میں اس کی شادی سے کتر انا سب کو عجیب معلوم ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر اس مسئلہ کو صرف یہ کہہ کر مائل دیتا تھا کہ میں ابھی شادی کی ذمہ داریوں کو

ادرا خسر گوتم شادی کرنے پر رضا مند ہو ہی گیا۔ ویسے تو بظاہر شادی سے گزرنے کوئی وجہ نہیں جان پڑتی تھی۔ انداز ہی بڑی تھی جس سے اس نے خود محبت کی تھی اور جس کے ساتھ شادی کے فیصلہ کو اس نے قطعی قرار دیا تھا۔ پہلے تو جیسا کہ ہوتا ہے پوری چھپے وہ اسے ظاہر کرتا تھا۔ پھر ایک وقت کیا کہ اسے اپنے والدین کو سب کچھ بتانا پڑا۔ گوتم نے سن رکھا تھا کہ والدین ہمیشہ محبت کے راستے میں روڑے اٹھاتے ہیں اور ہر جوان عاشق کی زندگی میں اس کی جمود کے روپ ہیں محبت اور والدین کے روپ ہیں فرض کی آپس میں ملتی جاتی ہے۔ لیکن اس کی قربانی کی حد نہ رہی جب اس کے والدین نے فوراً اس کو پرہیز کوئی لیا تو گوتم کی مرضی کے مطابق شادی کرنے کو تیار ہو گئے۔ اپنی جوہر کی فوری قبولیت پر ایک بار تو اسے افسوس بھی ہوا۔ اس نے کیا کیا سبکیں بنائی تھیں کہ ماں باپ کے انکار کو دیتے ہو کیا کرے گا۔ ہری چاچا ان پر دبا ڈ ڈ لوائے گا۔ کھانا پینا سچھوڑ کر عاشقا نروغ اختیار کرے گا۔ خود کچی کی دھکی دے گا۔ دونوں طرف سے سمجھوتے کی کوششیں ہوں گی وہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف رسول برحق کرے گا۔ غرضیکہ اس نے کیا کیا سوچا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے والدین نے دانش مند اور آزمودہ حربیوں کی طرح پیش بینی کر کے اس کی تمام چالوں کو ناکام بنا دیا ہو۔ یہ کیسے والدین ہیں، گوتم نے سوچا، جو حققت ہی نہیں کرتے محبت کا دھماکا تو ان قصاصوں میں ہے جن کو وہ

سنبھالنے کے قابل نہیں ہوا۔ لیکن جب وہ دیا ننداری سے اپنے دل کو ڈھنسا تو وہ خود اپنے سے یہ چھپا نہ سکتا کہ وہ انداز سے دور چکا تھا اور آہستہ آہستہ غیر مشغوری طور پر رتنا کی طرف کھینچا چلا جا رہا تھا۔ رتنا سے اس کی ملاقات ایک بڑی یادگی میں ہوئی تھی لیکن جس قسم کی لڑکیوں کو سوسائٹی گزرنے کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے رتنا ان سب سے جدا تھی۔ قنارت کرائے جانے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے ایک دوسری باتیں کیں اور اختہ ہی سے گوتم جان گیا کہ رتنا لاکھوں میں اپنی قسم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ جب گوتم یادگی سے واپس آیا تو ایک محسوس قسم کی خوشی اس کے دل میں گھڑی لے رہی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک مسکراہٹ اس کے بھلے پر ناز دہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلنے کے لئے مڑا تو قدر آدم آئیچے پر اس کی نظر جا پڑی اور وہ ششک کردہیں رک گیا۔ آئیچے میں دیکھا تو اپنے عکس کے بجائے وہاں رتنا کھڑی تھی۔ وہ خوبصورت تھی، بہت خوبصورت، لیکن اس میں منہ کشش کے بجائے ایک قسم کی روحانی کشش تھی۔ اس کی آنکھیں اس عہد کے پانی کی طرح شفاف تھیں جس میں پہاڑ کا عکس مٹھ کر اس کے اُچھلنے کو اور بھی نمایاں کر دیتا ہے۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کے وجود کے زیر مٹی پن میں اضافہ کر رہی تھی۔ گوتم نے دیو دیوی کے بارے میں بھی سُن رکھا تھا آج اس نے اپنی آنکھوں سے ایسی دیوی کو دیکھ لیا تھا جس کی عبادت کرنے کے لئے ایک عمر تو کیا بار بار۔ جم بیٹے کو تار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہس کی منزل آتے پہنچی ہو۔ اس کی روح کو مدق جس کی تلاش تھی وہی اس کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ مرقہ قاس کی بھائی کوئی ۱۸-۲۰ برس کے قریب ہوگی لیکن اس کے چہرے سے وہ سنجیدگی اور متانت نہ نکلتی تھی جو سان کو مدقوں آخوش تہذیب میں پلٹنے پر بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ رتنا کے وجود میں ایک عجیب وقار تھا اور اس کے حسن میں ایک اٹھ کھلاں۔ رتنا کی ایک مسکراہٹ گوتم کی زندگی کو دکھانے کے لئے کافی تھی۔ وہ بار بار لے اور پھر ان کا منہ عام ہو گیا۔ وہ یاد رکھیں

میں ملے، ایک دوسرے کے گھر پر ملے اور کبھی کبھار اکیلے ہی۔ ہر ملاقات ان کو ایک دوسرے کے پاس لاق رہی حلقہ کر ان کی قربت کی آغ ایک دوسرے کے لئے منظر حیات بن گئی۔ گوتم کو رتنا کے ساتھ بے پناہ محبت و معیت تھی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ رتنا کے جذبات میں بھی اس کے لئے اتنی ہی سنجیدگی ہے تو جیسے اچانک گوتم نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ کبھی اس نے انداز سے بھی محبت کی تھی اور اس کے ساتھ شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ جذبات چاہے کچھ بھی ہوں گوتم بے حد کھد دار، سنجیدہ، وفا شعار اور صاف گو واقع ہوا تھا۔ ایک دن اس نے رتنا کو بتا دیا کہ شاید ہمیں اس سے آگے نہ بڑھنا چاہیے کیونکہ اس نے انداز سے بیار کیا تھا اور شادی کے لئے انداز اس کا انتظار بھی کر رہی ہے۔

رتنا بھی عجیب لڑکی تھی۔ اس بات کو سن کر وہ جل نہیں اُٹھی، روٹی نہیں، چلائی نہیں، ہنس پڑی اور بڑے مضطرب سے بولی۔

”بڑی اچھی بات ہے۔ کبھی اپنے پسپا رہی کہانی تو سناؤ ہیں۔“

اور ایک دن گوتم نے دیانت داری کے ساتھ ساری کہانی سنا ڈالی۔

رتنا بڑے غرور اور صبر سے سب کچھ سن رہی تھی۔ پھر مسکراتی ہوئی آہ بھر کر بولی۔

”واہ صاحب اتنی بھی جلدی کیا پڑی تھی آپ کو؟ کچھ قراحتا کر لیا ہوتا۔“

اور پھر ایک دم اپنے آپ کو سنبھال کر بولی جیسے اپنی لغزش کو چھپانا چاہتی ہو۔

”میں مانتی ہوں آپ پر انداز ہیں کا حق ہے۔ میں اس کا حق نہیں چھیڑوں گی۔“

”بہن“ گوتم گھبرا اُٹھا۔ کس نام سے رتنا اندرا کو پکارتی تھی۔ ایسی حالت میں کوئی اور عورت کس رقیب کے نام کو

بالکل برداشت نہ کرے۔ لیکن کس احترام اور پیار سے رتنا اندرا کو ذکر کر رہی تھی۔ اسی ہی باتیں گوتم کو رتنا کا اور بھی کچھ دیکھنا بدادیتیں۔

ایک دوبار گوتم نے کہنا چاہا۔ ”ہمیں ایک دوسرے سے ملنا نہیں چاہیئے۔ ورنہ.....“

رتنا اس کی بات کا شے ہوئے کہتی۔ ”یرتم کیا کہتے ہو میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے صرف اپنے آپ سے پیار کرنے دو۔ اور گوتم کا مجھ سے ہوا عزم بے سہارا ہو کر پھوٹ جاتا۔ اب اندرا ان کی ملاقاتوں کی گھنٹہ گوا ایک لازمی موضوع بن گئی تھی۔ ان کی قربت کے بہت قیمتی لمحوں میں رتنا مسکرا کر اچانک پوچھ بیٹھتی۔ ”ابندرا ہمیں کیسی ہیں؟ کبھی ان کی کوئی بات سنایا کرو۔“ یہ بات گوتم کو بہت ادا اس کر دیتی اسے ایک دم رتنا پر غصہ بھی آتا۔ پیار کے سہانے لمحوں میں اس کی یہ بات کہتا ہے مڑھیں پیدا کر دیتی تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے یکوا جرم اور فحاشی کا احساس ہوتا۔ وہ ایسا محسوس کرتا گویا رتنا نے اس کے جرم، اس کے باپ پر اٹھی لکھ دی ہو۔ اگر گوتم کے دل کے اندرا اندرا ایک بار داخل ہو جیتی تھی تو پھر کیوں گوتم نے رتنا کے دل کے کواٹر پر دستک دی؟

وہ اپنے آپ کو کھوتا اور پھر کھوتا اندرا کو مامی کے ہونٹانک سامنے کیوں اس کے حال اور مستحکم کو تارک ایک کئے جاتے ہیں؟

اور گوتم کو ادا اس دیکھ کر رتنا بڑے سخیخ انداز میں اسے گویا چھڑنے کے لئے کہتی دھان کر عام طور پر چھڑنا اس کی خصلت میں نہ تھا۔

”کیوں اندرا ہمیں گویا دھان ہے کیا؟“ اور پھر گویا تیس لکھ کر گوتم کو دلاسا دیتے ہوئے کہتی،

”کوئی بات نہیں۔ انھیں بھی یہیں بلائیں گے۔ اور گوتم پریشان ہو کر رتنا کی گود میں سر ڈال دیتا۔

دو دن جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک ناقابل عبور

خیلی حائل ہے جس کی درستیں گوتم اور رتنا دونوں کی اخلاقی قدروں کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ گوتم خود رتنا پر دل و جان سے مڑتا تھا، اس کی عبادت کرتا تھا۔ اسے پاکر وہ کیا کچھ نہ پالیتا۔

اس کی زندگی سہل ہو جاتی۔ لیکن.....

لیکن گوتم خود اپنے خلاف تھا۔ اس کا رویہ اپنے ساتھ بھی نہایت متعقبات اور غیر جانبدارہ قسم کا تھا۔ وہ چھٹتا تھا کہ چیز بات چاہے کچھ بھی ہوں انصاف کی بنا پر اندرا کو اس پر قلمی حق حاصل تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ اندرا اس کی زندگی میں پہلے داخل ہوئی تھی اس لئے وہی اس کے دل کی جگہ ہو سکتی تھی جیسے راسخ کی دکان پر جو ”کیو“ میں پہلے آئے اس کو حق ہو جاتا ہے پہلے پہنچنے لینے کا۔ گوتم گوتم کو پیار بھی آئے اور چینی کی طرح ”کیو“ کے لئے مروجہ ضابطے سے ہی دل کھاتا تھا۔ وہ یہ بات جانتے ہوئے بھی نظر انداز کرتا چاہتا تھا کہ ضابطہ، فہم اور ترتیب کا پیار سے کوئی ضابطہ نہیں۔ محبوب کو سارے ”کیو“ سارے قوانین اور ضابطے توڑ کر اپنے محبوب تک پہنچ جاتا ہے یا پھر چپکے سے چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے۔ کوئی قانون، ضابطہ اور حکم اسے قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ گھنٹوں اس کی خود اپنے آپ سے بحث ہوتی اور اس کے اندر کے دو گوتم اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔

”اندرا کو بھول جاؤ، رتنا تھا رانا ازل سے انتظار کر رہی ہے“ رتنا تھا رنے ہی تھی۔

”یر بے وفا کی مہے۔ اندرا کا حق تو پرامن ہے۔ اندرا نے تمہیں پہلے ڈھونڈا ہے۔“

”ڈھونڈنے کی بات چھوڑو۔ تم شادی کرنا چاہتے ہو شادی اسی کے ساتھ ہو سکتی ہے جو تمہارے دل و دماغ میں بسا ہے۔

شادی تمہاری خوشی کی بات ہے۔“

”تم کسی کی آرزوؤں کا خون کر کے اپنی خوشیوں کا صلہ کیسے کھڑا کر سکتے ہو۔“

”یر تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ عمر بھر کی خوشی چاہتے ہو یا

عمر بھر کی قید ؟ رتنا کو چھوڑ گئے کہیں اور تسکین نہیں پاؤ گے ؟
 ” یہ صرف تمہاری زندگی کا ہی سوال نہیں کسی اور کی بھی
 زندگی کا سوال ہے ، حتیٰ و یا ظلم کا سوال ہے ، انصاف اور ظلم کا
 سوال ہے ۔“

” اپنے دل کا خون نہ کرو ۔ اپنے پاؤں پر کھسکاؤ مت مامو
 محبت کی آواز کو سنو ۔“
 ” فرض کی پکار کو مت ٹھکراؤ ۔“

فرض اور محبت ، محبت اور فرض ، اور پھر دونوں کو قبول
 پس تو تین میں شروع ہو جاتی ، ناقص پائی ہو جاتی اور پھر دونوں
 محکم ٹھکتا ہو جاتے حکم کھلاڑائی شروع ہو جاتی ۔
 اور پھر گوتے کے دل میں ایک بیس سی اٹھتی ۔ وہ کہہ اٹھتا ۔
 وہ دونوں کو توں کوڈا نٹ ڈیٹ کر اپنی جگہ بیٹھ جانے کو کہتا ۔
 لیکن یہ قوروز کا معمول ہو گیا تھا ۔ جب بھی اسے اکیلا پاتے
 دونوں گوتے آہستہ سے اٹھتے اور کھٹے بندوں اس پر زور ڈالتی
 کرتا شروع کر دیتے جو ہمیشہ اسی دھینگا سٹشی اور لڑائی پر ختم
 ہوتی ۔

آخر ایک دن تنگ آکر اس نے ہمارے حامی گوتے کو خوب
 ڈانٹا ۔ اسے سخت سست کہا اور اپنے دل سے نکل جانے کو کہا ۔
 وہ چپ چاپ منہ لٹکائے آنکھوں میں آنسو جھپٹے نکل گیا ۔
 اس کے جانے سے گوتے کا دل پر نشین ہو گیا ، اداس ہو گیا اور
 گوتے اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کیے لگا ۔ لیکن اب وہ پکا فیصلہ
 کر چکا تھا ۔ اگر گوتے جھوٹا اور خود اس کا بیٹا قتل کے جرم میں
 اس کے سامنے پیش ہوتا تو وہ بلا جھجکا اسے چٹائی کی سزا دیتا ۔
 اپنے ساتھ ہی گوتے نے ایسا ہی کیا ۔

اسی شام وہ رتنا کے پاس گیا اور دم لے ہوئے ٹھکے سے
 اس نے اپنے فیصلہ سنایا دیا ۔ ” رتنا : میں اگلے چھینے اندر اسے
 شادی کر رہا ہوں ۔“

رتنا کے چہرے پر یہی مخصوص مسکراہٹ آگئی جو اندر کے
 نام پر ہمیشہ آیا کرتی تھی ۔ لیکن آج اس مسکراہٹ میں وہ سب

یاس و حزن چھپا ہوا تھا ۔ وہ لمبی اور لمبی چارنگی تھی جو گوتے کے لئے
 جہنم کے کام انتظار نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی ۔ رتنا کی اس
 مخصوص مسکراہٹ نے اسے عام عورتوں کے زمرے سے الگ کر رکھا تھا ۔
 وہ محبت اور بچائی پر مبنی ہوئی ایک دیوی لگ رہی تھی جسے انسانوں کے
 دنیاوی کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جو انسان کی دعاؤں اور
 بد دعاؤں کے جواب میں کیساں طور پر ایسی مسکراہٹ ہی سے جواب
 دیتا ہے ۔ اور پھر جیسے رتنا کے صدیوں کے رُکے ہوئے آنسوؤں کو راستہ
 مل گیا ۔ اس کا چہرہ ہنسٹا اٹھا اور وہ بولی :-

” بہت خوشی کی بات ہے ۔ میں بھی ملے گا یہ“
 اور جس گوتے کو گوتے نے اسی اچھی اپنے دل سے مار رکھا تھا وہ
 چلا آ ، دوڑتا اور چلتا ہوا ، پس آ گیا اور دل کی چوکت پر کھٹا
 ہو گیا ۔

گوتے نے دم لے ہوئے ٹھکے سے رتنا سے کہا :-
 ” رتنا اگر اب بھی تم صرف ایک بار مل نہ دو تو میں اندر کو چھوڑ
 کر تمہارا ہو سکتا ہوں ۔“

رتنا کے کانوں پر جیسے ہوئے آنسوؤں نے اپنے راستے بنا لئے تھے
 وہ ایک دم چمکی اور ایسے انداز میں بولی جس میں حیرانی کے ساتھ
 کسی قدر تعجب کا میز جڑنے کی تلی بھی شامی تھی ۔
 ” اندر ابھی کا تم پر تھی ہے ۔ یہاں کسی کا حق کیسے چھین سکتی ہوں ؟ میں
 اپنے ہاتھ سے تمہیں اندر باہر کسو نہیں گی ۔“

رتنا کے اندر میں اس کیفیت تھی کہ وہ لڑا جو گوتے کے دل
 کی چوکت پر کھڑا تھا ، پھر ڈر کر ہباگ گیا ۔ دوسرے لڑکے نے تہمتہ
 لگایا اور گوتے کے دل کو لڑ بندھ کر دئے ۔ اب گوتے کے دل پر اس
 دوسرے لڑکے کا پورا قبضہ تھا ۔

شادی کے دن سے دو روز پہلے ایک بار پھر گوتے رتنا سے
 ملنے آیا ۔ یہ دو گوتے دونوں کی آخری ملاقات تھی ۔ اس کے بعد دونوں
 کی منزلیں الگ الگ اور راستے الگ تھے ۔ جیوں کے سفر میں ایسے
 ساتھیوں کا بھڑنا جانکا ہی تو ہوتا ہے ۔ رتنا نے اپنے اہل حق سے
 گوتے کے قدم چھو کر اپنی مانگ مہری اور پھر گوتے کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کہک - اندرا ہیں کو خوش رکھنا۔"

یہ آخری چوٹ تھی اندر گوتم اس کا زور نہ سہرا۔ وہ چسک گیا۔ کبھی کسی نے اپنا مزہ ایسے بھی لٹایا ہے؟ راجپوت مورچے بھی تو اسی ضبط اور خوشی کے ساتھ اپنے مردوں کو دشمنی کا تلواری دھارا پر دو کھیلے تھیں۔ شاید رہتا پہلے نہیں میں سمیٹتا راجپوت ہی پیدا ہوئے آئی تھی!

گوتم کی شادی میں رہتا نہیں آئی۔ اور صرف یہی بات تھی جسے گوتم کو اس کے عورت ہونے کا یقین کیا۔ اگر وہ شادی میں شرکت کر لیتی تو گوتم کو یقین ہو جاتا کہ تو رشتہ جی کا بت ہے یا مرے سے اسے گوتم سے کوئی لگاؤ ہی نہیں تھا۔ اور خود گوتم کا یہ حال تھا کہ دو سال پہلے ہی بڑی کے ساتھ وہ رسول میرے کے خواب دیکھا کرتا تھا، اس کے ساتھ منڈپ میں بیٹھے رہ جاتے تھیں اس کے دماغ کو طلاق کے خیالات ڈالتے جا رہے تھے!

ہندوستان میں شادی ہوتی ہے تو بچہ تو پیدیا ہونے کے لئے تیار ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ لڑکیاں اپنی دوشیزگی کا غلط نہ سمجھتے ہوتے ہیں۔ پہیز میں نہیں لائیں۔ ورنہ اور شادی آؤ اور جیسے۔ ہر ہندوستانی لڑکی کا حق اور فرض ہے کہ اس کی گود سدا ہری رہے اور وہ اپنے خاوند کو ملوں سے دھڑا دھڑا لال کر دے۔ اندرا بھی اس خاندان سے خالص ہندوستانی لڑکی تھی اور عیسے شاید ہر ہندوستانی ماں کی طرح اس کی ماں نے بھی ڈول میں سپرہنے ہوئے اس کے کان میں بھونک دیا تھا کہ جب تک بچہ نہیں ہوتا مرد پوری طرح قابو میں نہیں آتا۔ جہاں تک بیوی اور خاوند کے رشتے کا اس بات سے تعلق تھا کہ ہر بے اندر گوتم کی گود نہ اٹھانے والی تھی۔ وختیہ کہ کم سے کم عرصے میں اندر اسے اپنے خاوند کو تین چوں کا پاپ بنا دیا۔

پہلے کے علاوہ اندر گوتم کو وہ سب کچھ دیتی جیسی کی تو حق بہتر ہیں بیویوں سے کی جاسکتی ہے۔ وہ کام کرنے والی، پیدا کرنے والی اور خاوند کی تفریب عہد کرتے والی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ ایسی لڑکیوں میں سے تھی جو صرف شادی کے لئے ہی پیدا ہوتی

ہیں۔ میں کی انفرادیت شادی کے بعد ہی ٹھیک ہے۔ جن کی شخصیت کا پورا ٹھکانہ چار دیواری میں ہی پھنسا ہے اور پچھلے اور خاوند کی گہما گہما اور اہتمام میں کے لئے امت سے کم نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں اندر شادی اور ٹھکانے کے لئے گہما گہما تھی اور ایسی ہی کسی اہمیت دل کو شاداب نہیں کر سکتی؟ خاص طور پر جب کہ اس کا کام صرف ماحول کے ساتھ مکمل افاق کا ثبوت دینا ہی ہو۔ اندر نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی بے لوث خدمت اور پیار کے ذریعے گوتم کو ریشم کے دھاگوں سے جکڑ لیا۔ وہ گوتم کی ازدواجی زندگی میں اضافتی روپ سے آئی تھی۔ گوتم کو اس بات کا پورا اعزاز تھا اور وہ بچے دل سے، ہر طرح میں طبع سے، اور روحانی و فاداری کے مشا اس بات کے لئے کوشاں رہتا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ اندر کے پسیدہ کا بدلہ تو دے سکے۔ لیکن دل آخروں ہے کوئی میلا کڑا تو ہے نہیں کبھی اس کو نہی پڑتا تھا تو کبھی اس پر۔ ہر جسم کی اپنی لہر دریاں ہیں تو دل اپنی جگہ جم ہو رہے۔ جسم واقعی ضرورتاً دھب کر سمجھتا کہ کسکنا ہے لیکن دل کا تو اپنا ستیوہ ہے جسم اور دل کی آپس میں کبھی نہیں بنتی اور چوں کہ جسم بڑا ہے اندر اسے اس نے ہمیشہ دل پر قابض آ جاتا ہے۔ بے چارہ دل اسی لئے تو ایک کونے میں جمسا ہوا پڑا رہتا ہے۔ گوتم کا جسم تو اندر کا غلام ہو چکا تھا لیکن دل میں کبھی کبھی جیگر کی سنگ تھی۔ جسم تو اندر کا نام ہے کہ تم کھا تا لیکن دل اب بھی رشتا کے لئے آہ بھر رہا تھا۔

شادی کے بعد رشتا سے وہ کبھی ملا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے کبھی خط و کتابت ہوتی تھی۔ ماں اس کا دوست بہت جی جی خط لکھتا کچھ نہ کچھ حال رشتا کا بھی لکھ دیتا۔ اسی سے اُسے معلوم ہوا تھا کہ دستخانے اب تک شادی نہیں کی اور ابے گھر میں وہ تہہ بیاہیں ہی رہتی ہے۔ گوتم کی زندگی پر سکون تھی۔ ٹھکانے والے بچے، نوکر چاکر اور موٹریں غیر غرضیکہ ہر چیز کی بہتات تھی لیکن نہ جانتے کون کبھی اچھا انداز کے ساتھ لطیف ترین محبت میں بھی اسے کسی مظلوم سے۔ نام برکی یزمری بوجھ کے احساس سے گھٹی سی محسوس ہوئے لگتی۔ ایسا تو بوجھ ہے گوتم کبھی آنا نہ بھول گیا ہو اور جو زہری طرح آہستہ آہستہ اس کے جسم میں

سراست کرتا جا رہا ہو۔

گوتم بظاہر مکمل غاؤ اور شفیق باپ تھا۔ اندرا کو بھی اپنے غاؤ پر پورا اعتماد تھا اور اس کی پوری محبت حاصل ہونے پر فرحی زندگی کی گاڑی آرام سے طاری تھی کہ اچانک ایک بچہ لاسلا سا ایک دن نئے سال کی شام کو گوتم جب دفتر سے واپس آیا تو اس کے چہرے پر تکنان اور اندر دگی کے نشان نمایاں تھے۔ گھر آتے ہی وہ بستر پر پڑ گیا اور بٹے سے بخار اور سرور دگی کے شعلہ سیت کی۔ اندرا سے سوچا شاید یاد کام کی وجہ سے تھک گئے ہوں گے اور دوا کھانے سے ٹھیک ہو جائیں گے لیکن رات کو گوتم کو زوروں کا بخار چڑھ گیا اور وہ بے ہوش کی حالت میں بھی بھی بڑبڑاتا رہا۔ دوسری صبح تو بس یہ حال تھا کہ ڈاکٹر دو گنا آتا لگ گیا۔ ڈاکٹر دوں کی رائے میں زیادہ فکر کی وجہ سے شاید عصبانی ہو گیا تھا۔ وہ ان کا خیال تھا کہ چند دنوں کے مکمل آرام سے ٹھیک ہو جائے گا۔

شام کو گوتم نے اندرا کو اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ سے لکھی کرتے ہوئے بولا، "اندرا! میں تمہارے پیار کے برے میں تمہیں کچھ مزہ دے سکا۔" گوتم کے انداز میں ایک کرب و غم اور عزت تھا اور ایسا عزت عام خود پر نشان بھی کرتا ہے جب وہ اس دنیا سے من موڑ رہا ہو۔ اندرا اس اشاریت سے گھبرا گیا اور بولی، "مائے رام یہ آپ کسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کے چروں میں کسی کچھ پایا ہے۔" گوتم نے ایک بھی سانس فی اور ایسی نظروں سے اندرا کی طرف دیکھا جس میں ادنیٰ اداسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بولنے کے لئے خاص بہت سے کام میں پڑ رہا ہے۔ اندرا یہ دیکھ کر کانپ اٹھی اور چھپرے گوتم نے بلندی سے اترتے ہوئے پچھلے کی طرح اندرا کو زور سے قہقہہ لیا اور دھڑکی چپکے کے ساتھ بولا۔

"بہن چلا۔ اندرا مجھے صاف کر دو میں چلا۔"

اور اندرا کے جواب کا انتظار رکے بغیر گوتم چبدا گیا اندرا دو زکی، "بیچ نہ سکی۔ میں پچھلے پچھلے دیروں سے اس اندھیرے کو جبر کر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی جو اس کے گرد دھوئیں کی طرح

بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس نے اچانک اس جوانی میں ہندوستانی عورت کا دھوا پس اپنے پورے وجود کے ساتھ اندرا پر ان گرا اس بات کو کچھ سمجھنے لگا کہ لیکن اندرا ابھی تک یہ مانتے سے برابر انکار کے جاری تھی گوتم مرچیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور رائے گا۔ بارہا گوتم ایسے ہی دوسرے پر جایا کرتا تھا اور جلتے ہوئے کہتا "اچھا میں چلا" اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شاید کچھ دیر لگ گئی ہو لیکن وہ آہیں گے ضرور۔ اس نے گوتم کی کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں کی، ہتھ ہوئے بچے اگر کسی چیز کو ہاتھ لگائے لگتے تو انہیں ڈانٹتی، "مت چھیڑو ان کی چیزیں۔ وہ آہیں گے تو غصہ کر دیں گے۔" اور مضموم بچے سوچتے کہ جیتے ہی جن صاحب نے مجھے غصہ نہ کیا ہو وہ موت کے بعد غصہ کیوں کرنے لگا جیتے بچوں کو بھی ماں کی ویرانی اور بے کسی پر ترس آنے لگا تھا۔ جب گھانا میر پر لگا یا جاتا تو گوتم کی بلیٹ بھی لگتی اور اندرا گوتم کے اختلاف میں نہ جانے کس سوچ میں بھی رہتی۔ پھر جب سب کھما کھما ٹھ جاتے تو اندرا بھی جھوک اور غم سے نڈھال ایک دو دن اسے مزہ نہیں ڈال کر اٹھ بیٹھتی۔ اس طرح بہار سادوں رات ہو جاتا اور رات کے اندھیرے پھر سحر کے اُجالوں میں تبدیل ہو جاتے۔ اگر اندرا کی زندگی ویران اور اس کے دن افسردہ تھے تو کیا ہوا۔ نظام شام و سحر تو ایک افسردہ روح کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔ اگر ایک طاق ویران بھی ہو تو بزم جب آغاں براس کا لکھا اڑھ پڑ سکتا ہے؟ اندرا اپنے غم میں اکیلی، بالکل اکیلی تھی۔ اسی زندگی جیسے انتظار کی ایک طویل شام تھی۔

ایک دن موسم بدلنے پر اندرا نے گوتم کے کپڑوں کو دھوپ دینے کے لئے نکالا۔ سب سے پہلے جو سوٹ اٹھا یا وہ دہی تھا جو گوتم نے آسٹری دن پہنا ہوا تھا۔ اسے اٹھا یا اور جیسے لمحوں کو اندرا کی جیب میں اسے دو خط گوتم کے نام لکھے ہوئے ملے۔ اس نے ایک خط اٹھا یا، اسے نئے سال سے پہلے ہی دن پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ عجیب سا خط تھا۔ لکھا تھا۔

"گوتم! آج تک میں نے تجھے خط نہیں لکھا اور یہ

تربیت

کھیل چر مشورع ہو گیا۔

گیند جب ریپکے پاس آجاتی تو وہ اسے چھینکے میں تامل کرتا،
ناقد میں تھاے نشانہ سادہ ہٹا رہتا اور تکی کھڑا اس کا منہ تانا کرتا۔
ایک بار اس نے دیر اور بھی زیا دہ کر دی جوتی کو ناگوار گزری چٹا پچہ
جب گیند اس کے پاس آئی تو وہ اسے ریپ کی طرف چھینکے کی بجائے آپ
سی آپ اُچھالے اور کھینکے لگا۔ ریپ نے کھینکے کی کوشش کی تو اس نے
تڑا تڑا تڑا تڑا دھنن ناقدہ مار دے اور ریپ روٹا چلا ہوا ٹھہری
طرف دوڑا۔

بل نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوں اتر آیا۔ وہ غصے
سے تھلا اُٹھا۔ ریپ کو وہ نے منہ کھلوئے اس لئے لاکر دیتا تھا کہ وہ دستہ
بچوں کے ساتھ کھیلے ہوئے فرحمنوں کرے۔ اس میں احساس برتری
پیدا ہو اور اس میں حس اور آٹ کا جذبہ پرورش پائے۔ لیکن جب
اسے تکی کے ناقدہ سے پہلے دیکھا تو بل کو بے حد رنج ہوا۔ بی بی آنی کو کتنی
کوہک کر گدگد سے پوچھے اور پھر ریپ سے کہے۔ ”ماریشا تو جی ماڑ
لیکن دوسرے ہی لمحہ خیال آیا کہ بچوں کی لڑائی میں کوہ تا مناسب
نہیں ہے۔ کوئی دیکھے کہ تو کیا کہے گا۔ شرافت کی جو ساکھ برسوں میں
قائم کیے دیکھتے ہی دیکھتے مٹی میں مل جائے گی۔ لگی کپے کے سب لوگ
اسی کو برا کہیں گے۔ ریپ کا مقصد رکھ دیکھے گا۔

اس نے ایک لمحہ دارا دی کی طرف غصہ ضبط کیا۔ آہستہ سے
باہر نکلا اور تکی سے کہہ کہنے کی بجائے اپنے پچے کو پھارتا ہوا اندر

دوڑنے پچے سامنے گویں کھیل رہے تھے اور بل کھڑکی میں کھڑا
انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں خاص طور پر اپنے بیٹے ریپ
پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کی ہر ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک
ہوائی جہاز کی گونج سنائی دی۔ دونوں بچے چلے گئے اور گیند چھوڑ کر اوپر
کی طرف دیکھنے لگے۔
”وائی جان! وائی جان!“ تکی چلایا اور اپنی جگہ پر ایک ناگ
کے بل اُچھینکے لگا۔

”دو! دو!“ ریپ نے کہا اور بیڑے بے معصوم اشتیاق
سے آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

”شباباش! بل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اسے اپنے بیٹے پر فخر
محسوس ہوا کیوں کہ اس نے سب کے سب کے ہڈب بچے کی طرف اپنے جذبات
کو نکال دیا تھا اور تکی کی طرف بے قشاعت چلنے شروع نہیں کر دیا تھا۔
تکی ابتدائی دور کے وحشی انسان کا اور ریپ عیسوی مدی کے شائستہ انسان
کا نمونہ تھا۔ دونوں کی حرکتوں سے ہڈب کے ارتقا کا فرق نمایاں تھا۔
باپ کا دل خوشی اور مسرت سے ناپاچ اُٹھا۔

ہوائی جہاز دور نکل گئے رفتہ رفتہ آواز مدہم ہونے لگی۔ باکا سنائی
دینا بند ہو گئی۔ بچے پھر گیند کی طرف متوجہ ہوئے۔

”یہ میاں ہے۔ بیٹے ڈیڑی لاسے تھے۔“ ریپ نے گردن ہڑس کر کے
شان سے کہا

”لاؤ چھینکو، دونوں کھیلیں گے۔“ تکی نے بات بنائی اور گیند کا

لے گی۔

بڑے تماشا دور تھا اور دونوں بھائیوں چلا رہا تھا جیسے ایک وقت ہزاروں بیڑوں نے کاٹ کھایا ہو۔

بچے کا دل ناسی کر رہا تھا کام چھوڑ کر دوسرے سے دوری ہوئی آئی اور بڑے کو گود میں بٹھا کر اس کے گل پہلاستے ہوئے بولی۔
”ہے ہے کیسے ظالم بچے ہیں۔ دیکھو تو یہی انگلیوں کے نشان صاف اُبھر رہے ہیں۔“

”جس کی گردن تمہاری اولاد ہی ایسی ہے۔“ بل نے گھٹی گھٹی
”کلی کا تہا رکیا اور ذرا وقت کے بعد پھر کہا۔“ یہ عمر میں کلی سے
ڈیڑھ دو سال بڑا ہے۔

”ایک تلی کیا“ بھی سے پٹ جاتا ہے۔ اس سے کچھ بڑا ہی نہیں
مان سے رواں سو بھوکا کہا اور بچے کو چھاتی سے لنگایا۔
”میں تو اور آگے کی سوچتا ہوں۔“ بل نے سنی خفیت سی
حرکت کے ساتھ حسنینہ نشانہ دیا تھا۔ ”اگر یہی حالت رہی تو وہ
ساری عمر پیشانی پر ہے گا۔“

”تم بھی آگے کی سوچتے ہو اور کبھی پیچھے کی پر یہ نہیں کیجئے
کہ محلے کے دوسرے بچے بھاڑی سے خوشوار ہیں۔ وہ مومے تو
پیدا ہوتے ہی لڑنا سیکھ لیتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں بھی اسے لڑنا سکھاؤں۔“

”تم کیوں سکھاؤ گے شرافت کو لاج نہیں لگ جائے گی۔“
بیوی نے کہا اور کتے ہونے بچے کو ساتھ لے کر دوسری میں چلی گئی۔
بل آہستہ سے کمری پر بیٹھ گیا۔ وہ بٹا ہوا سر اس کی اور خاموش
تھا لیکن اس کے اندر لاہا کھول رہا تھا۔ بچے کے پٹنے کا منظر
اب بھی غفلت کے ساتھ تھا۔ بیوی کے الفاظ ”محلے کے بچے
سکھاؤ ہی سے خوشوار ہیں۔۔۔۔۔“ اس کے فاقوں میں گونج
رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ میں ایک باپ کے ناطے میں
اپنے فرض سے کوتاہی کر نہیں کر رہا۔ چڑیا اپنے بچے کو پٹکا لینا
اور شاہی شکار پر بھٹتا سکھا رہا ہے۔ اہلہ میں۔۔۔۔۔ کم از کم
اسے اپنی مخالفت کرنا تو سکھاؤں۔

یہ خیالی اس کے ذہن میں ابھی کی طرح گونج رہا تھا۔ وہ شور و گھبراہٹ کے
ملاقا نہیں بنا سکا اور اضلاع کی راست میں اور حرا دھر ٹھٹھے لگا۔

”ہاں! اگر اس ماحول پر رہنا ہے تو اسے لڑنا بھی سکھانا ہوگا۔“ اس
نے شفیق تان کر کہا جس پر اپنی اور اپنے ادا کے آواز بلند اعلان کیا۔
پتیاں چر اس نے دھوک پٹ کر جاگنے کی بجائے آگے بڑھ کر حملہ
کرنے کے محسوس کیا۔

”دیکھو بیٹا! اگر یوں انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دو ہتھڑا لاجائے
تو سامنے والا بچہ اونڈھے منہ میں پرگڑ پڑتا ہے۔“

پچھلے پہل سے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ جیت سے یہ تماشا دیکھتا اور
باپ کے معصومی دور ہتھڑے ہتھڑے پر کر کر منہ بڑھتا رہا۔ مگر سات آٹھ
دو کے بعد اس نے انگلیوں میں انگلیاں جھپٹ کر دو ہتھڑا جانا سیکھ لیا
اور جب اس کی چوٹ سے باپ واقعی اونڈھے منہ چارپائی پر رل چلا گیا
اور ڈھکی سر سے آکر تڑپ میں پر چاڑی تو بڑھ کھل کھل کر رہ گیا۔ اسے
اس کیل میں واقعی مر آ رہا۔ ”دیکھا یوں کر جانا ہے۔“ بل نے اپنی ٹوپی
دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تلی یا کوئی دوسرا بچہ تمہیں مارے
یا تمہاری چیز جیسے توڑنا نہیں، جاگنا نہیں۔ اسے یوں ہی اڑتا۔ لو
پھر ڈالو انگلیوں میں انگلیاں اور یوں۔۔۔۔۔“

وہ بچے سے چپٹ کھاتا اور جان بوجھ کر چارپائی یا صوفے پر
گر پڑتا۔

جب یہ سلسلہ بندہ ہیں روز تھک جاری رہا تو بڑے دو ہتھڑا پٹنے
اور ضرب لگنے میں مشاق ہو گیا اور اس کیل سے اس کی دل چسپی میان
”تھک بڑھ گئی“ کو جب دیکھو انگلیوں میں انگلیاں جھپٹا کر اور دو ہتھڑا
بنائے گھوم رہا ہے۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہاں، جیسی،
باپ جو بھی نخرے اس پر دار کر کے بڑی شان سے کہتا،

”دیکھو ڈھکی یوں۔۔۔۔۔“

بل بچے کو کہتے ”اور سکرانے دیکھو کہ فرض ہوتا اور میں اس
میں سوچتا۔“ اب اس کا مستقبل محفوظ ہے۔

انہیں دونوں اس کا دوست سرسبز اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ
جائزہ دے کر آیا۔ انہیں پانچ سات دن مل رہا تھا۔ بل نے خط

میں کہہ دیا تھا کہ اور کبھی پہلے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بھڑا۔ میں ڈر
برہی جو ی آپ کی آمد کے منتظر ہیں گئے۔ چنانچہ سریش اس کی بیوی اور
ان کا بچہ اب محل کے مہمان تھے۔

دوسرے دن رپو اپنے مہمان اس موقعی جتنی کو ساتھ لے کر کھینچے نکلا
وہ اس کا ہم عمر تھا اور ہم میں بھی کوئی زیادہ مقید نہیں تھا۔

"ابن دور نہیں جانا، اور ہر کھینچنا۔" محل نے رپو سے کہا۔
"ڈپٹی ام جی میں کھینچ گئے۔" رپو نے جواب دیا اور کوئی کے کند
پرنا تھڑکھڑاتے بڑے چاؤ سے اپنے ساتھ لے گیا۔

"دیکھو، ہم عروں میں قدرتی لگاؤ تھا اور بچے کتنی جلدی ایک دوسرے
کے دوست بن جاتے ہیں۔" محل نے رپو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
سریش نے بھی کچھ کہنا ضروری سمجھا اور بات جب ایک بار محل پر
تو رپو کی لفتی سے لے کر کھانا انت اور احوال تک جا پہنچی۔

"کوئی بچہ روز رہا ہے۔" وہ چونکے
"جتنی کی آواز ہے۔" ان نے نشوونما کا اظہار کیا۔
پیشوا اس کے کہ کوئی اظہار کرنا چاہے۔ جتنی روتا جلتا اندر آیا
"میں کیوں کیا ہوا؟" سریش نے ایک کراہے اٹھا لیا۔
"شاید گر پڑا ہے۔" محل نے ہمدردی بتائی۔

"کیوں مٹا کر پڑے تھے؟" ان نے پوچھا۔ مگر جتنی نے کچھ
نہیں بتایا۔ سسکیوں کے مارے اس کی زبان بند تھی۔
"پچھتے پچھتے رپو کی گیند قدمیں لے اندر آیا۔ وہ خوش تھا اور
خاتما نہ دھنک سے مسکراتا تھا۔

"کیوں رپو، جتنی گر پڑا ہے یا کسی نے مارا ہے؟"
"دیکھو ڈپٹی! اس نے گیند حسین لی اور میں نے یوں...."
وہ انجلیوں میں اٹھیاں جینا کر دوہڑ کا مظاہرہ کرنا چاہتا
تھا مگر محل نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔ "نہ مٹا! اچھے بیٹے! اس میں

پیارے کھیلے ہیں، ٹرا نہیں کرتے۔"

"ڈپٹی ام جی کھیل رہے تھے۔ میں نے یوں...."

پچھتاہ پچھتاہ کرتے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا لیکن محل نے پھر اسے
روک دیا اور کہا "جاؤ! امدادی سے اپنے کھلونے لے آؤ اور ان
سے کھیلو۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ مہمان مٹے چلے گئے اور بچے کو بھی بانسٹر
کراپے ساتھ لے گئے اور لڑتے گئے سو گئے۔

میں پھر دونوں بچے میں بل لے گئے اور کھینچے کھینچے ہمارے
چلے گئے۔ جتنی بخوبی ہی پھر روتا جلتا ٹوٹ آیا۔ اس مرتبہ
حالت پہلے سے بھی خراب تھی۔ اس کا منہ اور کپڑے مٹی سے لت پت
تھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

ان کو پڑا دکھ تھا اور وہ اس کی ناک پونچھتے ہوئے بولی۔ "کیسے
ظالم بچے ہیں، کس بری طرح سے مارا ہے۔"

"بہن، کیا کیا ہوا ہے۔" محل کی بیوی نے صفائی پیش کی۔
"محل کے بچے سب کا من سے خوشوار ہیں۔ ہمارا فاقہ سڑاٹی کے
مارے ناک میں دم ہے۔ پر کیا کریں مکان چھوڑ کر کہیں جایا ہو تو
ہیں جاتا۔"

رپو بڑی شان سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھوں پر وہی خاتما
مسکراہٹ تھی اور اس نے اپنے کپڑے چھپے ہی بتانا شروع کیا۔
"ڈپٹی ام جی کھیل رہے تھے میں نے یوں...."

"چپ چپ، گندہا کہیں کا۔" محل نے اسے ڈانٹا۔

"کیا کریں احوال ہی خراب ہے۔ لاکھ سمجھاتے پر بھی گڈ سے بچوں
سے گڈی باتیں سکھ کر رہا ہے۔ لڑنا ان کے نزدیک کھیل ہے۔"

محل نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا تھا اور مہمان بچے کے پرل
سے دھول جھاڑنے لگا۔

ایم ٹی تو انائی

چنانچہ انسان نے ممکن طریقے سے اس ارجی کو قائلانہ سے
پورا پورا فائدہ حاصل کیا ہے۔ کارخانے، مین، مکین، مشینیں، کاریں،
لائبریاں، ہوائی جہاز، سمندری جہاز۔ اگرچہ یہ سب مجھے آج کے مشین
دور میں زندگی کی ساری حرکت قائلانہ کے دم قدم سے ہے۔ لیکن یہ فیملی
حکومت کو استعمال کرتے ہوئے بھی انسان نے آخر کار یہ محسوس کیا کہ یہ طاقت
اس طاقت سے بہت کم ہے جس کی آگ کے انسان کو ضرورت ہے۔

چنانچہ انسان نے یہی تحقیق اور محنت سے نہیں، ہوا پانی، سورج، کوئلہ اور زمین سے کم ہے کہ محنت کر کے اور ارزاں سے ارزاں طریقوں سے ہر توانائی حاصل کر کے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود انسان نے محسوس کیا کہ ایک خاص حد سے آگے اترتی حاصل نہ ہو سکے گی۔

پہلے یہ سائنس دانوں کے سامنے کے تجربے کے نیکر ایک ہی طرز کی توانائی ٹھہریں آئی ہے اسی توانائی دھماکا اترتی کہا جاتا ہے۔

اس توانائی کے بھرمیں آئے ہے پہلے سائنس دانوں کا یہ ایمان تھا کہ نظام قدرت میں زیادہ تر توانائی کا منبع حرارت سورج ہی ہے۔ اس کی شعاعوں سے روشنی اور حرارت ہوتی ہے۔ سورج کی کچھ صدرات جیل پودوں کی کششوں میں سماد بننا پتی ہے۔ کچھ دھبوں کو گرم کرنے سمندر کے پانی اور ہوا کو حرارت دینے اور کچھ فضا کے ذرات کو گرم کرنے میں مرمت ہوتی ہے۔ چنانچہ سورج کی حرارت اور روشنی زیادہ سے زیادہ انہی ماحول کرنے کے علاوہ جو کچھ انسانی توانائی

انسانی زندگی میں انرجی (قوتانی) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر زندگی کوئی کاروائی، حرکت یا عمل ممکن نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بغیر ہمارے سب منصوبے بے کار ہو جاتے ہیں۔ خود انسان نہ تو قوتانی پیدا کر سکتا ہے اور نہ اسے ختم کر سکتا ہے۔ اُن اسے یہ مفرد اختیار ہے کہ اپنے خوراک کے برعکس پر اور اپنی ضرورت کے مطابق قدرت کی دی ہوئی قوتانی کو استعمال کرے۔ یہ قوتانی قدرت نے مختلف صورتوں میں نسلت کر رکھی ہے جس سے ہم روزانہ کام لیتے ہیں۔ ایسی قوتانی ہم حرارت، روشنی، بجلی اور مادے حاصل کرتے ہیں۔ حرارت براہ راست سورج سے اور مکی چیز کو جلاتے سے ملتی ہے۔ روشنی کا منبع سورج اور چاند ہیں۔ بجلی ہم Dynmo کے ذریعے پیدا کرتے ہیں مکی بار اہم ضرورت کے مطابق حرارت کو بجلی یا روشنی میں بھی تبدیل کر لیتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ قدرت کی دی ہوئی قوت کے علاوہ ہم مادیات بھی قوتانی حاصل کر لیتے ہیں اور مادیات سے حاصل کی ہوئی قوتانی ایک مادے سے متشبیہ سی ہوتی ہے۔ آج کے بلڈنہ یہ سائنس دان انٹسٹائن نے مادہ اور انرجی کو ایک ہی تصور کرتے ہوئے فرما دیا ہے۔ دراصل مادہ اور انرجی دو الگ الگ مقدار یا اجزاء انہیں ہیں۔ ایک مخصوص مادہ سے مخصوص دو خبیہ کی قوتانی پیدا کی جاسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قوتانی پیدا کرنے کے عمل کو یوں کہنا چاہیے کہ مادہ کو قوتانی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

پیدا کرنے میں لگتی تھی اس کا سہرا ان سائنس دانوں کے سر
جھونٹے اس انرجی کو لوگوں سے روشناس کرایا۔ اس انرجی کو
سائنسی اصطلاح میں Nuclear انرجی کہتے ہیں۔

نیوکلیئر انرجی یا ایٹمی طاقت کا کثافت ایک صی آفاق ہے۔

۱۸۹۹ء میں ایک سائنس دان ہنری بیکل نے ایک دن یورینم کا ایک
ٹکڑہ اپنی میز کے خانے میں رکھ دیا۔ میز کے اس خانے میں ایک بیکریک
انڈروم فوٹوگرافی کی کچھ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ جب وہ پلیٹیں باہر نکالی گئیں
تو معلوم ہوا کہ وہ کالی پڑ چکی ہیں۔ سائنس دان کو پہلی بار معلوم ہوا کہ
یورینم دھات سے ایسی شیا میں خلطی ہیں جو یکس کے انڈر سے گزر کر
فوٹوگرافی کی پلیٹوں کو سیاہ کر سکتی ہیں۔ دھاتوں سے مشابہت رکھنے
کے اس عمل کو تابکاری یعنی Radio-Activity

کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد دنیا بھر کے سائنس دانوں نے تابکاری
اور ایٹمی طاقت کی ماہیت کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور اسے انسانی زندگی
میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لئے تجربے کرے۔

سائنسی دانوں نے کیمیائی متغیر نگاہ سے دنیا کی سب سے
چیزوں کو عناصر (Elements) میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ تقسیم
کر لیا گیا ہے کہ جب سے دنیا معرض وجود میں آئی ہے تب سے یہ
طاقت اس میں ودیعت ہے۔ ان باتوں میں کئی قسم کی دھاتیں شامل
ہیں۔ بر دھات کی کیمیائی خصوصیت دوسری دھات سے کافی
مختلف ہوتی ہے۔ پھر بھی ایسی ایک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کون سا عنصر
الومینیم، کاربن، آکسیجن اور نائٹروجن سے کس قدر طاقت حاصل کی
جاسکتی ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ ان میں اتنی وا فر انرجی ہے یا نہیں ہے

نیوکلیئر طریقے سے استعمال میں لایا جا سکے۔ چنانچہ یورینم، پلاٹینم
میتھڈم میں ایسی دھاتیں ہیں جی سے ایٹمی طاقت حاصل کی گئی ہے۔

مزید بات یہ ہے کہ ان تین دھاتوں سے طاقت حاصل کرنے میں نہ تو
کئی کیمیائی عمل کی ضرورت ہے نہ کیمیائی اور نہ آگ کی۔ یہ طاقت یورینم
کو بکھیرنے سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس عمل میں یورینم کو ٹکٹے ٹکٹے ذرات
میں بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور ان ذرات کو ہم ایٹم کا نام دیتے ہیں۔ یہ
ایٹم یورینم کا وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جو بناتے ہوئے قائم رہ سکتا

ہے۔ یہ ایٹمی ذرات اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک ہین کی موٹائی میں
لاکھوں ایٹم سما سکتے ہیں۔ یہ ذرات تابکاری کی خاصیت رکھتے ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ یورینم کو جب ایٹم میں تبدیل کیا جاتا ہے تو کافی طاقت اس عمل
میں صرف ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچھ طاقت تابکاری کی صورت میں ضائع
ہو جاتی ہے۔ پھر بھی ایک حقیقی طاقت بچ جاتی ہے جسے ہم ایٹمی توانائی
کا نام دے کر اپنے کام میں لا سکتے ہیں۔ سائنس دانوں کا یہاں ہے کہ
ایک پونڈ یورینم کو بکھیرنے سے تقریباً ایک کروڑ ٹون ٹاورس پاؤر (وقت) حاصل
کی جا سکتی ہے۔

نیوکلیئر طریقے سے یورینم سے جو طاقت حاصل کی جاتی ہے وہ بالعموم
حرارت کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ جو مقنا تیز اور
قدرت سے یہ انرجی خارج ہوئی آتی تیز اور شدت سے دھماکہ بھی
پیدا ہو گا۔ یہی حالت ایٹمی بموں کی ہے۔ جن کے دھماکے اور تابکاری
انٹریسٹنگ مومن کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے
لئے یہ ضروری ہے کہ جو انرجی اس عمل سے پیدا کی جائے اس پر کنٹرول
بھی رکھا جا سکے۔ دوسری بھی اختیار ہیں ہوتا جا چکے کہ ہم جب چاہیں
اس کے رد عمل کو روک سکیں۔ اس رد عمل کو روکنے میں بھی بڑی احتیاط
کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مادہ انڈائن سے پہلے ہی دھماکے کی صورت
اختیار کر لے۔ اس مقصد کے لئے یورپ و امریکہ کے ملک میں سائنسی دان
نے قریات کئے تاکہ اپنے اپنے ملک میں ایٹمی بمبیاں تیار کی جائیں جن سے
ہر ملک اپنے اپنے طور پر زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکے۔

اگر حسب ایٹمی طاقت یا عیث رحمت ہے تو دوسری طرف
باعث زحمت بھی ہے کیونکہ اسے آگے دن ایٹمی بموں کے
دھماکوں کے قربات میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انسانی
زندگی کے بقا اور ترقی کے لئے اس قوت کو تیسری کاموں میں صرف کیا
جائے اور تباہ کن ایٹمی بمبیاں روکی جائیں تاکہ ایٹمی قوت کو انسانی
خدمت میں صرف کیا جائے۔ سائنس دان اسے علاج، صنعت، کھیتی باڑی
اور صنعت و غیر کے شعبوں میں استعمال کرنے کے وسیلے اور امکانات کو تلاش
کر رہے ہیں اور ایسا جس میدان میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے بعض
ایسی عملی اختراعات ہیں جی جن کی وجہ سے ایٹمی طاقت کا استعمال کچھ

تاکڑ برسا ہو گیا ہے۔ دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اسی لحاظ سے انسانی ضروریات کا بھی پورا کرنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے صنعتی دور میں وہ ضروریات مضمینت سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ کارخانوں کو چلنے کے لئے کوئلہ، بجلی، کاشتیں اور پٹرول درکار ہے، اور یہ سب ایجادات ہی۔ ہم انہیں مصنوعی عمل سے برحق نہیں نکال سکتے۔ پتھر، لچنی، لکڑی، مسرت، رعبان بڑھ رہا ہے۔ آج کل برطانیہ، کینیڈا، امریکہ اور روس میں بڑے پیمانے پر ایٹمی جھیلان تیسری جارہی ہیں جس کے ساتھ ایٹمی طاقت کو کاربند متاخذ اور صنعتی ترقی کے لئے استعمال کرنے کو بڑے بڑے منصوبے بھی ہیں اور عملی طور پر اس میں بڑی کامیابی بھی ہوئی ہے۔

سائنس دانوں نے جو کچھ پہلے کے قزبات سے اور جہادتی صنعتی جھیلوں کے استعمال سے پیشا مت کر دیا ہے کو بجلی طاقت کو ان کوئی طریقہ سے ہماری ترقی اور خوش حالی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ یورینم، تھوریئم اور ریڈیم سے ایک خاص قسم کی شامیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ ان شاموں کو ایلیا، بٹیا اور گاما شاموں کا نام دیا گیا۔ گاما شاموں کی بدولت زمین میں نشہ دہائی طاقت کو بڑی حد تک برحقیا جاسکتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایسی شاموں سے ذرا مٹی ترقی دینے کا ایک مرکز نیو دہلی کے پوس انٹیلٹیوٹ میں پچھلے دو دن سے کھل گیا ہے۔ یہاں ان شاموں سے استفادہ حاصل کرنے کے قزبات کے در جارہے ہیں۔

شمارہ کاری، بذات خود علم طب میں بڑی دھڑا رشا مت ہو سکتی ہے اگر شمارہ کاری کے یہ قریبہ کامیاب ہوتے رہے تو وہ دن دور نہیں۔ کیمسٹری لا علاج مرض کا بھی علاج اسی کے ذریعے سے کیا جائے گا۔

اسی طرح Bio-Chemistry قاسوس اور کھوڈا کی کے ریڈیو آکسوجن آج کل ڈاکٹری طبع میں استعمال کے در جارہے ہیں۔ یہاں تک کہ خون کی گردش کی رفتار بھی اس کی بدولت جا بھی جاسکتی ہے۔ بڈیوں کی کئی قسم کی بیماریوں کے لئے آج کل ریڈیو آکسوجن کو سوپ کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ ریڈیو آکسوجن کی بدولت بڈیوں، کوٹوں میں جو کیمسٹری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ بھی جانچی جاسکتی ہیں۔

ہندوستان میں بھی ایٹمی طاقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے وسیع منصوبے بنائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی کے بغیر کوئی

ترقی محض منوں میں ترقی نہیں کہا سکتی۔ ہمیں خصوصاً بجلی کی بڑی ضرورت ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ہماری بجلی کا خرچہ صرف سترہ لاکھ کوٹ تھا۔ ہماری آبادی اور صنعتی کام بڑھ جانے اور تین پانچ سالہ منصوبہ کے پہلے سے ہماری کھپت سا تارن لاکھ کوٹ ہو چکی ہے جبکہ ہم اب تک صرف دس فی صدی گاڑوں میں بھی بجلی پہنچانے کے دعویدار نہیں ہو سکے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لاکھوں کوٹ مزید بجلی کی ضرورت ہے۔ دیکھو بھی پانی اور کوئلہ سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور آج بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں کئی دشواریاں اور محرومیاں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پانی سے زیادہ سے زیادہ چار سو فیصد لاکھ کوٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہی ہماری ضرورت سے بہت کم ہے۔ یہی حال کوئلہ سے بجلی تیار کرنے کا ہے۔ کوئلہ ایک محدود وسیلہ ہے جسے مطلوبہ حد تک نہیں حاصل کیا جاسکتا۔

ہندوستان میں دوسرے جھیلان بھلان کے مطابق پانچ سو چالیس لاکھ ٹن سالانہ کوئلہ دستیاب کرنے کا منصوبہ کامیاب رہا اور امید ہے کہ ۱۹۶۶ء تک کوئلے کی پیداوار چار ہزار لاکھ ٹن سالانہ تک پہنچ جائے گی۔ لیکن بجلی پیدا کرنے کے علاوہ کوئلہ اور بھٹ سے کاموں میں استعمال ہوتا ہے، ان میں ٹھہرلو، تھارقی اور صنعتی ضرورتیں شامل ہیں۔ دیکھ لیا گیا ہے کہ بجلی کے لئے صرف دس سے پندرہ فی صدی کوئلہ صرف کیا جاسکتا ہے اور باقی ماندہ دوسرے کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دیگر ضروریات کو بالائے طاقت نہیں رکھا جاسکتا۔

چنانچہ ایٹمی توانائی کیمسٹری اور مشہور سائنس دان ڈاکٹر جہا جی دھننا کی ہیں ہمارے ملک میں ایٹمی طاقت کے وسیلوں کو بڑھانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندوستان نے تیار پور میں ایٹمی قاذوئی کاربک مرکز کو کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہاں ۱۵ کروڑ روپے کی لاگت سے یہ مرکز تعمیر کیا جائے گا۔ اور اس میں سترہ روپے فی کوٹاٹ کے خرچ سے بجلی تیار کی جائے گی۔ اس مرکز میں یورینیم دھات کے استعمال سے بجلی تیار

ایٹلی بھی گھر ہندوستان اور کینیڈا کے اشتراک عمل سے بن کر تیار ہو رہا ہے دوسرا ایٹلی بھی گھر زیر تعمیر ہے۔
اگر ایٹلی طاقت ور سپر پائے پر ہندوستان اور دوسرے ممالک میں استعمال کرنے کے منصوبے کامیاب ہوتے ہے تو وہ دنیا میں نہیں جب ذرات میں چپی ہوئی یہ پراسرار اور عظیم طاقت بہت سی اقتصادی مشینوں کو سلجھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایٹمی بھی ایک ذریعہ ترقی کرنے پر کامیاب ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم دھات ہندوستان میں یورینیم کے متعلقہ میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ لیکن حقیرم کو دوسری ایٹمی بھی کے لئے محفوظ رکھا جا رہا ہے اور جوں جوں یہ عیشیاں کامیاب ہوں گی حقیرم کی تلاش کے منصوبے پر تیزی سے عمل درآ کر کرنا ہوگا تاکہ یہ دھات ہماری تہیرو ترقی میں معاون بن سکے۔ ایک

سنیہ جاوید

غزل

چشم بے افک سے دامن کو جھگونا آیا
مکراتے ہوئے اک عمر میں رونا آیا
درسِ خورشید گری خاک کو دیتا ہے وہی
خونِ دل راہِ وفا میں جسے بونا آیا
دل بے زخم کا طالب ہے ستم تو دیکھو
جب سے اس شلوخ کو نشتر کا چھوٹا آیا
میں نے مجروح کیا غیرتِ دل کو خود ہی
اکثر اوقات اسی جرم پر رونا آیا
قدیمِ زیت کی موصیٰ نہیں تھی میں بیخ
جنہیں طوفان کو سینے میں ڈبونا آیا

دل تو وابستہ امید ہے لیکن جاوید

کون ہے وہ جسے مایوس نہ ہونا آیا



کیا آپ
نہیں چاہتے
کہ



آپ کا بچہ تندرست و توانا ہو!
اُسے سازگار ماحول میسر آئے!
اُس کی موزوں پرورش کے وسائل دافر اور خاطر خواہ ہوں؟
آپ اپنے بچوں پر خاطر خواہ وقت اور توجہ صرف کریں؟
آپ آپ کی بیوی اور بچے صحت مند رہیں اور مشورہ زندگی
گزار دیں؟

مشورے کے لئے سرکار کے منظور شدہ کسی قریبی
فیملی پلاننگ سنٹر میں تشریف لائیے

پلان سے کیا ہوگا



۲۷۵ روپے زیادہ آمدنی
فی کنبہ

تیسرا پلان پورا ہونے تک فی کنبہ اوسط سالانہ آمدنی ۱۹۶۰-۶۱ء
کے ۱۶۵۰ روپے سے بڑھ کر ۱۹۲۵ روپے ہو جائے گی
پلان کو کامیاب بنائیے، تاکہ آپ کی آمدنی بڑھ سکے

ہر شخص کے لئے اچھی زندگی
پانچ سو روپے سالانہ
پلان



نرم دل ماموں

پیارا ماموں بڑا پیارا کرتا ہے۔
 ماموں سے دل کی بات کہنے میں بھی
 ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔
 آندھرا کی اس توخیز اظہر دوشیزہ کے
 دل میں کیا ہے ؟ — وہ اپنے پیالے
 مانا سے کہتی ہے، ”مجھے چند گری سے
 چڑی خوبصورت ساڑھی لادیں گے“ وہ ماموں
 سے کہتی بھی کیوں نا! نرم دل ماموں پیار
 جو کرتا ہے۔ کیا وہ نہیں کرتا !

نندگیری بنگارو ماما
 چاندگیری پیرالہ پے
 بنگارو ماما رంగارو ماما
 چاندگیری پیرالہ پے



ہاتھ کھڑی

ہمارا قومی ورثہ ۔



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آہ کل

چتر شاک سنہ ۱۸۸۳
اپریل ۱۹۶۲ء

۱۹/۱۶/۶۲

نہ نئے پیسے



ہماری کتابیں



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نہرو سے بات چیت	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
ابوالکلام آزاد	دو روپے	۳۵ نئے پیسے
تیسرا پنج سالہ پلان	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوگ کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
دیس دیس کی لوگ کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے

(فی نمبر)

(فی نمبر)

نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶

————— لے کا پتہ —————

بزنس میجر پبلکیشنز ڈوٹیرن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول غلام معثور ہا سنامہ

ترتیب

آج کل دہلی

محسن ادارت

محمد حبیب احمد مایہ دہلی
حمی الدین قادری زور سری نگر
گپتی ناتھ امین دہلی
خواجہ احمد فاروقی دہلی
عبدالحق دروسوری حیدر آباد
یو ایس جی راء ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈوہڑن
بی۔ این۔ ایس۔ رائون ڈپٹی ڈائریکٹر ڈائریٹریٹ
بی۔ نیچا ناتھ ڈپٹی ڈائریکٹر ڈائریٹریٹ
بال مکندر عرش ایڈیٹر شیمہ اردو (سیکرٹری)
مدیر سکول

۲	ادارہ	ملاحظات
۳	جدید انفارمیشنل	مولانا ابوالنور
۸	شہاب سمدی	مسنے راستے
۹	آصفت الرآبادی	غزل
۱۰	کوثر چاند پوری	ہمسرا
۱۲	عمران انصاری	میسرہ نجات
۱۵	محمد قسب ض	انڈونیشیا - سرزمین اعتدال
۱۹	بیتھرسکین	تھکے کا سہارا
۲۴	شاگر پست رنجی	بچوں کے حقوق شعراء
۳۸	پران ناتھ	موسیقار کی ڈائری کا ایک ورق
۴۱	نارت کان پوری	غزل
۴۲	دجاست علی سندیلوی	ضادی چپا

سرسورق :- مان اور جیتھ
رسانے کی قیمت پر :- ہوک

اسسٹنٹ ایڈیٹر : منظر مرثیہ

چیرٹ شک ۱۸۸۴

اپریل ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ نمبر ۹

ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
۱۰ خلیفہ یا ڈیڑھ ڈالر
ہندوستان میں :- ۴۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
۱۰ خلیفہ یا ڈیڑھ ڈالر
۱۰ خلیفہ یا ڈیڑھ ڈالر

مرتبہ و نشان کردہ

ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈوہڑن سرکاری آف انعامیٹ : نیڈر لاکسٹنگ حکومت

مصافین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکندر عرش ملیانی ایڈیٹر ڈی جی 'داعہ' اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی

پبلیکیشنز ڈوہڑن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

آٹھ سال میں قحطی آمدنی ہوئی ہے یعنی کوئی مہینہ فی مہینہ اضافہ ہوا ہے۔

لکھنؤ تیرہ سے عام انتخابات جڑہ قحطی تم ہو گئے۔ دنیا کے کسی ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر انتخابات نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں ریلوے دستگاہ کی تعداد رگ پرگام ہوتی ہے۔ ریلوے دستگاہ کی قحطی بڑی تھوڑی ہوتی ہے۔ ملک میں نہیں ہوتی۔ اس کام پر ۱۵ لاکھ سے کچھ زیادہ ملازمین لگائے گئے تھے۔ قحطی کوئی پچاسے کرا تھا بائیسے دور میں کوئی نا تو ٹھکراؤ تھا کہ نہیں تھا۔ اور یہ کام امن اور عافیت کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے عوام نے ایک بار پھر جمہوری حکومت پر اپنے عملی حتمہ دکھایا ہے۔

مستاد میں اور ماہر نمایاںات جناب امتیاز بھی عرضی رام پور کی ساجیہ اکاؤنٹی کے مرتب کے ہونے کا خیال پر پانچ ہزار روپے کا تمام مینے کا اعلان کیا ہے۔ عرضی صاحب کی علمی و ادبی خدمات متعلقہ تمام نہیں۔ وہ براعظمت سے اس اعزاز کے مستحق ہیں جس پر اردو علمی و ادبی حلقوں میں انھما پرست کیا جاوے گا۔ ادارہ بین الاقوامی پریس بینک پشیم کہتا ہے۔

اردو کے مشہور شاعر غرضی ملک چند مردم کو حکومت پنجاب نے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ۱۱۰۰ روپے کے انعام خلیفہ اور عوامی اعزاز سے نوازا ہے۔ حکومت پنجاب کا یہ اقدام بڑا عمدہ ہے۔ قحطی تو فیض اور خوش آئند ہے اور اردو دنیا کو مستحق سمجھا جائے گا۔ اس سے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد افزائی کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی بہت افزائی ہوتی ہے۔ ہم مردم صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اردو کے دو خطی مسزوں کے بعد اب امریکہ کے ایک کڑی جان لکھیں بھی علا ہیں جا کر اور زمین کے گرد چکر کاٹ کر واپس آگئے ہیں۔ انھوں نے زمین کے نینے چکر لگائے۔ اس طرح بالآخر امریکہ بھی خطی مسز میں کامیاب ہو کر برابری کا شریک ہو گیا۔ روس کی طرح امریکہ کے اس خطی جہاز کی رفتار بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ امریکہ کی اس کامیابی پر دنیا میں انھما پرست کیا گیا اور مبارکباد کے بیانات بھیجے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں سے خطی سفر کی تیز رفتاروں پر قابو پایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں سے سرعت خطی سفر کو زیادہ سے زیادہ آسان بنایا جاسکتا ہے بلکہ اس دنیا کی خوش مسالی میں اضافہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ کاش ان دونوں ملکوں میں اشتراک عمل اور خطی سائنس کی ترقی میں باہمی امداد و تعاون کا پڑ پڑا ہو تاکہ ان کے قابل فز ترقیات عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ثابت ہو سکیں۔

مصر کے صدر جمال عبدالنصر نے ایک روز امریکہ کے ایڈیٹر کو جو امریکہ دیا تھا اس کے بیچ سے تاخریں کی دل چسپی کا باعث ہون گئے۔ جنگ سمیر کی کامیابی کے جو نتائج نکلے ان پر خوش ڈالتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اس وقت اس بات کی تصدیق کر دی کہ جو طاقتیں دوسرے ملکوں کی دولت کی بارہ دہرے میں ہیں انھیں شکست بھی دی جاسکتی ہے۔ جنگ سمیر نے ان لوگوں کو ایک نیا حوصلہ دیا کہ وہ افریقہ میں امریکہ کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور آزادی حاصل کر کے دم نہیں۔ اسوں ہندو کو گرتے ہوئے صدمہ مرنے بتایا کہ سامراج شاہی نے انھما کی تکریم پر ہتھ نہ لگایا ہے۔ لیکن اب اس ملک کا عملی کام چلتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ مصر کی اقتصادی ترقی کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ گزشتہ

مولانا ابوالنصر

(مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی)

لوہ پر زمانہ کی زکسی منزل پر لڑ ہر کامیاب بھی ہو جاتا ہے ایسی ہی عارضی کامیابی اور یہ چند روزہ فتح و نصرت بذاتِ خود منقلب زمانہ کے لئے کیجیے ابدیت کا باعث بن سکتی ہے ؟ زمانہ مولانا ابوالنصر کو مٹا نہ سکا۔ ان کا پیکر فانی اس دنیا میں نہ رہا ایسی ان کے افکار ان کا ادبی سرمایہ ایک ایسی چیز ہے جو کسی وقت بھی ان کی دھندلی تصویر کو نمایاں اور روشن کر سکتی ہے بیشک وہ کمالی طور پر سامنے آجائے۔

مولانا ابوالکلام کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ مولانا ابوالنصر مولانا ابوالکلام سے عربیہ دو تین برس بڑے تھے۔ اس حساب سے مولانا ابوالنصر کی ولادت ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ چون کہ دونوں بھائیوں کی عمریں ایسا کچھ زیادہ تفاوت نہ تھا اس لئے تقریباً دونوں ہم درس رہے۔ مہدی قیامی نے مولانا ابوالکلام کے لئے مذہب، علوم و فنون، ادب و انشا اور شاعری کے لیے شارحین کمال دی تھیں اور جن لطافت و نمایات سے انھیں نوازا تھا مولانا ابوالنصر بھی ان سے مستفید نہیں تھے۔ مولانا ابوالنصر کی شخصیت میں بھی وہی ذہانت، وہی ہمتی، وہی حافضہ اور وہی ذوقِ علم و کمال و رویت تھا۔ یہاں مولانا ابوالکلام کی شخصیت میں تھا۔

تصویروں کے خالق نے یکے بعد دیگرے دو تصویروں پرست ہیں۔ دونوں اپنی جگہ یاد رکھو اور یا کمال نہیں۔ دونوں میں ایک جو مختصراً ایک جاذبیت تھی اور ایک کیفیت تھی۔ اس وجہ سے اہل نظر کی نظر ان دونوں تصویروں کو دیکھ کر جو جوا بڑا کرتی تھی۔ ان تصویروں میں اکثر باتیں مشترک تھیں لیکن ان کی قسمت ایک ہی تھی۔ ایک کی قسمت میں صاف، واضح، روشن اور نمایاں ہونا تھا۔ دوسری کی قسمت میں ایک ذرا سی مدہم روشنی اور پھر ہمیشہ کا دھندلا پن۔ دھندلے ہی سے ایک کو ہمیشہ کے لئے دھندلا پن بخشن دیا۔ روشن اور نمایاں تصویر مولانا ابوالکلام کی اولین صورت آزاد ہو کر کہے اور دھندلی تصویر مولانا ابوالنصر غلام الیسیں آہ مرحوم کی جو مولانا آزاد کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ مولانا ابوالنصر کی زندگی کا پورا اس دنیا کی تیز و تند ہواؤں میں زیادہ دیر تک نہ جھلکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی اور حالات پر کتنی ہی اندھیرا چھا گیا اور ان کی وہ دھندلی تصویر جو کسی زمانہ میں لوگوں کے لئے مولانا ابوالکلام کی تصویر سے کم جاذبیت نہ رکھتی تھی وقت کے ہواؤں کے ساتھ ساتھ شرمیلی چلی گئی۔ دنیا میں کچھ ہسپتال ایسی بھی ہوتی ہیں اور ہوں گی جن کو زمانہ اپنی لاکھ کوششوں کے باوجود مغرور ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ وقتی

مولانا ابوالنصر ادو، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب ترکی قادیان پر بھی لکھی تھی۔ شہزاد علی سے انھیں تقریر و تقریر کا شوق تھا۔ ایک متنبہ اسلامیہ کالج کے بڑے طالبین ایک بہت بڑے جلسے میں انھوں نے تقریر کی تھی۔ اس کے علاوہ وافی، یکم سی۔ لے کے بریجنگ ہال میں وہ برہمنہ جایا کرتے تھے اور میسائی پلسٹوں سے بحث و مباحثے میں حصہ لیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالنصر کا زبانیں اپنے والد بزرگوار کے پیچھے جالھیں اور قدم پر قدم چلنے والے تھے۔ وہ غلطی کی مجلسوں میں ٹھیک اسی اسلوب سے وہ غلط کیا کرتے تھے جو ان کے والد بزرگوار کیا تھا۔

مولانا ابوالنصر اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے تو بیسویں صدی کی ابتداء میں لاہور سے محض نئے روشنی کے خیالات کا ترجمان بن کر منظر عام پر آیا۔ مولانا ابوالنصر اور مولانا ابوالکلام دہلوی نے اپنی علمی صلاحیتوں کی جلوہ گری بھی بدلیہ تفسیر شہزاد کی ہی لوگوں کے پاس رسالہ نمونہ کے ابتدائی پرچے ہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان دونوں مجاہدوں نے کیسے کیسے مضامین لکھے۔ مولانا ابوالنصر کے متعدد مضامین بیسویں صدی کی ابتداء میں ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ خصوصاً نمونہ، غنک نظر، کربل اور خاقان میں مولانا کے مضامین نکلے ہیں۔

مولانا ابوالنصر کی مذکورہ ایک نمونہ ملاحظہ ہو جو تقریر کی صورت کے نام سے رسالہ خاقان علی گڑھ ہا بابت جنوری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔

”چاندنی رات ہے ادا ایک جونی کے کنارے اپنے کو پاتی ہوں۔ امواج نسیم سے متناثر ہونے والے اطراف جونی کے چمن سے آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں اور درختوں شاخوں سمیت وہ وہ کرنا پناہ دیتے ہیں۔ ایسے میں بلبل نغمہ وہ رات کا مدار، رات کے محض قلب سے حسی ہرمت اور جلوہ جی آواز کو نکال نکال نکال کے موجودہ سکوت میں غل ڈالتے لگا۔ وہ میری تھکنے رون میں تفرہ تفرہ غم ٹپکا کے اس

آواز کو ٹوٹا تھا اور میری آنکھیں دھیمی تھیں کہ آواز نے اس روشن تاریکی اور لامحدود آسمان کو لرزہ میں ڈال رکھا ہے۔ نئے نئے نہیں یہ ظلمات میری میرے قلب اور میری روح کو بریز کر رہے ہیں۔ جس وقت میں جس ہی تھی روح کو ٹپکے محسوس کر رہی تھی اور دل سسکیاں نہ رہا تھا میں نے چاہا کہ اس تنگست اور بے آہنگ آواز کی تعلیمیں مکدر جسم کے ساتھ فضا کے شہسبازوں پر داز کروں لیکن

ایسباز!

دفتر آہنگ دار اور لرزہ آواز اپنی حفاظت کے خیال سے موقت ہموکھی اور میں اس مستی کی حالت میں باوجود ویکہ اپنے کو محسوس کرتی تھی اس تعدادی سکوت کو محسوس کر چکی۔ وہ آواز میرے کان بہت ضعیف طریقے سے سر رہے تھے لیکن مرث اس برسات کے پچھلے قطرے نے میری موجود کو جگا دیا۔

آخر میں نے مجرد، متردد کے ساتھ ڈل سے اپنے کو کینچا لیکن ایک بلبل کے نئے تاریکی شب کے سکوت کی گود میں متفکر آسمان کے سامنے جیسا کہ میں اب تک سر رہی ہوں۔“

(ابوالنصر دہلوی از بنگاد)

مولانا ابوالنصر کو سیر دنیا حیات کا بہ عاشق تھا۔ انھوں نے حجاز، عراق، دریائے فرات، شام، وزیرہ، مالک کا سفر کیا۔ اوپر جو نمونہ نثر دیا گیا ہے وہ اصل وہ ترکی زبان سے ترجمہ ہے۔ مولانا جہاں کہیں بھی گئے اپنی اردو زبان کو نہیں ہوسے۔ جیسا مالک چاکر بھی اصفہان نے اردو میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ ان کے دیگر نثری مضامین میں اہل غلہ کے شاہیں مشک، ویرہ رسالہ نمونہ کی ابتدائی جلدوں میں شائع ہو کر اس زمانے میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مولانا ابوالنصر نے ایک کتاب عمر خیم کی سوانح عمری

متعلق ہی لکھی تھی جو لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ”غیظہ الناطق“ نامی عربی رسالے کا جس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات لکھے گئے تھے اور جس کو ڈاکٹر اس پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا ترجمہ اردو میں کیا۔

ایک اور اہم کشف بھی مولانا ابوالنضر غلام یسین کے بارے میں تھے۔

مولانا ابوالنضر شاعر بھی تھے اور آدھ گن گرتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی سے انھیں تلمذ تھا۔ مولانا طح آبادی کہتے ہیں کہ مولانا ابوالنضرؒ صاحب دیوان تھے اور ان کے دیوان میں برصغیر کا چمچ مندو اشارہ موجود تھے بلکہ زمانے کی دست برد کے ماتحت ان کا بیشتر کلام شائع ہو گیا۔ قزوں کے علاوہ مولانا ابوالنضرؒ نے ترکی، عربی اور انگریزی سے بے شمار نظمیں اردو میں ترجمہ کیں جن میں سے بعض انجمن تہامت اسلام لاہور کے سالانہ مجلسوں میں پڑھی گئیں۔

مولانا ابوالنضرؒ کا کچھ کلام قدیم رسالوں اور کلاسوں میں پڑی توش جب تکے بعد دستیاب ہوا ہے جو تیراکیاں پیش کیا جاتا ہے۔

عزل

اشک حسرت میں بیزہ ہوں دھلنے کے لئے

ایک دریا میری آنکھوں سے اُبلنے کے لئے

کوئی تدبیر نہیں دم کے نکلنے کے لئے

کیا اُٹھا رکھتے ہیں بیباک سنبھلنے کے لئے

چاہیے صورت پروردان دل سوز طلب

ایک پر ایک گرا پڑتا ہے جھلنے کے لئے

داغ کیوں تڑپے دیبا کے رقبوں سے مجھے

ہتش چھبر نہ کم حق مرے چلنے کے لئے

سے گم ہو جو مرے ہوش و خرد و سر و قرار

داغ دے جاؤ کوئی دل کے بھلنے کے لئے

نزد میں دیکھے کوئی حسرت و ارمان کا جو

سب مرے ساتھ ہی تیار ہیں چلنے کے لئے

آپ دل میں پڑے داغ بگر کے مسراہ

کیا بسا آدمی مرے پھولنے پھلنے کے لئے

جان ہی مٹنے کے افتادہ سنے ہی آخر

ایک ٹھوکر ہی کما حقہ سنبھلنے کے لئے

دو ہر ہش کی اب ہوجی اے مہر شباب

سسر پہ کیا ہے دوپٹا ترا دھلنے کے لئے

دیکھوں چاہتے ہیں چاہتے والے تجھ کو

ہر طرف آنکھیں بھی ہیں ترے چلنے کے لئے

جب بگڑتے ہیں سنبھلنے کے سنبھلنے ہی نہیں

آپ بھی میری طبیعت ہیں چلنے کے لئے

تاقتہ پر تاقتہ مرے بیٹھے ہیں کیوں پریشان

سے ہے دھلنے کے لئے کام ہیں چلنے کے لئے

سیکھ لے ہم سے کوئی مشق و تہنہ تہائی

تیری تصویر سے باتیں ہیں بھلنے کے لئے

دھڑکتے ہیں بھی رند تو دیکھ اے شاہد

یا علی منہ سے نکلنا ہے سنبھلنے کے لئے

کھائیں گے زردبینان جہاں آغا ای پر

دانی پوشاک نکلنے میں بدلنے کے لئے

بجی حسرت و اندوہ سے دم گھٹتا ہے

راہ پانے نہیں ارمان نکلنے کے لئے

تم سلامت ہو تو اُسے گی قیامت بھی کہیں

اک سی پی چال اُٹھا رکھی ہے چلنے کے لئے

لوٹ جاؤ دلی ہے تاب تارا لے کر

کوئی جیلہ نہیں درکار چلنے کے لئے

ہے مرے خادما تارک میں یکساں شب و روز

اک چراغ اُٹھ پھرے چاہئے چلنے کے لئے

شاعری داد طلب واد نہ دے جب کوئی آہ

چہر قراک شغل ہے یہ دل کے بھلنے کے لئے

(داغ واد نکستہ بزرگ عالم کلکتہ اپریل ۱۸۹۹ء)

یہ عزل مولانا ابوالانصرؒ کے ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ اور اس وقت کی ہے جب کہ ان کی عمر سو سال یا ہ سال کی تھی۔ ابتدائی عزلوں میں وہ آٹھ سال تک آٹھ ماہ بھی تھے۔ ایک اور عزل بھی کچھ اسی تھیل کی ہے:

بھی وہ جان کا دشمن وہ قاتل یاد آتا ہے
بھی پہلوئے خالی دیکھ کر دل یاد آتا ہے
چلے جاتے ہیں اٹھتے بیٹھتے ہم وشت غربت میں
وطن اپنا ہمیں منزلی یہ منزل یاد آتا ہے
پچھنے اک ان سے لذت کر کے ہم دوسری بیعت میں
ادھر وہ یاد آتے ہیں ادھر دل یاد آتا ہے
رہا پہلوں جب تک ہم اسے سمجھائے دشمن
گواہی دے ہیں تو کجنت اب دل یاد آتا ہے
گزن تاجے نرسے جب کوئی پھولا پھولا گلشن
تو پھولوں کو اپنا رنگ منل یاد آتا ہے
مرے کی تندرستی ہے آغاز جوانی میں
گرا خدام میں یہ وقت غافل یاد آتا ہے
بھی جس دل کو کلام و مدد یاد آتا تھا
اب اپنا ہم کو وہ آیا ہوا دل یاد آتا ہے
ہماری بے گناہی پر بھی رہتی ہے قاتل سے

کمی تم کو کوئی نام لعل یاد آتا ہے
بڑا ہوتا ہے صدمہ ہم نہیں کے بھر کاے آتے
کعبہ کوئی مل دیتا ہے جب دل یاد آتا ہے
گر تندرستی کا نام کارنگہ بھی بدلتا گیا۔ ڈسٹریکشن رطلہ حلوں:

دل میں لازم ہے خیال روئے پرتو زہری
چاہے اس لئے کوئی تو زہری
سوئے زلفاں تب ترادیاؤ گیسو چلا
پاؤں پرلے کے لئے آگے بڑھی زہری
درد سارے جسم کی آتی ہے کچھ کرکان میں
سورج کا دم تری جاوہر جیسی تعزیر بھی

یہ عزل مولانا ابوالانصرؒ نے بغداد سے بھیجی تھی۔

آہ اس سفاک نے ہم پر کبھی کیا نہ رحم
روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر وہ گریہ

نہ توڑو بتو دل شکستوں کے دل
خدا جانتے کب دل میں آئے گئے
مری قبر پر آگے بکھتے ہیں وہ
بہت نیند کے آپ مانتے ہوئے

بکسا ہوں جب کہ مجھ پر نکو و کرم نہیں
بکھتے ہیں ناز سے وہ خدائی قسم نہیں
ترے جفا و جور کا ہم کو ام نہیں
بیٹھے کا اپنے رخ ہے مرے لاف نہیں
تکتے ہیں گاہ مجھ کو کبھی وہ رقیب کو
شری سے سرم شرم سے شوق بھی کم نہیں
دل کی تڑپ میں شوقی جان کا ہے مرہ
اب آرزوئے وصل خدائی قسم نہیں
تم ہوزیاں دمانہ تو ہم بے زبان ہیں
تم ہم سے کم نہیں تو ہم تم سے کم نہیں

ادب و ادب میں آہستہ آہستہ ایک انقلاب آ رہا تھا۔ شاعری میں
اب مقصدیت شامل ہو رہی تھی اور مولاناؒ نے بھی ادب کی نئی شاہراہ
پر چلنے کی کوشش کی۔ ذیل کے قطعات ملاحظہ ہوں:-

یہ تم کو کیا ہوا ہے اسیرانی ہم میفر
اٹھتے نہیں ہلانے سے بھی سو گھم ہو کیا
ہم تو وہی ہیں اگلے تمھارے نیا زمانہ
چپ چاپ کیوں ہم سے غما ہو گئے ہو کیا

پیری میں دور رہا ہے۔ جوانی کو پیر مرد
یمن وہ اگلے رنگ کے اب کیسی ہی نہیں
اک خواب تھا زمانہ ماضی کی چسپائی
اکلاس اب ملاپ نہیں میل ہی نہیں

ہرست سے آدمی ہے آواز
الذبحلا بشر کے نہیں
الذبحاری حرم رکھے
تیرے ہی تو ہیں اگر بڑے نہیں

ناگشتی ہے بہر صورت فیر شاہ کی
اس نے پختہ کاٹ دی اور اس نے رفتہ کاٹ دی
گو کہ ان کا جاگنا بھی غفلتوں کے ساتھ ہے
پرہیزی دیکھو کہ ہم نے رات سوئے کاٹ دی

اسراف کی دھوم پر نہیں ہے
پابندی رسم دل نشیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں
اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے

آرام کی چیزوں سے بیستر نہیں آرام
دنیا میں ہر اک طرح سے مشکلی ہے بشر کو
تھک تھک کے جاتے ہیں کوڑا ہلنبیں
کیسا سر پہ کوئی سے کے پلے پائے سفر کو

شاعری اصلاً غلط گوئی نہیں
بھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
سب نہیں گندوں ہیں گندے خیال
شاعروں سے شاعری بدنام ہے
دخترن بابت اگست ۱۹۰۴ء

ایک عزل کے چند منتخب شعرا و حسن لکھے:

فروزی گزارش

- ۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور عرض خط کیجئے۔
- ۲۔ فریبیہ مضامین اسی صورت میں واپس کے
جاتے ہیں جب کہ مناسب سائز کاغذ اور لک
کے ٹکٹ ان کے ہمراہ ہوں۔

ایک ہے مسرود اک ناشاد ہے
بزم ہستی کی عجب روداد ہے
قید میں جلتا نہیں بلبل کا دل
یہ چسپاں خانہ مینا دے
ایک عالم کی اڑائی اس نے نیند
اب مرغا خسیار کی فریاد ہے
ہن بڑے قوم بھی دین جودوں دل
دشمن جاں حسن آدم زاد ہے
جبر کی قتب دیکھتے بیوں کر کٹے
ہرستہ دیدہ جسداد ہے
جس کو سب کہتے ہیں آہ نیم جاں
یہ وہی تو غامس بریا دے

سیر و سیاحت کے شوق نے مولانا ابوالنضر کو اپنے وطن سے دور
کر دیا ایکی اٹھیس کیا نیرتھی کہ چروٹن دیکھنا نصیب ہو گا بھی یا نہیں
چنانچہ مولانا اپنی جوانی ہی میں اپنے وطن سے دور دیا رنجیستیں
عالم جاودانی کے سفر پر چلے گئے ان کا مولد نہیں تھا دفن نہیں بنا
مظلوم کیا کیا امنگیں مولانا کے دل میں جو ان ہونے کے لئے تاب
تھیں۔ کیا کیا ارمان تھے جو شرمندہ ٹیبل نہ ہو سکے اور کیا کیا خواہشیں
تھیں جو ان کے دم کے ساتھ دم نہ لگئیں۔ دیکھئے خود مولانا ابوالنضرؒ
کایہ شتران کے دل کی آواز سنا رہے۔

زندگی میں تھیں ہزاروں خواہشیں

مرنے بھی مٹی مری پر باد ہے

گو یا یہ ایک پیشین گوئی تھی جو خود انھوں نے اپنے متعلق کی تھی۔
اگر قدرت نے مولانا کو کچھ اور زندگی دی ہوتی تو شاید وہ ایک
روشن ستارہ بن کر اُبھرے۔

سوئے راستے

دن کو گھمان تھی
شہر کی زندگی
شام آئی تو ایسا لگا
جیسے رستے میں ڈاکر بڑا
اور بھولی دھن لٹ گئی۔
جیسے زنداں میں پھیلی ہوئی چاندنی -
اب جدھر جائیے
جس طرف دیکھئے
صفت یہ صفت، غم یہ غم
روشنی روشنی -

شام آئی ٹھٹھکتی جھیمکتی ہوئی
جیسے پردیس میں اجنبی -
جیسے پہنچی کوئی
پائے برسوں میں پھرے کی چٹکی کھلی۔
دور تک جالی جلی کا پھیلا ہوا
ایک رو سرخ تاروں میں دوڑی ہوئی،
جیسے لگ رگ میں سوزِ زمِ زندگی
پھیلتی آگ کو اور دے کر ہوا
جیسے جھل مٹانا ہو دیپ دلی

شام آئی تو اک شمع سی بجھ گئی
جیسے مالہ میں چوہوں کی پھپکی ہنسی -
جیسے بچھ سے پھسری
معلومت کی سمجھائی ہوئی دوستی
جس میں سب ہے، مگر ایک بھل مٹی۔
شہر کے اس طرف
دھوم سی اک بجی
کارخانوں میں بے لے کے آنکڑائیاں
دیو سپیکر میں نہیں تھرکے لگیں -
شہر کے اس طرف
وقت نے ایک کروٹ چولی

شام آئی تو کھلتی کلی رک گئی
جیسے بچے کو احساس بے چارگی
جیسے جذبات کی نبض ڈوبی ہوئی
ہر گستاخ
آرزو مضمحل
شام چپ ہو گئی سو گیا آدمی -
پھر سس میں گھٹ گیا بھونپڑوں کا ڈھعلا
کو ٹھیلوں پر تری اوس گرنے لگی
بند پھاٹک پہ ہیں اونٹنے سنسنری

غزل

دعویٰ ہوش ہے ساقی کی نظر ہونے تک
شع کی قدر ہے محل میں محسوس ہونے تک
آج محسوس ہوا جاہِ ملکستاں تھا یہی
آشیاں کچھ بھی نہ تھا نذر شر ہونے تک
الغابت نگر یا رہے تیغِ عسریاں
مرگہاں مرکزِ عشق کے سر ہونے تک
ذرہ ذرہ نظر آنے لگا دامنِ کب دل
لٹ گئے ہم تری محل میں گزر ہونے تک
دل بوتر پے گا تو آنکھوں سے گریں گے آنسو
حسنِ خفاں ہے مرے خاک بسر ہونے تک
دیرِ جاناں پہ جو بہو چپ پھر اسے ہوش کہاں
حسرم و وزیر ہیں بیگانہ در ہونے تک
راہِ آسودگی دل ہے اتنی دامانی
دولتِ فقر ہے محسوس ہر ہونے تک
ہمنہ مشقی کی ضرورت ہے یہاں اصف
شکر کو چاہیے اک عمر اتر ہونے تک

ہیں اکیلا سی
بیری دیوانگی، بیری دیوانگی
مکو معلوم ہے
ریت و اداں نے کب پریت کو بھیک دی
پھر بھی دیکھے کوئی
طرزِ تما جیسا
ہیں جدھر میل پڑا
راستہ تھک گیا
رات آگے بڑھی

اب کسی موڑ پر کوئی ملنا نہیں
پر سڑک دم بہ خود
ہر گئی سو گئی

روشنی سے یہ چھنتی ہوئی چاندنی
بیتِ پاؤں چالِ بنی ہوئی
یہ اندھیرے آجائے اچھتے ہوئے
جیسے مبہم سوالات کی چھاؤنی
جیسے محرابیں اوام کے لشکری
یہ جیسا تک سے

چاہے جو کچھ کہے
دورِ نزدیک سے جو بھی آہٹ ہے
ہیں سمجھتا ہوں اری نہیں زندگی -
کیا ہوا تب سے اند آنکھوں سے گر آئی
مج کے واسطے
نرم و تازہ ہوا کے لئے
آج یہ بھی جیسی



سے یہ رسم رائج ہے اور شادی نیز ہر اچھے کام کے شروع میں ادا کی جاتی ہے۔

اجودھیا بیگم نے شادی کے بعد اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا۔ آخر تک ہندو ہی رہی۔ اس سلسلے کا بہرہ ہے کہ یہ رسم کسی مسلمان کے منظور سے معرضِ وجود میں آئی ہوگی۔ بہت سی رسمیں اگرتے اپنے جبرِ مذہبی میں ہندوؤں سے اتقاد کی خاطر اپنائی تھیں۔ اگرتے بادشاہوں میں سب سے زیادہ روایتِ خیال اور اتحاد پسند تھا۔ وہ مذہب کی بنا پر حکومت کرنا پسند نہیں کرتا تھا نہ کسی فرد یا برزیا دقِ روا رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے ایسے قاعدے جاری کئے جو ہندو راجاؤں کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہندوؤں سے جزیہ لینے کا طریقہ بھی اسی کے حکم سے بند ہوا۔ شادی کے سلسلے میں اس نے چند قوانین نافذ کئے تھے جن کی نگرانی کے لئے 'طری بیگی' کے نام سے ایک جدید اور مقرر کر دیا گیا تھا۔

ہرے کاروانِ جمعی مسلمانوں میں بھی نہیں رہا۔ یہ فاضلِ ہندوستانی رسم ہے، یہاں تک کہ اس نغمہ ہی کو فارسی کا لفظ نہیں سمجھا گیا اور اکثر فارسی لغات مثلاً برائن قاطع مستغنیب اللغات اور فیث اللغات

سے تاریخِ اموات ص ۶۵

سے آئیں اگری جداول ص ۱۴۹ طوی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی میں 'توی' بھی لکھا جاتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جن رسوم کی پابندی کی جاتی ہے ان میں سے بعض ایسی ہیں جو مقلدِ بادشاہوں کے ساتھ آئی ہیں۔ مثلاً سابق اور شاہنشاہی وغیرہ بعض ایسی ہیں جو اصل میں کدلی ہوئی اور ان سے بیس چول بڑھانے کی غرض سے اختیار کر لیا گیا تھا۔ مثلاً مٹکی اور سہرا یا ایسی ہی دوسری چیزیں۔ کچھ رسمیں ایسی بھی ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے مذہبی ماحول کو سلنے رکھ کر ہندوستان ہی میں ایجاد کر لیا تھا۔ جیسے بیوی کی صونگ جس کو متبرک بخو کر شادی کا پیشِ تمبر قرار دے لیا گیا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ جہاں بیکر کی جیسی بیوی اجودھیائی ہوا چوت قوم سے تعلق رکھتی تھی، درجہاں بیگم سے تعلق نہ تھی۔ درجہاں اسے دیہقانِ زادی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور اس کی طرح چھڑا کرتے تھے۔ اجودھیائی نے تنگ آکر عزتِ خاقانِ جنت کے نام سے قاعدہ دلائے کا آغاز کیا۔ اس کی صورت یہ تھوڑی گھٹو کھڑی صحنوں میں نیاز کا کھانا جمایا جانا تھا جو نیک اور سہاگن عورتوں ہی کو کھنا یا جاتا تھا۔ جو لوگ بلائے جاتے تھے وہ پاک و صاف ہو کر کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ اجودھیائی نے بیوی کی صونگ پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ اسی تمام نیکیاتِ شریک کر سکتی ہیں جو اپنے شوہروں پر قائم ہیں۔ فورجہاں ہندوستان جہاں تہذیبِ نہایت محبوب، بیوی شریفی، نیک و شریفی کے تعلق ہو جاتے پر وہ اس کے عقیدے میں آتی تھی اس سلسلے کو اجودھیائی کی نظر پر پوری نہ آتی تھی۔ چنانچہ وہ شریک نہ ہو سکی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ توہرہاں نے اجودھیائی کو دیہقانِ زادی کہنا چھوڑ دیا، انھیں

دیوہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اپنی ترکیب کے فائدے سے "سہرا" یقیناً فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان ہی میں بنایا گیا ہو۔ چنانچہ اشتیازخان خاں نے جو مصافحہ اور ایرانی الاصل تھارک سٹری میں سے نکل گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں
ماہ من از جہاں خوش بسو آپ و تاب شد
سہرہ جو بہت عارضی پتھر و آفتاب شد
یہ واضح رہے کہ اشتیازخان خاں اورنگ زیب کی طرف سے موثر عقیم کہا گیا تھا اور شاہ عالم کے جوہر حکومت میں ایران جاتے ہوئے عدا یا رخاں مرزاں سند کے اشارے سے قتل کیا گیا۔
یہ واقعہ ۱۱۲۲ھ کا ہے۔

اشتیازخان خاں پیدائش کے لحاظ سے ایرانی مہزور تھا لیکن عرصہ تک ہندوستان میں رہا تھا۔ یہاں کے رسم و رواج سے بھروسے لے آج بھی حاصل کر لی ہوگی۔ اس نے اپنے سفر میں جس کیفیت کا اظہار کیا ہے اس کا مشاہدہ ہندوستان ہی میں ہوسکتا تھا کیونکہ ایران میں سہرا یا مذہابی نہ جاتا تھا۔ وہاں کسی محبوب کو وہ شدت حسیا سے پیغمبر آفتاب بننے نہیں دیکھ سکتا تھا اور بغیر دیکھے اس کیفیت کی عکاسی ممکن نہ تھی۔ بہر حال اورنگ زیب کے زمانے میں "سہرے" کا لفظ فارسی اہل زبان نے قبول کر لیا تھا۔ رسم کے اعتبار سے "سہرا" یا مذہب کا دستور کا فی قدیم تھا مگر آگے چل کر یہ بتاؤں گے اور اس کی حیثیت بالکل مذہبی تھی، البتہ اس بات کا ثبوت مجھے نہیں مل سکا کہ اگر جہانگیر اور شاہ جہان کے دور حکومت میں بھی کسی شاعر نے "سہرے" کا لفظ استعمال کیا یا نہیں۔ میں نے ان ادوار کے اکثر شعراء کا لامدحہ کی گزیرا کہیں نہیں ملا۔ بہت ممکن ہے کہ خالص ہی کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یہ لفظ بنا لیا گیا ہو۔ ارباب تحقیق نے "سہرے" پر مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

سہرا جو تین، متبش کے تاروں یا ہر تار پھولی کی لڑیوں سے بنایا جاتا ہے اور دھڑا کے سر پر شب گشت کے وقت اور دھڑا کے سر پر لکے بہار بزم
تذکرہ حصہ ص ۱۱۱ و ۱۱۲ و ۱۱۳

جلوسے یعنی رونما کے وقت نقاب کے طور پر یا مذہب جاتا ہے۔ ہندوؤں میں سہرے کی رسم مذہبی مشیت رکھتی ہے اور احکام شاستر کے پیش نظر ادا کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد معن دھوا اور دھوکا چھون کو دھوا سے مخفی رکھنا ہے، شاستر کی رو سے شادی کے وقت دھوا دھوکا مسموم انسان نہیں سمجھا جاتا بلکہ قدرت الہی کا منہر خیال کیا جاتا ہے۔ اسی لئے دھوکا کو کشمی اور دھوکا کو پرمیش سے مسموم کیا گیا ہے۔ کیونکہ انھیں دونوں کی ذات افزائش نسل کی ضامن ہوتی ہے۔ سہرے کے نقاب سے ان کے چہرہ کو پوشیدہ رکھ کر عوام کو شاستر کے عقیدے کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے۔ سہرا یا مذہب کے موقع پر نیز شادی کی دوسری رسموں کی ادائیگی کے وقت شاعروں کی وہ جماعت جس کی جات کہتے ہیں دھوکا کی تعریف میں اشعار پڑھا کرتی تھی، اور چون کہ سہرا بھی شادی ہی کے سلسلہ کی ایک رسم تھی اس لئے "سہرے" اور دھوکا کے حسن و جمال کی تقریب بھی کی جاتی تھی۔ یہی دواغہ بعد کے سہرے کی قرینہ و توصیف میں متعلق طور پر نہیں لکھے کا حرکت ہوا۔ سہرے کا مطلب تھی تہنیت اور مبارکباد کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ تہنیت دشتوار ہے کہ اردو میں سب سے پہلے سہرا کے لکھا اور کسی کی کاموید کہنا چاہیے۔ لیکن اس کی ساخت کے اعتبار سے بنگالیا معلوم ہوتا ہے کہ سہرا مرثیہ کے راستے سے اردو میں آیا ہے۔ کم سے کم اس کی ساخت میں مرثیہ کا پلونا اتباع کیا گیا۔ چنانچہ سہرے میں روشنی چھپی کا بیان کیا جاتا ہے تو اسے حسب حال سہرا، ہستی، ساقی اور دواغ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان چاروں اقسام کا بیان عام طور پر مرثیوں میں ہوتا ہے۔
سہرے کی لفظی تحقیق کے سلسلے میں ارباب لغت کے بیانات بہت مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سہرا اصل میں شور تھا پھر بگڑ کر شہرہ اور آخر میں سہرہ ہو گیا۔

لے تاریخ انڈیا ص ۹۷

لے محمود استخار دوجا ص ۳۳

لے خزینۃ العلوم فی سلسلۃ المنظم

فرنگ آبادیہ کے مدبعت کی رائے میں ہرے کی اصل سرور
ہے کیونکہ سر "فرق" کے معنی میں ہندی بول چال میں داخل ہے جس کو
دار سے مرکب کر لیا گیا ہے۔ شرع میں اس کو سرور کہہ لیا گیا ہوگا۔
پھر رائے ہند کو گرا کر سہار بنایا گیا ہوگا۔ اس کے بعد اعلیٰ نے
قلب مکانی کی منزل سے گزر کر اپنی جگہ تبدیل کر لی ہوگی اور اس طرح
"سہار" بن گیا ہوگا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہرے کی اصل سرور ہے لیکن ہے
شروع میں تین بار کا سہار بانٹھا جاتا ہو۔ اگرچہ سرور اور "سہار"
میں تفسیر ہی فرق ہے اور یہ بات بھی غلط تیس نہیں ہے کہ ابتدا
میں تین بار کے ہرے کا رواج رہا ہو لیکن سرور میں کہا جاتا ہے کہ
رک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی ہے، یعنی بار اور دو مختلف زبانوں
کے الفاظ کو ملا کر اس طرح ایک معر دلفظ بنا لیا جائے گا۔

یہی رائے میں یہ اعتراض سہارا اور دار کے اس رشتہ کو
منقطع نہیں کرتا جو سب سے زیادہ قریب منقطع ہے۔ کیونکہ اول تو بہار جم
اور جمح انشاق کے مصنفین نے لفظ دار کو چاہے وہ موتیوں کی لڑی
کے لئے استعمال کیا جائے، چاہے پھولوں کے دار کے لئے، فارسی قرار
دیا ہے اور طائیر کے کلام سے ہتسناد کیا گیا ہے جو کہتے ہیں

ب ذکر خلق شا ہنشاد دوران
نار گل لائلک سجر گرامش

ایک جگہ اور کہتے ہیں

گستہ نار مروارید در پردہ

ہندی میں نار کو مال کہتے ہیں جس کی عربی "بسم" ہے۔ اگرچہ پھولوں کے
نار کی جگہ پھول مالدار کے لئے ہی تھی لیکن یہ لفظ مقبول نہ ہو
سکا اور بہار جمح کی رام لکھی کی طرح زبان میں جذب ہونے سے رہ
گیا۔ بہر کیف نار کو عربی میں عقد اور ہندی میں مال کہتے ہیں اس
اعتبار سے ہرے کی اصل "سہار" ہی کو تسلیم کر لینا زیادہ مناسب
ہے۔

بہار جمح میں ہرے کو بھی فارسی قرار دیا ہے۔ پٹنا حبیب
کہتے ہیں :-

"ہرے" بالکسر دماصل سیرا بیائے جمول دامن
الف است پر سے بانٹو کہ از سرور ادب
وازمیش و از گھا نیز سازند و ہنگام عروسی
بر سر دماوے بندہ۔"

انتقاد خان قانع کا وہ شعر جو پہلے لکھا جا چکا ہے، صاحب بہار جم
نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے

علامہ نیاز فتح پوری تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ سہار ممکن ہے کہ
سنسکرت کے کسی لفظ کی بڑی ہوئی صورت ہو یا پھر عربی سے لیا
گیا ہو جس میں ہرے کے معنی زات کو جاننے کے ہیں اور سہرہ اس
جسرا اجتماع کو کہتے ہیں جو شاہ کے وقت قائم کیا جائے گا۔

مجھے علامہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ ہرے کو
سنسکرت میں "بہاں سنگ" کہتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ الگ الگ
معنی رکھتے ہیں۔ بہاں بیشاپ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور
"سنگ" دونوں پتھروں کے درمیانی فاصلہ کو کہتے ہیں۔ اس میں سنگ
نہیں کہ سنسکرت کے اکثر الفاظ ذرا سے تیز کے بعد اردو میں رائج
ہو چکے ہیں مثلاً چندرما کی جگہ چاند اور سورج کی جگہ سورج۔ لیکن یہاں
سنگ کو کتنا ہی مزہ کیا جائے اس سے "سہار" نہیں بن سکتا۔ یہ ممکن
ہے کہ "بہاں سنگ" کے معنی کو سامنے رکھ کر اس سے "سرور" بنا
لیا گیا ہو جو پیشانی پر ایک کان سے دوسرے کان تک بانٹھا جاتا
ہوگا۔ چرہ میں لفظ بھیا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے "بہار" کی درمیانی
صورت سے گزر کر "سہار" بن گیا ہو۔

دار عربی الفاظ سہار اور سہرہ کا ساما تو اس کو بھی "ہرے"
کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ "جلیہ سہرہ"، "رت جلیہ" کا مترادف
ہو سکتا ہے سہرے کا نہیں اور شادی میں یہ رسوم میں ترتیب
کے ادائیگی ہیں اس کے اعتبار سے سہرے کا بہر بہت بعد میں

لے بہار جم جلد دوم ص ۱۲۸

تہ مجموعہ استفسار و جواب جلد اول ص ۳۷۲

لے بہار جم جلد دوم ص ۷۵

تہ مجمع انشاق

آتا ہے۔

شادی کی ابتدائی رسم 'بیوی کی صیگہ' ہے، اس کے بعد رت چگا میں شب بیداری جو دو گھنٹے اور دس دو گھنٹے کے گھر منائی جاتی ہے۔ پھر فجر فجر کی رسم کا ہے پھر سچائی یعنی بری کا یہ رسم ترکوں کے ساتھ 'ہرے آبی' ہے اور سچائی کے موقع پر دھوم دھم سے جلوس نکالا جاتا ہے وہ بھی ترکوں ہی کی نقل ہے۔ باہر آنے اپنی توڑک کے صفوے پر اس رسم کا ذکر کیا ہے۔ اگر نئے اپنے پڑتے کی شادی میں سچائی کی رسم کو نہایت پر تکلف طریقے پر اقسام دیا تھا۔ اس جلوس میں اگر لاش کا نہایت قیمتی سامان تھا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ روپے نقد بھی تھا۔ دربار امرا بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ سچائی کے بعد سہریں یعنی حبابی گاہی آتا ہے پھر شب گشت کا اس کے بعد کہیں سہرے کی نوبت آتی ہے۔

غالب اور ذوق سے پہلے ازد و شوا کے کسی دیوان میں کوئی نظم 'سہرے' کی نہایت اور ہمارا باد کے طور پر نظر نہیں آتی شادی پر قطعات ضرور نظم کئے گئے ہیں 'گران میں' 'سہرے' کی خصوصیت نہیں، ذیہ نظم استعمال کیا گیا ہے۔ ایسے قطعات اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ہیں۔ نعمت خاں عالی نے ایک بولے قطعا کا مکار خاں کی دوسری شادی پر نظم کیا تھا۔ جس کا پہلا شعر ہے:

باردیر کے خدا شہد خاں عالی منزلت
با کمال عز و تمکس با وقار ذیہ زین

اس قطعہ میں نہایت خوب کارانہ انداز میں میر جعفر دھار کی بھوک گئی ہے اور اکثر علوم کی اصطلاحات صحت کر کے اسے آتش کشی بنا دیا گیا ہے کہ علامہ آزاد بگڑی کو اس کی شہرہ کیلئے کی رحمت گوارا گرنا پڑی۔ اس قطعہ میں بھی سہرے کا لفظ نہیں ملتا۔

اردو کے موجودہ موجد، ذخیرے کے پیش نظریہ کہنا غالب امیر ہو گا کسب سے پہلے مرزا غالب نے سہرے کے نام سے ایک مستقل نظم

لہ خزانہ عامہ صفحہ ۳۳ دیوان عالی کے بعض نسخوں میں 'عالی منزلت' کی جگہ 'دلا منزلت' مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے۔

بادشاہ کے ایما و پر لکھی، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے

سہرہ لکھا گیا زو امتثال امر

دیکھا کہ چارہ خیرالامعت نہیں مجھے

یہ تاریخی سہرا مرزا جان نبت کی شادی پر لکھا گیا تھا جو شاہ ظفر کے بیٹے تھے اور غالب ذہنت محل کے بلن سے پیدا ہوئے تھے مطلع میں شاعر نے

تلقی حق ادا شاہ استاد شاہ حضرت ذوق کی طرف تھا

، من سخن ہم میں غالب کے فرخدار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کو نیال ہوا کہ غالب نے براہ راست ہم پر چوٹ کی ہے یعنی اس

سے بہتر سہرا کہنے والا کوئی نہیں اور ہم نے ذوق کو ملک انشاء بنا کر

سخنی بھی اور میر تقی شاہ کا اثر نہیں دیا۔ ذوق آئے تو بادشاہ

نے سہرا دکھا کر کہا کہ آپ بھی سہرا کہیے اور ابھی کہیے۔ ذوق نے وہیں

بٹھ کر ۱۵ اشعار کا سہرا کہ دیا اور مطلع میں غالب کی شاعرانہ تفسیر کا

جواب بھی اسی روحیت اور اشاریت کے ساتھ دے دیا۔

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں مستور سہرا

ذوق کا سہرا اسی دن شہر میں پھیل گیا اور دیکھ کر مرگی کو کہے میں

گھایا چلنے لگا۔ غالب کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے مہذرت کے طور پر

ایک لہو لکھا۔ سارا جھگڑا مطلع سے پیدا ہوا تھا۔ غالب اس کی طرف

اشارہ کر کے کہتے ہیں

مطلع میں آپڑی حق سخن گسترانہ بات

مقصود اس سے قطع حجت نہیں مجھے

اس کے بعد غالب اور ذوق کے امتیاز میں سہرا کہنے کا دواغ

عام ہو گیا جو اب تک موجود ہے لیکن بہر حال بے جھجکی کا ایک

نقدی یا فنیہ شکل۔

غالب اور ذوق کے سہروں کو دیکھ کر سہرے کے مطلع کچھ اور

باقوں کا علم بھی ہوتا ہے مثلاً موتیوں کی لڑیوں کے ساتھ یہ سہرے

میں چھوٹی لڑیاں بھی ہوتی تھیں یا موتیوں اور بچوں کے سہرے

انگ انگ ہانڈے جاتے تھے۔

جی میں انزائیں نہ موقی کر ہیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مفرد سہرا
سہرے کی لمبائی تبا کے داسی سے نہیں بڑھتی حتی
یہ بھی اک بے ادبی حق کر قبا سے بڑھ جائے
وہ گسیب آن کے داسی کے پرایہ سہرا
سہرا کشتی میں رکھ کر لایا جاتا تھا
ناؤ حیر کر ہی پروٹے گئے ہوں گے موقی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
شادی کے موقع پر دستار کو باغی ہی جاتی تھی اور اسی پر سہرا باندھا
جاتا تھا بلکی ساتھ ہی سر پر طرہ بھی مہنڈا تھا اور گلے میں بدھی بیز ڈالتے
میں مکئی پہناتے جاتے تھے

سر پر طرہ ہے مڑیں تو گلے میں بدھی
گلگٹا لگتے ہیں زیبا ہے تو منہ پر سہرا
بدھی اور گلے مکئی ہے پھولوں ہی کے بنائے جاتے ہوں
سہرا گلے کا رواج تو بھائوں ہی کی ایجاد ہے مگر ڈومنینا بھی
گلابی تھیں۔
سہرے کی بڑی کاٹھ جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کو بہت
بڑی فال تھیال کیا جاتا تھا۔
ہو بخیر دھن دو لہا کی ما تھا۔ مرا ٹھنکا
اچھا نہیں بی ٹھنکا سہرے کی بڑی کاٹھ
لے تاریخ ریختی سندھو جان صاحب صفحہ ۷۷

عمران انصاری

محیفہ نعمات

ہم سے بعد خلوص دہی بات ہو گئی
میرے لئے محیفہ نعمات ہو گئی
جس بات سے خلوص میں آتی ہے کچھ لکھی
عمران ان ہوں سے ادا ہو سکے یہ عزلی

ذکر خلوص سنی تو رہا ہوں مگر حضور!
عمران عرض ہے یہ خدا نے جمال سے
پہلے کوئی خلوص کے قابل بنا لئے دل
کبت تک جہاں میں با رعبت ملے دل

آسمانوں پر اہل زمین آگئے
جس جگہ راہ دہم دنگاں بھی نہیں
تم تھے ہم کو جہاں سے بھی آواز دوی
بزم شعر و ادب، بزم ماتم ہے اب
ہم جہاں سے چلے تھے وہیں آگئے
ہم وہاں کے عزم دقتیں آگئے
تم ہی کہہ دو وہاں ہم نہیں آگئے
نکیزہ دال پل بسنے تلخہ تھیں آگئے

اندونیشیا — سرزمین اعتدال

کیا جاتا ہے۔ آج سے پانچ لاکھ سال پہلے کیا ہو۔ کون جانتا ہے البتہ تیس سے کم آج سے کم پانچ لاکھ سال پہلے کیا ہو۔ کون جانتا ہے البتہ انسانی آبادی پائی جاتی تھی۔

اندویش کے قدیم ترین باشندے سپاہِ قان نامے قد کے گھنگریالے باؤں والے حبشیوں (نیگرو) تھے جتنے آدی باسی تھے اور چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں ان جزائر میں چھیلے ہوئے تھے لیکن ان کی مجموعی تعداد جزیروں کے رقبے کو دیکھتے ہوئے تھی، فیصلہ کن آبادی کا تصور جیسا کہ اب ہمارے ذہن میں ہے (۱۱) اس وقت ناممکن تھا۔ قدیم نسل کے یہ باشندے اب بھی تہذیب سے بہت دور قدیم آدی باسی زندگی بسر کرتے ہوئے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

دو مہیسی کے آواز سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے موجودہ

آندو چوچا نے ختم سے منگول نسل کی ایک شاخ کے لوگ ہماری
کی صورت میں متعدد قلوں میں شہنشاہ دوان کی تلوش میں جنوب
کی طرف دواڑ بھڑے اور ہرا اور زیرہ نامی ایک راہ سے اجڑا کر
ملک پہنچے۔ ان قافلوں میں کچھ تو قلیا کے سرمنشاہ آباد علاقے
میں بس گئے اور کچھ نے گے رطہ کے سمندر پر مجموعہ الجسٹائر
میں متعدد ٹوٹیں ہیں اگر دو پاش اختیار کرنی۔

آج سے تین ہزار سال پہلے کی تاریخ پر قدامت کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ تاریخ کے اس دھندے خاکے میں رنگ آمیزی کے لئے

جنگ بنگال کے جنوب مشرقی قسمت پر مشتمل خط استوا پر طے
کے ہوئے جزیروں کی ایک ہری دیباقت ہے۔ ایک وسیع
خزانہ کے طالب علم اس خط کو جزائر مشرقی ہندوستان یا ایٹ
کے نام سے جانتے رہے تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ہارس کے
کسکار جو کوٹ ل اور اپنا جزائر بدلاؤ بہت سی نئی سرحدیں، جس
اٹھیں اور دنیا کے نقشہ پر بہت سے علاقوں پر اپنا جواہر بدل دیے۔ جزائر
مشرق ہندوستان بھی ایسے ہی آباد ہیں۔ رنگ کا جواہر کے آزاد ملک کا
آپنا ہر سے سبز رنگ کا جامہ پہنا اور ڈیٹ ایٹم بڑی جنگ آؤٹو شیا
نام سے ایک نئی جمہوریت قائم ہوئی۔ دینیات سمجھا کہ اس کی تاریخ میں ایک
نئے ملک کا اضافہ ہوا۔ لیکن آؤٹو شیا کی اپنی تاریخ اتنی پرانی ہے
جتنی کنسل دوم۔

جو لوگ دارودن کے نظریہ ارتقا سے نہیں چمکتے ہیں وہ آدم باوا کے نام سے مفروضہ وقت ہوں گے۔ 'آدم باوا' اس نظریہ کے سلسلہ کی ایک اہم گڑی فراہم کرتے ہیں اور جو ردِ نسل انسانی کو سب سے پہلے دگر کر رہی ہے اُن کے والدے انسان نما جانور سے قریب ترین رہتے ہیں۔

Pithecanthropus Erectus سائنس دان آدم جاواکو

Sinanthropus Erectus ہتے بی اور ی مین کے

اور یورپ کے Neandarthial Man دونوں سے عمر میں بڑے تھے، اس انسانی رُو، ڈھانچے کی عمر کا اندازہ پانچ لاکھ سال

دیوالاکے تیشی کا سہارا دینا پڑا ہے۔

بکھتے ہیں کہ عید سے سادھے، بھولے بھالے انسان کا یہ قافلہ جس وقت طایاک میں سر پہرا کر رکھتا ہے تو ہمارے دیوانہ ستم سے ایک دھپنا اپنے آسمانی سفر پر اور سر پہرا کر رہتا ہے اس نے ہی انسان کو پر مسکرا کر نظر ڈالی اور جیسا کہ روٹاؤں کی عادت ہے اس نے ان دھرق ہاسیوں کی قسمت بھانپ لی اور خوشی کی ہر سی اکرا پتے لگے سے ذمہ کی امانت رکھ سنبھالیں چھینک دی جو ان کے قدموں پر ام کر گئی۔ دیوانہ کی اس فراخ دلی پر اور دیوانہ کی میں مجلس پیچی تو ادھر انسانی جس نے ایک حد سے آفریں بلندی کی کسی نے کہا: ”وہ دیکھو!“ لوگوں نے دیکھا اور ان کی پر جرمیوں کی ایک دنیا خالی پڑی ہوئی بود و باش کی وجہ سے ہی تھی، ٹھکری کماشت میں سرگردان انسانوں کو ایک نگر لکھ لگ بھتا اور کیسا ٹھہر!

موتیوں کی کڑن بھرے ہوئے چموتے پڑے ہیں ہزار ہزار پر سے تقریباً تین ہزار سیکن کی سہاٹی میں پیچھے ہوئے، لگاتار چموتے کسی کو نام دینے کا خیال نہیں کیا اور جہاں چند درختوں کے علاوہ آبادی کا نام نہیں۔ اور ان میں سب سے بڑا اور نہروں کو اگر آسٹریلیا کو براعظم مان لیا جائے اور گرین لینڈ کو صرف سے ڈھکے ہوئے تین لاکھ، لاکھ چارے تو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ۔ پھر اس گسریں قدرت کا واسطہ لکھ موجود ہے۔ وہ تمام قدرتی وسائل جو دنیا میں ہمیشہ سے قوموں کے لئے مفلحت اور ترقی کے ذرائع ثابت ہوئے ہیں اس سر زمین کا سب سے بڑا، سونا چاندی، تانبہ، تیل، لوہا، کوئلہ اور گیس سے چٹا پڑا ہے۔ استوائی آبد ہوا کے ساتھ ہمارے ذہن میں انتہائی گرمی اور بارش کا تصور ہے وہ یہاں آکر غلط ثابت ہوتا ہے۔ پورے ملک میں چند لمبوں کو چھوڑ کر کسی بھی دور میں سال میں گھس۔ وقت ناقابل برداشت نہیں ہوتا اور بارشیں غیر معمولی طور پر سلاحدار خاص کر پہاڑی تمامات پر دروازہ پہاڑ جزیرہ پر سے کیچوں پر دیکھ کی ہڈی کی طرح پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے) آپ وہاں تک اور دھریب ہے۔ زمین تخی ذخیرہ کو جو چیز گنتی ہے وہ شدت سے لگتی ہے۔ یہاں خزاں نہیں

ہوئی۔ سبزہ و درخت سب سدا بہار ہیں۔ بے ملک و موصوعا ہوا اور ہالی کے جزیرہ قدرتی مناظر کی جنت ہیں۔ ساتراپیں گئے بنگلے ایک ناقابل مور و مہار کی طرح کھڑے ہیں جن میں عجیب و غریب آرکٹڈ انسانی دسترس سے ہا پر چھوئے ہیں اور انسان کو دھرتی ہم دیتے ہیں۔ جاوا میں زمیندار دھان کی کھیت نہ جانے کب سے معورتوں کے لئے موزوں تصویر بن گیا کر رہے ہیں۔ تارلیں پہاڑی چائے، چمرو، بڑا، تبا، کوکنا سب کچھ افراط سے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑھ کر یہاں کے سالے ہیں۔ سیاہ چرخ، لونگ، بائل، ہوز، بھارتی وغیرہ وغیرہ جن کی خوشبوؤں نے دنیا کے کونے کونے سے تاروں کو یہاں لکچ بلیا۔ ان سالوں کی تجارت اور اس تجارت کے منافع کی تلاش میں اس سرزمین میں چینی، ہندو عرب، فرانسیسی، انگریزی، انگریز اور انگریز کی سبھی لاکھ رہا۔ یہاں آئی جنگ، مارکوف اور جی بولٹو می۔ پچھلے ہیں۔ چینی کے بدعہ عالم اور یورپ کے متشرقی سب سے یہاں سے فیصلہ حاصل کیا ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان سے ہزاروں کی تعداد میں کچھ یہاں بسنے کی غرض سے آئے۔ بلائی نامان کے سپاہیوں نے خان اعظم، کا دہ بد قائلہ کرنے کے لئے یہاں بڑھائی کی تو کھنڈر کا ایک شہزادہ یہاں بدھ بھکشو کی گڑیا۔ عرب اور عراقی تاجروں نے یہاں اسلام کا پیغام سنایا اور پرتگالیوں نے صلیبی جنگ کے نعرے لگائے اور آفریں رکوتی تین سو سال پہلے) و لنڈریوں نے یہاں اپنے گھر سے ڈورایاک گھر بنایا اور دنیا کی زبردست نوآبادی قائم کی۔ انیسویں کی کارگرانہ لے اندونیشیائی تاریخ میں ہمسایوں رنگوں کا ایک عجیب و غریب نمونہ بنایا جس تاریخ کے صفحوں میں آپ کو فن و فن ارتق و ملت پخت و صحت اس دن، ممانت و دیوی اور بڑی و کھینگی لکھی ہستی روق دستا میں لیں گی۔

اندونیشیا اپنے عام کھوڑا آبادی کے ساتھ دنیا کے ملکوں میں اس وقت چھٹے نمبر پر ہے۔ اس آبادی کے ۹۰ فی صدی سے زیادہ لوگ اسلام کے پیرو ہیں اور اس خانہ سے مسلم ملک ہیں

اس کا درجہ پاکستان کے بعد آتا ہے لیکن ملک کی زرخیزی اور تصدق و ساقی کے اعتبار سے یہ مجموعہ، غیر اثر پیشیا بلکہ دنیا کے امیر ترین ملک میں شمار کیا جاتا ہے۔ گزیرے وقتوں میں دنیا کے زبردست ملکوں نے اپنی فوجی فادلوں سے اتحاداتی فائزہ نہیں اٹھایا جیسا کہ دلتیز میں نے اٹھادیشیا سے۔

جاوا اندونیشی جزائر میں رقبہ کے لحاظ سے یورپو، سواترا آڈ ایرین کے بعد آتا ہے۔ یہیں پورے ملک کی آبادی کے تین چوتھائی ریلوے، گاڑیوں، لوگ اسی جڑی میں آباد ہیں تاہم تاریخ اعتبار سے بھی جاوا کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ زمین کی مشاوری، زرخیزی اور ترقی مشاوری دل کشی میں شاید ہی کوئی دوسرا جزیرہ جاوا کا مقابلہ کر سکے۔ ملک کے اہم ترین آثار قدیمہ جاوای میں پائے جاتے ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی سلطنت کا مرکز تاریخ میں جاوا ہی تھا۔ اندونیشی ثقہ مذہب کو عروج اسی جزیرے میں حاصل ہوا۔ بت و شان سے آکر لے والے کہنے سب سے پہلے جاوای پہنچے تھے۔ ہندو مت کا پرچار، سب سے پہلے جاوای میں ہوا تھا۔ ساراچہ کے قدم بھی سب سے پہلے یہیں پڑے تھے۔ اندونیشیا کے مسلم مبلغ جاوای میں سب سے زیادہ سرگرم کار تھے۔ حریت کی جنگ بھی اسی جزیرے پر ہوئی۔ اور قیام جمہوریہ کے بعد اس سلطنت بھی اسی جزیرے کے بشر جاوای کو بنایا گیا۔ لوگوں کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ جاوا کے باشندے بھی متادوم رکھتے ہیں اور پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس جزیرے میں بیک وقت ملک کے ہر علاقے اور دائرے کے لوگ آکر بس گئے ہیں۔

جاوای آپ دیکھو ایسا ایک سلامت روی اور اعتدال پایا جاتا ہے اور یہ خصوصیت اس کے باشندوں کو بھی عطا ہے وہ کسی بھی جزیرے سے آکر لے ہوں وہ دلیت کی محنت ہے۔ جاوا کے ایک شہر سے کہ دو سرے تک کوئی جہاز کا موسم نہ لگا۔ جاوے کا موسم کے ایک ایسے ہمنو میں ہے کہ یہاں جیسے تازہ ہوا کا گرمی نہیں۔ یہاں کی گرمی میں اس اور اس کے شہر ہے کہ جاوے کی فوجی اس کو صرف چند دن برداشت کرتے ہیں اور ساقیوں روزانہ واد کو شہرستان

ہو جاتا ہے۔ اس دور شہرے باہر جانے والی سڑکوں پر لوگوں کا ایک طوفان ہوتا ہے۔ شہر سے باہر مدت دس کیلو میٹر دور پہاڑ بدل جاتی ہے۔ جوار، خشک اور فرحت بخش ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ وسط جاوایں آپ ڈانگ پلیٹیں پہنچ جائے تو سال کے کسی وقت پر ت باری بھی دیکھ سکتے ہیں۔

قدرتی مناظر بھی آپ جیسے سفر کرتے جائیں دیکھ سکتے ہیں۔ ساحلی میدانوں میں سرسبز لہجاستے ہوئے دھان کے کھیت، ادور دور پہر کیلون کے جھرمٹوں میں چھپے ہوئے گاؤں، میدان سے ہٹ کر پیشی پہاڑیاں جن پر جاوا کی سبیل کے تناور درخت، اونچی پہاڑیاں چائے کے باغوں کا دیرینہ غلاف اوڑھے، میلوں لمبا قی میں تغار و قطار لڑکے خامد، وادو میں ناریل کے گٹھے گڑے سبز رنگ کے جھنڈ اور ان کے پس منظر میں دھان کے زہر دار زمینی کھیت، ان میں لپکتے ہوئے شیشی کی طرح جھلکتا ہوا پانی۔ زمین کا پتہ چہرہ سبز فزوں سے بھرا ہوا۔ یہ سارا منظر ایسا ہے کہ قہقہے و آفرین کے الفاظ بول کر بند دیکھتے چلے جائے۔ اور جب چاکری کی گشت میں آپ آجے تو اس سڑی ہوئی گرمی میں ہلے کی چھین برداشت کرتے ہوئے سروا ہوں کے ساتھ چھ الفاظ اور جن خیالات میں بی جا ہے ان منظر کی دل فریبی اور آب و ہوا کی فرحت کو یاد کر لیجئے۔ البتہ یہ تاثر آپ دیکھ سکیں گے کہ اندونیشی منظر میں آپ کو کوئی ایسی چیز نہ ملے گی جو حیرت انگیز ہو۔ یہاں آپ گرد و پیش کی خوب صورت دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ یہاں قدرت ہر جگہ اور ہر ذرے میں ایک اعتدال اور سلامت روی سے ہوئے ہے۔ پہاڑ، دریا، جھیلے، جھیلیں، وادو اور وادیاں سب ایک سبک سا شہر رکھتی ہیں اور قدرت کا یہی اعتدال یہاں کے لوگوں کی طبیعت میں جھلکتا ہے۔ اس پسندیدہ صبح جو، انگسار اور روا دادی ان کی طبیعت ثانیہ ہے۔ ان کی کمال وصال اور طرز گفتگو میں ایک سلامت روی ہے جس کو دیکھ کر یورپ کے لوگوں کو صدمہ سے کاٹی اور سستی کا دھوکہ دیا جائے اور استوائی آدما ملین، غرب المثل ہو گئے ہیں۔ یورپ کے نقطہ نظر سے یہ سلامت روی دیکھنے والے کو بے مبرک و قبی

۱۰۔ اس سست رفتاری پر جمعیتا جاتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کی
 سماجی اور روزمرہ کی یہ وجہ حیات کے مد نظر یہ محسوس ہوتی ہے
 حق بجانب ہے۔ خود انڈونیشی زندگی میں یہ اعتدالی اور سکون
 جزو حیات ہے اور ایک نیرملکی یہاں چند سالہ رہ کر اس کا اتنا
 عادی ہو جاتا ہے کہ اسے اس سست رفتاری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

انڈونیشی لوگوں کی یہی اس سست رفتاری اور روانداری تھی
 جس نے ہمارے آسمے ہونے پر تنہا ہی عنصر کا بیڑ مقدم کیا اور
 ان خارجی عناصر کو اس طرح جذب کیا کہ یہاں پہنچ کر ہر چیز
 انڈونیشی سانچے میں ڈھل گئی۔ لیکن یہ تو دوسری داستان
 ہے۔

آج کل / فن تعمیر نمبر

اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہو گا

اس خصوصی نمبر کے مندرجہ ذیل مضامین پر مضمنا ہیں وگا ہیں۔ جو حضرات
 مضمنا میں لکھنا چاہتے ہیں وہ ریڈیو 'آج کل' سے خط کتابت کریں۔

۱۔ ہندوستان کا قدیم فن تعمیر (موسس جوڈو - ہڑپا وغیرہ)

۲۔ بودھ فن تعمیر

۳۔ جین فن تعمیر

۴۔ غاروں کے حیرانی شاہکار

۵۔ جنوبی ہند کا فن تعمیر

۶۔ ہند آریائی فن تعمیر

۷۔ چولیا لٹریچر فن تعمیرات

۸۔ پچھلے اور نئے فن تعمیر

۹۔ پہاڑی فن تعمیر

۱۰۔ مشرق میں ہندوستانی فن تعمیر کے اثرات

۱۱۔ جدید ہندوستانی فن تعمیر

۱۲۔ آزادی کے بعد کی عمارتیں

پتہ: ۱۔ ریڈیو، 'آج کل' دارود، اولڈ سیکریٹریٹ، دہلی

تنگے کا سہارا

ایرٹ نے دی میریا جی کیا گر نہ جانے کیسی اضر دی اس کے بچہ وجود پر طاری تھی کہ شام ہوتے وقت تک اس کا دل بکا نہ ہو سکا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے اس شام کو کنسرٹ میں جانا منظور کر لیا تھا مگر اب سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی ایسا بہانہ ملتا کہ وہ نہ جاتا۔ ایرٹ وائلی کا مہر سہ وہ دل ٹھاکر اپنے منی سے غلوس کے ساتھ منت کرتا ہے۔ مگر جب کنسرٹ کا وقت آتا ہے تو اس میں ایک طرح کی بددی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب ڈانس میڈل جیسے ہوسے ایسٹ پر اکر اپنا وائلی سے کر کوئی دھی چیرتا ہے تو چند ہی منٹ میں لوگ پڑیں باقی شروع کر دیتے ہیں کچھ بھی ہیں کی آواز نالی میں پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے، ایرٹ کا دل اُپٹا ہوتا جاتا ہے اور پھر وہ جلدی غلہ ختم کر کے وائلی سے بھاگ نکھڑتا ہوتا ہے۔

ایرٹ نے دی میریا جی کیا گر نہ جانے کیسی اضر دی اس کے بچہ وجود پر طاری تھی کہ شام ہوتے وقت تک اس کا دل بکا نہ ہو سکا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے اس شام کو کنسرٹ میں جانا منظور کر لیا تھا مگر اب سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی ایسا بہانہ ملتا کہ وہ نہ جاتا۔ ایرٹ وائلی کا مہر سہ وہ دل ٹھاکر اپنے منی سے غلوس کے ساتھ منت کرتا ہے۔ مگر جب کنسرٹ کا وقت آتا ہے تو اس میں ایک طرح کی بددی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب ڈانس میڈل جیسے ہوسے ایسٹ پر اکر اپنا وائلی سے کر کوئی دھی چیرتا ہے تو چند ہی منٹ میں لوگ پڑیں باقی شروع کر دیتے ہیں کچھ بھی ہیں کی آواز نالی میں پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے، ایرٹ کا دل اُپٹا ہوتا جاتا ہے اور پھر وہ جلدی غلہ ختم کر کے وائلی سے بھاگ نکھڑتا ہوتا ہے۔

ایرٹ نے دی میریا جی کیا گر نہ جانے کیسی اضر دی اس کے بچہ وجود پر طاری تھی کہ شام ہوتے وقت تک اس کا دل بکا نہ ہو سکا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے اس شام کو کنسرٹ میں جانا منظور کر لیا تھا مگر اب سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی ایسا بہانہ ملتا کہ وہ نہ جاتا۔ ایرٹ وائلی کا مہر سہ وہ دل ٹھاکر اپنے منی سے غلوس کے ساتھ منت کرتا ہے۔ مگر جب کنسرٹ کا وقت آتا ہے تو اس میں ایک طرح کی بددی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب ڈانس میڈل جیسے ہوسے ایسٹ پر اکر اپنا وائلی سے کر کوئی دھی چیرتا ہے تو چند ہی منٹ میں لوگ پڑیں باقی شروع کر دیتے ہیں کچھ بھی ہیں کی آواز نالی میں پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے، ایرٹ کا دل اُپٹا ہوتا جاتا ہے اور پھر وہ جلدی غلہ ختم کر کے وائلی سے بھاگ نکھڑتا ہوتا ہے۔

وہ ایک وائلی فنانس ہے۔ مگر ایک ناکام فنکار۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر روتا ہے۔ پیرس چھڑتا ہے اور کان لگا کر ہوا کی ہروں کو محسوس کرتے ہیں۔ اب کیا کمی ہے۔ اب کیا کمی ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ پھر پوری تھی قہ سے جلد چھڑکتا ہے جگر تیر دھبی کاوی۔

وہ وائلی بھانا چوڑی بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی تو ایک چیز تھی جس سے اس کو مل چھی تھی۔ جس سے وہ کچھ پیسے کا سکتا تھا۔ لیکن اگر اس طرح وہ کنسرٹ میں ناکام ہوتا رہا تو توک اس کو بھولی جائیں گے۔

کے سلسلے میں ابرٹ دودھنک دقت میں نہیں گیا۔

شام کو وہ اچھی طرح تیار ہو کر اور بہترین سوٹ پہن کر گریس کا رنگ اس نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے جانے والے وقت کی ملاقات کی۔ گزری۔ بر میں راجہ آٹا دکھائی دیا اس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے اور ایک اخباری رپورٹر بھی جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ سٹریٹ اس کے ساتھ بھی کچھ لوگ تھے۔ ایک اخباری نمائندہ اور بائناڈرسلے کا لٹو۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو فن کار کے حسب خواہش تبصرے کرتے تھے۔ صرف ابرٹ ہی ایسا تھا وہ چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

گزرے لوگ کی تحریکات کی سرکڑی جو ممکنات و قار کے ساتھ خوبصورت اور فحاشت کا ایک دل کش مجموعہ معلوم ہوتی تھی اسٹیج پر آئی۔ اس نے لاروائی کام غار کرتے ہوئے فن کاروں کے نام سنائے اور ان کا تعقیب کیا تعارف حاضرین سے کرایا۔ سرسری طور پر چند نعروں میں اس نے ابرٹ کا بھی ذکر کیا۔ پھر ایک کونے کی طرف ٹھکرتے ہوئے اس نے ابرٹ کے نام کا اعلان کیا۔

وہ بڑے اعتبار کے ساتھ اسٹیج پر آیا اس نے وائٹ ٹشاکر ہارموسیکٹا کی طرح کندھے پر رکھا اور کسی طرف دیکھے بغیر ایک نئی دھن بجی۔

بمب پریکوت طاری تھا۔ لوگ خاموشی سے متاثر انداز میں بہوت بیٹھے تھے فضا میں دل آویز نغمہ کی ہری بھر رہی تھیں۔

”ارے یہ کیا۔“ ابرٹ چونک گیا۔ سامنے کی قطاریں میں بیٹھی دو لڑکیاں سٹریٹ سے کچھ کھسک چکی رہی تھیں اور سٹریٹ نے ابرٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استغناء بینچے میں کچھ کہا۔ ابرٹ کا حیاں بٹ گیا۔ اس کو غصہ آ گیا۔ گر ان چند ہی سیکنڈوں میں اس کی دھڑکا سلسلہ منتشر ہو چکا تھا۔ تارے درستی سے بچنے لگے تھے۔ بال میں نئے کا جادو ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے بیٹھی سنا لیں اور ایک طرف کچھ کسک رہی تھیں۔ سٹریٹ کی جگہ پر ایک سی منجبت ہٹ بال میں پھیل گئی۔ ابرٹ بالکل ہی بدحواس ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی سنگیت ختم کر کے اپنا ڈراما ادھورا چھوڑ کر وہاں سے جھٹک کھڑا ہوا۔ اس کے پاس پندرہ منٹ تھے کہ وہ منٹ میں اسٹیج پر نہ ٹھہر سکا۔

آج کی دہلی

”یہ میری آخری کوشش تھی۔ اب میں چھوڑ دوں گا۔ مجھے دامن چھوڑنا نہیں آتا ہے۔“ نالام کوششوں اور وقت کی بربادی سے کیا حاصل ہے یہ غلط ہے کہ میرے فن کی قدر نہیں ہوتی۔ اصل میں گزری خود مجھ میں ہے۔ مجھ کو کچھ نہیں آتا۔“ وہ بے کار پرتشنگائی میں یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ دوسرے دن اس نے دفتر میں لوگوں کے کوشش کی تعریف سنی۔ جب اپنی ٹیبل پر پہنچا تو دل نہ چاہنے کے باوجود اس نے ان کا متاعی بڑوں کا نصف کھولا جس میں سٹریٹ اور اداس کی بہت تعریف تھی۔ رپورٹس لکھتے تھے کہ سٹریٹ کو کئی بار ایسٹج پر بلا گیا۔ کار کی کلب سکرٹری نے اس کو بہترین متاع ہرے کا تحفہ دیا اور اس کے آؤگرافٹ لگے۔

ابرٹ دن بھر کچا پورے بیٹھے بہت چڑچڑا رہا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اب دامن کبھی نہیں جائے گا۔

یہی کیا ایسا ہو کہ اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ ایک دہلی صبح وہ بہت ہی دل شکستہ اور افسردہ سا تھا تو اس کو ایک خط ملا۔ سرپرست کا وقت تھا۔ وہ کام ختم کر کے بیڑ پر سر رکھے اور گھر نکلا تھا۔ اسی کی ازلی تہنائی آج اس کو کالے کھا رہی تھی۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا دکھ کھسکتا۔ اس نے دامن بجائے کیا تہنیں خشک بنا رکھا تھا۔ ان نغمہ خات میں جبکہ زندگی بڑا اچھا معلوم ہوئی تو وہ دامن اٹھا لیا اور بڑے غلوں کے ساتھ درد میرے دل کی آواز کو نادوں سے ہم آہنگ کر کے فضا میں منتشر کر دیتا۔ مگر اب بہت دنوں سے دامن بھی اس کا سا تھی نہ تھا۔ اسی کی تہنائی اور بڑھ گئی تھی۔

وہ دہلی کچھ کچھ بہت زیادہ اداس تھا۔ مشروعا پر کار زمانہ تھا ورنہ جس سے پتہ توڑ کر گر رہے تھے۔ یادوں طرف عجیب و غریب سی برس رہی تھی۔ ایسے میں ابرٹ کو وہ خط ملا۔

وہ خط بہت خوبصورت شاعری قریب تھا۔ مگر عجیب والے لفظ پتہ اور نام و درجہ نہ تھا۔ چند ہی سطریں تھیں مگر ان میں سب کچھ موجود تھا۔

ڈیر ابرٹ

تم ایک بہت اچھے لکھ بہت ہی لاپرواہ فن کار ہو۔ میں نے

کا لکے کنسٹریٹ میں تھا راعلا ہرہ دیکھا۔ بہت سی گراڈریا۔ مگر تم جلدی چلے کیوں گے۔ میں کوں ہوں بے تباہا مناسب نہیں ہے نیکی "خدا کی شام" کے کنسٹریٹ میں تم مزدور۔ کھنڈو رنگ کی ٹیول بھی بچا۔ مجھے بہت پسند ہے۔ یہ امید ہے جا نہیں ہے کہ تم مزدور کو گئے مگر تم پورے وقت وہاں بہو تو شاید میں تم سے مل سکوں اور اپنا تعارف کراؤں۔۔۔۔۔"

خفیجیے والی کوئی لکھی تھی۔ خط انگریزی میں تھا۔ اس وجہ سے واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کیسیے والا مرد ہے یا عورت۔ ممکن ہے کہ وہ اس کا لکھی کا صاحب ہو۔ البرٹ نے سوچا۔

مگر وہ کنسٹریٹ میں کیسے جائے گا۔ اس کے پاس کوئی دھننا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ اس شام کو دیر تک بگڑی سوچ میں رہا نیکی ایک بات اور وہ بھی بھولی اور وہ یہ کہ اس نے خط کو احتیاط سے اپنے سر لٹے رکھا لیکن اور بہت دھن بھول دوائی بچایا۔

اس کی آجی دور ہو گئی۔ دوسرے دن اس کو خزاں کی شام "کا دعوت نامہ ملا۔ اور ایک بار پھر وہ بڑے اٹھاک کے ساتھ کنسٹریٹ کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ پہلے تو اس نے نئی اور پانی تمام دھنیں بھاڑ لیں پھر دن بھر دنیا کے ماہر فن کاروں کی نقلیں آمارا رہا۔ پھر اس نے دو ایک نئی کتابیں لیں اور ان میں سے اس نے نئے رنگا رنگوں کی نئی دھنیں معلوم کیں۔ پورا ہفتہ اس تیار رہی میں گز رہا۔

پھر کنسٹریٹ کی شام آگئی۔

اس دن البرٹ نے کسی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ کوں کوں آیا اور کسی کے ساتھ کوں اور کتنے لوگ تھے شہر کے سبز زمیں میں کون کون موجود تھا۔ اس سب باتوں کی البرٹ نے مطلق پروا نہ کی۔ اس کو صرف ایک خیال تھا کہ اس صبر سے مجھ میں کوئی اس کا بھی تھا جو صرف اس کا منتظر تھا۔ اس واحد پرستار کو مایوس نہیں کرنا ہے۔ آج خواہ کچھ کیوں نہ ہو پورے وقت تک اسٹیج پر بٹھے گا۔ مکی ہے خط لکھنے والا اس سے

آکرے۔

"اے میرے ان چائے دوست کاش میں تم کو مایوس نہ

کروں۔" اس نے بہت عجیب انداز میں سوچا

وہ مستقل سوچ میں تھا۔ چاروں طرف سے بے خبر مگر چنکا اس وقت جب اس کا نام پکارا گیا۔ شاید کچھ لوگ بھنے۔ کچھ نے بیزاوی کا اظہار کیا۔ مکی ہے کہ پورے رٹوں نے اپنی فوٹ لیکن بند کر لی ہیں۔ لڑکیوں نے اپنے کاشوں کی پالش کھرتا شروع کر دی ہو۔ اگلی صفوں میں لوگوں نے پہلو بدلے ہوں۔ مگر البرٹ ان سب سے بے نیاز آسٹج پر پہنچا۔ اس نے سامعہ دیکھا۔ اس کی نظر میں لالے و سڈیں عین گردہ دیکھ کر بھی نہیں رہا تھا۔

بڑی سرعت کے ساتھ تادیں میں ارتکاش شروع ہو گیا۔ آل میں کئی خاموشی تھی۔ چنڈی منٹوں میں البرٹ نے تادیوں کو خزاں کے المیہ ماحول سے ہم آہنگ کر دیا۔ ایک دھن اس نے دوسرے ایک تار کو رگڑا اور پورا آسٹج جیتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ دوبارہ اس نے اٹھتا ہوا ہمارے آواز کو بالکل ہی مخالفت انداز میں موڑ کر کسی فنکار تصور سے وابستہ کر دیا۔ آخری بار جب وہ ترچھا ہوا تیزی سے مڑا اور آخری تار پھاڑنے کے لئے اس نے "کھنڈو رنگ" متروک کیا تو اچانک پورا آل تادیوں سے گونجنے لگا۔ اگلے تین منٹوں میں وہ مانتی سر نہلاتا۔ پھر ایک دھن زور دیا جتنا کہ اس کے ساتھ اس نے مغز اب اور تادیوں کا تعلق کر دیا۔

بیس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے پانچ منٹ زیادہ لے لئے۔ مگر پورے آل میں صرف تادیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

البرٹ کو بہت ہی نہیں حلا کر کتنے دیر ہوئی اور اس کے فنی کے منظر سے لاگوں پر کیا اثر پڑا۔ وہ اندھیرے میں ایک جگہ کھڑا ہوا بے خیالی میں لوگوں کو دیکھتا رہا اور پھر بالائی خاص خیال کے ایک طرف کوچل پڑا۔

جب وہ دفتر گیا تو اس کو لوگوں نے مبارکباد دی۔ اس نے بلے خیالی میں یہ سب کچھ سنا۔ اس نے اخباروں کے ان کالموں پر بھی توجہ نہ دی جو میں اس کا مدحیہ انداز میں ذکر تھا۔ اس بار وہ ہمیشہ سے

لڑا وہ چپ اور مخموم تھا۔

مذہب و مذہب کا۔

شاید یہ قہر بھی بدست ہو جاتا لیکن نئے سیز کے شروع میں ایٹم کو پھر دی نفاذ ملا۔ وہی جاتی چھپائی جو بیحد تھویر۔ اس نے جلدی سے کھول کر پڑھا،

ڈیرابرٹ

تم اب ایک کامیاب کادرو۔ میری دلی مبارکباد قبول کرو
قیس یا دوہکا کہ میں نے ایک بار تمہیں ایک کنسرٹ میں گرد پڑا دیا تھا
اور تم بدحواس ہو کر پریشان ہو گئے تھے۔ تمہاری اس ناامی کا مجھے
صحت افسوس ہے۔ میں تادم تھا کہ وہ حق میری وجہ سے بھا۔
تم کو اس طرح غمناک خط لکھ کر فنی کا لڑندہ رہتے پر مجبور کیا تم
میں بڑی اہلیت ہے اور اب تم پر چرچ بڑے آکسٹ ہو گئے ہو۔ شاید
اب تم کو ان خطوں کی مزید ضرورت نہ ہو۔

تمہارا مشرقی

گرمی کو پھر ایک خط اس افادہ کا ملا۔ کچھ دانے نے اس کی ترقیت
کی تھی اور افسوس ظاہر کیا تھا کہ وہ ایٹم سے نہ مل سکا۔ گرد میں
یہ بھی تھا کہ وہ سال کے اوڑھائی جیسے میں مزدور آئے۔ امدادی جیسے
میں ابھی گلب بھگ پندرہ دن تھے۔ گر پھر بھی ایٹم نے پوری تھی وہی
کے ساتھ ریاض مشورہ کر دیا۔

امدادی جیسے میں اس کو بہت سے لوگ ملے۔ کئی ایک نے کوشش کی
کہ مبارکبادی کئی خبری نہ تھوڑی نے اس سے دل چسپی۔ اور
دو تین ٹکڑوں نے بھی اس سے تھارت حاصل کیا۔ مگر ان سب میں وہ نامعلوم
شخصیت نہ تھی جس کے تصور میں ایٹم دنیا و باہیا سے بے غرض ہو چکا تھا۔
اگر وہ کوئی لڑکی ہے اور خوبصورت لڑکی تو پھر حقیقت ہے۔ لیکن اگر وہ
کوئی اور ہے تو..... آؤ اس طرح وہ اس مہم میں سہارا سے
حاصل پھر سکے گا۔ اس آج بھی کا کوئی علاج نہ مل سکا۔

اس جیسے میں بھی ایٹم سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ ہارنا تا یثا
بھائی ہیں۔ لوگوں نے کئی بار اس کو اسے پڑنے اور نہی دھیں پہلے
کو کہا۔ دوسرے دن اخبارات نے اس کی ترقیت لکھی۔

ایٹم کی یہ کامیابیاں بہت ہی جلد اخذ ثابت ہوئیں۔ اب
وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے پرستاروں میں گھرا رہتا۔ کئی نقادوں
اس پر اچھے تبصرے کئے اور موسم گرمی کی شاندار تقریبوں میں تمام
پہاڑی شہروں سے شہر، مسوری، دارجلنگ اور نیپالی تھل سے اس کو
بلوے آئے۔

پھر برسات آئی۔ کنسرٹ اور میوزک کانفرنس دو ڈھائی ماہ
کے لئے بند ہو گئیں۔ مگر ایٹم اب خوش اور بہت ہی خوش تھا۔ وہ
ایک کامیاب فن کار تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اور کوئی کانفرنس یا کنسرٹ اس کی
بیزگلی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

گردن کی میں پھر بھی ایک خط لکھی تھی۔ ایک نقشہ۔ سب کچھ پانچ
کے بعد بھی کچھ دیا ہے اس کا۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ میرا پرستار ہے۔ جو
ہر جگہ ہوتا ہے جہر بھی مجھ سے نہیں ملتا۔ مگر ہر کانفرنس اور کنسرٹ
کے بعد مجھ کو مبارکباد کا خط بھیجتا ہے۔ ایٹم اس راز کا حاصل

مسرتا

ساجی تعیر نو کا ترجمان

- ساجی اور گیلو زندگی کی مسیح عکاسی کرنے والی کہانیاں
- اہم اور بے چیدہ سیاسی اور انقلابی مسائل پر خیال انگیز مضامین
- دلی نیشنلزم اور جذباتی غزلیں
- طنز و مزاح
- عورتوں کے سلیب ہوئے مضامین

فی شمار ۷۷ نئے پیسے
زیر سالہ ایک سال ۷ روپے
دو سال ۱۱ روپے

میںبر سرعہ اردو۔ جھنڈے والا، رانی جھانسی روڈ، نئی دہلی۔
مجھے اگلے شمارے کے ایک سال دو سال کے لئے خبردار
بنائیے۔ زنجیرہ کے لئے وہ مکمل دی۔ پی۔ پی۔ سے روانہ کیجئے۔
نام _____
پتہ _____

اپریل ۱۹۶۷ء

پنجابی کے صوفی شعراء

پنجابی زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود پانچ دریاؤں کی یہ سرسبز زمین ہے، ویسے وہ بزرگ گروہوں میں نسبتاً سترھویں کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔ قدیم ہندو دینیاتی ثقافت کی ابتداء سے لے کر اسلامی عالمِ اقسام کے دھڑلے عروج تک پنجاب کی دھڑکی سیسوں تہیز یوں کی آواز جگاہ رہی ہے۔

سیاسی اعتبار سے بھی جتنے انقلابات پنجاب میں رونما ہوئے، اتنے شاید ہندوستان کے کسی اور خطے پر نہیں ہوئے۔ پنجاب کے قدیم آباد کار 'دراوڑ' اور 'وارو' آریہ ایک وقت تک یہاں رہ رہ رہ رہ رہے۔ اس کے بعد ایرانی، پارسی، یونانی، باختری اور پارسی۔ یونانی، گزنائی، اسیری، ہونانی، اشک، گرج، سامی، جاٹ اور بعد ازاں محمد بن قاسم کی شیریں سترھ کے بعد سے افغان و منگول، تورانی اور ترکی اور کئی دوسری قومیں یہاں آئیں اور پاکا خر۔ یہیں بس گئیں۔ پنجاب کی جہاں قیام، اخلاقی اور مذہبی نشوونما میں ان سب کا گہرا اثر ہے۔

اس نوع کی سیاسی اہمیت کی کشمکش میں ایک عرصہ تک پنجاب کی حالت دگرگوں رہی ہے۔ آج جس علاقہ کو ہم پنجاب کے نام سے منسوب کرتے ہیں، ستارہ جی اعتبار سے یہ علاقہ پہلی بار ۱۸۰۱ء کے بعد ہی ایک سیاسی اکائی کے روپ میں متحد ہوا۔

مشرقی ہلاکو، الٹے کی روشنی میں پنجابی زبان و ادب کا جائزہ

پنجابی زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود پانچ دریاؤں کی یہ سرسبز زمین ہے، ویسے وہ بزرگ گروہوں میں نسبتاً سترھویں کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔ قدیم ہندو دینیاتی ثقافت کی ابتداء سے لے کر اسلامی عالمِ اقسام کے دھڑلے عروج تک پنجاب کی دھڑکی سیسوں تہیز یوں کی آواز جگاہ رہی ہے۔

سیاسی اعتبار سے بھی جتنے انقلابات پنجاب میں رونما ہوئے، اتنے شاید ہندوستان کے کسی اور خطے پر نہیں ہوئے۔ پنجاب کے قدیم آباد کار 'دراوڑ' اور 'وارو' آریہ ایک وقت تک یہاں رہ رہ رہ رہ رہے۔ اس کے بعد ایرانی، پارسی، یونانی، باختری اور پارسی۔ یونانی، گزنائی، اسیری، ہونانی، اشک، گرج، سامی، جاٹ اور بعد ازاں محمد بن قاسم کی شیریں سترھ کے بعد سے افغان و منگول، تورانی اور ترکی اور کئی دوسری قومیں یہاں آئیں اور پاکا خر۔ یہیں بس گئیں۔ پنجاب کی جہاں قیام، اخلاقی اور مذہبی نشوونما میں ان سب کا گہرا اثر ہے۔

اس نوع کی سیاسی اہمیت کی کشمکش میں ایک عرصہ تک پنجاب کی حالت دگرگوں رہی ہے۔ آج جس علاقہ کو ہم پنجاب کے نام سے منسوب کرتے ہیں، ستارہ جی اعتبار سے یہ علاقہ پہلی بار ۱۸۰۱ء کے بعد ہی ایک سیاسی اکائی کے روپ میں متحد ہوا۔

مشرقی ہلاکو، الٹے کی روشنی میں پنجابی زبان و ادب کا جائزہ

جس ہندوی زبان کو مسلمانوں نے ہندوؤں اور ان کے مخصوص شمالی حصے کے باشندوں کے ساتھ بات چیت، اپنے دھرم، لکچر اور ادب کے پراپر کا ذریعہ بنایا۔ اس میں تصنیف اس وقت بھی کافی مقدار میں نثری اور مخبری ادب تخلیق ہوا ہوگا۔ مگر تاہم جو گویوں اور سندھوں کی بڑھتی ہوئی باتوں کے علاوہ کوئی اور ادبی سرمایہ دست یاب نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شمالی ہند کی اس بولی چال کی زبان میں جتنا عرصہ تخلیق ادب کی شروعات سب سے پہلے دیسی مسلمانوں نے کی۔

پنجابی کی اس ابتدائی شکل ہندوی کو جس مسلمانوں نے سترگوئی کا ذریعہ بنایا۔ ان میں سب سے پہلا نام 'مصدق ابن سعد' کا ہے جو محمود غزنوی کے پوتے ابراہیم سلطان کے دربار میں تھا۔ ۱۱۶۸ء اور ۱۱۸۰ء کے درمیان اس نے وفات پائی۔ حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء) کے سوا کو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوی میں بھی صاحب دلیان ناما ہے صاحب دیوان و عبارت ہندوی دپارسی 'آہم مسود کا ہندوی دیوان دستیاب نہیں ہو سکا اور اسی باعث اس امر کی سلسلہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ مسعودی ہندوی زبان کی شکل کیا تھی۔ مشہور ابراہیم سنائیٹ، ہم پند رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر سنیت کمار جیٹھی نے کہا ہے کہ بہت لمبی ہے مسعودی مسود کی ہندوی رسم جیسا شاید کی ہندوستانی کے مطابق پتھر یا رحوں میں لکھی گئی ہوگی۔ اس میں مرعہ 'اپ، ہرنش، ای، ری، ہی۔ اگرچہ آپ ہرنش' کا ادبی سلسلہ ترحوں ہندی تک چلتا ہے لیکن یا رحوں ہندی سے ہی آپ ہرنش، غلام سے دوہ معنی ادبی تعلیقات کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔ عام لوگوں میں جدید ہندوستانی زبان کا قدیم روپ ہی مرعہ رہا ہوگا۔ اس لئے فارسی کے عالم مسعودی اگر ہندوی میں شعر کہے ہیں تو بلاشبہ ہندو پنجابی یا ہندو ہی رہی ہوگی جو جدید پنجابی کی ابتدائی شکل ہے۔ اس کے بعد جب عربی ہند میں لاہور کی بجائے دہلی حکومت کا مرکز بنا تو اس زبان سے دہان پہنچ کر بسج جیسا اور دوسری زبانوں کے اثرات قبول کر کے بالآخر اس کی شکل اختیار کرنی۔

غزنیوں نے پنجاب پر ایک سو ستر سال تک حکومت کی۔ اس زمانہ میں لاہور پنجاب کا پایہ تخت بننے کے وجہ سے علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا تھا اور یہاں محدثوں سے علماء، فضلا اور صوفیاء کو ان کے رہنے ہو گئے تھے۔ غلام محمد شیخ شیردے نے اپنی تصنیف 'حدیقۃ الاسرار' میں اخبار البار' میں ایسے علماء و فضلاء کی ایک فہرست اور مفصل فہرست درج کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی سب سے عظیم شخصیت شیخ علی بن عثمان چوہدری کی ہے جو آخر عمر میں غزنی سے لاہور آ گئے تھے۔ انھیں کے مراد پرخواجہ حسین الدہشتی اور فرید الدین گنج شکر نے پتے لکھنے اور نظام الدین اویسی نے انھیں سے روحانی استفادہ حاصل کیا۔ شیخ اسماعیل لاہوری شیخ ابوالغی اور بہت سی دوسری بزرگ و بیدہ بستان اسی زمانے میں لاہور میں وارد ہوئیں اور انھیں کی بدولت یہاں اسلام پھیلنا ابتدائی عہد میں ہو گیا و عام طور پر تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے۔ لیکن ان کا اسلام محض افراد باللسان کا اسلام نہ تھا۔ ان کا طریقہ دسترس صرف و عذو و متاثرہ نہ تھا بلکہ خدمت غنی اور لوگوں سے محبت کا راہ قائم کرنا تھا پھر بھی اس دور کے بزرگوں نماز، روزہ اور دوسرے شفا پڑھائی پر بہت زور دیا ہے۔ پنجاب کے مونیانے ہندوستان کے دیگر حصوں کے مونیوں کو ان کی طرح خورج شروع میں ایک مدت تک فارسی کو ہی اہم دینیال کا ذریعہ بنائے رکھا اور فارسی میں تہذیب و تہذیب اور تہذیب ثابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ ابتداء میں ہندوستان میں تصوف پر لکھی جانے والی تمام کتابیں فارسی زبان میں ہی بنیں جن میں شمس المیرزا 'مکشف الاسرار' اور 'فتحنا الحارثین' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں نے ایک عرصہ تک متعوق فکر کو متاثر کیا ہے۔ ان ابتدائی تصنیفات میں فارسی اسلوب اور طرز نگارش، علم الحسد و اذ علم العیان کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن اس کے بعد پنجاب کے مونیانے و عذو تبلیغ اور اہل دینیال کے لئے مقامی زبان پنجابی کی طرف رجوع کیا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے خیالات سے فیض یاب ہو سکیں۔ حقیقتی اس بات پر

متفق ہیں کہ موجودہ پنجابی زبان کے جنم داتا بھی بزرگ تھے اور ان کی خالقیت ہی موجودہ پنجابی ادب کے وہ مراکز تھے جہاں سے موجودہ پنجابی ادب دو ہزاروں اور کافی کی شکل میں معرض وجود میں آیا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا کہ اس میں باقاعدہ نظم و نثر میں کما میں لکھی جانے لگیں۔ پنجابی زبان کی صوفی شاعری بلا مثال نہ پنجابی ادب کا عظیم ترین اور گراں قدر سرمایہ ہے۔ ان صوفی شعراء کے طبعیت ہی پنجابی زبان کو محنت اور اپنی ثروت کی سرپرستی کے بغیر ترقی و ترویج کے علاوہ کچھ کر کے ہی عفت کی بلندیوں سے روشناس ہوئی۔

چنانچہ اسی سلسلے میں تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر نے پنجابی زبان میں کلام کہا جس کی باقاعدہ طور پر پڑی میں لکھنے کی ابتدا پندرھویں صدی عیسوی میں شیخ ابراہیم فریدنائی نے کی۔ اس کے بعد پنجابی ادب میں صوفی شاعروں نے جتنی بہاؤ حاصل کیا ہے وہی اور اس کی ایک ششگل اور عظیم انسان رعایت ہے۔

اس سے پیشتر گجراتی کے صوفی شعراء کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں مناسب ہے کہ پنجابی کی صوفیانہ شاعری کی بعض اہم خصوصیات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے

مذکورہ بالا گفت کی روشنی میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ پنجابی ادب کی ابتداء صوفی شعراء سے ہوئی۔ ایک طرف تو ان صوفی شعراء نے جہت اور موضوع کے اعتبار سے پنجابی زبان کو بالعموم اور پنجابی شاعری کو بالخصوص بہت کچھ دیا۔ دوسری طرف تو ان صوفیوں کا کام نے پنجابی زبان، پنجاب کی معاشرت اور مقامی باشندوں کے بددعاؤں اور ان کے خیالات و رویات سے بہت زیادہ اثر قبول کیا اور بالآخر اپنی تمام اعتزادیت اور اہمیت کو گجراتی کے عنصری رنگ میں رنگ گئے۔ چنانچہ خواجہ فرید الدین گنج شکر اور فریدنائی کی شاعری میں اسلام کی تبلیغ واضح عت کے لئے جو ہنہنگ نظر آتا ہے، بالبد کے صوفی شعراء میں ان کا یکسر فقدان

ہے۔ بلکہ یہی قویہ ہے کہ بالبد کے صوفی شعراء نے اشاعت اسلام کی طرف سے تو کم کر کے ملک میں رائج اوقات مختلف مذاہب اور درجہ فلسفیانہ مسائل کی چٹان بنی اور تحقیق و استفادہ کی طرف خاص طور پر مشغول کر دی۔ حضرت میان میر اور ابوالفضل جیسے صوفیاء اور علماء اسی مدرسہ فکر سے نکلے ہوئے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ابوالفضل اور فیضی کے افکار و طریقت پر ویدوں اور پندتوں کے نفوذ سے بہت گہرے ہیں۔

شاہ جہان کے عہد میں خزاہہ دارا شکوہ کی سرپرستی میں صوفیانہ ہندومت و ویدوں اور پندتوں سے بڑی کشادہ دلی سے استفادہ کیا اور کافی اثر قبول کیا۔ ان صوفیانہ طریقت کوٹھ لور پر۔ خربیت سے الگی اور کسی مذہب افضل و برتر منزل قرار دیا اور شریعت اور اس کے شائستے واضح اخراجات کی جہل تک افکار اور کلام میں نمایاں ہے۔ نماز، روزہ و غیرہ ظہری رسوم کی پابندی ان خطرناک اور کوکے صوفیانہ مقابلہ زیادہ ہنہنگ و توجہ سے غیر اسلامی شاعری کی طرف رجوع کیا۔ اور لکھی، گرم اور اہنسا جیسے غیر اسلامی نظریات سے خاطر خواہ اثر قبول کیا۔ شاہ جہان اور تاج محل کی سرکار شاہجہان صوفیانہ انہیں غیر شریعی رہنمائی پر دلالت کرتے ہیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں شہنشاہ اورنگ زیب اور اس کے راستہ اعتقاد و رویوں کی تعصب اور تنگ نظری نے بہت سے صوفیوں کو شہنشاہ کی موت پر سیاسی سے بدلہ کر دیا اور وہ بھگت گرم اور ہندو سوادھو سنتوں سے زیادہ دل چسپی لینے لگے۔ ہندو صوفی شاعر جیسے شاہ اور ان کے مرشد شاہ جہانیت اسی دور کی پیداوار ہیں۔

الغرض پنجابی صوفی شعراء نے ہمیشہ مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو بلائے لائق رکھ کر مذہبی رواداری، کشادہ دلی، مختلف مذاہب کے اخلاقیات میں باہمی میل جول اور سماعت و اذیت کا پرچار کیا۔ یہی خصوصیات ہیں جو انہیں درجہ صوفیانہ سے مستزاد کرتی ہیں۔ اور تمام مذاہب کے ائمہ و اولیاء انہیں مقبول بنا تی ہیں۔ یہ رہنمائی

پنجاب کی سرزمین پر قسمت میں تھے، خاقانوں کا باعث بنے ہیں لیکن یہ ہر مونی کی شاعری اور اس کی تنظیم کی اہم خصوصیت قرار نہیں پاسکتے۔ کیونکہ اس مشورہ خصوصیت کے باوجود ہر ایک کا ایک اپنا شعراء رنگ اور مزاج لازم تھا، اس کے نظریات اور کلام پر غالب ہے۔

شریعہ لاجوئی رام کرشنا نے اپنے حقیقی متاثر Punjabi

Sufi Poets میں مونیاد کرام کو نظریات کے اعتبار سے تین

دبستانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دبستان ان مونیاد کا ہے جو بتدریج مذہب

کو فراموش خیال کیے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن مجید سب سے افضل

کتاب ہے جو مانتا تھا کہ انسان کی صلاح اور ہدایت کے لئے حضرت محمد

پرہیز گزینی، گو ان مونیاد نے مذہبی تنگ نظری اور کشتیا کا مظاہرہ

نہیں کیا لیکن انھوں نے اصل حقیقت کے لئے اسلام انداس کے اصولوں

پر ایمان لاتا لازمی قرار دیا۔ حضرت فرید الدین گدڑی کے مونی شاعر

علی حیدر، مونیاد کے اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرا دبستان ان مونیاد کا ہے جو مذہبی عملی طور پر مختلف مذاہب

کے اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت

ختم کر کے باہمی رواداری کی تلقین کی۔ انھوں نے ہندو مت اور دیگر

کالمذہب میں نہیں کیا بلکہ ان کے اچھے اُپدیشوں کو اپنے مونیاد رنگ میں

ایٹایا بھی ہے۔ جیسے خواہ اسی دبستان کا نامائندہ مونی ہے۔

تیسرا دبستان ان مونیاد کا ہے جو کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ

تھے۔ یہ نہ تو قدرت کی بکس انجمن میں آ رہے اور نہ ہی اس کے مسائل و

فلسفہ کا جیسے مطالعہ کیا۔ انھوں نے مختلف عقائد اور نظریات سے

چند سلی باتیں اخذ کیں اور ان میں کا پرچار کرتے رہے۔ بے لوگ اپنی

سیدھی سادی باتوں اور جملانہ و عامیانہ خیالات کی وجہ سے ہندوؤں

اور مسلمانوں کے بچے جیسے ہیں کافی مقبول ہوئے لیکن اس طرح کی مانی تعلیم

میں تعلق رکھتی، مٹا نہیں کیا۔ بے لوگ اُنٹا بعض جاہلانہ باتوں کو فراموش

دینے کا باعث ہے۔ انھیں مونیوں، فیضان اور پیروں کا دارت شاہ

نے بڑی مشہور تصنیف ”پیر را نیما“ کی زبان میں کافی طاق اُٹایا ہے

اور ان کی دیا کاراد کو ششینی کا پردہ چاک کیا ہے۔

پنجابی زبان کے مونی شعراء کے کلام میں ہیں ان کے جھلکی

سایہ اور مانتی حالات کی واضح جھلک ملتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے

دور کی عاشق کیفیات کا پردہ ہے اور یہ خصوصیت صرف مونیانہ

شاعری میں ملتی ہے۔ باوجود سادگانہ ذوق اور محبوب حقیقت کے جو یا

ہوئے کے پنجابی مونی شعراء نے دنیاوی عشاق سے کبھی مشابہت نہیں

کی۔ عام دنیاوی مانتی پر ان کی نظری ہے اور اپنے مانتا رنگ میں

وہ انھیں بیان کرتے رہے۔ علی حیدر، جیسے شاہ اور باہم کے کلام میں ان

کے دور کی سیاسی افراختی کے متعلق کافی اشارات ملتے ہیں۔

وہاں میں نشور و غبار کے دیر سے پنجابی مونیاد شاعری میں

اس وقت کی دیباچہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ دیبا

ہنایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اردو اور فارسی کی مونیانہ شاعر

کی طرح پنجابی میں بھی پرشکوہ الفاظ اور زار لڑکیاں استعارہ اور

اُچھے ہوئے خیالات نہیں ملتے۔ انھوں نے ہمیشہ سادگی اور سہولت

مستوروں کی اصطلاحات کو تہذیبوں اور استادوں کے استعمال کیا۔

فارسی کی مونیاد شاعری میں محبوب مجازی کے لئے ”مجنون“ ”دولت

تعلیمات“ آتی ہیں۔ لیکن محبوب مجازی کو موشگافہ اور موشگافہ طرز بانہا

گیا ہے۔ لیکن پنجابی میں اس کے برعکس صرف مذکر یا مذہب کا ہے اور

مونیانہ اپنے لئے موشگافہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے پنجاب

کی عوامی جماعتوں اور مشہور روایات داستانوں کے کرداروں کو بطور تعلیمات

کے برتا ہے۔ ان کے نزدیک عاشق حقیقت کی حالت پر و فرات کی ماری

مونی سستی، ہیرا و سرہن کی انگریز، جو ہمیشہ اپنے محبوب کی یاد میں

ترپ چہ رہیں اور آخر موت کے بعد بھی انھیں وصال نصیب ہوا۔ پنجابی

مونی شاعروں نے بڑی خوبی کے ساتھ پنجاب کی امیر روایات و داستانوں

کو اپنے مونیاد رنگ میں پیش کیا ہے اور عام بول چال کے الفاظ کو بھی

بڑے فن کارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ مقررے کو پنجابی مونی شعراء کے

پیش نظر ہمیشہ بات مہر کی ہے اور اپنے خیالات کے پُرکھوں اُجھار سے

لوگوں میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیداکریں۔ لہذا انھوں نے شاعری کے

فنی محاسن سے قطع نظر اس قصیدی پہلو کو زیادہ مد نظر رکھا۔

اصناف سخن

پنجابی کی مونیانہ شاعری کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اردو کی مونیانہ

اپریل ۱۹۶۲ء

مراد یہ ہے۔ پنجابی صوفی شعراء کے کلام سے متعارف ہونے کے لئے ہم تاریخی اعتبار سے پنجابی ادب کے مختلف ادوار کی ذیلی اس ہند کے اہم اور مشہور صوفی شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ لیں گے۔

ابتداءً دور - شیخ فرید الدین گنج شکر - شیخ ابراہیم فرید ثانی گوردوانہ مکمل - شاہ حسین سلطان باہو

مغل کال - بچے شاہ - علی حیدر - وزیر

آدھنگال (دور حیدر) - غلام حیدری - میران شاہ - خواجہ غلام فرید محمود بونا بگوانی - ہدایت اللہ - غلام حسین کلائی

منہم و فرہ

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر (۱۷۷۳ تا ۱۸۲۵ء)

پنجابی کے اولین شاعر حضرت فرید اللہ دہلوی ہیں۔ مگر قول ضعیف ملتان میں پیدا ہوئے۔ گوردونہ صاحب میں فرید کے نام سے جوادی (کلام) - شاعری کی گئی ہے اس کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اگر اہل الرائے اور ہونے اس کی روانہ دیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس میں گوردونہ کے ہم عصر حضرت بابا فرید کی بارہوی پشت میں حضرت ابراہیم فرید ثانی کا کلام بھی شامل ہے۔

مشہور تاریخی ان مشرکیات نے بھی گوردونہ سے شاعری فرید کے کلام کو فرید ثانی کی تخلیق ہی ثابت کیا ہے۔ حضرت فرید گنج شکر و شیخ ابراہیم فرید - دونوں نام اسی ایک تصدیق طلب ہیں۔ بہر کیف پنجابی شاعری میں فرید کو دوسری مقام حاصل ہے جو آخری بی بی یا سومر کو، فارسی میں ہمدانی کو اور اردو میں دلی دکن کو۔ آپ کا کلام عارفانہ رنگ میں ہے۔ فرید دہلوی اصل آدرش وادی اودھیا سیت پند شاعر ہیں۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہی ان کا مقصد ہے۔ اسی لئے آپ کی شاعری میں جذبہ کم اور اپدیش زیادہ ہے۔ پند اشعار طاعت پر فرمایا ہیں جانا کہ عجب کو، دکھ سیانی اسے جنت

نہجے بڑا دے دیکھا، گھر گھر ایسا آگ

دفرید! میں نے سمجھا تھا کہ دکھ اور تلخی میری ذات کو ہی ہے۔

لیکن یہ دکھ امداد و تسوی دنیا میں مشرک کہے۔ میں نے نظر غائر دیکھا تو مجھے ساری دنیا میں ہی آگ جلتی ہوئی نظر آئی

فرید کالے میٹھے کپڑے لالا میڈا لیس

گناہیں بھریاں میں پیران لوک بھس دھڑ

فرید! میرے پیرے کالے رنگ کے ہیں۔ میں میٹھا سیاہ لباس میں ہی میٹھے رہتا ہوں۔ میں گناہوں سے لدا ہجرتا ہوں اور لوگ مجھے دھڑلے کہتے ہیں

فسرید اگلے چکر دور گھرنال پیارے مینوں

چلائے پچھے کھل ران تان لٹے مینوں

اے فرید! گلی کی کوئی ہے، گھر دور ہے اور پیار سے دوست ہے۔ چلتا ہوں تو کھل بیگنا ہے، نہ چلوں تو دوستی ٹوٹتی ہے

باد و جان کے عارفانہ اپدیشوں اور زہد و ریاضت کی تپش کے حضرت فرید مری رسوم و شاعری کی پابندیوں سے باہر نہیں جاسکتے۔

”راحت اقبوب“ اور ”اسرار اللہ“ کے مطابق وہ خود بھی کچھ نمازی اور شریک آداب کے پابند تھے اس لئے وہ کہتے ہیں

فرید! ابے زانا کشتیا ایہ نہ بھی بیت

کب ہی چل نہ آسپا بچے وقت مسیت

اے فرید! تو بے نماز ہے تو کتا ہے۔ اور یہ بیت اچھے نہیں۔ خدا کی بیٹگی میں نماز اور کھلے تو پاؤں وقت مسجد میں نہیں آتا،

اور

اٹھ فرید! جو ساج مع فوج گزار

جو سرسائیں ناں تو ہے سومر کپ آمار

اے فرید! اٹھ کر دھوک اور دم کی نماز گزار۔ روز جو سر اس محبوب حقیقی کے آگے نہیں جھکتا، اے کاشکراتا دیکھنا چاہیے

حضرت فرید کے کلام کے کچھ ادا کرنے ڈاکٹر عبدالحی نے اپنی کتاب ”اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حلقہ“ میں دئے ہیں۔ خواجہ فریدی میں آپ کے کثرت و کرات اور ریاضت سے متعلق پوری واقفیت تھی ہے۔ آپ دلی کے مشہور بزرگ حضرت علقمادین بختیار کاکی کے مرید تھے اور آپ نے آخری فرسخ شگر کی قصبہ پاک پٹن میں گزار دی اور وہیں ۱۲۶۵ء میں وفات پائی۔ پنجابی کے علاوہ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

شاہد حسین ۹۹-۱۵۳۸ء

اسلام کے شرع سے واضح طور پر بناوت کرنے والا پنجابی
کا پہلا حریف شاہ حسین ہے۔ جس نے ۱۵۳۸ء میں احمد کے ایک
بڑے فوجی حلقے کے گھر پھیرا ہوا۔ دن برس کی عمر میں اس نے قرآن
حفظ کر لیا۔ دیکھا حضرت داتا گنج بخش میں اس نے متوفی کی تسلیم
پاؤں امداد ہر سال اس طرح گزار دئے۔ "غزیت الامنیہ" میں
درج ہے کہ وہ دن رات کی کتابیں پڑھتے بیٹھوں میں گھومتا رہتا اہل
کوشش علیٰ عزم و کوشش پوری کے مراد پر کھڑا تلاوت قرآن میں
مغلول رہتا۔ اسی مراد پر اسے ایک لڑتے احساس ہوا کہ اس نے
دینا ہی کو پایا ہے۔ اس کے بعد حسین نے مائیں کے تمام اصول
تلاک تاریخ کا شروع کر دیا۔ جس میں شرح ہاس پہنچا تھا اور داس
مورخہ زاد داتا گنج بخش نے اس سے گفتگو اور بے راہ روی نے لوگوں
کے دلوں میں شکوک پیدا کر دئے۔ مفتیوں اور تلامیوں نے اسے کافر
کہنا شروع کیا۔ حسین کی یہ فوجی فتوحات کو وہ ابھر کے بعد میں
ہوا ہے جو میں سے بہت تھی۔ دارا شکوہ کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے
کہ ابشر شاہ حسین کو جانتا تھا۔ جس کے کشت و کرامات سے تسلی کئی
افسانے مشہور ہیں۔ دارا شکوہ نے "شلیات" میں ان کا ذکر کرتے
ہوئے لکھا تھا کہ شہزادہ سلیم جو بعد میں جہاںگیر کے نام سے بادشاہ بنا
اس کی فرق احادیث روحانی طاقت اور تقدس کا بڑا قائل تھا۔

شاہ حسین کو مویا کے فرقہ ملا مین کا امام بھی جاتا ہے۔
گوکہ کڑا لاؤ تو جسے اپنی تعینیت میں انھیں قادری لکھا ہے جو غلط
ہے۔ حناۃ العارفین کا شاہیہ کوئی مہر نسو ڈاکڑ لاؤ تو کی نظر سے
نہیں گزرا۔ ہندوؤں کے ایک لڑکے کو مدھول کے ساتھ حسین کے والد
عشق کی کہانی بھی ڈاکڑ لاؤ جتنے سے بیان کی ہے جو بڑی حیرت انگیز
مادھو سلطان تھا جو کہ وقت حسین کا مرید ہوا اور بعد میں شہنشاہ
میں سے ایک اتان گیا۔ حسین نے ۹۹۹ء میں وفات پائی۔ اس کا مزار
لاہور کے قریب مانڈی پورہ میں ہے۔ جہاں ہر سال ہینتے کے دی
میل لگتا ہے۔

پیشیت شاعر شاہ حسین اپنی کافوں کی وجہ سے بہت

مشہور ہے۔ شاہ حسین کی کافیاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی
ہیں۔ چلیات عشق اور ہری کینیا کے انہماک کے شاہ حسین
نے ہنایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے تشبیہیں اور استعارے
باصوم و گھریلو زندگی سے لئے ہیں۔ اس کی کافوں میں شریعت کا عنصر
قالب ہے۔ ایک شہید لاف کا خلد ہے:

درد و پھر دے حال فی میں کینوں آکھان

سولان مار دوا فی کینت برہوں پیا نیال

فی میں کینوں آکھان ؟

جنگی جنگی چرمان و خون زدی ابے نہ آتیا میں نیال

فی میں کینوں آکھان ؟

و حق و حوٹیں شمایاں دے جان پھول تال تال

کے حسین خیر رہا دیکھ تانیاں داحال

فی میں کینوں آکھان ؟

دراپے درد ہر کال میں کے ستاؤں ؟ ان دکھوں نے مجھے دیوانہ کر دیا
ہے۔ ہرادی کے خیال نے مجھ پر تسلط جما لیا ہے۔ میں اپنا حال کے ستاؤں ؟

میں جنگی جنگی آوارہ پھرتی ہوں۔ میرا ہینڈل دھجھ (ابھی
تک نہیں کیا۔ میں اپنا حال کے ستاؤں ؟

سنگتی ہوئی آگ سے سیاہ و حواں نظر رہا ہے۔ جب بھی میں اس
ہنگ کو کر دیتی ہوں تو دیکھتے ہوئے شروع کر کے غلغلہ آتے ہیں۔

خدا کا فیض حسین کہتا ہے، ابے کسوں کے حال پر دم کر۔ میں اپنا
حال کے ستاؤں ؟

شاہ حسین کی دنیا میں کتنا اضطراب ہے جس کی طرح اس کی
شاعری میں متاف و مری ہے:

رونا مولے سو سونا

جس حق دردان دھ آہ سوئی تھ دونڈای

کڑی دی دیکھ سو اوپر

ٹھیکیا کوئی تال سو سونا

دھب و دھب دھاری کیا کرتا ہے۔ کبھی بھی انے نیند نہیں آتی

جس حق میں درد کی آہ بون ہو ہی تھ کریم و زاری کرتا ہے۔

کاٹوں کی اس سیج پر آج تک ملکی عینک کی نہیں سوسکا
شاہ میں خدا کو رانجا اور خود کو 'رانجے کی جوگی' کہہ کر پکارتے ہے
اپنے محبوب متیق کی رہ ادیشا ہنگی سمجھتا ہے
رانجے بیڑا میں رانجے دی
پیر دیاں دن کوڑی جھاک
وگ جانیں میر کی موٹی
ہیرے دا ور پاک

د رانجا میرا ہے اور میں رانجے کی جوگی ہوں۔ ان پیر دیاں کو خواہ مخواہ
کی جھوٹی امید کی ہے۔ وگ سمجھتے ہیں کہ پیر دیاں ہی ہے مگر میر کا سہانگ
کو رانجا جھاک (چروانا، اسی ہے)

مژدہ اور دل کش سلوک اور موسیقی ہی شاہ میں کی کافروں کی
جان ہے۔ محبوب کے فراق میں سویر جوگی کی اضطرابی کیفیت دیکھئے،

سہن بہن راناں ہو گیاں وڈیاں
مانس جھڑ پھر ہو گیاں گھن گھیاں ہڈیاں
مشت چھیا یا چھپا تاہیں برہن تھاون گڈیاں
رانجا جوگی میں جو گیاں فیہر کہ چھڑیاں
بکے میں فیڑ ساش دا ترے دامن گیاں

(سامجے کے فراق میں راتیں بھی ہو گئی ہیں۔ جسم سو کہہ کر ڈھانچے
رہ گیا ہے۔ ہڈیاں تو کٹاؤں ہیں۔ مشت کو لاکھ چھپاؤے نہیں چھپتا۔ فراق
نے اپنی طمانی ہو گئی ہے۔)

رانجا جوگی ہے اور میں اس کی جوگی۔ اس نے مجھ کیا کر دیا ہے
خدا کا فیڑ شاہ میں کہتا ہے۔ اب تو میں نے تیرا دامن چھڑ دیا ہے)

سلطان باہو (۹۰۰-۱۶۲۹ء)

شاہ میں نے بھی زودہ حیات آئیز اخلاذ میں اسلامی مشرع
سے بنات کر نے والا صوفی شاعر سلطان باہو ہے جو ۱۶۲۹ء میں فتح گنج
کے مقام آٹاں میں پیدا ہوا۔ اس کا مراد شاہ پوٹ کے قریب ہے سلطان
باہو کے ابا دادا جواد اپنے علاقے میں بہت با عزت سمجھے جاتے تھے۔
پہلے چر شاہ جہاں نے انھیں جاگیر عطا کی تھی۔ سلطان باہو کا پنجابی
کلام جو متروک بہت دست باپ ہے وہ اس کے سجادہ نشینوں کی وجہ

سے ہے جو اردو گو کی دیہاتی آبادی اور ان کے مریدوں کو اپنے پیرو
مستاف رکھتے تھے۔ باہو کے سواخ نگاروں کا بیان ہے کہ اس نے
عربی فارسی میں کوئی ایک سو پانچ سو چھٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔
اس کی شاعری میں باہو دو اداسی، مساوات، نفس کشی اور خود شناسی
کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نے محبوب متیق تک پہنچنے کے لئے مرشد کی
اہمیت اور عقیدت پر خاص زور دیا ہے اور خود اسی دنیا میں رہنے کی
آمد کو ہے جہاں میں 'اور' میرا کے بھیڑے نہ ہوں۔

باہو کی سی حرفیوں کا ہر مصرعہ لفظ بہ لفظ جو اللہ کے لئے استعمال
ہو سکے، ختم ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری میں یہ طرز سلطان باہو کی ایجاد
ہے۔ باہو کا انداز بیان سادہ اور بے تکلف ہے۔ زبان جنگل کے گل
کی پنجابی ہے جو اپنی شیرینی اور لطافت کے لئے شہر ہے۔ سلطان باہو
کی ایک سخیل سی سرف کے کچھ بندہ اس طرح فرماتے۔ 'ظاہری رسوم و خشاثر
سے گریز کرتے ہوئے اس نے محبوب متیق کو ہی ہشتاںے معنوق قرار دیا ہے۔

ن۔ نہیں عالم، نہیں فاضل، نہ مفتی نہ قاضی ہو
نہ دل میرا دوزخ بنکے نہ عشق بہشتی راضی ہو
نہیں ترسے دوزخے رکھے نہیں پاک نمازی ہو
نہاں وصال اللہ سے باہو دنیا کوڑی بازی ہو

د نہیں عالم ہوں نہ فاضل نہ مفتی نہ قاضی میرا دل دوزخ بن گیا ہے
اور نہ عشق بہشتی پر راضی ہے۔ نہ میں نے تیس دوزخے رکھے نہ میں
پاک نمازی ہوں۔ اے باہو اللہ کے فیڑ دنیا جو تھیں گیل ہے)
سلطان باہو کا پنجابی کلام بہت کم ملتا ہے جو صرف چند سی حرفیوں
پر مشتمل ہے۔

پہلے شاہ (۱۵۵۲ء-۱۶۸۰ء)

پہلے شاہ کا شمار شفقہ گو پر پنجابی کے سب سے بڑے صوفی
شرا میں ہوتا ہے۔ پہلے شاہ ۱۶۸۰ء میں تیسرا قصور کے مقام پانڈوی
کے ایک شیعہ گھر میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل کرنے کے بعد
لاہور آ کر پہلے اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت عنایت شاہ
ارائیں قادری کا مرید ہو گیا۔ شاہ عنایت چھوٹی ذات کے فقیر ہونے کے
باوجود بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ پہلے شاہ کو ان کا فیض تربیت

طا اور وہ اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود شاہ عنایت کا حصہ لیا۔
گرویدہ و شیشترہا جیسے شاہ کی شاعری کو تین اصداد میں تہہ تہ کیا جا سکتا
ہے۔ پہلے 'دوریں وہ محبوب حقیقی کی تلاش میں رہتا ہے۔ دوست و دُور
میں اسے کبھی محبوب حقیقی کا جلوہ نہ آتا ہے اور تیرا دُور وصال کا
منہر ہے۔ جیسے شاہ نے بڑے عام فہم اسلوب میں زندگی کی حقیقت ترین
حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ یہ یقینیتیں ہیں کہ اس کے ذاتی تجربہ اور شاہد
کے باعث آشکار ہوئی ہیں اس لئے ان میں تاثر بھی ہے اور اہلما بھائی
کی دل کشی بھی یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے جیسے شاہ پنجاب کے
دوسرے صوفی شعراء سے مختلف ہے۔ وہ پنجابی کردار کی اس معنوی
نزدہ اور ایسا کردہ ذہنیت کا نمائندہ ہے جس میں ہر ذاتیت کم اور
حقیقت پسندی زیادہ ہے۔ جیسے شاہ کی کا فیاں آج بھی بہت مقبول
ہیں اور قاریوں میں اگر کافی قاری ہیں۔

جیسے شاہ کی کا فیاں عہدِ ہمدردی پر کئی شہادت ہیں۔
اس نے بلا امتیاز رنگ و نسلی اور مذہب ہر فرد میں اسی ذاتِ تریاقی کو
جلوہ کر پایا۔ ایک کافی ملاحظہ ہو:

کہتے تھان ہو بندے ہو کہتے سقت فرخ دیندے ہو
کہتے نام دانی دیندے ہو کہتے تھانک لگاؤ دا
ہم کی قیاس آپ چھپائی دا

بندہ راہ میں گنہگار دے لٹکا چڑھ کے ناد مجا دے
کہتے دا بن عا ہی آ دے واہ واہ رنگ و ثانی دا
ہم کی قیاس آپ چھپائی دا

جیسے شاہ مروت کے لئے حاجی طایلیں ہی اس محبوب حقیقی کے
جلوے نہیں دیکھتے بلکہ اس کے نزدیک بندراہ میں گامیں چرانے والا
درگزر ہے اور لٹکا بن ناد بنانے والا درام، بھی اسی ذاتِ باری کا
پیر تو اور منہر ہے۔ انھیں ہر رنگ میں اسی کے جلوے نظر آتے ہیں۔

سیوہن ساچ میں پائیوئی

ہر ہر دے وچ سا بیوئی

(اے میری سہیلیاں میں نے اب محبوب کو پایا ہے۔ اب وہ
'ہر' میرے دل میں سما گیا ہے)

جیسے شاہ کی کا فیاں میں ادب کی چاشنی اور تائیر کی خردانی ہے۔
ان کے ابیات دل و دماغ کو متاثر کر کے بغیر تہیں رہ سکتے۔ جیسے بڑی
بے غریبی اور ۱۷۵۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

علی حیدر (۱۷۷۷ء - ۱۷۸۰ء)

علی حیدر جٹان کے قصبہ 'تاضیر' میں ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا۔
اس کی زندگی کے حالات تقریباً طور پر نہیں ملے۔ علی حیدر نے زیادہ تر
سی جڑیاں لکھی ہیں جن کی زبان ملتا ہے کہ اس میں غریبی فارسی کے
انفاذ پر کڑت استعمال ہوئے ہیں جس سے اس کی علمیت صاف جھلک رہی ہے
اس کی سی حرفیوں کی زبان بڑی مرض اور پُر تاثر ہے۔ علی حیدر نے
مروت و شیشترہا حقیقی کہتے ہی نہیں الاچلے بلکہ اپنے گرو و پیش پر بھی
اس کی نگری نظر رہی ہے۔ اس کے جہد میں نادر شاہ کے حملے اس کے
ہم وطنوں کو سن طرح تہہ تہہ کیا تھا اس سے وہ تڑپ اٹھا اور بدھوئیوں
کو جھنجھوڑتے ہوئے اس نے بڑے طنز و انذار میں کہا:

بہ کہ نہیں جو کھارک کچھ سترم دہندوستانیوں فوں

کیا حیا نہیں انہاں راجاں فوں کھلے نہیں تو رانیوں کو

بھڑے بھر ہر دین خزانے اپنے فارسیاں خراسانیوں فوں

دارحیاں چائمانیاں لکھو حیت ہے انہاں زانیاں فوں

(کہیں نہ رہی نہیں کہ کھارک رہا میں۔ ان ہندوستانیوں کو شرم نہیں آتی
نہ ان راجاؤں کو حیا ہے اور نہ تو رانیوں کو کچھ عزت کا پائاس ہے۔ کم نبت
فارسوں اور خراسانیوں کو بھر بھر خزانے دے رہے ہیں۔ ان لوگوں
نے تو دارحیاں منڈوا رکھی ہیں۔ ان مردمان عورتوں پر حیت ہے)

تورانیوں کا اشارہ نظام الملک کی طرف ہے جو نادر شاہ سے
مل گیا تھا اور فارسی و خراسانی نادر شاہ اور اس کی افواج ہیں۔
علی حیدر کی مروت گریس حرفیوں میں اسلامی رنگ زیادہ ہے۔

ناظم

ناظم کے حالات زندگی سے متعلق بہت سی متضاد باتیں مشہور ہیں
لیکن اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ اہر تہر کے ایک گاؤں جگر پو
میں ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوا اور ستر سال کی عمر میں ۱۸۲۳ء میں انتقال
کیا۔ ۴۰ سال کی عمر میں اس نے فارسی اور عربی پر عبور پالیا۔ باپ کی

وفات کے بعد گاؤں والوں نے اس کی صوفیانہ صلاحیتوں کے پیش نظر اسے نکر حاشیہ سے آزاد کر دیا۔ اس کی شاعری کی شہرت چوتھی عمر میں نمود تک پہنچی تھی۔ ڈاکٹر مونس سنگھ لکھتے ہیں کہ بعد میں وہ ہمارے رجحانیت سنگھ کا درباری شاعر ہو گیا تھا۔ ہاشم نے پنجابی، فارسی اور ہندی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی تصانیف کی فہرست اس طرح ہے:

فارسی: غزلیات و قصیدہ یوسف زلیخا

ہندی: گیان پرکاش اور چند دھڑے

پنجابی: قصہ سوہنی سمیڑال - قصہ سہی پٹوں - قصہ شیریں فرما

سحر جی: دوہڑے - ہیرا پنجا - چند قصیدے - پانچ

سی صوفیانہ اور گدگدی رسم الفک میں علم القلم پر

چند کتابیں۔

ہاشم کی تصنیفات میں کسی پتوں اور دوہڑے سب سے زیادہ

مشہور ہیں۔ ان میں جذبات کی شدت اور غلوں ہے۔ الفاظ کا انتخاب

موثر اسلوب اور بلند خیالی اس کی خصوصیات ہیں۔ ہاشم کی سستی کا

ایک نمونہ میں سستی کو جھلکتی ہوئی ریت پر سرگرداں دکھایا گیا ہے

طا حطہ ہو:

چمکی آن دو پہسراں ویلے گری گرم بہارے

تپیدی دادگی آسافوں پچھی آن آتارے

آتش دادریا کھسوتا تھل مارو دھج سارے

ہاشم پھر پچھان مڑی ٹوں ٹوں پڑوں ٹیکارے

دوہڑے کے وقت گری خوب چمکی تپتی ہوئی ہوا چلی جس نے آسمان

پر نہ دیں گدگدایا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے آگ لا دیا ہو یہی مارنا ہو۔

ہاشم ایسی واپس نہ آئی، اور اس کے بڑی دلیلیں سے پتوں پتوں

کی آواز آ رہی ہے

ہاشم کے بعد پنجابی ادب کے مودر حیدر کا آغا نہ ہوتا ہے۔ اس

دور میں ویلے نہ بہت سے صوفی شاعر ہوئے مگر ان کے کام میں کوئی

جدت نہ تھی۔ اس نے وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے۔ ان میں چند نام یہ

ہیں: غلام جیلانی لائی پوری، میراں شاہ جامنہری، غلام حسین

معلوم، اکرم علی، محمد یونس بکسراتی، کریم بخش وغیرہ۔

الہ آباد صوفی شاعر ہیں اور درام قابل ذکر ہیں: میان بدلت

اور خواجہ غلام فرید۔ دور حیدر کی صوفیانہ شاعری میں ان دونوں شاعر

کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

میان بدلت الہ آباد

ایسویں صدی کے وسط میں غازی لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے

دو بیٹوں کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے محل چاچڑاں میں پیدا

درزی کا کام کرتا تھا۔ ہدایت اللہ نے زیادہ تر دوہڑے اور سرسرقاں

لکھی ہیں۔ اس کا ایک بارہ ماہ بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ بارہ ماہ کا

ایک بندل خط ہو:

ماگھ پھینے مایا باہوں جو کچھ میں سنگ سیتی ہے

شالادشن نال نہ بوسے مجھی بچھوٹے کیچے ہے

کو کلدانگ جان تھادی پڑ عشق نے ریتی ہے

جانن اوہوگی ہدایت نہ ہر عشق میں مچے ہے

دماگھ کے ہمیشہ میں دوست کے فراق میں جو کچھ پھر رہی تھی تہ خزانہ

کرے دشمن کے ساتھ وہ ہو جو فراق نے میرے ساتھ کیا۔ مجھے نصیب

کی جان کو لھو کی طرح عشق نے پس دی ہے۔ اسے ہدایت: یہ بات دی

جانے ہی جنھوں نے عشق کا زہر پیلا ہے

۱۹۲۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔

خواجہ غلام فرید

صوفیانہ شاعری کے دور حیدر میں سب سے اہم شخصیت

دیا ست بہاول پور کے خواجہ غلام فرید کی ہے۔ تعارف اور شاعری

دونوں میں آپ کا مقام نہایت بلند ہے۔ خواجہ فرید ایک متبع عالم کے

ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبہ صوفی بھی تھے۔ آپ نے لمبائی زبان

میں جو پنجابی کی ہی ایک شکل ہے کافیاں لکھی ہیں۔ آپ کی کافیاں

لفظ زبان اور حسن اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں۔ سانی کے ہتیار

سے ان میں بڑی جاہلیت اور گہرائی ہے۔ موصوف کوچل کے خود

بھی موسیقی میں بڑی دسترس تھی اس نے اپنی کافیاں میں تڑم پیدا

کرنے کے لیے آپ نے کافیاں میں کچھ نئی اختراعات بھی کی ہیں۔

خارج فرید کے متاثرہ کے ملائی میر دا شکل کے توزع، رنگارنگ اور اخلاق کے پس پردہ دی، حسن واحد، لافراسے جوت نے روپ بھرتا ہے۔ کبھی رانجے، کبھی ہیر اور کبھی کیڑوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی بریا کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے تو کبھی طاہر کی رانجوں میں اٹتا ہے۔ کبیں ہوا زود ہے کبیں محاشیں اور کبیں فریاد برس۔ یہ یوگونی اور کثرت صفت ایک قریب فکر ہے ورنہ یہ جیستہ ستور دیدہ بننا کسے ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ان کی ایک کافی:

سب میت پرچ و سدا ڈھولامی دل ساڈی کسدا ڈھولامی
رنگ برنگی اس دے ڈیرے آپے لاپچے آپے میرے آپے کیڑے
”کب چھپ جیبتہ دسدا ڈھولامی
آپے بھرتے آپے میلا آپے قیس تے آپے سیلا
تپ آواز برس دا ڈھولامی

دہر صورت میں محبوب رہتا ہے اور ہمارا دل چھپ لیتا ہے۔ اس کے رنگ رنگ کے ٹھکانے ہیں۔ وہ خود ہی رانجھا ہے، خود ہیر اور خود ہی کیڑا۔ محبوب چھپ چھپ کر اپنے جیبتہ پوشیدہ رکھتا ہے خود بھر ہے اور خود وصال۔ خود قیس ہے اور خود ہی سیلا ہے۔ یہی محبوب خود آواز برس (یوگ) ہے

خارج فرید کے لیے شاعر اشعار سادہ اور بہار کے موضوع پر یہی۔ لیکن اس طرح کا خود خارج فرید قدرت کے اس دل کش منظر کا حقدار ہے۔

آپ کے کلام پر سندھی کا بھی کافی اثر ہے۔ پنجابی کافیاں اور دوہڑوں کے علاوہ آپ نے ہندی میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں جن میں ہندو راجن اور کرشن جی سے عقیدت کا جا بجا اظہار کیا ہے۔

پنجابی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا اثر اتنا گہرا ہے کہ بسا اوقات رومانی اور قہمت گو شعراء بھی صوفیانہ رنگ میں بہت کچھ بھر جاتے ہیں اس لیے لوگ انھیں صوفیہ و خیال کرتے ہیں اور ان کے رومانی قہمتوں اور عشقیہ کلام میں تفاوت کی باریجیاں

تلاش کرنے کی تاام کوشش کرتے ہیں۔ خود وارث شاہ اور میر کے ساتھ یہی سلوک ہوتا آیا ہے۔ وارث خا نسبتاً ایک حقیقت پسند رومانی شاعر ہے۔ صوفیہ دے کے گڑھے میں اس کا کوئی قلعہ نہیں بلکہ وہ تلاؤں اور پردوں فیردن کا مذاق اڑاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض جگہ صوفیانہ رنگ اس کے کلام میں جھلکتا ہے جس سے تعداد اور متقن۔ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ آج کی پنجابی شاعری میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوان نے بھی صوفیانہ شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں لیں آزمائی کی ہے۔ پردہ فیسروں پہن سنگھ ماہر اور پرچہ جوت کد کی کئی نغموں پر صوفیانہ شاعری کا اثر صاف جھلکتا ہے جو بری حد تک تپتے کی دلیل ہے۔ ان کی کئی نغموں جیسے شاہ اور شاہ حسین کی کافیاں کے ٹپ کے مضمون کے طرز پر لکھی گئی ہیں تاہم تپتہ پنجاب نے صوفیانہ شاعری کی اس مفیم اور مستقل روایت کو معدوم کر دیا ہے۔

اس معنوں کے لیے ’مذہب ذلی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے

The History of Punjabi Literature | ڈاکٹر موہن سنگھ دیوان

Punjabi Sufi Poets - ڈاکٹر لاہوتی راما کرشنا

The Sufis work in the early development ۳

of Urdu Language. ڈاکٹر مولوی عبدالغنی

۴- صوفی مت۔ سادھنا اور ساسنیہ۔ ڈاکٹر رام پوجن تیواڑی

۵- اُتر بھارت کی سنت پریمیا۔ پریشورام چترودی

۶- بھارتی آریہ ہاشا اور ہندی۔ ڈاکٹر سنیت کمار چٹرجی

۷- حسنا آغا خان (ریشلیات) اردو ترجمہ مولوی محمد رفیع اللہ

۸- تحقیقات حشیق۔ مولوی ذرا محمد شمس لاہور

۹- باغ اولیاء و ہند۔ مولوی محمد دین لاہور

۱۰- پنجاب میں اردو۔ پروفیسر محمود شرانی

۱۱- پنجابی ادب۔ محمد سرور کرکراچی

۱۲- کلیات جیسے شاہ۔ شائع کردہ پنجابی اکادمی لاہور

۱۳- شاہ حسین۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوان (امرت سر)

موسیقی کی ڈائری کا ایک ورق

ان فن کا دونوں کوننا کو میری آتش شوق اور بھڑک اٹھی۔ اس سے پہلے مجھے اتنا ہی معلوم نہ تھا کہ گانے کے کتنے ڈھنگ ہوتے ہیں اور یہ کتنے رنگوں میں گایا جاتا ہے۔ ہری پور کے سیلے میں مختلف فن کاؤں کی گائی سن کر میری آنکھیں کھلیں اور موسیقی کی اس بے پناہ وسعت کی جھلک پا کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں کچھ ایسا کہو گیا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل معلوم ہوا کہ ان میں سے کون سی گائیگی کو اپنانا چاہیے۔

ہندوستانی موسیقی کی اس عجیب و غریب دنیا کو دیکھ کر میری آنکھیں توجہ ہو ہی چکی تھیں، اس کے ساتھ ہی اس کے ایک عنصر پہلو نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔ مجھے پہلی بار ہندو مسلم امتداد کی حقیقت کا احساس ہوا۔ میں نے مسلمان استادوں کے ترتیب شدہ ہجو فرمیشن بھیگے کے خیالی اور دیوی کی استی کو سنا۔ جن سے ہر پروردہ عزت و معیت کا اظہار ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے چیتو خان نیرخان کے ترتیب دیے ہوئے میاں کی ڈھڑی کے خیال کو مشہور موسیقار امان علی خاں کی زبان سے سننے کا موقع ملا جو برسوں میرے دروڑاں رہا اور جو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

اے سی۔ اے۔ اب گن وے، بے دیوی

دیاں بھوانی سکل پگ مانی

میشا سر بروئی دیوی درگا، شادرا سر سوتی

اب و ر دے

یہ تو میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جہاں دور دور تک موسیقی کا لونی ذکر نہ تھا۔ لیکن مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو موسیقی سے قدرتی لگاؤ تھا۔ ہم دونوں مل کر پہلے کے ریکارڈ سننا کرتے، دوران کے گانے کی نقل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی مجھ سے اچھا گایا تھا اور لوگ اس کے گانے کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس سے مجھے میں رشک کا جذبہ پیدا ہوا اور پھر میں نے بڑے ذوق و شوق سے اپنے گھر پر گانے کی مشق شروع کر دی، اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی ہوئی۔ میری ماں گانے بجانے کے بہت خلاف تھیں مگر وہ یہ خیال کر کے چپ ہو جاتی تھیں کہ یہ محض بچوں کا کھیل ہے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ میں موسیقی کو ہی اپنا پیشہ بنانے والا ہوں تو یقیناً وہ اس بچوں کے کھیل کو کبھی گوارا نہ کرتیں۔

اس طرح میرا شوق روز بروز بڑھتا ہی گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری تویر پڑھائی سے ہٹتی گئی اور جس بھائی کو دیکھ کر مجھے موسیقی کا شوق پیدا ہوا تھا وہ تو اس سے باز آگئے اور اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو کر ڈاکٹر بن گئے، مگر میں اسی کوچے میں سرگوداں رہا اور آج بھی ہوں۔

بچوں میں ہری دیو کا میل بہت مشہور ہے جہاں دور دور سے موسیقار اکٹرا کر سننے اور بچے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چھپ چھپ ہی مجھے اس سیلے میں جانے کا موقع ملا اور جب میں نے

اسی طرح بہت سے ہندو استادوں کو حسن اور حسین کے گٹھ گاتے بنا۔ ایک ایسا ہی ٹوٹی کا چھوٹا خیال ہے:

الٹ جانے مولا جانے غنی پر لور ہوس رہو

چمک ہیں حسن حسین چین دو

بغ تن پاک دوازدہ امام کچھ عاجز یہ کرم کرو

کرو پاک پروردگار سائیں

دلچسپ استغاثوں کی ایک بہت بڑی تعداد بڑگانہ میں

سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان استادان فن کی بڑی

دین ہے۔ اور موسیقی کے خزانے میں قابل رشک اضافہ۔ اس

کی دو مثالیں میرے پیش نظر ہیں۔ ایک تو خراجہ بردرو کا ترتیب

دیا ہوا غنائی ٹوٹی کا خیال ہے۔ جسے میں نے اپنے استاد سے

سیکھا تھا۔

جاگوں الٹ رنگ لاگے ہے چوپا چھے پانچے پتھر زرد

چلو دل دل دیگیں کون ہے خواجہ بردرد

جن بھوک پیاس مار لکھی سوکھت چمک میں مرد

کچھ ہوت سوئے دن کچھ ہوت جسد

اور ایک دوسری چرن پورن کی بھائی ہے جو حضرت خواجہ نظام الدین

اولیاء کی شان میں ہے:

یا محبوب الٰہی میر جیستی حضرت سلطان المشائخ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء

کرتار آپ بنا پور سے معمور

صورت سجائے یا در زری زریں

آج بھی ہندو مسیقار اسی عقیدت کے ساتھ یہ دونوں بڑے خیال

گاتے ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں ہندو اور مسلمانوں کی یہ یک جہتی کوئی نئی

چیز نہیں بلکہ سیکڑوں سال سے چلی آتی ہے۔ مثلاً بہت دنوں پہلے

ہندو دین کے بھجنوں سے پورے شمالی ہندوستان کی فضا گونج اٹھی تھی

مشہور بھی ہے گووند نے گوپال اب کی بادیا لکرو' کی آواز آج بھی

سینکڑوں گھروں میں صبح سناؤ دیتی ہے۔ ایسے ہی امیر خسرو کی

مثال ہمارے سامنے ہے۔ موسیقی کو ان کی جودین ہے وہ آج بھی اسی طرح

قابل قدر سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت اس ہندو مسلم یک جہتی کا جو احساس تھا وہ آج بھی ایک زبردست حقیقت کی طرح قائم ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں مجھے ہندو ادکارا تھاکھٹا کر کو بھی سننے

کا موقع ملا۔ اور ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ چند سال تک میں نے

ہندو ادکارا تھاکھٹا کر کی ٹائی کی کو اپنا لے کر کوشش کی۔ لیکن جب

میں دلہن چنر ویدی سے متاثر ہوا تو میں دوسرے رنگ میں

آ گیا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت تک میں اپنے لئے کوئی مخصوص راستہ

مقرر نہ کر پایا تھا۔

پھر حال اس وقت تک میرے گھر واوں کو یہ نصیحتیں ہو چکی تھیں

کہ میں موسیقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے چکا ہوں

اس وقت موسیقی کے محنت راتے میرے سامنے تھے اور

میں گویا چوراہے پر کھڑا تھا یہاں میرے لئے پانچوں راستے کھلے ہوئے تھے

کہ کون سا راستہ اختیار کروں۔

دلہن چنر ویدی سے میں متاثر ہو ہی چکا تھا، اس لیے

نے بہت کچھ سیکھا۔ مگر مرتبہ میں نے سواستین شک کا کام لیا تو ان

سے سنا۔ تان ان کی ایسی تھی جیسے ریت کی دھار۔ ان کا پڑھتے کا

ڈھنگ پیچیدہ تھا۔ اور ان کی گائیے کے نظام کو سمجھنا کوئی آسان

کام نہ تھا۔

اس وقت اور بھی بڑے بڑے استادان فن موجود تھے اور

ان میں ہر استاد اپنے میدان میں یگانہ روزگار تھا جیسے کرامت کے

استاد عبدالکریم خان، مشتاق علی خان، پیارے خان، بے بے خان،

مبارک علی خان، دلی کے استاد عبدالکریم خان، استاد رجب علی خان

اور استاد فیاض خان وغیرہ۔ موسیقی سے دل چسپی رکھنے والا مشکل

ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے استاد عبدالکریم خان کو نہ سنا ہو۔ یہاں

تک کہ جنوبی ہند کے لوگ بھی ان کے گاتے سن کر متاثر ہوئے بغیر

نہ رہ سکے۔ — خان صاحب نے بھی بہت سے کرناٹک راگوں کو

ہندوستانی موسیقی کے سانچے میں ڈھالا اور مدح کیا۔ تاریخ میں

یہ موقع بہت دنوں کے بعد آیا تھا کہ جنوبی اور شمالی ہند کے مابین

موسیقی کے میدان میں یہ نہیں دیں ہوا۔ استاد عبدالکریم خان کا مقصد

امانزیہ تھا کہ جب وہ شپ کے سارے پر جا کر بھرتے تو ایک ایسی پسکو کیفیت طاری ہوتی جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

میں نے استاد عاشق علی خان کو ہنگ کو بھی اپنے لے کر کشن کی۔ عاشق علی خان صاحب اتنے خوش گزرتے تھے کہ ان کو اپنے مخصوص امانزیہ میں ہی پڑی قدرت حاصل تھی۔ ایسی روکھی آواز اور اس پر ایسا بڑے تاثیر گنا، اس کی مثال ملنا مشکل ہی ہے۔

دلی کے استاد عبدالکریم خان قوال چوں کی گائیگی کے ماہر تھے۔ اسٹائی انٹرس کے آثار چھوڑ دی تھیں کمال حاصل تھا۔ اسی طرح استاد جب علی خان بھی ایک مشہور موسیقار تھے۔ وہ اتنا تیار گانگتے تھے کبھی دھمی سے نہیں گانا شروع نہ کرتے تھے بلکہ دھم کے میں شروع ہو کر مدت میں آ جاتے تھے اور گھنٹوں لگاتار تاؤں کی پھر ہوا ہوتی رہتی تھی۔

اگر وہ گھرانے کو چار چاند لگاتے وہ استاد فیاض خان کو گس نے دستا بول گا۔ انھوں نے موسیقی کو ایک ڈھنگ دیا جو اپنی سہلیت کو کھوئے بیچرام لوگوں میں مقبول ہوا۔ 'ہودی دھار' کو، انھوں نے ایسی شکل دی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ خود قوم کے الپ کا جواب ہی نہ تھا۔ ان کے طرز ادا پر لوگ سر دھتے تھے۔ شٹان کی گائی ہوئی ہمدردی کی بھری 'بناؤ بیتاں چلا کرے کو جھوٹا یا منٹ بھاگ کا خیالی،' بھی جیسے پائل ہے' زبان زد عام و عام ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں مجھے کرانہ کے استاد عبدالوہید خان کو بھی لاہور میں تنے کا موقع ملا۔ اس وقت میں نے پورے خیال 'یاد آؤں گم لگا' سنا۔ اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ پورے رانگی کے 'خود رس کی' کیفیت طاری ہے۔ خان صاحب کے گانے کے امانزیہ میں عبادت کا حس ہوتا تھا جس سے یہ معلوم ہوا کہ موسیقی کا اصل مقصد یہ ہے۔ ان کے شمر کے لگاؤ میں عدا کا عنصر پایا جاتا تھا۔ جس سے ایک قسم کا روحانی سکون حاصل ہوتا تھا۔

اس زمانے میں گوئیہ عام طور سے کچھ دیر بعد ہی شپ پر چلتے تھے مگر استاد عبدالوہید خان نے اس طرز کو بدل ڈالا اور گانے میں ایک عجیب و غریب مہر اور پیدا کیا۔ ان کے ان الپ تاؤں کی جیت

راگ کی بڑھت بول اور بھلا دے میں ہوتی تھی۔ اور ہر شری جلا گاند کیفیت پوری طرح عیاں ہو جاتی تھی۔

اب میں نے سمجھ لیا تھا کہ مجھے اپنے راستے کا نشان مل گیا ہے۔ میری تلاش پوری ہوئی اور میں جو بس گھنٹے اسی طرح میں رہتا کہ میں کیے ان کا شاگرد بنوں۔ استاد کے رد قیہ سے مجھے اذعان ہو گیا تھا کہ ان میں اس بات کا ذرا بھی شک نہیں کہ شاگردوں کی تعداد بڑھانی جائے پھر نہ میں کوئی پیشہ و معاملہ کی گویا تھا اور نہ میری عمر ہی ایسی تھی کہ استاد میری طرف متوجہ ہوتے۔ لیکن میں بھی اپنی ذہن کا پتہ تھا ہر چہ میں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہنے لگا۔ جب کبھی استاد قیام دینے باہر نکلتے تھے میں ان کے ساتھ ہو لیتا اور وہ اپنے شاگردوں کو جو کچھ بتاتے اس کو پڑے دھیان سے سنتا کچھ مرتبہ میں نے گیوں میں کھڑے ہو کر گھنٹوں تک ان کا گانا سنا۔ اس طرح آٹھ سال تک میں ان کے پیچھے پھرتا رہا۔ بالآخر ایک فیصلہ کی امداد اور سفارش سے میری مقصد برآی ہوئی۔ انھوں نے میرے حال پر رحم کھا کر استاد سے سفارش کی اور استاد نے مجھے اپنی مشاگردی میں قبول کر لیا۔

اب تو میں جو میں گھنٹے استاد کی خدمت میں رہنے لگا۔ ان کی جلسیں بھرتا، پر دانا اور ان کے حکم سے ہی کھاتا پیتا اور سوتا تھا۔ تعلیم کا کوئی وقت مقرر نہ تھا استاد جب چاہتے تھے تو پورے علاقے اور سین شروع ہو جاتا۔ بعض اوقات وہ جمعیتیں بھی ہی اٹھا دیتے اور تعلیم شروع ہو جاتی اور گھنٹوں یہ سلسلہ قائم رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہفتوں تعلیم کا موقع نہ آتا۔ برسوں استاد نے ہفت میں رگ کے پلٹے کھوائے۔ اگر کبھی شراد تال میں ذرا بھی چوک ہوتی تو استاد جملتا گھنٹے اور کبھی کبھی ماہی بیٹھے۔ لیکن ان کی اس مار میں محبت کا ٹکٹ تھا۔ انھیں بیٹوں سے مجھے شراد تال کا گنیاں ہوا اور اس مار کی وجہ سے میں کسی لائق نہیں پایا۔ کا کا عہد سبق کے علاوہ میں نے اور طرح سے بھی استاد سے بہت کچھ پایا۔ یعنی جب وہ دوسروں کو کچھ بتاتے یا خود گانے یا دیگر موسیقاروں سے جن پر گفتگو کرتے تو میں ان کی سب باتوں کو دھیان سے شکر

غزل

ہر ماسی پر اک تیرا یہ غم یاد رہے گا
دنیا ترا ادا از ستم یاد رہے گا
یہ سجدہ پر مشوق نہ ہو میں گئے بھی ہم
یہ نقش کش کت پائے غم یاد رہے گا
تم آنکھ دھڑکتا ہوا دل دیکر رہا ہوں
تم کو مرا افسانہ غم یاد رہے گا
اک سجدہ بعد مشق کیا ہے وہاں بھی
میت خانہ یہ تہریب حشرم یاد رہے گا
کس کرب سے گزرا ہے محبت کا زمانہ
ہر حال میں یہ دور کم یاد رہے گا
ہر عادت دہریسے غم راہوں میں، لیکن
جو اس نے دیا ہے وہی غم یاد رہے گا
ٹوٹا سا دل ٹھہریں تمہیں ہے کہ جلا لیں
یہ وقت بھی اسے شام الم یاد رہے گا

وہ روحانی تعلق نہیں رہا اور نہ آج کی زندگی میں کسی
پایس آنا وقت ہے کہ اس قدر دیا ہو کہ اس کے جتنا پیسے
ہوا کرتا تھا۔ پہلے تو یہ صورت حال تھی کہ ہم ہر وقت استادا
کے اشارے کے منتظر رہتے تھے اور ان کی خوشنودی مزاج
کے خوابوں۔ مگر آج استادا کو اپنے شاگردوں کا سنجیدہ
پڑتا ہے۔

اپنا نے کی کوشش کرتا۔ کئی راگ ایسے ہیں جو ان سے بچے اسی طرح
حاصل ہوئے اور کئی راگ ایسے ہیں جیسے ملتا ہی جس کے شری باریکوں
کو انہوں نے بچے سینکڑوں بار سنا یا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سرت
ڈرنے سے کام نہیں لیتا۔ پرانے تھے! ہمیں شری کو بوسا رکنا چاہیے
تب ہی شری گئے ہیں ان کے پاس۔ ان کے محبوب راگوں میں ملتا ہی راگ
شامل ہے۔ اور خواجہ میر درد کی چیز۔

چاکر من اللہ سنگ لاگ رہے۔۔۔ اے

بڑے شوق سے گھنٹوں گاتے تھے۔ بیم پلاسی پوری، درباری
پٹ دیپ، میان کی توڑی اور دگر راگ بھی ان کو بہت پسند تھے۔
اک خرابک دن ایسا بھی آیا کہ استاد نے فرمایا کہ آج تم تال سر
نہیں گے، ہوا میں اب ریاض میں لگ جاؤ۔

خاصا جب بڑے سچے اور بے غرض انسان تھے۔ یاد خدا
سے کبھی غافل نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ان کے یہ حضرت
خواجہ سید علی اختر نیز عالم کا مرس تھا۔ ان کا یہ طریقہ تھا کہ ایسے
موقوف پر قائل کو دینے کے لئے نوٹوں کی گڑیاں بنا کر رکھتے تھے۔
چنانچہ ان کے پاس نوٹوں کی گڑیاں رکھی ہوتی تھیں۔ جب نوٹ
ختم ہو گئے تو انہوں نے اپنی سفیر اور شریوں تک اتار کر
قوالوں کو بخش دی۔ میں ہوتے ہوتے یہ عالم ہوا کہ قوالوں نے
اگر دیکھا کہ استاد بھی کچھ سنائیں۔ چنانچہ نیز بندوقی کے
استاد نے قوالوں کے پاس کے شری دیا کہ وہی راگ چھیڑ دیا اور
گھنٹوں بڑی عقیدت کے ساتھ گاتے رہے۔ بول یہ تھے:

”میر دردی علی احمد دین دیاں“ ایک سال بندہ گیا۔ قوال
اور دیگر سامعین پر ایک وجہ تھی تھا اور سب لوگ ڈانڈ
رہے تھے۔

غرضیکہ برسوں استاد کی خدمت میں رہتے اور سخت ریاض
کرنے کے بعد کچھ کر حاصل ہوا اور آج میں بھی گائیوں کی صفت میں
شامل ہوں اور اپنے طور پر اپنی خدمت انجام دے رہا ہوں لیکن
آج عورت حال بدل چکی ہے۔ اب استاد اور شاگرد کا وہ رشتہ
باقی نہیں رہا، محض ایک پیشہ ہو کر رہ گیا ہے اور آپس میں

فسادی چچا

جھگڑا کروانے، پھڑپھڑانے، سنے مٹنے، جھوٹ گھڑنے اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرانے اور عجیب و غریب تشکیق جھوڑنے سے، بے باق نہیں آتے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ لوگ اسے اور ان کے حربوں سے ضرورت سے زیادہ واقف ہو چکے تھے لیکن وہ ہر مرتبہ اپنی چال بازی کا جو ہر دکھاتے ہوئے اپنا تیار وار کپڑا، اس غیر متوقع انداز اور زاویے سے کرتے کہ وہ ہرگز غالی نہ جاتا اور چونکے سے چمکتے انسان پر بھی جب وہ اپنا جال ڈالتے تو وہ محض ایک جیسڈ زبون بن کر رہ جاتا۔ وگ تھیلانے، چمچے، اوچھلنے، لیکن پھر دل ہی دل میں فساد ہی چپا کٹی مہارت اور بے وقوف بنانے کی صلاحیت کی مجبوراً داد ہی دیتے۔ چپا پوچھے تو پورے محلے کی اجتماعی ذہانت کے وہ تہنا جواب دہ تھے۔

پچھلے دنوں میں چچا کھلتے لیکن پھر کثرت استعمل سے وہ صرف بوجہ بن گئے تھے اور کچھ عرصہ بعد ان کا یہ نام بھی کچھ غیر ضروری ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ عام طور سے ان کی سیٹھی پچھے لوگ انہیں فساد ہی چپا کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ خود بھی اس کو بُرا نہیں سمجھتے بلکہ ایک طرح سے اسے اپنی کارگر اہلیوں کا اعزاز سمجھ کر اپنے متعلق خود بھی استعمل کر لیا کرتے۔ اگرچہ جب مرے سے میں ہونے تو فرماتے، ”بھوہوہوہو! تمہارا فساد ہی چپا کہتا ہے۔۔۔“ یا ”اپنے باپوں کی کس چکے اب اپنے فساد ہی چپا کی بھی سنو!۔۔۔“

ایک ایسے محلے میں جو شہر کی باہمی سے دور ایک کونے میں تھا اور جہاں صرف جھوٹی موٹی دکانوں کے علاوہ نہ کوئی بازار تھا، نہ سینما، نہ کلب نہ کافی ہاؤس اور جہاں زیادہ تفریحی سہولتیں والے لوگ امروڑ اور تجارت ہمیشہ لوگ رہتے تھیں سویرے سے شام تک اپنی مدنی کھاتے ہی سے فرصت نہ ملتی۔ صرف ایک فساد ہی چچا کا دم تھا جو اپنی لگاؤ، چھائی جھوٹ، فساد اور بات کا تشکر بنا دینے سے اُسے دن سے نئی توفیقیں مل جھگڑنے اور ہنگامے کھڑے کر کے محلے والوں کی ہنسنے ہوئے پانی جیسی زندگی میں کچھ پھری ہوئی موجیں بلکہ انکڑا چھپے چھپے طوفان اٹھا دیا کرتے تھے۔

اپنی حد سے زیادہ غیر ذمہ دار حرکتوں کے باعث خود فساد ہی چچا کی شخصیت محلے والوں کے درمیان ایک شدید اخلاقی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ کچھ عاقبت انڈیشن، چھین شامیہ، اعمال، وبال جان بلکہ قرب قیامت کی نشانی سمجھ کر ان کا وجود پورے محلے کے ایک انتہائی خطرناک علامت سمجھنے لگا۔ برخلاف اس کے کہ میں چچا، انہیں حرکت اور زندگی کا ٹھیکے دار ایک دل چسپ تماشا، اور زندہ دل کا سرچشمہ سمجھتا تھا۔ اور ان کی موجودگی کو محلے کی ذہنی صحت کے لئے کسی قدر لازمی قرار دیتے جیسے جہاں صحت کے گنڈے مٹانے یا کوڑے ختنے کو۔ لیکن فساد ہی چچا اپنے فساد کے من میں اس ہنڈی پر فائز تھے یا ستر انگریزی میں ایسے پھونچے ہوئے بزرگ تھے کہ وہ اپنے متعلق دوسروں کے خیالات اور پسند و ناپسند سے بالکل بے نیاز رہتے ہوئے میس میں چنگاری ڈالتے، جہاں کو بائس تھانے، لڑائی

دیر و دیر۔

دیش جلا۔ "اس کے کامنہ جا؟" کراب یہ آپ کے مضہ پاپ کوہ ایمان اور دغا باز نہیں کہتا؟ کیا میں نے ان کی غیبت میں ان کوہ ایمان اور دغا باز کہا تھا؟"

پچھانے چارے ہوئے کہا۔ "تسے کہا یا نہیں کہا۔ اس فصل تو ابھی ہو سکتا ہے لیکن جو کچھ تم دونوں کی خیر خواہ ہوں اور تھارے باہمی تعلقات اور زیادہ خراب نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہذا میں سارا ازام اپنے ہی مرے لینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

دیش نے عجزاً کہا۔ "چلا آپ ہم دونوں کی فکر نہ کیجئے اور نہ گھا پیرا کرات کرے کوئی فائدہ ہے۔ فیصلہ ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔"

کس صاحب نے ہاں ہاں طاق۔ "ان صاحب فیصلہ یا مافی جو کچھ میں ہوا ابھی ہو جانا چاہیئے۔ میرے لئے دغا باز اور بے ایمانی کا اہتمام ناقابل برداشت ہے۔"

پچا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ایک دم سے دیش کی آنکھوں میں آنکھیں جمال کر بولے۔ "اچھا تو تم کہہ دو کہ کس صاحب دغا باز اور بے ایمان نہیں ہیں؟"

دیش نے میں کیوں کہہ دوں۔ "پچھانے قہر نہ لگایا تو بیش چڑھ گیا۔" میں تو یہاں صرف اس صفاتی کے لئے آیا ہوں کہ میں نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ دغا باز اور بے ایمان ہیں۔"

پچا بھی تیز ہو گئے۔ "تو کہہ دو نہ کہ دغا باز اور بے ایمان نہیں ہیں۔" ابھی صاف ہو جائے۔ صرف ذرا سی زبان ہلا کر تم بچے ہیں جاؤ اور میں جھوٹا۔"

دیش۔ "انٹیمیر؟" باتیں تو میں جانتا نہیں۔ آپ صرف یہ بتائیے کہ میں نے آپ سے کبھی صاحب کا تذکرہ کیا ہے؟ کیا تھا؟ پچا بولے۔ "کس صاحب کو تھارے چوری پاپ ہے تم سمجھ لیکن وہ ایسے نا سمجھ بھی نہیں ہیں کہ وہ تھارے اس قسم کے داؤ پیچ کو بھی نہ سمجھیں۔"

دیش قہقہہ سے "داؤ پیچ کیا؟" پچا۔ "جب تم بے کھنے کو تیار نہیں کہ وہ راست باز اور ایمان

اپنی حرکات ناشائستہ سے وہ قریب قریب کھلے کے بسیں لوگوں کو کسی نہ کسی طریقے سے گھانے کر چکے ہیں اور ان کے باعث نادی چلی نہیں معلوم کیے کے لئے نہ جانے چا چکے تھے۔ مگر ان میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ مردوں کو مرنے والے کو اپنی زندگی کا واسطہ مقصد بنا لینے کا وجود وہ خود بھی کسی نہ کرتے۔ اپنے مشتق دل جوں کی کردہ کی کبھی باتیں بھی ہو کر مکر کر لی جاتے۔ اگر بھی ان کی چوری پچھانے یعنی ان کی افلاک بھی کسی ہوائی کے مشتق فریقین ان کے پاس سامنا کرانے سے پہلے ہو جاتے تو وہ نام ہونے کے بجائے ہنسنے اور خوش ہونے اور اپنی تعالیٰ سے کچھ ایسی منکر خرم صلاحت پیدا کرنے کی کوشش کرتے کہ جس میں فقرہ اور گرمی بڑی حد تک فرزند ہدی اور بے عمل معلوم ہونے لگتی۔ وہ ایسے نادر متون پچھانے اس قسم کی باتیں کرتے۔ "ہی تھارے شادی چھانے یہ کہہ دیا تو کیا قیامت آگئی؟" "تم کھتے ہو کہ میں نے کیا تم نے نہیں بے کہا تھا تو خیر یوں ہی سی۔" "تھوڑی دیر کے لئے تم ہی سچے ہیں جاؤ گے تو میرا کیا بڑھ جائے گا؟" "واہ میان داہ! اتنی سی باتیں پر جھگڑ گئے؟" "تیر تھارے چوری چاہے میرے مشتق سمجھ دو۔ لیکن یہ تو قسمتی بنائے گا کہ میں نے کسے ہاں تو بے باؤقت کی بات ہی تھی؟" دیر و دیر اور پھر گھا پیرا کر اپنی چرب زبانی سے پچھا "ایسا رنگ جادہ جیے کہ آخریں پالا نہیں کے ہاتھ نہ پتا۔"

ایک دفعہ سوئی کسی صاحب امدان کی دکان کے سامنے دار دیش چڑھ رشتے ہوئے شادی چھانے یہاں پہنچے۔ دیش نے فتنے اور افسوس سے پھرے ہوئے بے بسی کہا۔ "یوں چلی ہیں کہ کب معلوم صاحب کو ہے ایمان اور دغا باز تھا؟" یہ آپسے ان کے کان کھینچے بھر دئے؟" چھانے پڑے ٹھنڈے دل سے جواب دیا۔ "اچھا ہیران! تو تم بچے اور میں جھوٹا اور میری سات اپنی جھوٹا! اب تو خوش ہو کر سکدو۔" اب کس صاحب نے زبان بلکہ طلق کھولا "لیکن آپ سے تو مجھے کہا تھا کہ مجھے ہے ایمان اور دغا باز کہتا ہے؟"

چھانے جابھی بیٹے ہوئے کہا "لیکن اگر یہ آپ نے مضہ پیر آپ کوہے ایمان اور دغا باز نہیں کہتا ہے تو میں کیا کروں؟"

ہیں تو تھارالہ کے متعلق جو خیال ہے وہ صاف ہی ہو چکا۔ اب
آزمائش سے ہو یا نہ ہو۔

کب صاحب کچھ لکھنے ہی دے تھے کہ ریش بولا "کیسا
مطلب آپ کا؟ اچھا میں کہہ دیتا ہوں۔۔۔۔"

پچھنے سے ہاتھ کاٹ کر کہا۔ "ہاں ان کہو کہ تمہیں دکان کے
محاسب پر پورا پورا بھروسہ ہے اور کہیں صاحب نے اپنے بیٹے
اور خاؤ کے نام جو ادھار رکھتے کھول رکھا ہے اس کو تم یا کل۔۔۔ میں
سمجھتے ہو؟"

ریش۔ "مجھے اس وقت صاحب اور کھانوں کی باتیں ماننے
دیتے۔ وہ بخارانی معاملہ ہے اور اس کے متعلق مجھے کبھی صاحب نے
یقیناً کچھ اخلافت ہے۔"

کب صاحب۔ "آپ کا اخلافت آپ کی غلط فہمی ہے۔ مجھے
اگر ٹھیک سے صاحب لکھتے ہیں آقا اس کے یہ سہی ہرگز نہیں ہیں
کہ میں دغا باز اور ایسا ہوں۔ رہا میرے بیٹے اور خاؤ کے
ادھار کے کھاتے تو وہ کوئی آپ کی چوری سے تو کھولے نہیں گئے اور
کیا خود آپ نے ادھار کے کچھ ایک کھاتے نہیں کھولے؟"

ریش۔ "حساب ٹھیک نہیں ہے تو پھر ہر چیز مشکوک
ہے اور میں نے کوئی اپنے رشتہ داروں کو تو ادھار کے کھاتے
کھولے نہیں دئے۔"

چنگاری ہرگز آگھی تھی اور چاہئے ہوا دے کر اُسے جلد
بھی شعلہ بنا دیا۔ ریش اور کہیں صاحب جب کچھ دھڑلک دوسرے
کو دغا باز، بے ایمان اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ کہنے لگے تو مروت علی
دیکھ کر چپلے لڑکھائی لگا لیا۔ مسکراتے ہوئے کب صاحب سے
بولے۔ "ہاں صاحب میں نے کب آپ سے کہا تھا کہ ریش آپ کو
دغا باز اور بے ایمان کہتا ہے؟"

کب صاحب نے اس غلط فہمی میں اس فرسودہ سوال کا جواب
تفصیل سے دینا شروع کر دیا تھا۔ "اچھا وہ میرے سمجھنے سے دغا باز
اور بے ایمان ہر رہا ہے اور میں ابھی اس کی دغا بازی اور بے ایمانی
کھول کر رکھ دوں تو آپ حق حق کہہ جائیں۔"

اور جیسا کہ ریش اور کہیں صاحب کے درمیان زبانی تو فرمایا
کے بعد اسی میں چڑھنے لگیں تو اپنی شفقت بزرگ سے فساد چاہنے
میں آگے لگانے کا بیڑا لگا دیا۔ ریش نے دکان کے قریب سے
رعیت کرتے وقت انھوں نے آخری شکوہ یہ چھوڑا۔ "ایک ساقہ
نہیں بچتی ہے تو اپنا اپنا کاروبار دالگ کر دو چر خریف آئی کی بھی
نا تھا پانی پر آگئے ہیں؟ معاملہ نہیں سمجھتا ہے تو آخرے معاملہ میں
مرض کی دوا ہیں؟"

دوسرے دن کہیں صاحب اور ریش کی دکان کا بٹوارہ ہو گیا اور
دونوں ہی نے چند دنوں بعد ایک دوسرے پر دعوے کر دئے۔ خاندانی
کا نام دونوں ہی کی قبر سے گواہان میں ہی حسرتوں میں سب سے
اوپر درج تھا۔

خود میں نے فساد چلی کی شہرت تو کافی سنی تھی اور ایک دوسرے
کچھ لوگوں نے ان کی جھلک بھی دکھائی تھی لیکن ان سے شرف نیاز حاصل
کرنے کو کافی ہا کا عہد مروت علی بھی تک نہ آیا تھا۔ ان کے محلے
میں بلکہ ان کے مکان کے بہت قریب مجھے کولہ پراک کولہ ملا تو کئی
دوستوں، واقف کاروں اور خاندانی فوجداروں نے سمجھا یا کہ اگر کچھ اپنی
عزت آبرو پیار ہے اور یہ بازار میں اپنی فوجی اچھلوانا منظور
نہیں ہے تو فساد ہی چاہئے ہمارے بیٹے کے خیالی فاسکراؤں کی کسی
نے ان کی شان میں یہ عقیدہ پڑھا کہ وہ پرلے دیکھ کے جھوٹے اور

فسادی ہیں اور دوستوں اور عزیزوں کے درمیان جوتا جوتا بیٹے میں
اپنا جواب نہیں لکھتے ہیں کسی نے ہا کا عہد اعداد و شمار میں کے کہ
انھوں نے اتنی گئی ہوئی شادیاں چھڑوا دیں، اتنی فوجداریاں کر دیا
دیں اور اتنے جھوٹے مقتدرے جلاوڑے۔ کسی نے ان کا یہ کارنامہ
بیان کیا کہ انھوں نے ایک بار ذات کافی ترست کے بعد واپس کروادی
تھی کسی نے اس کے جوڑے کا یہ جوابی حملہ بیان کیا کہ انھوں نے ایک صاحب
کے یہاں بھگوانی بارات بھجوا دی تھی۔ کسی نے ان کے متعلق یہ بیان
سنایا کہ انھوں نے ایک مرتے والے کے یہاں جنازہ اٹھنے سے پیشتر
ایک وارث کو جین امداد دوسرے کو اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ایک صاحب
نے ان کا یہ فیض بیان کیا کہ ایک محلے میں انھوں نے ایک خود ساختہ

خلیفہ صدارت چھپرے پر آکر تعین کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے صدر جلسہ کو اصلی خلیفہ صدارت سے کر اور جوتے چھوڑ کر چلے سے بھاگنا اور کئی دن تک رو پش رہنا پڑا تھا دیزرہ ویزرہ۔

فسادی جھگے متعلق یہ باتیں اور اس قسم کی دوسری بہت سی باتیں کر میں ان سے دور بھاگنے کی بجائے ان سے ملنے کے لئے اور بھی سے چھپ چھپا گیا تھا۔ چنانچہ یہی نے اپنے خیال میں انتہائی عقلمندی اور اپنے کان بھرے والوں کے خیال میں انتہائی بے وقوفی سے یہ جواب دیا۔ ”بھئی جب کوئی شخص اتنا بڑی اور شور مچوٹا، فسادی اور فتنہ پرور اور فاضل ہو جائے تو اس کے جملے میں آجانا دیکھا ہی ہے۔ جیسے کسی جگہ کے ایسے کچھ سے ٹھہرا جانا کہ جس پر ضرور ہے، کاساٹھی ہے، مدد سے چک رہا ہو۔“ میرے اس جواب پر میرے ایک بہت بڑے ہمدرد برا فرخزہ، بھوکے چلے۔ ”ہی آپ فسادی چلا کو کیسے کیا ہے؟“ حرفوں کے بے ہی حرفوں کے؛ شیطان کے کام چھوڑ آئے۔ استرے سے کاشے ہیں۔ اسی ان کی دہمیاں ہو افسکار بھاگنا تو درکنار مذکور کو لڑائی بھی نہیں لگائی۔ میں نے اس جواب کو اپنے لئے ایک چیلنج تصور کرتے ہوئے عرض کیا، تو پھر ایسے بزرگ سے کچھ نہ سیکھنا تیشا کھڑا نہ نصرت ہوگا۔ محنت غالب اسی قسم کے ایک مسئلہ کا حل بہت چھپے پیش کر کے ہی ہے

ان وہ نہیں خدا پرست، جاؤدہ بے وفا ہی جس کو ہمدردی دل عزیز اس کی گھم میں جائے یوں

مجھے اپنے لئے دیکھ میں آئے ہوئے دوسرا دل تھا۔ اچانک سامنے دروازے کا پر دہا ہوا اور ایک پتہ تھا، وجہ اگورے چلے اور سینہ کا ڈھی بزرگ اندر چلے گئے نظر آئے۔ صورت شکل اور دین تعلق سے وہ ایسے معلوم بہتے کہ ع

دامی پوڑی تو فرشتے دھو کر ہی امروں نے فرمایا۔ سلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ میں فوراً پہچان گیا کہ وہ فسادی چلا ہیں۔ میں نے بڑی گرم و سخت سے عرض کیا۔ ”علیکم السلام! آئیے آئیے تردد کو نہ

لائیے“ اور ایک کران سے رہنما فرماتے ہوئے، عین گھرے کی سب سے آرام دہ کرسی پر بیٹھا۔ اس وقت وہ غلوں اور محنت کا ایک حسین مرقع دکھائی دے رہا تھا۔

بڑی شفقت سے میرا نام پتہ اور غنائی حالات پوچھتے رہے اور اس کے بعد کچھ کے تعلق سے بولے۔ ”کیوں مہیاں“ آپ کو اپنا کمرہ پسند آیا؟“

میں نے عرض کیا۔ ”جی ہاں کمرہ تو فضا ہے لیکن غالباً یہ جہت کے کسی انجمن کے مشورے سے تیسرے کیا گیا ہے کیوں کہ جہت ہی کی طرح اس سے متعلق کسی باورچی خانے، پانچ خانے یا غسل خانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ پھر میرے اس محلے سے بہت خوش ہوئے اور فرماتے۔ ”ان دنوں کی کابینا ہے اور نہ کوئی اس کابینا۔ مطلب یہ ہے کہ نہ کسی مکان سے متعلق ہے اور نہ کوئی دوسرا جزو اس سے متعلق؛ اچھا تو میرا کام کیسے چلتا ہے۔ میرے لائی۔ جو خدمت ہو میں اس کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کھانا ہوٹلی میں کاتا ہوں اس کا خیال وہ ملک کے سب سے بڑے جمہوری ادارے یعنی ایم پیس میں جھگڑتا ہوں۔ غسل خانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے سامنے شکر پر تل لگا ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک میری عزت نے یہ گوارا نہیں کیا ہے کہ شکر پر بیٹھ کر اپنے برسرہ جسم کی نمائش کروں بلکہ سبوتا ہو جو صرف غسل خانے کی تکلیف ہے۔“

فسادی چلا پہلے کچھ بیٹھے۔ پھر چند ہی سے کہنے لگے: ”میاں یہ تعلیم تو چٹائی بجائے دور ہو سکتی ہے۔ دیکھئے آپ کے کمرے سے بالکل لاپرواہا دکن جانب جو مشرع مکان ہے اس میں حرما بہادر دیگ رہتے ہیں۔ اکیلے آدمی ہیں لہذا ان کے لئے مکان کا صرف اوپر ہی حقہ کافی ہے اور اسی کو بند کر کے وہ سمیرے کام چھپ جاتے ہیں۔ نیچے کا حصہ جس میں غسل خانہ اور فرش ہے وہ ملے والوں ہی کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آس پاس کے لوگوں میں جس کا ہی چاہتا ہے اسے استعمال کرتا ہے بلکہ آپ سے قبل اس کمرے میں جو غلام علیمل رہتا تھا۔ وہ بھی نہانے

دھونے کے لئے دہیں جاتا۔ آپ بے تکلف وہاں چلے جائیے گا اور احتیاطاً آج یا کبھی میں آپ کو مرزا صاحب سے متعارف بھی کرا دوں گا۔

میں نے مزید امتیاز طے نہ ہو چکا ” تو مجھے بروئے میں جا کر کسی کو بلانا ہوا کہ ” بوسے ” ” بکار بیٹے کا کس کو؟ وہاں وہاں رہتا ہی کون ہے البتہ خاندانِ مرزا ستر رات میں کوئی ضرورت پیش آ جائے تو مرزا صاحب کو بلانا بھیج دوں گا۔“

اس کے بعد فسادِ چاندنی کی پستی اور دوستوں کی طوطا چستی کا تذکرہ کرتے ہوئے ادراک کی دیر کے بعد جب وہ جانے کے لئے اٹھے تو مجھے ایک حد تک یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایک شریف اور بامروت انسان ہیں اور محض غلط فہمی کی بنا پر انھیں فسادِ چاندنی کا لہجہ سے کر معلوم اور بدنام کر دیا گیا ہے۔ وہ ظالم نہیں بلکہ معلوم نظر آئے۔

دوسرے روز دو بجے سویرے جب ایک پُر دلف غزل کی امید میں میں گنگنا تا ہوا اپنے کمرے کے دھکن چاہتے شرع مکان میں بروٹھا لے کر کے اندر داخل ہوا تو فقہاء میں دہلیا شہر تین وخت زدہ نہوائی چینی اور پھر میں نے اپنے آپ کو جھگٹا اور اپنے قاتل میں ایک نٹ باز قسم کے انسان کو جو بہادر بیگ ہی معلوم تھا۔ دوڑتا ہوا پایا۔ بڑی شکل سے اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ بند کر لیا اور اس کے سلسلے کھڑے ہو کر ادا ہے خود دھن سے آدھے گئے کمرے کے بہادر بیگ نے میری شان میں جو فی البدیہہ اور بے ساختہ تنقید پڑھا وہ یقیناً اپنی نوعیت سے فردوسی کے شاہنامے قسم کی کوئی چیز تھی۔ آخر میں جب فیصلہ لایا نہ رہا تو میں نے سلاخوں والی کھڑکی یا پٹے کھول کر عرض کیا ” آپ کے اس تنقید کا ثواب یقیناً فسادِ چاندنی میں پڑھ کر دیکھ سکتے ہیں۔“

اور میں نے فسادِ چاندنی کی دھرتی پر قدم نہ دیا۔ جیسا کہ نام آتے ہی پورا مجھے قہقہے لگنے لگنے کا شکار ہو گیا کہ بہادر بیگ سے

بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور خدا خدا کر کے بات آئی گئی ہوئی۔ واقعی چچا نے پانی کے بجائے خود اپنے خون سے نہانے کا انتظام کر دیا تھا! مجھے خفت اور شرمندگی سے زیادہ خود اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ میں چچا کے ایسے صاف اور کھلے ہوئے چر کے میں کیسے آ گیا؟

دوسرے روز چچا بے - پہلے تو دل کھول کر غور ہنسنے پھر مندرستہ خواہمے میں بولے ” تمہارے سر کی قسم مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مرزا بہادر بیگ کا بچہ پر سون ہی اپنے وطن سے ایک چوڑے دودھ بیویاں لے آیا ہے۔ عیرت چاہو تو غسل کے لئے میرے کمرے آ سکتے ہو۔“ میں نے ماتھ جوڑ کر اس دوسری دھوکہ کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد بھی چچا میرے یہاں آتے رہے لیکن مجھے پہلے سے ہی زیادہ محتاط دیکھ کر خود بھی اپنی باتوں میں بڑی احتیاط جتنے لگے تھے۔ اس کے باوجود ہم دونوں کے درمیان ایک خاص قسم کا غلوں اور لگاؤ تھا۔ میرا اس کو نہ میں طار کرتا اور نہ وہ۔ ایک روز جبکہ میں دفتر باردا تھا مجھے راستے میں لے اور برٹشے رقت آئیں بچے میں بولے: ”میاں آج میری کمرٹ گئی۔“ میرا بی بی کا دوست اور ساقی رام ناتھ چل بسا۔ بے حیا رہ پندرہ دن سے ناچنے میں مبتلا تھا۔ ماتھ پر کیا زبان تک ہلانے سے معذرت تھا۔ خیر اس کی تو حق سہارہ ہو گئی لیکن میرا غصہ نہ ختم ہو گیا۔ جب باغ و بہار طبیعت پائی تھی اس نے۔

میں نے انہماں دھندلی دی کچھ مجھے کے تو فرمایا: ”آؤ کھڑے کھڑے تم بھی نہ ہو اس کے کھڑے کھڑے کھڑے کھڑے۔ ایک دوسرے کے تم میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔“

میرے دماغ میں غصے کی گھنٹی بجنے لگی۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں؟ سا ہے ہی دام نہ تھا کہ کاملاً فسادِ چاندنی کے ساتھ میں بھی اندر چلا گیا۔ لیکن دھن میں اس یقینی کے ساتھ کہ رام نہ تھا جی مرے مرے نہ ہوں گے گردنوں پہنچ کر فسادِ چاندنی

کا قول صحیح پایا۔ رام ناخدیق دھاتی مرگے تھے اور ان کی نفس کشش نہ ہوئی
 بے جانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ چادر تھی کہ سر ہاتھ لٹے نہ اور تھلاؤ
 رہتے تھے۔ کچھ دیر بعد سکین بچے ہوئے تھے جو بے حجاب ہوئے۔ "اچھا تم
 باؤ۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہوگی۔ ابتر راستے میں چوراہے پر ڈکشتی کی
 دکان پر اور آگے بڑھ کر نانک چنڈوین کو ضرور اطلاع کرتے جانا کہ
 رام ناخدیق آج سویرے گزرے۔ اور اسحق بس اٹھنے ہی والی ہے۔"
 میں نے چھٹی بات کے بموجب ڈکشتی کی ادنا نانک چنڈوین
 کو اطلاع دے دی اور جب ان دونوں نے پوچھا کہ آخر مرحوم کیا دیکھا
 تھے؟ تو انتہائی سادہ فہمی سے کہہ دیا۔ "پندرہ دن سے فالج میں مبتلا تھے
 شام کو فوتے آئے تو کچھ دیر بعد ایک صاحب تشریف لائے اور
 پوچھا۔ "کیوں صاحب رام ناخدیق کی فالج سے مرے تھے؟" میرے
 منہ سے بے اختیار رائے نکلا۔ "یہاں!" کچھ دیر میں چونکا تو وہ صاحب
 یا پکے تھے۔ "گھڑی ہی دیر میں ایک اور سرسبز بزرگ نما وارد ہوئے۔
 "آپ کو صدمہ ہے کہ رام ناخدیق کس مرض میں دیہانت ہوا ہے؟"
 میں نے انتہائی صاف گوئی سے جواب دیا۔ "یہ نہیں۔" اور یہ جواب
 سنتے ہی وہ بزرگ بھی تیزی سے روانہ ہو گئے۔ میری کیمیں نہ آیا
 کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور رام ناخدیق کی موت کا سبب مجھ سے کیوں پوچھا
 رہا ہے؟

دوسرے روز سویرے دس بارہ آدمیوں کا ایک فوجی انتہائی
 بے تکلفی سے میرے چہرے سے کمرے میں گھس آیا۔ ایک گولی ٹول شخص
 نے کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ رام ناخدیق کس مرض میں
 مرے؟" میں نے گریس کی ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ نہیں؛" اور فوراً
 فوجی نے ایک گروہ سے آوازیں بلند ہوئیں "بھوٹا!" "مکلا!"
 "توڑ دیا گیا ہے یہ کہ بھت۔" دوسرے گروہ نے فوراً ہتھ دیا۔ "پیر
 کہہ رہا ہے یہ۔" بہتان تراشا گیا تھا اس پر۔ "یہ رام ناخدیق کو کیا
 جانے؟"

پچھلے گروہ کے ایک بڑی بڑی موٹیوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں
 والے سورمانے آستین بٹھکاتے ہوئے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "آپ
 نے ڈکشتی کی ادنا نانک چنڈو سے نہیں کہا تھا کہ رام ناخدیق فالج میں
 مرے ہیں؟"

میں نے پسینہ پونچھتے اور ہلکتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں
 کہا تھا!" اور پھر دونوں گروہوں سے عجیب عجیب آوازوں کا ایک
 متور و غوغا اٹھا۔

"دیکھا آپ نے؟" "گھڑی میں کچھ اور گھڑی میں کچھ۔ اس
 بے ایمان کا کیا اعتبار؟" "پیر کبھی چھینتا نہیں۔" "جلی و حیرت تا
 پر شاہد اس سے بھی دستبرد نہیں۔" "حیرت کا مرصہ کیسے ہو سکتا
 ہے؟" "میں نہیں تو کیا اصرار ہے؟" "دیر و جزہ اور کچھ صاحب
 نے کس صاحب کے ایک چیت جمادی جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت
 ہوا میں اس کے بعد ایک گروہ دوسرے گروہ پر پل پڑا اور باقاعدہ
 مار پیٹ شروع ہو گئی۔ میری میز کرسیاں، کتابیں، کھونٹیاں، چوتے
 گلاس، مچائے، لیب و جزہ اسلحہ جنگ کا کام دے رہے تھے!
 اس سے قبل تو میں نے سڑک سے بھاگ کر اپنے
 کمرے میں پناہ لی تھی لیکن اس موقع پر اپنے کمرے سے بھاگ کر مجھے
 سڑک پر پناہ دینی پڑی!

انداز چپا کا یہ سب سے بڑا اور آخری حملہ تھا کیونکہ اپنے
 کمرے کے میدان جنگ بنائے جانے کے چند ہی گھنٹوں بعد اپنے ساتھ
 کے باقیات و سالت کو لے کر میں ایسا بھاگا کہ محلے والے اپنا ملک میل
 پتا پوچھتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے کمرے میں جو دو گروہ درگ
 تھے وہ رام ناخدیق کے دشمن اور ان کے متعلقین تھے اور ان کے درمیان
 مرحوم کا ایک وصیت نامہ بنائے غنیمت تھا اور اس کے
 اصل یا جلی ہوئے کا بہت کچھ وارد و مدار مرحوم کا مرض الموت
 تھا۔

آپ کا
تار

آپ بھارت کی
کسی بھی زبان
میں تار
بھیج سکتے ہیں۔



ہاں،
پیغام کا
دیو ناگری رسم الخط
میں لکھا ہونا
ضروری ہے۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے۔

محکمہ ڈاک و تار۔

۱۹۵۹ء

بجٹ کی بجٹ کی جلدی کی جلدی



کام بہت ضروری ہوا بھی تو آپ تار بھیتے ہیں۔
تو پھر یہ پورا کیوں نہیں لکھتے۔ یہ پورا بھولنے
سے تار بھیتنا جلدی پہنچتا ہے۔
یہ ادھر اُدھر ہونے کی صورت میں تار کے دہر
سے پہنچنے کا امکان ہے۔

آپ پیسے بھی پکا لکھتے ہیں اور تار بھی جلدی پہنچ سکتا
ہے۔ وہ کیسے؟ تار بھی فون نمبر کے پتہ پر دیکھتے۔
پتہ بول لکھتے مثلاً "برج نائن ٹی۔ ایف۔ ۳۱۶۷۰"
دہلی" جیسے ہی تار دہلی پہنچے گا اُسے ٹیلی فون پر
پڑھ کر سنا دیا جائے گا۔

پتہ ہیں "ٹی۔ ایف۔ ۳۱۶۷۰" کو ایک ہی فقدان کر دام لگا سے جاتے ہیں۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

مسکرو ڈاک و تار



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آج کل

دیشاکہ شک سہ ماہی
مئی ۱۹۶۲ء

پیشہ ورانہ
مطبوعات

پیشہ ورانہ



ہماری اُردو کتابیں



تیمت	معنی	نام کتاب
۳۵ روپے، نئے پیسے	مصدر آہ	ہندوستانی ڈراما
۵۰ روپے، نئے پیسے	انتہت گویاں شیوڑے	جو اُلکھی دنوں،
۲ روپے	ٹیر منڈی	پینڈت تہرو سے بات چیت
۲ روپے	—	ابوالکلام آزاد
ایک ڈیڑھ ۲۵ روپے	ڈاکٹر سی۔ دی رمن	سائنس کے چند پہلو
ایک روپیہ	—	ہندوستان کا دستور
ایک روپیہ	—	بھارت کی لوک کہانیاں
۵، نئے پیسے	—	دیس میں کی لوک کہانیاں
۵، نئے پیسے	ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن	کلی یا تہذیب کا مستقل
۵، نئے پیسے	جوہر لال نہرو	بھارت آج اور کل
۵، نئے پیسے	—	اپنے گھر کو آگ سے بچائیے
۴۰ روپے، نئے پیسے	—	کیٹنڈر کی اصلاح
۳۵ روپے، نئے پیسے	—	تاپ تول کا میٹری نظام
فی نمبر ۱۰ سے پیسے	—	جوہر لال نہرو کی تقریریں
		نمبر ۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸

پبلک اور ڈاک خریدنے کے لئے کم نئے پیسے یا قیمت کا ۱۲ فیصدی مزید بھیجئے۔
 رہنمائی کے لئے ۵۰ روپے سے اس کے علاوہ ہوگی۔ ۲۵ روپے یا اس زائد کی کتابیں سونے پر ہولڈنگ سمان

کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے
 پرنس منیجر پبلکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام معنور ہونا نامہ

آج کل دہلی

مجلس ادارت

محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور سری نگر
گوپی ناتھ حسن دہلی
خواجہ احمد رفی دہلی
عبد اللہ درمذوی بھدرا آباد

د۔ ایس۔ مومن راڈ ڈائریکٹ بلیکیشنز، ڈوہڑن
بی۔ این۔ ایس۔ راگھون ڈیجیٹل ڈائریکٹ (ایڈیٹوریل)
جی۔ نجما ناتھ ڈیجیٹل ڈائریکٹ (پروڈکشن)
پال کھنڈرکشن ایڈیٹر شہباز اردو (سیکرٹری)
(مدیریسٹور)

اسٹینڈ ایڈیٹر... منظر تحریر

سالانہ چندہ :-
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
اشدنگ یا ڈیڑھ ڈالر
بندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
بندوستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
اشدنگ یا ڈیڑھ ڈالر

مرتبہ و مناشخ محمد

ڈائریکٹ بلیکیشنز، ڈوہڑن مشرقی آف ریشیا ایڈیٹوریل کانسٹریکٹ حکومت ہند

بلیکیشنز، ڈوہڑن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

۲	ادارہ	ملاحظات
۳	آئیڈیٹوری	غزل
۴	عبد الباقی	دعایاں، بھارتی
۱۵	جاوید دشت	ہم
۱۶	رشید الدین	بھدرا آباد
۲۷	شش ہرانی	نئی کاروں کا کورس
۲۹	رضیہ سجاد ظہیر	گرم
۳۳	صوفی نظر	سکیت
۳۴	سمت پرکش شوق	خانی سے رک ملاقات
۳۷	دقار غیل	شہر بھدرا آباد
۳۸	شانی تریپن جیٹا چاریہ	نئی تاریخیں پرکھتے
۴۱	حسن عسکری کاشفی	یہ نیشنل یہ چٹا بن
۴۳	ع۔ م۔ ش۔	نئی نکتہ بنیں

سردق :-
رسالے کی پیشبرد :-
جیسی نیرمیں کہ

دانشکدہ شک ۱۹۶۲ء
مئی ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ — نمبر ۱۰

مناویں سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال کھنڈرکشن، ملیانی ایڈیٹر کمال دودو) اور سیکرٹری دہلی ۶

ملاحظات

انتخاب میں پورے ملک میں ۱۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ووٹر تھے اور دوسرے انتخاب میں یہ تعداد ۱۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ہو گئی اور تیسرے انتخاب میں یہ تعداد ۲۱ کروڑ ہو گئی اور اس اعتبار سے حق رائے دہن کی استعمال کرنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا یعنی بالترتیب ۸ کروڑ ۸۲ لاکھ، ۱۰ کروڑ ۱۰ لاکھ اور ۱۲ کروڑ۔

ترقی پذیر میشت میں ایک طرف عوام کی آمدنی بڑھتی ہے تو دوسری طرف حکومت کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوتا ہے جن کو حکومت ٹیکس بڑھا کر پورا کرتی ہے۔ یہی صورت حال ہمارے ملک میں بھی ہے جہاں منسوبہ بندی کے ذریعہ ہم ترقی کے متنازلے کرتے جا رہے ہیں۔ مرکزی وزیر مالیات نے کچھ ٹیکسوں کو کچھ سال کا بیٹ پینز کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۶۲-۶۳ میں مرکز اور ریاستوں کا منسوبوں کا خرچ ۱۴ ارب ۶۶ کروڑ روپیہ کر دیا جائے گا۔ اور اگر اس میں سالہاں ۱۲ ارب ۱۴ کروڑ روپیہ اضافہ کر دیا جائے تو تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ابتدائی دو برسوں میں منسوبے ۱۵ ارب روپیہ کی رقم میں سے دو تہائی خرچ کی جائے گی۔ سہارا کے اخراجات اور قرضوں کے لین دین میں ایک ارب ۲۶ کروڑ روپے کا خسارہ رہ جاتا ہے جبکہ آئندہ سال کی عام آمدنی اور خرچ میں ۳۶ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ اس خسارے کا ایک خاصا حصہ ٹیکسوں سے پورا کیا جائے گا۔

ایری یا اور فرانس کے باہیں جنگ بندی کے معاہدے پر دنیا بھر میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ بالآخر فرانسس ایری یا مملکتوں کی قربانیوں کے اگلے جھکے پر مبنی ہو گیا۔ ایری یا کی جنگ آزادی تاریخ میں بے مثال ہے۔ یہ جنگ ۱۷ سال تک جاری رہی جس میں دس لاکھ باشندے شہید ہوئے ان کے علاوہ نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں نے آزادی وطن کی خاطر کسی کیسی میمبٹن، اٹھائیں۔ یہ سب مجاہدین آزادی دینا کے آزادی پسند اور انسانیت دوست لوگوں کے خراج عقیدت کے مستحق ہیں۔ ایری یا کی فتح تو اصل انسانی اقدار کی ایک زبردست فتح ہے اور اس کے لئے ایری یا کے عوام نے جو قیمت ادا کی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مستقل قریب میں ایری یا کوئی آزادی حاصل کر کے آزاد قوموں کے شانہ بشانہ تعمیر ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکے گا۔ اور دنیا کے امن و سلامتی کے تحفظ کے لئے مسان و مددگار ثابت ہوگا۔

ملک کے حالیہ عام انتخابات اور گزشتہ دو انتخابات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت اور باغ رائے دہن کی کے اصول کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں اور عوام اس طریقہ حکومت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان کی جمہوری روایات کے لئے خوش آئند اور مستحق کی کامیابیوں کا پیش خیمہ ہے۔ جمیٹ الیکشن کمیشن کے پیش کردہ ۱۰ ہلاوتیہ کے مطابق پہلے عام

غزل

چشم ساقی سے تھا تشنہل بے پرستی ایک دن
مرہن بادہ تھا نہ اپنا ذوقِ مستی ایک دن
وائے برانساں کہ ہے اپنے تلون کا شکار
حق پرستی ایک دن باطل پرستی ایک دن
حسرتیں بے خانماں ہیں آرزوئیں بے دیار
کیا خبر تھی یوں لڑگی دل کی بستی ایک دن
ہوشیار اے بادہ نوحہ کے ماتھے ہوشیار
چھین لے تجھ سے نہ تجھ کو خود پرستی ایک دن
اب خموشی ہے ہماری ان کے طمنوں کا جواب
یا زباں کرتی تھی کیا پیش دستی ایک دن
گما گئی اب کہاں ویران ہے مسلمان ہے
یا ترے جلوے تھے اور اس جل کی بستی ایک دن
نیار یوں سے دیز لے اے بندہ حرص و ہوا
خاک پھنوائے نہ تجھ سے ذر پرستی ایک دن
باندھے تھے منہ ویلے کیا کیا یہ کے معلوم تھا
زیست سستی ہوگی اور اس درجہ سستی ایک دن
موت ہکتے ہیں جسے اک رُخ ہے و دجی زیست کا
رختِ بستی خود کرے گی چاکِ بستی ایک دن
سرِ بندی پر ہیرتا کیوں ہے مانندِ حباب
تجھ کو لے ڈوبے نہ تیری چیرِ بستی ایک دن

اب نہ وہ شیوہ ابیانی ہے نہ وہ دمِ ضم اثر

یا زباں تنوار کے مانند گشتی ایک دن

حقی شاہجہانپوری

”طہم افکار“۔ جی سائز، صفحات ۲۵۴۔ مرحوم کی خود نوشت مرثیہ، مگر بیشتر اپنی ہی شاعری پر مشتمل۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ادبی بھی قابل قدر ہے کہ مرحوم کی دادرستیت ہے اور اب نایاب۔ کتاب ”تقی پر تنگ“ درکنس میں چھپی ہے۔ سال اشاعت کتاب پر درج نہیں۔ شاید تقی پر تنگ ”روکنا“ مرحوم کی ملکیت تھا۔ اور اگر تھا تو خدائی جانے کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ بہر حال آئیے ”طہم افکار“ کو کہیں کہیں سے اس نظر سے دیکھیں کہ مرحوم کا دنیا اس وقت کیا مٹی اور وہ خود شعر و ادب میں کس قدر متغیر۔ کے مالک تھے۔

مرحوم کی اولاد کا حال معلوم نہیں۔ سنا ہے ان کے ایک صاحبزادے اپنے وطن ہی میں مقیم ہیں اور ماضی اعتبار سے عارف و فاضل۔۔۔ افسوس ہے کہ ہمارا صاحبزادہ اگر کسی صاحب فکر وطن پر تو بہر بھی کرتا ہے تو صرف اسی تک، اس سے آگے والا شہنشاہ اس طرح معلوم کتے غیبیوں کے کہیں کھلے مر جھائے۔

”سختے چنر۔۔۔“ اگرچہ پوچھے تو اردو شاعری کا یہ دین بہت محدود ہے۔ کسی کی محنت سے شعر کہا جائے آخر یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔۔۔ اگر آپ ان اور ان کو انتہت خاص کے ساتھ ملا نظر فرمائیں گے تو کم از کم طرز ادب عام روش سے علانیہ ضرور محسوس فرمائیں گے۔ میرے خیال میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک دیوان یا مجموعہ کا

پورا نام سید نامہ رسالہ۔۔۔ آئیے کہہ دیر مرحوم کی یاد تازہ کریں مرحوم تعظیم ہے کہ پہلے تک سلامت تھے۔ وہی میں قیام تھا۔ ان کا ایک گھر بھی تھا۔ وہی انتقال فرمایا اور وہی حضرت نظام الدین میں دفن ہوئے۔۔۔ چنپی وہیں یہ خاک جہاں کا غیر تھا افسوس ہے کہ پندرہ بیس برس میں ہمارے ادبی شعری صفے بھی مرحوم کو بھلا بیٹھے، حالانکہ مرحوم اپنے دور میں ایک ممتاز ادیب تھے، شاعر تھے، صحافی تھے اور ایک رسالہ ”جنتی کے ایڈیٹر۔

راقم، المردود نے حقی صاحب کو پہلے پہل خواجہ محمد شمس کی اردو مجلس میں دیکھا تھا۔ مرحوم اس مجلس میں بالعموم خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ساتھ آتے تھے اور بعض اوقات خواجہ صاحب کے ساتھ جناب واعی دہلوی بھی شریک مجلس ہوتے تھے۔ راقم آج مرحوم ذاتی صاحب کو اس سے بھی یاد کر رہا ہے کہ وہ اس پر کرم فرماتے تھے کبھی راستے میں مل جاتے تو ہنس دیتے، جنت سے باتیں کرتے اور صبر آگے بڑھتے۔ افسوس کہ راقم سطور نے ان سے کچھ استفادہ نہ کیا۔ حالانکہ وہ بڑے ذی علم تھے، ہوش مند تھے اور ادب و شعر کے بہتر۔۔۔ اب کہاں لوگ اس طبیعت کے۔

حضرت دہشتی نے مرثیہ و نظم میں بہت کچھ لکھا ہو گا لیکن غالباً ان کا کوئی ادبی کاوش ان کی حیات کے بعد منظر عام پر نہیں آئی۔ ایک کتاب مرحوم نے انجی بیات میں چھپوادی تھی اور وہ ہے

اس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔

گوہ گائی ہے۔

مجھے ذیل کے اشعار خصوصیت کے ساتھ پسند ہیں (دیباچہ بہ سب اشعار نہیں، ان کا بھی انتخاب ہے۔ حیرت)

نامزدہ ہم نے جسم کا اقرار کر لیا
جب کچھ علاجِ رخصت لے جا نہ ہو سکا
پہلے تو نہ تھی اتنی دشت مجھے دندان میں

پھر فصلِ بہار آئی شاید چمنستان میں
اس وعدے کا مطلب کیا سمجھوں اس سان بھی ہے دشوار بھی ہے
امر و نہی ہے بل، ہونٹوں پر ہنسی، انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

د اس دور کی مہر و عزل۔ حیرت

وہ آگ میں سے سرگوبے اسے نامہ بردار دست

لیکن مریضِ غم کو امیدِ سرگوبہاں
تم سے نگرِ شرم کو روکا نہیں جانا
اب اسے ہجومِ شوقِ اتنی کسبِ صلاح ہے
پوچھا ہے اس نے حالِ دل بے فساد کا
احساس کچھ ہوا نہ ترے لطیفِ عام کو
حالا کہ سن گئی کوئی صورتِ سوال کی
کیا انتظارِ مرگ میں بیٹھا ہوں مہبطی

گویا اب اور کوئی معیبت نہیں دی
شاید غصہ یا غم کا یہی اک علاج ہے

کچھ دیر روئے، تو طبیعتِ سنبھل گئی
اب دل کو یہ سحرِ مہر و مہر بھی نہیں
جھڑے حالِ دلِ فردم نہ پوچھو تھے جو بات ہے معلوم نہ پوچھو
اس سے کیا کیجئے، یارب، نگاہِ غم نہ تاز

تو ابھی اپنی اداؤں سے جزدار نہیں

اس طرف کچھ سوچ کر دوسنے لگے بیمار وار
اس طرف بہارِ غم کو کچھ کھسکے غافل ہو گیا
دل کی حرکت بند ہے بے نور ہیں آنکھیں

ہزارے کیسے ہیں کہ اب دشتِ محسوس ہے

آغا زینال — میں شاعری کا مدعی نہیں۔ شاعری کو اپنے
لئے ذریعہ اختیار نہیں کرتا۔ نہ کسی کا شاگرد ہوں، نہ کسی کا استاد۔
نہ غالب و مومن کا پرورد ہوں نہ آتش و ناسخ سے وابستگی رکھتا ہوں۔
مبت سے باتیں ہیں جن میں نے اپنی عزال میں غوطہ دکھا ہے۔ مثلاً
(۱) میں واسوخت کا مخالف ہوں، اگرچہ میرا ہم قلع و قحیٰ بیدی
واسوخت کھنے میں کمال رکھتا تھا۔ واسوخت کے معنی ہیں محبوب سے
تاراض ہونا۔ میں اس خیال کو نشانِ محبت اور شانِ وفا کے منافی
سمجھتا ہوں

(۲) میں رقابت کے سہول کو نفرت کی نعر سے دیکھتا ہوں۔ یہ
حق باوجودی انتہائی بے حیثی اور سبتِ ہستی پر مبنی ہے۔

(۳) میں عزال میں باندی آدمیوں کی بدل چال اور جھلسلی
زبان پسند نہیں کرتا۔ میری مثال کوئی نازِ سبت یافتہ بھیجا
نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی ہستی ہوتی ہے جو فیصیح و لایح اور لطیف سے
لطیف اشاروں کو سمجھتی ہے۔

(۴) صنایع و بدائع اور الفاظِ مناسبہ کا استعمال گناہِ کبیرہ سمجھتا
ہم۔ لہذا یہ کوئی معمولی سی خوبی ہے ارادہِ علم سے نکل جائے
(۵) دو تین اشعار کے سوا میں نے اپنی عزالوں میں ایسا کوئی
شعر نہیں کہا جو مجازی تعلقات تک محدود ہو۔

(۶) حربِ غلت، ہا قصوس الف کا گناہِ سخت ناپسند ہے۔
دعا، ہمنہ، اود، غرضتہ کی ہائے قہقہہ کوالت کی طرح کھینچنے
کو چڑھنا ناپسند ہے۔

(۷) پیری عزال میں جان میں، میری جان، مستوث، دلِ ریا،
مراقب جیسے لفظ نہیں ہیں۔

(۸) میرے یہاں تو سنی مری، شاعرِ جذبات، کیفیات
وارادات، مشاہدات و محسوسات پر مبنی ہیں۔

(۹) میں نے تحقیق کے لئے زبان اور زبان کے لئے تحقیق کو
مرداد نہیں کیا ہے۔

(۱۰) میرا شعر ہماری قوتِ کاغذ ہے، اس لئے کہ بہت سوچ کچھ

چشم ساقی تک رہی ہر چیز اپنے حال پر
پھر نہ شیشے پر وہ عالم تھا نہ پانیے میں تھا
بناوٹ سے بھی ملتا ہو تو ہیں تیار سمجھتا ہوں

مرے دل کو نہیں آتا کسی سے بدنگاہ ہونا۔۔۔

یکہ ذاق اشارات — ”چنے سات سال کی عمر میں اردو خط بہت اچھا تھا۔ میری عمر کس سال کی تھی کہ میرے پدر بزرگوار غفر اللہ نے وطن فرماؤ — سندھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوا حضرت علامہ محمد فاروق عباسی مدرس اعلیٰ تھے، مولانا اردو فارسی عربی تینوں زبانوں میں شریک تھے — عروض سے فارغ ہونے کے بعد عربی میں سے بھی شکرنا شروع کیا — مولانا یکہ بیگ عبدالغنی مرحوم ندوۃ العلماء میں نائب ناظم تھے — مولوی محمد حسین زین، مولوی کرنا لکھ وانا سہرامی، مولوی مصطفیٰ حسین، مصطفیٰ ایاز آبادی، مولوی محمد احمد ہتیری، مولوی اجویں لکھنوی، سب اردو کے شاعر — ایک دن شیخ الاشاعری حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گیارہ آبادی قدس سرہ کے حلقہ الرشید حضرت مولانا احمدیوں چند لکھے کے لئے دارالعلوم آئے تو میں نے ان کے زیر مقدم میں عربی میں فی البدیہہ ایک مختصر ساقیہ کہہ ڈالا۔ اس پر مولانا نے مجھے بہت سادہ نام بھیجا۔ حضرت استاد اردو و معانی کا ترجمہ عربی میں کرتے تھے۔ میں ہمیشہ نڈکا ترجمہ نڈکا اردو نظم کا ترجمہ نظم میں کرتا تھا۔

مگر کاتر حواں اور در سے میں داخلے کا وہ سراسر سال تھا کہ مدرسے میں ایک فضیل بیلا و منقہ ہوئی۔ مولانا شاہ محمد سیوان پھلوا دی نے عربی میں ایک نصیحتہ قصیدہ لکھنے کا حکم دیا اور میں نے اس نظم کی تیس کی۔

جب تک دارالعلوم میں رہا، اردو میں دس اشعار کے سوا کچھ نہیں کہا۔ اس زمانے میں میری فارسی فز و دقتی تمام حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب شروانی مرحوم کے ایک چلے میں شرکت پر میں نے فارسی میں ایک مثنوی سوس پڑھا۔

شاہ سیوان پھلوا دی کے مشورے پر جب میں مولوی فیض کے لئے لاہور پہنچا تو وہاں کی فضا نے عربی شاعری ختم کر دی۔

ولیتہ تافنی لغز الحس، مولوی عبداللہ ٹٹو اور مولانا، منزع علی رومی سے جب ملاقات ہوئی تو عربی شرو من کا چرچا رہا۔

میں نے حضرت مفتی حکیم سلیم اللہ صاحب مرحوم سے اس پرے فاضل اور لائق لطیف تھے، طب رچی ہے۔

ایک دفعہ مولانا رومی کے سامنے قلم کا ذکر کیا۔ مولانا نے فوراً ذکر کے بعد دستی قلم جویر کیا — اس قلم میں بھی کوئی خرابی نہیں۔ غزلیت اور شریعت بہت کافی ہے۔ ستودا، دارغ، ستود مشا پر شرا و کے قلم میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے

ایک دفعہ انجمن اشاعت القرآن کے ایک عظیم الشان جلسے میں تو میری قلم اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا ایک ایک شرو دس بار پڑھوا گیا اور ہر بار دس بار پڑھنے کی بادشہ ہوئی تھی۔

اسی آئینہ میں فر پنجاب شیخ عبدالقادر صاحب ہے، جو اس وقت ”نور بی اخبار“ کمزور اور رسالہ ”غزن“ کے ایڈیٹر اور مسماہیہ کا بے پروا فیض تھے، ملاقات ہوئی اور میں آٹھویں دسویں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔

ایک دفعہ میری ایک نظم پر شیخ صاحب نے کہا: ”وہی، ہندو میں اس وقت کم از کم دس ہزار ملکہ اس سے بھی زیادہ شاعر موجود ہیں لیکن اگر نڈکا دنگاشی کئے جائیں تو سو بھی شکل سے نکلیں گے۔ میں تم شاعر بننے کی کوشش نہ کرو، نڈکا دنگاشی ہو۔“ اس دلقے کے بعد میں نے دو سال کے عرصے میں تقریباً دس ہزار سے نڈکا لکھے لیکن شعر ایک بھی نہیں کہسا۔ اب میرے جذبات دل بوائی کی منزل میں تھے۔

۱۹۰۶ء میں کچھ دھوکا پتور دینے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر حکیم الطاف احمد آقا انصاری سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایسی گر محبت سے ملے کہ روزانہ ملاقات ہونے لگی۔ حکیم صاحب اردو کے بہترین شاعر ہیں۔ حکیم صاحب کی شاعری میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو دلی سے لکھ کر تک کسی شاعر کے کلام میں نہیں اردو یہ ہے کہ ان کا ہر شعر ترکیب ہی میں بلکہ نڈکا ملایا ہے۔

۱۹۰۶ء میں زیادہ تر گورکھپور میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ابتدا میں جناب مولوی سید بہمان اللہ صاحب رییس اعظم گورکھپور کے

دولت کرسے پرصوفت اعلیٰ درجے کے معنی فہم ہیں۔ اساتذہ کے ہزارہا
اشعار یاد۔ یہیں گورکھپوری مولوی احسان اللہ صاحب مباحثی وکیل
فتحی قطب الدین صاحب اور مولوی عبدالرحمن صاحب وکیل کے یہاں
بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

۱۹۰۸ء میں کانپور میں چند ماہ شیخ عظیم اللہ صاحب سوداگر
مرحوم کے یہاں قیام رہا۔ ان دنوں متعدد اطلاقی نگلیں کہیں۔ اس
زمانے میں میرے خیالات عجیب تھے۔ دل دینیسے ہزار موت کو یاد
کرتا اور تنہائی میں روتا۔
ایک لمحہ ————— ”سائے بالا خانے میں ایک خوبصورت
جوان عورت اکثر میری طرف متوجہ رہتی۔ میں نے اس پر ایک غلم کہی
ایک شریہ

نفس دیتا ہے مجھے ترغیب تو کہتا ہوں میں
پچھے وکس طرح یہ شربت کا ترہ لود جام
پیرکان پور سے پہنچ چکا۔ ۱۹۰۹ء میں شاہجہان پور میں متعلق
قیام اختیار کیا۔ شاہجہان پور میں شاعری کا بہت چرچا ہے۔ میں نے
بھی نگلیں لگیں اور ہنگام جلسوں میں پڑھیں۔ لیکن میں شہر میں
روشن نش تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک صاحب کی غزل بنادی اور وہ
مشاعرے میں بہت کامیاب رہی۔ ایک بار وہ ایسا ہی ہوا اور اس طرح
خواص تک میرا چرچا بچھا۔ اب وہاں ایک مشاعرہ ہوا شیخ حسین احمد
صاحبہ ارمان کا مکان تھا۔ شریک مجلس، سید حسینی احمد بیگ،
میکم فخر حسن خاں، دل، فتنی مشرق حسن اسرار فتنی افعال حسن رسوا اڈ
فتنی احمد حسینی، شوقی۔ اس مشاعرے میں میری غزل بھی پسند کی گئی۔
اسد صاحب نے بہترین داغ پایا ہے۔ فارسی میں بھی دستگاہ
رکھتے ہیں۔ فنی شعرے حافظ ہیں اور بڑے پائے کے شاعر۔
ماثر سید منظور علی، فنی تعلیم کے ماہر اور بہت اچھے شاعر۔ رسوا
مرحوم میرے کلام کے بڑے قدقدار تھے اور بڑے خوش گلو۔

ایک مشاعرے میں بھی شاہجہان پور کی ایک قابل شاعر
خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تخلص حجاب، بینائی سے محرم
جلال کھنوی کی شاکرہ، کلام بے تکلف اور جربستہ۔ ایسی ذہین، طہار

شاعرہ خاتون اس زمانے میں نہ دیکھی، دہشتی۔

کھنوی کی ایک محبت جس میں حضرت عزتیر کھنوی، مختار، سراج
عزیم، حریت شریک تھے۔ حضرت مشرے میرا یہ مطلع بار بار
پڑھوایا

محنت یہ راگنوں نے ہوائے چارہ لگی کہیں

پھرے نہ جائے لذت زخیم جگر کہیں

میں نے کئی قدر انگریزی شاعری سے بھی واقفیت حاصل کی۔
میں ہندی نہیں جانتا مگر مجھے ہر زبان کی شاعری پسند ہے۔ میرٹھ
میں اردو شاعری سب سے کم درجہ رکھتی ہے۔ تینٹی کی نزاکت اور
بلند پروازی میں فارسی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ہندی میں جذبات
دیکھتیا کی فراوانی ہے۔ انگریزی اور عربی میں سادگی اور فصاحت
ہے۔ میرٹھ میں ہے کوئی شاعر اور نہ نگار اس وقت تک نہ جیم
اردو بول سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے، جب تک وہ عربی، فارسی
سے یہ قدر ضرورت واقف نہ ہو۔

میں نے ہزار بار شکرے دیے کبھی استاد کی ضرورت محسوس نہیں
کی۔ میں شاعر کو تلیف زمین سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک شعر کے یہ معنی
ہیں کہ شاعر کے دل میں جو جذبہ پیدا ہو، جو کیفیت رونما ہو، یاد داغ ہیں
جو تخیل قائم ہو، وہ اسے بہترین اسلوب اور سقصرے الفاظ میں جس
حد تک ادا ہو سکے، ادا کر دے۔

اب ۱۹۱۵ء کا زمانہ تھا۔ سندیے کے ایک مشاعرے کے لئے
دہلی دن کی محنت میں گیا رہ سفر کی ایک غزل تیار کی۔ ہر شعر کا بری
اور معنوی اعتبار سے بہتر تھا۔ لیکن یہاں معلوم ہوا کہ مشاعرے میں
غزل پڑھنا اور اسے کامیاب بنانا ایک خاص فن ہے جو زبردست
قوت اکتساب اور صہنہ زور کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ بہت حال
سندیے کے اس مشاعرے میں فوج ناردی، ہر گوبادیاری اولیش لہری
پچھلی سے آئے ہوئے تھے۔ انھیں کے ساتھ ہمارا بھی قیام رہا۔ یہ
حضرات میرے لئے، اجنبی تھے۔ مشاعرے میں کھنوی کے شاعر زیادہ
تھے۔ شل، انجم، بہادر، آرزو، یاس، دلی کے بہتور شاعر حاضر
میں روٹی افزو تھے اور محاب صاحبہ بھی۔ گریں غزل نہیں پڑھ

سلا، دیکھی نے فراٹھی کی، زخوہ چھپے برأت ہوئی۔ مجمع دس بجے کے بعد ملت میری باری آئی اور جب میں غزل پڑھ چکا تو میں دیکھا کہ صاحب نے وہ تین بار وہاں، ماشاء اللہ، نگہ شاعر کے لئے میدان صاف کر دیا۔

غزل کی پہلی سے رات تاج ہوا۔ کافی کی سورت میں بھی کہ شاعر سے توفیق یہ تپا بیگے، پڑ چکے ہیں نے آرزو صاحب کو سینکڑوں سلام کر ڈالے۔ اور حضرت جگر گویا ری، بہتار لکھنوی، یاس عظیم آبادی اور بانہ سہلی سے **زیر قند و گنبد** کا تعلق پیدا کر لیا۔

اپنے میں ایک شاعر تھا۔ میں اس زلمے میں اپنا مکان ہوا رہا تھا۔ حضرت بیباک سکہ اہرا پران کے ساتھ چلے ہوا۔ غزل روادری میں کئی گروہ شاعرے میں بہت سرسبز ہوئی بلکہ صاحب مشاعرہ ہوئی ۱۹۱۶ء کے ابتدائی عین تھے۔ سید منظور علی صاحب ارتقا کے یہاں مشاعرہ میری غزل یہاں بھی بہت کامیاب رہی۔

۱۹۱۶ء کا یہ سہ ماہی بہت اچھی اور خوش گوارہ شائستگی میں اور کنگ اہرا پران کے مشاعرے میں بھی شریک ہوا۔ اس مشاعرہ میں غزل کھنکے کے بعد میں نے عرف نکہ نہیں کہا۔ وجہ یہ کہ میری محبوب میری ایک عرصہ تک جاری اور آواز و آواز مخالفت ڈگئی۔

شاہجہان پور میں سید المارٹ خان صاحب نے لے ڈی کلکٹر کی ذات منقشات سے تھی۔ مرنے فارسی میں کافی ہمارت رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے سن فم تھے۔ شاعری خوب سمجھتے تھے لیکن اپنا کام اپنے نام کے ساتھ بہت کم منسوب ہونے دیتے تھے۔ مجھ سے محبت فرماتے تھے۔

۱۹۱۶ء میں ختم نہ ہوا تھا کہ میں لکھنؤ گیا اور وہیں مستقل رہنے لگی۔ میرے سہ ماہی عہد، مولوی سید عبدالغفور صاحب سہ شہر مدو کا برنامہ مدوہ خوب شریک تھے، بلکہ پڑھ گویں۔ یہاں ایک شاعر میں میرے ساتھ مولانا اکرام اللہ صاحب بھی تھے جو بڑے سنی فم ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں کینگ کاغ میں ایک مشاعرہ تھا۔ مولانا غالب سوم

لے کاشی خندہ مفر عام پڑتے۔

دہلی کے اہرا پران بھی شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں مولانا شہرانی، اختر گوندی، مولانا صفی سراج اور عوم بھی تھے، مگر پہلے محسوس کیا کہ میرا لکھنوی نہ ہونا میری غزل کا سب سے بڑا عیب تھا۔ اسی سال ندوۃ العلماء میں میلاد کے ایک جلسے میں میں نے ایک نظم پڑھی۔ نامور انشا پران مولانا عبدالمہم شاعر نے داد بخشیں میں بہت ہی مبالغہ فرمایا۔

۱۹۱۹ء میں لکھنؤ کو الوداع کہا اور روزنامہ زمانہ کی ادارت کے لئے نکلے۔ آگیا مگر وہاں جہاں ۲۰ پہنچے۔ ۱۰-۲۰ آئے ہونا مولوی رہی۔ وہاں دفتر میں مولانا عبدالغنی میثم تھے، بڑے خوش ذوق و سنی فم تھے۔ وہ اکثر میرا کلام سننے اور کرنا بیت فرماتے۔

کلکتے سے واپس شاہجہان پور اور شاہجہان پور سے دہلی چلا آیا۔ بہت کم لوگوں کو مدد ملے کہ دہلی سے میرا ایک لکھن ہے۔ میرے بزرگ۔ بخار سے دہلی آئے اور انہوں نے مدد دی میں قیام کیا۔ پتی قر کے محلے میں ہمارا مکان تھا۔ میرے بزرگوں میں بعض شاہی عہدوں پر ممتاز تھے اور بعض فیزی میں شاہی کی عزت رکھتے تھے۔ مکان ہے اب بھی میرے رشتہ دار موجود ہوں لیکن علم نہیں۔ غدر میں میرے بزرگ دہلی سے گزرا اور گزرا ہے شاہجہان پور آئے۔ ۱۹۱۹ء سے خود

میں دہلی میں مقیم ہوں۔ میری شادی بھی دہلی میں ہوئی۔ اب میرے دل میں شاعری کا جذبات شوق نہ تھا۔ مگر شاہجہان پور کے ایک مشاعرے میں شریک ہوا۔ مشاعرے کے باقی نڈت چک مومن ناثرین شوق ڈیٹی کلکٹر تھے جو خود بھی بڑے سنی فم اور صاحب ذوق تھے۔ اس مشاعرے میں بہادر سراج، یاس، تجوہ موہانی بھی تھے۔ الگ دن شام کے قریب بیتابک، یاس، تجوہ اور مجھے بڑے کامیاب ملا۔ میرے بعض اشعار پند کے لئے، مگر میری غزل دہلی کے ایک مشاعرے میں بہت زیادہ کامیاب رہی۔ یہاں تک کہ میرے کلام دوست پڑھیں گے کہ میں نے جو میرے کلام کی بہت قدر کرتے ہیں میری غزل کا ایک شریک اور چاہ تصویر پر کہ اپنے منشیت کے کمرے میں آویزاں کر لیا۔

ایک روز میں بیتابک احسان اعلیٰ کے مکان میں بیٹھا تھا، دہلی کے نامور انشا پران حضرت خواجہ حسن نظامی بھی تشریف لکھتے

تھے۔ اتنے میں رائے بہا دلدار پارس داس صاحب خراجی ہوئے
 دلی تشریف لائے۔ انہوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ گیارہ ماہ
 کا جلسہ ہر کسی اچھے شاعر کا یہ بتائیے جو ایک نظم تیار کر دے۔
 خواجہ صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے سر سے
 پاؤں تک دیکھا اور خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ تو کوئی کھوسٹ آگیا
 معلوم ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے پھر میری طرف اشارہ کیا۔
 میں نے نظم لکھنے سے انکار کیا۔ رائے بہا دوسرے کہا۔ مواضع لیجئے
 میں نے کہا۔ اگر تیس شعر چاہیں تو تیس روپے ہوں گے۔ بولے شرط
 یہ ہے کہ نظم اعلیٰ درجے کی ہو۔ پوچھا فیصلہ کون کرے گا۔ بولے
 خواجہ صاحب۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ میں شاعر ہوں۔ فیصلہ
 چیک کرے گی۔ میں نے دو گھنٹے۔ ۳۰ منٹ میں یہ نظم لک دی۔ جلسے میں
 میں نے اپنی بھی چار شعر پڑھے تھے کہ پارس داس صاحب اور
 رائے بہا در سلطان سنگھ اور دوسرے بہت سے حاضرین ناچار
 روئے گئے اور جلسے میں ایک کرام برپا ہو گیا۔ نظم ختم ہونے پر
 جیہ کسی نے بے رشتہ کر بے ادب کیا۔ اس دن سے رائے بہا اور
 پارس داس میرے دوست ہو گئے اور اچھے دوست کو دنیا میں ان کے
 ہر نہ دو دوست تھے اور ان میں سے ایک دوست میں تھا۔ لالہ
 پارس داس بڑے خوش اخلاق، لطیف، شاعر، اور ادبیات
 کے شائق تھے۔ میری شاعری کے بڑے قدردان اشعاروں میں بڑے
 شوق سے شریک ہوتے تھے۔

خواجہ حسن لدھی کے اراد پر مشاعرہ بزم خسروی کے لئے جس نے
 بھی دن بھر میں چننا اشارہ رکھے۔ شام کو لالہ پارس داس آ گئے۔
 ان میں لالہ پارس داس صاحب کی کوٹھی پر تھا۔ میری شیرازی اور
 ٹوپی دو گانہ تشریف ہی ہیں ہی۔ مشاعرے میں سائل، آزاد، انصاری،
 قوسی مرحوم، جتوئی، منتظر احمدی، کاوی وغیرہ تھے۔ جب میری بادی
 آئی تو حاضرین نے بہت بے توقیر جی برف۔ لیکن جب میرا کلام آتھنابی
 لکھی کو بھجوا گیا تو مجھے زبرد آ دل دیا گیا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں
 کہ کوئی مجھے شاعر سمجھے۔ میں نے آج تک نظم و نثر کے
 کم از کم ایک لاکھ صفحات اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ لیکن میری غنزل

بڑا ڈیڑھ ہزار اشعار تک محدود ہے۔

حضرت خواجہ حسن لدھی کی عنایتیں روز بروز میرے حال پر
 افزوں ہو رہی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے سوا میں نے
 ایک شخص ایسا ایسا نہیں دیکھا جو اپنے احباب و رفقا کو ہر ممکن
 طریقے سے بڑھائے اور فائدہ پہنچائے۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب
 کے یہاں بہار کے نامور شاعر مولانا شفیق مقیم تھے۔ مولانا شفیق
 شاعر و شاعر صاحب بھی ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ جب
 میں خواجہ صاحب کے یہاں پہنچا تو ایک دیکھا ہوں کہ وہاں خواب و بیدار
 مولانا شفیق، جناب بخش اور ایک خوبصورت جوان عورت جو تاسا سب
 اور گوارا ہون کی بنا پر ایک ملکہ معلوم ہوتی تھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب
 نے تینا یا کہ وہاں کی میز پر کھانا اور صبر پر غور شدہ ہیں۔ بخش صاحب
 سے معلوم ہوا کہ وہ خود بھی شریک ہیں۔

اس واقعہ پر چند روز گزرے تھے کہ خواجہ صاحب نے مجھے قتل
 کے ایک جلسے میں مدعو کیا۔ ملا دہری صاحب، قیاسی، احسان الحق اور پندرو
 بیس آدمی اور موجود تھے۔ میں نے درمیان میں قتلے میں فارسی میں ایک
 غزل کہی۔ اب یہ غزل دہلی کے اکثر قہاؤں کی زبان پر ہے۔ اسی غزل
 کو ایک مجلس میں سن کر حضرت شاہ عبدالعصم صاحب بلند محمد سے
 فائزہ واقف ہوئے اور پھر مدوح نے مجھ سے ملاقات فرمائی اور
 میرے انسانہ زندگی میں جدید ابواب کا اضافہ کیا۔

خواجہ حسن لدھی اس کے بعد دوبارہ آ گئے اور وہاں سے کھلا
 کہ میری یہ فارسی غزل ہمارا بے کوش پرشاد نے بھی بہت پسند فرمائی۔
 ۱۹۳۶ء میں بزم خسروی کے وقت پر میں نے ایک غزل کہی۔ اس
 مشاعرے میں بیٹھ، احسان الحق بھی تھے بیٹھ خواجہ صاحب بڑے خاص فہم
 اور دلکش پرس ہیں۔ طبعی تخلص فرماتے ہیں مگر اپنا شاعر ہونا چھپاتے ہیں۔
 اس شاعرے میں ساگ دہلی، بزم، بکر، بادی، اسرار و بادی، برف، بادی
 رونق، مدوی، آزاد، انصاری شریک تھے۔ میری غزل سب سے
 بڑھ کر کیا بیاہ ہوئی۔

اسی اثنا میں حضرت مولانا قاضی مولانا محمد عظیم صاحب رئیس
 بریلی سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ تاسی صاحب عربی فارسی کے فاضل

ہیں اور بہترین معنی فہم - اساتذہ قدیم کا کلام پر کثرت یا دہے - مجھے
خاصی عادت ہے فارسی کے عجیب و غریب اشتراکات سے - خیال آیا کہ
فارسی کی کسی نزاکت خیالی اور دہی میں بھی کیوں نہ پیدا کی جائے - چنانچہ ذیلی
کا شعرا ہی احساس کے تحت لکھا

اوداں اس کی ہشتائی کو تعلقینہ مشکین کیوں دیں

کہ راہب قضا صرف وہ ہیں یرستہ سنا نے میں

ستبر کے بیٹے ہیں ایک کا بیاب مشاعرہ لالہ پارس واس کے
یہاں ہوا - مجمع و دودھاٹی ہزار سے کم نہ ہوگا - معنیک خواجہ صاحب
یعنی احسان افغانی لالہ پارس واس، بیڈٹ ہرگوالی، لالہ سیتل داس
پروفیسر کرمچندری، ساعر صاحب اور عاقلہ صاحب اختر میر جلی
بیٹھے رہے - انوس اب وہ ذات کہاں، وہ بات کہاں اور رائے ہمداد
کی ذات کہاں -

ایک دن تیناں آیا کہ اگر شاعری کا موجودہ انداز بدل دیا جائے
اور اس میں کوئی چپ پرائے میں کام کی باتیں لکھی جائیں تو اردو ادب کی
ایک بہت بڑی خدمت انجام پائے چنانچہ ایک غزل لکھی، اس کا
ایک شعر:
کام پڑھے ہیں مرے کو تاج تہ سیر سے
مجھ کو نیکی کیوں کر شکوہ تغیر سے

لیکن حالات نے اجازت نہ دی کہ اس خیال کو اردو دست دیں۔
۱۹۳۶ء میں ایک - شاعر میر سے عرض و دوست بیڈٹ ہرگوالی رئیس
ترکان دہلوانہ دہلی کے مکان پر ہوا۔ اس میں غنی و ذہقان، لالہ مرزا علی
لالہ ہمایہ پریشاد و شریک ہوئے تھے۔ اس مشاعرے کا سارا ذخیرہ
نادر پارس واس صاحب کے پاس رہا۔ میر سے کاغذات میں صرف
دو تیس مسودے تھے۔ ان کی اشاعت پر ظاہر مناسبت کے خلاف
مسامحہ ہوتی ہے۔ لیکن پچھلے تو غزل لکھنا ہی مناسبت کے خلاف
ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چند نامور شعریاں تہذیب کی چیں جہیں سے
ڈر کر انھیں شائع نہ کیا جائے۔ صدی اور جانی کے یہاں تو اس سے
زیادہ خوشیاں موجود ہیں۔

۱۹۳۳ء میں ایک تجارتی پھلا - جس میں غصب کی اعلیٰ شکی
ہوتی تھی۔ بعض مرعیوں کا بدن سرخ ہو چکا تھا۔ بعض کی مینائی میں

فخوڑ آچکا تھا۔ حالات کی چارہ لنگر، تجارت، لالہ جارا اس کے مختلف نام
تھے۔ دہلی میں اس جگہ سے شاید ہی کوئی محفوظ رہا ہو۔ میں اور میرا
سارا گھر اس میں مبتلا تھا۔ اس عالم میں دوستوں نے ایک جلسہ کیا
اور ان کے ارادہ پر میں نے ایک نظم بھی - مطلع یہ تھا:

دلی میں یہ ہستہ قیامت سے کم نہ تھا

ایسا کوئی نہ تھا کہ گرفتارِ عمر نہ تھا

میں جان کو توں خفیض کے ساتھ بھی نہیں لکھتا گھر اس خنم میں
اس طرح لکھا ہے۔

شاید ستبر کا مدینہ تھا کہ مولانا گزالی مرحوم، فارسی کے مائے ناز
شاعر دہلی تشریف لائے۔ ڈپٹی بلونت رائے نے جو مجھ سے بڑی
محبت رکھتے ہیں، مولانا کو ادکھنے میں دعوت دی۔ اس دعوت
میں میر زادہ محمد حسین، عارف اشرفی، خواجہ حسن خفائی
بیڈٹ امر ناتھ ساجر اور رائے ہمداد پارس واس شریک تھے۔
حضرت گزالی نے دو رنگ اپنے کلام سے فوازا۔ اس تقریب پر میں
نے بھی ایک فارسی نظم لکھی اور سنانی۔

دسمبر میں بیڈٹ امر ناتھ صاحب ساجر کے یہاں سالانہ شاعر
ہوا۔ بیڈٹ صاحب دہلی کی قدیم تہذیب و دھندلاری کا نمونہ ہیں۔
آج دہلی میں شرف سخن کا جو کچھ چسپا ہے وہ انہی کے دم سے ہے
اس - شاعر سے میں اردو کے ساتھ فارسی کی بھی طرح دی باقی ہے
جس نے فارسی میں بیج آزمانی کی۔ اس موقع پر حافظ ذاکر علی بی بی - اے
ایل - ایل بی شاہجہان پرست تعریف ائے ہوئے تھے اور میر
ہماں تھے - میری غزل بہت پسند کی گئی۔

چاندنی چوک میں ایک خوب صورت بالا خانہ پر میرا قیام
تھا۔ یہاں ہماری محنتوں میں ایک خوش رو، خوش خویسی
خاتون نے آمدورفت شروع کی۔ مینک چند طاق توں کے بعد
انھیں کچھ سن لکھی پیدا ہوا ہے دور کرنے کے لئے میں نے ایک
نظم لکھی - غزل کا ایک بند:

ہے آٹھ پُر خسار تو میری جاسے ہو

ہے زلف مشکبار تو میری جاسے ہو

عاض ہے تابداد تو میری بلا سے ہو

دینا سے بے قرار تو میری بلا سے ہو

تفاویں دل ہے اندر جہاں ہوں وہیں ہوں میں
عاشق مزاج ہوں مگر عاشق نہیں ہوں میں

آخری شعر:

ابنتہ مجھ کو شوق بہت دل لگی کا ہے

میری لغت میں نام یہی زندگی کا ہے

دلی میں خدمت خلق کے ایک جلسے میں میری نظم کو جو مقبولیت

حاصل ہوئی، پہلے سے یا رہے۔

میں نے ایک بار پنڈت امر ناتھ صاحب سار کے یہاں

سالانہ مشاعرے میں فارسی کی ایک غزل پڑھی۔ مرزا احمد علی بیگ

مروم اس مشاعرے کے صدر تھے۔ بڑے سخی فہم اور سخی سچ۔ میرا

کلام بہت پسند فرماتے تھے۔

پنڈت صاحب ہی کے یہاں ایک اور مشاعرے میں حکیم احمد علی

آنریبری میزبانی تھے۔ حکیم صاحب دلی کے نامور شاعر حافظ ویران

کے قوائے ہیں اور اپنی جگہ بڑے صاحب ذوق۔

پنڈت صاحب کا اگلا سالانہ مشاعرہ لالہ پارس واس صاحب

کے دیوان خانے میں منعقد ہوا۔ اس میں نواب شجاع الدین تالپان،

حکیم اسد علی منظر تھے۔ یہاں بھی میں نے فارسی غزل پڑھی اور

وہ جہد مقبول ہوئی۔

عالمگاہ دہلی میں لالہ میر برام الیم۔ اسے بڑے خوش مذاق،

خوش مزاج، پاکیزہ دود اور پاکیزہ خویش تھے۔ شہر دہلی کے بہت

شہیدانی و فخریہ جدید ان کے ذوق ادب کی بہترین یادگار ہے۔

صاحب موصوف نے ایک دن مجھے مدعو کیا۔ اس محبت میں حکیم

اجلی خان صاحب، سائل دہلی اور حضرت کبھی داتا تریہ تشریف

دے رکھتے تھے۔ میں نے غزل پڑھی:

اس وعدے کا مطلب کیا مجھوں آسان بھی ہے دشواری بھی ہے

ابرو پر سے لے ہو تو پوٹیں ہنسی، انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

لے یہاں میں ساقط ہے (ع۔م)

غزل بہت پسند کی گئی۔

میں نے بھی اپنا کلام کسی اخبار یا رسالے میں شائع نہیں کیا

مگر بعض دوستوں نے یہ غزل شائع کرادی۔ خدا کی شان دیکھو کہ

اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں جہاں یہ غزل

سُنی نہ گئی ہو۔ ملک کے بڑے بڑے موسیقی دانوں نے اسے

گایا ہے اور گراموفون ریکارڈ میں بھی ریکارڈ کیا ہے۔

ایک دن حضرت شاہ عبدالعزیز کے ان قوالی پوری تھی۔

میں اُن تھے، لگاتار حضرت نے فرمایا کہ ایک غزل اور سنئے جاؤ۔

میں نے سنا تو وہ اپنی غزل تھی۔ ایک دن ایسا ہی واقعہ

دیکھ کر ارحمن صاحب کے یہاں ہوا۔

سیس الملک حکیم حافظ عبدالرحمن خان بڑے جامع انصاف

بزرگ تھے۔ جن لب کے مجدد و امام، عربی فارسی کے ادیب، اعلیٰ

درجے کے سنی کے اور سنی فہم۔ میری پہلی غزل سننے کے بعد اس کی

قدرو منزلت سے پیش آنے کے اس کا اثر آج تک دل میں محسوس

کرتا ہوں۔ جامعہ تعلیم کا سالانہ جلسہ تھا اور شاہ عہدہ۔

حکیم صاحب نے میرے لئے سوادی بھیجی۔ ملاقات ہوئی تو فرمایا

”آپ کی ملاقات کا یہی امداد ہے گا؟“ میں نے عرض کیا کہ وقت

تیار دین روز انداز حاضر ہو جایا کروں گا۔ فرمایا ”رات کو و سے

اچھے نمک“۔

سنگم ٹھیکڑ میں ترک مرثاب کے متعلق ایک جلسہ تھا۔ اس

میں کئی ہزار آدمی شریک ہوئے۔ مولانا محمد علی اور لالہ پارس اس

کے اہلکار پر مجھے بھی کچھ بڑھانا پڑا۔ مولانا محمد علی مجھے بہت محبت

رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آپ موقع ملنے سے منظر عام پر نہ

آئیں اور آپ سے کم درجے کے لوگ بلیک ہیں بشور ہو گئے۔

ایک دن جمع و بے میرا خلاق حسین دہلی جو بڑے خوش گو

اور خوش فاشاعر ہیں، تشریف لائے اور حکیم اجماعی صاحب

کے ہاں مشاعرے میں مدعو کر گئے۔ میں نے بھی شام تک غزل کہہ

لی۔ اس مجلس میں ادیب، شاعر اور فلسفی بلکہ غزلیہ فہم قساری

مرغزار حسین عانی بھی تھے اور نواب صاحب بوٹا رو بھی۔

بہت امانتدار تھے سارے کے یہاں ماہر مشاعرہ تھا۔ میری یاد میں سب سے بڑا ماہر مشاعرہ۔ اس مشاعرے میں مولوی شرف الدین صاحب یاس کوئی کے علاوہ برق، ذار، سحر، اکبر اور مجن بھی تھے۔ ایک دن حکیم اجمل خاں صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ حسائی موصاف صاحب مالک کو کبھی حاجی علی جان اور دوسرے حضرات شریف لائے حکیم صاحب کی فرمائش پر بیٹھے ہیں نے کچھ عرض کیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے اپنی بیاض منگوائی اور حسب دستور سائل صاحب سے اپنی چند غزلیں پڑھوائیں۔ مجھے یہ شعر پسند آیا۔

یاد آتا ہے کہ میں از ہمسر تقدیم نسیب
ہم جینے دہشتم، ہم آستے دہشتم
دوسرے دن جب گیا تو اس شعر پر تعین لکھ کر لے گیا ہے حاضر مجلس نے بہت پسند کیا۔

حضرت سیاح الملک کے یہاں جو پراپرٹ مشاعرے ہوتے تھے ان میں یہی طریق عمل تھا کہ چند گھنٹے یا ایک دو دن پہلے طرح کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اس مجلس میں ڈپٹی ناٹا مرحوم (علی گڑھ) بھی تھے علی گڑھ میں اپنے محترم دوست مولانا اکرام اللہ خاں صاحب کا یہاں تھا۔ فارسی کی ایک غزل وہاں بھی سون ہو گئی۔

ایک دن حکیم اجمل خاں صاحب نے فرمایا، آؤاب صاحب رام پور آئے ہوئے ہیں، کئی شام میرے یہاں مدھویں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کو سرکار کے دور رس پیش کر دوں۔ مگر تم ایک غزل لکھو اور طرح حکیم صاحب سے دی۔ گھر پہنچا تو رات کے ۱۲ بج چکے تھے۔ صبح اٹھ کر غزل شروع کی اور شام کے ۶ بجے حکیم صاحب کے دولت کوہ پر پہنچ گیا۔

آج اس دولت کوہ کے کا عالم یہی اور تھا۔ مجھے دیکھ کر حکیم صاحب نے مسکرا کر فرمایا ”آپ آ گئے“۔ اس کے بعد حکیم صاحب مجھے آؤاب صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ میں مہربان کھڑا تھا کہ آؤاب صاحب نے فرمایا ”بیٹھ جاؤ“۔ آؤاب صاحب کا پورا شرافت موجود تھا۔ حکیم صاحب نے تعارف کراتے ہوئے میرے متعلق ایسے تخریجی الفاظ فرمائے کہ سننے والوں نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب نے آؤاب صاحب سے ایسے برزور الفاظ میں کسی کا تعارف نہیں فرمایا۔

حکیم صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اردو، قدسی، عربی تینوں زبانوں میں شریف تھے۔ آؤاب صاحب نے پہلے شریف کے متعلق سوال کیا۔ میں نے عرض کیا کہ شریف سے دل چڑی نہ مجھے طالب علم کے زمانے میں بھی نہ اب ہے۔ پھر حکیم صاحب نے اجازت حاصل کی کہ میں کچھ پڑھوں۔ میں نے دو چار شعر فارسی میں عرض کرنا چاہے تو فرمایا کہ اہل زبان میں موجود ہیں دیر ایک ایرانی مجتہد صاحب کی طرف اشارہ تھا، ان کے سامنے کیا پڑھو گئے۔ میں نے تامل کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کیا مضائقہ ہے میں نے چند غیر مقدی اشعار پڑھے۔ مجتہد صاحب نے کئی اشعار پر منت کی صلا بلدی (افسوس کہ یہ فارسی اشعار کو گئے) اس کے بعد آؤاب صاحب کی فرمائش پر حکیم صاحب نے دی ہوئی طرح میں غزل پیش کی، مجھے آؤاب صاحب نے بہت توجہ سے سنا۔ دو تین اشعار پڑ فرمایا۔ ”بہت اچھے، بہت اچھے“ جب کسی شعر پر آؤاب صاحب داد دیتے تو حاضری بھی مہربا، سبحان اللہ کی صلا بلدی کرتے دیر نہ خاموشی رہتی۔

اس غزل کا ایک شعر:

اے صبا، اک آخری ارمان باقی ہے ابھی

دل کے یہ ڈرے نہ جو ابھی پریشاں، دیکھنا

اس غزل کے بعد آؤاب صاحب نے فرمایا کہ بھائی کچھ عربی کا کلام بھی سناؤ میں نے عرض کیا دہائی کچھ یاد نہیں۔ بیاض لایا نہیں۔ فرمایا ناں بھائی کیوں لاتے۔ خیال کیا ہوگا کہ وہاں کوئی گھمے گا، بزرگ اُدھ شرفیو سناؤ حکیم صاحب نے فرمایا، کیا حرج ہے۔ جہاں چاہیں نے دو شعر پڑھے۔ دوسرے دن چند دہائی شعر پیش کئے۔

حاجی علی نقی حیدر آبادی واقعہ قوال کے نام سے مشہور ملی آئے ہوئے تھے۔ اجاب کے ارمار میں نے انھیں ایک فارسی غزل دی۔ قوال میں بہت کامیاب رہی۔

میں پندرہ سولہ سال سے ریاضی شکایات میں مبتلا ہوں۔ ہزاروں دوسرے پڑھے ہیں۔ سیکڑوں یازدہ عالم لاری ہو چکا ہے لیکن بقول غالب ”موت آتی ہے پر نہیں آتی“۔ خیال کیا کہ میرے الملک سے درد دل کہا جائے۔ چنانچہ میں نے اس طرح اظہار کیا

ما حب لکرمین نہ روم از دیش

حق کہ اور ابخشد یکسندیم

دستی ہزار حبیب کہ از دست می رود

مردے چنی سخی ورد خوش بھر و دفع

حکیم صاحب اپنے پبلنگ پر پاؤں ٹٹائے، زانوؤں پر تکیہ، کتھے پر کھنیاں، ہتھیلیوں پر رخسار رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ لوگ کیسوں پر دو دبیر۔ حضرت سائل نے یہ نگاہ سنایا۔ حکیم صاحب دینک مسکراتے رہے۔ فرمایا، خوب اشنا رہی، لیکن آخری شعر سے مجھے اختلاف ہے۔ ایسا نہ ہوگا۔ جب مجلس پر غاصت ہوئی تو فرمایا آپ ص ۵ بجے آجائیں۔ مجھے آتے ہیں کچھ دیر ہوئی تو آدمی مجھ سے میں قاسم جان بنایا تھا کہ سانس سے آتے ہوئے منظر آئے۔ میں ساتھ ہو گیا۔ حکیم صاحب پہلے ذواب شجاع الدین تالیاں کے یہاں گئے۔ پھر موڑ میں سوار ہو گئے، اچھے پاس بٹھایا۔ نبض دیکھی اور نسخہ تحریر فرمایا۔

بندت ماحرکہ یہاں پھر ایک سالانہ مشاعرہ۔ شام سے ۹ بجے تک تین دفعہ موڑ بھی۔ آخر جا پڑا۔ مشاعرے میں مگر د اعتراض بھی تھے۔ میں ۱۲ بجے رات گھر آ گیا، مگر نیند نہ آئی۔ اس عالم میں ایک غزل لکھی اور صبح اسی پر ایک شعر۔ مرزا محمد علی بیگ صدر تھے۔ کہیں ۲ بجے کہ بدھیری بادی آئی۔ ہر شہر پر تھیں وہ آفریں کے نور سے بلند ہوئے۔ ایک شعر پر تو صاحب صدر نے یہ اٹھ کر بوسہ دیا۔

انہی دنوں ارباب دہلی نے گاڑھے کے متعلق ایک غلیظ نشان جلسہ کیا۔ قاری عباس حسین صاحب نے شرکت پر مجبور کیا۔ مہر عطر پہننے سے بھی ایک نظم لکھی۔ اس نظم کا پہلا بند:

ترقی کی راہیں دھبے سے گاڑھا
تو تیار دولت تباہے کا گاڑھا
غم تنگ دستی شائے کا گاڑھا
کفایت شادی سکھائے کا گاڑھا
سب تو بزرگی کے سکھائے کا گاڑھا

ایک دن لالہ پارس داس صاحب کے یہاں پیر پیر گو کی میٹری۔ ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا اور طرح ”پہار رنگ لگے ہزار انگ لگے“

اس جہت مشاعرے میں بھی میری غزل بہت مقبول ہوئی۔ اگرچہ خود مجھے وہ پسند نہیں۔ منتقل یہ تھا،

جس میں جب نہ رہا اپنا آشتیاں دمخ

مری بلا سے اگر لاکھ بار آگ لگے

ایک دن دیکھ ڈاکا اہل صاحب کے یہاں مدعو تھا۔ مرحوم بڑے

زیدہ دل، ظریفیت اہل اور کثیر الاحباب تھے۔ مرنے سے چند روز پہلے انگریز بالکل مستعد تھے تو مایوسی کے کلمات ان کی زبان پر آ جاتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ اپنا کام سنائیے۔ میں نے یہ مطلب پڑھا،

اب مناسب ہے کہ دستی ترک و تنبا بیچے

آئینہ داسے پہن کر فسر و اچھے

شعر کا سنا تھا کہ زار داروں نے لگے ادھر ہی دینک دوست رہے۔

صبح الملک حکیم جیل خان صاحب وقتاً فوقتاً کرتے ہیں۔ بڑے

صنعتیہ نم۔ جلوت میں سفیدہ۔ جلوت میں خوش شمع۔ گنگوڑس، ذہبی و ہلوار

ہیں، شہر میں زبان و خیال کی سادگی زیادہ پسند ہے۔ اسی نے ان کے بعض

اشعار میں ایسی سادگی اور صفائی قوت ہے کہ ہر سرخی نظر میں آتا دھوکا

ہوتا ہے آپ کی غزل کا مجموعہ دیوان و ناکے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

والد حکیم اہل خان صاحب کی طرح آپ بھی منتظر شاعر کے جمہیت مستعد کرتے

ہیں۔ شاید ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ آپ کے ہاں ایک ایسی ہی مجلس مستعد

ہوئی۔ طرح تھی۔ ”میا کے ساتھ“ حضرات شیدا، شوق، لالہ محمدی لال

اور مرزا عجاز زین، عجاز زین کم شیک تھے۔ میں نے غزل پڑھی،

اسے دل سے اتفاق نہ ہواں کی دلیل ہے

اس کا نہ دیکھنا نغمہ مستفانہ کے ساتھ

حکیم اہل خان صاحب کے ہاں ایک اور شہری مصلیٰ میں خان بہاد

شیخ امیر علی سیستانی، ڈاکٹر سمیع الدین کلو، خواجہ عبدالغیر دراز، شیخ

خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر محمد شفیق، پی۔ ایچ۔ ڈی، لالہ مست لال، مولانا

ابوالکمال حمید اللہ بیگ، مارچ تھے اور ایک گروپٹ مارچو بیگ بھی

تھیں۔ شعر خوانی کے بعد اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔

مولانا فخر الدین شیر کوئی ایک، عجاز لالان، میرے قدیم

کرمفرما ہیں۔ وہ بھی اپنے ہاں کبھی مجلس شہری مستعد کرتے ہیں۔ مولانا

کے یہاں میں نے بھی ایک مرتبہ غزل پڑھی۔ ایک شعر:

دیکھا دیکھی کہ بیٹھے ہیں بازی کا وہ لعنت میں

لیکن یہ معلوم نہیں کہ کون سی گئی یا پائیں گے

ایک ورہ ماہر صاحب دہلوی کے یہاں بیٹھا ہوا تھا بخشی جھونپیر
تھا قوی نے کچا اشارہ سنا ہے۔ افسوس ہے کہ بخشی موصوف ایک ہی ہفتے
کی بیماری میں دماغ مفارقت دے گئے حالانکہ وقت سے پہلے بہترین
تندرستی رکھتے تھے۔

اچھا صاحب اب رحمت! اگر زندہ رہا اور کچھ عرض کرنے کا موقع
ملا تو اگلے ایڈیشن میں پیش کروں گا۔۔۔۔ اگر میرے مفوض ذوقی سنی
سے اپنے آپ کے ناگوار کی محسوس کی ہو تو اس کی معافی چاہتا ہوں۔ امید ہے
کہ آپ مجھے مزبور محافت فرما دیں گے۔ مجھے کہ میری عمران اوراق سے
بھی کم ہے اور محسوس ہے کہ جب یہ نوشتہ آپ کے سامنے ہو تو زندہ
دنیا کی نظر سے اوجھل ہو چکا ہو (اور واقعہ یہ بھی ہے کہ وحشی صاحب
زندہ نہیں۔ برسوں سے نہیں۔ جرت)

اگر ناخرم کرام کو اس طویل کلام نے تھکا دیا تو پھر حضرت وحشی
کے چند اشارہ اور لحاظ فرمائیں، تکان دور ہو جائے گی:

شاید غبارِ غم کا یہی اک علاج ہے

کچھ دیر روئے تو طبیعت سنبھل گئی

ناگوارہ ہم نے جرم کا قرار کسب کیا جب کہ علاج یہ تجھ ہی ہے جانہ سوسکا
پہلے تو نہ تھی اتنی وحشت مجھے ذمہاں میں

پھر نفس ہمارا آئی شاید چہشتاں میں

مرگِ بخش پہ پیرِ نرخی اسے دوست آخسراک دن تجھے بھی مرنا ہے
جس کے شبنم نے ہمارے نہ ہوں آئو

ہم نے کوئی ایسا کچل خندان نہیں دیکھا

پوچھی ہے ان سے دادی امین کی سرگزشت

تہیہ دید کچھ تو چاہیئے آخسر سوال کی

اس خوف سے کہ ہر نہ مگر نہ ترازا ج

جسرات ہیں ہوئی نہ کبھی عرضِ حال کی

ہم کو ہنگامہ مستح کی جرات ہے جب کبھی آنکھ تو فرمایا یہ قیامت دیکھی

یا یہ کہو کہ آگ ہیں پروانہ صبل گیا

یا یہ کہو کہ جسکی طاقت نہیں دی

ہشیدانِ وفا کی حسرتیں بھی یاد کر لینا

اگر فرصت ملے نتھارہ گوہرِ سربیاں کی

دامنِ لالہ دلی ہو کہ نقابِ مسدود

دیکھنے والے تمہیں دیکھ لیا کرتے ہیں

اُچھے ہوئے ہیں تارِ نفس میں جنوں کے ماتھے

ذمت کسان کہ تارِ غم یہاں نکالے

وہ شوقِ کب ہوا وہ انگلیں کہاں گئیں

وہ حق یہ عشق تھا کہ جوانی کا بخش تھا

جار ہے ہوسوئے سے غارِ جنابِ وحشی

راہ میں کون شفیق سنا نہ کہیں مل جائے

یہ تو سب کچھ ہے کمر اسے وحشی کو تہا میں

کام سے پہلے ذرا انجام سوچا لیجئے

کس رنجوت سے چلے تھے دردِ دوم و خیال

نہ ملا بارگسی کو ترسے کاشانے میں

دل کی حرکت بند ہے تو میں نہیں آئواریہ کچھ کہ مرادِ تہ سحر ہے

تھارے ناوکِ مرگ کی کانام سننا تھا

جز نہ حق کہ ناوک ہیں میری قسمت میں

جنوں ہیں بھی نہ تھا کوہن سے کم وحشی

کے مٹے، تم نے بھی کچھ کام عسدا لعنت میں

تا چند ایک منظر، انکا میں نگاہیں

اب اپنے بیستہ دسے اے آسمان بدل دے

کلام فارسی

ہر کسے درخوہا میں معیتِ غفلتِ نہ بود

شاد باش اسے دلِ وحشی کہ ترا غم دادند

خاطرِ نازک میں شہزادِ احسان نہ خورد

تشنہ لبِ میرم و شہرِ مندہ دریا نہ شوم

ابیں مسرکہ مستکارِ دارم و قصبِ غمِ روزگارِ دارم

مئی ۱۹۳۲ء



ہم کہ آدم ہیں، ابن آدم ہیں
جنہ تقدیس کے میں ہم ہیں
خیر و شر سب ہمارے دم ہے
نیشتر ہم ہیں، انجیس ہم ہیں

سب فرشتے پڑے ہیں سحرے میں
ایک ابلیس ہم سے برہم ہے
پھر بھی کیسے بُرا کہیں اس کو
آج تک جو ہمارا ہمدم ہے

یوں تویز داں کا بھی جواب نہیں
اہرمن کی بھی بات کیا کہنا
کس کے اعلیٰ کہیں کسے ادنیٰ
دن ہے دن، رات رات کیا کہنا

ایک رحمان، دوسرا ابلیس
خیر ہی نیر ایک شر ہی شر
اور ہم خیر و شر کا سنگم ہیں
ہے امانت کا بار بھی ہم پر

کائناتِ حیات پُر اسرار
ہم دادِ راک و آگئی سے پرے
رازِ تخلیق، وحدتِ افساد
کون اب اس کا انکشاف کرے

زندگی - سرخوشی و سرمستی
ہنس کے ہرغم قبول کرتے ہے
اور غم کو خوشی بتانے میں
چوکتی ہے نہ بھول کرتی ہے

محرمِ راز، محرمِ اسرار
عشق ہے وہ بھی اک محبتِ راز
پھوٹ پڑتا ہے نعرِ عرفان
چھپتا ہے وہ جب جنوں کا ساز

بحسبِ و برپرسد کا قبضہ ہے
آسمان پر بھی اس کی نظیر ہیں
علم و فن کے کمال کی سو گند
چاند تارے بھی اس کی زد میں ہیں

دل کا عرفان، روح کا وجدان
یہ حقیقت، یہ معرفتِ ابہام
جامِ جوشِ جنوں لٹھکتے ہی
ہونے لگتا ہے عشق کو ابہام

اڑ رہی ہے خسروِ غلاؤں میں
جامِ تغیرِ کائنات لے
تاکہ محفل میں چاند تاروں کی
زہرہ و مشتری کے ساتھ پئے

ہم، ہماری انا، ہمارا دل
تشنگی سے حیات تابستہ
روحِ انسانیت، غمِ انسان
گمئی عشق ہی سے ہے زندہ

ہم کہ مسجد ہیں فرشتوں کے
دُ فلکِ احترام کرتے ہیں
ہم کہ مشبہ قیام ہیں پیرِ بھی
چاند تارے سلام کرتے ہیں

حیدرآباد

(ایک قدیم اور عظیم شہر)

ایک جگہ کہتا ہے :

” اے غلام ! تو میرے شہر کو لوگوں سے اس طرح
مہمور کر دے جس طرح تو نے سمند میں مچھلیاں مہمور
کر دی ہیں۔“

تاریخ قطب شاہی میں اس کی آپ دہوا اور محل وقوع کے متعلق
درج ہے کہ اس کی آب دہوا بہت دل کش اور لطیف ہے اور یہ مقام
مبارک اور مسعود ہے اسی لئے حیدرآباد کو فرزندہ بنیا کہنا جاتا ہے ۔
محموق قطب شاہ نے سب سے پہلے وسط شہر میں جہاں جھاگ
کا گھر تھا چارمینار کا سنگ بنیا دکھا ۔ اس کے چاروں طرف چار بابا زار
اور شاہراہیں قائم کیں ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ان بابا زار
میں چودہ ہزار دروگاہیں تھیں ۔ چاروں طرف قریبے کی شکل کی عمارت ہے
جو ۱۸۹ فٹ بلند ہے ۔ یہ عمارت مربع پتھر اور پگ سے بنائی گئی ہے ۔ اس
کے چاروں طرف چار مینار ، اندود میان میں ایک مسجد ، ایک خانقاہ
ایک مدرسہ اور ایک حوض ہے ۔ اس کے مینار ۱۹۰ فٹ بلند ہیں ۔ وسطی
عمار ت ۔ سڈ فٹ عرض اور ۲۰ فٹ بلند چار محرابوں پر مشتمل ہے ۔ جن
کے درمیان ایک گنبد کی چھت ہے ۔ اس چھت پر ایک دو منزلہ محراب
بنائی گئی ہے ۔ جس کی پہلی منزل پر مدرسہ اور خانقاہ اور دوسری منزل

حیدرآباد کو قطب شاہی سلطنت کے چوتھے بادشاہ
محموق قطب شاہ نے ۱۵۹۱ء میں بسایا تھا ۔ جس زمانے میں گوکنڈے
میں قطب شاہیوں کی حکومت قائم تھی حیدرآباد موسیٰ ندی کے کنارے
آباد ایک چھوٹا سا موضع تھا جس کا نام پھیم تھا ۔ جہاں محموق قطب شاہ
کی محبوبہ جھاگ متی رہا کرتی تھی اور اس کی راضی ہی اصل میں اس شہر کی
بنیاد کی محرک تھی ۔ جب محموق قطب شاہ بادشاہ ہوا تو اس نے جھاگ متی
کے نام پر ایک نیا دارالحفاظ جھاگ متی بسایا ۔ بعد کو جب جھاگ متی کو
میدخل کا خطاب دیا گیا تو اس کا نام بھی بدل کر حیدرآباد رکھ دیا گیا اڈ
جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے ۔

محموق قطب شاہ نے صرف اپنی محبوبہ کا دل رکھنے کی کو بیچے
آبادی ملنے بہت گوکنڈے کو چھوڑ کر ایک نیا پایہ تخت نہیں بنایا ۔ بلکہ
اس شہر کی تعمیر اور آراگش میں اس نے خصوصی دل چسپی لی ۔ محموق
قطب شاہ کا ذہن ایک فن کار کا ذہن تھا جس نے اس شہر کا بڑا اچھا
نقشہ تیار کیا اور اس نقشے کو رو بہ عمل بھی لایا ۔ محموق قطب شاہ اردو
زبان کا پہلا شاعر ہے ۔ یہ ساتھی قلمی کرتا تھا ۔ اردو کے علاوہ دہلتگی
اور فارسی میں بھی شاعری کرتا تھا اور بڑا فنیسار دل اور وسیع انظر
تھا ۔ اس شہر کی تعمیر کے بعد اس نے ایک سنا جات لکھی تھی جس میں

پرسووار وحشی تعمیر کے لئے آئے ہیں۔ ان کے اوپر پہنچنے کے لئے چاروں
میدانوں میں بیڑھیاں لی ہوئی ہیں۔ یہ چڑیاں باہر سے نکل نہیں
سکتیں۔ چار میار کے علاوہ محمقی قلب شاہ نے اپنے زمانے میں کئی
عالی شانہ تعمیر کروائے تھے جو یہی قابل ذکر دولت خانہ عالی، چنٹ محل
گلگلی، علی، بی، بی، جلی، میر علی، داد علی، اکوہ در علی اور قلب محل
ہیں۔ ان عایشان محروں کے علاوہ جن کا آج کوئی نشان نہیں، عورتی قلبہ
نے اپنے زمانے میں بہتر سے بہتر نام، مسجدیں، باغ و خانے، لکڑ خانے
درست، مہمان خانے، کاروان سرائے اور دواخانے بھی بنوائے۔
چاچ مسجد، بادشاہی باغ و خانہ اور محلہ دارالانشاء ان ہی باقیات الصالحات
میں سے ہیں۔ اس طرح عورتی قلب شاہ کے تعمیر کردہ عمارتوں کی ایک
فہرست درست ہے جو آج صرف کتابوں کے ادراک ہی میں موجود ہیں اور
جو کہ کہیں نشان نہیں۔ اس زمانے کی عمارتوں میں صرف چار میار
اب تک صحیح و سالم حالت میں ہے۔ ڈاکٹر علی، الدین قادی قمر کے
ادارہ دیجات اردو واقع ایوان اردو میں اس زمانے کے جید آباد
شہر کا ایک بڑا نقشہ موجود ہے جس کے دیکھنے سے اس زمانے کے
جید آباد کا ایک خانہ عام سے دیکھ ہی آ جاتا ہے۔

۱۰۔ فٹ عربی اور ۷ فٹ بلند ہے۔ اس کی چیت پینہ گبندوں پر شقی ہے۔ اور یہ گبند اس خوبی سے بنائے گئے ہیں کہ شاہر سے نکل آتے ہیں اور اندر سے گیم کو یہ جن ستونوں پر قائم ہیں ان کو بڑی بڑی کمانوں اور محرابوں کی شکل دے دی گئی ہے۔

۱۷۶۲ء میں عبدالغفر قطب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ کیونکہ اس کا کلاں
 (شاہ) نہیں تھا اس لئے اُمراء نے اس کے سب سے چھوٹے داماد ابوالحسن
 کو تاج شاہ کے لقب سے بادشاہ بنادیا۔ ابوالحسن تاج شاہ قطب شاہی
 سلطنت کا آخری بادشاہ تھا جس نے چودہ سال حکومت کی اور پھر اس
 پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ مغل ہشت شاہ اورنگ زیب دکن میں مر مغلوں
 دے کر ایک منتظم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر میرا پوتہ
 درو گنڈہ (حیدر آباد) کی سلطنتوں کی وجہ سے وہ اپنے اس مقصد میں
 کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ سلیطین مر مغلوں کو مدد دیتی تھیں۔
 یہاں پر اورنگ زیب سے پہلے ان ریاستوں کی مغلوب کرنے کی سوجھ
 بوچھے تھیں۔ پور اور پھر گنڈہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۸۷ء تا ۱۷۰۷ء

یعنی ۳۷ سال تک حیدرآباد متلون کا دست نگرہا جبکہ ۱۷۶۲ء میں نظام الملک اول نے مثل سلطنت کا شیرازہ بھرنے کے بعد روکنے کے آذی من مریبلہ عمار الملک مبارز خان کو تشکک دے کر دکن میں آرمٹ جاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ مگر انھوں نے حیدرآباد کو نہیں بلکہ اورنگ آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ ان کی ریاست میں تلنگانہ، مرہٹہ، اردو، گوناگ، علاقہ تھانی تھے۔ پھر بھی وہ حیدرآباد آئے جاتے اور یہاں قیام کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اپنے تقسیم کئے گئے انھوں نے یہاں ایک جوبلی بھی بنوائی تھی جو علی نظام الملک کے نام سے مشہور ہوئی اور آج بھی موجود ہے۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے بعد ان کے جانشینی کے بڑے جانشین تھے۔ اور باقریتب نامہ جنگ، مظفر جنگ اور صلاحیت جنگ بادشاہ ہوئے۔ مگر انھیں آصف جاہی بادشاہوں کے ذمے سے شہر نہیں کیا جاتا بلکہ نظام الملک ثانی، میر نظام علی خان کو کہہ جاتا ہے جنھوں نے ۱۷۵۰ء میں صلاحیت جنگ کو ایک کر کے خود تخت سلطاں پھرا انھوں نے پایہ تخت حیدرآباد منتقل کیا اور یہاں منصب علی اور عمارتیں تعمیر کراوائیں۔ ایک زمانے سے پایہ تخت رہے کی وجہ سے اس شہر کی رونق جاتی رہی تھی مگر نظام علی خان نے یہاں پھر بھی رونق اور چمک دیک قائم کر دی۔ نظام علی خان بھی تعمیر کا شوق رکھتے تھے دکن الدولہ، پنج محلہ اور پانی جوبلی ان ہی کے زمانے میں بنائی گئی۔

نظام علی خان آصف ثانی کے بعد سکندر جاہ نظام شہنشاہ ان کے بعد تھے اور الدولہ نظام لڑاکا اور افضل الدولہ نظام قاسم ریاست حیدرآباد کے حکمران ہوئے۔ ان لوگوں کے زمانے میں کوئی خاص تغیری یاد بخیر قسم کے قابل ذکر کام نہیں ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں جب افضل الدولہ کا انتقال ہوا تو ان کے فرزند میر محبوب علی خان صرف دوسال کے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ چند نشان پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط ہو چکا تھا اور تمام دیسی ریاستوں نے انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ ریاست حیدرآباد بھی جو سب سے بڑی دیسی ریاست تھی انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم

کر تی تھی۔ انگریزوں اور حکام حیدرآباد کے تعلقات بھی ہمیشہ بہت ہی خوش گوار رہے۔ کیونکہ میر محبوب علی خان ابھی بائیس برس بڑے تھے اس لئے حکومت کا کام رشید الدین خان ممتاز الملک سرسارار جنگ اول اور سر آسان جاہ نے سنبھالا۔ ان ہی کے زمانے میں ہندوستانیوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی لڑی۔ بچے انگریزوں نے اس زمانے میں غدر کا نام دیا تھا۔ کوش سنبھالنے کے بعد میر محبوب علی خان نے عہد حکومت کو مستحسنی لی۔ بعد میں ان کے وزیر اعظم چندو محل شاہی رہے۔ میر محبوب علی خان کے زمانے میں روشن ثانی عام ہو رہی تھی۔ چنانچہ حیدرآباد اس زمانے میں بہت کچھ موجودہ زمانے سے روشن سا ہوا اور یہاں انگریزی کالجی و اعلیٰ مدرسہ لگا۔ میر محبوب علی خان کے زمانے ہی میں حیدرآباد کی سرکاری زبان انگریزی سے اردو ہوئی۔ میر محبوب علی خان کے زمانے میں بہت کچھ جدید عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں۔ جن میں موسیٰ ندی کے کنارے خلافت العالیہ کی عمارت خاص طور پر قابل ذکر ہے جو اس وقت آذربھار پیدیش لائی کوٹ اہماتی ہے۔ باغ عام بھی ان ہی کے زمانے میں بنایا گیا۔ یہ ایک بہت ہی وسیع و عریض اور خوش مذاق قریح کاہ ہے۔ جہاں شام کو عوام کا گھنڈا ہوتا ہے۔ گنگ کوٹ، یہاں برٹشن علی خان نظام ساج اپنے زاد بادشاہت میں اور اب بھی قیام پذیر ہیں انھوں نے ہی خریدی تھی۔

۱۹۱۱ء میں میر محبوب علی خان نظام ساج کا انتقال ہو گیا اور ان کے فرزند میر عثمان علی خان نظام ساج تخت نشین ہوئے جو ۱۹۱۷ء تک ریاست حیدرآباد کے اطریق یوینین میں شعلی ہوئے تک حیدرآباد کے حکمران رہے۔ یہ مہفت جاہی خاندان کے سب قویں اور خری بادشاہ ہیں۔ ان کے زمانے میں حیدرآباد نے بہت ترقی کی۔ انھیں جدید عمارتیں لگا جاتا ہے اور بڑی حد تک سبھی جمے۔ میر عثمان علی خان ایک وسیع انتظار علم دوست اور روشن خیال حکمران رہے ہیں۔ ان ہی کے زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا خاکہ تیار ہوا اور سندھوستان میں اردو بونی و روشی کا خواب شرمندہ تعمیر ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی ان کے نام پر بنائی گئی تھی اور اب بھی ان کے نام سے باقی ہے، اس کی عمارتیں تعمیریں ایشیا کی عظیم عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ شہر سے دور پر سکون ماحولی میں پتھر کی بلند بادشاہت

عمارت یرمضان علی خان کی یاد دلائی رہے گی۔ اسٹینڈ لائبریری جو اب اسٹینڈ لائبریری کے نام سے موسوم ہے انھوں نے ہی جوائی تھی۔ اس کے علاوہ موہنی ندی کے کنارے عدالت احاطہ دہائی کورٹ کے درپردہ خانہ میٹریز کی سرسبز دشا زار مہارت بھی ان ہی کے زمانے میں بنائی گئی۔ موہنی ندی کی مہینیاں سے بچنے کے لئے دو مشہور تالاب مٹن سنگر اور حمایت ساگر بھی ان کے زمانے ہی میں بنائے گئے عثمانی ساگر جو عثمان علی خان کے نام پر بنایا گیا ہے۔ جو خصوصاً گندھی جیل میں واقع ہے اس کے گندھی پتھر کا تالاب بھی کہلاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا تالاب ہے یہاں سے شہر حیدرآباد کو تلوں کے ذریعہ پانی پتیا گیا ہے۔ حمایت ساگر ان کے بڑے صاحبزادے حمایت علی خان، عظمیٰ شاہ کے نام پر بنایا گیا ہے ان کے زمانے میں ایک پتھر مارکیٹ بنی تھی جو ان کے چھوٹے صاحبزادے شجاعت علی خان مغل کے نام پر منظم جاہی مارکیٹ کہلاتی ہے۔ یہ عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے اور اس میں ایک گنہ گھر بھی ہے۔ عظمیٰ شاہی مارکیٹ میں ہر دیانت زدگی کو جلد پھینک دیتی ہے۔ عثمان علی خان کے زمانے میں حیدرآباد میں دارالترجمہ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں ہندوستان بھر سے اردو کے چوٹی کے عالم، شاعر اور ادیب اکٹھے کئے گئے اور جہاں سے ہر قسم کی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ حیدرآباد میں موجودہ خبروں کی ساری خصوصیات یرمضان علی خان کے زمانے میں ہی آئیں۔ یرمضان علی خان نے باپ کا کام میں اپنے جتنی سببوں کے موقع پر ایک عالی شان عمارت (جولائی ہال) بھی تعمیر کی تھی جہاں ان دونوں آدھرا پردیش دوکان سب کے اجلاس ہوتے ہیں۔ یرمضان علی خان خود بھی شاعر ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شکریت ہیں اور انگریزی پر بھی، عجمی دہترس رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ۱۰۰ ویں سال گزرا مٹا گیا۔

حیدرآباد شہر کے ہر علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جس میں ہر کابا جی تین سو باؤں کا شہر عروسی شہر میں علم و فضل کیوں نہ چھپے گا۔ قلعہ شاہی خاندان کے سب سے بڑا شاہ علم دوست اور فیاض تھے۔ جن کے زیر سایہ کئی شاعر ادیب اور عالم و فاضل پدید آئے تھے۔ عموماً قلعہ شاہ، مٹائی، سلطان علی قلعہ شاہ، گل انار اور عبداللہ قلعہ شاہ تو خود بھی شاعر تھے۔ اصمت جاہی بادشاہوں کا بھی یہی

حال تھا۔ اس خاندان کے بھی دو بادشاہ یرمضان علی خان اور میر محبوب علی خان شاعر تھے۔ چونکہ آخر ان میں جب ریاستیں ختم ہوگئیں تھیں اس لئے ہندوستان کے سارے اردو دان لکھنے کی نظر حیدرآباد پر ہی پڑتی تھی اور چونکہ شاہی سرپرستی حاصل تھی اس لئے ہندوستان کے معتبر شاعر ادیب اور عالم فاضل یہاں جمع ہو گئے تھے اور حیدرآباد اردو کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔

آج بھی حیدرآباد میں موجود دور کے بڑے اچھے اور بلند پایہ تھے نقاد، شاعر اور ادیب موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد الدین قادری زور پر فیر حیدرآباد دسروں کی سید محمد نعیم الدین اسٹیج اور ٹیکس کاظمی (جنگ) حال میں انتقال ہوا، حیدرآباد کے مشہور محقق ہیں۔ جنھوں نے دکن ادب پر کام کرکے غنیمت کے ساتھ تمام پیرا کیا۔ حیدرآباد کے دیگر نقادوں اور نثر نویسوں میں رائے جانی پرشاد، ابو ظفر صاحب فضل الرحمن، ڈاکٹر جعفر حسین، ڈاکٹر رحمتی، الدین صدیقی، ڈاکٹر رفیع سلطنت، عظیمیٰ علیک، جمیل انار، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، حبیبی شاہ عالم خونیہ، ڈاکٹر حفیظہ شاکت، ڈاکٹر شریف، انسا، ڈاکٹر خادہ یوسف اور ڈاکٹر بیگز جعفر وغیرہ شامل ہیں۔ جن نثر نگاروں نے شاہی شہر سے آکر حیدرآباد کو فیض پہنچایا ان میں مولوی عبدالحی، وحید الدین سلیم، محبت اللہ خاں، بخش یلگامی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور غلام نبی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ نگاروں کی بھی ایک ہی قلمار حیدرآباد سے تعلق رکھتی ہے جن میں عزیز احمد، اشتیاق حسین، جہاں بانو، فاضلہ زینت، ساجدہ، ابراہیم علی، رشید قریشی، عاتق شاہ، اقبال حسین، جیدتی بانو، عرش سید، واجدہ تبسم، اکرام جاوید اور رندا جاوید وغیرہ شامل ہیں۔ ہنر نگاروں میں ناکارہ حیدرآبادی شامل ہیں۔ باہر سے آکر کھڑے والے ہنر نگاروں میں آدھر، فرحت اللہ بیگ اور عصمت اللہ بیگ کے نام لے لے سکتے ہیں۔ شاعروں کی بھی حیدرآباد میں کی نہیں۔ خاص حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے شاعر عروں میں امجد حیدرآبادی، جذب عالم پوری، صبر اللعینم خان باقی، تہمتیہ نذر، نذیر احمد ہشتنگی، عزیز یار بیگ، محمد علی الدین، سلیمان ادیب، کنول پرشاد کنول، قزاق تہیم، سرور ڈنڈا، قمر ساری، لطیف سہیل

ابو احمدا ب - مؤہر ل شارب ، س - و - عشرت ، تاج قریشی ،
 لہب رنقا ، شاد تکت ، ردی علی امیر ، بشیر انشا ، بشیر خورشیدی
 سعادت نیکر اور سید مجیدہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن شاعروں نے
 باہر سے اگر حیدر آباد کو نصیب کیا یا ان کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں
 داغ ، امیر ستانی ، جلیل ، ناک پوری ، جوش ملیح آبادی ، قافی بدلی
 مرزا محمد چنگیزی ، صفی اور ننگ ، بادی ، نظم علی لہائی ، مرزا خواجہ
 ماہر افغانی ، حبیب خیر آبادی اور حیرت یارونی وغیرہ شامل ہیں۔
 جن نوجوان شعرا نے حیدر آباد میں رہ کر اس سرزمین سے کچھ
 حاصل کیا ان میں سکندر علی صاحب ، شہرمد علی ، آغا علی سلم ، وکیل خان
 باؤلا پھر سید ، حمایت علی شاعر ، یوسف ناظم اور اور فیض وغیرہ
 شامل ہیں۔

حیدر آباد میں اردو کا مستقبل آج بھی چراورشن سے متاثر
 کی پندرہ - بیستوں میں آٹھ پندرہ پیش ہی وہ ادھر ریاست ہے
 جہاں تلمیذ کے ساتھ ساتھ اردو بھی نہ باری - تلمیذ کی گئی ہے
 آٹھ پندرہ پیش سہایت لادہ کی تھی کے ساتھ ساتھ اردو کیا بھی
 شائع کر رہی ہے اور اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو بھی سالانہ
 انعامات دے رہی ہے۔ حکومت آٹھ پندرہ پیش نے ۱۹۵۷ء کے بعد
 بطور خاص ایک الگ محکمہ ترقی اردو قائم کیا ہے جس میں اردو کی ترقی
 اور یہاں حکومت کی ان کا دریاؤں کو جن کا تعلق عوام سے ہے ،
 اردو سے انگریز میں ترجمہ کر کے حکام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور
 حکومتی کاروباروں کا اردو ترجمہ عوام کی سہولت کے لئے کیا جاتا ہے
 اس طرح یہاں اردو کی دفتری حیثیت کو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

مدارس اور کالجوں میں بھی یہاں اردو کو ایک اہم مقام حاصل ہے
 حکومت کے علاوہ بہت سے عوامی ادارے بھی یہاں اردو کے لئے
 بہت کچھ کر رہے ہیں۔ راسخانی پشاور کی صدارت میں اردو مجلس
 حیدر آباد میں اردو کے لئے بڑا مفید کام کر رہی ہے۔ اس ایک
 سہ ماہی رسالہ میں بھی شائع ہوتا ہے۔ انیس ترقی اردو آٹھ پندرہ
 پندرہ پیش بھی اپنے دور پر مرکز مکتب ہے۔ اس کے زیر انتظام
 حال ہی میں ایک اردو نالی تعمیر کیا گیا ہے جہاں اردو سے تعلق رکھنے والے

مٹائی جاتی ہیں۔ اس کے تحت ایک اردو کالج بھی ہے جو بہت کامیابی
 سے چل رہا ہے۔ انجمن نے حیدر آباد کے نوجوان شاعروں اور
 ادیبوں کی تہنیتات بھی شائع کرنا شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر علی الدین
 قادری زور کا ادارہ ادبیات اردو بھی اردو زبان و ادب کی بڑی
 خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے کی اپنی عالی شان محلات
 'ایوان اردو' حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے جہاں اردو کا ایک بہت
 بڑا کتب خانہ ہے جس میں اردو کی بڑی نادر کتابیں اور قلمی نسخے
 محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا دارالمطالعہ بھی بہت بڑا ہے جس
 میں اردو کے بہت سے اخبار اور رسالے لگے ہیں۔ اس محلات
 میں اب الکلام اردین سرپرچ الٹی ٹیوٹ بھی ہے جہاں اردو
 زبان و ادب پر تحقیق کا کام ہوتا ہے اور سرپرچ اسکالروں کو
 فی ماہ دو سو روپیہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو
 اردو زبان کے اہم نامہ نگار بھی ہوتے ہیں اور اسناد دی جاتی ہیں
 اس ادارے سے مختلف علمی و ادبی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور
 ایک ماہ نامہ 'نامہ سپرس' بھی نکلتا ہے۔ کمیٹی صبا نوجوان
 حمایت اور شاعر سلیمان ادیب کا پبلیشنگ ہاؤس ہے جہاں سے وہ
 سیاری ادبی ماہنامہ 'صبا' نکالتے ہیں۔ حیدر آباد میں فارسی زبان
 کی ایک انجمن 'بزم سعدی' بھی ہے جس کے ممتاز نوجوان شاعر
 قمر ساجی ہیں۔ یہ انجمن اردو اور فارسی کے لئے بہت مفید کام
 کر رہی ہے۔

حیدر آباد میں اردو میں آج بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ یہاں سے سنہ
 ۱۹۵۷ء کے بعد اردو میں ایک سہ ماہی رسالہ 'ایک سہ روزہ'
 اور دو ہفتہ وار رسالہ شائع ہوتے ہیں۔ یہاں چھاپے خانے بھی
 بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کتابت بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ حیدر آباد
 کی اردو کتابت و طباعت دور دورہ رنگ شہور ہے۔ یہاں کاتبوں
 کی باضابطہ ایک انجمن ہے۔ اردو کے علاوہ حیدر آباد سے
 انگریزی ، تلمیذ اور ہندی کے بھی کئی اخبارات ، دور رسائی نکلتے ہیں۔
 یہاں اردو تلمیذ اور ہندی میں بڑی ہم آہنگی ہے اور اکثریتوں
 زبانوں کے مشترک مشاعرے اور پروگرام ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے دیگر تاریخی شہروں کی طرح حیدرآباد بھی اپنے
 دامن میں اپنی مخصوص تاریخ اور تہذیب پیٹھ بٹھنے ہے۔ یہ ایک
 قدیم اور عظیم شہر ہے۔ یہ نیا اور پرانی تہذیب کا سنگم اور ہندو مسلم
 تہذیب کی خوشگوار یادگار ہے۔ اس شہر پر جہاں مسلمان بادشاہ حکمران
 رہے وہاں ہیں ان کے مشہور اور گہرا دھڑاؤں ہیں اکتا ماتا،
 لالہ ناما، چنلوصل شاداں اور بہار پرکش پشاد و شاد جیسے نام
 بھی ملتے ہیں۔ تنہی، تانتا، بھائی چارگی اور خوش اخلاقیوں کی
 تہذیب سے وابستہ ہے۔ یہاں کی فی قدیم مسجدیں، گنبد اور عمارتیں
 ہیں قدم قدم پر اس بات کی یاد دلاتی رہتی ہیں کہ یہ ایک تاریخی شہر
 ہے اور اپنے جملہ عمارتوں اور اساتذہ کے ہونے ہے۔

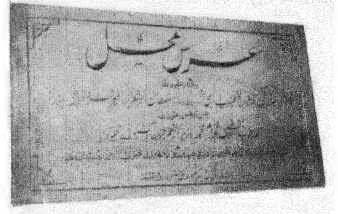
مگر حیدرآباد یعنی دیگر شہروں کی طرح صرف تاریخی اور قدیم
 ہو کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں
 نمایاں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں اور قدیم کے ساتھ ساتھ وہ ایک
 جدید شہر بھی بن گیا۔ حیدرآباد نے تیزی سے بدلے ہوئے زمانے کا
 ساتھ دیا ہے اور نئے زمانے کی چھائیوں کا اپنا ہے۔ اس وقت
 حیدرآباد و محنتوں میں نعمت ہے۔ ایک پرانا حیدرآباد کہلاتا ہے اُد
 دوسرا نیا حیدرآباد۔ ان دونوں کے درمیان کوئی مڑی ہوئی ہے
 اور نیلی، پلانا پل و چار گھاٹ کابلی ان دونوں کو ملاتے ہیں۔

قدیم حیدرآباد قلعہ شاہیوں کے زمانے کا حیدرآباد ہے جس میں
 چار سینکڑے مکہ مسجد، دارالشفاء، بادشاہی عمارتوں، ڈیڑھی
 میرٹھ، حویلی نظام الملک اور ایسی ہی قدیم عمارتیں ہیں۔ نئے
 حیدرآباد میں جو جدیدی گزرتا آبادی سے خود بخود بنتا گیا
 تمام وقار، نئی نئی عمارتیں اور کشادہ و پُرجوش شہر ہیں اور
 تفریح گاہیں و غیرہ ہیں۔ نئے حیدرآباد کے رہنے والے بھی
 مزے تہذیب کے پرستار اور روشن خیالی ہیں۔ مگر اندھا پرستی کا
 پانچوخت نے۔ بعد سے (۱۹۵۹ء) اس کے رقبے اور آبادی میں
 مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اب سکندر آباد کو بھی جو پہلے ایک
 الگ شہر تھا اور جہاں انگریزی فوجیں رہتی تھیں حیدرآباد میں
 شامل کر لیا گیا ہے۔ اور اس طرح عظیم تر حیدرآباد وجود میں آ گیا ہے

حالیہ مردم شماری کی رو سے عظیم تر حیدرآباد کی آبادی ۱۰ لاکھ
 ہے اور یہ فی کلاس شہروں کی فہرست میں شامل ہے۔ حیدرآباد
 میں نیا دفعتی کیڑی کیڑی عمارتیں، کشادہ سڑکیں اور صاف ستھرے
 پارک و شاہراہیں ہیں۔ یہ شہر پرسکون، سہولت اور سنجیدہ شہر ہے۔
 حیدرآباد میں دو بڑے اسپتال اور ایک ہوائی اڈا ہے۔ اس
 کے علاوہ سارے شہر میں سکول اور ایک چال بچا ہوا ہے۔

حیدرآباد صرف ایک سنجیدہ اور عاموش شہر نہیں ہے
 بلکہ یہاں موجودہ دور کی بہت سی مہیتیں بھی قائم ہیں۔ چنانچہ
 یہاں تکیا، کاغذ، شکر، پچھلے سینٹ، فریچر، اوزار اور
 دواؤں کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں جن میں وزیر سلطان
 ٹوبہ کی کمپنی، شمش، سرپرپر پٹر شمش، میوہاں سینٹ، فیکٹری
 نظام شاہی، طرہ لیمٹڈ، انڈین میٹل ورکس، پراگا ٹولس کمپنی اور
 کارخانہ زلفہ طاسات و غیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد یہاں
 فنی صنعت بھی قائم ہو گئی ہے جہاں پہلے دو دین ہندی فلمیں بنیں
 اور اب تک فلمیں بن رہی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ حیدرآباد
 مستقبل میں ٹیگور فلم انڈسٹری کا ایک بہت بڑا مرکز بن جائے گا۔
 اس وقت حیدرآباد ہندوستان کی ایک اہم اور
 بڑی ریاست آندھرا پردیش کا پایہ تخت ہے۔ قلعہ شاہی
 سلطنت کے پایہ تخت سے لے کر جمہوری ہندوستان کی ایک
 ریاست کا پایہ تخت بننے تک حیدرآباد نے کئی منزلیں طے کیں
 اور اس کی زندگی میں کئی اچھے اور برے وقت آئے مگر وہ
 برابر ترقی کرتا گیا۔ حیدرآباد ایک ایسا شہر ہے جہاں قدیم
 اور جدید دونوں محال موجود ہیں۔ ۱۰۰ء کے اپنے چھپے اپنی ۱۰۰
 سالہ طویل القدر تاریخ رکھتا ہے اور اپنے آگے ایک عظیم انسانی
 مستقبل کو بھجور رہا ہے جب وہ جدید ہندوستان میں اپنی و مندرجہ
 تنہی، بھائی چارگی، غلطی اور ایسی ہی گونا گوں خصوصیات
 کی بنا پر ہمیشہ مڑت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس طرح
 ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

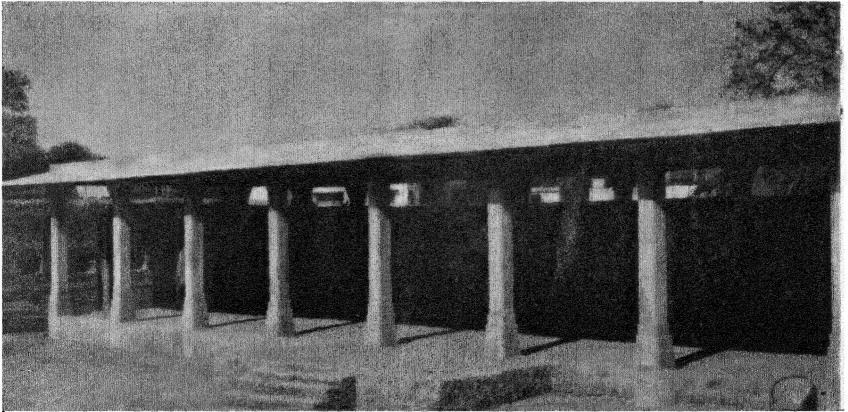
عرسِ حضرت امیر خسروؒ



ایرانی سفارت خانے کے کلچرل آتاشی استقبالیہ نطیجہ پڑھ رہے ہیں۔
ڈاکٹر رادہ خاکشن، ہیڈ آف جوائنٹ پروڈکشن اور بی بی سی غلام محمد نشریات فرم ہیں۔

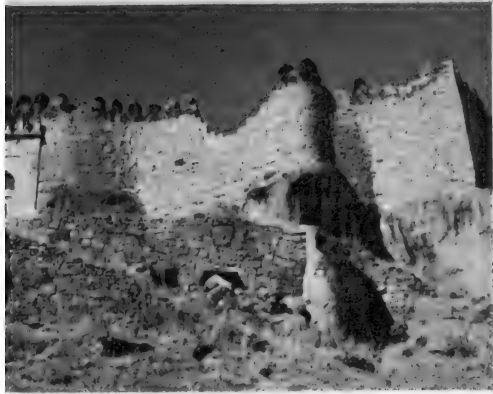
عرسِ میل کا سنگِ تعمیر

عرسِ میل - جس کا افتتاح نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادہ خاکشن نے فرمایا۔



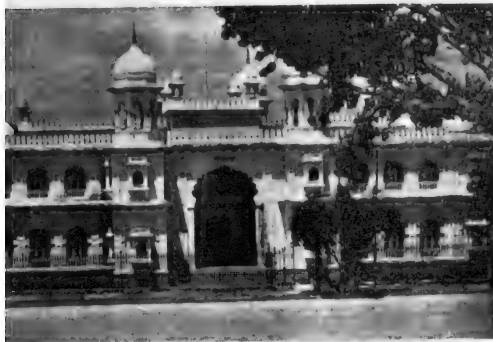
حیدر آباد

(منطقه متعمون و غیره اپر ملا خطه فراموش)



قلعه گوکنده

باده شاهی عاشر



حیدرآباد میوزیم



مسجد

بانی کورث



منظم جای مارکیت

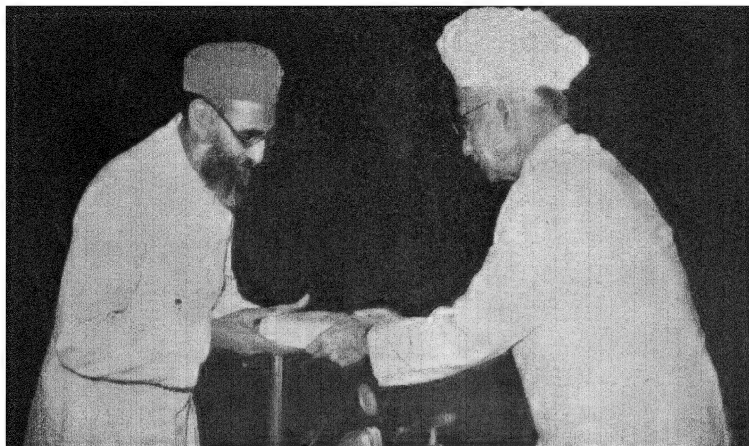
سلطان محمد قطب شاه کا مقبره



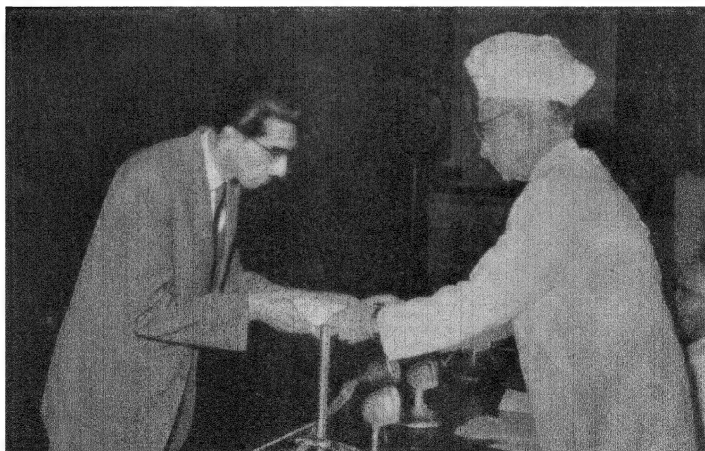
چار بيسار

عشائیر یونیورسٹی





نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر راہہ کارشناس امتیاز علی عرشی کو سائبیہ اکادمی کا انعام عطا فرما رہے ہیں۔



رحمان راہی
سائبیہ اکادمی
کا انعام
لے رہے ہیں

فن کاروں کا کورس

شاخ گل، برگِ حنا، غنیمتِ نسیم و سمن موسمِ گلِ میں ہسکتی ہوئی لکڑیوں کی پھس
 قلبِ شبنم پہ پھلتی ہوئی سورج کی کرن دستِ فردوس کی چٹکی میں وہ دانا بین
 جتنی محنت کدہٗ چن گلستاں نہ رہے
 ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے
 ہم نہ ہمیں تو حیندوں سے تعداد بھی نہ ہو ہم نہ ہمیں تو فضاؤں پہ تیسرے بھی نہ ہو
 ہم نہ ہمیں تو عتدل کا ترقم بھی نہ ہو ہم نہ ہمیں تو یوسے گل کا تلام بھی نہ ہو
 جلوۂ حسنِ مہاسات بہاراں نہ رہے
 ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے
 گوشہٗ پارخ نہ گلِ رخ نہ گلانی نہ گلاب شمع و شاد نہ شبنم نہ خشکوفہ نہ تیاب
 سرو سنبل نہ سمن زار نہ ساقی نہ سحاب رامش و رنگ، نہ دمِ ہم نہ روانی نہ ریاب
 حُسنِ فطرت کا کھی دل میں بھی ارواں نہ رہے
 ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے
 منقذِ جتنِ خمریات سرِ شام نہ ہو زینتِ ساحرِ درخس مے گلغام نہ ہو
 پیائے برفاں پر سرگردشِ آیام نہ ہو دولتِ حافظ و دارائیِ خستیاں نہ ہو
 شانِ رحمت کدہٗ بادہٗ فردشاں نہ رہے
 ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے
 ہم سے ہی کاوشِ افسون و فوں کاری ہے ہم سے ہی کاہشِ سرسختی و سرشاری ہے
 ہم سے ہی دولتِ سخاوت و طساری ہے ہم سے ہی جلوۂ رنگیں کی لہنگاری ہے
 بزمِ عنزت نہ رہے ہنر نگاراں نہ رہے
 ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم اگر سیرۂ خواہیدہ کی قیمت نہ جگائیں
ہم اگر نرس گس شہلا سے لگا ہوں نہ ملائیں
ہم اگر خونِ تمنا مہر گلشن نہ پہنائیں
ہم اگر محو کو تبسم کی ادائیں نہ سکھائیں

سو زبلیں نہ رہے سارے بہاراں نہ رہے

ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

چرخ پر دوند انگر گشتائیں نہ رہیں
سازِ باراں کی طرب دین صدائیں نہ رہیں
موسمِ گل کی جنوں نیز ہوائیں نہ رہیں
صحنِ گلشن کی دل آویز فضاؤں نہ رہیں

رنگِ دستی کا جہاں میں کوئی سماں نہ رہے

ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم اگر تلخیِ غم سے زمانہ نہ مٹائیں
رشتہ عمر جو ہم اپنا ابد سے نہ ملائیں
ہم اگر دغدغہ و دوجہت کو نہ مٹائیں
ہم اگر قصہ لب بوسیِ خواباں نہ سنائیں

داستانِ خطر و چشمہ جیواں نہ رہے

ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

آرزوئے رُخ شمشادِ دہاں ہے ہم سے
سرخیں سودائے غم زلیبتاں ہے ہم سے
شمنِ خودشن کی جانبِ تگواں ہے ہم سے
عالمِ پیرِ عیدنا نہ رواں ہے ہم سے

زینتِ انجمنِ مسرگِ بھیراں نہ رہے

ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

قلب کو عسرمِ اسرار بنا سے پھر کون؟
آنکھ سے دولتِ افوار لٹائے پھر کون؟
شام کا سنِ گہر باریدِ حالے پھر کون؟
جج کا جلوہ سرشار دکھائے پھر کون؟

شامِ رنگیں نہ رہے صبحِ درخشاں نہ رہے

ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم کتابِ دلِ انسان کا جو لیلیٰ نہ ورق
ہم جواناں کو سکھائیں نہ سیاست کا سبق
ہم اگر اپنی جمعیوں سے نہ چٹکائیں نوق
روئے تقدیر کریں رنگِ عمل سے جو نوق

جہدِ پیہم کی ترپِ قلب میں علماں نہ رہت

ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

گھر

چوڑے کا نوکر ایک پرچہ لے کر آیا۔ اس نے موٹر روک کر پرچہ پڑھا، لکھا تھا: ”آج رات کو، بچے شہور افسانہ نگار شہباز صاحب میرے ہاں آ رہے ہیں۔ تم بھی آ جاؤ۔“
عادل نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر نوکر سے کہا: ”صاحب سے سلام کہنا اور کہنا کہ جلد روانہ ہو گا۔ اس وقت دفتر کو دیر ہو رہی ہے ورنہ میں پرسہ لے کر دیتا۔“
”اچھا!“
”چھپٹے کے بعد عدل نے اپنا سب سے اچھا تنگ مہری والا سوٹ پہنا۔ جیب میں ریشمی ردائی ترچھا کر کے لگایا۔ گردن پر ادوی کلون کی پھوڑا والی۔ سفید اور سیاہ نوک دار جوتے پہنے اور موٹر سے روانہ ہو گیا۔

چوڑے کے گھر پہنچا تو وہاں کچھ مہمان آچکے تھے لیکن شہباز صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ جو مہمان آچکے تھے ان میں تقسیم بھی تھی، جو ایک مقامی کاریں تاریخ پڑھا تھا اور ادب میں افسانے لکھتی تھی۔ اس وقت وہ غائبی سوئی ساری پہنے، سیاہ شال اوڑھے، ایک موٹے پر شاعر عزیز کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور بہت اچھی لگے ہی تھیں وہ اسی موٹے پر فریڈا اور تقسیم کے بیچ میں نفس کر بیٹھ گیا۔ اس نے گفتگو کو دل چاہتے ہوئے کے لئے غالب کے دو شعر بھی پڑھے جن میں سے ایک نامور دن تھا! تقسیم نے تقریباً سات منٹ تک اس کی گفتگو نہایت خاموشی اور مہربانی کے ساتھ سنی۔ اور پھر بیٹھو چسپس بیٹھے اقدار بھی گئی!

عادل کمرے میں ادھر ادھر ہل رہا تھا۔ رات کو وقت اسے سوئی وہ کوئی خیالات تو نہ تھی مگر اس سے ایک بار پھر اس کو تشریف بیا ہوئی تھی کہ آخر لوگ اسے کیوں پوچھتے ہیں۔ وہ کسی نے اس سے خود تو نہیں کہا تھا کہ وہ پورے گھر ادھر ادھر سے اٹھتی ہوئی اس کے کان میں بھی پڑی جایا کرتی تھی اور وہ حیران رہ جاتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ صورت شکل اس کی اچھی تھی۔ کپڑے وہ سلیف سے پہنتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا کسی سے برتری اور برتری نہیں کرتا تھا۔ دوسروں کو کھڑا نہ پلاتا۔ اپنی موٹر میں گھنٹا، آڑے وقت پر قرض دیتا۔ پھر یہ کیا بات تھی کہ کسی منٹ میں وہ کسی کے پاس دس منٹ بھی بیٹھ کر بیٹھ جاتا تو وہ شش کھٹکتے گھنٹا۔ اور پھر کوئی معمولی یا کوئی بڑا بہانہ کر کے اور گردہ میں جا ملتا اور وہاں سے بیٹھا بیٹھا ایسی سہمی ہوئی نقد دے گا کہ کوئی کھار کھار لیتا کہ گویا کوئی بلا تھا جو چٹ جاتا۔ عادل کا دل کہتا یہ سب تمہارے جلتے ہیں۔ یہ سب سانس کی ہیں جلتا ہیں۔ یہ خود غرض ہیں۔ یہ خدا بہت فی فر دل چاہتے ہیں۔ مگر عقل کہتی ایک دوا دی احساس کمتری میں مبتلا ہو سکتے ہیں، حیرت انسان ایک ساتھ احساس کمتری میں کیوں کر مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی اس کا ہاتھ پڑتا۔ کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ خود غرض نہیں تھے اور دل چاہتے بھی تھے ورنہ وہ خود کیوں کہ ان میں شامل ہوئے بغیر بے قرار تھا۔
دور جاتے کے لئے وہ چائے سے لکڑی تھا کہ اس کے دوتے

گو اپنی موٹیریاں کی جائے قیام پر متعجب دے تو اس کی خوشی کی بہت سزا
ہی۔ شہباز صاحب کی رلا کی پہلے ہی کسی اور دعا توں کے ساتھ جا چکی تھی۔
مادہ نے بڑی شکل سے شکیلا اور افراتو لالہاں کے گھر میں ادھر صبر ہی
تھے۔ جلدی سے شہباز صاحب کو اپنی موٹریں تقریباً دھکیلا اور روانہ
ہو گیا۔

زیادہ ہمدیں وقت ضائع ہونے کا اندیشہ تھا اس نے اس
نے روانہ ہوتے ہی گفتگو شروع کر دی۔ "شہباز صاحب مجھے آپ سے
مل کر تاحی خوشی ہوئے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔ دیکھئے اس کو خوشامدہ کچھ
بڑی پیار پر محسوس کروں گا ہوں کہ آپ ایسا دل چاہتے شخص ہیں نے
پہلے بھی نہیں دیکھا۔"

شہباز صاحب گردن جھکے سر گٹ سٹلگا رہے تھے، سر ہٹے
کر کے اٹھنے کے ملکیتوں سے حاملہ کو دیکھا، مسکرائے، چپ رہے۔
مادہ نے سیٹ پر پہلو بدلا۔ "بات یہ ہے کہ کو
گستاخی صاف۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی اس دل چاہت شخصیت
کا راز کیا ہے؟ شہباز صاحب نے عجب سے مادہ کی طرف دیکھا۔ پھر ایک
پل کچھ سوچا۔ سر گٹ کا کٹھن کیا۔ بولے کچھ نہیں۔ مادہ چپ رہا۔
اپ کی شہباز صاحب نے پہلو بدلا، مادہ کی طرف متوجہ اور
کہنے لگے۔ "دیکھئے حاملہ صاحب، دنیا میں ہر شخص اپنے آپ کی کو سب سے
زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اپنے ہی آپ میں سب سے زیادہ دل چاہی رکھتا
ہے۔ اس لئے اگر آپ لوگوں سے ان کے ہی متعلق بات کریں گے تو ظاہر
ہے آپ ہر دل عزیز ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔ یہ تو صاف سی بات ہے۔ لیکن شکل یہ ہے کہ اگر
کسی کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ ہو تو اس سے کیسے بات کی جائے۔"
"تو اس سے پوچھئے، سوال کیجئے، فوجان عورتیں اپنے
لباس دیزے سے دل چاہی رکھتی ہیں، ذرا سی دارو روں کو بچوں سے
اور گھر سے دل چاہی ہوتی ہے۔ اور شاعر ادیب تو اپنی تخلیقات سے
عشق کرتے ہیں۔" وہ ڈرامہ کر کے۔ حاملہ بھی ہنسا۔ ہاں بھرتے ہوئے
سر ہٹانے لگا۔

"تو اگر آپ ان چیزوں کے بارے میں سوالات کریں تو اخلاقی

کریں تو بات جیت کچھ آپ کی طرف سے ہوگی، کچھ ان کی طرف سے اور
گفتگو کا مزہ اسی میں ہے کہ کچھ کہئے اور کچھ سنئے۔ اور دل چاہت
گفتگو شخصیت کی جان ہوتی ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔"
"جی ہاں۔ جی ہاں۔" - حاملہ جلدی سے بولا۔ "وہ تو
صاف ظاہر ہے۔ آج شام ہی میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے اپنی باتوں
سے کسی طرح ساری محفل پر جادو سا کر دیا تھا۔ میں آپ کا بہت مشکور
ہوں کہ آپ نے نہ ہی گر بتا دیا"

اس بات نے دوسرے دن اتفاق سے حاملہ یوں ہی اپنے
دوست عرفان کے یہاں گیا تو اسے دروازے ہی سے کچھ ایسا لگا کہ
ڈرائنگ روم میں کئی لوگ ہیں۔ وہ گیلری کی طرف بڑھا تو عرفان
کی پیش نظر آئی، بوجھ کر رہا تھا۔ "کیا؟ حاملہ صاحب گھر پر نہیں
ہیں؟ کہاں گئے ہیں؟ انہیں معلوم؟ اچھا خیر۔" "بیلیفون
بندر کے وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑا ہی تھا کہ اسے حاملہ نظر آیا۔
پلک کر وہ اس سے پیش گیا۔ "اے یاد تیریں ہی لٹی کر رہا تھا
ابھی، تمہاری بھابی سے جمع کچھ تھا کہ تم کو فون کر دیں مگر وہ بھول گئیں"
پھر وہ اسے گھسیٹتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ اور جیسے بولا۔
"دوست! پندرہ بیس روپے ہوں تو دے دو، کچھ ہسٹن لیز
بلائے آگے۔ پرسوں واپس کر دوں گا۔"

مادہ نے فوراً نہیں روپے نکال کر اس کی مٹھی میں دیا دئے۔
ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ ادرہ دھڑنڈھڑیں
ڈال رہا تھا کہ کچھ عرفان آئیں اور شرمندگی سے بولیں۔ "مادہ
صاف کرنا، میں نہیں فون کرنا بھول گئی۔ تم تو جانتے ہی ہو میں سدا کی
بھلا کر ہوں۔ صاف تو کبھی دو گے نہ۔" اُدھتیں عرفان کی
بہن مقبرے ملڈوں۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آتش دان کے پاس لے گئی۔ جہاں
ایک چھوٹی سی بجلی میز پر رکھے ہوئے ایک گول ٹی کٹ پر ایک دلی تلی،
نازک اقدام، اکم سن، حسین بڑی بیٹی تھی۔ اس کے پاس رکھے ہوئے
موڈ کے ہتھ پیرچہ پڑا تھا۔ قالین پر جوتے کھسک کر کے رکھ دیتے

ہوئے مانتے چنانچہ کراس سے باتیں کر دیا تھا۔ اور وہ ہنسی کے مارے
ڈوبی ہوئی جا رہی تھی۔

حادثہ کا ثبوت ہوا تو چوڑا اپنی ہنسکھڑکھڑائیم کے پاس
جا بیٹھا۔ حاد چوڑہ کی جگہ تو بیٹھ گیا مگر اس کی ٹانگیں ذرا جھنجھکی
اس نے بھی چوڑا کے انداز میں فرشت پر کھسکھس کر کرنا چاہا تو صوفے کا
ہتکا اس کے نیچے سے نکل گیا۔ اور اس گڑبڑ میں صفیہ نے اس سے
ادر چلنے کیا کہا، جو وہ سن ہی نہیں سکا، بہر حال اس نے صفیہ کا لباس
تو دیکھ ہی لیا تھا، بیڑے اخلاق سے مسکرائے کہا۔ ”آپ کا بلاؤ ڈیڑا
خوبصورت ہے، کیا آپ نے خرید کیا ہے؟“

اس بلاؤ ڈیڑا کا لہجہ بڑھا تھا اور آستینیں یقین ہی نہیں۔
صفیہ نے ڈراسا سسکاکے اور تھوڑے پر پڑ ڈال کے ڈراسا ساری کا پتہ
اپنے وجود پر کراس طرح پیش کیا وہ سارا بلاؤ ڈ چھپ گیا جس کی
تقریب ہوئی تھی۔ حاد کو احساس ہوا کہ شاید کچھ غلطی ہوگئی۔
موضوع بدل کر بولیا۔ ”آپ کہاں بڑھتی ہیں؟“
”میں پڑھ چکی۔“ صفیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

”تو آپ ہمیں کام کرتی ہیں؟ آپ ایسی تیز اور ذہین بڑکی بے کار
تو نہیں رہ سکتی۔“

حادثہ سوچا۔ اس بات میں سوال ہی ہے اور تکرار یقین بھی
کر کے دونوں جھٹے بولے ہوتے ہیں۔ یہ رہی زبان!
”میں کام نہیں کرتی۔“ صفیہ نے جیسے سے جواب دیا۔ وہ اس
طرح پھسل بدل رہی تھی جیسے کسی جال میں پھنس گئی ہو۔ چاروں
طرف سے لوگ اس کو ترس مہسری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
پھر اس نے سامنے میز پر رکھے ہوئے ایک رسالے کی طرف
غیر ڈھٹایا تو حادثہ پھر تھا سوال کر دیا۔ ”رسالوں سے آپ کو
دل چپی ہے؟“

اب صفیہ کا چہرہ آدھا میگزین سے ڈھک چکا تھا کہ ایک
خوبصورت جوان اندر گھر سے نکل کر آیا۔ اس کی ٹوڈ میں سال پیر
کا ایک نسخہ ہوئی تھی مگر صفیہ کی گود میں منتقل ہوگئی!
حادثہ حیران رہ گیا!

صفیہ کبھی میں معروف دیکھ کر چوڑہ نے حاد کو اپنی طرف
اشارہ کیا۔ اس وقت پر دونوں طرف چوڑہ اور تیسندہ
تھے اور بیچ میں، پچھلے کی طرف گاؤں کیخیر سے ٹکی ایک خاتون بیٹھی
تھیں، پھر ٹکی بال مگر بہت شکستہ جسم اور روشن آنکھیں۔
سبز ساری اور سیاہ بلاؤ ڈ پہننے دہڑی خوش مزاجی سے فریاد
سے کچھ میٹ کر رہی تھیں۔ اتنا رت ہوئے، حاد چوڑہ کے پاس بیٹھ
گیا اور فلا۔ ”آپ لوگ کس بات پر بحث کر رہے تھے؟“ حادثہ
احتیاطاً یہ سوال کیا تھا کہ ان خاتون کی دل چسپی کے موضوع کا
پرتزل چل جائے تو چہرہ وہی سی بات کرے۔

وہ ہفت روزہ میں سے پانی نکال کر مین پر رکھے ہوئے بولیں،
”ذرا بچوں کی سیالیاں بوج پر کچھ بات ہو رہی تھی۔“
”خوب۔ خوب۔“ حادثہ کہا۔ ”ظاہر ہے بچوں کے متعلق
ہی بہتر رائے دے سکتا ہے جسے تجرم ہو۔“ آپ کے اپنے
کتے بیچے ہیں؟“ — اور پھر اس نے یوں چاندی طرف
دیکھا جیسے اپنے اس جلد کی تصریف سننا چاہتا ہو۔ پھر اس نے
دیکھا کہ ان خاتون کے چہرے پر ایک کھیاں سی مسکرا ہٹ آئی۔
چوڑہ نے زور سے جھٹھڑ لگایا۔ ”دیکھ لیا آپ نے۔“
اب یہی بات جس آپ سے کہتا ہوں میں منو چاہو آپ مانتی نہیں۔
حاد کو پسینہ چھٹنے لگے۔ ہنگامے بولا ”محاف بیچو گا۔۔۔“

میں... میں... میرا مطلب تھا کہ...“
”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ ان خاتون نے
کہا۔ مگر ان کے تھوڑا سا سے ظاہر ہوئے تھے کہ انھوں نے ڈراسا ساری
سنبھالی۔ تخت سے اتریں اور اندر چلی گئیں۔
اب حاد کو عرفان پر غصہ آئے گا، نہانے آئے ان ظالموں کے
جوالے کے خود کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کو ڈھونڈنے کے خیال سے
وہ اٹھ کھڑی والا تھا کہ ایک کونے سے اڈر کی آواز آئی۔ ”بیڈیز
ایئرڈنٹلیس۔“ بڑی خوشحالی بات ہے کہ کراسے شاعر سہیل صاحب
بھی یہاں موجود ہیں اور ہم لوگوں کے اصرار پر اپنا کلام سنائیں گے۔
سب نے آئیاں دہرائیں اور چہرے چمکے!

میرے ہاتھوں میں جلتا سگرٹ ہے
جس کے نیلے دھوئیں کا مرغول
ایک لمحہ کے بعد فانی ہے
جس کے ہر دائرے میں شکل تری
جس کا ماضی کے دوش پر رقصاں
”راہِ تنہیل سے گزرتی ہے“

سوچتا ہوں تو یاد آتے ہیں
زندگی کے وہ کیمتِ زانحات
وہ محبت کے دن خوشی کی وہ رات
جب مرے ہاتھ میں تھا تیرا مات
زندگی نذر کر رہی تھی مجھے
قولی و استراکی جواں سوغات
تھے محبت کے نرم ہونٹوں پر
ناز و انداز کے حسین نجات
گوشہ دل میں میرے سہمی تھی
رد و شب تیرے پیار کی بارات

میرے ہاتھوں میں جلتا سگرٹ ہے
جس کے نیلے دھوئیں کا مرغول
میری آنکھوں کے گرد ناچتا ہے
جس کی اک منہر کب فانی ہے
جس کا ہر تیز و تاب فانی ہے

سوچتا ہوں کہ عرصہ عزم میں
زندگی خود بھی ایک سگرٹ ہے
وہ بھی جاتی ہے یہ بھی جلتا ہے
قصہ زبیت یوں ہی چلتا ہے

شعر و شاعری کے ہر جیب کھانے کا سلسلہ چلا تو حامد ادریس
آدریس کو آتا ہسپل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اور جب ان کے پاس
بیٹھی ہوئی تسنیم کوئی چیز دیکھ کر اندر گئی تو وہ فوراً اس کی جگہ پر بیٹھ
گئی اور دولا۔

”ہسپل صاحب، اچھے آپ کا کلام سننے اور آپ سے ملنے کا بڑا
شوق تھا۔ یہاں تک وہ کہہ پایا تھا کہ اسے تسنیم آتی دکھائی دی۔
اور جگہ پر قبضہ رکھنے کے لئے اس نے پھر جلدی سے بات شروع
کر دی۔“ ہسپل صاحب نے آپ شاعر لوگ جو عشقیہ چیزیں لکھتے
ہیں تو بچ بچ آپ کو عشق ہوتا ہے یا کہ.....“

ہسپل صاحب سوکا سا منہ بنا کر بولے ”ارے نہیں صاحب
بچ بچ کسی کو عشق ہوجانے تو دوا لعل جانے۔ دیکھا دیکھی کی بات
ہوتی ہے۔“

بادوں طوفان طوفان ہوئے لوگ بھٹک گئے، حادثے ان کی ہنسی کی
پیرا کئے بیز و دوسرا سوال کر دیا ”اور میں یہ جانتا چاہتا ہوں
ہسپل صاحب کہ آپ لوگ اتنے اچھے شاعر کیسے کہہ جیتے ہیں۔ کمال
ہے صاحب۔“

ہسپل صاحب کی پلی بھری خاموشی میں حامد نے دو تین سوال
اور کر ڈالے:

”ترقی پسندی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ہسپل صاحب؟“
”آپ کو ایک نظم کا اوسلا گنت لی جاتا ہے؟“

”جو بچ گھنٹوں میں لکھتے، گھنٹہ آپ شاعر کیسے میں لکھ سکتے ہیں؟“
شاعر سگریٹ چپ چاپ سینڈوچ کھا رہا تھا!

حامد اٹھواں سوال کر رہی دلا تھا کہ میرے ایک کوٹے سے بیچ
ماری۔ ”ارے بھئی، کچھ لوگ دوڑے، کچھ کھڑے ہو گئے، ایک
دو دوڑوں نے چھین ماریں۔ محض تیر تیر ہو گئی۔“

جاوید نے باہر نکلے وقت کئی دباؤں کو پیس میں بکتے سنا
”بھئی اس وقت بھئی کی حلیق نے بڑی فوریت سے چایا!“

موٹر کے انجین پر زور سے پاؤں مارے وقت حامد کا دماغ
زور زور سے سوچ رہا تھا کہ شہباز صاحب نے جو گیتائے اس میں
اصل ٹکڑی بات وہ مزہ دیا تھا۔ ورنہ تو.....

فراق سے ایک ملاقات

حضرت خرق گورکھپوری یومِ جمہوریت کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے شہرہ ۲۰۔ جنوری ۱۹۶۲ کو دہلی تشریف لائے تھے۔ ۲۵ جنوری کو مصروف نے میری درخواست پر یہ گران قدر انٹرویو مرحمت فرمایا جس کا میں ذائقہ طور پر محسوس ہوں۔

شوق :- خرق صاحب! اپنی شاعری میں آپ نے کون سے مقاصد متعبر رکھے ہیں؟

فساق :- اپنی غزلوں میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ جو خوش و محبت اور درادراہت زندگی کے تصور سے یہاں تک کہ متاثر کے بھی تصور سے اپنے شعور و وجدان میں گرائی اور گرائی پیدا کروں، اہمات پیدا کروں، شرافت جذبات پیدا کروں، نری اور معصومی پیدا کروں اور سوئے دنگلائی وہ کیفیتیں پیدا کروں جو آفاقی پچھلے کی مانندگی کر سکیں۔ موجودہ عرف کی پہلی دہائی کی اردو شاعری کے شعور اور بے میں اکاؤ کا شہرہ جو پھر ایک شہرہ اور گزشتگی سببیت اور عدم سببیت اور بہت سی تاؤ خوش گوار باتیں پاؤں جاتی ہیں۔ لفظی کن بان پر پورا زور دھرت کر دیا جاتا تھا۔ حسن و عشق کی پرستش معنوی تھی۔ شاعر کا بیان زندگی پر نہیں تھا، مذہب اور خدا پر بھلائی ہو۔ بچے میں گھلاؤ نہیں تھی۔ جسکی تعلقات کی ملاقات دیا پیر کی کا احساس نہیں تھا۔ انہیں

خراپوں کی اصلاح میں نے اپنی غزل کا مقصد اور تعجب الین بنایا۔ غزلوں میں کہیں کہیں اور مغفوں میں مقدور موقوفوں پر متاثر قدرت کے روحانی پہلو، ان کی رمزیت، انسانی زندگی سے ان کی ہم آہنگی، ان سے پیدا ہونے والی داخلی کیفیات، ان کی خواہش کی اور فضا آفرینی کا اظہار میں نے کیا ہے۔ 'روپ' کی دیا میں میں گھری زندگی کی اہمیت اور عورت کی دہشت کو اُجاگر کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ انکاؤ اور فطرت کی حق کو سننے سے گونہنے کی کوشش کی تاکہ شاعری کا ایک تیار نہیں کر سکے۔ ایک نئی اعلیت اور ایک زیادہ پی ہوئی غابجیت پیدا کر کے کی کوشش میں نے اپنی شاعری میں کی ہے۔ دعوتِ عمل سے میں نے شاعری کو عدم نہیں رکھا۔ لیکن جو دعوتِ فکر میری شاعری میں ہے وہ محض دعوتِ عمل نہیں ہے نہ محض برائے عمل ہے۔ بلکہ وجد اور عمل دونوں کے جمالیاتی پہلو کی وہ معصومی ہے جس میں قدیم سنسکرت ادب اور دنیا کے بہترین ادب کی تھرتھرائیں سنائی اور دکھائی دیں۔ سن اوڈ زبان کے لحاظ سے میری کوشش یہ رہی ہے کہ ایک نیا تعبیر پیدا ہو جائے۔ انکاؤ میں نئی جھنکاریں پسیدا

روحانی اور شاعری انسانیت کی آواز سے ہم آہنگ ہو جائے۔

شوق :- دکھ، درد، رنج، مصیبت، غم، الم کا زندگی میں کیا مقام ہے ؟

فسراق :- میرا ایک شعر ہے :-

اک غم وہ ہے انسان کو جو رہنے نہ دے انسان

اک غم وہ ہے انسان کو جو انسان بنا دے

میرا ایک دوسرا شعر ہے :-

جیات عشق کے باغوں میں جیات نہیں

غم و غوغا کے لئے آدمی کی ذات نہیں

تو سوال غم و غوغا کا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی لطافت

کا ہے جو وارے غم و مسرت ہے اور جو غم و نشاط

کو اپنے اندر جاری و ساری رکھتی ہے۔ نشاط و جدوجہد

ہی دوسرا پہلو غم و سنجیدگی ہے۔ ہمیں ایک نئے پہلو

کا تلاش ہے یا یوں کہیں کہیں اپنے ہی پرانے پہلو

کی تلاش ہے۔ ہمیں اس بلوغت رسیدہ لطیفی کی ضرورت

ہے جس کے دوش پر ابدیت نیروی کے کا ہتھ رکھتی

ہے۔ جب درد میں اٹھتا ہی راحت سمواٹے اور اہستائی

راحت و سکون میں جب درد سمواٹے زندگی اس وقت

زندگی بنتی ہے۔

شوق :- جیات بدمذمت کے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں ؟

فسراق :- اس باب میں میرا کوئی بڑھانکا عقیدہ نہیں ہے۔ بالخصوص

اگر حرجانے کے بعد کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم روح کہیں

یا مثالی جسم کہیں کہی عرصہ تک یا بہت عرصہ تک قائم

بھی رہے تو ایسی یا دائمی طور پر ایسا نہیں ہو سکتا۔

فرود کے دوام کا میں قائل نہیں ہوں جیسے دریا

یا سمندر کی موجوں کو دوام نہیں ہے۔

شوق :- اخلاق زندگی اور اخلاق فرائض کا فرق کیا ہے ؟

فسراق :- کسی آسانی کتاب یا کسی خدا یا پیغمبر کے احکام پر میں

اخلاق کو سمجھ نہیں سکتا اور نہ انہیں اخلاق کا عسکر

سمجھتا ہوں۔ اخلاق کا ایک عملی پہلو ہے اور وہ تاریخی اور

ارتقائی ہے۔ دوسرا پہلو اخلاق کا وہ ہے جسے ہم روحانی

پہلو کہتے ہیں۔ مثلاً عملی طور پر خدمتِ خلق، اخلاق کا ایک

پہلو ہے۔ وجدانی طور پر تشنگانہ کا وہ تصور جس نے کالیڈاس

کے وجدان میں ہم دنیا یا شاعر اعظم میر کے وہ اشتیاق کا

تعلق عمل سے نہیں ہے بلکہ محض وجدانی محسوسات سے

ہے یا وہ وجدانی لحظیت جو موسیقی سے اور دوسرے

فنونِ لطیفہ سے ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے اخلاق کے

دوسرے غیر عملی پہلو ہیں جنہیں میں روحانی پہلو کہتا ہوں

میری ایک رباعی ہے :

جاگ اُٹھے اُمّی روح تم سو جاؤ گے

سرِ حشرِ زندگی میں دو جاؤ گے

کھو جاؤ گے جب مناظرِ فطرت میں

اپنے سے بہت قریب ہو جاؤ گے

ایک دوسری رباعی میں اخلاق کے بیک وقت عملی اور

وجدانی یا روحانی پہلو پر میں نیچوں روشنی ڈالی ہے

”لطفت کو سوار دے جاوے کیا ہے

دنیا کا شباب اُٹے بہت کیا ہے

ہاں ہے کہ جہاں کا ذرہ ذرہ

میرشارر عجاز ہو حقیقت کیا ہے

حقیقتاً اخلاق کا عملی پہلو ایک درمیانی منزل ہے۔

آخری منزل اخلاق کا کچھ کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ ہونا ہے۔

وہ دن تو آکر رہے گا۔ انسان کی اجتماعی کوششوں سے

افلاس، ظلم، بے رحمی، بے انصافی اور قریب قریب

تمام دوسری بدعین مش جاؤ گی۔ اس وقت ہم

خدمتِ خلق صرف اپنے وجدان اور عالم وجود سے

کرسکیں گے۔ یعنی دائمی زندگی کے لئے ایک ایسی آہ ہو

پیدا کرتے رہیں گے جس سے شعور انسانی میں اور انسانی

کردار میں خوشبودار تہذیبی ہوتی رہے۔ یہی سبب ہے کہ خارجی عمل کے لحاظ سے ملحدیت اور ادا کے لحاظ سے جوگ اچھے انسان ہیں ان سے زیادہ عزت و احترام ان رشیوں اور بہانوں اور اُن فی کاروں اور شاعروں کا ہم کرتے ہیں جو دنیا اور زندگی کی فضا کو روحانی عمل سے شاداب رکھتے ہیں۔ ایک انجینئر منظر کے کہا ہے کہ فن اخلاق سے بھی زیادہ با اخلاق ہے۔ میں اکثر اخلاقی زندگی کی مثال کسی اچھے منظر یا سایہ دار درخت سے دیتا ہوں جس کی چھاؤں میں ہم اپنی تھکن مٹاتے ہیں اور سکون پاتے ہیں، دھرق، اکاش، ادبیا اور بہار، پہلے سائنس کی بجائے، چچان، انسان، ایوان، سنسار میں جو کچھ بھی ہے اس کا وجود ہی ایک اخلاقی عمل ہے بلکہ فطری لطیفہ ہیں اور شاعری و ادب میں تو بڑا اخلاقی کام بھی تینا کی پہلو دکھایا گیا ہے۔ اقبال نے اپنی اس نظم میں جہاں ایلینس جبریل سے خطاب کرتا ہے۔ ایلینس کی طرف سے کہا ہے ۴

تقدیر آدم کو دیکھیں تو گیس کس کا ہوا

یہا جنت میں دھرم راج پر مشروط جنت پہنچے تو کو دروں کو بھی جنت ہی میں دیکھا ہے۔ راون بھی رام کے ہاتھوں مرکز سیرھا جنت پہنچا۔ دائمی مذہب کا تصور یہ اخلاقی رہنمائی ہے۔ البتہ دنیا میں ظلم اور بے انصافی کے خلاف لڑنا عملی اخلاق کا ایک درمیانی پہلو ہے۔ روس کے ایک مشہور ادیب نے کہا ہے کہ پچاسی کے تخت پر برجرم حضرت عیسیٰ سے مشابہ ہوتا ہے۔ تاقی کو چھانی دے چکے کے بعد اس سے نفرت نہیں کی جاسکتی۔ یہ ہے میرا فلسفہ اخلاق۔ لیجئے میرا شعر یاد آگیا ہے

قتل کے پر غصہ کسب ہے لاش مری اٹھانے دو
ہم بھی جان سے جاتے رہے ہیں اکڑتے ہی جانے دو

میری ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی اور عملی لحاظ سے نیکی اور ہمدردی کا متعصب نہ بن جائیں اور لوگوں کے سبب کرنے کی آزادی دے دیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ بڑی کو بڑا سمجھو لیکن بدی کرنے والے سے نفرت نہ کرو۔ بے غصہ کئے ہوئے بدی کے خلاف لڑنا بلند ترین اخلاق ہے۔ کیونستوں سے میرا اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ وہ ظلم اور ظالموں کے خلاف لڑیں بلکہ اس لئے کہ گالیاں اور دانت نہ پیسیں۔ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے خلاف اس طرح لڑیں جیسے انگریزی سامراج کے خلاف گاندھی جی لڑے یا غلامی کے خلاف جن طرح پیٹل جی اہرلال نہرو لڑ رہے ہیں۔ اس طرح جدوجہد کریں۔ لڑیں نہیں۔ اخلاق عملی اخلاقی مقام سے بلندتر حقیقت ہے۔

شوق ۱۔ فراق صاحب! دنیا میں مذہب کا کیا مستقبل ہے؟

فراق ۱۔ وہ تمام مذاہب مٹ جائیں گے جو اپنے منہ کی عتیدہ رکھتے والوں کو جنسی سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے تعلیم دنیا کو صرف ہندو مذہب نے دی۔ یہ تعلیم عام ہو جانے لگی اور انسانیت کا ورثہ بن جانے لگی۔

پیرس نے ایک ہندو مذہب کی سب سے بڑی بین یہ ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان لانا بالکل ضروری نہیں بلکہ شعور میں روحانیت پیدا کرنا، منظر ہے میں روحانیت پیدا کرنا محسوسات میں روحانیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

شوق ۱۔ اور آپ کے خیال میں روحانیت کس وقت پیدا ہوتی ہے؟

فراق ۱۔ روحانیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہمارے انسانیت میں لطافت پیدا ہوتی چلی جائے۔ پوری انسانیت ایک ملت بن جائے گی۔ یہ ملت ہندو ملت یا اسلامی ملت نہ ہوگی بلکہ انسانی ملت ہوگی۔ بلند ہندو تکریمات معتیدوں سے آزاد ہو کر اس ملت

کر ہی ہم کوئی تارے نہیں توڑ لائیں گے۔ ہری اویٹھی
 بندیں جو سکول ہے اور غیر شعوری روحانی نشانی ہے
 اُسے سیدار زندگی میں منتقل کرتا ہے۔ بہر حال
 تقسیم اور تفسر تھے وہ چیزیں ہیں جنہیں مٹنا
 چاہیے
 لیتیں جب مٹ گئیں اجڑائے ایمان ہو گئیں

کا خواب دیکھتی رہی۔ ہم کو اپنی زندگی سے کتنا غم کا جوچ
 کم کرتا ہے۔ بے حس یا کم حس یا غلط حس سے آزادی
 حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں مادی ترقی
 کو لامحدود نہیں سمجھتا۔ اس کے بدلے ہمیں زندگی میں ایک
 داخلی انقلاب پیدا کرنا ہے۔ ہم جو ہیں اگر وہی رہے تو
 دوسرے تیار سے پر آباد ہو کر ورستاروں پر پہنچ

شہر حیدر آباد

وقائع طویل

مرا شہر ہے ایک شہر نگاراں جہاں وفا، محفل کلمتاراں
 براک خواب تعبیریں بہاراں یہ ادنیٰ مرد ہسار یہ بزم یاراں
 مرا دلیں مدد رشک شروسیں ہے
 کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے
 یہیں غفلت فکر و تہذیب فن ہے یہیں سفر و نئے کا البیلا پن ہے
 یہیں ہر وہ لغت کا ہر سوطین ہے یہیں زندگی کا ہر اک بالکین ہے
 براک دل یہیں مثل گل خندہ زن ہے
 کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے
 یہ بزم غمتاراں یہ سرو خراماں یہ طاؤس رقصاں یہ ابر بہاراں
 یہ صبح خراماں یہ شام فسر و زماں یہ بچھراج دیلم یہ گلزار و ایوان
 اُجھالوں کی ہنسی ہوتی، اجمن ہے
 کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے
 جہاں اعتبار دیا ضی سمن ہے جہاں ہر خوشی گل رخ و گلبدن ہے
 جہاں ہر نفس، ہر قدم بالکین ہے جہاں آرزو زار و ابر چین ہے
 وہ دلعزاسے، دل دیا ہے، دمن ہے
 کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے
 دیا ر دکن، غفلت قطب ثنایاں دیا ر دکن، صولت کے گھاٹاں
 دیا ر دکن، قسمت خوش نگاہاں دیا ر دکن، دولت داد خواہاں
 براک لب پر نام دیا ر دکن ہے
 کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

منشی تارینی چرن متر

بہا دہلی عیسیٰ ۱۹- دسمبر ۱۸۰۹ء کو ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ منشی میر شیر علی افسوس کے انتقال پر کالج کمیٹی نے مشری تارینی چرن متر کو دوسو روپیہ کا تنخواہ پر ہیڈ منشی مقرر کیا۔ رپورٹ میں یہ بات صاف درج ہے۔

At a Council held on 1st February 1810, Meer Sher Ulee Ufsoo Head moonshhee in the Hindoostanee Dept: having departed this life on the 19th of December 1809—Resolved that the following promotion and appointments in the Dept. take effect from the 21st December, vize Taranee Churan, appointed Head Moonshhee on 21st December in the room of Meer Sher Ulee deceased.

تارینی چرن متر ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ منشی کی حیثیت سے مئی ۱۸۳۰ء تک یعنی ۲۱ سال کے طویل عرصہ تک ملازمت کرتے رہے اور اس کے بعد ۵۸ سال کی عمری ایک سو روپیہ پنشن پر ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد تارینی چرن ہمارا جگہ کاشی کے دربار میں ملازم ہوئے۔ راجہ رادھا کانت دیپ کی کوشش سے انھیں

Home Dept: Miscellaneous P-186-No: 561 لے

لے رپورٹ میں کہا گیا ہے

The following situation to cease from 1st June 1830.

تارینی چرن متر ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ جناب محمد صلیح خان "گلکرسٹ" اور اس کا جہد میں لکھا ہے،

"کالج کونسل رپورٹ ولیم کالج کی کاروائی مورخہ ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے ہندوستانی شعبے میں حسب ذیل منشیوں کا تقرر عمل میں آیا تھا — چیت منشی میر بہا دہلی عیسیٰ، تنخواہ دوسو روپیہ ماہوار، سکڑ منشی تارینی چرن متر تنخواہ ایک سو روپیہ

ماہوار۔"

اور پھر آگے چل کر صفحہ ۱۹ پر فورٹ ولیم کالج کے معنیوں کی جو فہرست دی ہے اس میں تارینی چرن متر کا نام بھی درج کیا ہے اور لکھا ہے،

"۴۔ اپریل ۱۸۰۱ء کو تارینی چرن متر کی تنخواہ اتنی روپیہ ہوئی اور وہ چیت منشی مقرر ہوئے۔"

لیکن یہ درست نہیں ہے۔ چیت منشی کی تنخواہ اتنی روپیہ نہیں بلکہ دوسو روپیہ تھی۔ اور مئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج کے مختلف شعبوں میں نیٹس اور منشی رکھے گئے۔ اس دن کی رپورٹ میں درج ہے کہ تارینی چرن متر ایک سو روپیہ ماہوار پر تارینی منشی مقرر ہوئے اور اس وقت چیت منشی میر بہا دہلی عیسیٰ تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میر بہا دہلی زیادہ عرصہ تک اس جگہ پر قائم نہیں رہے، کیونکہ ۱۹- دسمبر ۱۸۰۹ء کی رپورٹ کے مطابق میر شیر علی افسوس ہیڈ منشی تھے نہ کہ میر

یہ کام ملا۔ کاشی جانے کے بعد میری راجہ رادھا کانت ویتپ سے ان کی خط و کتابت بھی بتاریخ ۱۸۔ مئی ۱۸۳۳ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاشی کے محشر تھے اور راجہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

یہ ہنسیت اخوس کی بات ہے کہ اردو کی بھی ادبی تاریخ میں تاریخی جہنم سزا کا حال درج نہیں ہے حتیٰ کہ محمد رفیع صدیقی نے بھی اپنی کرسٹ اور اس کا جہد میں ہندوستانی ویاڈنٹ کے اس چھینٹنی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس حال میں انھوں نے تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے ”کی کرسٹ اور اس کا جہد“ میں ہم کو دیکھ کر تمام مشنوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوجاتی ہیں کیوں کہ معتقد نے ان سب کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً میرا سی، بہادر علی حسین، حفیظ الدینی، میر شیر علی اخوس وغیرہ۔ لیکن انھوں نے تاریخی چرن مرتز کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں لکھا جو کتاب کی سب سے بڑی کمزوری ہے کیوں کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے تاریخی چرن مرتز ایک طویل عرصے تک فورٹ ولیم کالج کے چیف مشن رہے۔ اس نے ہم پر کہ آپ کو اردو اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا ورنہ اس دور میں آپ اتنے عرصہ تک اس اہم عہدے پر ملازم نہ رہتے۔

تاریخی جہنم سزا، بنگلہ، اردو، ہندی اور فارسی کے عالم تھے۔ آپ نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران میں اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا علم بھی آج نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ کتبچہ کی میں لکھ چکا ہوں ادنیٰ تذکرے آپ کے باب میں خاموش ہیں۔ تاریخی چرن مرتز نے اردو اور ہندی کی کئی کتابیں لکھیں۔ اور کالج کے ہندوستانی محکمے میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان میں آپ کا نمایاں حصہ رہا۔ سماجی اور ذلکے۔ کا ایک محلہ بدن پالی پر پینٹ کے ایک اشتہار سے ہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس پریس سے ۱۸۲۵ء میں آپ کی ایک کتاب ”گولادھا“

لے دیکھو بنگلہ ہفتہ وار ساپاورد پر ۱۸۲۵ء

نای شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب تاریخی حروف میں شائع کی گئی اور یہ وجہ پنیم کے لئے تھی۔ جناب محمد رفیع صدیقی نے ان کتابوں کی ایک فہرست دی ہے جس پر کہ ہندوستانی معتقدوں کو انعامات دینے کے لئے ڈاکٹر کی کرسٹ نے کالج کونسل کو لکھا تھا۔ اس فہرست میں تاریخی چرن مرتز کا نام بھی ہے لکھتے ہیں۔

”نام کتاب۔ تعلقات انسانی۔ صفات یقین سو۔ رقم انعام چھ سو روپیہ۔ معتقد تاریخی چرن مرتز مولوی امانت اللہ سدل مسر پٹنٹ، میر بہادر علی حسین میر شیر علی اخوس، مشی لال کب اور علام اشرف“۔ ان کی کرسٹ نے انعام کی تجویز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”اول الاکر تین مرتز جہنم خصوصیت کے ساتھ انعام کے مستحق ہیں کیونکہ بنگالی، عربی اور سنسکرت سے ترجمہ کر کے کاسا راجہ احمد علی پتہ تھا اور ان میں بھی تاریخی جہنم مرتز نے سب سے زیادہ منت کی ہے۔“

فورٹ ولیم کالج کے علاوہ تاریخی جہنم مرتز کا تعلق اسکول ”ہمک سوسائٹی“ سے بھی رہا ہے۔ میں نے کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کی کئی سالانہ رپورٹیں دیکھی ہیں۔ ۱۸۔ ۱۸۱۶ء کی رپورٹ میں مولوی عبد الواحد کے علاوہ چار بنگالیوں کے نام ہیں (۱) تاریخی چرن مرتز (۲) رادھا کانت ویتپ (۳) رام علی سیکس (۴) مرثیہ بدوینا انکار۔ اور ان میں تاریخی چرن کو سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ یعنی وہ اس کے سرکاری ہیں۔ اسکول بک سوسائٹی ۱۸۔ ۱۸۱۶ء سے ۳۱۔ ۱۸۳۰ء کی رپورٹوں میں میں نے تاریخی چرن مرتز کا نام پا یا ہے اور ان رپورٹوں سے حقیقی باتوں کا علم حاصل ہوا۔ ۱۸۔ ۱۸۱۶ء کی رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ۔

”باب تاریخی چرن مرتز جو کہ اسکول بک سوسائٹی کے دیسی سیکرٹری ہیں اور ترجمہ کی حیثیت سے مقبول ہیں

لے اسکول بک سوسائٹی ۱۸۔ جولائی ۱۸۱۶ء کو قائم ہوئی۔ یہ ادارہ اسکول کے لئے کتابیں تصنیف کرنے، شائع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام کرتا تھا۔

کورس کی کتاب تھی۔ متیق صاحب نے لکھا ہے۔

”گلیک کرسٹ کی یہ کتاب کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے جس میں Aesops fables کے کچھ قصوں کا ہندوستانی فارسی، عربی، برص ہماشا، بنگلہ اور سنسکرت میں ترجمہ تھا۔ ان زبانوں میں خود گلیک کرسٹ نے ترجمہ نہیں کیا تھا بلکہ کتاب کے سرورق کی عبارت کے مطابق مختلف لوگوں نے یہ ترجمے کئے تھے۔ مترجمین کی تفصیل یا ان کے نام درج نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن غالب سے کہ ہندوستانی، فارسی، عربی، بنگلہ اور سنسکرت کے شبیوں کے شفیوں ہی نے یہ ترجمے کئے ہوں گے۔“

میں اپنی تحقیق کے دوران میں یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہوا ہوں کہ متدحسبہ لاکتاب کا کس نے کس زبان میں ترجمہ کیا۔ اس مشہور کتاب کا بنگلہ، اردو اور فارسی ترجمہ کرنے میں تاریخی چرن متر نے بڑا حصہ لیا ہے۔ جان گلی کرسٹ نے تفصیل یوں لکھی ہے۔ ۱۔ ان ڈیسی مالوں کے نام جن کو کس کتاب کے مرتبہ کے لئے متر کیا گیا حریف میں ہیں:

- ۱۔ تاریخی چسرن متر زبان بنگلہ، فارسی اور ہندوستانی
- ۲۔ میر بہادر علی سینہ ” فارسی اور ہندوستانی
- ۳۔ میر فتح علی انسوس ” ” ”
- ۴۔ مولوی امانت اللہ ” ” ”
- ۵۔ سدر سر ” سنسکرت
- ۶۔ شری لال کب ” ”
- ۷۔ علام اشرف ” فارسی

تاریخی چرن متر کے انتقال کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا۔ شاید کاغذ میں ۱۸۳۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ان کتابوں کا جس کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے بنگلہ سے اب ہندوستانی میں ترجمہ کیا ہے، پر اس کے لئے تیار ہے اور چاہر اطلدیں شائع کرنے کے لئے آمادہ دیا گیا ہے تاکہ وہ موجودہ اور آئندہ کے لئے کام آئیں۔“

دوسرے سال یعنی ۱۹-۱۸۱۸ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہر اطلدیں ختم ہو گئی ہیں اور وہ چاہر اناگری حروف میں چھاپی گئی ہیں۔ اس بار ایک ہزار اطلدیں اور دوسرے میں چھاپی گئی تھیں اور (Well shaped Persian nustaaleeq) میں چھاپی گئی تھیں اور وہ بھی ختم ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے دوسرے دو ہزار اطلدیں اردو میں چھاپنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ اب چھاپی جا رہی ہیں۔ ۲۰-۱۸۱۹ء کی رپورٹ میں تاریخی چسرن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

“That the thanks of this meeting be cordially given to the native member and officer of the Society, and more especially to Baboo Tarinee Churn Mitra for his constant labours on the society account.”

۲۱-۱۸۲۰ء کی رپورٹ سے ہمارے علم میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ ”اور دوسرا“ جسے گلیک کرسٹ نے تصنیف کیا تھا اس کی دو ہزار اطلدیں پریس سے آئی ہیں۔ اور چھپ کر کچھ موبک کا انتقال ہو چکا ہے اسے باوجود یہ چرن متر کو اس کتاب کے سلسلے میں کافی منت کرتی پڑی اور آپ کی بخاری میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اور وہ یہی نہیں بلکہ کچھ روپک کی کتاب ”کھڑی ہونے کی ہمت“ جو کہ مرحوم کتب نہیں کر پائے تھے اس کو باوریتی چسرن متر نے مکمل کیا ہے اور اب وہ پریس میں ہے۔ اس کے بعد ۳۱-۱۸۳۰ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی چسرن نے ایک ”انگریزی ہندوستانی لغت“ کا مسودہ بھیج کر پیش کیا ہے لیکن یہ شکر کے ساتھ قبول کیا ہے۔

یہ سیٹے، یہ چٹائیں

مضبوط، چھپستانی، نئی کھوپڑیوں سے ٹھیکرا کرنا بیٹے ہوئے سینوں سے ہم جانے کی بات کہتی ہوئی پھر ٹھیکیدار کے منہ میں لٹ آئی۔ یہ اخلاق کے دور سے تو زندگی سے ناتہ جوڑے ہوئے تھے اور یہ زندگی کے تانے بانے تھے۔ ابھی راجو کی رادھا آئی ہوگی۔ وہ روز بارہ بجے آئی ہے۔ اپنے ملازم سینہ دوی آئیں سے بروسی ہوئی شینیائی موٹی موٹی روٹیاں لاتی ہے۔ اور راجو اس کے عوض دی بھر کی کافی دوڑی اردو میں کی کلر کے دانوں تلے آجاتے ہی اس کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر رادھا کی سرواٹھوں کے گنگوڑی اس گری سے بچھل جاتے ہیں اور گنگا بہہ نکلتی ہے۔ چٹاؤں کے اندر بھی راستے بن جاتے ہیں۔

”کاش ٹھیکیدار.....“ اور راجو صرف اتنا ہی سوچ پاتا کہ ٹھیکیدار پھر دور سے بیچ آجھٹتا۔
”اے لاجو..... حرام زادے.....“ مجروری کرتا ہے یا سقا۔ چل لاجو کہ وقت ہو گیا۔
اور رادھا جھوٹے برتنوں کی تھالی اپنے سینے سے لگائے چلی جاتی۔ سواری کا جھوٹا تو مانگ کا سینہ دور ہے۔ سہاگ کی امانت ہے۔

’رادھاؤں کے جاتے ہی بھاڑے اور بلیاں پھرتی ہیں ایک۔ دو۔ تیس۔ سینکڑوں۔ ہزاروں۔ اور چٹائیں

شینیائی، سبیلی اور سپاٹ دھرق کا سینہ چوٹ اور دھک سے پھلتی ہوئی تھا اور ٹھیکیدار کا سینہ ہر چوٹ پر چھوٹ رہا تھا یہی اچھی کوئی تیل کا فوارہ چھوٹ پڑے گا یا بجھنے ہوئے ہیرے یاد دگتے ہوئے سونے کی کوئی تہنگی پڑے گی جو ٹھیکیدار کی بکایت بن جائے گی یا بیسے ابھی اسٹیٹ بینک کا آئین دروازہ ٹوٹ جائے گا اور کونسی برس پڑے گی۔
”کیا کر رہے راجو؟ چل، جلدی جلدی کام کر۔ حیرام خور۔“
ٹھیکیدار کے صبر کا پیمانہ چھوٹ گیا۔ وہ ابیں دور اونچی چٹان سے برس پڑا۔

پھاڑے، سیلیاں اور کدال ایک ساتھ اٹھے اور مضبوط چٹیل چٹاؤں سے ڈراما بنی اور پھلنا شروع ہو گئیں۔ تڑاک۔ تڑاک۔ تڑاک۔ اور ٹھیکیدار کی سرخ چٹاؤں کی طرح کھوڑ اور سپاٹ پتلیاں دم دم پڑنے لگیں۔ اجنبی دورے آنکھوں سے پھرے چلے گئے۔ پھر سیٹے سے کانٹے مٹیائے جسم چھپانے لگے۔ نکلے اور نا توں بازوؤں میں بھی کی ابھری ہوئی پتلیاں پھر نیت کے جھکے ہیں آئے ہیں۔ پیٹ کی شکلیں ڈھری ہونے لگیں۔ تو ٹھیکیدار کا جسر کا گھوڑا پھر یک آغا۔ چٹائی انھیں جاگ گئیں۔ اجنبی دورے کو آئے اور شے برتنے لگے۔

”اوپے کیا کرتا ہے.....“ اور ایک موٹی سی گالی کی پڑی ہوئی پتھر کی چابک اترتی ٹھیکیدار کے منہ سے چھوٹ پڑی اور منٹلی

تو اپنے نکیتن - ٹیکیدار کا سینہ چولے لگتا۔

”بیٹے اور بیٹیاں...“

راجو مرت آنتا ہی سوچ پاتا۔ ٹھک۔ ٹھک۔ تڑاک...
تڑاک۔ چلا آئے اور گنگا کا خاموش شہرہ پاٹی راستہ بدل کر منہ
پھیر لیتا۔

اور کام کرتے کرتے اپنا تک ایک دن بلیاں رک گئیں۔
کدالیں سہم سی گئیں۔ بچا وڑے اٹنے سے لگے۔ ٹیکیدار کا سویا ہوا
ذہن جھٹکے کھانے لگا۔

”کیا ہے رامو۔ کام کیوں رک گیا؟“۔ دل: ٹیکیدار
اپنی ساری قوت سے گرج اٹھا۔

”سرکار کھانا“۔ رامو کی کدال کی ٹن ٹن نے کسی خزانے کا
بھید پایا تھا۔

اور ٹیکیدار نے ایک انیم کی گولی میٹھے خرک کے عذاب میں
گھول کر اپنے گھر کے نیچے اتاری۔

”روک دے کام۔ رامو۔ میں آ رہا ہوں۔“ ٹیکیدار
کی آواز میں نجانے کہاں سے خزانے کی نرم کھٹک اٹھی اور وہ
لڑکھٹا ہوا آہ بھونچا۔

”بھلے ہے کھانا۔ لا کدال مجھے دے۔ میں کھودوں گا
ادھر ہو کام چور خزانہ میرا ہے۔“

اور نہ جانے کہاں سے ٹیکیدار کی قوت ٹوٹ آئی۔ اس کے منہ
بوسے یا توڑوں کی پھلیاں خزانے کے مقناطیس سے کھینچ کر ابل پڑیں۔

ایک۔ دو۔ تین۔ کچا بار کدال چٹاؤں کے اندر
چھپے ہوئے خزانے سے ٹکرائی۔

’ٹن۔ ٹن۔ ٹن‘ اور کسی مزدور نے پیچھے سے کہہ

دیا۔ ”کھانا ہمارا ہے۔“

گر ٹیکیدار نے سنی آن سنی ایک کر دی۔

ٹن۔ ٹن۔ تڑاک۔ تڑاک

خزانے کو چھپانے ہوئے چٹان ٹوٹ گئی۔ کدال کی نوک لمبے
سے ٹکرائی اور ایک چنگاری پھوٹ پڑی۔ ایک انوکھی روشنی کی ہر
کوڑھی اور آنا نا سرد ہو گئی۔ ٹیکیدار کے اکتوں پر بھی ہونے
گوال پھر عیس۔ پورینچے گری اور ٹکرائی۔ پھر چنگاری تپن پھوٹ
جیسے کسی سنت کڑی کے ٹکڑے سے ٹکرائی ہو۔

اور مزدور ایک پڑے۔ ”یہ کھانا ہمارا ہے۔ یہ
کھانا ہمارا ہے۔“

پھر کچا کدالیں ایک ساتھ اٹھ گئیں۔ بجلی کوڑی اور ٹیکیدار
پیچھے ہٹ گیا۔

رامو نے جلدی جلدی ٹوٹی ہوئی چٹانیں ہٹائیں جیسے ماں کی
چھاتی میں مننا کابیرا تلاش کر رہا ہو۔

سامنے خزانہ تھا۔ جو مرت رامو کا تھا۔ اس کے تمام ساتھیوں
کا تھا۔ کچا سو برس پرانی چٹانوں کے نیچے۔ کچا پڑا اور تپتی ہوئی
کی تہہ میں۔ جو آج بھی اسی طرح زندہ تھا۔

مزدور رہے چین ہو اٹھے۔ رامو نے بڑھ کر خزانے پر اپنا
سینہ رکھ دیا۔ ٹیکیدار کی سانس آ کھڑے لگی اور مزدور جھک کر

اور کچا ہزار برس پرانی اور نہنگ خورہ کدال اور منقبض
چٹیل اور سوکھی انسانی ٹھوڑی سے پٹ گئے۔

بچے خاموش زبان سے کہہ رہے ہوں۔ دیکھو ہم امر ہیں۔

نئی کتابیں

علمہ منتخب یعنی تذکرہ سرور

سلسلہ اشاعت مخلوقات اردو - دہلی یونیورسٹی - نبرا
تائیں قواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور سے مقدمہ از
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی پروفیسر صدر شعبہ اردو فی یونیورسٹی -
کتاب بڑی تبلیغ کے ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ پکڑنے کی مضبوط جلد
ہے اور ٹائپ میں دیر کا فخر پر چھپی ہے - قیمت بیس روپے -

تذکرہ سرور آٹھ سو سے زیادہ شعرائے اردو کے حالات اور
کلام پر مشتمل ہے - حالات فارسی میں ہیں - اس نسخے کا متن انڈیا انس
لائبریری لندن کے نسخہ تذکرہ سرور کے عکس سے تیار کیا گیا ہے -
ایک مختصر موقوف مقدمہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے قلم سے
شامل کتاب ہے جس میں تذکرہ سرور کے نسخوں، سرور کے حالات زندگی
تذکرے کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ درج ہے - اینٹیک بیئر میڈر اہد
تاریخی تذکرہ حزب کی لائبریریوں کی زینت تھا - اسے شائع کوکے دلی
یونیورسٹی نے اردو کے ادبی سرمایہ میں ایک گمان قدر اضافہ
کیا ہے -

دیوان میر

مرتبہ سردار جعفری - ناشر ہندوستانی بک ٹرسٹ کھیتان پور
دوسری منزل، پے ٹاؤن روڈ - بمبئی - فرہنگ ہندی الگ چھپا
ہے - قیمت سہ فرہنگ بیس روپے - کتاب خوب صورت ٹائپ
میں چھپی ہے - نفیس کپڑے کی جلد سے مزین ہے - ہر صفحہ اردو کے

ساحے کا صفحہ ہندی رسم الخط میں چھپا ہے - دونوں ہندی یا اردو
جاننے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں - اس سے پہلے یہ ادارہ
دیوان غالب اسی اسلوب سے شائع کر چکا ہے - ایک بسوط اور
فاصلہ از مقدمہ کتاب کے شروع میں مرتب کے قلم سے ہے -

گل تر

محمود علی الدین کا مجموعہ کلام - ناشر مکتبہ مباحہ، محبہ گاہ
حیدرآباد دکن - قیمت ایک روپیہ پچاس سٹم پیسے - صفحات ۸۸ -

محمود اردو زبان کے جاننے پہچاننے شاعر ہیں - ان کی شاعری
کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص ہے، ان کا بیدار سماجی شعور ہے -
خود ان کا قول ہے کہ سماجی تقاضے پورا کرنا اور پرستار لکھنا ہے -
ان کے یہاں ماسکو، بیجاپور، تلنگانہ پر نہیں ہیں وہاں جھاگ مٹی،
پیار کی چائنی اور احساس کی رات پر لطیف جزئیات کا انجسار
ملتا ہے -

عروس فطرت

مرزا جعفر علی خاں انزلی کی اردو کے نہایت ممتاز ادیب
شاعر ہیں - ان کی فیصلہ نغموں کا مجموعہ عروس فطرت کے نام
مکتبہ برائی دنیا بازار سینما دام دہلی سے شائع کیا ہے - قیمت تین روپے -
اگر صاحب کی قادر الکلامی سے کوئی کافر انکار کر سکتا ہے -
غزل ہمایا نظم دونوں اصناف سخن پر آپ کی کیا قدرت ہے -
اس مجموعے میں ۹۳ نغمیں شامل ہیں - ہمیں امید ہے کہ اس مجموعے

کی اردو کے حلقوں میں یا علوم اور ادب میں یا خصوصی قسم کی جائے گی۔

سجی مختصر

فروزان کے بیرونی کایہ دوسرا مختصر مجموعہ شائع ہوا ہے۔
ناشر انجمن ترقی اردو (بندر) علی گڑھ۔ قیمت دو روپے۔
کتاب نمائش میں بھی ہے اور بڑی صاف ستھری ہے جس کی
دہن بیکار کے مالک ہیں۔ ان کے غزلوں اور نغموں میں اسی ذہنی
بیادری کی جلوہ سائیاں ملتی ہیں۔

آج بھی سر سے گرجا جاتی ہیں امواج بلا
آج بھی اپنے اچھرنے کے نشان لکھتے ہیں

اس مجموعے میں نگلیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ اور سب جذب کی
الغازیت کی آئینہ داد۔

مختصریں اردو

مترجم سید زوار حسین زیدی - ناشر غالب پک ڈپو
گیت روڈ لاہور۔ قیمت ڈھائی روپے۔ ہر صفحہ آرٹ پیپر پر لک
میں چھاپا ہے۔ میراں دہلوی سے شوکت تھادی ملک - ہر ترنہ گلاؤں
کے حالات، نمونہ ترنہ اور تصویر اس خوب صورت کتاب میں درج
ہیں۔ اس سے قبل اسی قسم کا ایک مختصر تذکرہ شراو کے باب میں
مترجم نے ہندوستانی میں تقسیم سے قبل شائع کیا تھا۔

ساگر سہیت سروس - بحرِ ترجمہ

مصطفیٰ آبداد - مترجم موز لکھنؤ - ناشر
آدرش کتاب گاہ - ۶۹-۱۵۲۸ فیضی ٹولہ، درگیاں دہلی۔ قیمت
ایک روپیہ ۵۰ - ساپیٹ۔

اصل تعینت نظم میں ہے۔ ترجمہ نثر میں ہے۔ ترجمہ
روان اور سلیس ہے۔ مترجم صاحبِ خلقی و ترجمہ پر یکساں قدرت
رکھتے ہیں اور متعدد کتابوں کے معنی و مترجم ہیں۔ ان کا یہ
ترجمہ نگاہی ادب کے ایک شاہکار ہے اور حلقوں کو روشناس کرائے گا۔
نوائے سروش

معنی: ہمیں سنبھال دی گئی۔ معنی: عطا ہوا ہے

باری روڈ لگیا کے پتے سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

بہل صاحب بڑے مشتاق تاریخ گو ہیں۔ تعریف اور تحسین
کے بغیر ان کی تاریخی قابلِ داد ہیں۔ اس کو درمیان میں مٹا جانا ہے
صرف ایک تاریخ مثال کے طور پر درج ہے۔
مولوی محمد یعقوب صاحب کے فرزند کی تاریخ وراثت ہے
ایچو میرو سنے درخانہ یعقوب احمد

۸ ۵ ۱۳، پجری

کتاب کا تاریخی نام بھی قابلِ داد ہے۔

مجموعہ تعلقاتِ تداریح

۱۹۶۱ء میروسی

کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔

اردو شعاعوں کا انتخابی سلسلہ { انجمن ترقی اردو
اختر شرفانی { (بندر) علی گڑھ
یگانہ چنگیزی { نے اردو انتخاب
شائع کئے ہیں۔ اس سے قبل بھی متعدد شعرا کے انتخاب چھپ
چکے ہیں۔ دونوں انتخابوں میں سے ہر انتخاب کی قیمت ۵،

عروسِ ممنا

پروفیسر حامدی کا شعیری کا مجموعہ کلام۔ ناشر ادارہ ادب
بھوری کول سری نگر کشیر۔

حامدی صاحب انسانوں اور ناول کی دنیا میں تو نام پہلے
کرمی چکے تھے۔ اب ان کی یہ تعینت، منت نظم شائع ہوئی ہے۔
حامدی درد مند دل رکھتے ہیں اسی لئے ان کے یہاں اس قسم کے
نشر ملے ہیں

چھوٹی تھی مجھ دل کو تری بھولی سی نظر

وہ نظار مری تقدیر ہوئی جاتی ہے

قیمت دو روپے ۵۰ - ساپیٹ۔

مضارب

شباب ملت کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

ملے لاپتہ۔ کوشنابراؤز پبلشرز نے کتبہ اردو ادب اپنی
چھاپنی بنی۔

شیاب لٹ کے خوش گوئی ان کے کلام سے آشکارا ہے۔ ہر
اور نہیں وہ دن اس کتاب کی قربت میں۔ نور کلام ملا جملہ ہو۔

ہائے لقتیر میں لکھے ہوئے دافوں کی کشش

نہیں سنیں چمن دام ملک آپہنچے ہیں

ہے اختیار ہی شامی و روشن میں شیاب

بھی میں سحرہ زن ہر جہ سے باہر یاد نہیں

لیکن ان کی نظموں میں غزلوں سے زیادہ خطوط اردو لکھتے ہیں۔

قال نیک سمجھنا چاہیے۔

پیر بیضا

سارہ جویاں کا مجموعہ کلام ملے لاپتہ۔ کتبہ جامع لکھنؤ

اردو بازار دہلی۔ قیمت تین روپے

Pilgrimage of Eternity

اقبال کے جاویدانے کا انگریزی ترجمہ از شیخ محمد احمد۔ دیباچہ از
جشن جلال رحمت۔ ترجمہ بھی منظوم ہے اور اقبال کی حرکت آلاستیف

کو جو ڈانٹے کی Divine Comedy کے تحت میں

لکھی گئی۔ انگریزی جانتے والوں سے مسرت کرائے گا قیمت باؤ روپے

ملے لاپتہ۔ انیشیوٹ آف اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۲ (۲۰۰۰)

نئے ڈرائے

منتخب ڈاکٹر محمد حسن۔ ناشر انجمن ترقی اردو دہلی۔ اصل گڑھ

صفحات ۱۱۲۔ قیمت پانچ روپے۔ کتابت۔ لمبا عتد۔ اوسط۔

اس مجموعے میں مختلف ڈراما نگاروں کے بارہ ڈرائے شامل

ہیں اور سب کے سب جدید سٹیج کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر منتخب

کے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے مرتبہ نے وقت کی ایک اہم ضرورت

کو پورا کیا ہے۔ ان دنوں ملک میں ایسٹ کے اجا دی وجہ سے ایسے

ڈراموں کی تلاش ہونے لگی ہے جو ایسٹ کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہ

ڈرائے زیادہ تر جدید ماحر کے سماجی مسائل سے متعلق ہیں۔ اسے

جدید اردو ڈراما کا نمائندہ انتخاب کہا جاسکتا ہے۔

پروسی کے خطوط

مفت۔ جموں گورکھ پوری، ناشر کتبہ جامع لکھنؤ

نئی دہلی۔ صفحات ۲۱۲۔ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے۔ کتابت

لمبا عتد۔ جموں گورکھ پوری کے بارہ خطوط کا مجموعہ ہے

جن میں انھوں نے زندگی اور ادب کے مختلف مسائل پر اظہار حیاں

کیا ہے۔ جموں صاحب ایک بلڈ پائے ادیب و نقاد ہیں اور انھوں نے

مختلف موضوعات پر بھی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بصیرت افزا

اور دل چسپ ہیں۔ ان خطوط کے حامل کم عروک ہیں۔ لیکن کو بقول مفت

”ہیں نے اپنے سے کم عمر لوگوں کو اس لئے حامل کیا کہ مناسب سمجھا کہ

پیری آواز زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہو سکے گی۔“

فن اور فن کار

مفت۔ ڈاکٹر رفیع سلطان۔ ناشر مجلس تحقیقات اردو لکھنؤ

صفحات ۱۰۹۔ قیمت مجلہ تین روپے۔ غیر محدود روپے ۵۰ پیسے

کتابت لمبا عتد۔ اوسط۔

یہ مجموعہ محمد زکریا رفیع سلطان کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے

جن میں جدید موضوعات کے ساتھ نئے اردو ادب کے قدیم اصول

اور شاعروں کی تخلیقات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس سے معتمد

کی وسعت مطالعہ اور سائنسی انداز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ہے کہ

یہ مجموعہ مضامین اردو ادب سے دل چسپ رکھنے والوں کے لئے مفید

ثابت ہوگا۔

عظمت رفتہ

از شبیر الدین احمد رنی۔ ناشر نیلی مرکز کراچی ۱۰۰

۵۱۲۔ قیمت دس روپے۔ کتابت۔ لمبا عتد۔ اوسط۔

جلد اول پر پیش کی جا رہی ہے۔

اس میں ۹۳ شخصیتوں کے سوانح حیات درج ہیں جن کو

مفت ستر پورے دل حب امتاز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ سب وہ لوگ

ہیں جو کسی نہ کسی میدان میں صاحب عظمت ہوئے اور تاریخ میں

اپنا اثر نشان چھوڑ گئے۔ جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کی نشان دہی

کرتے ہیں۔ کتاب میں بعض نواب فخر دورج بھی۔ ہر لحاظ سے یہ کتاب

اردو کے سوانحی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا کتاب النذر

جامعِ برودینر ہالوں مجید - مترجم ڈاکٹر سیردی الدین - ناشر
ابوالکلام آزاد انشیل ریسیج انسٹی ٹیوٹ، زیریت آباد، حیدرآباد
صفحات ۲۸۹ - قیمت چھ روپے - کتاب ٹائپ میں خوبصورت
چھپی ہے۔

زیر نذر کتاب ملک دیر دی ملک کے اکابر کے ان مضامین پر
مشتمل ہے، جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا
گیا ہے اور مختلف حوالات سے اس علیل القدر شخص کا ذکر کیا گیا
ہے۔ یہ مضامین انگریزی میں لکھے گئے۔ فاضل مترجم نے انہیں
اردو میں منتقل کر کے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔

محمد بن قاسم سے حملہ یا برکت

مفت - تیارہ فتحپوری - ناشر نیم پک ڈپو، لاٹوش روڈ
لکھنؤ - صفحات ۲۲۷ - قیمت چھ روپے پچاس نئے پیسے - کتابت
لیاقت اچھی۔

اس کتاب میں تیرہ ابواب ہیں، جن کے تحت محمد بن قاسم کے
حادثے سے کہہ کر ہر بابری ایک تاریخ اہلحدی بدکار سرری جائزہ پیش
کیا گیا ہے اور ہر دور کے سیاسی، اجتماعی اور تہذیبی حالات
پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب تاریخ ہند سے دل چسپی رکھنے والوں
کے لئے خاص کر مفید ملانہ ہے۔

تاریخ اسلام حصہ اول

از امان مولانا بیہدی نقی نقوی - ناشر ارز حیدر سبیل
اسسٹنٹ سیکرٹری ان ایجوکیشن، لکھنؤ - صفحات ۱۸۱ - قیمت دو روپے
کتاب میں - حضرت امیر المومنین خلیل اللہ سے لے کر حضرت رسول کریم
ﷺ تک اسلامی تاریخ کے واقعات و روایات کے لئے لکھے گئے ہیں۔ الماریش
نے اسلامی تاریخ کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی یہ

پہلی کڑی ہے۔
پوسٹ مارم

مفت عبدالصاحب تلمس جھوپالی - ناشر فقرا ادب پبلیشرز

پیری ٹکٹ - جھوپالی - صفحات ۱۸۳ - قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے
کتابت لیاقت، جلد، جلد پیش عمدہ۔

زیر نذر کتاب طنزیہ اور مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ مفت
نہ اپنے مخصوص انداز میں بڑے قارئین کے ساتھ مختلف شخصیتوں کا
خاکہ ان کے سماجی پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنے مقصد میں
وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

چند سال پہلے اسی نام سے عرشِ عیانی کا صاحب ایک
کتاب شائع ہو چکی ہے۔

دیک کی بک

از محمد ابراہیم - ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی محمد -
صفحات ۱۳۴ - قیمت دو روپے - کتابت، لیاقت اوسط۔
اردو میں عیانی دنیا سے متعلق کتابوں کی بہت کمی ہے۔ خاص
مفت نے دیک کی بک کی فکر کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔
اس کتاب میں دیک کی زندگی اور اس کے خاص سے متعلق دل چپ
معلومات درج ہیں۔

گرو دیو ٹیگور

مفت دویک بٹنا پاریہ - مترجم شہناز حسینی - ناشر
میرٹو پبلیشنگ کمپنی پرائیویٹ لٹڈ - ۱ - اینٹی سبھا شاگ
دلی - ۶ - صفحات ۱۰۰ - قیمت چار روپے - کتابت، لیاقت، جلد
جلد پیش عمدہ۔

اس کتاب میں شاعر اعظم ٹیگور کی گونا گوں شخصیت اور ان کے
فنِ ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے نظریات و خیالات کا
جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ناب مددگار زادہ کا
کا تفاوت شامل ہے۔ ترجمہ نبات رداں اور سلیس ہے۔

سوامی دیوکیانند

شائع کردہ - سری رام کرشن مشن ڈپلی - صفحات ۶۰ - قیمت
ایک روپیہ - کتابت، لیاقت عمدہ۔
یہ سوامی دیوکیانند کی زندگی کی بک ہے۔ سچ انگریزی
سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ رداں اور سلیس ہے۔ سوامی کی حالت

ادراں کے پیغام سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

پاکستان کی بساطِ سیاست

مختلف خراجِ غلام محمد۔ کوچہ روح اللہ خاں دہلی ۶ صفحات ۱۹۱۔ قیمت تین روپے بجائیس نئے پیسے۔ لمبا عت کتابت بھی۔ اس کتاب میں پاکستان کے حالات و واقعات اور دہائی کے اہل الرائے حضرات کے خیالات اور پاکستانی اخبارات کے اقتباسات یکجا کر کے شائع کئے گئے ہیں۔ سیاست سے دل چسپ رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب مفید مطالعہ ہوگی۔

جاجی نلؤل (ناول)

مفت فتح سجاد حسینی۔ مرتبہ جمیل جاجی۔ ناشر شائق باغی

نزد اور دو کاغذ۔ شملہ ۱۰ روڈ۔ کراچی ۱۔ صفحات ۲۹۶ قیمت چار روپے بجائیس نئے پیسے۔ کتابت، لمبا عت، جلد چلچلانی اور 'جاجی نلؤل' ایڈیٹر اور دو پینج شفی سجاد حسینی کا مشہور مزاح ناول ہے جس کو مرتب نے مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہودی کی لڑکی

خوبصورت بلا [از آفا حنتر کا شیری۔ ناشر مشابیر یک ڈپو کلکتہ۔ علی ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ کتابت لمبا عت اوسل۔ آفا حنتر کھن دو مشہور و مقبول ڈراموں کے نئے و ایڈیشن شائع کئے گئے ہیں۔

(م س شس)

'آج کل' کا 'فن تعمیر نمبر'

اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہوگا

اس خصوصی نمبر کے لئے مندرجہ ذیل عزائمات پر مہمنوں درکار ہیں۔ جو حضرات معانیوں لکھنا چاہتے ہیں وہ ایڈیٹر 'آج کل' سے خط و کتابت کریں۔

۱۔ ہندوستان کا قدیم فن تعمیر (جوہن جوڈو، ایڈیٹر و جیزہ)

۲۔ لودھ فی تعمیر

۳۔ جین فن تعمیر

۴۔ غاروں کے تھرائی شاہکار

۵۔ بنوئی ہند کا فن تعمیر

۶۔ ہندو گریانی فن تعمیر

۷۔ چوکیا طرز تعمیرات

۸۔ مینان اور منلی فن تعمیر

۹۔ پہاڑی فن تعمیر

۱۰۔ مشرق میں ہندوستانی فن تعمیر کے اثرات

۱۱۔ جدید ہندوستانی فن تعمیر

۱۲۔ آزادی کے بعد کی عمارتیں

پتہ: ایڈیٹر 'آج کل'، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

مئی ۱۹۶۲ء



دیوکی تو دیوکی مھاروی گوری پانی ہے بالی
 سارو ہی گام لبھایو گڈا مارکی
 کللا نہ پکلا ساہیب کور پاپیا
 پھٹت امار نندل وارے رو کیر

موتی مورت

پہلو ادھے یہ راجستانی دوشیزہ پانی پھرنے جاری ہے۔
 اس کی ساڑھی کے پلو پر پیسے اور سونے ہوئے ہیں جہاں
 جہاں سے یہ گزرتی ہے، گاؤں والے اس موتی مورت
 کو دیکھتے ہی رو جاتے ہیں۔

ہاتھ کھڑی

ہمارا قومی درش

ہندوستانی ڈراما

(۱:۱۔ ڈاکٹر صفدر آغا)

ڈاکٹر صفدر آغا دنیائے ادب کی ہشتوڑ شخصیت ہیں۔ یہ گراں پایہ تعینیت ڈراما کے میدان میں ان کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فاضل معیت نے اس تعینیت کو نمائی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈرامے کی تاریخ اور مغربی و ہندوستانی فن ڈراما سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں محنت نے اداکاری سے بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ڈراما اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر ہے۔

صفحہ ۱: ۳۴ — قیمت ۱۔ تین روپے ۷۵ نئے پیسے

برنس میجر پبلیکیشنز، ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی ۶

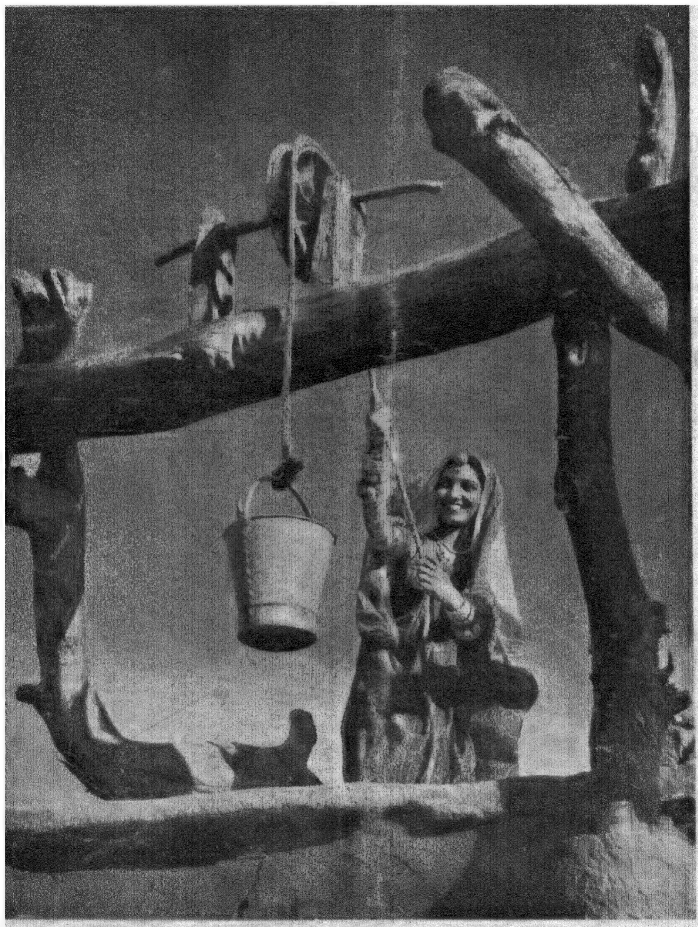
باہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹- اسٹریٹ نمبر ۳۳- پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲- رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱- بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا- ۳۱ گرینچ روڈ، سنگاپور

برنس میجر پبلیکیشنز، ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

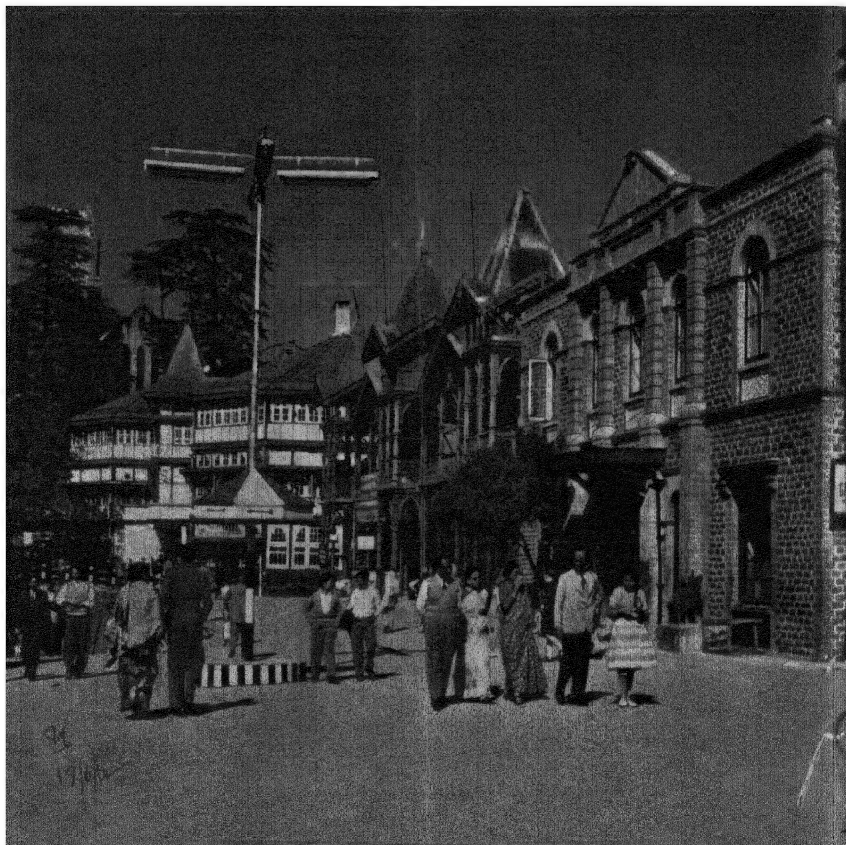
آج کل

پیشہ شاکر ۱۹۵۴ء

جون ۱۹۵۲ء

Marine University Library
GRABAD (DECCAN)

۶۰ پیسے



ہماری اردو کتابیں



قیمت	مفت	نام کتاب
۳ روپے ۵۰ نئے پیسے	مقدر آہ	ہندوستانی ڈراما
۲ روپے ۵۰ نئے پیسے	انت گویاں شیوڑے	جو انالکھی (ناول)
۲ روپے	ٹیبر منڈی	پنڈت ہرد سے بات چیت
۲ روپے	—	ابوالکلام آزاد
ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے	ڈاکٹر سی۔ وی رمن	سائنس کے چند پہلو
ایک روپیہ	—	ہندوستان کا دستور
ایک روپیہ	—	بھارت کی لوک کہانیاں
۵۰ نئے پیسے	—	دیس میں کی لوک کہانیاں
۵۰ نئے پیسے	ڈاکٹر ایس۔ راوہا کرشنن	کلی یا تہذیب کا مستقبل
۵۰ نئے پیسے	جواہر لال نہرو	بھارت آج اور کل
۵۰ نئے پیسے	—	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں
۴۰ نئے پیسے	—	کیلنڈر کی اصلاح
۳۵ نئے پیسے	—	ناپ تول کا پیشی نظام
فی ہیرا اٹے پیسے	—	جواہر لال نہرو کی تقریریں
		نمبر ۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸

پبلک اور ڈاک خرید کے لئے کم سے کم پانچ روپے یا قیمت کا پانچ ۱۲ فیصدی مرزہ بھیجئے۔
رجسٹرڈ کے لئے ۵۰ نئے پیسے اس کے علاوہ ہونگے۔ ۲۵ روپے یا اس زائد کی کتابیں مگولنے پر معمولی ڈاک سہا

کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے

برنس منیجر پبلکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوامی مہینہ نامہ

ترتیب

آج کل دہلی

مجلسِ ادارت

محمد حبیب جامعہ ملیہ دہلی
حاجی الدین قادری زور سری نگر
کپڑی ناتھ رام دہلی
خواجہ احمد فاروقی دہلی
عبد القادر سرودی جدید آباد
بی۔ ایس۔ مہن اوڈا لکھنؤ پبلیکیشنز ڈویژن
سی۔ این۔ ایس۔ لکھنؤ ڈیپٹی ڈائریکٹر (ایڈیٹوریل)
بی۔ نجسنا تھ ڈپٹی ڈائریکٹر (پروڈکشن)
بال مکندر عرش ایڈیٹر شنبہ اردو (ریگسٹری)
(مدیر پرسنل)

اسسٹنٹ ایڈیٹر، منظر شاہ

سالانہ چندہ:-
غیر مالک سے:-
ہندوستان میں:- سات روپے
پاکستان میں:- ساڑھے دو روپے
اشٹلنگ یا ڈیڑھ ڈالر
ہندوستان میں:- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں:- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر مالک سے:- اشٹلنگ یا ڈیڑھ ڈالر

مقررہ دستانہ نمبر

ڈائریکٹ پبلیکیشنز ڈویژن مسٹری آف انفارمیشن ایڈیٹر ڈائریکٹ پبلیکیشنز

۲	ادارہ	ملاحظات
۳	اعجاز حسین	فائیکل تنقیدی شعور
۱۰	دانش قزازی	شاہ کار
۱۱	علی عباس حسینی	پلمبی کا عجیب گھر
۱۵	اطہر حسین جعفری	زعفران دار کثیر
۱۸	پیام قیصری	غزل
۱۸	دھمی عارف	غزل
۱۹	شہابہ سبید	ڈاکٹر دوشیزہ
۲۷	محمد پوش خاوری	آٹا پتوری
۳۳	عزیزت قادری	منصوبے
۳۴	محمد حسن	تشکست
۴۶	راجندر بہار دوج	غزل
۴۵	سرداری لال شتر	برہم

سردی:- خدا کا ایک پُروردہ بازار۔۔۔
رسالے کی پشت پر:- آج کل گرمی کے رستا گرم

جیشٹ شنگ ستمبر ۱۹۶۲ء
جون ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ - نمبر ۱۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکندر عرش ملیا ٹی ایڈیٹر آج کل (اردو) ڈائریکٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

ڈاکٹر عیدالتا رصیلقی بھی ہیں۔ پدم بھوشن کا انعام پانے والوں میں مرزا جعفر علی خان انٹر کمونی اور علامہ نیاز فتح پوری شامل ہیں ان تینوں حضرات کو اعزاز دے کر حکومت نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے جس پر علمی و ادبی حلقوں میں انہماک و مسرت کیا گیا ہے۔ ہم ایک مرتبہ پیران بزرگوں کی خدمت میں ہدیہ تحریک پیش کرتے ہیں اور ان کی درازی عمر کے لئے دعا گو ہیں۔

ملک کی عام منصفی ترقی کے لئے جہاں بڑی بڑی صنعتیں قائم کی جاتی ہیں وہاں چھوٹی صنعتوں کی تہمت افزائی اور استحکام کے لئے بھی کوششیں جاری ہیں۔ اس وقت یہ کوشش ہوم ہی ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تہمت کا کام دسپنہ پیمانے پر انجام دیا جائے تاکہ ان کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ دوسرے پہلے سالہ پلان کے دوران میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے ایسی صنعتوں کے لئے ۵ کروڑ روپے کی رقم پیش کی گئی تھی۔ اسی طرح تیسرے پلان کے تحت ان کے لئے ایک ارب ۱۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ بنی طور پر لگایا جائے والا سرمایہ دو ارب ہوگا۔ ان وسیع کوششوں کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یہ صنعتیں جو ابھی دستکاروں تک محدود ہیں، بڑی بڑی صنعتوں کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوں گی اور ملک کی ہر گز منصفی ترقی میں ایک اہم رول ادا کر سکیں گی۔

گزشتہ ماہ ڈاکٹر اجڈ پر سادہ صدر جمہوریہ کے ہمد سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ جمہوریہ ہند کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اور بارہ سال تک اس ہمد پر قائم رہے۔ مرموف انکسار اور شرافت کا مجسمہ ہیں۔ آپ نے سادہ طرز زندگی کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے، جو ہر زمانہ میں ملک والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ جنگ آزادی میں آپ نے تن من و حن سے حقاریا اور اپنی محنت اور خلوص کی بدولت صعب اول کے لیڈروں میں شامل ہو گئے۔ آزادی کے بعد آپ کی ذہانت، سنجیدگی اور تحریک کاری سے ملک فیض یاب ہوتا رہا۔ آپ ہی کی سرکردگی میں ملک کا دستور تیار ہوا۔ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے۔ اپنے دور صدارت میں آپ نظام حکومت کی بہتری، منصوبہ بندی اور جمہوری و دستوری روایات کے استحکام کی سعی میں برابر کے شریک رہے۔ اگرچہ آپ صدر کے ہمدہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں، مگر آپ کی ذلت ملک والوں کے لئے مشعل فیض رہے گی اور قوم آپ کے پیر غلام مشور و دست برابر مستفید ہو رہی ہے۔

۲۸۔ اپریل کو راشٹری بھوئی کی ایک شاندار تقریب میں صدر جمہور نے ملک کی ان نامور ہستیوں کو اعزازات اور سندات عطا کیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ سنسکرت اور عربی کے جن عالموں کو اعزاز کی سند ملی ہیں ان میں صمدی کے عالم

غالب کا تنقیدی شعور

ممنون شروع کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں غالب کو بہ حیثیت نقاد نہیں پہنچ کرنا چاہتا۔ کیوں کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ تنقید کا کوئی ایسا واضح نظریہ رکھتے تھے جو دہریہ جدید سے اردو میں جگہ پالنے لگا تھا۔ تنقید کے امرار تحریر و قلم جو فنِ نقد کے لئے ضروری عناصر ہیں وہ کسی قید و بند کے ساتھ غالب کے یہاں نہیں نظر آتے مگر فنِ شعروادب کے بارے میں جو خیالات انھوں نے جا بجا اپنے خطوط میں ظاہر کئے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شعور میں ایسے عناصر موجود تھے جو راجِ تنقید کے لئے ضروری ہیں۔ آج کی یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ اچھے شاعر اور ادیب کے پاس کوئی نظریہ ادبی یا تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے جو تخلیقی عمل میں اس کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن اس سے یہ بھی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ غالب جدید مفہوم میں نقاد تھے، یہ مزید ہے کہ وہ ایک ایسا تنقیدی شعور رکھتے تھے جو کچھ لحاظ سے قابلِ قدر تھا۔ ان کی نظرِ الفاظ کی اسہیت، زبان کی نشرو نما، شعری خصوصیات پر توجہ ہی اس کے علاوہ اہلکارِ ادب میں انفرادیت، اجتہاد، نفسِ ممنون پر غور و فکر خیالات کی بلندی دلچسپی پر تیسرہ، مرزا کے تنقیدی شعور کی نشان دہی میں کوٹا ہی نہیں کرتے۔ ان کے ان خیالات کو یہ کہہ نہیں لایا جاسکتا کہ شاعرانہ لعلی یا کسی استاد کی مٹائش کا نتیجہ ہیں۔ چون کہ عبارتیں مدلل ہیں اور موثق دلائل کے لحاظ سے

ضبطِ تحریر میں آئی ہیں اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب نے جو کچھ کہا وہ ان کی سوچی سمجھی رائے ہے۔ ساتھ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ فکر و فن کے بارے میں اپنے طور پر سوچا کرتے تھے۔ بڑے اور اچھے شاعر مقرر کے مقبول دیا اثر ہونے کے اسباب پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ کیوں یہ فن کار یا اس کی تخلیق داد و تحسین کی مستحق ہے، کیوں کوئی شاعر یا شاعر یا وجود عوام میں مقبول ہونے کے خواہ میں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد وہ اپنی رائے قائم کرتے تھے جس میں اصولی تنقید کی جھلک اور نقاد کی انفرادیت نمایاں ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی رائے زنی سے یہ بات مرزخ ہوتی ہے کہ خطائے بزرگانِ گزشتہ خطا است، کے وہ قائل نہ تھے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مستند شاعروں اور ادیبوں کی باتوں کو سندرہ مانتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی ادیب کی غلطی کو اس لئے جائز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عرب عام میں بڑا فن کار سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری خصوصیت جن کا غالب کے ذہن و مذاق سے براہِ راست واسطہ ہے، ہم کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ غالب کے پاس ایک ایسا ذہنی شعور تھا جو ان سے پہلے کسی شاعر یا ادیب کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ اگر قلمی توان میں سے کسی نے نثر میں نمایاں کرنے کی زحمت نہیں کی، ہم اس سے بے خبر نہیں کہ گوگل نے تہ لکھنؤ میں شعرا کی

اس بات کی ہے کہ شاعر، نیا سے فکر میں ایسے مفہوم کی تلاش کرے جو خیالات کی ذرت دگر سے شعر کو قابلِ توجہ بنا دے۔ اگر یہ خصوصیت نہیں ہے تو شاعری قافیہ پیمائی کی مترادف ہے۔ غالب کا یہ سوچنا اور اتنا ہی بنیادی بات کا اس طرح پیش کرنا یہی ہے کہچے پر مجبور کرنا ہے کہ عجب نہیں کہ مقدمہ مشرور شاعری میں مسمیٰ و ذیلی کی محض اس تعلیف یا اشارہ کہ بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ جب عالی یہ کہتے ہیں کہ سب سے مقدم اور فردی چیز جو کہ شاعر کو جڑ شاعر سے تیز رفتی ہے۔ قوت تمیز یا تخلیق ہے جس کو انگریزی میں فینٹیشن (Imagination) کہتے ہیں۔ یہ قوت شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی، اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی، اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ "لاہم کو غالب کا یہ عقولہ یاد آتا ہے کہ شاعری مسمیٰ و فہمی ہے قافیہ پیمائی نہیں کیوں کہ مسمیٰ و فہمی بہتر عقل کی ہندوڑانے کے ممکن نہیں اور غالب کا شعاع بھی یہی علوم و ہوتا ہے جس کو شاعری کی بنیاد سمجھ کر غالب نے عرصہ حرام فرمائی۔

خصوصیاتِ کلام پر تبصرہ کیا ہے مگر شرکی و جہانی یا اسی تحریک سے زیادہ اگے بات نہیں بڑھی، عموماً صفاتی جیسے کہ گوی کلام تک بات سمجھتی ہے۔ رائے دینے کے وقت ذائقہ تعلقات بھی تذکرہ فرمیں گے پیش نظر ہے کہ ان کا ذہن اسے لوث معلوم ہوتا ہے نہ پسندیدگی و نا پسندیدگی کا ادراغ و منفعت و جہت جاتی ہے، و جہانی کیفیت اصل میں کرسائنس نہیں آتی، کامیاب یا مغفیر خلق کے سلسلہ میں شامل کسی نے نہ ہی اس میں خصوصیات کا ذکر کیا ہو جس کے نتیجے میں یا نہ ہونے سے فن یا بشر بلندی یا پستی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ غالب نے جا بجا اپنے ایسے خیالات کو قبضہ تحریر میں لانے کی ابتداء کر کے دوسروں کے ذہن کو بڑی خوبصورتی سے بیدار کرنے کی فکر کی۔ یہ رو رہے کہ انھوں نے اس فن میں کہیں کو نہیں حاصل بہت نہیں کی مگر جس طرح بات کہی ہے وہ غالباً زیادہ وضاحت کی محتاج بھی نہیں۔

اس آہستہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ان شواہد کو کسی دقت کے بغیر نہیں دیکھا جو صرف قافیہ کے بل بوتے پر شاعر کی کیا کرتے ہیں، اسی کو قافیہ مضمون سوچنے پر بالی کرتا ہے جو کے پاس رشتہ داروں کی افرادیت سے دیکھ کر کسمپاسب رہ جاتا۔ غالب انہیں ہیں۔ قافیہ، روایت سے دل چاہا۔ مستعد کو کسی بات کو فٹے جاتا ہے اور بات شکر کے ساتھ ہے، اصل کو مصروف قافیہ پر آتا ہے۔ اس لیے یہاں جامع عبارت میں غالب نے کہہ دیا کہ ”شاعری مضمون آفرینی سے قافیہ بیانی نہیں“ یعنی ضرورت

کے طرز پر رفعت لکھتا تھا۔" بعد میں اس طرز نقل کو غالب نے اتنا
خیر و پیودہ بھی کر اچھے آپ کو بھی صاف نہ کیا۔ اوداق دیوان
چاک کر دئے اور اس دیوان کو دور کیا۔ جواب تک جی ہو گیا تھا
دوسرے الفاظ میں غالب یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ خیال
دفعی باتیں دیسی ہی ہے یا یہ ہیں میری بچوں کی سوچتے ہو جی نہیں
ملنا نہ بازی گری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جب تک
تیز نہ تھی بیدل و غیر کو لافنی بڑی وقعت معلوم ہوتی تھی جب
شور باغ ہوا تو محسوس ہوا کہ یہ اقدام شاعری کے لئے نہ صرف
غیر مفید ہے بلکہ ہلک ہے۔ اس فضا سے صرف ظاہر لافنی
کی پروازیں کی نہیں آتی بلکہ اس لاد م لگتے لگتے۔ اگر یہ رائے
ظاہرہ جائے تو شاعری و نظریہ ہی میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا
شاعر تلمیذ الرحمان ہونے کے باوجود کسی شہیدہ لگاؤ کو لاد م معلوم
ہوگا۔ کسی خیال کو اگر متعلق کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا تو وہ
بھی قابل اعتناء نہیں۔ اس کا اشارہ وہ ایک تقریر میں اس طرح
کرتے ہیں کہ رکنی کے فردغ کے لئے یہ ظاہر اس میں موصیت نہیں
معلوم ہوتی مگر فردغ کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ منفی میر عباس سے
ایک خط میں اپنی ترقی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" فارسی کے ساتھ ایک مناسبت انڈی و سرمدی لایا
ہوں، مطابق اہل پارسی کے متعلق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔"

غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز ہے اور اس نازش کی خاص
وجہ یہ ہے کہ ان کا متعلق شعور ان کا ابدی راہ ہے۔ اس
میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ خیالات ظلم بند کرنے میں
اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے کہ مثلہ یا گفتگو صرف جذبات یا
الفاظ کا ہمارا ہے اگر نغمہ کے جائیں گے تو اثر پذیر ہوگا
بات اسی وقت پڑا اثر دل نہیں ہو سکتی ہے جب اس کو دلیل
و حقیقت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ عقل و فہم کے لئے
اختلاف و اتفاق کے راستے کھلے ہوں اگر کسی مسئلہ پر منطقی انداز
سے گفتگو نہیں ہو سکتی تو راہ غور و فکر مسدود ہو جائے گی
اور مسئلہ جڑا ہم ہو جائے گا۔

غالب کا منطقی شعور صرف نظریاتی نہ تھا بلکہ عملی بھی
تھا۔ اس کا قوت کم کو اس وقت ملتا ہے جب وہ اچھے افسانہ کی تشریح
کرنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ مثال کے لئے ان کے سبھانے کا انداز
حسب ذیل شری و مضامین میں ملاحظہ ہو

" ایک شے ہے دلیل محسوس و غرض ہے
فلت کہہ میں میرے شہب نام کا بوش ہے "

کہتے ہیں " ایک شے ہے دلیل محسوس و غرض ہے " یہ جرح ہے۔ پہلا شعر
فلت کہہ میں میرے شہب نام کا بوش ہے، یہ مبتدا ہے، شہب نام
کا بوش بھی از حیرانی از حیرانہ لعلت غلیظ سخن ناپیدا گویا خلق
ہی نہیں ہوتی۔ ان دلیل مع کی رو پر ہے بھی ہوئی شے اس راجہ
کہ شے و چراغ کو جو جابجا کرتے ہیں۔ لعلت اس معنوں کا یہ ہے کہ
جس شے کو دلیل مع ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے۔ منہل اسباب ناپیدا
کے پس دیکھا چاہیے کہ جس قدر یہ علامت مع سبب فلت ہوئی وہ
فکر کشنا ناپیدا ہوگا۔

کسی ادب پر رائے ذی کرنے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے
کہ وہ اس مخصوص زبان کی نشو و نما سے، اس کے مزاج و ادوار
کے طاق سے پوری طرح واقف ہو۔ اگر ان اوصاف سے بے ہوش ہے
تو اس کی رائے ناقص ہی رہے گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفہ دان،
مورخ یا عالم ہو، وہ الفاظ کے معنی و مفہوم صرف نانات کی جینک
سے دیکھے گا۔ اشارہ کے رسم و رواج سے بے گنجائی خد کا رکی یا توں
کی ترجمان نہ پہنچنے دے گی۔ مثلاً اگر کوئی شخص آشیان کے معنی
صرف گھر نہ لانا پتا ہے بلکہ اس کے معنی صرف گلاب کا پھول سمجھتا ہے
یا غبار کو صرف گرد یا دھول خیال کرتا ہے تو وہ اردو شاعری کے عالمی
سے نا آشنا رہے گا۔ اب شخص اگر ہماری شاعری پر یوں روکتا ہے
تو محسوس ہے غصہ نہ آنے کی وجہ سے ضرور کہتا پڑے گا کہ

" سخن شناس ذی دہرا غما اینجا است، غالب کو اس کا پورا
احساس ہے، یہ حیثیت شاعر نہیں بلکہ صاحب شعور ہونے کے الفاظ
سے جب ہم ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ راز آشکار ہو جاتا
ہے۔ ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں :

”نیم گاہ، نیم گاہ، نیم ناز یہ روزمرہ اہل زبان ہے۔
نیم یہ معنی انوک و ردنگاہ کا ادھا اور نگاہ کی اددھوڑا اور
ناز ادھا ہلات ہیں ہے چیزوں کا مناصف کیا“
اگر نیم کے معنی صرف نصفت کے لئے جائیں جو عموماً لغات
میں ملتے ہیں تو ذاتی یہ فقرے ہلات کے سوا اور کیا سمجھے جا
سکتے ہیں۔ غالب نے جرأت سے کام لے کر کہہ دیا کہ یہ روزمرہ
اہل زبان ہے۔ ان کے کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ لغات
میں چاہے ”نیم“ کے معنی صرف ”نصف“ ہی لکھا ہو مگر اہل زبان
اسے ”انوک“ یعنی کچھ یا تھوڑے کے مفہوم میں بھی استعمال کرتے
ہیں اس لئے ایسے موقع پر ہم لغات کو پس پشت ڈال کر اہل زبان
کی طرف نظر کریں گے، جہاں جو مفہوم میں جمہور نے استعمال کیا
ہے وہ سب ہم کو ماننا چاہیئے خواہ کہ امر اور لغات خاموش ہی
کیوں نہ ہوں۔

اس بات کے متعلق کہ جہاں لغات و گرامر خاموش ہوں
وہاں اہل زبان دور کرنے کے لئے قویہ کار اہل زبان کی طرف رجوع
کرنا چاہیئے غالب نے ایک اور موقع پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا
ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض مقامات
پر اہل زبان لغات و گرامر سے زیادہ اہم و کارآمد ہوجاتے ہیں
دیچے میں تو یہ معمولی بات ہے مگر ذہن کی دور رس کا وہ
سراغ اس بات سے ملتا ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ سنت، قواعد
مربوط زبان کے لئے صرف آخر نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں
نے شعری و فنی شوری طور پر زبان و سماع کے مزاج و مذاق
سے متاثر ہو کر الفاظ و فقرات میں وہ معنی بہنائے جو محسوس
و خیالات کی پوری ترجمانی کر سکیں قطع نظر اس کے کہ وہ لغات
میں ہیں یا نہیں گرامر کی کوئی پیر پور سے اترتے ہیں یا نہیں
اس ضمن میں مرزا رحیم بیگ کو ایک خط میں لکھے ہیں،
”تو نے سنا نہیں جو عربی و فیعی میں گفتگو ہوئی“
لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کام تھا۔ مولانا جلال الدین
عربی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے خوش سینھا لا

اور نطق آشنا ہو گیا ہوں اپنے ٹھکر بڑھیوں سے لغات فارسی
اور یہی ترکیبیں سنتا رہا ہوں۔ فیعی بولا کہ جو کچھ تم نے ٹھکر
بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ بہتے خاقانی اور افندی سے اخذ کیا ہے
حضرت عرفی نے فرمایا، فقیر محامد خاقانی داوری کا اخذ ٹھکر
کی پیرزادوں کا ہے۔ بلکہ اہل تیز زبان سے بلاؤں جو ہمیں کہ یہ
حالی فلم روہنڈ کے صاحب کاموں کا ہے۔ اس خیال کی مزید
وضاحت ہم کو غالب کی ایک دوسری تقریر میں بھی ملتی ہے۔
معلوم ہوتا ہے ٹھکر لوگوں میں بعض الفاظ کے تذکرہ تائیت پر بحث
تھی اس مسئلہ کو قدر بلگرامی نے مرزا غالب کی خدمت میں پیش کر کے
فیصلہ کی درخواست کی۔ مرزا غالب نے جواب میں تقریر فرمایا کہ
”فیض کے نزدیک لغات، تعلیم، ادبی تذکرہ ہیں فارسی
میں تائیت و تذکرہ کہاں ہیں اس امر کے مالک اور اہل زبان
ہم ہیں یعنی ہم تم اور مجموعہ مترقا و مترقا کے مل جلنے و
ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے، زیادہ بھڑکاوے فائدہ۔“ اس
حیثیت سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اہل زبان لغات و قواعد
سے بالاتر ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب سمجھتے تھے کہ زبان کی
نشوونما کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں اس کا قطع جمہور سے
ہے ایک دو آدمی سے نہیں۔ مترقا و مترقا کی قید کا کر غالب
نے یہ بھی بتا دیا کہ کون لوگ اس کے اہل ہیں اور کس کی زبان سند
سمجھی جاسکتی ہے کس طبقہ کا فیصلہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔
”تجربہ کے لئے جرأت و شجاعت وہ ضروری خصوصیت ہے
جس کے بغیر انفرادیت و شخصیت کا نمایا ہونا دشوار ہے۔ یہ
عنصر جس حسن و شجاعت کے ساتھ آتا ہے اتنی ہی ناقدر و ممتاز
ہونے کی امید کر سکتا ہے۔ اسی جرأت کا تقاضا ہوتا ہے کہ
ادیب اپنی قوت تخیل کو کسی معیبت یا شخصیت سے مرعوب
نہ ہونے دے، نہ اس بات سے اپنی فکر جبرود ہونے دے
کہ فلاں شخص مسلم، لبرٹل استاد ہے۔ اس کی ہر بات رخص ہوگی
وہ شخص غلطی نہیں کر سکتا یا یہ سوچ کر دریدہ دہیں ہوجائے
کہ کوئی شاعر یا ادیب اس کے ہم مذاق یا ہم خیال نہیں

اس لئے اس کی عیب جوئی فرض ہوگئی ہے۔ یہ جرأتِ دلیل و منطق کے علاوہ علمیت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ خصوصیت کافی ہے۔ یہاں ہم ان کی اس جرأتِ دماغ کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو میراں نظم میں برطرف بخیر پڑی ہے اس لئے کہ اس پر تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قافی شاعرِ اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ شاعروں کے لئے یہ ایک رسمی و روایتی بات ہوگئی تھی مالا کر یہ صحیح نہیں مگر اس وقت اس پر بحث بھی مقصود نہیں۔ یہاں ہم صرف ان کی وہ باتیں یا رائیں پیش کرنا چاہتے ہیں جو نثر میں ملتی ہیں جی پر روایتی یا شعری خصوصیات کی پرچھائیاں ہونے کا شہرہ نہیں ہو سکتا۔ ان عبارتوں کی متانت و جمیدگی ذہن کو کسی بہانے کی طرف نہیں لے جاسکتی۔ بعض تاریخی واقعات بھی ہماری تائید کرتے ہیں۔ مثلاً اس واقعہ کو یاد کر لیجئے۔ جب غدر کے بعد برطانوی قافلے پر رائے نئی کر کے غالب نے ایک دنیا کو اپنے خدمت کر لیا تھا۔ مخالفی کا رطرت سے بلخار تھا مگر غالب پھر بھی اپنی رائے پر قائم رہے ان کو اس کا ڈر بالکل نہ ہوا کہ اس نعت نویس کے ہزار اُمتقن ہیں اور مقلدین کی ملی بنیاد اسی نعت پر قائم ہے۔ وہ ان الفاظ کے معنی وغیرہ پر رائے نئی دیکھتے چینی میں ہمیشہ بے باک رہے جو ان کے نزدیک غلط و گمراہ کن تھے۔ اس نعت کے مرتب کرنے والے کو غالب نے جی کھول کر کُڑا جھلا دیا۔ اس کی نغز و شوق کو نمایاں کر کے اسے رسوائے عام کر دیا۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو متاجر بیان نہیں مگر اس سلسلہ میں انھوں نے جس طرح بیناک ہو کر جو نعت نویس کی قلمی اتاری ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ ان ہی کی زبان سے سنئے،

یرم بیگ کو ایک خد میں لکھتے ہیں،

”یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اخذ کا فرہنگ نویسوں کے باب میں کیا عقیدہ ہے۔ اگرچہ قافلے برائیاں جا بجا لکھتا آیا ہوں مگر اب ہندی کی جینی کر کے لکھتے ہوں کہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ فرہنگ لکھنے والے

بچتے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں ہاں مسلم صرف و نحو عربی میں یہ قدر تفصیل مسلم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں۔ جس نے چاہے اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرت نے لکھی ہیں مطالبہ مدرجہ کی اصول پر منضبط ہے ہیں اور اس کا علم کسی استاد سے حاصل کیا ہے و قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضلِ محرم سے پڑھا ہے۔“

اس خط میں پوچھ گچھ کے برہم کرکٹوب الیہ کو غائب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک لطیفہ لکھتے ہوں اگر غفا نہ ہو جاؤ گے تو حد اٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ ہراڑ ہیں یہ سب کتابیں اور جامع ماہند چسپا ز ہیں۔ تو یہ تو اور لباس در لباس، دم در دم اور قیاس در قیاس، پیاز کے چھلکے جس قدر نکارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مزہ نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ لباس ہی لباس دیکھو گے، تضحی مہموم۔ فرہنگ کی ورق گردانی کرتے ہو، ورق ہی ورق نظر آئیں گے مٹی مہموم۔ خلاف پر مدارِ حقیقت نہیں ہے۔ آپ کے حاضر نہیں کرتا ہوں جو میرے دل نشیں ہے فرہنگ (فیوں) قیاس مٹی فارسی میں نہ سراسر غلط ہے، البتہ گمراہی اور بیشتر غلط ہے۔“

اس اقتباس میں جو بے باکی اور دلیل آپ نے مرزا سے دی وہ علاوہ مٹی بیان کے حقیقت پر مبنی ہے۔ جن لوگوں نے نعت کا مطالعہ و موازنہ کیا ہوگا، وہ مرزا غالب کی رائے سے متفق ہوں گے کہ واقعی فرہنگ ہراڑوں نے حقیقت میں بڑی کوتاہی

کی ہے قتل سے کم کام لیا ہے نفل سے زیادہ۔ اس قدر
میں جرات کے ساتھ ساتھ مسانت اور امایت رائے بھی
قابل احترام ہے اور ہمارے نزدیک تنقید نگاری کی
اولی شرط بھی ہے۔

”یہ دیکھا کر کہ اگلے جو لکے ہیں وہ حق ہے کیا
آگے آوی امتق نہیں ہوتے تھے۔“
پھر ایک خط میں شرگوپال تنفہ لکے کہتے ہیں: ”نقشہ شفقت اور
گوشہ شفقت ہم نہیں جانتے اگرچہ نقشہ شرگوپال آفتست اور
موسوا فرامدین کھودی نے لکھا ہو۔“ اس طرز بیان کا تیسرا نمونہ
دیا ہے کہ اگر غلطی کھودی سے بھی ہوئی ہو تو اتنا مزوری نہیں۔
زرگوں کی غلطی پر امتا و صدقا: کہنے کی ایک مثال یہ بھی قابل ذکر
- 4 -

ایک خط میں چودھری عبدالغفور کو غائب لکھتے ہیں کہ
 دارستندیالی کوئی نے خان آرزو کی حقیقت پر توجہ نہ اعراض
 دیا ہے اور ما عراض مجاہد ہے۔
 مرزا غائب کے تئیں دی شہور ایک، پہلو یہ بھی قابل قدر ہے
 کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں توفیق نہیں کرتے۔ اس کو ان کا بی
 ایمان و اداری آپ بھی نہیں پڑا ہے یہ خیال کریں ہر حال قابل قدر خصوصیت
 ہے۔ مثال کے لئے ایک موقع ملاحظہ ہو۔ مرزا بیگ ایک کو ایک
 لکھنے موشہ اوقات ہو کر تھے ہیں لکھتے ہیں:

”آئینہ و افس کے بیان میں مجھ سے وہ کہتا ہوا ہے
 کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں واہ خلی
 شرمناک ہے“

غلی کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں،

آفرین ہے عرض کرنا ہے کہ باد جو خورد و خورشید کے لیے میرے افغانہ
 نہیں ہو سکا کہ مرزا غالب ادبی لحاظ سے فصاحت کے لیا و
 دل دادہ تھے یا بلاغت کے گزردہ تھے۔ اس کا فیصلہ دراصل مسان
 بھی نہیں اس لئے کہ فصاحت و بلاغت کی حدیں ایسی ہی ہوتی ہیں
 کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا کوشش سے ناممکن الگ کرتا
 ہے۔ عورت نام میں جو مہتمم فصاحت و بلاغت کا سمجھا گیا ہے
 وہ ہمیشہ کے زیر بحث رہا اور چونکہ یہ ہے کہ ان کی پسیدگی کتابت
 و مناظرۃ کی وجہ سے اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ آسانی سے جا تہ
 مان ادبی تفصیص ہو بھی نہیں سکتی لیکن پھر میری دہیں میں جو ایک
 نقشہ ان دونوں صفات کا ہے اس کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو
 مرزا غالب کبھی فصاحت پر زور دیتے ہیں کبھی بلاغت پر یا ان میں
 میری رائے میں ان کی پسندیدگی کی میزان میں ان فصاحت کا پلہ گراں
 نظر آتا ہے۔ مرزا داد میں وہ انی شزار کے زیادہ قافی معلوم ہوتے
 ہیں جو زبان کے اعتبار سے صاف اور پر مٹی شریک ہیں۔ ایک
 خط میں سیدالدریں شفیق لکھتے ہیں،

”دود کی اسوی فرمودی کاشورہ سوری کے وقت میں ترک ہوا اور سوری کے طرز سے بسبب ہسبل متنتہ ہونے کے رواج نہ پایا۔ اس میں نہ نئے رنگ پیدا ہوئے گئے تو اب طرز میں تین ہٹیں متنازعہ آخر وغیرم کالام الی قیروں طرزوں میں سے کسی طرز پر ہے۔ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی

ہے..... کیا کہنا ہے خوب طرز ہے! اچھی طرز
 ہے مگر فارسی نہیں ہندی ہے! دارالغزب شامی کا
 سکر نہیں ہے کسلاں یا ہرے۔ داد، داد، اضافہ،
 اضافہ..... وہ چیز نہ تھی میں سب پارسیوں
 کے آئی ہے۔ ان اردو زبان میں لہجہ اہل ہند سے
 بھی وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمہ
 بدنام ہو گئے جیسے بھی دو اسحاق کو
 رکھے گا کون تم سے عزت پائی جان کو

ستودا

دھکلائے لے جا کے تجھے ممر کا بازار
 خواں نہیں لیکن کوئی واں جسٹ گراں کا

موتیں

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
 جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
 "آئس کے یہاں کم تر آتش کے یہاں بیش تر یہ تیز نشتر ہیں۔"
 ان باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فصاحت کلام کو بہت
 بلاغت کے زیادہ مرغوب رکھتے تھے مگر بعض مقامات ان کی تقریروں
 میں ایسے بھی نظر آتے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا غالب
 کو بلاغت زیادہ پسند تھی، مثال کے لئے ان خط کی عبارت
 "لاحظہ ہو جو انھوں نے ۱۳ جمادی ۹۰ کو مکتوبہ کو پال تفتیر
 کو لکھا تھا اپنے اس شہزادی تشریح کرتے ہیں
 مجھ تک کب ان کی یز میں آتا تھا وہ درجہ
 ساتی نے کچھ طالعہ دیا ہو سبب اب میں
 لکھتے ہیں،
 "یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں جڑتا ہوں"

یہ جملہ سارا مقدس ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے
 وہ جانے گا کہ کچھ کے چلے مقدر چھوڑ جائے ہوں
 ہر سخن دتے۔ ہر نکتہ مکلفہ دارد۔"

معنی وہ بیان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی ایسے پہلو
 کو محذوف یا مقدر کر دینا جو منہدم میں تازگی پیدا کر سکے
 بلاغت کا خاص جزو ہے۔ غالب کے یہاں اس حسن بیان
 کے نمونے بہت ہیں۔ ایسا نہیں کہ مقدر اتفاق ہو۔ ان کے
 دیوان میں ایسے اشارے ہیں جن میں یہ مضمت پائی جاتی ہے۔
 ان باتوں سے شک ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر وہ بلاغت کے
 دلدادہ تھے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آخر عمر میں مرزا صاحب
 نے ایسے اشعار پر زیادہ توجہ کی جو آسان اور سربز بیان کی
 دل کش کے اعلیٰ نمونے ہیں اور نثر میں بھی انھوں نے خط و قری
 کی بنیاد سہل الفاظ، مروجہ روزمرہ، رواں دواں عبارت
 پر قائم کی تو قیاس یقین کے قریب ہو جاتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ
 غالب کو بلاغت سے زیادہ فصاحت مرغوب تھی حالانکہ ان
 کی فارسی اور اردو شاعری میں اشارت کمیت اور مضمت طے
 کے موافق بات کہنے کو وہ اہمیت حاصل ہے جس نے انھیں
 دوسرے شعراء میں ممتاز کر دیا ہے۔

بہر حال غالب کے تنقیدی شعور کی جو جھلکیاں ان کے
 خطوط میں نظر آتی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں
 ہو سکتا کہ وہ نہ صرف زبان اور لغت کی محنت، محاورے
 اور روزمرے کے مناسب استعمال سے واقف تھے بلکہ
 فن کی پیسیدگیوں پر بھی غور کرتے تھے۔ مواد و ہیئت میں
 مبالغہ کی جستجو کرتے تھے، خامیوں اور خوبیوں پر مدلل رائے
 رکھتے اور اصل ہر نقد میں کرتا ہے۔

شاہ کار

فنون طرازی محبوبِ خوش ادا کی قسم

بیز اس کے یہ افسانہ گلو کیا ہے
حدیثِ رقص و بیانِ شے و سبو کیا ہے
یہ لذتِ خلشِ تیغِ آرزو کیا ہے
جو وہ نہیں تو یہ تعبیرِ مدعا کیسی
ہمارے آئینہ فکر میں جلا کیسی
زہے نصیب وہ قاتل بھی جاں نواز بھی ہے
فرد بخِ بزم و چراغِ حیرم راز بھی ہے
دیارِ شوق کا محمود بھی ایاز بھی ہے
حلاوتِ نئے سحر فن بھی رکھتا ہے
لئے متابع سکون وہ چلن بھی رکھتا ہے
اسی کے لب کو لبِ گلِ فروش بکتے ہیں
اسی کے حسن کو محشرِ بدوش بکتے ہیں
اسی کو ہر زن تمکین و ہوش بکتے ہیں
وہ برقِ شعلہ فشاں ہے وہ موجِ شبنم ہے
جمال و جبر کا اک دل نواز سنگم ہے

کمالِ جنِ غزالاں بھی ہم نے دیکھا ہے
فرغِ سرو چہراں بھی ہم نے دیکھا ہے
جمالِ ماہِ درخشاں بھی ہم نے دیکھا ہے
مگر یہ بشرط ہے اُس ماہِ و ش کی آپ کہاں
کہ خالِ عارضِ گلرنگ کا جواب کہاں
اسے نشِ طعنه نہ بہت چہن بکیئے
بہار بکیئے، شبنم ماہ کی پھین بکیئے
گلوں کی آن، ستاروں کا بانگین بکیئے
وہی ہے نقشِ سویدائے خاطرِ عالم
وہی ہر ہے وہی ہر کشتاں وہی شبنم
بلکتے۔ جمود سے سرشار آبشاروں میں
سرو وئے ہیں، ہوا کے لطیف دھاڑوں میں
نگارِ وقت کے وجد آفریں اشاروں میں
سنی ہے گوشِ سخنور نے گفتگو اس کی
افتخار کے ہے بیٹے میں آرزو اس کی

لجھمی کا عجائب گھر

اور کھا دوسے کا ایک نسل کا۔ ایک کونے میں مٹی کے دو ٹکے اور تین چمڑے ان میں کچھ ناچ، آنا اور دوا میں رکھی ہوئی۔ دروازے کی ایک اینٹ میں رسوئی کا سامان، مٹی کا ایک چوٹھا، لوہے کا ایک گڑا، ایک بڑا چمڑے پتھر، پتھر کے دو ٹکے، لکڑی کی ایک ہڈی، ایک تھوڑا سا ایک فٹائی اور ایک چمڑا۔ دوسری اینٹ میں ایک چمڑا، ایک ڈلیا میں کچھ کستا ہوا سوت اور تھوڑی سی دھنکی روٹی۔

کوٹھڑی کا چھتر دروازے کے رخ پر دو گرام کے کھلا ہوا تھا۔ یہیں گویا برآمدہ تھا۔ لکھی نے اس حصے کو اس پاس کی مٹی سیٹ کر کوٹھڑی کی دیوار میں سے ایک چوڑائی لگایا تھا۔ اس چوڑے پر دن میں وہ خود بیٹھ کر چمڑا پلاتی یا پٹائی بچھا کر لکھی پر مٹی۔ رات میں وہ اس کے پائو تھوڑا روں کا لیسیریا جاتا۔ یہیں اس کی بکری مٹی بیٹھ کر کھاتی کرتی، اونگھتی اور کان بھٹ بھٹا کر اپنے منہ کے قریب بھٹکے والی کھیتوں کو بھٹکتی۔ یہیں لکھی کا بزم وحشی بنتا، چرا، بیٹھا، اوجھتا کرتا، یہیں اس کی عمر بزرگی کی تھی، خیلا، مٹھیں بند کئے، خرخر کرتی اور یہیں برسات میں اس کا مرغ، بلکے خان، اپنے سارے عملوں کے ساتھ بیٹھ کر گرام کرتا رہتا۔ اس زندہ عجائب گھر کا ایک اور کونہ، بالک رام، کوٹھڑی کی چھت میں بانس اور چھس کے درمیان بیٹھا لکھی کی تھوڑی کچھائی کرتا۔ اس کے ارد گرد بانس کے بیچھے چھتروں میں لکھی لکھی کی چھوٹی بڑی رکھی رہتی۔ ان

لجھی بوڑھیا کا گون والے عام گھر پر لکھی کہتے تھے۔ کوئی چمڑا نہ تھا کہ اس کی عمر کیا ہے۔ بوڑھے چھوس بھی یہی کہتے کہ تم نے اسے سراسے ایسا ہی دیکھا۔ یہی سفید لکھے ہوئے بال بھی پیشانی پر موٹی تھیں۔ یہی چھریاں پڑا پڑا منہ اور یہی سوکھی مٹی تھوڑی۔ بس اپنی یاد میں آتا فری کیا ہے کہ بچپن میں پٹ سے بلی ڈراوا بچے بائیں اوڑھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ چھوٹے ہو کر دوڑوں طرف سے صرٹ گئے ہیں۔ مگر چلی آکر یہی ہے یہ بوڑھیا اور اس کی چھوس کی جو چھوٹی پرکھوں کے سے۔

جو پڑی گاؤں کے ایک کونے پر مٹی، پٹیت پر ایک ٹیلا، سائے شدت نما ایک کھیت، ان کی اعلیٰ بل جھیل، جو پڑی کیا مٹی کی، فوٹا لگی ہوئی دیواروں پر چھوس کے چھترے مٹی ہوئی ایک کوٹھڑی مٹی، اندر جانے کے بس ایک پانچ فٹ اونچا، گڑ، چوڑا دروازہ، نہ کوئی کھڑکی نہ سکھا، داخل ہوتے ہی ہوا کا بھی دم گھٹنے لگتا یہی، کالی کوٹھڑی، لکھی، اکا گودام بھی مٹی، رسوئی، ٹھسہ بھی اور گام کا کرہ بھی۔ یہیں اس کی وہ بھری مٹی جس کے پر ہونے کی وجہ سے وہ لکھی کہلاتی تھی۔

اس کوٹھڑی کا سامان دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک جھیل، لکھی پر ایک ٹیلا بیٹھا گڑا۔ اس کی پانچ ایک ٹوٹا ٹھسہ دروازوں کے گرد لکھے کا بنا ہوا گل۔ ایک لکھی پر ایک پیر علی ساڑی

سے لکھی گئی تھی کہ کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ وہ لکھی کہ سوکھی انگلیوں کی خوشبو سے اس کا سہا تھا۔ یہی تو اس کے لئے مٹی کا دودھ ایک چینی میں پروردگار شام اپنے بلکے کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔ اس احباب نے زہر کو امرت میں بدل دیا تھا۔ ناگ "بالک" بن گیا تھا اور لکھی ماتہ لکھی کی آسنی کے کئی درپے تھے۔ وہ کئی کھیتوں کی مالک تھی جو اس نے بٹائی پراٹھا رکھے تھے۔ ان میں گھوں، چنا، جو، مڑا اور اہر کی کاشت ہوتی تھی۔ فصل کٹنے پر لکھی کا حشر ایسا ہوا۔ واری سے چھانے بنا کر ہر کاشت کار اس کے گھر پہنچا جاتا تھا یہ ایسا ہوا۔ واری کسی خاتون سی یا گم کا شیعہ نہ تھی بلکہ پورے گاؤں پر لکھی کا ڈر چھایا ہوا تھا۔ ان کو لکھن تھا کہ وہ بدو گرنی ہے اور وہ دیل میں پیش کرتے۔ اس کے زور و عجب گھر کو۔

وہ کہتے کہ وہ نہیں جانتا کہ ہم ہری چر کو دیکھ کر بولی کے منہ میں پانی بھرا آتا ہے۔ وہ چر کہیت آتے چرے کی مگر بوٹیا کی مٹی نہ تو اور دگر کے پہلے تھیں کی طرف دیکھتی ہے اندر خود لکھی نے جو وید پر کے سامنے ترکاریاں نکال رکھی ہیں اس کی ایک پتی تو لگتی ہے۔ وہ تو کھیتوں میں گھس کر لکھی کا کام کرتی ہے یہی ہے وہی لکھی اس لکھی ہے جو پودوں کو بڑھنے اور پھیلنے سے روکتی ہے۔ بڑی کیا ہے کوئی ملائے مسجدی ہے کہ ہر قدم پر جاؤ نا جائز محلوں حرم و حلیق چلتی ہے۔ کتے کا رات بچھیرا اور بڑی ہے۔ مگر لکھی کا بچرا "س" شام روٹی والی پرتاقت کرتا ہے اور سوائے مخصوص دن کے کسی نے

اسے گاؤں میں اندر سے اچالے کسی کتے سے رومان لڑا ہے کتے نہیں دیکھا۔ لکھی کا بڑا مدھی اس کے لئے دو محبوب ہے۔ وہ شہرستان پر مہر رکھے دیں چارہ جتنا ہے۔ قے کے بارے میں طرز طریقی افواجی مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے ملا ہے۔ اتنی خوشوار سے کہ کتہ کہ اس سے بڑا ہے۔ کوئی کہتا اس پر کسی جی یا پریت کا سایہ ہے لکھی کا کایر و دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں یہ حالت ہے کہ کتے ہیں زہر دم سے جی نہ کر دیت جاتا ہے تو ہی خیر خرقہ رقی آتیں اور اس کے پیسے سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ اپنی پتی زبان نکال کر اپنا منہ اور بچے چاٹ کر صاف کرتیں اور بچوں کو بھلا کر اوپر سے

کھٹکتی ہوئی جلیٹیں اور دودھ پلانے والی مٹی کی گود میں جا کر بیٹھ رہتی ہیں۔

بانگے خان اور ان کی بیویوں کی عادت تھی کہ وہ برسات کے علاوہ سامنے والے نیم پر رات کو سہرا کرتے اور دن میں سائیں کے کھیتوں میں چلتے رہتے۔ جب کسی مرغی کے دروٹے تھے تو وہ کڑا کڑا کر اگلے ٹھکانا بقی کو کھینچوں سے دیکھتے بوڑھی کی طرح میں چلی جاتی اور وہیں اپنا قبضہ رکھ کر ہر چلی آتی۔ واپس میں برسات کو وہ دیے پاؤں پار کرتی۔ ان چوتھے کے کنارے بیٹھے ہی وہ خوشخبری کا غلغلہ سننے لگتی ہوئی اپنی ہونٹوں کے پاس بیٹھ جاتی۔ زور چڑھانے کے علاوہ مرغیوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر وہ بغیر اطلاع رات میں جانی کی کوشش کرتی تو خسیلا بھٹ کر سامنے آ جاتی اور مرغی چینی، چٹائی، پھر پڑاؤ، بھاگتی۔ جب کبھی ایسا حادثہ پیش آتا یا بنگے خان دوسرے محلوں کو چھوڑ کر بے تحاشہ دوڑتے اور بھٹ پھٹا کر اور گردن پھٹا کر پانی کا مٹا بل کرتے کتے لئے جھگ جاتے۔ دونوں ایک دوسرے پر دادر کرتے کتے پتیر سے بدلتی ہوتے کہ چرا بھرتہ کہ بچ میں آ جاتا اور بوڑھی چوٹ کر ڈانٹتی، مکیا شہر بھارت پت پامو! چلو اپنی جگہ! اس کی آواز سن کر خیرا ہی خوشی سے اچک کر ہر لمبے میں جھپٹتا اور بنگے خان کٹ کٹ کر سارے محلوں کو پاس بلا لیتے اور جلی کو نہری کے گھروں سے دیکھتے۔ گردن لڑی سے کتے بچوں کے بل پتے کھیتوں کی طرف بھاگتے

میں جلیں کے ہاتھ ڈالنے کے تھا کہ صاحب روزانہ منگا دیا کرتے اور یہ لکھی کی مستقل آمدنی کا ذریعہ تھی۔ زایدے کی فروخت اور اڈوں کے پیسوں کے علاوہ لکھی کو دی جینڈا سے بھی کچھ آمدنی تھی۔ اس کے کارندے لکھی کو روٹی دے جاتے اور وہی اس کا کانا ہوا سوت ہر شے آ کر لے جاتا کرتے۔ ان دنوں سے اسے جو کچھ ملتا وہ اسے پتیروں میں پیٹ کر بائیں کے کتے والی توری میں رکھ دیتی جہاں بالک رام کا پیر تھا اٹھ کر وہ سوت کی دست میں لکھی نہ تھی۔ گاؤں کے کتے لکھی کے پیسے میں بدھ تو کی حالت میں اگر لکھی کی

دوسے کے مشق پر کیا ہیں بھتیجی، سال میں دو بار سو مزدور بناتی تھیں
 آئی ہے، کیا کرے گی یہ سب روپیہ نہ کوئی آگے نہ پیچھے، پڑھیں
 منہ پر ہے جی بھانے ”لوکسی اندھیری رات میں۔ کشتی ایک ایک
 ہاتھ میں غم لئے جا سکتے ہیں۔ بوڑھیا کا کھانچوٹ دینا کون
 بڑی بات ہے۔ پھر اس نے بوڑھی کا چھپا رکھا ہے، وہ سب یادوں
 ہی کا ہے۔“ دو ایک سالوں نے جو بڑی کے قریب تک پہنچے
 کی جستہ بھی کی گزروں پہنچتے پہنچتے نشر میں ہو جاتا۔ ایک نامعلوم
 سا دروں پر چا جاتا اور ایک دوسرے کو مڑا کھینچ لیتے آتے۔
 گھر جو بڑی کے ہمسایہ میں دو جا رہی تھی۔ ان کا لالچ
 ان کے در پر قابو آ گیا۔ ان میں سے ایک تو بولا تھا جو بڑی کی
 پشت والے ٹیلے پر رہتا تھا۔ ہاتھ نال اور ان کے حصرم کو ہمیشہ
 پٹائی بندوں سے دیکھتے۔ اس کو ان کے انڈوں کی بڑی ہمت تھی۔ وہ
 بھی فخر تان کر لیا ہے۔ ایک دن یہ بولا انڈوں کی ڈھ لگا کر اس کو
 ملک پیٹتی تھی۔ اس وقت لکھی پتی چٹائی پر بیٹھی سو رہی تھی اور جرات
 خیل بھی اڈھٹے گتے رہنے سے موت کو غنیمت جانتا اور جھٹ
 کوٹھڑی میں جا گھسا۔ وہاں سامنے ہی بھکت کے نیچے ایک ڈبیا
 میں چار انڈے دکھائی دے۔ گو پورا دل ادا تھا ہوتا ہے کریوں نے
 لے لٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اس نے بھیٹ کر ایک انڈے پر نہ مار دیا۔
 اسے جڑ تھی کو کوئی اور پر اس کا بھلا بھلا ہاتھ ہے۔ گھور رہا ہے۔ نیوے
 نے اڑا دانت سے کھڑا رہا۔ پیڑی پائی ہی تھی، باگہ دام نے پٹ
 سے اپنے کو بھٹک پر کر کر کے زور سے پھیلاری ماری، تسکون سے آتی ہوئی
 پرانی دشمنی لالچ پر فتنہ پائی۔ نیوے نے اڑا منتر سے گروا اور پینے سے
 بدل کر وہ ساہیہ پر چڑھ کر نہ لگا۔ اس دو بدل میں جو کھٹ پٹ ہوئی
 تو جرات کھنکھن کر غرایا۔ کھٹی بڑی رائی ”پاچا! پڑا سو رات، دیکھتے
 نہیں کو ٹھڑی یہ کیا ہو رہا ہے! قبل اس کے کہ جرات اٹھ دیتی ہے کہ
 کوٹھڑی کی طرف بڑے، اچھلائے چلا گیا ماری اور اندر پہنچ گئی۔
 نیوے نے جیسے ہی اس نے مخالفت کی صورت دیکھی وہ کوٹھڑی سے
 نکل کر بھاگا۔ بوڑھیا نے جرات کو لگا کر ”پڑو لا! پس اب کیا تھا
 نیوے اور کتے کی دوڑ ہوئے گی۔ بولا چھلایاں دیتے ہیں بہت

بوڑھا تھا۔ ایکلا جرات ہوتا تو وہ غائباً اسے نہ پڑھ سکتا مگر خیال ہے
 اس دوڑ میں حصہ لیا اور وہ اڑنے لگھوٹے جسم کو کھینچنے، اٹھنا
 کو کھینچنے میں نیوے سے بھی دو قدم آگے تھی۔ بولا اس کے پیچھے
 کی پٹ سے اپنے کے ہاتھ کے سلسلے میں ایک کانٹے وار پودے
 سے لکڑیا اور تولا زبانیں لگا لگا۔ جرات ایک کرگدن میں بیٹھی
 اور اسے لاکر بوڑھیا کے ساتھ ڈال دیا اور اس طرح دم مٹانے
 لگا جیسے جرم کو پڑھنے میں اس نے اہتائی کا خیال حاصل کی ہے۔
 مگر خیال اپنے ہتھ کو اس کی سے نڈھانڈا کر دے جانے پر تیار تھی
 اس نے مالک کی سوکھی نڈھیروں میں اپنی پیٹھ رگڑ کر اس ہم میں اپنے
 شتہ کی طرف متوجہ کر لی۔ کھٹی نے اپنی ٹیڑھی مری آنکھوں سے اسے سکر
 کر دیکھا اور سر طاقی ہوئی نیوے پر جھک پڑی۔

وہ قدر قریب رہتا تھا۔ اس کی باجھوں میں انڈے کی جگر
 تھوہ جرات گھسے ہیں اس کے تیز دانتوں نے اس کی زبان کو جروح
 کر دیا تھا۔ وہ اپنی چوٹی چوٹی ٹانگیں دھشت سے بلر پڑ گھس
 رہا تھا۔ گویا مورچ کی تلاش میں تھا کہ ان سپاہیوں کی ذرا کھانچے آد
 وہ ایک کرکٹ بجائے کھٹی نے اس کی گردن پر دھکرتے بلے کھلے دھکے
 دے گئے۔ ”تم نے چوری کی، ڈاکا ڈالا! پوٹھ گئے تم! اب کھو جرات
 کو کھم دے دوں نہیں تنکے کوئی کر ڈاے“ یہ سہرے پاؤروں کے ساتھ
 بھاٹی بھاٹی بن کر دھتا تھا اور یہ زبردستی ”جرات آیا، خیال نہ لے“
 کر کے زمین پر چنب مارا۔ کھٹی نے اپنے ہونے نیوے کو پھر ایک
 ڈاکہ پڑا۔ ”اچھا جاؤ، اب کے چوڑے وقی ہوں، پھر کبھی کوٹھڑی
 میں نہ گھسنا۔“ اور اس نے نیوے کو چھوڑ دیا۔ جرات نے ہتھ سے
 جڑ کا خیال سے پھر زمین پر چنب مارا اور نیوے اٹھ کر بے کھاشا
 اپنے ٹیلے کی طرف بھاگ گیا۔

دوسرا علاقہ اور ایک گیدڑ تھا۔ یہ جو بڑی کی دامنی جانب
 جو جنگل تھا حصہ تھا اس میں اکثر اونٹوں کا ”ایمان، دانی“ کی پکار
 پر اپنے ہم جنسوں کو اکثر دعوت شرفاعی دیا کرتا تھا۔ ایک رات
 جب زدور کی بادش ہو رہی تھی اور اس کا دیوان خانہ بھی گڑبھاگی
 صورت اختیار کر رہا تھا تو وہ بہت کر کے جو بڑی کے برآمدے

اس زور کی ٹھونکنی کو وہ دروازے سے اچھل کر برآمدے کے باہر
 کھڑا ہوا جاکر گرا اور کچھ سے لت پت کا پیتا کا پیتا بے تماشہ بھاگا۔
 ہانک پیپاری مارتا ہوا ہانک پر سرسرا ہوا چڑھا اور کھی
 کے جسم کے کھلے ہوئے حسوں پر بردہا۔ جڑا خوشی سے جھوٹکا اور کھی
 کا منہ چائے لگا۔ خیال سے خرخر کر کے اس کے بھری داد گاؤں پر
 پیڑ اور دم گرڑی۔ ان کے بال کھی کے تختوں میں گھسے اور
 وہ چھینکی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ ہانک نے پر پھٹ پھٹا کر غور فرغ
 بلند کیا اور سنے سے بھی خوشی میں ہیں میں کر کے ساز دلایا۔ کھی
 نے ڈانسا۔ ”کیا ستر مہر رکھا ہے یا جو۔! چلو اپنی
 اپنی جگہ۔“

ہانک سرکا، خیلا دی۔ جردم دبا کر کھسا۔ مٹی کان چھٹ
 کر گھسے میں بیٹھ گئی۔ ہانکے خان ایک پر ٹپا کر ایک مرنے کے گرد
 تاجا۔ کھی نے اپنے تاج ٹھپر پیاری نظر ڈالی اور اہمستان کی
 سانس لے کر انہیں بند کر دیں۔

نہک پہنچا۔ کوٹھڑی کے پڑے دروازے سے روشنی پھٹے دیکھ کر
 اور اس کے پاس ہی سے مرنوں کی بو پا کر اس نے وجہ پاؤں اندر
 داخل ہونے کی جسارت کی۔ وہاں جو نظر ڈالی تو کھی سوتی دکھائی
 دی۔ کتا اور بکری دکھائی نہ دئے۔ البتہ سامنے ہی کھی مرنے کی نظر
 آئیں۔ کھی دن کا بھوکا تھا۔ منہ سے زالی ٹپک پڑی۔ وہ بے ساختہ
 ایک مرنے پر چھپٹ پڑا۔ مرنے کی دم ہی منہ میں آئی اور وہ پیچ کر پڑ پڑ
 ہانکے خان نے اڑ کر پورے زور سے لات ماری۔ داہنی ”کھاٹک“
 آنکھ کے ایک کونے میں لگی۔ وکھلا کر پٹا۔ دلچسپی جراتے ہانک
 کے پیچے سے نکل کر ہانک پر حملہ کیا۔ گیدڑ اٹھ اٹھ اٹھی اٹھی مٹی وہ
 اس کے پیچے پر گرا۔ بوڑھا آہ کر کے گری۔ اس کا سر باز سے ٹکرایا
 اور وہ نیم بے ہوش ہو کر بے سدھ ہو گئی۔ ادھر خیلا اور ہانک نے
 ایک ساتھ گیدڑ پر حملہ کیا۔ خیلا کے پیچے سے جڑے کے پاس سے
 ایک بوٹی پڑی۔ وہ ہانک سے نیچے کو دھککا جا۔ دروازے سے
 قریب پہنچا ہی تھا کہ ہانکے خان نے پھر اڑ کر لات ماری۔ ادھر مٹی نے

فن تعمیر نمبر

’آج کل‘ کا ماہ اگست ۱۹۶۲ء کا شمار ’فن تعمیر‘ نمبر ہوگا

دیدہ زیب سرورق اور خوبصورت رنگیں وسادہ نقادیر سے مزین یہ خصوصی شمارہ ۸۸ صفحات پر مشتمل ہوگا
 ہندوستانی فن تعمیر کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات سے متعلق دلی چپ اور پُر مملو متناسب
 شایعہ اشاعت ہوں گے۔

قیمت صرف ایک روپیہ۔ یہ شمارہ خریداروں کو سالانہ چندہ سے ہی ملے گا
 آج ہی خریدار بن جائیے تاکہ آپ بھی یہ شمارہ سالانہ چندہ میں ہی حاصل کر سکیں

’آج کل‘ کا سالانہ چندہ صرف سات روپے ہے

ایڈٹ حضرات زائد کامیوں کے لئے اجمعی سے آرڈر بھیج دیں

بزنس مینیجر، پبلیکیشنز، ڈویژن اوڈیسس، ٹریڈ ڈیپارٹمنٹ

زعفران زاد کشمیر

تَعْنِیْفُ اُیْمُنِ الْبَرِّ، میں لکھتا ہے: "زعفران کے پھولوں کا منظر ایسا دلکش ہوتا ہے کہ ایک ایسے شخص سے بھی جو شکل ہی سے کسی بات سے خوش ہوتا ہے، دلچسپی لے لیں نہیں دیتا۔" خلاصہ یہ کہ قدیم زمانہ سے لے کر اب تک پیپور کے زعفران کے پھولوں کا حسین منظر نزدیک اور دور کے لوگوں کو کھینچ ہی لاتا ہے۔

زعفران کا پھول گلارستہ کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اس بات کا یقین ثبوت کہ زعفران ہمیشہ سے شانہ بھول سمجھا جاتا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں اب تک اس کی وہی قدرو منزلت ہے جس کا وہ مستحق ہے، یہ ہے کہ وہ لہانہ دراز سے ہندوؤں اور تانویں روپیوں اور دوسرے لوگوں کے دیوتاؤں کی پوجا کے حوزہ سوان کا ایک جز سمجھا جاتا ہے۔

قدیم اکرمینڈ میں بادشاہ کی دروازہ زعفران سے رنگی ہوتی تھی یہاں تک کہ ستر حویں ہمدی تک ہیرا ٹوڑ کے اعلیٰ عہدہ دار زعفرانی رنگ کی قمیص پہنتے تھے۔ لفظ کجوس سے دکن کی عورتیں پیشانی پر ٹیکا لگاتی ہیں کہ کم سے مشتاق ہے۔ ہندو زعفران کو قابلِ نیک کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کی کوئی تعریف نہیں ہوتی جسے موقع پر راستہ میں زعفران کا پانی نہ چھڑکا جاتا ہو یا مٹوں پر زعفرانی تلک نہ لگایا جاتا ہو۔ ہاتھ کا گدھے سے بھی ڈانڈی پانچ شروع کرتے وقت اسے پتھر پر کم لپی کا ٹیکا لگایا تھا۔ قدیم زمانہ سے ہی کشمیر زعفران کا تہنا اجارہ دار قرار پانگیا ہے۔ اسی وجہ سے

اکثر برادرِ ہر کے ہینے میں جب زعفران کے کیٹوں میں پھول کٹتے ہوئے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور پودوں میں سرخ اور نارنگی رنگ کے زیرے والی کیوں کی پٹی چوڑی یا وہی خوش رنگ خوش نما کابیس کی طرح پڑی ہوتی ہیں تو پیپور در قدیم پر مالچ کا وسیع اور ہموار میدان ایک ناقابلِ فراموش منظر پیش کرتا ہے۔ جس کا اثر عرصہ تک دل پر قائم رہتا ہے۔ اور جب کارنگ کے ہینے میں اہلِ کشمیر بہار گری اور خزاں کے ان متاثر کو رحمت کرنے کے لئے جس کا لطف اس زمینِ خردوس میں اٹھانے کے ہیں بڑا دل کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں تو چاند کی بھری ہوئی روشنی میں اس کا یہ اثر دو چند ہو جاتا ہے۔ پھولوں کی کیاں اتنی نازک ہوتی ہیں کہ کھلنے لگنے رنگ بن ایک خاموشی کی دھمکیاں کر دیتی ہے۔ اچھے ہی موقع کے لئے کسی ایرانی شاعر نے کہا ہے ع

زعفرانی دیدہ باید داہ ہندوستان گرفت

یعنی زعفران کے پھولوں کا لطف اٹھانے کے لئے ہندوستان کے لئے دوا ہو جانا چاہیے کیونکہ جاڑے کا زمانہ قریب آگیا ہے جو ایرانی سیاح کے مزاج کے ناموافق ہو گا۔

کالی داس نے اپنے متعدد قرائی شاہ کاروں میں زعفران کے کیٹوں کے حسن کو سراہا ہے۔ مشہور ہے کہ اسکندر اعظم کے یونانی سپاہی جب اس میدان سے گزر رہے تھے تو ان اودے رنگ کے نعیرس اور خوش نما پھولوں کو دیکھ کر رنگ رہ گئے تھے۔ ابو الفضل اپنی

بڑے تالاب کے کنارے ہوتی ہے۔ آئین اکبری میں مذکور ہے کہ زعفران کی کاشت کی ابتداء کے زمانہ میں ابوالفضل اس تالاب کو دیکھنے گیا تھا مدت دراز سے مختیار اور زعفران کا ایسا چولی دامن لاسا تھا ہے کہ پردیسر لمبی دھڑلاتے اپنے اس دھوسے ثمرت میں کوکبیداس کا مولد (جمہوم) مختیری تھا اس امر کو پیش کیا ہے۔ کالی داس نے اپنی تشانیف میں زعفران کی کاشت اور اس کے فوائد کا اس تفصیل سے ذکر کیا ہے جو کسی مختیر کے باشندے ہی کے۔ بس کی بات ہے۔

زعفران کی کاشت بذات خود ایک فن ہے۔ بونے کی غرض سے اس کی گھٹی یا ٹی پی جی کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی طرح زمین کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے تیس سال کے بعد نکال کر چوکور کیا ریوں میں لگائی جاتی ہے۔ ان کیا ریوں کے لئے ضروری ہے کہ سال تک ان میں نہ کھاد ڈالی جائے اور نہ پانی جائیں۔

کیاری میں گاڑ دینے کے بعد نیز کاشتکار کی دیکھ بھال کے پوٹھی م سال تک کام دیتی رہتی ہے۔ پراگ گھٹی جاتی ہے اور نئی اس کی جگہ پر پیدا ہوتی ہوتی ہے۔ پوٹیوں کے ٹکسے کا زمانہ جولائی اور اگست ہے۔ اس کے بعد کاشت کار کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ کیاری کو کبھی کبھی گڑا اور تھالے کے گرد نالی بنا کر اسے نیچا لے۔

پھول ۱۵۔ اکتوبر تک کھلنا شروع ہوتا ہے اور اداوے رنگ کی کلیاں اور زعفران کی بیجیں یحییٰ پو پور کے خشک اداس میدان کو ایک نادر پھولاڑی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھولوں کے جن ہو جانے کے بعد ان میں سے زعفران عطلفہ کرنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ پھولوں کو دھوپ میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس کے اندر سے تین تین لمبے ریشہ نکال لئے جاتے ہیں۔ ریشہ کا سرا نارنجی رنگ کا ہوتا ہے جسے اول درجے کا کاشی زعفران کہا جاتا ہے۔ لمبے ریشہ کا چھلا سفید حقہ بھی زعفران ہی ہوتا ہے مگر سڑنے زعفران کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ کا۔ نعلک اور جع ہوجانے کے بعد ”موتھا“ کہلاتا ہے۔ جب موتھا خشک پھولوں سے عطلفہ کر لیا جاتا ہے تو ان کو آہستہ آہستہ لکڑی سے پیٹ پیٹ کر چٹک

اے مختیر بھی کہتے ہیں۔ قدیم یونانیوں کے ہمسدیں زعفران کو شاہی رنگ کا درجہ دیا گیا تھا۔ بلجی، کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شیونش بائبل کے طور پر زعفران کا استعمال مختیر کے افراد کے لئے مخصوص تھا۔ یونان کے ایواؤں، دیادیوں اور تعمیروں میں اور رومی قماموں میں زعفران کا خوشبو پانی چھڑکا جاتا تھا۔ مشور ہے کہ تیرہ کے۔ ہنزیں داخلہ کے موقع پر سڑکوں پر زعفران کا پانی چھڑکا جاتا تھا۔ زعفران یونانی علاج کے علاوہ مختیر میں اب تک دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ کثیر ایرانی اور ہسپانوی ابھی اس کے زرد رنگ سے ترہ بکاتے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں تین عرب کے مافوق ہسپانیہ میں زعفران کی کاشت کی بنیاد پڑی تھی۔ یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ شکاریوں صدی تک انگلستان میں بھی لندن سے مہم میل کے حامل پر ایک دین میدان میں زعفران کی کاشت ہوتی تھی۔ چنانچہ والدین کا قصہ جہاں خاص طور پر زعفران کا کاروبار ہوتا تھا اب تک زعفران والدین کے نام سے مشہور ہے۔ بقول بیلگریٹ انگلستان میں سب سے پہلے زعفران کے پودے کی ایک گھٹی تروٹی کا ایک سیاح اپنی چھڑی کے سوراخ میں چھپا کر لایا تھا۔

زعفران کے میدوں کی داستان راج ترنگی میں یوں لکھی ہے کہ اس کا پھول مشک ناگ نے جو پیپور میں رہتا تھا ایک وید کو تھم کے طور پر دیا تھا۔ اس ناگ کی آنکھ میں کچھ تکلیف ہوتی تو وہ علاج کی غرض سے وید مذکور کے پاس گیا۔ لیکن اس کی دوا سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ عاجز وید نے ناگ سے سوال کیا کہ کیا تم آدمی ہو؟ جب معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں بلکہ دراصل ناگ ہے تو وید فوراً تان لیا کہ دوا کے کام نہ کرنے کی غرض سے یہ بھی کہ اس منہ سے جو ہر پری جاپ نکلتی تھی وہ دوا کے افزودن کو دیتی تھی۔ چنانچہ وید نے اس کی آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی تو وہ آنکھ بھی ہو گئی۔ اس کے جھلے میں شرکان کے طور پر ناگ نے وید کو زعفران کی ایک گھٹی پیش کی۔ اس کے بعد پیپور میں زعفران کی کاشت پھیل گئی۔

مشک ناگ کی پوجا اب بھی زمان نام کے گاؤں کے قریب پانی کے ایک

لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کئی سال پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پتھر میں پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہیں اور اصل زعفران تر نہیں ہو جاتی ہے اور پھر اسے پانی سے نکال لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں جو بیتاب سطح پر آ جاتی ہیں اللہ کو پھر خشک کر کے پیشا جاتا ہے۔ اسی طرح کئی مرتبہ کیا جاتا ہے۔ ہر مرتبہ اس کی قیمت گھٹتی جاتی ہے اور پچا بہ لاتی ہے۔ زعفران میں تلاوٹ پیدا کرنے کے متعدد طریقے ہوتے ہیں۔ جس کی مقدار معلوم کرنے کے لئے بڑی تجربہ کار نگاہ اور قوی قوت ذائقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کشمیر میں زعفران کی کاشت اور تجارت متعدد انقلابات کی نشان دہی ہے۔ قدیم ہندو ہمد میں اس کی نمیکہ داری کشمیر کے ماتھ میں رہی جس سے نہ صرف ہزاروں ہندوگان نہاد کی روزی چینی تھی بلکہ ریاست کو بھی زبردست مالی فائدہ پہنچتا تھا۔ ویسائی غیر آئینہ اور پھر آشوب زمانے میں اس کا ادوار گھٹ جاتے کے بعد مل فرمانرواؤں کے عہد میں اس نے اپنی سابقہ عظمت

پھر حاصل کر لی جو زعفران کو دہاکے طور پر کام میں لانے کے علاوہ کھانوں میں ڈالنے اور رنگ میں اضافہ کرنے کی غرض سے استعمال کرتے تھے۔ ابو الفضل کا قول ہے کہ اس کے زمانے میں زعفران کی کاشت کا رقبہ دس سے بارہ ہزار بیگے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد افغانی دور میں اس کی کاشت پھر گھٹ گئی۔ مگر ہمارا راجہ رنیر سنگھ کے زمانے میں اس نے پھر پیشا کھیا۔ وہ ان کی پڑھیاں کشتزار سے حاصل کرتے تھے کیوں کہ ہر ششہ قسود قسود کے زمانوں میں لوگوں نے ان سے پیٹ پالا تھا۔ اراچی کے پہلے بندوبست میں زعفران کی ڈیر کاشت اراچی صوبہ ۱۳۲۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ قیمت کے چڑھ جانے اور ہندوستان سے اس کی مانگ بڑھ جانے سے زعفران کی تجارت نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس کی برآمد میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا ہے جس سے امید پائی جاتی ہے کہ اس کی کاشت کا رقبہ جلد بڑھ جائے گا۔

مزوری گزاشت

۱۔ کاغذ کے ایک طرٹ اور خوش خط لکھے

۲۔ فرامیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کے جاتے

ہیں جبکہ مناسب سائز کا کاغذ اور ڈاک کے ٹکٹ

ان کے ہمراہ ہوں۔

غزل

غزل

داس آجائیں جو دل کو دی غم اچھے ہیں

ہوں ستم بھی تو بے آئینِ کرم اچھے ہیں

مسکراتے سے بھی افسردگی دل نہ گئی

ایسے بیسار تبسم سے تو غم اچھے ہیں

دل کٹی رکھتے ہیں کیا کیا غم کیسے جیت

پھر بھی اسے دوست تری زلفتِ تم اچھے ہیں

یوں زمانے کے بھی پیار ہیں یہیں غم لیکن

جو ترسے نام پر ملتے ہیں وہ غم اچھے ہیں

ہم کو انسانوں سے نسبت ہے غرض کیا اس

اب دیر اچھے ہیں یا ابلِ حرم اچھے ہیں

زیست کی راہ ہیں جائیں جو منزل کے چراغ

نقش اچھے ہیں وہی نقشِ قدم اچھے ہیں

لوگتوں امن و محبت کے کھلے ہم سے پیام

اب تشخیر سے ہم ابلِ قلم اچھے ہیں

خیالِ دیر نہ شوقِ حصر نے ساتھ دیا

جہاں گئے ترے نقش قدم نے ساتھ دیا

خوابِ غم آفاق داس آ ہی گئے

بقدرِ ذوقِ طلب تیرے غم نے ساتھ دیا

تھے دل میں کتنے ہی اندیشے ہائے دُورِ دُور

چلے تو راہ کے ہر پہلوِ دُغم نے ساتھ دیا

شبِ سیاہ میں مشکل تھی جیتوئے سحر

خیالِ جسلوہ روئے ضم نے ساتھ دیا

کہاں کہاں نہ کسی کے ستم ہے ہم نے

کہاں کہاں نہ امیدِ کرم نے ساتھ دیا

یہ اور بات ہے دنیا ہمارا ساتھ نہ دے

بڑے خلوص سے دیا کام نے ساتھ دیا

روِ حیات کی دشواریاں نہ عارف پوچھ

چلے تو ساتھ بہت اک سے کم نے ساتھ دیا

ڈاکٹر وثنولیشوریہ

مذہبی کتابوں کے مطالعے اور ترقی دہ استھانوں کی یا تزا میں صرف ہوتا تھا، اس نے ان کی والدہ دینکا جتانے وثنولیشوریہ کی شخصیت اور کردار کی نشو و نما پر گہرا اور فیصلہ کن اثر ڈالا۔ انھوں نے ملک کی زندگی میں جو ممتاز مقام حاصل کیا اس میں ان کی والدہ کی قوت ارادی، دور اندیشی اور جذبہ انشاد کا بڑا دخل تھا۔ دینکا جتا اپنے چھوٹے سے گاؤں کی سماجی زندگی میں بڑا اثر رکھتی تھیں۔

جب وثنولیشوریہ پانچ سال کے تھے اور ان کے والدہ دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس دوران میں چوری کی ایک معمولی واردات ہو گئی، لیکن اس بظاہر معمولی واقعہ کا ان کی والدہ نے اتنا اثر لیا کہ انھوں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اب گاؤں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا گاؤں چھوڑ کر وہاں سے تین میل دور پیکیا لہ پور نام کے ایک قصبہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہ اکثر اس گاؤں میں آتی جاتی رہیں، لیکن وہاں انھوں نے دوبارہ سکونت اختیار نہیں کی۔

پیکیا لہ پور میں ہی وثنولیشوریہ کی تعلیم و تربیت کی باقاعدہ مشروعات ہوئی۔ ہونہار بدواس کے چلنے چلنے پات۔ کم عمری ہی وہ متیس، سترہ اور اسی دہائی دہائی کے بچے تھے۔ ان کی فرزند شاستری اور نیپک چلانی نے اسکول کے ایک مہتر شاستری نادمہنی ٹائیٹو کو آتما تتر گیا کہ انھوں نے انھیں روزانہ شام کو اپنے گھر پڑھنے کے لئے آئے کا مشورہ دیا اور مشر ٹائیٹو نے ان کے

۱۴۔ اپریل کو بنوادیوں جو لوگ پنڈت ڈاکٹر وثنولیشوریہ کے والد کی پرسی کی رسومات انجام دینے آئے تو یہ عجیب اتفاق تھا کہ انھیں بیٹے کا گیارہ کم کرنے کے لئے رکنا پڑا۔ ڈاکٹر وثنولیشوریہ کی موت اس واقعہ سے بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ وہ بھی سال کے اسی دن پر لوگ سدھارے جانے کے والد کا یوم وفات تھا۔ ایسا لغتاف خاذا و نادری ہوتا ہے۔

ان کی موت کے متعلق ان کے صحابہ کا یہ خیال تھا کہ یہ ان کی قوت ارادی تھی جس نے ان کے دل کی حرکت قائم رکھی۔ ورنہ شاید وہ بہت پہلے رخصت ہو جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر وثنولیشوریہ عظیم اور بے مثال قوت ارادی کے مالک تھے، اور انھیں علم شخصیتوں میں سے ایک تھے جو موت اور زندگی کی کش مکش کو خاطر میں نہیں لائیں اور جن کے لغزش عمل کو وقت کا بے رحم ہاتھ نہیں چھو سکتا۔

ان کے کردار شخصیت اور مزاج کی تشکیل میں مختلف اثرات کار فرما تھے۔ ان کا جنم ۱۵۔ ستمبر ۱۸۶۱ء کو مڈن پٹی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک غیلم متوسطہ طبقہ کے گوتامہی گھرانے میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں بنوادیوں سے متعلق تھا۔ ۳۶ میل کی دوری پر ہے۔

اس کے والد شری داس شاستری مرحوم بہت بڑے عالم اور سخت مذہبی آدمی تھے۔ ان کا زیادہ وقت مقدس

کے اندر اچھی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ایک عالی دارغ اور ملندہ دارماں اور ایک شفیق ہرمان استاد نے اسے علاوہ دشوئیثوریہ کی ایک اور خوش نصیبی یہ تھی کہ انھیں ایک شفیق اور برتر خواہ ماموں کا سایہ کرم بھی نصیب ہوا۔ ان کے ماموں نے بھی ان کی زندگی کی تسمیر میں اہم حصہ دیا۔ اور ان کے مشورے سے ہی دشوئیثوریہ نے ریاست میسور کی خلافت اختیار کی۔

ایک بار دشوئیثوریہ اپنی ماں کے ساتھ ایک قریب کے گاؤں میں گئے اور وہاں دو ہفتے گزارے۔ ان کے ماموں کو جب ان کی اسکول سے دو ماہ کی غیر حاضری کا پتہ چلا تو انھوں نے اپنی بہن کو ایک سماعت خط لکھا:

”کیا تم دشوئیثوریہ کو چرواہا بنانا چاہتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس کی تعلیم کی کوئی فکر نہیں ہے۔“

اس خط کا اثر ہوا کہ دینکا تچا فوراً اپنے بیٹے کے ساتھ بکلیا لہ پور واپس آ گئیں۔

جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو دشوئیثوریہ کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ ایک تیرہ یا تیرا کے بیچ باجوڑ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۸۷۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کھلے بنگلور گئے جہاں انھوں نے سڑل کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۸۰ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ سڑل کالج میں ان کی طالب علمی کی زندگی کے دور رخ تھے۔ ایک طرف انھیں کالج کی زندگی میں امتیاز حاصل تھا، ان کے استاد ان کی صلاحیتوں کے محض تھے اور وہ خود وہاں کے اعلیٰ ماحول سے بڑے خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ ان کے بچی حالات پریشان کن اور تکلیف دہ تھے۔ زراٹش کی آسائیاں میسر نہیں اور نہ اخراجات کے لئے کوئی معتدل ذریعہ صرف دو خوبیاں ان کا سرمایہ تھیں۔ حوصلہ مندی اور الوازی۔ ان حالات میں بھی وہ اپنے مستقبل سے یائس نہیں تھے۔

اس زمانے میں سڑل کالج بنگلور کے پرنسپل مسٹر چارلس وائٹس تھے۔ داخلہ کے بعد سے ہی انھیں دشوئیثوریہ کی ترقی سے گہری دل چسپی رہی۔ کمزورہ انھیں ریاضی کے مشکل سوال حل کرنے کے لئے دیا کرتے اور ان کی فرض شناسی اور باہمی دوستی سے متاثر ہو کر مسٹر وائٹس نے انھیں دیسپرٹ ڈکشنری کا اپنا ذاتی نسخہ انعام میں دیا۔ دشوئیثوریہ نے اس ڈکشنری کو جو ۱۸۸۰ء کی مطلوبہ تھی اپنے استاد کی تقدس نشانی سمجھ کر ساری زندگی اپنی میز پر رکھا۔ مسٹر وائٹس کا ایک اور انعام جو انھیں بہت عزیز تھا وہ دو پہری کڑیاں تھیں جو اسی طرح انھیں انعام میں دی گئیں۔

پچیس سے ہی دشوئیثوریہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے بڑے دھڑلے اور غرور و فخر سے تھے۔ ایک بار ایک کنسلرٹ کے پڑتال نے زندگی اور طویل عمر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی طرف اشارہ کیا:

”اسے دیکھو اس کا پیس کے سن تک پہنچنا مشکل ہے۔“

لیکن پڑتال جی کی اس پیشین گوئی کے باوجود دشوئیثوریہ ۱۰۱ سال کے سن تک پہنچے اور ۱۵ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ہندوستان میں ان کا صد سالہ جشنِ ولادت بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ جب ۱۸۸۰ء میں انھوں نے بی۔ اے کیا تو خوش متوجہ سے اسی زمانے میں ریاست میسور کے دیوان مسٹر رنگ چارلہ نے میسور کے ان طلباء کے لئے ”دلیفے جاری“ کے جو میسور سے باہر جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے۔ جب دشوئیثوریہ دیوان رنگ چارلہ کو کھری پر ان سے ملے تو وہ پہلی نظر میں ہی اس ہونہار اور بلند اقبال طالب علم کے خوبصورت ہو گئے۔ انھوں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ ریاست میسور کے دلیفے سے پونا میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔

چنانچہ دشوئیثوریہ نے پونا کے کالج آف سائنس میں داخلہ لیا اور وہ ستمبر ۱۸۸۱ء میں وہاں سے انھوں نے انٹرمیڈ کی ڈگری لی اور ساری تعلیم پھر پڑتال میں ہی آگئی۔ فوری

۱۸۸۲ء میں انہوں نے اسسٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے حکومت برہمپور
محکمہ تعمیرات عامہ کی ملازمت قبول کر لی اور سپرنٹنڈنٹ انجینئر ہو کر
وہاں ۱۹۰۸ء میں اپنی مرضی سے ریٹائر ہو گئے۔

پرائیویٹ اپنی ملازمت کے دوران میں انھیں کئی بار واپس
افسروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور سب سے ان کی ذمہ داری
کا کردہ گی اور فرائض شناسی کو سراہا۔ ان کا دائرہ عمل محض ملازمت
تک محدود نہیں تھا، وہ سماجی زندگی میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک
تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے رفقاء کے گھرانوں سے پوتیاں کن کلاب
کی بنیاد ڈالی۔ ان کے دوستوں اور رفیقوں کے علاقے میں گئے،
رہائش گاہ اور کتابچے سمیت زہرستان شالہ میں، گوکھلے اور نیاوگا
تو دکن کلاب کی مجلس انتظام میں بھی شامل تھے۔

حکومت برہمپور کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد
دشوریشور ریڈیہ مالک کے دوسرے پر پلے گئے۔ وطن واپس آئے
کے بعد اس کے ملازمت قبول کرنے کے بجائے انھوں نے
آزاد مشن کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ انھیں کام کی تلاش
کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ اس وقت تک ان کی اتنی شہرت
ہو چکی تھی کہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے لوگ ایک
دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی خدمات
کی مالک صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھی بلکہ برقی مالک
میں بھی ان کے مشوروں اور ان کی تجویزوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔
اس زمانے میں میسور کے دیوان ٹی۔ آنندراؤ نے انھیں خط لکھا:
"آپ کی اعلیٰ مقامات اور خدمات کے ساتھ ساتھ اس امر
کے پیش نظر بھی کہ آپ میسور ہیں، ہر نئی فن کو آپ کی خدمات حاصل
کرنے مستعد ہوگی۔ ہر نئی فن کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ
آپ معاوضہ سے زیادہ عوامی خدمت کو اہمیت دیتے ہیں۔"

چنانچہ دشوریشور ریڈیہ جیٹ انجینئر کی حیثیت سے ریاست
میسور سے وابستہ ہو گئے اور تین سال بعد ہمارے انجینئرس
ٹی۔ آنندراؤ کے بعد ریاست کے دیوان کے منصب پر فائز کیا۔
میسور کے دیوان کی حیثیت سے چھ سال کی مقرر مدت میں

ان کے کارناموں کی طویل فہرست ایک مجلہ سے کم نہیں ہے۔
گورنر راج ساگر بانڈھ، بونی درستی، اسسٹنٹ بینک انجینئر آف
لامرس، ریلوے اور ایلیس ویٹر ادارے اور تعمیرات ان کے
دور انتظام کی یادگار ہیں۔ ان میں سے بعض ترقیاتی منصوبے ایسے
تھے جنہیں برطانوی ہند اور ریاست ہند میں اولیت کا شرف
حاصل تھا۔

اسی دور میں انھوں نے میسور میں بڑی صنعتوں کے قیام کے لئے
بھی کئی تجویزیں بنائیں اور ان پر عمل کیا۔ جھدرادق کا لوہے اور
فولاد کارخانہ اور تاق کی پرقانی اسیکم بھی ان کے دور
کی یادگار ہیں۔ اپنے عرصہ اقتدار میں انھوں نے میسور کی صنعتی
کار جو خاک تیار کیا تھا اس میں مجموعی طور پر رنگ بھرنے کے لئے
تیار کیا۔ چار سال کا عرصہ درکار ہے۔ نئے برقیہ، نئی تعمیراتی
اور نئے تعمیرات، ان کو عملی جامہ پہنانے میں انھیں خاص
دل چسپی تھی۔

ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ وہ ہمیشہ کام
کو معاوضہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے میسور کے دیوان کے
منصب سے سبکدوش ہونے سے پہلے ہمارا یہ کہ دیوان ہمش تھی
کہ وہ ان کے مشا پر سے ہیں شاہد کریں لیکن اس پیشکش کو انھوں
حقہ ہر کرت قبول نہیں کیا

"میں اپنے مشاہر کے مفاد کے بارے میں مشربیل
کو لکھ چکا ہوں۔ میں پچھلے اٹھارہ مہینوں سے اس
تجویز کا مخالفت رہا ہوں اور اب بھی میری رائے
یہی ہے۔"

انھوں نے ہمیشہ اپنے کام کو عبادت سے کم نہیں سمجھا۔
مسٹر خواجہ کتبہ بی بیپیدہ اور لکھا لکھوں نے جو ان کی عوامی
نظر اس کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی دلچسپیاں گونا گوں اور
دیس تئیں تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں داسی جے کو بھی
برتناگنہ دیکھتے تھے۔ وہ اس امر کے حامی تھے کہ جو کچھ بھی کرنا
ہو اسے بخوبی انجام دیا جائے۔

دخیویشوریہ اپنے اھوں کے بڑی سنی سے باز رہتے۔ میو کے دیوان پوجنے کے بعد انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان سے کسی رعایت، سفارش یا مراعات کی توقع نہ رکھیں۔ یہ کہنا تیرا وہ صحیح ہوگا کہ ان کے عرصہ اقتدار میں ان کے رشتہ دارانہ کے لئے ریاست کیسور کی ملازمت حاصل کرنا زیادہ مشکل ہو گیا ہوگا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ سنگ دل تھے یا دیوانی سے کام لینا نہیں جانتے تھے۔ عین اپنے عزیزوں کے معاشی حالات کا علم تھا اور ضرورت مند عزیزوں کے لئے اور خصوصاً ان ذوالفقر کے لئے جو اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے۔ وہ بہ ماہ ایک موقوف رقم کا بندوبست اپنی جیب سے کر دیتے تھے۔

لوگ اگر ان سے پوچھتے تھے کہ ان کی طویل عمر اور کامیابی کا راز کیا ہے ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا "ممت، عادت و اطوار میں توازن اور اعتدال، آرام اور سادگی، اہلسنا اور شگفتہ طبیعتی یہی میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔"

اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ملک وہ لوگوں سے پہلے سے معینہ وقت پر ہی ملا کرتے تھے۔ اگر ملاقات کسی مشاومت کے لئے ہوتی تو وہ پہلے سے موضوع اور مسئلے کا بخور اور گہرا مطالعہ کر لیتے تھے۔ اس بعدہ اپنی مخصوص پوشاک زیب تن کر کے ملاقات کے لئے تیار ہوجاتے خوش لباسی بھی ان کا طرہ امتیاز نہ تھی۔ وہ اپنے غلہ واصل سے بھی یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے مائل اور حقانی سے پوری طرح آگاہ ہو کر ان سے مشورہ لینے آئیں۔

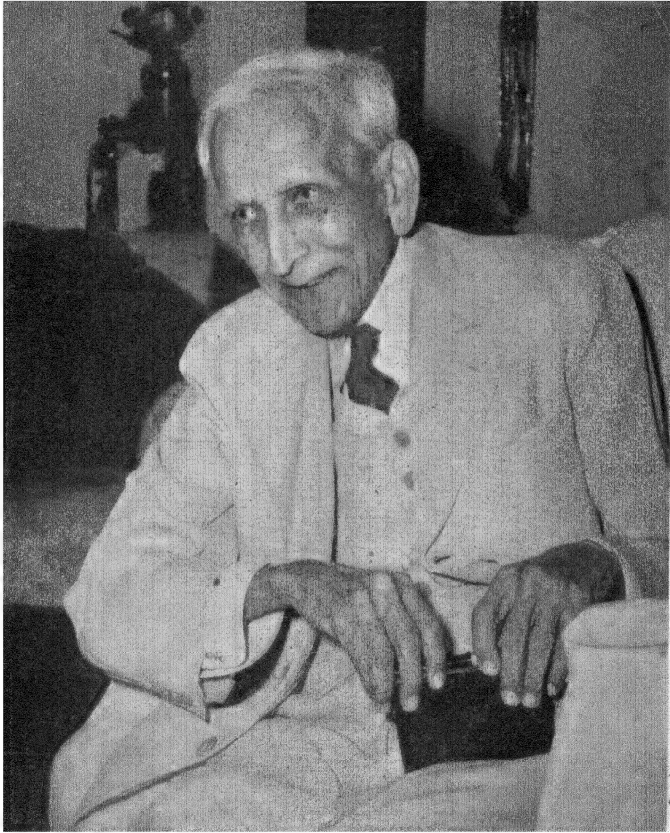
ان کی ذہنی قوت، سماجی طاقت اور امید پر حق کا کوئی حاسب تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو آسانی سے اپنے اھول اور رعیت میں ترمیم کر لیتے ہیں۔ وہ شہد بیاں مقرر تو نہ تھے لیکن اپنی تقریر بڑی سنائی اور اعتماد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

وہ جذباتی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ خود قی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے تھے اتنی ہی محنت اور جانفشانی کی توقع وہ اپنے ماتحتوں سے بھی رکھتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جو آدمی محنت اپنی ذاتی کوششوں کے کامیابی حاصل کرتا ہے وہ

دوسروں سے بھی خلوص، جوش اور محنت کی امید رکھتا ہے۔

دخیویشوریہ مرث ایک اچھے، غیر، سیاست دان اور تنظم بھی نہ تھے، بلکہ معاشی معاملات میں اچھی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ عین ہندستان میں معاشی منصوبہ بندی کا پیش رو کہنا مناسب ہوگا۔ ۴ کی زندگی کا سب سے بڑا خراب یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور خوش حال نہ کیے۔ وہ پہلے ہندستانی تھے جن نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی معاشی منصوبہ بندی پر ایک کتاب لکھی اس سے پہلے ۱۹۲۰ء میں وہ ہندوستان کی نئی تعمیر پر بھی ایک اہم کتاب لکھ چکے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ملک کو وہ فرسے دئے جو ہمارے ملک کی موجودہ معاشی اور صنعتی ترقی کی روح رواں کہے جاسکتے ہیں۔ وہ فرسے یہ ہیں۔ "بیداوار بڑھاؤ ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔" "صنعتی ترقی کرو ورنہ مٹ جاؤ گے۔"

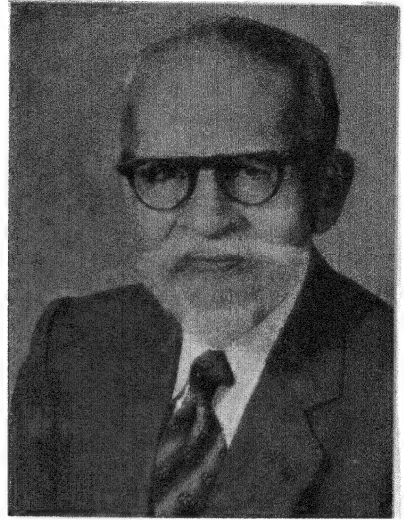
دخیویشوریہ کی زندگی اس بات کی روشنی مثال ہے کہ اگر کوئی انسان چاہے تو صرف طویل عمر حاصل کر سکتا ہے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنا اور اپنے ملک کا مستقبل سنوار سکتا ہے۔ انھوں نے یکسوئی، خلوص اور دھولے کے ساتھ ملک کی خدمت کی اور اپنے آخری سانس تک اپنے علم اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے تاکہ وہ اپنے دور اور اپنے ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی وہ ایسی سائنس کی تازہ ترین ترقی سے بخوبی آگاہ تھے اور ملک کے عام معاشی حالات اور خصوصاً لوہے اور فولاد کے کارخانوں کی ترقی کے پوری طرح باخبر تھے۔ وہ ان قابل قدر بہتوں میں سے تھے جن کی شخصیت میں اصول اور عمل کا تضاد نہیں ہوتا، جن کے اصول کا غدی چھوٹی کی طرح محض رائے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ جو اپنے اھولوں میں اپنے خون جگر کے حقیقت کا رنگ بھرتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی صنعتی ترقی اور تعمیر کی تاریخ میں ان کا نام ایذاک درخش رہا ہے۔



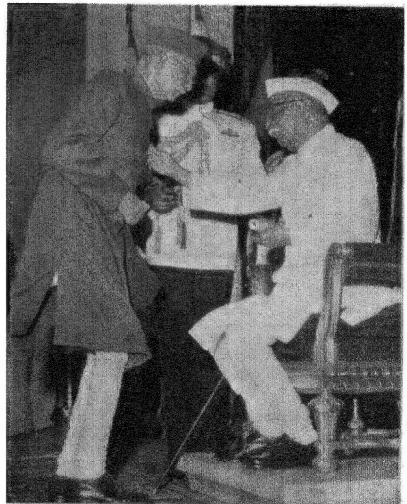
ڈاکٹر وشنو تھاکور

آپ کے باپ ہیں شاہدہ سید کا معنوں صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ فرمائیں

ڈاکٹر عبدالستار مسیحی
 جیسے عربی کے عالم کی حیثیت سے
 دانشور بننے والے عربی سرمدی



پدم بھوشن کا اعزاز پانے والے اردو کے ادیب
 انشا نکتہ نوی اور نیار فیتوری



آثار تیموری

سرپرستی کی اور نہ امداد کو سبب سے لگایا — یہ بات دوسری ہے کہ

”اودہ کا لفظ ترکی ہے اور منوں کے فعلیل فارسی میں پہنچا اور بابر کے ساتھ ہندوستان آیا۔ اس کے معنی امراء سلاطین کی فرودگاہ (لشکرگاہ) یا کمپ ہے چنانچہ شاہ جہاں اور بعد کے بادشاہوں کے کمپ اردو معنی کے نام سے موسوم تھے اور قلعہ مدنی کے طوق باز کا نام بھی اردو باز کا تھا۔“

اس لئے اس کو زبان کی حیثیت سے چاہئے کہ یا سرپرستی کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رہا اردو زبان میں شکر کہنے کا سوال، تو اس کی تاریخ قدیم تاریخ ہے۔ اس زبان میں شاعری کا آغاز کس سن میں ہوا اور اودہ کا سب سے پہلا شاعر کون تھا وہ پیشلہ ابھی تک تحقیق کا محتاج ہے، لیکن یہ بات ضرور صحیح ہے کہ ”اس زبان کا بیج اس سرزمین میں اس وقت پڑا کہ جب مسلمان اور ہندوؤں میں یک جہتی ہوئی۔“

اور اس یک جہتی کا ایک خوش گوار نتیجہ نکلا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی زبان سے آشنا ہونے لگے۔ ہندی، فارسی زبان کو قبول کرنے لگی اور فارسی میں ہندی کے الفاظ آنے لگے۔ شاعرانہ

لہ اردو ادب کی منفرد تاریخ (چیز مطبوعہ) ص ۱۰۱ مرتبہ مولوی عبدالغنی

ہندستان کی تاریخ میں تیموری بادشاہوں کو چار ہیبت حاصل تھیں۔ دہلی سے پوشیدہ نہیں۔ خلیفہ الدین بابر سے سراج الدین ظفر سنگ کی بادشاہ ایسا نہیں کہ جس کو نظارہ قرا لیا جاسکے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اگر ان میں کوئی مجموعہ محاسن تھا تو کسی کو مجموعہ محاسب بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مابو شب زندہ دار کے مقابلہ میں زندہ لاپائی بھی نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن طیارے کے اختلاف کے باوجود ایک مسئلہ میں دونوں کا اشتراک حیرت خیز ضرور ہے، وہ ہے ادب سے دل چسپی اور ادب پروری! اس کی پوری تفصیل تاریخ و تذکرہ میں آج تک محفوظ ہے اور اس کا تذکرہ بھی بجاؤں پر بھی آ جاتا ہے اور تاریخ و تذکرہ کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فارسی ادب کے ساتھ ہندی ادب نے اس جہد میں کس قدر ترقی کی اور تیموری بادشاہوں نے ہندی ادب کو آگے بڑھانے میں کس قدر حصہ لیا۔

خلیفہ الدین بابر کا دور، تاریخ کا ایک نہرا دور ہے۔ اگر کے دور کی بہتر عالم گیر شہرت ہے، چنانچہ کی دلچسپیاں دیکھی ہیں وہ نہیں، شاہ جہاں ہندی ادب کا صرف سرپرست ہی نہ تھا بلکہ وہ بالکل ادیب اور شاعر بھی تھا۔ غریب عالم گیر پر چاہے کتنی بہتیں لگائی جائیں لیکن ادب کی سرپرستی میں اتاریج کی روشنی میں اسے جو مقام حاصل ہے، اس سے انکار تاریخی حقائق کا انکار ہے۔ مگر ان تذکرہ بالا بادشاہوں میں کسی ایک بادشاہ کا نام اودہ کے سرپرست کی حیثیت سے نہیں لیا جاسکتا، ان میں سے نہ تو کسی نے اردو کی

مرزا غیاث الدین بھی عالم عیش و نشاط میں یصدناز دانداز
پکارا، مٹی مٹی کہ

دیں جگہ زخم جفا کو دلِ مسدِ چاک میں ہم
 دیکھیں کہ کچھ بھی وفا اس ثبت ہے پاک میں ہم
 نقشِ پاکِ منتظر اے راحت جان عاشق
 تیرے قدموں سے جبر ہے ہو گئے خاک میں ہم

سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی صاحبِ زادی
 شاہہ فوازا خان بیگم الزاں کی قواسی دلِ رس ہو تو بیگم کی
 صاحبِ دل بیٹی زیب النساء بھی کبھی کبھی اسی زبان میں لکھتے تھے
 دوبرائے لگتے تھے اور عالم ہے خودی میں اس کی زبان سے نکل
 جایا کرتا تھا کہ

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کو
اس طرح نہ لگو مرے الٹ کو
ہر ایک پر تم جو کر رہو پیارے
دھڑکے ہے حرا دل، نہ لگے آہ کو
مناظر، پیغام زبانی نہ نشانی
حالت سے کوئی کیوں ہو آگاہ کو
جدا ہو مجھ سے ہر یاد یہ خدا نہ کرے
خدا کی تمہیں دوست سے جدا نہ کرے
ممن جو تم ہو آشنا، وہی سے گیا
خدا کی کے تمہیں مجھ سے آشنا نہ کرے

۱۔ جلوہ مخضر حصہ اول حاشیہ ص ۹۴
۲۔ اورنگ زیب عالمگیر کے صاحبِ دل ہونے کا ثبوت اورنگ زیب
(دکن) میں بی بی کا مرقہ ہے، جسے دیکھ کر بے ساختہ زبان
سے نکل جاتا ہے

یہ پتھر کا نہیں مقبرہ - یہ دل ہے اس بادشاہ کا
جسے جلگت ہے دل کہتا تھا - ”بی بی کا مقبرہ“
(غیر منبوعہ) (مردینسروٹی، دھرووا یا نکار)

دووں زبانوں سے کام لیا۔
 ” رفتہ رفتہ میرے محسوس طور پر یہی تقاضے فلسفے
 دو قوتوں اور دونوں زبان کے میل جول سے خود بخود
 ایک زبان پیدا ہوگئی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔“
 زبان کے اس امتزاج کے یہ مقدمہ قومیت کا بھی بنیاد رکھی۔
 تقاضے تہذیب نے ہم لیٹنا شروع کیا۔ نیا کچر، نیا معاشرہ
 عالم وجود میں آنے لگا۔

اس زبان کی ابتدا کی نشوونما غافلہ کوپن ہیگی، وڈان ہلنڈ
 کی گود میں کھلی پر دان چرخی، پھر جیرس، انیس کے ساتھ
 غافلہ ہوں تھے نکل، گیون، کوچوں، باڈاؤں میں پھرتی تھی
 بڑھتی ہوئی طور پر درباروں تک پہنچ گئی اور دیوتیوی سلاطین
 کرجے کے درباروں کی زبان فادسی تھی۔ فون ویں اگر راج تھا
 تو فادسی کے بعد ترکی اور ہندی کا راج تھا۔ و اگر فرتیہ تھے
 تو ترکی، فادسی اور ہندی پر فرتیہ تھے اور اس حوالے زبان کھٹے
 جے کے پاس کوئی جگہ نہ تھی اور جیہ زبان ہوتے گئے۔ "ملوہ خنز"
 اذ میفر بلرگے، کردی میں بار بادشاہ کی کسی کسی وقت اس
 زبان میں باتیں کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا۔ اور
 جلال الدین محمد اور بادشاہ محمد ابراہیم اٹھتا تھا کہ

”پرمی جو گھڑی، مجھ سے براہ عادت
 تو اصل کی ساعت کی نہیں کچھ حاجت
 ہو جاتی ہے لئے سے مبارک ساعت
 ساعت کا بہانا نہیں، غرض بر ساعت“

اور جہانگیر کی طرف سے جہانگیری کرنے والی ہمسرا النساء بنت

۱۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ (غیر منبوعہ) ص ۵، مرتبہ مولوی عبدالحق
۲۔ جلوہ مخضر حقہ اول، مصنفہ حضرت مسیح علیہ السلام، ص ۴
۳۔ ۱۶۱۱ وین فورجہاں بن کر جہانگیر کے عقیدے آئی۔ ۱۶۲۴
ملک ملکہ و ہندو بنی رہی اور ایشیہ سال ہو گئی کہ اپنی اداؤں کی جہانگیر
سنگرز سے۔ ۱۶۲۶ وین لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہ۔

اکر ہاری لعل پکب یار کر چلے
خواب عدم سے نکلے کو بیدار کر چلے
غزلی پیالہ، خواہ سو بکریو کا لال
ہم اپنی خاک پر تجھ منت ار کر چلے
کچے ہوتے، نہ گھسے مرے آیا کرتے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو ہسلا کیا کرت کوئی۔

یہ داستان محمدی الدین اور ملک زبیر عالم کے دور کی داستان ہے اور پھر اس کی صحت پر لیتیں گے ناجی مشکل ہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد تیموری خاندان کا زوال شروع ہوا اور پھر
”یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سلطنت منلیہ کا دور انحطاط
اور وہ زبان کے جدید ذہن کا پیش فیہ ثابت ہوا۔ یہ زبان کی
جب ستم نظریہ ہے کہ ادھر سلطنت منلیہ کے اقبال کا
یہ آفتاب عالم تاب غروب ہوتا ہے اور ادھر اردو
زبان کے اقبال کا ستارہ نعت اہلنا پر موفشاں کرتا ہوا
اقساطے عالم کو متورکتاب ہے۔۔۔“

اور چ۔

”ترقی اس کی تقدیر میں لکھی تھی وہ سلطنت کے تیزل کے
پردے میں تھی۔“

زبان کی ترقی کے ساتھ اردو شاعری کا عروج بھی حیرت خیز ہے اور
”یہ ظاہر ہے عجیب سی بات ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی
ماحول میں نہ ملی ہیں اردو شاعری کو نشوونما دیا
جب زوال پذیر ہوئے لگا تو اردو شاعری فروغ پانے
لگی۔۔۔“

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اردو کا مزاج خاص ہوا

۱۔ جلوہ خضر مختار اول شامیہ ص ۵۶

۲۔ نقد ادب (سید محمد جبار ایم۔ اے) ص ۱۹

۳۔ جلوہ خضر جلد دوم ص ۹

۴۔ اردو کی ادبی تاریخ (پروفیسر عبدالقادر صمدی) ص ۱۳۳

مزاج تھا اور اس کی ترقی کے لئے ایسا دُر زمامش کے ساتھ ہوا دور
کی ضرورت دقت کی اہم ضرورت تھی۔۔۔ ہندستان کی تاریخ کی روشنی
میں تیموری بادشاہوں میں پہلا ہوا بادشاہ فیروز الدین، دوشیز
محوشاہ (۱۴۰۱ء - ۱۴۱۴ء) تھا۔ جس کے دور حکومت کا آغاز
۱۴۰۱ء میں ہوا اور اختتام ۱۴۱۴ء میں۔ یہ پہلا بادشاہ ہے کہ جس
ایٹانائی الغیر ادا کرنے کے لئے اردو کا سہارا لیا اور اردو بھی فارسی و
ہندی کے ساتھ تخلص ملی، اس کی عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی، مگر
یہ یاد رہے کہ سرکاری زبان پیر می نہیں تھی۔ اس دور میں اس کا
نام اردو نہ تھا بلکہ اس کو ریختہ کہا جاتا تھا۔

”ریختہ کے کئی معنی ہیں، ایک معنی سنگین عمارت کے ہیں

اور اس سے اس کا استعمال چرنے اور چرچ پر ہونے لگا

جس سے عمارت سنگین اور پختہ ہو جاتی ہے۔ یہ تعمیرات

کی اصطلاح ہے۔ ایک دوسرے معنی گری پڑی چیز کے

ہیں۔ اسی سے بعض مصنفین نے معنی پیدا کئے ہیں، اگر

چونکہ اس زبان میں الفاظ پریشان بھی ہیں، اس لئے

اس کا نام ریختہ ہو گیا۔ اور ایک معنی ڈھالنے اور

بٹانے کے ہیں اور غالباً انہیں مسنوں سے موسیقی کی

اصطلاح ”ریختہ“ بھی، جس کا اطلاق اس ”سرود“ پر

ہوتا ہے جس میں ہندی اور فارسی اشاریا معرے، مغز

تال اور راگ کے امتزاج سے مستوحہ تے ہیں۔ اس اصطلاح

کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ امیر خسرو کی وضع کی ہوئی ہے

چنانچہ ان کی مشہور غزل

’ ز حال میکن گمن تلافی، دورائے نیناں، بتائے چشماں‘

اس کی سند میں پیش کی جاتی ہے ”لہ

اور میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرہ نکات اشعراء کے خاتمہ میں ریختہ

کی یہی تفسیر کی ہے کہ

”آدل آکر یک مفرعش فارسی و یک ہندی۔ چنانچہ

۱۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ (ظہی) بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحی ص ۳۳

شہاب الدین کے ہاتھوں ان کو بینا کی کھوپڑی اور تخت سلطنت سے سزا دی جوتا پڑا۔ عہد الملک نے حضرت ہرگزول کرنے کے بعد عزیز الدین عالم گزرائی کو تخت پر بٹایا۔ ان کا دور میرزا گردی کے شباب کا دور تھا اس نے ان کی اوقیہ دل چسپیوں کی تفصیل بھی نہ معلوم ہو سکی۔ تذکرہوں سے ان کے شہری ذوق کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔ اس بادشاہ کو بھی عہد الملک کی سازشوں کا شکار ہونا پڑا اور عام شہادت نوش کر کے اپنے فرزند ابوالخضر جلال الدین شاہ عالم ثانی آفتاب (۱۴۱۹ - ۱۸۰۶ء) کے لئے جگہ خالی کرتی پڑی۔ تیموری بادشاہوں میں یہ بادشاہ عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، ہندی، اردو، جہاڑ اور پنجابی زبانوں کا عالم تھا۔ اور فارسی، ہندی اور اردو کا مستند صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کی حکومت کا رقبہ ۱۸۰۳ء و کے بعد اس مشہور کہادت کی روشنی میں کہ

”ملک شاہ عالم از دلی تا یلم“

تھا۔ ایسی اسی زبانیں زمین، زبان کے معنی میں استعمال کی گئی اور اس نے اردو کا نام پایا۔ سب سے پہلے میر تقی میر نے نکات الشعراء میں

”یہ زبان اردو مصلیٰ شاہ جہان دلی“ لے

پھر معنی نے اردو کا لفظ زبان اردو کے لئے لکھا اور کہا کہ خدا کے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی کہیں کسی منہ سے ہم اسے معنی اردو نہ پائی؟

معنی کے بعد میرزا نثار اللہ خان اقلانی نے دریاے لطافت میں انیس معنی میں اردو کا لفظ استعمال کیا اور اسی زمانہ سے اردو عام اور پر زبان اردو کے لئے استعمال ہونے لگی۔ مگر اس کی معنویت کے آتش بھی نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں دلی آجڑے لگی اور لکھنؤ لیجے لگا۔ یا کہاں لوں لکھنؤ کا رخ کیا۔ خان آرزو مرزا محمد فیض شاہ

لے نکات الشعراء (مجلعہ نظایا پریس بدایوں) ص ۱

جون ۱۹۶۲ء

تلم حضرت امیر علی المرتضیٰ ثلثہ
 دوم آنحضرت معرشت ہندی دلفعت فارسی۔ پناں چ
 شریعت علیہ کہ خوشہ آفرین
 یکی ایک زمانہ کے بد اس کا اطلاق اردو نظم کے لئے ہونے لگا۔ اور یہ استعمال غالب کے زمانہ تک پایا جاتا ہے۔
 عورت ہی دور ریختہ کے بالکل شعرا کا دور تھا۔
 شاہ نجم الدین مبارک امیر و شیخ شرف الدین معنوں، میر غیاث
 تاجی، مصطفیٰ خاں یک رنگ، اشرف علی خاں فغان،
 شاہ بلور الدین عالم اور حضرت مرزا مہر جان جاں اسی دور کے مشاہیر شعرا تھے۔ عموماً شاعر کے متعلق حضرت ولی جسرانی (دکنی) نے فرمایا تھا کہ

دل ولی کا لے لسیا دلی نے چھیں

جا بگو کوئی عورت شاہ سون

اس دور کے بعد جو دور آتا ہے وہ جاہل الدین احمد شاہ بادشاہ (۱۴۲۸ - ۱۴۵۴ء) کا دور تھا۔ یہ دور انتہائی پر آشوب دور تھا۔ ایک اس کے دربار میں شعرا کو عزت حاصل تھی، اور اشرف علی خاں فغان آقاں کے کوکے (دودھ شریک بھائی) تھے۔ چھ سال حکومت کرنے کے بعد نظام الملک کے پوتے عہد الملک

لے قطع حضرت امیر خسرو دہلوی

زرگر سپر چہ ماہ پارہ

نقد دل کی گرفت چاکست

کچھ کڑے سوارے پکارا

پھر کچھ نہ گھڑا، نہ کچھ سنوارا

نکات الشعراء (دیر لکھی تیر) ص ۲

تے شہر میر معز فطرت موسوی دلی

از دلفعت سیاہ، بدل دھوم پڑی ہے

دردنا آئینہ مجھ کو جھٹک رہی ہے

نکات الشعراء (دیر لکھی تیر) ص ۵

تے نکات الشعراء میر دہلی شہر زاب صدریاجک مولانا

جیب الرحلی شروانی مرحوم) ص ۱۸۶

میر تقی میر سید محمد میر سوز، مرزا جعفر علی حسرت، غلام بھائی مفتح
میر غلام حسین ضابطہ، میر حسن حق، شیخ گلندرین جبرائیل،
میر انشا و انشا، انشا، سعادت یار خان رنگین و دیگر شعرا
لکھنؤ پہنچے۔ یہاں ذاب بخت خان ابن حافظ الملک حافظ
رحمت خان کی سرکار، ادب و آواز سرکار مفتحی - ذاب ام صحت الدولہ
اور ذاب سعادت علی خان کے دربار تو دائمی دربار تھے، اور
پھر لکھنؤ میں تیموری دربار کے آثار موجود تھے۔ وہ دربار شاہ زاد
مرزا سلیمان شکوہ (متوفی ۱۲۳۷ھ) خلعت شاہ عالم ثانی آقا
کا دربار تھا۔ اسی زمانہ میں بنارس میں ایک شاعر **میرزا جعفر علی**
داغ بیل پڑی۔ اس کے بانی شاہزادہ مرزا **جہانگیر**
عرف مرزا جوان بخت بہادر جہان نادر (متوفی ۱۲۷۷ھ) ولی بہر
اقل شاہ عالم ثانی آفتاب تھے۔ ان کی جہان وادری کی داستانیں
تاریخ نے پوری طرح محفوظ رکھی ہیں۔ اس جہان نادر نے اردو
کی پوری طرح سرپرستی کی۔ اردو دوستی کا نیا ادان کیا، اس کے
فروع میں کافی حصہ لیا۔ تیموری شاہ زادوں میں اس وقت کو
پروان چڑھایا۔ اسی نے آثار تیموری میں جہان نادر اور سلیمان
کے آثار نمایاں ہیں۔ اسی دور میں اردو مثنوی کے قدم لکھتے ہیں
پہنچے اور مدراس کو بھی شاہ زادہ محمد پیر الدین مرزا عالمی بخت
الغفری (۱۷۶۰-۱۸۱۸ء) نے قلم مثنوی کی زبان سے فائز۔
یہ بات پر ہے کہ شاہ عالم ثانی آفتاب کا زمانہ آفتاب تیموری
کے غروب اور آفتاب اردو کے جلال کا زمانہ تھا۔ اسی لئے اس
آفتاب اردو کی ضیا بادی شاہ زادہ مرزا حسن بخت حسن
خلف شاہ عالم ثانی کے زیر کابل میں ہوئے گی۔
لیکن یہ دلی کا جبرائیل دلی کا ایشادہ تھا بلکہ پورے
ملک کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ اس کو اگر کسی نے محسوس کیا تو
ایک خائفہ نشین نے محسوس کیا اور اس وقت محسوس کیا
جب کہ دلی پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہو رہی تھیں۔ کوئی
قدردان سنی بھی نہ تھا۔ خان آرزو، اسودا، میر تقی میر
دلی چھوڑ چکے تھے۔ وہ خانقاہ نشین خواجہ میر درد تھے۔

آج کل دلی

ان کے پائے استقلال کو ذرہ برابر لرزش نہ ہوئی۔ وہ مرتے
وہ ملک دلی میں رہے۔ انھوں نے دلی میں اردو زبان کی آبر
رکھی اور اپنے وجود سے نئی زندگی اور نئی توانائی بخشی۔
اس دور میں قلم مثنوی میں اگر کسی زبان کی راجدھانی مفتحی تو وہ
زبان اردو زبان مفتحی اور ہرشاہ زادہ اس زبان پر فزونی تھا۔
تیموری شاہزادوں میں اگر بخت ایسے شاہزادوں کی مفتحی - جو
خود بھی شاعر تھے اور قلم مثنوی میں تیموری دبستان شاعری
کے قائم کرنے والے تھے۔ ان شاہ زادوں میں حسن بخت حسن
پیر الدین الغفری، مرزا الدین ثابت، جوان بخت جہان نادر
دغلام فرزا الدین شمس، جلال الدین زبیب، عزیز الدین سرور
ایمزدین سلطان، سلیمان شکوہ سلیمان، اگر شاہ ثانی شاعر
خیات الدین شہرت، مرزا حامی شہرت، قمر الدین شہزادہ
بہادر شاہ ظفر، رحمت بخش شاعر، مرزا کوچک بخت کوچک
فرخندہ بخت جہان قمر، احمد بخش منعقت، دارا بخت ذفا،
مرزا غلام فرزا الدین آبادی کو خاص شہرت حاصل مفتحی۔ یہ سب
تیموری دبستان شاعری کی جان تھے اور شاہ عالم ثانی کے دہ
میں ان کے نئے قلم مثنوی میں گونجنے لگے تھے۔ لیکن یہ دبستان شاعری
مراج کمال تک پہنچا تو ابوالخضر سراج الدین بہادر شاہ ظفر
(۱۷۵۵ - ۱۸۴۲ء) کے دور میں پہنچا۔ اور یہ ایک کھلی
مفتحی حقیقت ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی تحت نشینی (۱۸۳۷ء)
کے بعدیا یوں کہیں کہ

”انیسویں صدی کے ریل دوم میں دہلی کی فضا پھر
ایک مرتبہ نئے فہم سنوں کے تراؤں سے گونجنے لگی“

یہ زمانہ کل تیر کے آخری سہ ماہی کا زمانہ تھا اور قلم مثنوی
شعرو شاعری کا مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ شاہ زادوں میں ایک
یہی شاہزادہ ایسا تھا کہ جس کو شرف بھی اور شرف گوئی کا ذوق
نہ ہو اور شعراوں میں حصہ نہ لیتا ہو۔ پھر وقت کے کبھی

لے اردو کی ادبی تاریخ دہر و خیر عید آقا در سردری) ص ۱۹۳

وہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر رنگون میں نظر بند کئے گئے اور اس مظلوم بادشاہ کو

”دو گز زمین بھی نہ ملی گونے یا رہیں“

لیکن یہ اردو زبان جو منہ سے گپ چکی تھی، وہ مزہبی۔ وہاں بھی اسی زبان میں وہ اپنی داستان زندگی دہراتے رہے اور ہم کے افسانے سناتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ یہ تیموری خاندان کے جہت و چراغ جہاں جہاں گئے اپنی پیاری زبان اردو کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ حیدر آباد، رام پور، بنارس میں جو آثار باقی ہیں وہ گوشت و گدھا میں رہتے ہوئے اس زبان کے امین ہیں۔ یہ زبان ہندوستان کی پیاری زبان اور باہمی میل جول کی نشانی تھی۔ اس زبان سے ملتے ان کا ایمان تھا اور امتیازی تیموری اس کا مذہب و جوت ہے۔

مشرق اور باری شاعر تھے، صرف ایک حکیم مومن خان مومن کا وہ ان کو دیکھوں سے پاک تھا اور وہ اپنے کو دربار سے وابستہ نہ کر سکے حالانکہ ان کے معاصرین میں شیخ محمد ابراہیم ذوق ۱۸۹۷ء - ۱۸۵۵ء کو مستاد و شاعر کا لقب حاصل تھا اور مرزا غالب (۱۸۶۹ - ۱۷۹۹ء) قلمی نام ہیں نجم الدولہ دیرالمنک نظام جنگ کے خطابات سے یاد کئے جاتے تھے۔ اسی دور میں دلی میں انقلاب آیا اور ایسا انقلاب آیا کہ جس انقلاب نے قلمی نام کی بساط اٹھ پورے ملک کا شہادہ منتشر ہوا، ہندوستان کی زمین پکارا تھی کہ زمین سخت ہے، آسمان دور ہے

دور دار و گیر کے سلسلے کا آغاز ہوا، عزت والے ذلیل کئے جانے لگے۔ شاہ زادے چن چن کر گرفتار کئے گئے۔ ان میں سے کچھ شاہ زادے جو برہمن کی گولی کا نشانہ بنے اور کچھ نے پاؤں کی جک دلی کی کوٹوالی کے چوڑے پر تختہ دار چما۔ اور جو باقی بچے

مدھیہ پریش میں آثارِ قدیمہ کی دریافت

مدھیہ پریش کے ضلع سوگرم میں یرون کے مقام پر ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء میں کی ہوئی کھدائیوں میں چار قدیم ادارہ کی تہہ پتھریوں کے آثار ملے ہیں۔ جن کا تعلق بیتل کے دور سے ہے۔ گھر دہلی ملک ہے۔ ہر گز مشدہ آثار میں لازمی ذکر نقش نگار بنے ہوئے مٹی کے برتن، مرنے مٹی کی جینی ہوئی جانوروں کی شبیہیں، ٹالیاں، تانبے کے کتے، سام گیتا، ناگ خانڈان اور ہندوستانی مفکروں کے دور کے کتے اور لوہے کی دیگر اشیاء شامل ہیں۔ ان آثار سے بیتل کے زمانہ سے عہدِ دہلی ملک ایک مضبوط پکڑ تسلسلِ عام ہو گیا ہے

منصوبے

یہ مرادیش اسکاؤں کا، جیساؤں کا وطن
یہ مراہند، ہلوں اور کداؤں کا وطن

جنگلوں کی، یہ پہاڑوں کی، گھاؤں کی نہیں
گنگناقی ہوئی بہتی ہیں جہاں گنگ و جمن
مُسکراتا ہے جہاں دھان کی فصلوں کا شباب
یہ مرادیش! کلاؤں کی، اجنتا کی نہیں
ایک جیون ہے نیا، آنکھ عید ہر اٹھتی ہے
کال مگتہ تھا جہاں، آج، انجین گھنٹیوں کی
گاؤں کی مگتی ہوئی دھرتی ہوئی ہے آباد
یہ مرادیش! یہ کشیر دہسا لکی نہیں

سادھوؤں، سنت، رشی، لوک گھاؤں کی نہیں
شانتی، امن، ہجرت کا سکھاتی ہیں چلن
کیستیاں جھومتی ہیں، نہروں میں نکلتے ہیں گلاب
یہ مراہند! یہ گھسٹرا ہو، اورا کی نہیں
بہلہاتی ہوئی آتشاں ہیں، ہریالی ہے
بالیان جھومتی ہیں روپ کا آنچل تانیں
کارخانوں سے نکلتا ہے پگھل کر فولاد
یہ مراہند! یہ گاندھی کی اہنسا کی نہیں

ہیرا کرد، اوڑھ، سیوی یہ بھلائی، یہ ملیں
پاؤں میں پائلیں یا ندھے ہوئے بہتی نہریں
بھانجرو، نیپ بھگ، سترری اور چیرچیں
لاکھ منصوبے چھپائے ہوئے زیر دامن
جگمگاتے ہوئے بھارت کا پتہ دیتے ہیں
اپنی جاگی ہوئی قسمت کا پتہ دیتے ہیں

ان کلاؤں کو گر اور سنورتا ہے ابھی
روپ کچھ اور بھی دھرتی کا نکھرنا ہے ابھی
اوڑے ہند کے مز دور اکساؤ! آؤ
اے کلاکارو! دھواؤ! دیر جو آؤ

شکست

(پانچ مناظر کا ایک المیہ)

پرجاکش - کیا یاد را دیر ذرا دیر کی رٹ لگائی ہے۔ دو ٹھٹھتے ہو گئے
دیو پڑے میاں تم نے جا کر جڑ کی تو میں خود گھس جائیگا۔
ڈکر - نہیں باپو یہ نہیں۔

پرجاکش - بیٹا کمال ہے۔ خود بھی جا کر جڑ نہیں کرتے مجھے بھی کمرے
میں نہیں جانے دیتے۔ کیا مذاق ہے۔ میرا یاد ہے
ڈاکٹر فرخ - ساتھ اسکول میں کھیلے ہیں۔ ساتھ میڈیکل
کالج میں دھما چوکڑی بچائی ہے۔ اب اتنے دؤں بسد
تو لے کر آیا ہوں اس سے اور تم تھنا دیر بن کے کھڑے
ہو گئے۔ چلو مجھے اس کا پتہ دو۔ میں اپنے آپ بھگت لوں
ڈکر - باپو جی ذرا دیر اور۔

پرجاکش - میں رن منٹ بھی نہیں ٹیڑوں گا
ڈکر - آپ ستار کی آواز سن رہے ہیں؟
پرجاکش - ہاں ستار کی آواز سن رہا ہوں پھر۔
ڈکر - جب تک یہ ستار کی آواز بند نہیں ہوتی اس وقت تک
میں کمرے میں نہیں جاسکتا۔

پرجاکش - خوب استار تو فرخ ہمیشہ سے بجاتا ہے۔
ڈکر - اور بجاتے ہیں تو اسے جی جی سے بجاتے ہیں کہ انہیں
تو دن کا ہوش نہیں رہتا۔ اس وقت وہ اپنے آپ

کہا رہا

فرخ - ایک ماہر فن ڈاکٹر عمرہ ۳ سال

پرجاکش - اس کا دوست جو بہم عمر ہے

نیلم - ایک نوجوان اندھی لڑکی

ڈکر - بوڑھا وفادار ملازم

زمانہ : موجودہ - وقت : صبح - ایک سے پہلے

فرخ کے کمرے کے باہر پرآمدہ میں پرجاکش کسی پریشیا ہو رہے
اور ڈکر سے گفتگو کر رہا ہے

[ستار پر عین غمزہ دور سے آ رہا ہے آواز قریب آتی جاتی ہے]
پرجاکش - یار عجب آواز سی پالا پڑا ہے۔ کیوں مسٹر تم ڈاکٹر کے
یہاں کب سے ڈکر ہو؟

ڈکر - سرکار بہت دن گزر گئے۔ آپ ذرا دیر بٹھرجائیں۔
ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں

پرجاکش - رہا ت کا شکریہ کیا ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب لگا
رکھی ہے۔ تم جانتے نہیں ہو پڑے میاں وہ میرا لنگوٹیا
یار ہے۔ اس سے کہو فرخ، تمھارا باپ پرجاکش آیا ہے
بھیرد کھینا دوڑا ہوا چلا آئے گا
ڈکر - لیکن سرکار ذرا دیر.....

میں نہیں بوجھتا بوجھتا بوجھتا۔ اس وقت ان سے کچھ کہنا
چاہتا تھا۔
(ستارہ کی آواز نہ ہوا جیسا کہ ہے)

پرکاش۔ خوب جانتا ہے ظالم۔ اچھا میں تم جاؤ میں انتظار
کروں گا۔

نوکر۔ اچھا بابو۔ میں ابھی خبر کرتا ہوں۔ آپ ڈرا دیر
بیشو۔

پرکاش۔ تم جاؤ (جانے کی آواز) بلائی۔ کم بہت اڑ گیا تھا۔
میں خود گھر سے میں جا کر دیکھوں گا۔ یہ لاٹ صاحب
کیا کر رہے ہیں۔

(ستارہ پر بڑا طوفانی رنگ چھڑا ہوا ہے۔ عین اس وقت
اب لہر اپنے شباب پر پہنچ رہی ہے، پرکاش دروازہ کھول
کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سنا ہوا کہ ہے۔ اس کے لئے
ایک طرف تالین پر فرخ بیٹھا ستارہ بجا رہا ہے)

پرکاش۔ فرخ (کوئی جواب نہیں ملتا۔ ستارہ رن رہا ہے) فرخ!
پرچ (کہ) فرخ [ستارہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے]
کون ہے؟

پرکاش۔ میں ہوں پرکاش۔
فرخ۔ (سوچتے ہوئے) پرکاش [ایک دم پرکاش کی
طرف پلٹ کر دیکھتا ہے]

پرکاش۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا فرخ؟
فرخ۔ (دھڑک دھڑکے ساتھ) میرا چہرہ بڑا ہیبت ناک
ہو گیا ہے۔ تمہارا خوبصورت اور فوجان دوست
فرخ بڑا بد صورت ہو گیا ہے۔ جاؤ تم بھی اس سے
منہ موڑ کر چلے جاؤ۔

پرکاش۔ مجھے صاف کدہ دوست۔
فرخ۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا پرکاش۔ میں بد صورت ہوں
میرے چہرے پر زخم کا لہجہ سا نشان ہے۔ میرے
چہرے کا ایک حصہ جل کر الیا ہیبت ناک ہو گیا ہے

کہ جو دیکھتا ہے چیخا مٹتا ہے۔ یہ سب باتیں تو اس دن
معلوم ہو گئی تھیں جب میں لڑائی کے میدان سے لوٹ
کر آیا تھا۔ لڑائی اسپتال سے نکلے ہی آئینے نے مجھے
سب کچھ بتا دیا تھا۔

پرکاش۔ مگر یہ سب کیسے ہوا فرخ؟

فرخ۔ بہت معمولی سی بات ہے۔ جنگ کی خندق بلم کا خوفناک
دھماکا اور ایک قریب بے آسرا سپاہی۔ ہو سکتا تھا کہ
میرے بدن کے پتھر ٹکے اڑ جاتے مگر بد قسمتی سے میں
زندہ بچ گیا۔ یہ جھسا ہوا چہرہ، سیاہ داغ، زخموں
کے جھانک نشان۔ یہ ہے تمہارا فرخ۔

پرکاش۔ یاد چھوڑ دو یہی باتوں کو۔ میں تو دن رات کے کام کاج
کے پکرے ہو ہو گیا۔ سوچا چلو اپنے پاس رہے ہی آئیں۔
پرانے زمانے کی باتیں کریں گے۔ بھگوان کی قسم کیا
جوانی گزری وہی دنوں گئے۔ یاد ہے کیسا رومال شک زانہ
تھا۔ تریا کی یاد میں رات کو موم بتی کی دھندلی روشنی
میں میان فرخ ستارہ بجاتے تھے۔ اور میں چلنے
کیا اٹھتا تھا۔ گیت گایا کرتا تھا (بہت سنا ہے) کیا غزل
تھی یا۔ کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ زیادہ
ان پرکاش۔ میرے لئے اب پانی یادوں کے سوا
سب کچھ جل کر مسمم ہو گیا ہے۔ بس وہی موم بتی کی
دھندلی روشنی ہے۔ ستارہ ہے اور بیٹہ ہوتی باتوں
کے بگڑے ہیں۔

پرکاش۔ فریا کی کچھ خبر ہے؟

فرخ۔ نہیں۔

پرکاش۔ تم دو دفن نے تو بیاہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا یاد

فرخ۔ تم سمجھتے کیوں نہیں پرکاش۔ اس جھانک چہرے کے
ساتھ میں فریا کے پاس شادی کا پیغام لے کر جاتا ہوں
پرکاش۔ لیکن دنیا میں خوب صورت چہرہ ہی تو محبت کا پاسپورٹ
نہیں ہے۔

فرخ - جب میں اسپتال کی میز پر مردوں کی چڑچاڑ کرتا ہوں
 ایک پسیلیوں کی ہڈیوں کو الگ کر کے گنتا ہوں۔ اللہ
 کے گوشہ کے ایک ایک گوشے کو کاٹ کر
 دیکھتا ہوں تو میں بھی سوچتا ہوں یہ خود بخود کی کیا ہے
 یہ حسن اور اس کے چہرے کیا ہیں۔ یہ مسکراہٹوں کے
 جال، یہ دل فریب لب و لہجہ سب مجھے تماشا
 لگتے ہیں۔ یہی زندگی آپریشن تھیٹر نہیں ہے۔
 پرکاش - تم نے فریا کو بے پناہ پیار کی دولت بخشی تھی وہ مجھ
 کبھی اسے بھول سکتی ہے؟
 فرخ - پرکاش شاعر بنو۔ ہم تم اس دنیا کے رہنے والے
 ہیں۔ مجھے صدمہ ہے کہ اس دنیا میں کسی میں اتنی صفائی
 نہیں ہے کہ مجھ جیسے بد صورت انسان سے پیار کر سکے
 مجھے ہنسا رہتا ہے۔ ماں پر روز میں اپنی تہنائی کو اس
 اندیز سے کہہ میں دور کر دیتا ہوں۔ ہر رات کو سوچتی
 کی اس خواب ناک روشنی میں ستارے اس فضا کے
 ساتھ ہیں اپنے پرستے رفیقوں کی محفل سماتا ہوں اور
 چند لمحوں کے لئے اپنے ہمیت ناک چہرے کو اتار سیکھتا
 ہوں۔ میرے لئے یہی دولت بہت ہے۔
 (دروازے پر دستک)

فرخ - المرد جاؤ
 (بگڑتی ہوئی آتی ہے)
 نیلم - (دروازے پر) آپ نے کیوں مجھے ٹوک کر اس کمانے
 کے لئے بجا لیا ہے۔ آپ نے مجھے مر جانے دیا ہوتا۔
 ایک اچھی روٹی کو بچا کر آپ کو پڑی روٹھ دلی کاؤنڈو
 پیش کیا تھا۔ اللہ کے واسطے مجھے زہر دے دیجئے مجھے
 موت چاہیے۔
 (بھونچا ہوا گردنے لگتی ہے)
 فرخ - کیا ہو نیلم۔ دیکھو اس قدر پریشان نہ ہو۔ تم
 تو بڑی ہمسار روٹی ہو

نیلم - یہ سب بھوٹ ہے۔ سب بھوٹ ہے۔ میں بہت بڑوں
 ہوں۔ لہذا ہوں۔ میری آنکھیں نہیں ہیں۔
 فرخ - نیلم، نیلم، میری ہمسار نیلم۔ آؤ میرے پاس آکر
 بیٹھ جاؤ۔
 نیلم - نہیں، کہیں نہیں بیٹھوں گی۔ جب قدم بڑھاتی
 ہوں بھی ٹوکر کھاتی ہوں۔ دوسرے آپ کے کمرے کی
 طرف آنا چاہتی تھی مگر قدم قدم پر نہ جاتے کسی
 چیز سے ٹکراتی ہوں۔
 فرخ - تم نے مجھے بلایا ہوتا۔
 نیلم - میں اس زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔ میں کب تک اس
 اندیز سے میں ٹیکتی رہوں گی۔ میں کہتی ہوں آپ نے
 مجھے پناہ دی۔ آپ نے مجھے کیوں نہ مرنے دیا؟
 فرخ - مایوسی کی باتیں نہیں کیا کرتے نیلم۔
 نیلم - نہیں، نہیں، نہیں، میں اس طرح زندہ رہنا نہیں
 چاہتی۔ مجھے میری آنکھیں واپس دے دیجئے۔ آپ تو
 ڈاکٹر ہیں۔ آپ میرا اتنا کام نہیں کر سکتے۔ تو پھر مجھے مر
 جانے دیجئے۔ میں دنیا میں تماشا بننا نہیں چاہتی۔
 (بھونچا ہوا گردنے لگتی ہے)
 فرخ - مرنے دو۔
 پرکاش - تمہاری آنکھیں اچھی ہو جائیں گی۔
 نیلم - آپ کون ہیں؟
 پرکاش - میں پرکاش ہوں۔
 فرخ - میرا بچپن کا دوست اور کالی کاسکتی۔
 نیلم - میں بہت بُری ہوں، ڈاکٹر باو بہت بُری ہوں۔
 میں یہ بھی تو نہیں دیکھ پاتی کہ آپ کے پاس دوسرا
 آدمی بیٹھ ہوا ہے۔ مجھے یہ سب باتیں نہیں کہنی چاہیے
 تھیں۔ میں بہت بُری ہوں۔ مجھے کچھ بھی دکھائی
 نہیں دیتا۔
 فرخ - نہیں نیلم۔ یہ دوسرے آدمی نہیں ہیں۔ یہ اپنا پرکاش ہے

نیلیم - کیا سوچتے ہوں گے اپنے بی بی - مجھے صاف کر دیجئے

ڈاکٹر بابو - میں نے پتہ نہیں کیا کیا کہہ ڈالا۔

فرخ - رہنسی کر (پنگلی)

نیلیم - پرہش بابو - ڈاکٹر بابو تو فرشتہ ہی فرشتہ۔

اخذن نے مجھے اس وقت آسرا دیا جب ساری دنیا

نے مجھے تنہا دیا تھا۔ میں موت کی گود میں بیٹھا بیٹھا جا

ہی تھی۔ انہوں نے بے فکر لڑاؤ نہ آجرا کو

آسرا اور ایک منٹس لڑکی کو عزت دی۔

فرخ - پرکاش - اس بنگی کی باتوں پر نہ جانا۔ مجھی میری

تقریب کرتی ہے۔ کبھی مجھے بڑا بھلا لگتی ہے۔

دیوانی ہے دیوانی۔

نیلیم - پست پرچہ دیوانی ہی تھی۔ جب میرے باپ کی

لاش ریل کے ٹکڑا جانے کے بعد ڈاکٹر بابو کے

پاس آئی تھی تو پست پرچہ میں پاگلی تھی۔ میرا اس دنیا میں

کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اپنے باپ کے پیچھے موت کی

گود میں چلی جاتی تو ڈاکٹر بابو نے اس سے آسرا لڑکی کو

پچایا۔ مجھے اپنے گھر میں رکھا۔ اچھے سے چھانکنے کو

دیا۔ میرے آرام کا ایسے دھیان رکھا کہ مجھے میں ہی گھر

کی مالک ہوں۔ مجھے اتنا پیہ دیا کہ یہ عالم دنیا بھی مجھے

پیاری لگنے لگی۔ میرا بھی بی پائے لگا کر کاش میسری

آنکھیں ہوتیں۔ میں بھی اس دنیا کو کھسکتی۔ لاٹو

پرکاش - کیا یہ سب آنکھوں والے دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں

داؤں میں بھی بہت سے اندھے ہوتے ہیں نیلم۔

نیلیم - ایسے وہ دنیا میں بڑے سہارے چل سکتے ہیں۔ وہ قدم

قدم پر ٹوٹ کر تو نہیں کھاتے۔

پرکاش - نہیں چھوڑتے انہوں والے اندھ کر کھاتے ہیں۔

نیلیم - وہ اپنے احساں کرنے والوں کی صورت کو دیکھ پاتے ہیں

وہ ان کی خدمت کو کر پاتے ہیں۔ میں تو ڈاکٹر بابو کو

دیکھ بھی نہیں سکتی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ فرشتہ

کہتے ہوتے ہیں ؟

فرخ - نہیں نیلم۔ ایسی باتیں مت کرو۔

نیلیم - کیوں نہ کروں۔ میں جیتنے آپ بی میری خدمت کرتے

رہی اور میں کچھ نہ کروں۔ نیلم نے وعدہ نہیں کیا ہے

تو۔ میتال ہے ڈاکٹر بابو سیدے گھر چلے آ رہے ہیں۔

نیلیم کی پرہاش کا وقت ہے تو ڈاکٹر بابو نے سارے کام

چھوڑ دئے ہیں۔ اے اللہ نیلم سارے زمانے کا

بوجھ ہی کر رہ گئی ہے۔

فرخ - ادھر تو کر کہہ رہا تھا کہ تم نے کھا نہیں کھایا ہے۔

نیلیم - ان نہیں کھایا ہے پھر!

فرخ - آخر۔ کیوں نہیں کھایا

نیلیم - میری مرضی۔ جھوک نہیں گی۔ نہیں کھایا۔

فرخ - اس گھر میں ہر بات میں تمھاری مرضی نہیں چلتی۔

جانتی ہو نا؟

نیلیم - جانتی ہوں ٹھکانا نہیں کھاؤں گی۔

فرخ - کھانا تھیں مزدور کھانا ہوگا۔ تم جھوک بڑا تالی کر کے

میرے گھر میں جان دنیا چاہتی ہو؟

نیلیم - میں ہرگز کھانا نہیں کھاؤں گی! ہرگز نہیں کھاؤں گی۔

نیلیم - نہیں تو مجھ سے وعدہ کیجئے۔

فرخ - کیا وعدہ کروں؟

نیلیم - وعدہ کیجئے کہ آپ میری آنکھیں مجھے واپس دلا دیں گے۔

فرخ - میں خدا نہیں ہوں نیلم۔ خدا کا عہد بندہ ہوں۔

نیلیم - وعدہ کیجئے۔ آپ اس کی کوشش کریں گے۔

پرکاش - یہ بات ٹھیک ہے۔ کوشش کا وعدہ کرے میں کیا

پرہیز ہے۔

نیلیم - وعدہ کیجئے۔

فرخ - دیکھیں کہ میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ تم جانتی ہو نیلم

میں تمھیں کس قدر سزا دے رہا تھا۔ کیا تمھیں مجھ

پر دانا ہی بھروسہ نہیں۔

نیلیم - پورا ہروسہ ہے۔ مگر مجھے اپنی آنکھیں داپس مل جائیں۔

میں اس اندھیرے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

فرخ - تم لوگ ڈاکٹر کو سمجھنا کیا ہو۔ وہ تو ایک معمولی سپایرہ

ہے جو ایک بڑے کارخانے میں اپنی جگہ کام کر رہا ہے۔

اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ وہ بالکل بے بس

ہے وہ یقیناً شفا نہیں دے سکتا۔ کبھی کبھی شفا کا آسرا

بھی نہیں دے سکتا۔

نیلیم - خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کرو۔ میں صرف اسی امید پر

زندہ ہوں کہ ایک بار اپنے عمن کو دیکھ سکوں گی اور

اس کے قدموں میں آنکھیں بچھا کر.....

فرخ - (بات کاٹ کر) میں تمہارا عمن نہیں ہوں نیلیم۔ میں نے

اپنے اوپر احسان کیا ہے۔ تم میری پناہ میں نہ آؤ

ہو میں تو میں انسانیت پر سے ہروسہ کو ہٹاتا۔

پرکاش - میرے خیال میں آپ دونوں کھانا کھا لیجئے۔

فرخ - چلو نیلیم۔ میرے ماتھے کا ہسار لاو۔ چلو میں تمہیں

تمہارے گھرے تک پہنچا دوں۔

نیلیم - اچھا تو آپ کی مرضی۔

فرخ - مجھے غلط نہ سمجھو نیلیم۔

نیلیم - تو مجھے عمر بھر اسی طرح اندھیرے میں چٹکنا ہوگا۔ مجھے

میری آنکھیں داپس نہیں ملیں گی۔ چلے میں تیار ہوں۔

آپ کہاں ہیں۔ آئیے مجھے ہسارادائیجئے۔ مجھے گھرے

تک پہنچا دیجئے ڈاکٹر بابو۔

[دونوں چلے جاتے ہیں۔ گھرے میں صرف پرکاش رہ

جاتا ہے۔ اور غصہ ڈی دیر کے بعد گھٹتی جاتا ہے]

نوکر۔ آپ نے بلایا تھا۔

پرکاش - جی ہاں۔ میں نے بلایا تھا۔ بڑے میاں کیا تمہارے

گھر مہمان کی خاطر کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے؟

نوکر۔ جی سہارا۔ ہم تو ہماؤں کی بڑی خاطر کرتے ہیں۔

پرکاش۔ خاطر کرتے ہو۔ اسے بھی اتنی دیر سے بیٹھا ہوا

ہوں۔ کھانے کا ذکر آتا ہے اور کوئی مجھے کھانے کو

نہیں پوچھتا۔ نہ چل پان ہے نہ چائے پانی ہے۔

آخر سر یہ معاملہ کیا ہے۔

نوکر۔ ابھی نیلیم بی بی نے کھانا نہیں کھایا ہے صاحب۔

پرکاش۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مہمان بھی قاتلہ مر جائیں

خوب۔ برا اچھا دستور ہے تمہارا۔

نوکر۔ آپ نہیں جانتے۔ بابو صاحب۔ ڈاکٹر بابو اس

وقت تک کھانا نہیں کھاتے جب تک نیلیم بی بی نہ

کھائیں۔ ان کا جی ذرا بھی میلا نہیں ہونے دیتے۔

بے چاری غریب لڑکی تھی۔ خدا کی قسم بابو جی جب

میاں آئی تھی تو میں پریشانیت کرنا تک نہ تھا چیتھڑے

لگے تھے چیتھڑے۔ ڈاکٹر بابو نے بے چاری اندھی لادار

لڑکی پر رحم کر کے اسے راق بنا دیا۔ اس کی ذرا تکلیف

نہیں دیکھ سکتے۔

پرکاش۔ وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔

نوکر۔ ہاں بابو جی۔ اور سچ بھی کہے۔ ان بے چاروں کا اب

کون سمجھا ہے دنیا میں۔ کوئی آگے نہ بڑھے۔ بے دے

کے یہی لاوارث لڑکی ہے۔

پرکاش۔ تم نے دہ شل سنی ہے بڑے میاں۔

نوکر۔ کون سی شل سرکار

پرکاش۔ قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔

نوکر۔ سنی تو ہے۔

پرکاش۔ تم ہو قاضی جی کے گھر کے چوہے، سمجھو میر دوست؟

میں بھوک بھوک چلا رہا ہوں اور تم مجھے دنیا

بھر کے پیچھے سے سنا رہے ہو۔ دیکھو بھائی چاہے

نیلیم بی بی کھانا کھائیں یا نہ کھائیں۔ قاتلہ کریں یا

بھوک بھوک کریں۔ تم میرے کھانے کا فوراً انتظام

کرو۔ میں دنیا کے سارے مذاہب سہو لگا بھوکا

نہیں رہ سکتا۔

فرخ - میں پچھری جانتا تھا۔ اودھ چاہتا شروع کر دیا۔

اچھا اچھا بڑے میاں تم جاؤ۔ اس کم بخت کے کھانے کا اختتام کرو۔

نوکر - بہت اچھا حضور۔

فرخ - یار تم ایک اپنچ نہیں بدلے پرکاش۔ بالکل دی ہو۔

دی ہو جہک جہک پتلے ہو۔ اسی طرح بالکل اسی طرح۔

پرکاش - تم تو بہت بدل گئے ہو فرخ۔ میں تو ابھی تک تمہارے مسٹر پرغور کر رہا ہوں۔

فرخ - کون سا مسٹر؟

پرکاش - بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ راز کیا ہے۔ یہ خاتون کی بیٹی

فرخ - یہ بے آسرا اندھی لڑکی جسے میں نے اپنے گھر میں پناہ دی۔

پرکاش - اس سے شادی کرو گے؟

فرخ - نہیں کہہ سکتا۔ ان اگر یہ سمجھیں گا کہ میرے لئے اس

کے دل میں ذرا سی بھی جگہ ہے تو ہزار شادی کر دے گا۔

پرکاش - چلو تمہارے دل میں تو اس کے لئے جگہ ہے۔

فرخ - میرے دل کی کیا بات کرتے ہو۔ اس اندھی لڑکی کی

طرح میرا دل بھی بے بہار ہے۔ اسکی کا بہار چاہیے

پرکاش - اس پر تو مجھے اور تعجب ہوتا ہے۔

فرخ - کیا کسی بے آسرا آدمی کا بہار چاہنا پسینے کی بات ہے۔

پرکاش - گرد بڑھمت کرو۔ میری بات کا جواب دو۔ تم منسلک کو

عزیز رکھتے ہو۔

فرخ - بہت زیادہ۔

پرکاش - اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتے ہو۔ اس کے دل پر بھی

میل نہیں آنے دیتے

فرخ - ہاں۔

پرکاش - پھر بھی اس کی سب سے بڑی خوشی کو پورا کیوں نہیں کرتے

فرخ - کون سی خوشی؟

پرکاش - وہ اپنی آنکھیں تم سے واپس مانگتی ہے۔ تم اسے میناؤ

دے سکتے ہو۔ یہ مت کہو کہ تم مجھ کو دے دو۔ مجھے معلوم ہے

کہ تم آنکھوں کا کتنا اچھا آپریشن کر چکے ہو۔ کالج میں بھی تمہارا

خاص سیکٹ سر جی ہی تھا۔

فرخ - پرکاش!!

پرکاش - میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہیں اس کی ہر خواہش عزیز

ہے مگر اس کی سب سے بڑی تمنا کو تم پاؤ تے روتے

سے بھی نہیں چوکتے۔

فرخ - اس کی وجہ پوچھتے ہو۔

پرکاش - ہاں۔

فرخ - پرکاش تمہارا دوست فرخ کیسے اذلیل اور خود غرض

ہے۔ کیا اس کی یہی وجہ کافی نہیں ہے۔

پرکاش - تم اور خود غرضی؟

فرخ - ہاں میں خود غرض ہوں۔ میں وہ ڈوبنے والا انسان

ہوں جو تنگ کا ہمارے کو دریا پار کرنا چاہتا ہے

میں نے تسلیم کو اس لئے نہیں کیا کہ وہ بے ہمتا رہتی۔

میں نے اسے اس لئے پناہ دی کہ میں بے ہمتا تھا۔

اور اگر تمہاری اس ہی چوڑی دنیا میں کوئی ایسا دل ہے

جو مجھ سے عقیدت رکھتا ہے تو وہ تسلیم کا دل ہے۔ میں

بہت مغض ہوں پرکاش۔ کیا تم چاہتے ہو

دُعا دینا بند ہو جاتی ہے (کہ اسے بھی آنکھیں مل جائیں

وہ بھی میرے خوفناک چہرے کو دیکھ کر تمہاری طرح

دیجے مارے اور نفرت سے منہ پھیر کر ہمیشہ کے لئے میری

زندگی سے باہر چلے جائے۔ تم چاہتے ہو میں اسے آنکھیں

دے دوں۔ اور اپنی دنیا کی ساری روشنیوں کی

دوں۔ میری دنیا ہمیشہ کے لئے ویران ہو جائے یہاں

کوئی ستارہ نہ چمکے۔ یہاں کوئی گیت نہ گائے۔

یہاں کوئی پھول نہ کھلے (دیجے کہ میں ایسا نہیں ہوں

دونوں کا۔ اسے ہرگز آنکھیں نہیں ملیں گی۔

پرکاش - میرے دوست۔ میرے دل بھی دوست۔

فرخ - (تکے ہونے انداز میں) میں بھی انسان ہوں۔ مجھے

بھی خوش ہوئے لائق حاصل ہے۔ ہرے بیٹے میں بھی وہ ہے
تم چاہتے ہو کہ اس دل کو پاش پاش کر کے اسے بیٹے سے
باہر جھینک دوں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا پرکاش۔
دو کر ٹھہرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر - سرکار - سرکار

پرکاش - فرخ - کیا ہوا ہے نصیں - کیا ہو گیا ہے نصیں۔
ڈاکٹر - ڈاکٹر! پوکے بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا۔ اب ذرا انھیں ٹانگ
پر لٹا دیجئے۔ میں اسپتال سے کسی ڈاکٹر کو بلاؤں۔
پرکاش - کیا یہ دورہ پہلے بھی پڑا تھا۔
ڈاکٹر - ہاں کبھی کبھی پڑتا ہے۔
پرکاش - بے چارہ فرخ - بے چارہ

(دو سرا منظر)

د م م کہہ - بیٹا! برف پریشان سا بیٹھا ہوا ہے۔ بیٹا نوکے
سُربے ڈھنگے اور بے ترتیب انداز سے رچ رہے ہیں۔ کبھی
تیزی سے کبھی آہستہ۔ بجلی کوئی اپنے پریشان دماغ کو بیانو
کے ان بے ترتیب سروں سے تکیں چوڑے کی نالام کوشش
کر رہا ہو)

(دو اندازے پر دستک)

نیل - میں اندازہ اسکتی ہوں؟

(کوئی جواب نہیں ملتا۔ بیٹا نوکے سر ایک لمحہ کے لئے بجے
بستہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح فرخ بیٹا نوکے مختلف پڑوں
پر انگلیاں پھیرنے لگتا ہے)

نیل - ڈاکٹر! ڈاکٹر! ڈاکٹر صاحب

فرخ - (چونک کر) کون؟ اے تم ہو نیل۔ آؤ اندر چلی آؤ
ہائیں! تھکے پر میز رکھی ہے اس سے چمچتی ہوؤ۔

نیل - آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر! یہ آپ کیسی مٹلی سیدھی
بائیں کر رہے ہیں؟
فرخ - کچھ بھی نہیں ہوا نیل۔

(بیٹا نوکے سر میرے اٹھتے ہیں)

نیل - آپ تو مجھ سے بات نہیں کرتے۔ اسپتال سے آکر سیدھے
میں بند ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ مجھے
روزی طرح ستا نہیں سکتاتے۔

فرخ - میں نے ستا نہیں کھایا۔ اچھا۔ ابھی ستا رہا تھا ہوں۔
نیل - مجھے ستاؤ کی فکر نہیں ہے۔

فرخ - تو جیسے۔

نیل - آپ اس قدر کھوئے کھوئے کیوں ہیں۔ آپ اپنے کو اتنا
ڈکھ کیوں پہنچا رہے ہیں۔

فرخ - کچھ بھی تو نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ... دراصل
بات یہ ہے کہ ان دنوں فرصت نہیں ملتی۔

نیل - کھانا کھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

فرخ - ہاں۔ تم اسپتال کا کام نہیں جانتی۔ کبھی ڈاکٹر کو سانس لینے
کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

نیل - اچھا۔ اب اٹھئے۔ چل کر کھانا کھا لیجئے۔

فرخ - مجھے تنگ نہ کر دینیل۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

نیل - آپ تنگ کر رہے ہیں مجھ۔ میں بے چاری آپ کو کیا
تنگ کروں گی۔ اب اس وقت کیا کام کر رہے ہیں کہ آپ
کو فرصت نہیں ہے۔

فرخ - میں اس وقت بھی بہت کچھ کر رہا ہوں۔

نیل - میں بھی تو سون

فرخ - سوچ رہا ہوں۔ بہت کچھ سوچ رہا ہوں

نیل - (تمہارے لگا کر) آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ کو میری جگہ
کی قسم چل کر کھانا کھا لیجئے۔

فرخ - میں کہتا ہوں نیل مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے
سوچنے دو۔

نیل - اب آخر آپ پاہتے کیا ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میں چلی
جاؤں ایک اندھی بے آسرا لڑکی کو پھر بے رحم دنیا میں
جھینک دینا چاہتے ہیں۔

فرخ - میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو۔

نیلم - اچھا تو میں بھی ہوں۔ میں ابھی ہی جاؤں گی یا چاہے مجھے دیر کی ضرورت ہی کہوں دکان نا چڑی۔ اچھا خدا حافظ۔

فرخ - کہاں جا رہی ہے بیگم؟

نیلم - مجھے چھوڑ بیٹھے۔ مجھے جانے دو بیٹھے۔

فرخ - نہیں نیلم۔ مجھے ابھی تو سب سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ بڑی بات کا جواب دینا ہوگا۔

نیلم - آپ کو فرصت کہاں ہے مجھ سے بات کرنے کی۔

فرخ - فرض کرو نیلم میں جا دو گروں اور اپنے جامعے سب کچھ پا سکتا ہوں۔

نیلم - دیکھتے ہوئے جا دو گرو

فرخ - ان - اور جا دو یہ نیلم کو اس کی آنکھیں واپس دلا دوں۔

نیلم - پیسہ بچ گیا میں دوبارہ دیکھ سکتی؟

فرخ - فرض کرو تم کو کھاری آنکھیں واپس لی جائیں تو کیا کرو گی

نیلم - میں اپنے ڈاکٹر باپ کے قدموں پر۔

فرخ - بات لا کر نیلم ایسا مت کہو۔ کیا تم اس کے بعد بھی

مجھ سے قریب رہ سکو گی۔ ان لوہیں بہت بُرا ہوں۔ میں

بہت ہی بدصورت ہوں۔ کیا تم چہرے مجھ سے نفرت

نہیں کرو گی۔

نیلم - یہ نہیں ہو سکتا ڈاکٹر باپ۔ ایسے میرا دل دالے سے کوئی

نفرت کر سکتا ہے۔ تم بد صورت نہیں ہو سکتے۔

فرخ - کیا تم برا بھلا کہہ رہی ہو؟

نیلم - ان ڈاکٹر باپ اگر میری آنکھیں تھیں بد صورت یا میں کی تو

میں ان آنکھوں کو چھوڑ ڈالوں گی، انہیں نکال کر تھارے

قدموں پر چڑھا دوں گی

فرخ - نیلم۔ رسلانہ کہو۔ میں پاکی ہو جاؤں گا۔

نیلم - تم انسان نہیں ہو باپ فرشتہ ہو۔ اگر تم انسانی ہو تو

ایسے انسانوں کو سمجھ کرنا روا ہے۔

فرخ - میں نے فیصلہ کر لیا ہے نیلم۔

پیرکاش - دکایاں بجاتے ہوئے، میں ہی فیصلہ کر لیا۔ اب یہ بھی

بتاؤ کہ فیصلہ کیا ہوا؟

فرخ - پیرکاش۔ تم آگے۔ اچھے وقت پر آئے ہو۔

نیلم - پیرکاش باپ۔ میری آنکھیں۔

فرخ - (بات کاٹ کر) ان پیرکاش نیلم کو اس کی آنکھیں ملیں گی۔

میں چاندی میں ہیں آپریشن کروں گا۔ نیلم اب اندھی

نہیں رہے گی۔

نیلم - اب میں ڈاکٹر باپ کو دیکھ سکتی گی۔

پیرکاش - مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ ارے بڑے میاں کہاں چلے

گئے۔ نہ کھانے دنے کا کوئی ذکر ہے نہ مٹھائی کا جیچا ہے۔

فرخ - چلو ہم سب کھانے کی کمرے کی طرف چلیں۔ آج سے

ایک ماہ بعد جب ہم اس کمرے میں پھر آئیں گے تو

نیلم کی آنکھیں ہوں گی۔

(تیسرا منظر)

(ایک ماہ بعد اسی کمرے میں)

[قدسے وقت کے بعد دعا گوشتی - پھر گھنٹے کے پانچ

بجائے کی آواز - بدگو گھنٹے والی ٹنگ ٹنگ ہونے کی

آواز۔ تھوڑی دیر کے بعد سوائے ٹنگ ٹنگ کے اور کچھ

سنائی نہیں دیتا]

فرخ - پیرکاش۔

پیرکاش - کیا بات ہے دوست؟

فرخ - میرا بیٹا ڈر رہا ہے پیرکاش۔ آخر وہ لہو پہنچا،

جس کا مجھے ڈر تھا۔ منزل قریب آگئی۔

پیرکاش - کس بات سے گھبراتے ہو۔ تم نے بہادر روئی کی طرح

زندگی کو جیل ہے۔ ایسے بہت نہ لاؤ۔

فرخ - آپریشن کا میاب ہو گیا۔ اب سے ایک گھنٹہ کے بعد

نیل کی آنکھوں کی پٹا کھول دیا جائے گی۔ پھر کیا ہوگا پڑاؤ
پھر میرا کیا ہوگا۔

پیرکاش۔ اس کی آنکھوں کی پٹیاں آج کھلیں گی۔

فرخ۔ آج اور ابھی۔ اب سے ایک گھنٹے کے بعد۔ میں نہیں
چاہتا کہ وہ مجھے دیکھے۔ تم اسپتال جا کر اپنے سامنے
اس کی آنکھوں سے پٹیاں کھلوانا۔ میں ابھی چند روز اس
سے ملوں گا۔

پیرکاش۔ جیسے تمہاری مرضی

فرخ۔ تم آج تسکین دلاتا۔ آسان کا سب سے خوبصورت منظر
دکھانا۔ اسپتال کے کمرے کی بائیں کھڑکی سے شفق کے
خوبصورت رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ درجیب کھونا۔
پھر روتے ہوئے سورج کا وہ دل فریب رنگ اس
کی آنکھوں کے سامنے بکھر جائے گا۔

پیرکاش۔ اور تم کیا کرو گے یہاں

فرخ۔ مجھے ابھی بہت کام ہے۔ مجھے ابھی اس کمرے کو سجانا ہے۔
میں جب تم پر اسے لے کر یہاں آؤ گے تو یہ کمرے وہیں
کی طرح سجائے جا چکے ہوں گے۔ پھر رات کو مجھے پوسٹلٹ
کی رپورٹ لکھنی ہے۔

پیرکاش۔ کیا تمہیں اسپتال جانا ہے۔

فرخ۔ ہاں میں نیلم کے کمرے میں صوف چنڈر کے فاسٹل پر
ہوں گا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں گا کہ نیلم کی
نئی آنکھوں نے پہلی بار اس دنیا میں کیا دیکھا ہوگا۔
اس نے اس دنیا کے بارے میں کیا کچھ سوچا ہوگا۔ اب
تم جاؤ پیرکاش وقت ہو گیا ہے۔ خدا حافظ

پیرکاش۔ اچھا میں چلتا ہوں

فرخ۔ بیٹے سیان اپنے میاں !!

نوکر۔ سرکار۔ ابھی آ کر سرکار

فرخ۔ تم بہت سست کام کرتے ہو بیٹے میاں۔ ابھی تک
گول کمرے کے کھانا میں پھیل تک نہیں لگے ہیں۔ یہ

پردے نہیں بدلے گئے ہیں۔ آخر نئے پتلی پردے
کس دن کام آئیں گے۔ یہ قالین ابھی تک اس طرح
پٹنا پڑا ہے۔ چلو۔ جلدی کرو۔

نوکر۔

فرخ۔ ٹھیک ہو جائے گا تمہارا سر۔ ابھی اتنا بہت سا کام
پڑا ہے اور وقت بہت کم ہے۔ تم جانتے نہیں ہو
آج میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے۔ آج
نیل کو اس کی آنکھیں دہلیں دی جائیں گی۔

نوکر۔

جو ان سرکار۔ خدام باریک کرے۔ آپ کے قدموں کی پر
ت نیلم بٹائی کی بڑی یں بن جائے گی۔
فرخ۔ اس کو بھی کہ ایک ایک درو دیوار کو سجادو۔ ہر کمرے
کو دہلیں بنا دو۔ ہر گلاب کو پھولوں سے گلزار کر دو۔ ہر
فانوس کو روشنی سے جگمگا دو۔ آج میرے ہنرے خواب
کی تیسرا دن ہے۔ نیلم آئے تو دیکھے دنیا کس قدر
خوبصورت ہے۔

(چوتھا منظر۔)

[اسپتال کا کمرہ۔ نیلم اپنے بستر پر لیٹی ہوئی پٹیوں کے
کیلے کا انتظار کر رہی ہے]
دھندلے چہرے پر جاتے ہیں۔ پھر ٹھیک کی آواز وقت کے
احساس کو زیادہ نمایاں کرتے گئے ہیں۔

نیل۔

(خوشی سے بلے چیں ہنکر) چھ بج گئے۔ نرس ڈاکٹر
تم سب لوگ کہاں ہو؟ کہاں ہو؟ تم سب لوگ
میری آنکھوں سے پٹیاں کھولو۔ مجھے میری آنکھیں
واپس دے دو۔ آؤ، جلدی آؤ۔

پیرکاش۔

نیل۔ اس قدر جلدی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم خاموشی
کے ساتھ لیٹی رہو۔

نیل۔

میں نہ جانتے کب سے اس طرح خاموشی کے ساتھ
لیٹی ہوں۔ اس گھڑی کا اتنا فرق تو رہی ہوں۔ اب

پیرکاش - ابھی ہم کھر چلیں گے۔ تم خود دیکھ لینا۔
 نیلم - پیرکاش یاو۔ دنیا واقعی خوبصورت ہے۔ وہ سامنے

ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی۔ یہ رنگینی۔ یہ سجاوٹ
 کسی کسی پیاری ہے یہ دنیا۔ میں نے تو اس کی
 رنگارنگی بالکل ہی کھودی تھی۔ مجھے ڈاکٹر یاو کے

پاس سے چلو۔ میں اپنے دیوتا کے قدموں پر گر کر ان کا
 شکریہ ادا کروں گی۔
 پیرکاش - ان ہم جلدی ہی چلیں گے۔

پیرکاش - ابھی تمہاری آنکھوں سے پٹیاں کھولی جائیں گی۔
 نیلم - خدایا تیرا شکر ہے۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ پٹیاں
 کھولنا شروع کیجئے ڈاکٹر صاحب۔

پیرکاش - تو تیار ہو جاؤ۔ پٹیاں کھولی جا رہی ہیں۔ (پٹیاں کھلی
 جاتی ہیں)

نیلم - آؤ کار میں ڈاکٹر یاو کو دیکھ سکوں گی۔ میں انہیں
 دیکھوں گی۔

پیرکاش - انہیں کھو نیلم۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھلو۔
 نیلم - میں دیکھ سکتی ہوں۔ آہ میرے خدایا دیکھ سکتی ہوں۔
 ڈاکٹر یاو۔ ڈاکٹر یاو تم کہاں ہو۔ میں دیکھ سکتی

ہوں کوئی مجھے بتاتا کیوں نہیں ہے۔ ہمسایہ
 ڈاکٹر یاو؟

پیرکاش - وہ یہاں نہیں ہیں نیلم۔ ایسی بچی نہ ہو۔ اب ہم گھر
 چلیں گے تو ڈاکٹر یاو سے ملیں گے۔

نیلم - ڈاکٹر یاو لے میری آنکھیں واپس دلادیں۔ اتنی بڑی
 خوشی بخشی ہے۔ انھوں نے! اور میری زندگی کی اس

سب سے بڑی خوشی کے وقت وہ آئے کیوں نہیں ہیں
 انہیں کبھی محاف نہیں کروں گی۔ کبھی بھی محاف

نہیں کروں گی۔
 پیرکاش - نہیں نیلم وہ تم سے بھی زیادہ خوش ہیں۔ انھوں
 نے تمہارے لئے سارے گھر کو دہن کی طسرت

سجا رکھا ہے۔
 نیلم - جیسے!

پیرکاش - ابھی ہم کھر چلیں گے۔ تم خود دیکھ لینا۔
 نیلم - پیرکاش یاو۔ دنیا واقعی خوبصورت ہے۔ وہ سامنے

ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی۔ یہ رنگینی۔ یہ سجاوٹ
 کسی کسی پیاری ہے یہ دنیا۔ میں نے تو اس کی
 رنگارنگی بالکل ہی کھودی تھی۔ مجھے ڈاکٹر یاو کے

پاس سے چلو۔ میں اپنے دیوتا کے قدموں پر گر کر ان کا
 شکریہ ادا کروں گی۔
 پیرکاش - ان ہم جلدی ہی چلیں گے۔

(پانچواں منظر)

[ڈاکٹر کے کمر کا ڈرائنگ روم]

نیلم - ادھ۔ کتنا سچا یا ہے یہ گھر۔ یہاں کی ہر چیز جی ہوئی
 ہے۔

نوکر - بی بی مبارک ہو۔ آنکھیں مبارک ہوں۔
 نیلم - ان بابا۔ ڈاکٹر یاو کی ہر بات سے مجھے سچ سچ آنکھیں

مل گئیں۔ میں اب وہ دیکھ سکتی ہوں۔ یہ گلاب کے
 برگے ادھ۔ میں توان کی خوشبو ہی سونگے جاتی تھی

انہیں کبھی دیکھ نہ سکی۔ محل کے خوبصورت پردے۔
 یہ گلدان یہ فانوس۔ آہ میری زندگی کا سب سے پیارا

دن ہے۔ ڈاکٹر یاو۔ ڈاکٹر یاو۔ تم سچ فرشتہ
 ہو۔ کہاں ہیں ڈاکٹر یاو؟

پیرکاش - ان پرشے میان فرخ کہاں ہیں؟
 (نوکر خاموش رہتا ہے)

نیلم - بولتے کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہو؟
 نوکر - کچھ بھی تو نہیں۔

نیلم - خدشا راکھ تو ہو۔ میرے ڈاکٹر یاو کو کیا ہوا
 پیرکاش - کہاں ہے فرخ؟

نوکر - یہ خط دے گئے ہیں
 پیرکاش - خط۔ کیا خط ہے یہ لاڈلیوں دیکھتا ہے)

ماٹی ڈیر پر لکاش

آج تیلہ کو آنکھیں مل گئی ہوں گی۔ اسے میری مبارک باد پہنچا دیتا۔ میں چار ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تیلہ کے دل میں جو میرا تصور ہے اسے مروج گردن اور وہ اکیلا دل جسے میں اپنی محبت سے سمور رکھتا چاہتا تھا۔ مجھ سے نفرت کرتے گئے۔ تم بھی یہ راز اس پر ظاہر نہ کرنا کہ اس کا من ایسا بد صورت اور خود غرض انسان ہے جس سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ میں نے

عوض سے جو تاج مل بنایا ہے اسے اس طرح نیت دنا بد نہ کر دیتا۔ میں ہمیشہ کے لئے چار ہوں۔ زندگی بہت سفاک ہے اور انسان سب کچھ نہیں پاسکتا۔ اب میں نے اپنی جمہوریوں سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ خدا حافظ

تھارا
فرخ

نیلہ۔ ڈاکو! ڈاکو! ڈاکو! ڈاکو!

غزل

راجندر بہادر مہوج

مکن نہیں چو پانا شاہی و سروری میں	اک کیفیت مستقل ہے وہ تیری بسندگی میں
وہ جس کو ڈھونڈتی ہے جہنم خودی میں دنیا	میں اس کو پا چکا ہوں محبت بخودی میں
نکر حصولِ جنت، افکارِ دین و دنیا	کیا کیا کرے اک انسان تھوڑی سی زندگی میں
لاٹریں کے ساتھ اچھے لوگوں کے ساتھ کھیلے	ایسے ہی دورائے پھولوں کی زندگی میں
دنیا ابھی نہیں ہے انسانیت سے خالی	ہمسرد و فلہے اب بھی لیکن کسی میں
ان کی طلب نے اب تو یہ حال کر دیا ہے	اپنی ہنسی خوشی ہے ان کی ہنسی خوشی میں
موت اتنی ہے حقیقت ہنگامہ جہاں کی	جس خاک سے اٹھے ہیں مل جائیں اسی میں
پنہاں تھے اس کے جلوے ہر ایک شے میں لیکن	ابھی رہیں نکاح میں دنیا کی دل کشی میں
تو اس کو ڈھونڈتا ہے دیروحم میں ناداں	جو سکرا رہا ہے ہر پھول ہر گل میں

دنیا نے آرزو کا اسے مہوج یہ سلاطم

ایسا نہ ہو کہ غم ہو کشتی دل اسی میں

ریڈیم

کے سر ہے جس نے آسٹریلیا میں اسدہات کے نمکوں کو
پچ بلینڈ سے ۱۸۹۸ء میں سب سے پہلے حاصل کیا۔ بعد ازاں
۱۹۱۱ء میں ان نمکوں سے ریڈیم نکالا گیا۔ ریڈیم کا عمل یہ ہے کہ
خود بخود اس مسلسل طریقہ پر تین اقسام کی حرارت شاخوں کی صورت
میں خارج کرتا رہتا ہے۔ یہ شاخیں اہل سائنس کی اصطلاح میں
ایلفا شاخیں (Alpha Rays) بیٹا شاخیں (Beta Rays)
اور گاما شاخیں (Gamma Rays) کہی جاتی ہیں۔ تحقیقت
میں ایلفا اور بیٹا مثبت اور منفی برقی ذرات ہیں جو ریڈیم سے
خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ایلفا شاخ سے جو ذرات نکلے ہیں
ان میں چار پروٹون اور دو الیکٹرون ہوتے ہیں اور ان دونوں
قسم کے برقی ذرات کی سرعت رفتار سینکڑوں میل فی سیکنڈ
ہے۔ گاما شاخ میں بھی صرف چھوٹی ہروں والی ایکس ریز
شاخیں ہیں۔

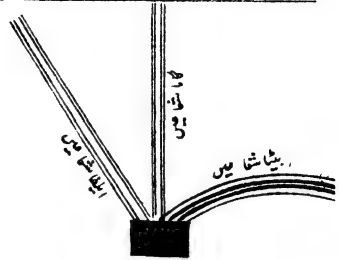
مندرجہ ذیل لفظیہ سے ظاہر ہوگا کہ ریڈیم کی تینوں قسم کی
شاخیں برقی طاقت میں کس طرح تبدیل اور منتقل ہو جاتی ہیں۔
چونکہ ایلفا اور بیٹا شاخیں ایک دوسرے کے برعکس یعنی
مثبت و منفی برقی طاقت رکھتی ہیں اس لئے مخالفت سمیتوں

ریڈیم ایک قسم کی وحالت ہے جس کا رنگ چاندی کے
مانند سفید چمک دار ہوتا ہے۔ چون کہ یہ اپنے جسم سے خاص قسم
کی شاخیں خارج کرتی ہے۔ اس لئے اس کا نام ریڈیم بمب
بشیش یا لائٹ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ نام اسم بامسمیٰ ہے۔
ریڈیم جس معدنی چیز سے نکالا جاتا ہے اُسے معدنی
یورینیم اکسائیڈ (Native Uranium Oxide) یا
پچ بلینڈ (Pitch-Blende) کہتے ہیں۔ جو ایک قسم کے پتھر
میں بیش قیمت سیالی کونار کا کیمیاوی مرکب ہے۔ اس
معدنی پچ بلینڈ کے سینکڑوں ٹن وزن سے محنت و دشواری
محنت اور نہایت پیچیدہ کیمیاوی عمل کے بعد صرف چند ٹن گرام
ریڈیم نکلتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ وحالت دنیا کی تمام دھاتوں
سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ یہ باجیات اور زندہ دھات اس قدر
کم یا ب ہے کہ زمین سے ایک ٹن کل بس ۰۔۰۰۱ اونس پر شکل حاصل
کی گئی ہے جو ایک کرکٹ کی گیند کو چھوڑ دینے کے لئے پر مشکل کافی
ہے۔ اس لئے دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز کارومان ڈیپ
سے خالی نہ ہوگا۔

ریڈیم کی دریافت کا سہرا ایک پولش فی خانہ میڈم کیری

بہت کم ہے۔ یہ شتا میں شیخ کی ایک فٹ موٹی چادر کو پار کر جاتی ہیں۔

سائنس اور طبیکی دنیا اب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو چکی ہے کہ ریڈیئم سے اس قدر تیز زبردست اور زود اثر ریڈیو برقی (Radio-Electric) شعاعیں خارج ہوتی ہیں جو آہستہ درجہ کی جہلک بھی ہیں اور مفید و کارآمد بھی انسان میں براہ راست ان شعاعوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے 'ریڈیئم' اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہی شعاعیں 'پُر دہ' کے اندر سے استمال کی جاتی ہیں تو بعض خطرناک امراض خصوصاً سرطان کے امراض میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔



ایٹلن شاہی کسرباقی ہسردوں کا مجموعہ ہیں۔ یہ میں ہزاروں
فیلم حرکت کرتی ہیں۔ ان کی طاقت نفوذ بہت ہی کم ہے۔
یعنی یہ معمولی گانڈی موٹائی میں سے بھی پاسانی نہیں گزور
سکتیں۔ بیشا شاہی اس فانی بدن میں نعت ایلچ تنگ اثر
جاتی ہیں اور سیما و ایلومینم کی چادر میں اپنے ایلچ نفوذ کو
جاتی ہیں۔ ان کی رفتار ۱۸۰۰۰۰۰ میں فی سیکنڈ ہے۔ جو
تقریباً معمولی روشنی کی شاعروں کی رفتار کے برابر ہے۔ ان کی
طاقت نفوذ ایلٹلن شاہیوں سے تقریباً سو گنا زیادہ ہے۔ یعنی
یہ ایک دھات کی تپتی سطح کو بہ آسانی جوڑ کر سکتی ہیں۔ جسم پر
ان کا اثر بہت ہلکا ہوتا ہے۔ یعنی جو حصہ جسم ان کے
زیر اثر ہو وہ کچھ مٹر کر مرده ہو جاتا ہے۔ گاما اشعاعیں

ایکس ریڑہ اور اور بالائے نفقہ شہ عیسیٰ

(Ultraviolet Rays) کے مشابہ ہیں۔ ان کی رفتار روشنی کی شعاعوں کی رفتار کے برابر ہے لیکن ان کی ہیر کی لمبائی (Wave-Length) ایکس ریز کی ہیر کی لمبائی سے

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آفتاب کے گرد و حوالہ
کا سرچر ریڈیم ہی ہے۔ آفتاب میں "ریڈیم" کا وجود پہلے ہی
سے معلوم کر لیا گیا تھا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ آفتاب کے گرد و حوالہ
میل کا جو "آتشیں مار" ہے جس سے گردش کی طوفان ابلتے
ہیں وہ حقیقت میں ہیلک کی شاخوں کا ہی نمونہ ہے۔ یہ بھی
تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ایک گرام ریڈیم سال بھر
میں ۱۶۰۰۰۰۰ وزن حرارت پیدا کرتا ہے۔ یہ حرارت تقریباً
پنیر سے برتن کو کھولاسکتی ہے۔ اس سے خود ریڈیم میں
۳۵۰۰ کی بجوایا ہے۔ ریڈیم تقریباً پانچ ہزار برس
میں اپنی حرارت اور روشنی کو کم کر سیکے گا جتنا کہ آفتاب کا
وزن تقریباً دو ہزار ہا سو کروڑ یعنی تین سے تقریباً سو لاکھ
سو ہزار ارب ڈگری ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ اتنے عظیم الشان
گرمی کا ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں برس سے متورہ رکھنے
کے لئے ریڈیم کے تختے پر لے خزانے کی ضرورت ہوگی۔

یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ سورج کی روشنی اور حرارت اجزاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ یعنی آفتاب میں چمک دہک کسی جھڑکے والے مواد سے نہیں ہے۔ ریڈیئم کی حرارت بھی اجزاء کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کی مخفی طاقت کا نتیجہ

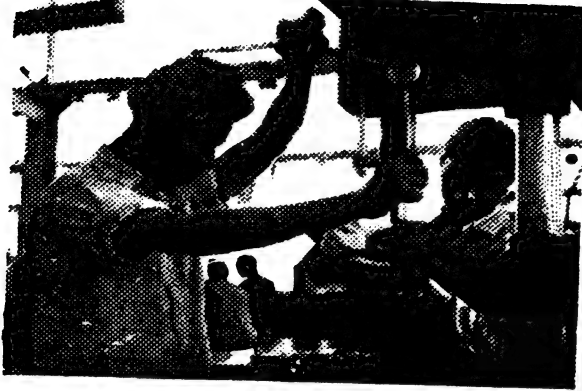
ہے۔ سورج کی شاخیں جو کوڑو سا لاکھ میل کا فاصلہ طے کر کے زمین تک پہنچتی ہیں۔ وہ ریڈیم کی گاما شاخوں سے بہت شاذ ہیں اور میں ممکن ہے کہ وہ ششاح گاما ہی ہو جسے سورج کی کرن بجتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اگر حسب ریڈیم سے ہزاروں برس تک بے شمار حرارت و قوت پیدا جاسکتی ہے۔ مگر اس سے خود اس کے جوہر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہزاروں برس کے بعد البتہ وہ سیسے کے قالب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ریڈیم تزلزل کر کے پلو نیئم بن جاتا ہے اور پھر سیسے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ریڈیم کی پیدائش پسپا، بھائی، غلط، بڑھا چا اور موت کے لئے بھی پھر ارب سال کی مدت درکار ہے۔

جہاں ریڈیم کی ہلکے امراض کے خلاف جنگ کرنے میں انسان کا سب سے بڑا دوست ہے وہاں دوسری طرف یہ سب سے زیادہ خطرناک اور ہلاکت آفریں دشمن بھی ہے۔ اگر اس کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ انسان کے مہمانی نظام ناک یا مطلق میں چلا جائے یا کسی اور ذریعے سے داخل ہو جائے تو دنیا کا کوئی ڈاکٹر یا سرجن اسے نکال نہیں سکتا۔ وہ ذرہ اپنی جلتی ہوئی تیز اور تند ریڈیو برق شاخ میں خارج کرتا رہے گا یہاں تک کہ انسان اس کے اثر سے مر جائے گا اور اگر یہ ذرہ اپنی جسامت میں ایک اونس کا بیس کروڑوں حصہ یا اس سے زیادہ ہو گا تو وہ فوراً ہلاک کر دے گا۔ چونکہ ریڈیم کی شاخیں اپنے اثر میں بے حد دور رس اور ہلکے ہوتی ہیں اس لئے جو ڈاکٹر ریڈیم کے ذریعے علاج کرتے ہیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کو لیے جیسے چھوٹوں کے ذریعے پکڑتے یا چھوتے ہیں۔ وہ جتنے کا دستانہ اور پورا لباس پہنتے رہتے ہیں اور خود بھی ریڈیم کے سامنے نہیں جاتے بلکہ جتن کے ایک موٹے پردے کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ ان کے جسم کے کسی حصہ تک ریڈیم کی شاخیں نہ پہنچ سکیں۔

ریڈیم کی گاما شاخوں کی اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ جسم کے ہلکے پھوٹوں (Malignant Tumours) شش، سرطان یا کینسر وغیرہ کو ہلاک کر خشک کر دیتی ہیں اور تندرست حصہ جسم پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جتنی ان شاخوں کی لہر کی لمبائی کم ہوگی اتنی ہی یہ زیادہ مؤثر ہوں گی۔ کیونکہ کم لمبی لہرواں شش میں طاقت نفوذ زیادہ رکھنے کے باعث مؤثر و دوبارہ آسانی سے جذب کر لیتی ہیں اور سرطان وغیرہ کو بہت جلد خشک کر دیتی ہیں۔ دنیا کے وہ شفا خانے یا دوسرے ادارے جو ریڈیم کے چمکاتے کچڑے کے استعمال کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ لندن کے ویسٹ منسٹر اسپتال میں مرث چار گرام ریڈیم ہے (جس کی قیمت فی گرام دس ہزار پونڈ ہے) جو سرطان کے علاج کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ہر ہفتہ ان چار گرام ریڈیم کو ڈوبل کر دیا جاتا ہے۔ ہر ایک گرام ایک ہفتہ تک استعمال میں رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے ایک خاص برتن میں ڈال کر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ دوبارہ استعمال کے وقت تک اپنی پوری طاقت اور اثر کو حاصل کر سکے۔

سائنس دانوں نے تجربے سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ ۸۰۰ برس کی مدت میں ریڈیم کی شاخیں اپنی نصف طاقت کھو دیتی ہیں اس لئے اسپتالوں کے پاس یہ بیش قیمت دھات موجود ہے ان کو کھٹے ریڈیم کے لئے پریشانی اور فکر مند ہونے کی چیز ضرورت نہیں۔ آپ سے ملاحت کیا کہ ریڈیم کیسی ہوش ربا اور طبعی دھات ہے یہی وہ شگبار سے جو کم سے کم ۶۰۰۰ سال تک شش حرارت اور طاقت بخشن سکتا ہے۔ یہی وہ سرخبرہ مس و ضیا ہے جس سے چاند، شمس اور سورج تابندہ و درخشاں ہیں۔ یہی طاقت و توانائی کا لازوال خزانہ ہے جس سے حیات، نباتات اور معدنیات میں حرکت و حرارت پائی جاتی ہے اور یہی وہ اکیسیت ہے جس کی مدد سے سرطان، نفرس، اعصابی درد، جراثیم حرارت خون اور ہیمہ کا کامیاب علاج کیا جاسکتا ہے۔

ہلان سے کیا ہوگا روزگار کے زیادہ مواقع



- تیسرے پانچ سالہ ہلان سے
بھر پور کھیتی اور زمین کو ترقی دینے کی بدولت ۳۵ لاکھ افراد کو
زراعتی حلقے میں روزگار ملے گا اور
- ۱۰۵ لاکھ افراد کو صنعت، ٹرانسپورٹ، تجارت، سرکاری اور
سماجی خدمات سے متعلق شعبوں میں روزگار حاصل ہوگا

اس کے سنی یہ ہوئے کہ
آپ کو روزگار کے نئے اور بہتر مواقع
حاصل ہوں گے

ہلان کو کامیاب بنائیے۔ اس کا نتیجہ ہوگا

تیسرا
پانچ سالہ

ہر شخص کے لئے
اچھی زندگی

ہندوستانی ڈراما

(اذ ۱۔ ڈاکٹر مفدر آسا)

ڈاکٹر مفدر آسا نے ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ گراں مایہ تعریف ڈراما کے میدان میں ان کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فاضل معتمد نے اس تعریف کو نصائی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈرامے کی تاریخ اور مغربی و ہندوستانی فن ڈراما سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں مصنف نے اداکاروں سے بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ڈراما اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر ہے۔

صفحات ۱۔ ۳۴۷ قیمت ۱۔ تین روپے ۵۵ نئے پیسے

برنس نیچر پبلیکیشنز۔ ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ ڈہلی ۶

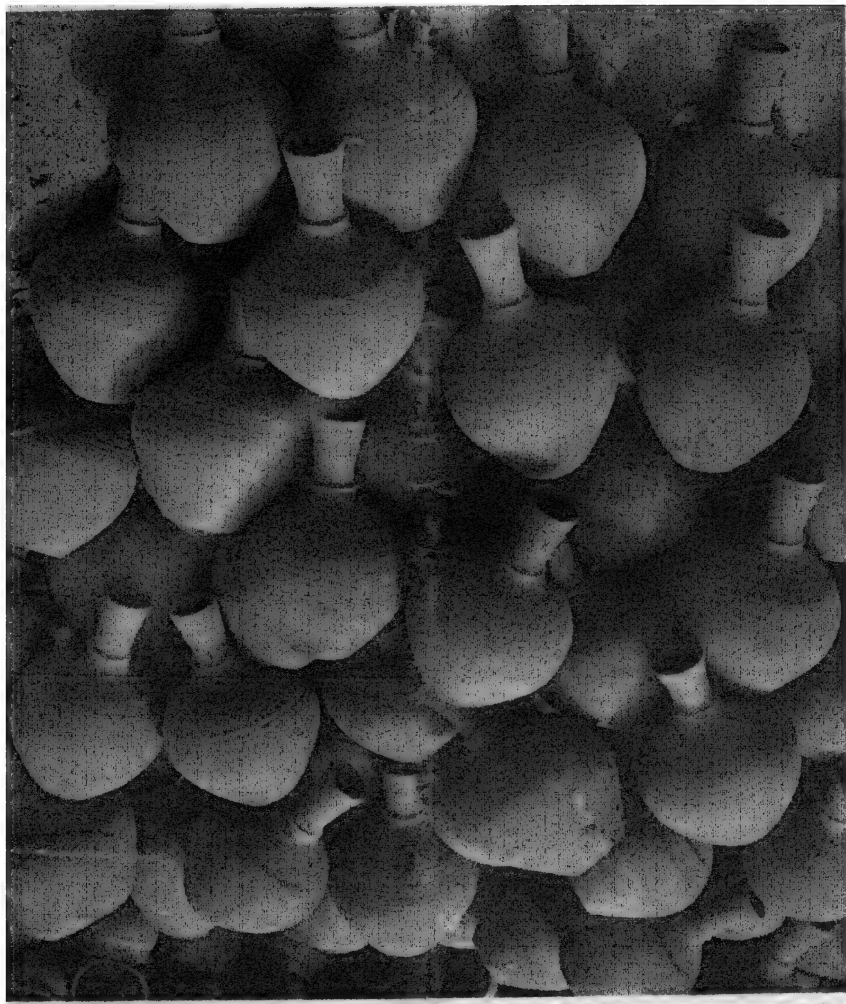
باہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۵۔ اسٹریٹ نمبر ۳۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲۔ رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵۔ بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۳۱ گرین روڈ سنگاپور

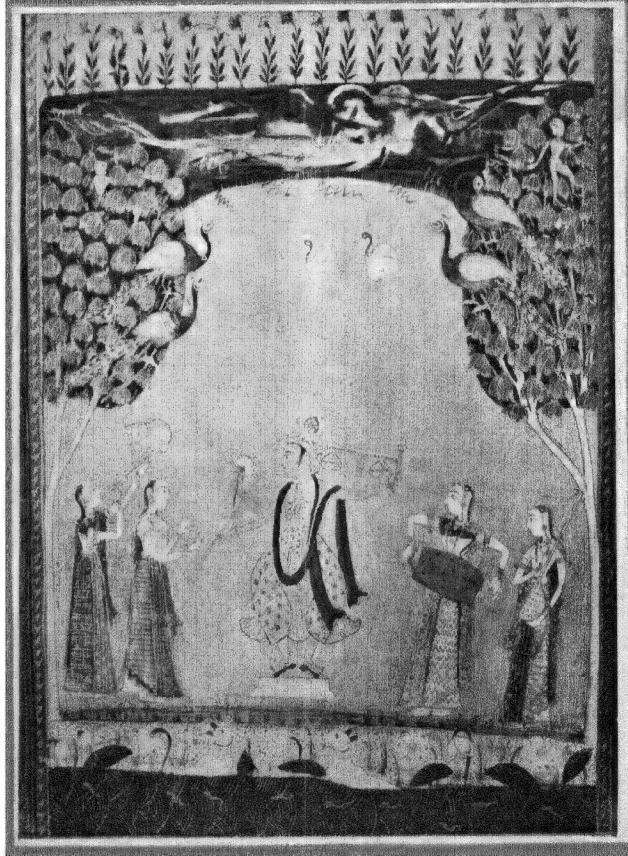
برنس نیچر پبلیکیشنز۔ ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ ڈہلی



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

آہ گل



اشادھ شک ۱۸۸۵ء
جولائی ۱۹۶۳ء

ہماری اردو کتابیں



قیمت	مست	نام کتاب
۳ روپے ۵۰، نئے پیسے	مقدر آہ	ہندوستانی ڈراما
۷ روپے ۵۰، نئے پیسے	انت گوپال شیوڑے	حوالہ لکھی (ناول)
۲ روپے	ٹیبر منڈی	پنڈت ہرو سے بات چیت
۲ روپے	—	ابوالکلام آزاد
ایک روپیہ ۲۵، نئے پیسے	ڈاکٹر سی۔ دی رمن	سائنس کے چند پہلو
ایک روپیہ	—	ہندوستان کا دستور
ایک روپیہ	—	بھارت کی لوک کہانیاں
۵، نئے پیسے	—	ویسٹ اینڈ کی لوک کہانیاں
۵، نئے پیسے	ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن	کلی یا تہذیب کا مستقل
۵، نئے پیسے	جواہر لال نہرو	بھارت آج اور کل
۵، نئے پیسے	—	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں
۱۰، نئے پیسے	—	کیلنڈر کی اصلاح
۳۵، نئے پیسے	—	ناپ تول کا میٹری نظام
فی ممبرانے پیسے	—	جواہر لال نہرو کی تقریریں
		۲۰-۳۰-۴۰-۵۰-۶۰-۷۰

بیلنگ اور ڈاک خرچ کے لئے کم سے کم پچیس روپے یا قیمت کا ۱۳ فیصدی مزید بھیجئے۔
رجسٹری کے لئے ۵۰، نئے پیسے اس کے علاوہ ہوگے۔ ۲۵ روپے یا اس سے زائد کی کتابیں منگوانے پر معمولی کمات

کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے

برنس میجر پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی

ملاحظات

یونیورسٹی کے نازک دور میں اس کی زمام کار آپ نے سنبھالی۔
پھر پانچ سال تک بہار کے گورنر رہے اور وہاں بھی ہردل عزت
رہے۔

آج ملک تیرور قح کے دور سے گزر رہا ہے اور اقتصادی و معاشی
قح کے ساتھ ملک میں اپنی اور زیادہ سے زیادہ تعلیم کو فروغ دینے
کی ضرورت ہے۔ ان دونوں بڑوں کا تعلق تعلیمی سرگرمیوں سے رہا
ہے۔ یعنی ہے کہ ان کے زیر سرکردگی تعلیم کی ہر گہر قح ہوگی۔

آزادی کے بعد تعلیم کے میدان میں ملک نے کافی ترقی کی ہے اور
مختلف قسم کی دھاریوں کے باوجود ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ
اعینان حق ہے، لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اسی لحاظ سے
بیسرے چھاپہ پلان میں تعلیم کی ترقی و قح کا خاص غاظر رکھا گیا
ہے۔ مرکزی وزیر تعلیم کا یہ اعلان خوش آئند ہے کہ تیسرے منصوبے
میں ۱۰ سال سے ۱۱ سال تک کی عمر کے ۶۵-۶۰ فی صدی بچوں کے لئے
لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا اور وہ ۱۹۸۰ تک ۱۱ سال تک
کی عمر کے سب بچوں کے لئے تعلیم کا نظام ہو جائے گا۔

اگرچہ ہندوستانی کو پلوں کی دوسری ہم موسم کی خرابی کے باعث
ایڈسٹرکٹ میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی ۸۰ ہزار چھ سو فٹ کی بلنگ
پر موسم کی انتہائی شدت کے باوجود تین لاکھ گز اگر انھوں نے ایک
ایسا دیکھا تو قائم کیا ہے جو بے نظیر ہے اور اس کے لئے وہ مبارکباد
مستحق ہیں۔ ان لوگوں نے انتہائی ہمت، دیانت، ہمت اور ضبط و نظم کا مظاہر
کیا ہے۔ یہ ہم جلد ہی کی اور امید ہے کہ نالی کے لئے ہمیں کام دے گی۔

جمہوریہ ہند کی صدارت کے لئے ڈاکٹر ادا جاکر ششی او تانے
کی حیثیت سے ڈاکٹر اکرشیں کے آخاب پر ملک بھر میں اظہار و مسرت
کیا گیا اور ہر جگہ و خیال کے لوگوں نے اعینان ظاہر کیا۔ جو ان دونوں
فاضلوں کی ہردل عزت کی کجوت ہے۔

ڈاکٹر ادا جاکر ششی کی ذات گرامی محتاج کاوت نہیں۔
ایک ممتاز فلسفی کی حیثیت سے وہ بین الاقوامی ہنرت کے مالک
ہیں۔ ہندوستانی فلسفہ کی تفسیر ای کا زبردست کارنامہ ہے
اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے مشرق و مغرب کی
بنیادی قدروں کو آ جا کر کر کے ایک دوسرے سے قریب لانے کی
کوشش کی۔ وہ ہندوستان کے سفر کی حیثیت سے بھی بہت
کامیاب رہے اور نائب صدر کی حیثیت سے بھی۔ انھوں نے
ہندوستان کی وکالت بڑی کامیابی کے ساتھ کی اور ویسٹ انڈیز
اور روادادی کی تعلیم کرتے رہے۔ ان کا علم و فہم روادادی
ویسٹ انڈیز اور انسان دوست ملک کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی۔

ڈاکٹر اکرشیں علم و ادب کے میدان میں جانی پہچانی شخصیت
ہیں۔ ایک ممتاز اہل تعلیم کی حیثیت سے ان کی زندگی کا بڑا حصہ
تعلیمی مسائل کو سلجھانے میں گزرا۔ وہ قومی تحریک سے شروع سے
وابستہ رہے اور ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف
کر دی۔ جتنا کام دہی کی آواز پر لبیک کہتے تھے جی گڑھ پوٹا ورٹی
کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شامل ہوئے اور اس کے بعد
متواتر تیس سال تک اس قومی یونیورسٹی کے راجہ رہے۔
کڑھی کی تحریک پر آپ نے بنیادی تعلیم کی اسلم مرتب کی۔ ہندی
کے اور ان کی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دانشور چائیر مقرر ہوئے اور

نقش و نگار

چند کیرٹوں نے ریگ ساحل پر حیرت افزا مرا سہلے لکھتے
 کیسی اچھی کشیدہ کاری کی کیا انوکھے خیال پیش کیے
 جوش میں کر کے خامہ فرسائی حل طلب مسئلے بکھیر دیے
 خوش نما ہے زمین کا دامن فکر انگیز نیل بوٹوں سے
 دل نشیں شاہکار حسنِ گل دیکھیے لاکھ بار جی نہ بھرے
 شکل کوئی یہاں نہیں بے جا کچھ تو معنی ہیں ان لکیروں کے
 فرصت یک نظر یہ خطِ غبار قلبِ دریا کے راز کون پڑھے
 موج آئی اطمس لٹ گئی سارے نقش و نگار دب گئے

جن فطرت یہ چاہتا ہے کوئی

دیر تک اس کی تاک میں نہ رہے

دیوان نوازش

کتبِ خاندانِ بخش پختہ ہیں، اور جس کا تعارف اس مقالے میں کرایا جا رہا ہے، انکی دوسرے نسخے کے وجود کا مجھے علم نہیں۔ مؤلف اور القابات نے نوازش کے اشارہ پوتہ کردوں سے نافذ نہیں پایا۔ سند میں پیش کے ہیں، ان کے پیش فقرہ دیوان کا کوئی نسخہ رہا ہو تو غیب نہیں۔ نسخہ عذائیش ۲۸۷ اوراق کا ہے۔ ان میں سے ورقِ اول کے فقرہ امیں دیا ہے، فقرہ ہے اور ورقِ آخر کا صفحہ ۲ سادہ ہے۔ سطر ۱۳۱ سطر کا ہے، لیکن بہت کم صفحے ایسے ہوں گے جن میں ۱۳۱ اشارہ ہیں۔ اشارہ کی مجموعی تعداد کم، سببش ۶۵۰۰ ہوگی۔ دیباچہ فارسی میں ہے اور نوازش کے دشمنانِ قلم سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی کتابت بھی خود نوازش نے کی ہے۔ دیباچہ اس پر مشعر ہے کہ نوازش نے یہ دیوان امیرش خاں کی فرمائش سے نقل کرایا۔ دیا ہے۔ کہ آخر میں مذکور سلسلہ مرقوم ہے۔ ہ کے بعد کے ہندو سے ضائع ہو گئے ہیں۔

دیوانِ نوازش میں سوز کے خاص رنگ کے علاوہ دردِ کمیزانہ بھی ملتے ہیں ایسی ہی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ طرزاں کے ہشار اگر ہیں تو بہت کم ان کے دیوان میں بہت سے ایسے الفاظ اور کلمات استعمال ملتے ہیں، جو نوازش اور ان کے قلم کار کے یہاں نہیں ملتے۔ ایک عجیب اور سوز میں ہے کہ سب کا غزل میں ایسے لفظ کچا پاتا ہے جتنے ہیں جو غزل کے مزاج کے خلاف ہیں۔ مثلاً ہڈا کے کسے مذاک اس کا اندازہ ہو کے کہ کیسے کیسے لفظ اور طرین استعمال دیوان میں پائے

نوازش جیسے عارف میرزا قاضی تقی نے نوازش کا ترجمہ معنی کے تذکرہ ہندی (سالِ اتمام ۱۲۰۹ھ) یا اس سے قبل کے کسی تذکرے میں نہیں دیکھی ہے۔ بعض انصاف میں ہیں کہ نوازش ۱۲۲۱ھ میں مرغا تھا، ان کا ترجمہ موجود ہے: "وہ حسین علی خاں ابنِ نواب ناصر خاں صوبہ دارِ کابل و پشاور، اور اگر کامیاد متولید شد، وہ رنگین و خوشو و نایاب ذہن ازس ہنر و مہارتی شوقِ موزنی ستر.... دروہن گفتن و خواندن ستر شمع میر سوز است او خود را شاگرد ایشان می گوید۔ دیوانِ اول الجواد ایشان گفتند و علائک دیوان و بحریم ستر خود" تذکرہ نامہ میں نوازش کے بارے میں مرقوم ہے: "شاگردِ ملکہ قائم مقام میر سوز.... خود فرمائے تھے کہ میں نے ایک دن سترِ نواز سے.... دیکھا کہ میں کیا کہتا ہوں۔" ان سے کہا کہ میرا ستر میرے ستر سے بہتر ہے، وہ سدا نہیں کہہ سکتا۔ ایک دن مؤلف نے ستر کے لے کر ایک ہندوستان کا کہ دروازہ پھرتا ہوا فخر و کھرا دوا۔ میں نے.... کہا کہ غزوہ میں ہندوستان کا دروازہ سے باز رکھے گا.... فرمایا یہ قول ہے، اس زمانہ میں جو قلم کار ہمارے دور سے آئے، سب تمیز کرنے و بہادری کے کام آتے ہیں، انھیں نظر نہ پڑے ہوں۔ غائب کا کہہ سکتا ہوں، جو آج پائے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نوازش ۱۱۶۲ھ سے لے کر ۱۱۶۳ھ تک چھ برس دیوانِ شیریں شاکر، ناز و شکر کے غزل و غزلیں لکھتا رہا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوازش کا سال وفات ۱۱۶۳ھ ہے۔ ان کا دیوان بہت کباب ہے۔ اس کے سوا جو تذکرہ دیباچہ اور تذکرہ کردوں میں دیکھیں نام ملتے ہیں۔

جانتے ہیں۔

غزلوں کا آغاز ورق اب سے ہوتا ہے، اور ورق ۱۰ بیت
دوسرے اصنافِ سخن کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلے پہلی غزل کے بیتِ اول
اور اس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :

بیتِ ہر دے صنم گھر ہے، دلی نادان کا

آپنا کسبِ دل چاہیہ مطلع ہے سرِ دیوان کا

خیر سے میرے ہیں خورے اس کے کچھ مردِ اندا

یوں تو ہر مرد ہے قافلے سرستہ مردان کا

گو نہ یاد میں بلا صفتِ سخنِ اہلِ طائفوں

ہے کھلم کھلا مقدرِ کس ہے اس اعداؤں کا

شاعری کا کرد ہے دجلی اکثریے تیرے

میں طرح بکنا نہیں ہے مقبرہ بزدلیان کا

نہری بیٹے، اپنے کرلیں لوگ رو بہ بازی

بشرِ قالیں میں بہت کم شاعر ہے میدان کا

جز نہیں ہے گلِ اسلام اپنا صاحبِ چرخ

اسے قازقش یہ طریقہ ہے مرے ایمان کا

شکر شاہِ اودھ کی مجھ کو کرنی تھی نہ سیر

کب سے میں بھولا ہوا تھا پھر وطنِ یاد کیا

ستف گردن کے تھے نتیجے کیا بارش میں

چھت چٹکتے ہے جدا لگتے ہے یو بھارِ حیدر

پس اگر کہیں قازقش تو کہیں یادوں سے

میرے اشارِ حیا ہیں مری گشتِ حیدر

سب کو خوشیہ قیامت کا قازقش تھا کھان

گلِ حورہ بامِ شائے پر اندوار ہوا

ایک کو دوسرے کی محنتِ زجر دیکھتے

جمعِ میلہ جو تھا حشر کا بازار ہوا

یاں بھی اک سے تھے رخصتِ دل لے تیرے خدا

کھٹوٹے تھا ہوا حکمِ اس پر گنگا پار کا

لے کڑا، مٹھہ جھڑا

برکاب اب اہلِ انعام کا ٹانگھیں دیکھی

اس پر جتنے نہ کسی کا بھی آسوس دیکھا

بڑے تم ہو چلے کیا ہے مرقعِ خضیعتے کا

عالم اس شعر کے کچے ہیں یہ ہے ٹھس ٹھس کا

چھوڑ کر بدستورِ خُش منتفع سے جوئے تو قدم

میرے صاحب نے دیا حکم مجھے انگلیں کا

دل کے قرض کی کوتاہی میں ابھی تمہ پر کروں

خوف ہو سادش حاکم سے نہ مگر ڈاسس کا

اس جوان کی مجھے الفت کا ہے کوئی شیخ

مانتا پر کوئی کھنا ہوں ہیں اس پر بے شک

قصہ فیرا کیا اس نے ترے داپس کا

کچھ خیال اب نہیں ہم کو تری اس مرقع کا

لکھو ہے وہ بچے کتنے ہیں زرِ ریزِ مکار

ہرگی کو میں مرستے یو غیس کچن دیکھا

کلی غلی عشق کو ان پٹے پٹے لوگوں کی آگ

بدن پر سوزِ دروں سے ہے ہر جگہ پھلکا

یار بھی کوتاہ ہے اپنی پار سائی کا

میں با پس سے زلفِ سید کا ہوں یا لکا

کھلا نہ رخ پر ترے کچھ یہ گول گالی رنا

چاشمہ خور کی کے نہیں دستِ حور کا

بھلا تو رعبِ مرین جو ہو ہر دویں کا

یادوے گردن میں اس کی ڈالنا نہ بات کا

ہر اک سے یوں تو قازقش تو دلِ اسناد

یہ وضعِ سخن میں کچھ تو ہی اقتضاب ہوا

۱۔ کڑا

۲۔ یہ اور اس کے برعکس ددشتر ایک ہی غزل کے ہیں

۳۔ حرفِ تہ میں مفقوع

۴۔ ت کسور

۵۔ توانی غلی بیل، وغیرہ، انہار و لیت

گھر میں ترے کوا کوئی یونہی سے نہ ہوگا
 جو ہم سے ہوا ملے وہ رستم سے نہ ہوگا
 رکھ کے گھر میں مجھے دل لوگے یہ یک تصالوہ
 ملک آخر میں قاتلوں کا ملکہ
 اس سنگ کو ہم نے یار کیا ہے ہر استیاد کیا
 سن فادش اسے سر جیب تامل سے نکال
 دامن نکر ہے ریختہ ادراک ٹانگا
 کہا جو غیرت لیلیٰ عین فادش نے
 یہ اڑ گئی تھیں میں نے بھی کیا سٹائی کہا
 قاری غزل : یا بونگنی کچھ آج ہی آواز جسر بند
 سن سن غزل : آج جو بڑی بزم میں پیش
 ہر شعر مرا مرثیہ کا سا ہے مگر بند
 اس فادش ہی میں بھی ہیں شاگردی کے
 اور بھی تو نے کیا شہرہ اسناد بلند
 ہے فادش نے فقط تاخیر شاگردی سوز
 شمع سال جو تیر کو ہے آتش زبان پر گھنڈ
 ایسے دیوں سے فادش دُلا سو دا ہے
 چھڑائی تھے منور ہے تو میر کو چھڑ
 زداں سے تنگ تو ہے فادش وہ یادیں
 ہے گھنٹوں میں نام مکاں دل کشا غلط
 ناظران حال مرگم افزا سادی کے ہیں
 ہے دہ گھنٹے ہی کے قابل ان کے دیراؤں کی
 ہم تو تکلیف نہ جانے کی دامن فہم دم
 ہیں بھان شہر میں سب مہر غزل فانی حسن
 انھیں ٹھونسی ہیں باندھے بزبان اردو
 ہیں لباس شہزاد میں ہوئے بند کھانی جع

لے یہ شہر و شہر ہے . مصرع ۲ دواؤں پر اس طرح ہے ۱
 جو کام ہوا ہم سے ادا ملے کلا

ان کا منہ تو یہ لہا ہے فادش ہی میں
 جب کہ استاد سے کہتے ہیں مجھے بہتر لوگ
 قافیہ جلد فادش بڑی جسرأت
 اسے انداز کے باوہ ہیں غزل وار نکال
 کہاں تو ہے فادش لوگ پیدا ہو کچھ ہو مجھے نہ ہرمان تم
 کرم صاحب کا کس لائق ہے بندہ بیان کرتے ہوا اپنی خوبیاں تم
 پڑھ کے جلس میں فادش میں غزل سوز کی دوش
 مرثیہ خراں کی طرح سب کو دلا جانا ہوں
 فعل بہار کیسی سمجھیں گے وہ یہ وحشت
 ہے فعل علی تھو نے دھو میں چاٹ لیں
 یہ گھنٹہ ہے فادش خویاں اڑی سو اڑی
 جو کاؤں کا نہ شینے کا پتھر نہیں
 دیکھ اس گری کو تاخیر نے فادش سے کہا
 اب کے پا ہی یقین مشر و برسات ہیں
 لے مارتے ہیں لڑکھیں سب میں مرد اس چب
 رشک سپن کوئی انٹو سپا پیدا ہو
 یزنی زمانہ فادش نہیں ہے حتم
 کچھ گھنٹوں میں دیر نہیں لغتلاب کو
 شعر میں علما فادش کے نہیں بندھے سنت
 ورنہ ہنسی شہر ہے سیر اسے قاسم کی
 کیا فادش کو لیا دیوان و نگین ہی نہ تے
 کس کا یاں دیتا سخن تیرے سخن پر رنگ ہے
 یاران پندارچہ فادش دامن پر ہیں
 آباد یہ دعا ہے سدا گھنٹہ رہے
 لکھنؤ کی نہ دلا دیا فادش مجھ کو
 گیا پر ی لوگ تھے ہم اس سے دیراؤں ہو
 دواؤں ہوں انداز میں اس کے فادش
 مرثیہ پکارا دے دے سو دا کو نہ پیچھے
 لے نامو زول دواؤں تاخیر سے تسخیر ہو سکے گی۔

”نقطہ“ شلت۔ بہت سے ہیں، فارسی اشعار کی تفسیر ہوئی

ہے جن میں سے ایک بھی فاضل کا نہیں معلوم ہوتا

نہ اس کو بوجھ بہم ہے اس کے وصف میں سارے

حرفِ جنتِ کار سے رہا عالم سوز و حجاز

بوقتِ جنگِ دانیہ بہ وقتِ صلح تہ دانیہ

ہے فرقہ خیز جانِ عالم با سایہِ قرانی پسندم

فنیق است و ہزار بد گمانی

راست پوچھو تو سر ہو نہیں میری نصیر حسن سبزے بطن سبز مرا گردا بر

دام ہر رنگ زین بود گرفتار دشمن

محنتا۔ محنت و قسم کے ہیں۔ ایک تو معمولی، دوسرے

جن کے ہر بند کے آنے میں ایک ہی مصرع آتا ہے خواہ فارسی

ہو خواہ اردو۔ قسم ادا کے محنتوں میں سب سے زیادہ سوز

کی غزلوں کی تفسیر ہیں۔ (۵) میر (۲۶) دور (۳)، محنتیں

(۲) خسرو (۲) جسرات (۱) عینی (۱)، شرد (۱)، فاضل

قسم دوم مصرع ”صحفی“ ”وان پڑی“ ”نکھ جہاں اپنا کارہ اپنی“

مصرع؟ ”اغصیں کے واسطے یہ سر پہ بال رکھتے ہیں۔“

مصرع ”لا جا رہو کے یاد ہمارے گئے پڑا۔“

معدسات بھی دو قسم کے ہیں، ایک معمولی، دوسری وہ جن

کے ہر بند کے آنے میں ایک ہی شعر آتا ہے: قسم اول کے رشتہ

میں سے ایک دو سوخت ہے۔

قسم دوم کے معدسات میں انشاء اور قائم کے ایک ایک اور

سوز کے دشمنوں کی تفسیر ہوئی ہے:

کسی ہی بچوں ہم تم سے لڑائیاں ہوں

جب کھٹکلا کے ہنس دوں میں مفاہیاں ہوں

تو مل سڈ تو واں ہو جساں ملال بھی ہو

بجان پاک مفاہیاں جو کچھ خیال بھی ہو

جو کہ آپ سے ملا کر سے دوستی اس سے پھر ملا کر سے

لہم تو چلے مسازی کو ہمسردی جو سلام عاشقی کو

اور بھی کئی مہدس ہیں مگر فی الحال یہ بتا نہیں کر کہ مشدرا

بہ رخصت ساز ایمان وہ زادہ فرنگی

اسلام اب کہاں ہے عاہی فراموش ہے

سبزہ ہے، گمشدہ ادب ہوئے باقی ساقی کی ایک جا ہے

ادہنم کو چپا کے جانے والے سہ ہے کل کیا تھا آگ کیا ہے

غزل ان کا بیوں میں تیسری بھی ایک میں لکھوں

تجے بھی سوز سے آخر تو شاگردی کا ناتا ہے

غزل سموز فاضل دیں میں نے بھی پڑھی

میں بے گھر سودا کے قہید سے نکلے

اس بار تو اسے محنت دل تم کو حسب آئے

گر پھر ڈیکھیں جو ناٹھی نکھرے ہو

قسم جو کھائے تو طالع زادش کی

کسی کی بڑی ہوئی بات کم سوزی ہے

دہیات

یہ سنگِ خلافتِ جلا بٹل جائے

میرمنز دیکھو کھنڈت نکلے

اندر صبا دیا اہلی اڑ جائے

ایک ایک کانگت میں نہیں گئی

توڑتے کا ہے میں دونوں کے کپانی

گورے کا چمچ مشق ہے اب قید رنگ

کالا بھی دکھا چکا ہے کالا پانی

وہ شادی ملازمت خوشی بیٹھ

ہے آگ کا روز روزِ عیدین ہے

تھابت تارِ بکا، سید لدا اعلیٰ (عالم مہبود) اندر آہ

دب کی اٹھ گیب انیسوں کو

بمسود مذہب شیعہ کا ہے

فرہیم الدین، تاریخِ بھالی محمد ہدی

تاج محل ہے بحال اب بھی محمد ہدی

وفات جرائت باخدا، آج جس وقت کا انتقال ہوا۔

موت غلام حیدر

”بولانی ہیں اندو سے چاہیں گئے نکل غلام حیدر سے جان

لے ۱۲۳۳ = ۱۲۳۴ء ۱۲۲۸ء ۱۲۲۸ء ۱۲۲۸ء

لے ۱۲۳۳ = ۱۲۳۴ء ۱۲۳۳ء ۱۲۳۳ء ۱۲۳۳ء

لے غلام حیدر = ۱۲۹۳ء ۱۲۹۳ء ۱۲۹۳ء ۱۲۹۳ء

غزل

خسرو ہے نذر جنوں عاشقی کے رستے میں

نمودی، خودی نہ ہی بے خودی کے رستے میں

خدا بنائے ہیں کیا کیا خودی کے رستے میں

کھلائے عشق نے لگی کھسروی کے رستے میں

کینے نہ ہوش کے عالم میں کائنات کے راز

جنوں سے درس ملا آہی کے رستے میں

سنبھل کے منزل ہستی میں شہسوار حیات

مقام موت بھی ہے زندگی کے رستے میں

جمالِ نیرِ محبت میں کھونہ جائے نظر

ہے غلبتِ شبِ غم روشنی کے رستے میں

جنوں عشق کی باغ نکلا ہیں، تو یہ

نبی نہ زیرِ وحشم بھی کسی کے رستے میں

جبر بھی ہے جو تری سبقت میں نکلتے تھے

نثار ہو گئے تجھ پر بھی کے رستے میں

قدم اٹھائے بھی تھے نہیں کسی جانب

اب کیراڑیوں جیتتی تھی کے رستے میں

نہ آئے حریفِ تمنا دھڑائے دھڑکے ساتھ

غرض کی لاگ نہ ہو بندگی کے رستے میں

کے شمس کی تعین ہوئی ہے۔

مشہداتِ دو ہیں۔ ایک محمدی کو پیش کی گئی تھی، اس میں

ایک درکنار، پور میر (دکن) کی زبان کا نمونہ دیا گیا ہے، دوسری

بطورِ ترقی کی ڈائریش سے نظم ہوئی تھی، اس کی بیتِ آخر

اور دیوان بھی یہ تمام ہوتا ہے، یہ ہے۔

دونوں حصے آئے گی تبھی کل

جب وصل سے مجھ سے ہوتا میل

۱۔ مناد: سزا درق ۳، پھر یوں کا درجہ ۴، ارغ، دوالا نکلا

کیوں قازش کسی طرح کٹتی تھی، جھڑ بدی کے دن، دو بارہ

انگریزی، اسے میاں کام مشکل ہے، مشافعت بنائے کا، دیکھا

پڑا، کلایا، خود پسند انداز کا ۹، سنبھل، جھڑی جھڑی

وا جھڑ کیا ذکر ہے اس بات کا ۱۲، بھاتی پر مونگ دنا،

سبز قلعہ بھان ۱۳، دریافت لائے حق و باطل، ریلے کی طرح

تم نے بھی اک ٹھنگ (قافیہ) نکلا ۱۴، لٹوں کا بھانا ۱۵

چینی کے پائے ۱۶، قازش وہ غزل تھرا پڑھا اور اس

زمین میں تو وسیع (دکن) یہ غزل ہو جائے پیارے جس کی ٹھکا

(بھینس کا ۹)، بیٹھی، ذکر آنا تو کیا یہ کسی قوم سے نہ ہو گا ۲۱،

شعر ہے ۲۲، نکلا: وہ کونسا، ہے میری اس جزو دان

کا ۲۳، یہی کہہ کہہ کے تم نے میاں پھر کیا م ۲۴، الٹ پھر

کیا، گھڑ بھلا، مزو ماننا ہے دن وہ ہو کر حائل (دکن) کا،

پریت اور رائی، لیتے، جگ ہٹائی ۲۵، کٹ پس کے، پیرا

پاؤں (دکن) ہے کیا مجھ سے قہر (قہر) دینا اس اسبہ مادر

(دکن) کو یہ ہے دیا جھلا رحیل با ستم قافیہ ۲۶، دلی

۳۱، مزیدار ۳۲، ایک ہی لائی یا نکلا م ۳۳، میں پہاڑ

ہم نے بھی لگایا کیا ۳۴، میان کیا، جھڑ بند ۳۵، ایچ یاد

(مگر)، بیت لیے پیر ۳۶، دکھائی دختر و آج کیا یہ اس نے

یوں یہ عذاب تو بہت مشکل ہے سب شیعے کی گردن پر ۳۷

میں، میں، اب کو یہ، چیلان ۳۸، ان ہی، کرد تری سے

تم جیسے لائی جاتی تھی ناگزیر میں نہ ٹھکر، باقی ہے میں بھی

کی کم نعت کادل ہوں ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ (وہ لیت واؤ) مشیا میں

۱۵، مکی پوس، پوس، انبا ۱۵، ۱۵، راب، گھڑ ہونا گھڑ

۱۵۵، جھڑ بند ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱

تذکرہ نکات الشعراء

میں تحریر فرماتے ہیں :

”پوشیدہ مآذ کہ دفنِ رخسار کتا ہے تا حاصل
تقصیفِ زشتہ کہ احوالِ شاعرانِ اس فن
بعصرِ روزگار باند بنا و علیٰ اس تذکرہ مسمی
ہر نکاتِ اشراست نکاشتہ می شود“ لہ

اردو کے جتنے تذکرے ایسا تک شاعر ہو چکے ہیں یا دریا
کرتے گئے ہیں، ان سب میں نکاتِ اشواء قدیم ترین تصنیف
ہے۔ اگرچہ معنیٰ نے کہیں بھی نہ تصنیف کی وضاحت نہیں
کی ہے لیکن ایک داخلی شہادت کے ذریعہ عقیدہ بھی مل جاتا
ہے۔ میر صاحب نے آئندہ مآذ کے حال میں لکھا ہے کہ
”قریب ایک سال است کہ درگذشت“ لہ مآذ کمالی دعا
۱۱۶۴ھ ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نکاتِ اشواء
اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا۔ اس فیصلے کے بعد
قائم چاند پوری مؤلف تذکرہ مخزن نکات لکایا ارشاد کہ
”کمالی آں در کرد بیانِ اشواء احوالِ شواء یعنی
کتا ہے تصنیفِ مذکورہ دیدہ و با اس زبانِ سچ انسانے
از اجرائے شوق افزائے مخزنانِ اس فن سطرے
تا بیحد ز سائیدہ“

لہ صفحہ ۱۷۷ صفحہ ۱۷۸ بحوالہ تذکرہ گلشنِ ہند صفحہ ۱۲۴
خزائنِ صوفیہ صفحہ ۲۲۵ مخزن نکات صفحہ ۱

اردو ادب میں تنقیدی شعور کی ابتدا تذکرہ نگاری سے
ہو چکے ہیں۔ آج کی تنقید تذکرہ نویسی کے ارتقاء پذیر مراحل سے
گزرتی ہوئی اس مقامِ بلند تک پہنچی ہے۔ اگرچہ قدیم تذکرہ نگاروں
نے زیرِ بحث شعراء کے محاسن و معائبِ کلام کی نشان دہی کو بہت
معمولی یا ثانوی اہمیت دی ہے اور ان کے تیسرے اور چوتھے تنقید
کی ناک ذمہ داریوں سے عمدہ برائیاں نہیں ہوتے تاہم ان تیسروں
کے پس منظر میں کچھ ایسے عواملِ داخل اور ہمہ تنوش نظر آتے ہیں جنہیں
ہم تنقید جدید کا نقطہ آغاز نہ کہہ سکتے ہیں۔ اردو شعراء کے یہ تذکرے
بہت سی خامیوں سے معمور ہیں۔ پھر بھی اس حقیقت کا اعتراف
کرنا پڑتا ہے کہ اگر یہ معرضِ وجود میں نہ آتے تو شعراء متقدبین
کے فن اور زندگی کے بہت سے گوشے پردہ تاریکی میں رہ جاتے
اور تاریخِ ادب کی بہت سی گڑیاں بھر جاتیں۔ اسی صورت میں
تذکرہ دہی کی افادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔
پیش نظر مضمون کا موضوع میر تقی میر کا تذکرہ نکاتِ اشواء
ہے۔ جس طرح تیسرا رد و غزل کی ارتقاء کی تاریخ میں ایک سنگِ میل
یا چراغِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح انھیں تذکرہ نگاری
میں زمرہٴ ایک امتیازِ بزرگ و اہمیت حاصل ہے۔ میر صاحب
اس وقت نکاتِ اشواء کا وہ نسخہ ہے جو اب اسے اردو
مولوی عبدالغنی کامرتبہ اور انہیں ترقی اردو ہند اور نگار
دکن کاشانی نے کردہ ہے۔ میر صاحب تذکرے کے دیباچے

اس بات کی تائید کرتا ہے کہ "نکات الشعراء" ان کی مغرب سے نہیں گزرا تھا۔ اور اس زمانے میں جبکہ لہجہ عامت کی سوانحیں مفعولہ تھیں، ایک ادیب تک کسی دوسرے ادیب کی تعصیت کا نہ پہنچا۔ تعجب نیز نہیں لہذا قیام پر کم سوادی یا بددعائی کا ابرام عاید کرنا مناسب نہ تھا۔ یہی کیفیت تذکرہ "ریختہ گوئیوں" مؤلف نے علی گڑھی کی بھی ہے جو ۱۷۶۷ء میں قائم کے تذکرے سے دو سال قبل مرتب ہوا ہے۔

یہ تذکرہ جو چھوٹے بڑے ایک سو پچیس شاعروں کے ذکر اسوانح اور انھیں پرکام پر مشتمل اور درمیانی سا تذکرہ ۱۸۰ صہفات پر محیط ہے، میر کے ہم عصر شاعر کی تحقیق ہے اور دہلی کے دوران قیام میں لکھا گیا ہے۔ مذکورہ شعرا میں اکثر بیت ایسے شاعروں کی ہے جو شالی ہندو اور خصوصاً دہلی یا بہار کا مسند ہندوستان سے تعلق تھے اور مصنف تذکرہ کے احباب و معاصرین اور بچے سے چھاپنے لوگوں میں سے تھے۔ تذکرہ کی ابتدا بھی شالی ہند کے شعرا میں کی گئی ہے۔ اس امتیاز خاص کی وجہ بیان کرتے ہوئے دیا ہے کہ میں لکھا ہے کہ دکن سے کوئی مرید شاعر پیدا نہیں ہوا اس لئے تذکرہ کے آغاز شوالے دکن کے نام سے نہیں کیا گیا تاہم ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر کیا جائے گا۔ دستور زمانہ کے مطابق میر صاحب نے اہلجاہ و ملایک کے لئے فارسی زبان کی اپنیا ہے۔ خوش نصیبانہ دستاویزات سے بھر پور ہوتے ہوئے بھی نہایت صاف و شگفتہ، ان تمام اور درمیانہ دوں سے سازت میں قافی کی پابندی کا غور نہ کیا ہے لیکن ان پانچویں میں آدھ نہیں آئے ہیں جس سے برتور اور کچھ کے لئے کہیں کہیں مفعولہ فارسی کی پابندی آزادی بھی حاصل کر لی ہے۔

عام تذکرہ کی طرح اس تذکرے میں بھی واضح تہمت بندی اشارے نہیں ملے۔ مگر جہت جہت ملوں سے مصنف کی ناقص صلاحیتوں کا اندازہ بھی طرح طرح سے ملتا ہے۔ میر کی شخص شاعری کے لئے کیا گیا جین نیز ضروری نہیں اور انھوں نے کس بار کو سامنے رکھ کر شعرا کو سراہنا پتہ یا ناقابل اعتناء قرار دیا ہے ان

جینوں کی وضاحت خود انھوں نے کہیں نشو و نما پر اور کہیں غیر نشو و نما پر ارادی طور پر کر دی ہے۔ تذکرہ کے خاتمے پر ریختہ کی جو ان کے الفاظ میں شہرت ہے، بغور شعرا کی زبان اردوئے سلی شاہجہاں آباد دہلی "قرین بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ریختہ کی کمی قیاس ہیں،

- (۱) جس میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی زبان میں ہو۔
- (۲) نصرت مصرعہ فارسی اور نصرت ہندی میں ہو۔
- (۳) جس میں فارسی کے افعال و الفاظ لائے جائیں۔ یہ قیاس صورت ہے۔

دہ، جس میں فارسی کی ایسی ترکیبیں استعمال کی جائیں جو زبان ہندی سے مناسبت رکھتی ہوں۔ ایسی ترکیب کا استعمال جائز ہے لیکن اس مناسبت کا اندازہ غیر شعرا نہیں لگا سکتا۔ جو ترکیبیں زبان ریختہ کے لئے مانا توں ہوں ان کا استعمال میسر ہے مگر اس کا ہیمنہ سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ فیض کا ملک بھی یہی ہے کہ اگر فارسی کی ترکیبیں لکھوئے ریختہ کے موافق ہوں تو ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۵) ایہام گوئی، جس کا رواج زمانہ قدیم میں عام تھا لیکن اب لہجہ، اس صنعت کی طرف بہت کم مائل ہیں بشرطیکہ بندش کی شستگی کا خیال رکھا جائے۔

(۶) وہ طرز شاعری جسے ہم نے اختیار کیا ہے اور جو تمام صنائع پر محیط ہے تجلیں اتریں آئینہ، صفائی، شگفتگی، فصاحت، بلاغت اور ادبندی خیال سب اس میں ہیں آتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ غیر نکلا جاسکتا ہے کہ میر فارسی کی مالوس و شگفتگی، ترکیب، صنائع بدائع کے لئے تکلف استعمال، فصاحت و بلاغت، صفائی، بدائی اندیشگی و بندش کو ازما ت شاعری اعمو کرتے تھے انھوں نے شاعر کے لئے ذوق قیاس کی اہمیت پر بھی روش

دیبا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک اکتسابی فن نہیں، وہی عقیدہ ہے۔
بیرنظری رحمان کے کوئی شخص کامیاب شاعر نہیں بن سکتا۔ فارسی
ترکیب کے استعمال کے سلسلے میں شاعر اور غیر شاعر کی تفریق انھیں
اشارات کی حامل ہے

بیرنظری کو محضر ۳، دلیل کی داستانوں تک، محدود رکشت
مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جدائی کتاب کی شاعری کے متعلق ان
کی یہ رائے کہ ”ہر چیز عرصہ سخن اور ہمیں درغلبہ کئے گی و باطل
تمام است۔ اما بسیار رنگین می گفتند، مگر تا اسی زمان کی نشاندہی
کر رہے ہیں۔ محبت، الفت اور محبت، محاورات و امثال کا خیال رکھنا بھی
ان کی نظر میں ضروری تھا۔ چنانچہ ہر مستجاد اگر بادی کے ایک شعر
پر جس میں ”کانوں میں شہینا“ کے بجائے ”کانوں میں اچھیا“
نظم ہوا ہے۔ اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”درشل لغوت
جائز نیست“۔ شیخ محمد حاتم کا ایک شعر ہے کہ

دیکھ لو اس دور کا قلم نے کی ترک شریاب

یا دکر کر سبزدیاں کو وہ اب پیتا ہے، بھنگ

بیرنظری ایک ترکیب ”بزرویاں“ پر اس طرح تبصرہ کرتے
ہیں کہ ویرن لفظ ”تامل کردن ضرور است زیرا کہ آشتائے گوش
ایں بیچوکان نیست“۔ محمد حسین کلیم نے فقیدہ ”روضۃ الشعراء“
میں میرزا مظہر کا نام ”جان جان“ کے بجائے ”جان جانان“ موزوں
کیا ہے۔ اس لغت کے متعلق میر صاحب کا ارشاد ہے کہ ”چوں
اکثر حوام نام مرزا از غلطی جان جانان می گویند، شاعر کو رنظیر
برمنٹ بھی نہیں موزوں کردہ اگرچہ فی بابست کا گٹھوٹے مایا
خاص است“۔ آخری جیسلم اس لفظ کو نظر کا حامل ہے کہ ششیر
خواص یا بہ الفاظ دیگر یا ران مکتہ دانی کے سمجھنے کی چیز ہے۔

یہ کو غلط الحام کا استعمال جائز ہے مگر اس سے احتراز کرنا بہتر ہے
میر کے خیال میں قوائد وکاس ایسی اصطلاح ہے جو شاعر نے
اختصاصاً حال کے لئے وضع کی ہے ورنہ متبادرہ اشعار سر قلم ہی

۱۰ صفحہ ۱۰۰، ۱۱ صفحہ ۱۱۱، ۱۲ صفحہ ۱۱۲، ۱۳ صفحہ ۱۱۳، ۱۴ صفحہ ۱۱۴

برنی ہوئی شکل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یقینی کے ذکر میں رقمطراز ہیں
کہ ”اکثر شاعران ریختہ را مبتدل بنویا فترام۔ میگویند قدارو
ی نامند گویا اب شعر استاد در حق ایشان است سے

ہرچہ گویند سہل عمل گویند
اور قدارو غزل غزل گویند“

تذکرہ نگار یا لفظ کا سب سے پہلا اور خوش گوار قرض انصاف
غیر جانب داری اور فراخ دلی ہے۔ ان بنیادی لوازم خصوصیت
کی روشنی میں تیر کا سب سے بڑا کمال وہ منعقاد اور سہل لاگ
فہمیت ہیں جو انھوں نے شعراء کے ادبی مقام کا تین کر کے ہوئے
مادہ فرمائے ہیں۔ اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس تیر صاحب
نے اس تذکرے میں بڑی لوداری، انصاف پسندی اور خود خواہی
کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی نازک مزاجی ضرب المثل ہے۔ اپنی عام
زندگی میں وہ نہایت آشفتمند طبع، زود رج، خود بین اور بدست
انسان تھے، اسی وجہ سے اکثر معاصرین سے ان کی شکایت ملتی رہتی
تھیں، لیکن نکات انشوائی میں اکثر ایسے مقامات آئے ہیں
جہاں انھوں نے ذاتیات سے بلند ہو کر حقیقت کی ترجمانی کی ہے اور
صدائے انوکھ پس پشت ڈال کر شعور کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

میر صاحب کے دالہ سے دو شادیاں کی تھیں۔ سراج الدین علی علی
اور وہ ان کی پہلی بیوی کے بھائی اور تیر دوسری بیوی کی اولاد
تھے۔ غالباً اسی بنا پر دونوں نے تعلقات ہمیشہ ناخوش گوار رہے۔
اس رشتہ نامی کی تفصیل ”ذکر میر“ کے اوراق میں ملتی ہے۔

والد کے انتقال کے بعد علی بی بی بیٹے پر چلی حالت سے تیر کو دو چار
ہو تا پڑا ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

”جو کہ درویش دالہ کی زندگی میں میری

خاک پاکو سر میر سے کریموں میں لگاتے تھے، انھوں نے

یکبار کی بجائے آٹھیں پیر لیں۔ تاجا پر چڑھی گیا

اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی علی

اور ذکا مت پر پیر ہوا۔ یہی کچھ وہ ان کے پاس

۱۵ صفحہ ۸

رہا اور شکر کے بعض مصاحبوں سے کہہ سکتا ہوں پڑھیں۔
جب میں کسی قابل ہوا تو چھائی صاحب کا خط پہنچا کہ
میر ہمتی فتحہ دودگاہ ہے، ہرگز اس کی تربیت میں
سی دی جائے۔ وہ عزیز (آرزو) ذاتی و خبیادار
شخص تھا۔ اپنے بھائی کے لکھے پر میرے دوپے ہو گیا
جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ برا بھلا کہتا شروع
کر دیتے اور طرح طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش
کرتے۔ میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جب کسی
دشمن سے ہوتا ہے۔“

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:-

”اگر ان کی دشمنی کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر
ہو جائے۔“

اب آرزو کی شخصیت کا وہ مرقع دیکھئے جو نکات و اشعار میں
پیش کیا گیا ہے:-

”شاعر زبردست، قادر سخن، عالم فاضل، تامل
ایچو ایشان بہ ہندوستان جنت نشال ہم نر سیدوہ
بلکہ مجھے دہرایں رود، شہرہ آفاق درسی فی
فاق..... حاصل کمالات اوشان از جڑہ بیان
بیرون است۔ ہم استادان مضبوط فی ریختہ
ہم شاگردان اُن ہر نگارند۔ گاہے ہر اُسے فتنی ملی
دوسرے شورشیر فتحہ از فی فی ہے اختیار را کہ ما اختیار
کر دہ ایم! اختیار دادہ اند۔“

دیکھئے یہاں تمام ذاتی اختلافات اور عائلی مسائل کو بالائے لاق
رکھ کر انصاف کی بات کہہ دی۔ اگر کوئی شخص اس قرینہ و توصیف
ور احزاب کمال کو فتنے یا عائلی سے تعبیر کرے تو دوست نہ ہوگا
وہوں بیانات میں اختلافات کا سبب ان کماتوں کی بنیادی حیثیت
کا اختلاف ہے جس سے وہ متعلق ہیں۔ ”ذکر میر“ تیری آپ میری
عادت“ ”آفتاب کلام میر“ ”ترتیب عدلی“ ”سفر“

۳۴ صفحہ

جسے ان ہوں نے آرزو کی شخصیت کے اخلاقی پہلو اور کردار کی
فرد و درویش سے بحث کی ہے۔ ”نکات و اشعار“ ایک ادبی کیفیت
ہے اس لئے اس میں ان کے کمالات فن اور علمی و ادبی انفعلیت
کی وضاحت کی گئی ہے۔

تیرے معاصرین میں سودا بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں،
اپنے ایک سفر میں تیرے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ
”وقت ہو تا مارا شکل سے تیرا اس شکر کے فن میں
پڑتا سودا کبھو ہوتا ہے سودا جی ہے کیا جائے
سودا جیے علامہ وقت اور یا کمال شخص کی ذات پر جہاں است،
کا اطلاق حد سے بڑھ چکا ہوئی اتنا نیچے کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن اس
کو کیا کہا جائے کہ اس قسم کی مہماندازی تیرے تعلیمات ابتدائی سے
ایک روایت کی طرح اردو و فارسی غزل گو شعرا کی سرشت
میں داخل رہی ہیں۔ سودا بہر حال ایک عظیم فن کار ہے
اور تیرے کبھی اس فن کا رسی اور ملک اشترانی کا اعتراف
ہے۔ منتظر بلا شتر ایک شاعر کے خود ستائش کی صدائے گشت
تھا۔ اب ایک تذکرہ نگار کی زبانی اسی سودا کی قدرو قیمت اور
فنی عظمت کا بیان سنئے:

”سرگود شترانے ہندی است، لب بارخو شکوست
..... درجی بدئی، الفاظش گل منی دستہ دستہ
ہر مصرعہ رحمتہ اش اسرہ آواز بندہ، پیش فکر
عالمیہ لہج عالی شرمندہ، شاعر دینیت چنان چہ
ملک اشترانی رختہ اورا شناید.....“

عدلی تاہاں کے موضوع فکر سے تیرے اتفاق نہیں پھوسا
ان کی رنگین نگارگری کی داد سب سے بڑی ہے۔ اس سلسلے میں ایک
قول پہلے ہی نقل کیا جا چکا ہے۔ چند تیلے اور ملاحظہ فرمائیے:

”تامل، رخ فہ شتر، ایچو اشعار خوش خاطر
لہر مہر کلم، جلوہ گردن شہرہ ہو.....“

پہ شتر اد استاد، ”عدلی“ ”فقت“ اورا تیرہ خاکری

۳۵ صفحہ

موزوں اور بریل الفاظ کا انتخاب کمال شاعری کی دلیل ہے۔ لیکن یہ کمال پر شخص کا حصہ نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تمام شاعر جس کے اشعار میں تعریف کیا گیا ہے اس حقیقت سے نا آشنا اہل اس جوہر سے بہرہ وختے۔ البتہ ان کی نظر میں اس مقام تک رسائی حاصل نہ کر سکیں، جہاں پہنچنے میں تیری کی دودھیں انہیں کامیاب نظر آتی ہیں۔ چیز شاہیں میں ان کی نظر کی جاتی ہیں

(۱) افام اشعار بیتی نے کہا ہے کہ
مجنوں کی خوش بیتی کرتی ہے داغ مجھ کو

کیا عین کر گیا ہے ظالم دوانہ میں

بیر کے خیال میں اگر خوش بیتی کے بجائے "خوش معاشی" کہا جاتا تو شربت "ہامزہ" ہو جاتا۔

(۲) میر تقی کا ایک شعر ہے کہ

بے تکلف ہو سچوں سے وہ لے ہے سجاد

دختر زنجی بوج طرح کی مستانی ہے

میر صاحب کہتے ہیں کہ اگر میرا شعر مہوتا تو میرے اول اس طرح موزوں کرتا ہے تکلف ہو نہٹ سے چڑے ہے سجاد

(۳) معطفہ خان لکھنوی کہتے ہیں کہ

پیر کے جو سوارا صاحب نے

راستی ہے گی دار کی صورت

میر صاحب فرماتے ہیں کہ "معتاد فیر" بڑے کے بجائے صرف "حق" اول ہے کہ

(۴) لکھنوی کا ایک اور شعر ہے کہ

اس کو مت بوجھو سب اوروں کی طرح

معطفہ خان نا آشنا لکھنوی ہے

اگر میر صاحب کا ہوتا تو وہ اپنے حب اللہ شاہی مصرع اس طرح نظم کرتے کہ

مت توں اس میں سمجھ آپ سا کہ

(۵) آیت اللہ صاحب نے کہ

موزوں کے معنی ۲۰ صفحہ ۳۳

نہیں تارے بھرے ہیں شب کے نقطہ

اس قدر شاعر خلک ہے غلط

میر صاحب کی رائے ہے کہ اگر "اس قدر" کے بجائے "کس قدر" کہا جاتا تو شعر آسان پرینچ جاتا۔

اس حقیقت سے کہ انہیں ہو سکتا ہے کہ ان کا اصلاح

مغزوں کی طبیعت دمنوبت ہیں اصل اشعار سے زیادہ بلندی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان اصلاحات سے میر کا مقصد

شعرا کی تامل کی نا اہلی کا اظہار کیا ان کے فن کی تنقید نہیں۔ ان کے

مغز سے ایک قیری اور اصلاحی جذبہ پریتی ہیں۔ ان کا مگر نظر

حرفیہ یا مآخذ خودہ گیری نہ تھی، ورنہ وہ ہر شعر کے کلام سے قابل اعتراض اشعار انتخاب کر کے اس کی کوتاہیوں کا مذاق

اڑا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ دوسری خصوصیت

کے علاوہ اس خصوصیت سے تیری کی دیانتداری اور سادگیت کا

فخر ملتا ہے۔

اس قدر کہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر کو ادو ادب کی تاریخ میں چند کشفیات کا فخر بھی حاصل ہے۔ انہوں نے

پہلی مرتبہ ایسی دو ایک باتیں لکھی ہیں جن کے متعلق ان کے ساتھ

پے لیز کسی صحیح فیصلے تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ "نہات الشعراء" کی

اہمیت کا پہلو بھی نظر انداز نہ کیا جائے گا کہ وہ پہلا تذکرہ

ہے جس میں ادو کے قدیم شاعر سدری کے تذکرے میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:

"اچھے بعض این را شیخ سحری رحمتہ اللہ علیہ محسن

بیرہ اندر خطاست کہ

بیر کے اس قول فیض سے قائم چاند پوری کے مژدہ ذیل خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ:

"اتفاق ہمدرد آمنت کہ بہوں حضرت شیخ سحر شیرازی

در نگاہ سیاست بہ طرف لغوات کنز لغت آوردند

یک دو غزل دینند از دیوانیات بر سبیل تعجب پس

ملہ صفحہ ۱۱ ملہ صفحہ ۱۰۳

یہ حقیقت بھی اس تذکرے سے بے نقاب ہوتی ہے کہ مرزا فخر کا نام شہرت عام کے برخلاف "جان جان" تھا۔ تیسرے اس دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھ ہے کہ:

"پندرو مرزا جان نام داشت۔ از خط شفقت مرزا جان بنی
ی گفت ازین سبب رہیں اسم معصوم است۔"
پھر یقینی کے ذکر میں اس حقیقت کی مزید تشریح کرتے ہوئے
لکھتے ہیں کہ:

"الکثروام از غلی نام مرزا جان جانان ی گویند۔"
لیکن اس نام سے موسوم ہونے کا جو سبب بتایا گیا ہے اس سے
مجھے اتفاق نہیں۔ اصل وجہ تفسیر کامل حضرت منظر دہ کے خلیفہ
شاہ قسیم الشک کے اس قول سے ہوتی ہے کہ:

"چون خبر ولادت آن حضرت برس مبارک عالم گیر
وسید، فرمود کہ پیر جان پوری باشد۔ چون نام والدین
مرزا جان است۔ نام پیش راجان جان مقرر کردم۔"

"نکات اشرا" کی درن گردانی سے ایسی ہی کچھ اور باتیں بھی
منظر عام پر آتی ہیں جو چند ان اہم نہیں لیکن ان کی تاریخی حقیقت
مسلم ہے مثلاً ولی کو سب سے پہلے "باشند" اور نگ "آؤ" اسی
"تذکرے میں لکھا گیا ہے یا تیرک متعلق خواجہ ناصر محمد علیپ کی یہ
پیشین گوئی کہ "میر محمد تقی تیسرے مرزا خان شہر" جو معتقد کے
سوانح حیات کا ایک جزو ہے، معتقد کے خود غویہ انوائز میں بیان
کی ہے اور اس کی تکمیل پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھ ہے کہ،
"الحمد للہ والمنة کہ حوت آن سلسلہ حذا پرستان
مؤثر افتاد۔"

اس تذکرے سے اس زمانہ کی ادبی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا
ہے۔ جیسے کہ "جگہ ایک" مجلس "ریختہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ مجلس
براہ کی پندروھوئی تاریخ کو انھیں کے یہاں ہوا کرتی تھی۔ تذکرے

لے غزل نکات صفحہ ۱۷۹
لے ممولات منبری صفحہ ۵۰
تے صفحہ ۸۹

کی تعینیت سے چار پارچہ سال قبل اس جلسے کی جائے انعقاد
حضرت علی خاں دکنی کا مکان تھا، اس کے بعد خواجہ میر درد کی دانش گاہ
اس اجتماع کے انعقاد کوئی تھی۔ آخر میں خواجہ صاحب کے
امرا پر تیسرے اس مقصد کے اپنے مکان کے استعمال کی تجویز
منظور کر لی تھی۔ اس کے علاوہ میر سجاد اکبر آبادی، علی نقی کافر،
حافظ حلیم اور بعض دوسرے لوگوں کے یہاں بھی اس قسم کی مجلسیں
منظم ہوتی تھیں جن میں تیسری بھی مندرجہ ہوئے تھے۔ ان مجالس
کے لئے، نکات، اشراء میں ایک جگہ لفظ "مراختہ" استعمال
ہوا ہے۔ یہ لفظ اس زمانے میں "مشاعرہ" کے وزن پر ایسا ہی فعل
کے لئے وضع کر لیا گیا تھا جس میں شاعرانہ یا شاعرانہ کام مناسبت تھے
شاعر کا لفظ ان مجلسوں کے لئے کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسرے جدید "مشاعرہ" کی اصطلاح صرف
فارسی غزل سراؤں کی مجلسوں کے لئے مخصوص تھی۔

اختر الدین علی خاں بیام کے درج ذیل قطب بنیاد شاعر جو عام
طور سے تیسرے منسوب کئے جاتے ہیں اور عبدالنسان بیدل علی بابا کو
نے "اشعار میر" میں ان کے بتدلی اور غیر فطری کام کی مثال میں
نقل بھی کر دئے ہیں، آپ نے مزور سے ہوں گے
ولی کے کے کلاہ لڑکوں نے کام عشاق کا تم کس
کوئی عاشق نظر نہیں آتا لڑکی والوں سے نقل عام کیا
"نکات اشراء" میں بیام کے نام سے ان اشعار کو موجود اس
اختلاف انتساب کے سلسلے میں حجت آخری حقیقت رکھتی ہے۔
"نکات اشراء" کی تعینیت کے دوران میں کچھ ایسی منزلیں بھی آئی
ہیں جہاں تیسری راہی قطبیت کے ساتھ نہیں کر کے ہیں۔ ایسے
مقامات پر ان کی فیصلے جزو داغ اور شکر نفا آتے ہیں۔ اہم انھیں
یقین کے لکھ شعر گوئی سے بھرہ ہونے کے متعلق ان کے ساتھ ایک
متمم واقعہ بھی تقابلی ہے وہ خود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:-
"میان شہاب الدین ثاقب نقلی کرو کہ میں سخن رہے
استان بخارا اور ہم تو یک غزل طرح کردم، میں غزل

باغرام و سابتم و از و معرے موزوں نشدہ! لے
لیکن اس کے باوجود ان کے بارے میں اس سے زیادہ برکت
کے کہ :

” مردمانی گفتند کہ مرزا مظہر اور اشتر غصتے ہی بدو وارث
خبرائے رحمتے خود گردانیدہ ، از قبول کردن این سخن بدو
را خدہ می آید کہ ہمہ چیز باواری رسد آن اشتر
بعد از ملاقات این قدر خود معلوم شد کہ ذات حق شرفی مطلق
مژدہ دارد ، شاید از ہمیں راه مردمان گمان تا موزونیت در حق
او داشتہ باشند ، جسے بریں اتفاق و ارتقاء کا شاعر ہی او
خانی زلف حقیت کے شاعر اس قسم تم فہمی باشد ، لے
خدا معلوم اہلاد خیال میں شکوک و شبہات کی ریاضت میں کسی شوق
تذیب کا نتیجہ ہے یا یقین کی قابلیت پر پردہ ڈالنے کے لئے معصیت
ایجاد کیا گیا ہے ، میری نظریں دوسری درجہ زیادہ اہم ہے ، جو جن
نے بھی اپنے تذکرے میں یقین کی موزوں فیض سے محرومی کا ایک
واقعہ جو سودا دے ان سے بیان کیا تھا ، نقل کیا ہے ۔ لکھتے ہیں
کہ ایک دن سودا اور میر حسن زرقین کے ہاں گئے اور انہیں ملاش کئے
ایک معرے طرح دیا لیکن باوجود اہلاد کے وہ ایک شعر مذکر نہ سکے ۔
پندرہاں راقم کے ذکر میں ان کا ایک شعر نقل کرتے ہوئے
یہ صاحب نے قوی فرمایا ہے کہ :

” ابی سنی وارد و بان میر عبدلی تا بان مرحوم بر تہریدین
باجی الفاظ ملاحظہ کردہ ام ۔ سنی غائب آں است کہ
ابن خرا تا بان مذکور است چرا کہ او از دست
مشق سنی ہی کرد و این فاشق است لے
راقم اور تا بان کے اشعار مترادف با ہم معنوں تو موزوں ہیں لیکن
یہ نہیں کہ جاسکے کہ راقم نے ستر کیا ہے ۔ اس سلسلے میں تا بان
کی کہنہ مشق کے مقابلے میں راقم کی آواز کی دلیل کافی نہیں ۔
بعض اوقات فاضل شاعر بھی پرانے اور قافیا و الکلام خاہوش
سے زیادہ اچھے اور بلند شاعر سمجھتے ہیں ۔ لے نکات اشعار
لے صفحہ ۳۸۱ صفحہ ۸۲۷ لے صفحہ ۱۰۳

ہی سے تہر بحث دونوں اشعار نقل کے چاہتے ہیں تاکہ ناظرین ان
کے اختلاف کا اندازہ کر سکیں ح

جناؤ چاہیے ، اے شاعر مجھ پر باں تک کہ
کہ سب کہیں مجھے رحمت تری وفا کے تیش (دستان)
یاں تک بقول طاہر علیجے تری جنب کہ
” سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کا (دقام)
اس تذکرے پر ایک سرسری ” کاہ ڈالنے ہی میں ، حقیقت
ساتھ آجاتی ہے کہ میر صاحب نے یقین و ترقین کو زیادہ اہمیت
مذہبیہ سوئے اپنے کلم کی جولانیاں ذاتی علم یا سبب صاحب
در سید محمد باقر ناست ہی کیا ہیں ملک محدود رکھی ہیں ۔ اچھوئے
یعنی اشعار کے مختصر سوانح حیات میں کہ ان کے ناموں کے متعلق
حصول معلومات کی زحمت اٹھانے کے مقابلے میں عدم واقفیت کے
اہلاد کو ترجیح دی ہے ۔ چنانچہ دلی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ،
” احواشی جانی سرزمین نیست ، لے
معصی ، خان یزدگ کے ذکر کا یہ اختصار بھی اسی رحمان
کی عفو کرتا ہے ۔

” یزدگ شاعر رحمتہ ، ماہر مہیاں ، آہوئی کوئند
کہ سب اچھوئے اختلاف و آشنائے دوست بود

بتدہ از احوال او غرب الملاح ندادم ” لے

محمود فاضلہ در دمتدا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

” ہر چند کہ ایک طافات ، با او کردہ ام لیکن خوب

از احوال شریف مطلق نیست ۔ اس قدر دقام کہ نظر یافتہ

مرزا مظہر سلور است ” لے

حبیب کے متعلق فرماتے ہیں :

” احواشی معلوم نیست ، از ماضی سید صاحب

مذکور دخرے فوشستہ شد ” لے

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ اوجاز و اختصار سے کام

سے کرم و تعلق کے بعد ایک یا دو شعر نطق کر دیئے۔ پھر اٹھ گیا گیا
ہے۔ یہ کوتاہیاں جو کرم و تعلق پسندی کا نتیجہ بھی جاسکتی ہیں،
ایک تذکرہ نگار کی شان کے خلاف ہیں، لیکن ان کی موجودگی
کے باوجود "نکات الخراء" ایک عظیم ادبی تخلیق ہے۔ چند
خامیوں کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت میں کوئی فرق نہیں

آسکتا کسی ادیب یا معتمد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ فروغ و ترقی
کا مرکب نہ ہو یا حقیقت سے مرہم و توازن نہ کرے، اس کی اولیٰ علت
مجھے سمجھنے کے برابر ہے۔ تیرے کلام میں بھی اسقام موجود ہیں پھر بھی
اس کی عظمت اور بادیت میں کلام نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح
"نکات الخراء" بھی ایک نقیض دوام کی حیثیت رکھتا ہے۔

نادر بزدانی

غزل

قدم قدم پر حسابِ نظام عالم ہے
وہ اعتبار ہماری نگاہ پر کم ہے
نشاط و گریدِ مطلب ہے جو بھی عالم ہے
فریب دل نے محبت میں کھائے ہی کیا کیا
کی کو پھول بست نا بھی ہے پریشانی
اسی سے ذوقِ لطافت کی واد کیوں چاہو
نہیں جھلکے دل و دس، ذرا نقاب اٹھا
وہ شمعِ طور میں ہو یا چیراغِ ہریں ہو
نیشہ پیو دگی، رنگِ لالہ، نقشہ موج
وہ رقصِ شعلہ، وہ سوز و گدازِ پردانہ
ان آئینوں کی حقیقت کو کون سمجھے گا
حدودِ دیر و حیرم سے گزر چکا شاید
جلالہ نور کو بے حیرم، اس نگاہ کی زیر

جمال یار، یکس کی نظر سے برہم ہے
جس اعتبار کے قابلِ نظام عالم ہے
صدائے نغمہ ہے غم میں نہ شور یا تم ہے
ہر اک فریب پر اب تک یقینِ محکم ہے
بہار سے بھی عروسِ جمال برہم ہے
جسے خبر ہو کہ پھولوں کی زندگی کم ہے
وہ ایک لمحہ سہی، ایک لمحہ کیا کم ہے
جہاں جہاں ہے تعلق، نظر سے برہم ہے
ترے جمال کی ہر مقرر خود ہی مبہم ہے
چرخِ چراغ ہیں روشن، عجیب عالم ہے
کہ جن میں موت نہیں، زندگی کا ماتم ہے
کہ اب اجازتِ سیدہ ہے اور پیہم ہے
تری نگاہ تو میری نظر سے برہم ہے

حیاتِ راز و غیر نہیں زمانے میں
مگر تمام زمانے کو موت کا غم ہے

بہاروں کو سلام

سیفِ جنتِ طرب، اسے نیرِ فصلِ بہار سکونِ درِ جگر، راحتِ دلِ پیار
قرارِ خاطرِ بے تاب، وجہِ میر و قرار بصدِ خلوص بصدِ عز و افتخار سلام
مرے وطن کی بہار و تمہیں ہزار سلام

کلی کا کہ ہے دل میں شگفتگی کی اُمتنگ جو دل ہے سوچ کے حیران آنکھ دیکھ کے دنگ
بچشِ خمدِ مہرِ تری یہ لطفِ رامش و رنگ فردِ بخ لالہ و گلِ جلوہ بہار سلام
مرے وطن کی بہار و تمہیں ہزار سلام

نجاتِ اہلِ گستاں نے پائی خاروں سے زبے نصیبِ ملا امنِ فتنہ کاروں سے
زمینِ بندِ ملاتی ہے آنکھ تاروں سے وطن کی پاک زمیں تجھ پہ بے شمار سلام
مرے وطن کی بہار و تمہیں ہزار سلام

ہیں وطنِ میں وہ ایسا متیازِ پست و بلند تہیں ہے کوئی بھی درِ ایسی کے واسطے بند
ایسا پی اپنی خوشی ہے اب اپنی اپنی پسند نظامِ ہند کے آئین با وقار سلام
مرے وطن کی بہار و تمہیں ہزار سلام

اٹھ اچکے ہیں کلاتیں سے ایخزاں کے علم کہ آگیا ہے گلوں کے نکھار کا موسم
خوشن نصیب کہ بچ کا بہار کا پرچم نشانِ اوج و وطنِ نازش بہار سلام
مرے وطن کی بہار و تمہیں ہزار سلام

مسلم ہیں یہ ہونے خواہیں ہر دار و درم سلام ان پر مٹائی بنوں نے رسمِ کھن
مسلم ہیں یہ ہونے جو تہذیبِ راہ و وطن مرے وطن کے تہذیبِ راہ جاتِ نثار سلام
مرے وطن کی بہار و تمہیں ہزار سلام

ہمارے نئے صدر

ہمارے نئے صدر چھوٹے عمر سے ہی ہندوستانی بھوکے ہراس
چیز کے دلدادہ رہے ہیں جس میں گہرائی، بلندی اور استقلال پایا
جاتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہم ہندوستانی حرف
بھوکے امانت دار نہیں بلکہ ہمیں روحانیت کا ایک سرچشمہ بھی ورثہ
میں ملا ہے، جس سے بڑی جان دار اور تخلیقی قوتوں کے سوتے بہہ
نکلے ہیں اور جو صدیوں سے فاجحانہ طور پر بہتا چلا آ رہا ہے۔ ۱۹۰۸ء
میں جبکہ ان کی عمر صرف بیس سال تھی ان کی کستاب

Ethics of Vedanta (دیانتی اخلاقیات) شائع ہوئی
جس میں ان کی آئندہ تقریروں کی بعض جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کتاب
کے ذریعہ نظام دیدانت کے خلاف اس اعتراض کا جواب دینا
مقصود تھا کہ یہ نظام دوسری دنیا سے متعلق ہے اور اس میں
اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ درحقیقت وہ ساری عمر
ہندوستانی فکر و خیال کی بہترین ترجمانی اور ہندوستانی بھوکے نامزدگی
کرتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے دھرموت
ہندوستانی مکاتیب فکر میں ہم آہنگی پیدا کی بلکہ مشرق و مغرب
برحمانہ میں بھی امتزاج پیدا کیا۔ آپ کے باب میں یہاں تک کہا
جاسکتا ہے، چونکہ وہ دنیا کے فلسفیانہ اور مذہبی خیالات سے پوری
طرح واقف ہیں، اس لئے ان کے نزدیک مشرق و مغرب، مادی
حال کی کوئی تمیز نہیں۔ ان کے سامنے ایک ایسی انسانیت کے

بارہ سال تک ملک کے سب سے بڑے ہمدے پر ناگزیر رہنے کے
بعد ڈاکٹر راجندر پرساد ۱۳۔ مئی کو اس سے دست بردار ہوئے اور
اسی دن ڈاکٹر مرواتی رادھا کرشننی نے نئے صدر کی حیثیت سے
حلت اٹھایا۔ ڈاکٹر پرساد ہمارے ضلع سالہ کے ڈیراٹی گاؤں کے
ایک کسان خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اب تقریباً پندرہ سال تک
غریب زندگی کی اعلیٰ ترین اور مشکل ترین ذمہ داریاں پوری کرنے کے
بعد اپنے صداقت انترم میں واپس پہنچ گئے ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشننی
نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے پکارا یا کہ ڈاکٹر راجندر پرساد
جنگ، ہجرت، ہمداد اور بدھ کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنگ
راج رشی تھے اور آزادانہ عمل کا طرہ امتیاز تھا۔ ہجرت کی
فرض شناسی سے متاثر ہے۔ ہمداد نے یہ تعلیم دی کہ جس مذہب میں
اخلاقی قدروں سے روگردانی کی جائے وہ مذہب نہیں کہلا سکتا۔ بدھ
رحمدی کامنڈ تھے۔ بودھ حاصل کرنے کے بعد وہ پنڈت لیس سال
تک انسانیت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر پرساد میں یہ
ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ سادگی، وقار اور مقبولیت پسندی
ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ خواہ کسان ہو یا راج
مکی ہو یا غیر ملکی، جو کوئی بھی صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ڈاکٹر پرساد
سے ملے، وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کا وہ ہندوستان اور ہندوستانی
بھوکے لگان ہیں۔

فکر و خیال کی دنیا ہے جو جسمہ آدھی ہے۔ ان کا نقطہ فکر محدود یا منظم نہیں بلکہ بہرگز اور مربوط ہے۔ وہ فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کو ایک ایک خانوں میں نہیں رکھتے تھے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جہیز میں ایک جسم کامل کے اعضاء دوسرے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ خود انسانی زندگی ہے جو بڑی رنگارنگ اور نامانی ہے۔ وہ مذہب یا فلسفہ کے بھی ایک نظام سے وابستہ ہو کر نہیں رہ گئے۔ وہ ہمیشہ زندگی کے متعلق اور بنیادیوں کے مستند متلاشی رہے۔ ان کے عقائد اور ایک باقی پر قائم ہیں، مذکورہ فکر خیال اور متعلق پر۔ ان کا فلسفہ اخلاق کی اقدار پذیر خواہش اور شعور پر مبنی ہے جو بلند تر فکر، دین سے ترقی زندگی اور پرستش بقا کے لئے سرگرم عمل ہے۔

فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کے متعلق ان کے غیر تقلیدی نکتہ نظر اور ادراک بالکل نئے پرستانہ ترائی کی تشریحات تھے۔ پر آدہ کیا۔ اس میں شامل ہیں اپنیشدر، پرہم سوترا اور جگوت گیتا۔ اگرچہ یہ تشریحات آخری زبان میں ہیں پھر بھی ہندوستان میں کے نزدیک ان کا عظیم ترین کارنامہ ہیں۔ انہی کی بدولت وہ آچاریہ کے رتبے کو پہنچے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو شکر، ادھو اور رامایا کو حاصل تھا۔ وہی شخص آچاریہ یعنی استاد کہلاتے۔ ماسٹر۔ بھی جانا ہے۔ جو ان کتب متفکرانہ بنیا د پر ایک مربوط نظام فکر قائم کرتا ہے۔ فلسفہ اور مذہبیت کے ایک عظیم تعلیمی مسکن کی حیثیت سے دنیا کے علماء و فضلاء میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے ہندوستانی فکر و خیال کی ترجمانی کے کٹھن اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی مدد میں بھی ڈاکٹر رادھا کرشننی کا مرتبہ بلند و محفوظ ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشننی ۱۸۸۸ء میں ایک تقلید پرست متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی جنم بھومی ترقیاتی (Tiru tami) اور ترقیاتی (Tirupatt) میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہ دونوں مقدس مقامات ہیں اور دور دراز

سے لوگ یہاں زیارت کے لئے آتے ہیں۔ مگر تقلید پرستی سے انھیں بھی کوئی دل چسپی نہ ہوئی۔ اولیہ باجول آزادانہ فکر و خیال کی دنیا کی طرف قدم بڑھا رہے تھے جن کو کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکا۔ مسیحی اداروں میں ان کی تعلیم بڑی مقید ثابت ہوئی۔ انھوں نے ایک نو انجیل سیمیت کا قریبی مطالعہ کرنے کا مرتع ملا۔ دوسرے انجیل ایک تبلیغی قبول کرنا پڑا۔ ہندوستانی فکر اور ثقافت کے خلاف جو اعتراضات کئے جاتے تھے، ان کے پیش نظر انھوں نے ہندو عقائد کا پورا مطالعہ کیا، اور اس طرح انھوں نے ہندوستان کی روح اور اس کے فلسفہ و مذہب کے زندہ جاوید مرتبہ کا پتہ لگایا جو بہت سی بے صحت اور مردہ رسمیات کے خنس و خاشاک میں دب کے رہ گیا تھا۔ لیکن یہ تحریروں نے ان کے خیالات کو تقویت پہنچائی۔

۱۹۱۸ء میں انھوں نے اپنی کتاب *Philosophy of Rabindra*

Nath Tagore شائع کی۔ یہ گورو کی کتاب بہت پسند کی۔ انھوں نے ڈاکٹر رادھا کرشننی کی تعریف میں جو کہ لکھا وہ کئی اعتبار سے اہم ہے، شاعرانہ لکھا تھا۔ ”آپ کی مستندی اور ژرف نگاہی نے مجھے متحرک کیا۔ زبان کا ادبی محسوس کرنے پر ہمارے ہے جن کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ الفاظ کے معمولی اور طبعیت کے اظہار بعض عیسوی راغیوں سے پاک ہے۔“ ان الفاظ میں شاعرانہ علم نے ان کے اسلوب نگارش اور اس کی خوبیوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں ہی ان کا انداز تحریر ترقی کر کے اس منزل پر پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر رادھا کرشننی اب بھی جو کہ لکھتے یا لکھتے ہیں، اس میں یہی عموماً مستورا قائم ہے۔ انسان لکھنا مشکل ہے اور انسان اور مؤثر انداز میں لکھنا اور بھی دشوار ہے، خاص کر جبکہ فلسفیانہ مسائل پر مؤثر انداز میں لکھنا ہو۔ لیکن ڈاکٹر رادھا کرشننی اس میدان میں بھی نمایاں طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسی کامیابی حاصل کرنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اُنھیں ہونے مسائل اور اجتہاد و ترقی و مزج عانت سے متعلق ان کی تحریروں میں بھی ایک ادبی سحرانگریزی پائی جاتی ہے جس سے ہم بہت متاثر ہو کر

رہ جاتے ہیں۔ ان کے اکثر مجھے مدتوں ہمارے ذہن میں گھومتے رہتے ہیں اور اپنے اثر و نفوذ کے باعث ہمارے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "مذہب کا مقصد صرف حق ہے۔" "مذہب عقل بنیادوں پر زندگی گزارنے کا دوسرا نام ہے۔" "مذہب کا میاب ملل اور صحت سابق اداؤں کے ذریعہ مذہب کا افسار ہونا چاہیے۔" "سچے دل سے ہی خدا کا جہود دینا جا سکتا ہے۔" اور "سچائی کو پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت نہیں بلکہ تجربہ کا دل چاہیے۔" فلسفہ اور مذہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی ان کی تحریریں ایسے ہی اثر و نفوذ کی حامل ہیں جیسے ان کے اس قول میں کسی اضافے کی کیا گنجائش ہے: "آخریت نابھ سوں کا اختیار ہے۔" یا "حقیقی جمہوریت وہ ہے جس میں انسانی عقلیت کی قدر کی جاتی ہے۔" انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ اپنے موضوع اور بیان کے اعتبار سے لایسکی قدر قیمت کی حامل ہیں۔

Indian Philosophy, An Idealistic View of Hindu,
Religion of Religion in Contemporary Philosophy,
Gautama the Buddha, Religion & Society.

یہ سب کتابیں بلا تفریق کی زینت ہیں۔

ڈاکٹر دادا صاحب مشنر جیسے لوگوں کی تخلیق قوت کی نشوونما کے پس پشت وجدانی کیفیت کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال آپ کے دل کے اندرون کو خوش سے جویندگی باقیں! ہر آسانی ہی ان سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ "مٹا ہونے کے پس پشت ایک ان دلچسپ دنیا" ہر ان کا مستقبل ایمان ہے جس کو دیکھنے سے زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو ذہن کے مقابلہ میں دل کی آنکھ سے زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ عقلیت پسند فلسفیوں میں شامل ہیں جس کی تعریف کا ایک بار ایک ان دلچسپ پردہ ان کے فلسفہ کے پس منظر کے پتے پر چھایا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ادراک یا حقیقت پر قائم ہے۔ ان کی ذات میں ہمیں ایک جھڑی سے زیادہ پھرتے روشنی میں صفات ملتے ہیں گودہ کسی بڑے بڑے جھڑی سے کم نہیں۔

انھیں اپنی زندگی میں شعلوں، آگ، ششوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ایک فنی قوت پر ان کا ہمیشہ جھروسہ رہا جس نے ان کی مدد کی۔ یہی فنی قوت، انسانوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتی ہے۔ ایک ہر تعلیم کی حیثیت سے وہ علمی انداز اور تیار کس یونیورسٹی کے دانش چاندلر بن گئے۔ اس کے بعد انھوں نے یونیورسٹی تعلیم سے شغل غیش کی صدارت کی اپنی ان کی شہرت و دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ ہمارے وزیر اعظم نے اپنے وزیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انھیں روسس میں ہندوستانی سیفر کے عہدے کے لئے منتخب کر لیا۔ سیفر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جو راجشاشی میں سے براہ راست بات چیت کر سکتے تھے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ دس سال تک نائب صدر کے عہدے پر سربراہ رہے۔ راجہ سبھا کے چیرمین کی حیثیت سے وہ اس کام نہایت برتری داری، حاضر جوابی، مزاح اور چابک دہق کے ساتھ انجام دیتے رہے جس کے باعث انھیں "لکھی رولنگ" دینے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی زمانے میں آپ عقلیت مناک کے دور سے برہمی گئے، یہاں آپ نے انسانی لیاقت اور دانش مندی کے ساتھ ہندوستانی لافظ منظر پیش کیا جس سے مخالفت ذہن بھی تامل ہو گئے۔ لیکن ان مصروفیات کے باوجود ان کے مطالعہ اور تفسیر کی کام میں کوئی کاوش نہ پڑی۔ انھوں نے ہندوؤں کی کتب مقدسہ کی تشریح مکمل کی۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے کہا تھا۔ "میری اصلی زندگی قیہی ہے، باقی سب کچھ جھاگ کی طرح ہے۔" انہی کے ایک افسانہ داروہ یونیورسٹی نے دنیا کے مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک عجیب و غریب ادارہ قائم کیا جہاں تمام مذاہب کے لوگ مشترکہ زندگی گزارتے ہیں۔

اب ڈاکٹر دادا صاحب کوشن کو ریاست، سیلیوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں نے چھاری کر تارے سے صدر منتخب کیا ہے۔ کل ۳۰۹ ممبروں نے انتخاب میں حصہ لیا۔ ان میں سے

۲۹۳۰ء نے ان کے حق میں رائے دی۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا سرکاری فریج بہت معمولی ہے۔
کافی اور رسمی طور پر انہیں پینے، سیکرٹری اور دوسرا ملنے کا
اختیار حاصل ہے، آٹھ ملے، انہوں نے کبھی نہیں رکھا کسی نے ان سے
پوچھا کہ جب آپ ملک سے باہر جاتے ہیں تو اپنے بڑے چاہنے والے
پیش فیکر سیکرٹریوں اور خدمت گاروں کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟
انہوں نے اس کا جواب دیا۔ ”ہم لوگ زیادہ شور مچاتے ہیں۔
مجھ جیسے لوگ جہاں بھی جاتے ہیں ان کی دلچسپی جہاں کی باقی ہے،
خواہ یہ ماسکو ہو یا پیرس، لندن ہو یا واشنگٹن۔“

صدر کا ہمدستیناٹے کے بعد ان کے نزدیک جو باتیں سب
سے زیادہ اہم ہوں گی ان کا اعزازہ ڈاکٹر رادھ کرشنن کی اس
تقریر سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے ۱۱ جی کوپارلیمنٹ کے میزوں
کے ساتھ برسرِ رسمی طور پر کی تھی۔ اس وقت تک ان کے انتخاب
کا بھی باقاعدہ اعلان کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے جمہوریت کی بہت
دل چاہ کر قریب پیش کی تھی۔ ”ہو سکتا ہے کہ دوسرا آدمی نراڈ
اچھا اور زیادہ دیر ہو۔ ایک بچے جمہوریت پسند کا بھی نقطہ نظر
ہونا چاہیے۔ اس نقطہ نظر سے انکساری، قوت برداشت اور
میر و استقلال پسند کرنے میں مدد ملے گی۔“ انہوں نے ہمساک
”ہندوستان میں ساری برائیاں غریب، اور اقتصاد و سیاسی
زندگی میں یکساں مواقع کی عدم موجودگی سے پیدا ہوئی ہیں۔“
انہوں نے بتایا ”ہم ایک منظم پھر کے وارث ہیں، لیکن ہمیں
نئے زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا پلین
قبول کرنا چاہیے۔ اب ہم اپنی روحانیت کا رشتہ آئندہ سے
نہ جانے دیں جو ہمارے پھر میں سب سے زیادہ دیر پا ہے۔“

ڈاکٹر رادھ کرشنن کی طراپ ستر سال سے زیادہ ہو گئی
ہے۔ گران پیاس کا کوئی اثر نہیں۔ وہ سیدھے اور تیز چلتے ہیں۔ ایک
لبا کوٹ پہنتے ہیں۔ وہ شرافت اور وقار کی تصویر معلوم ہوتے
ہیں۔ ان کے پُر رونق چہرے پر ہلکی سکرابٹ گھسیٹ رہی ہے۔
ان کے سر پر ایک سفید مٹھا ہوتا ہے جس کے نیچے وہ مٹھا
ہے جو کسی حد بندی اور رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لانا اور آزادی
کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ اور انسانی زندگی کی حقیقت، انسانی
دل جی کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ جہاں کہیں جاتے ہیں، وسیع
علم اور دانش مندی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ فخر انسانی
کی تمام اعلیٰ و افضل باتوں کے دلدادہ ہیں اور نیچے، جھوٹی اور
ریک باتوں سے متنفر۔

یہ دلچسپ کر تعجب ہوتا ہے کہ جو شخص ایسی عظیم گتوں کا
معنی ہے اور جس کے کندھوں پر حکومت کی اتنی بھاری ذمہ داری
کا بوجھ ہے وہ اتنی سیدھی سادی زندگی گزارتا ہے۔ ڈاکٹر رادھ کرشنن
بہت ہی سادہ انسان ہیں۔ وہ صبح چھ بجے، ٹھہ جاتے ہیں۔ روزانہ
صبح کو آل انڈیا ریڈیو کا ”وٹنایر وگرام“ سنتے ہیں جس میں ملک کے
تمام علاقوں کے بھائی گیت سناتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ
رات کے نو بجے خبریں سننا کبھی نہیں بھولتے۔

وہ دن بھر ملنا کتابتوں، سرکاری کاموں اور کانفرنسوں میں
معروف رہتے ہیں، بس رات کو نو بجے کے بعد انہیں پڑھنے لکھنے
اور غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پھر رات کے گیارہ بجے وہ سو
جاتے ہیں۔ ان کا کانا بہت سادہ ہوتا ہے یعنی چند چمچے چاول،
دو تین سوٹ، بسکٹ، ترکاریوں کا شورپہ، پھل اور کافی۔



صدرِ جمهوریت ہندو اکڑ سر پتی رادھا کرشنن



ٹھری اور

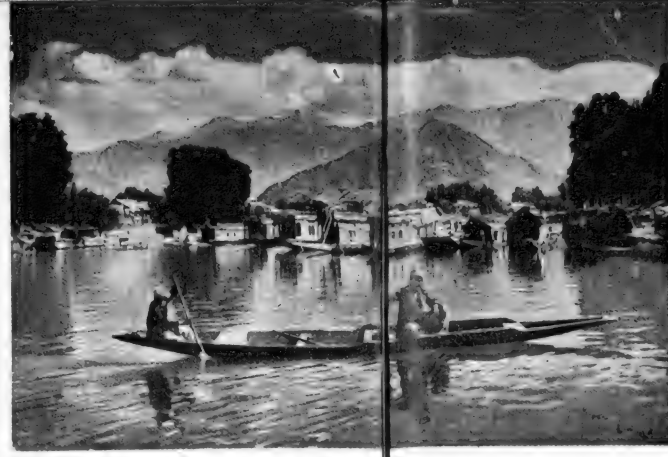
اشڈتے پادل



ہن تیں



برسات کی بہاریں



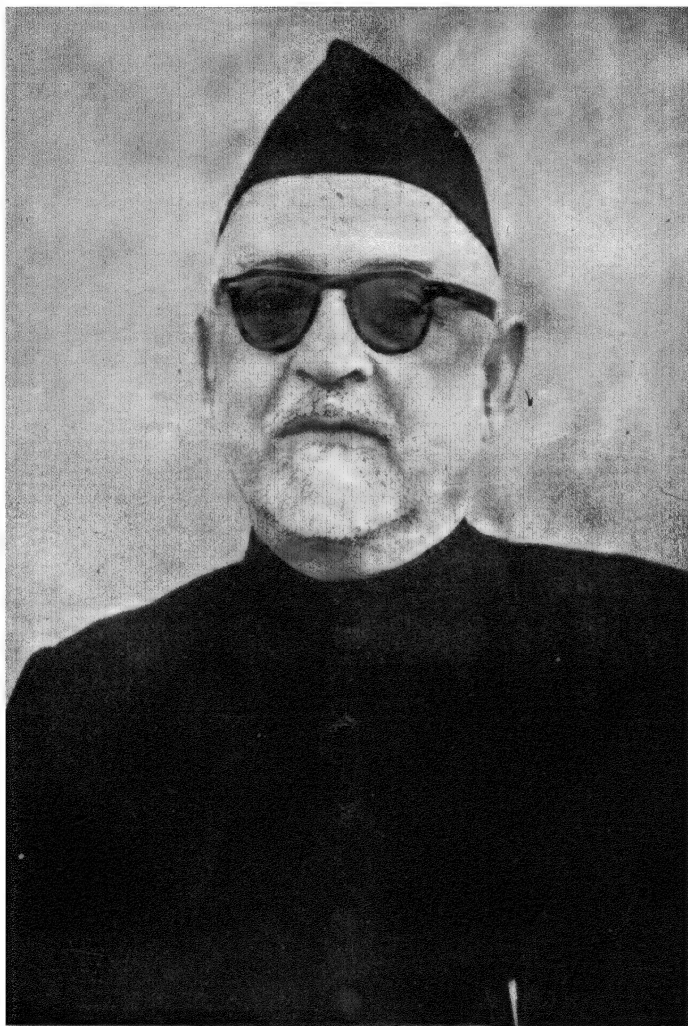
نامہش فضا



پیشی میں برسات

مٹھکھور فضا





نائب صدر مجلس شورای اسلامی
اکبر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین

ہمارے نائب صدر جمہوریہ

حلقے کے بارہویں میں مجھ سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ اس لئے مجھے کی جگہ رسی بی جو سینما گھروں کی نشستوں کے اعتبار سے باوقار اور جلسہ گاہوں کی نشستوں کے لحاظ سے بے وقار تھی۔ بہر حال اس وقت میں نے ڈاکر صاحب کا دھندلا سائنسٹن دیکھا اور کئی سی آواز سنی۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کا موقع تبنا صاحب کی محبت میں حاصل ہوا۔ میں ان کے چند جملوں سے ہی مرعوب ہو گیا۔ جب انھوں نے تبنا صاحب سے میرے متعلق یہ سنا کر یہ سستہ گروہ کی قریب میں قید رہ چکے ہیں تو انھوں نے چیل کے ساتھیوں کے بارے میں میرے تاثرات پوچھے۔ میں نے جو کچھ کہا انھوں نے فور سے سنا اور تبنا صاحب کی تفصیل سے ذکر کئے کی گنجائش ہے اور مصنفت یہی میں یہ خیال ہے کہ کیا تبنا جو بیس بیس سال بعد آج بھی قائم ہے کہ کچھ ای حالات کے مقابلے میں تعمیری کاموں میں جان کھپنا لازماً مشکل ہے۔

اے مرغِ مسمر عشق ز پروانہ بسیا ہوز

کاں سوختہ راجاں شد آواز تسیا ہ

ڈاکر صاحب انھیں خاموش کر باقی کرنے والوں میں سے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو جیز باد کہہ کر جب برہمن گئے تو وہاں سے سائنسٹا کی ڈاکٹر ٹیٹ کی ڈگری لے کر گئے۔ یہاں جا کر مشائخہ میں انھیں مجھ سوہدے کی جگہ ملی تھی اُسے قبول نہ کیا اور چار مرتبہ اسلامیہ

۱۹۲۵ء میں جب میں غازی آباد آیا تو میرے مقابل ہمدردی موعی تھا۔ ہنسنا وکیل کا مکان تھا۔ جوں تو نزل بھی جتے تھے اور مولانا حالی سے اصلاح بھی لی تھی گراں کا اصل میدان نزل تھا۔ جب کوئی مضمون لکھتے تو رسالہ میں بھیجے سے پہلے مجھے بلا کر سنا تے۔ کبھی میرا ان سے اتفاق ہوتا کبھی اختلاف، رفتہ رفتہ رابطہ مضبوط ہوتا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب میں چلے سے رہا ہو کر آیا تو ایک روز ایک مضمون سنانے کے بعد وہ کہنے لگے۔ چلے ڈاکر صاحب سے ایک روز آپ کی ملاقات کرا لائیں۔

میں نے ڈاکر صاحب کو ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قریب دہلی کے چلے میں ہسٹہ تو سنا تھا گراں سے تعارف نہ تھا۔ میں تبنا صاحب کی تجویز پر خوشی منی کی اور دوسرے یا تیسرے دن ڈاکر صاحب سے ملے ہم دونوں غازی آباد سے دلی آئے۔ میرے ذہن میں ڈاکر صاحب کے کمرے کا جو تصور تھا اس سے بالکل مختلف پایا۔ وہ ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ سامنے ایک ڈسک پر کلم، دوا کاغذ اور چند خالی بنٹیں پاس ہی ایک راکھی رکھی تھی۔ میں اس سادگی پر مرعوب نہیں لیکن مرعوب ضرور ہوا۔ پانچ سال پہلے میں نے ڈاکر صاحب کی جو تقریر سنی تھی وہ کچھ انوکھی سی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے تک لاڈلہ سپیکر راج نہ ہو تھے۔ ایک ڈاکر صاحب کی آواز میں باوجود چٹھان ہونے کے بجا نیت کے مقابلے میں گھنٹہ زبیرا ہے، دوسرے اس زمانے تک شراک

میں تین سو روپے بیچ کر کام کرنے لگے۔ جامر کی آمدنی کم ہوئی تو تنخواہ تین سو سے دو سو کر لی اور کم ہوئی تو دوسو سے ڈیڑھ سو پر سوا اور پھر پچھرو روپے بیچ کر سر کرنے لگے۔ اقتصادی یا ماضی اعتبار سے یہ ترقی محکوس تھی لیکن اخلاقی اعتبار سے یہ سونا کنڈن بن رہا تھا۔
 سے یہ زکوہ و سبتیرہ سو درم نہ پور شدہ اند کے
 غریب دانت روشن شو، اندک غسل باید ترا

اس خوش میں بعض غرت سے باہر آجاتے ہیں لیکن ڈاکر صاحب اب زیریں نہیں۔ یہ جھٹس بر ڈال کر فم کے باہر گرہ تیا ہے اکثر ان لوگوں میں پیا جاتا ہے جو اپنی قربانی یا ایشیا ر کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں کبھی جیسے نے اُسے زندگی کا جزو لازمہ مسترد کر دیا ہو کہ وہ کس بات پر ناز کرے گا
 گرمیاں چاک عشاق اذ ذوق فشاں شد
 الفت در سبب غنم ز شوق آسبیا باشد

یہ بات سبب ڈاکر صاحب میں بھی ہے۔ ان کے نالے کے پابند نے یا
 آذا ہونے کا سوا ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ نالہ کرتے ہی نہیں ان
 میں ڈاکر صاحب کم ہے سببیت زیادہ۔

ڈاکر صاحب کا دل فرخ آباد کا قصبہ قائم گلی ہے۔ آستوری
 چٹانوں کا ایک خاندان اس قصبہ میں آسا تھا۔ یہ کوئی دو سو برس
 کی بات ہے۔ پچھلی صدی میں اسی خاندان میں علامہ حسین نان صاحب
 ہوئے جو ڈاکر صاحب کے دادا تھے اور ایک باہرمت سیاحی ہوئے کے
 ساتھ ساتھ بغیر دست بھی تھے۔ بکتے ہیں کہ ان کا مکان میں رہا تھا تو کسی
 مزدور کو مال یا بے عمل دیکھ کر انھوں نے سخت گری کی۔ اس نے ان کے
 مرثیہ فریاد کی۔ جب یہ مرثیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے
 حکم دیا کہ مقررہ جاکر خان سادھو سے جو تو تھا دیہ خٹا صاف ہو جائے گی
 یہ مقررہ بیچنے اُس ہشت سے لے اور ایشیادادے کو واپس آئے۔ ان کے
 مرثیہ کی یہ دعا تھی کہ تمھارا یہ مکان بابرکت ثابت ہوگا اور تم چلے چھوٹے
 کاش دہ آؤ اس عالم آب و گل میں ہوتے اور یہ دیکھو کہ ان کا پوتا
 نائب صدر جموں ہند ہو گیا ہے اور لوگ کمر دے ہیں کہ
 فرخ آباد لاکھوں کو اذاتی ہمنور
 غلام حسین خاں صاحب کے دو صاحبزادے تھے۔ علاحدہ خاں

اور غلام حسین خاں۔ چونکہ مرثیہ اعلیٰ حسین خاں صاحب تھے اس نے اس
 خاندان کے ہر فرد کے نام کے آخر میں حسین خاں ہوتا ہے۔ یہی
 غلام حسین خاں ڈاکر صاحب کے والد ماجد تھے جو قائم گلی سے گئے تھے
 بعد آباد اپنے بھائی کے ساتھ تجارت کرنے، لیکن وہاں کے آدمی ماحول
 میں تعلیم کا شوق ہوا۔ کلاست پاس کی اور وہیں وکالت کرنے لگے۔
 ایک کا علی حیدر آباد میں بڑائی اور ایک اپنے وطن قائم گلی میں۔
 وہیں حیدر آباد میں ۱۸۹۷ء میں ڈاکر صاحب کا جنم ہوا۔

ابھی ڈاکر صاحب کی تعلیم شروع ہی ہوئی تھی کہ ان کے والد کا
 انتقال ہو گیا اور ان کا خاندان قائم گلی واپس گیا۔ بڑا نیک تعلیم تھیں
 حامل کی۔ پھر اترادہ سے آئی اسکول کا امتحان پاس کیا
 بالائے مرشد ز ہوش سندی
 ی ساخت سستارہ بلند ی

یہ سات بھائی تھے۔ سب ذہنی سب ادبی ماحول میں بچے بڑے
 بھائی شلف حسین خاں کا میں عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ یہ سب بڑے
 تھے۔ ڈاکر صاحب سے بڑے مارو حسین خاں تھے اور ڈاکر صاحب خاں جو
 ڈاکر صاحب کے بچپن میں آئے۔ یہ بھی جوانی میں ہی گر گئے۔ جعفر حسین
 بچپن میں ہی چل بے۔ اب یہ تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے ڈاکر صاحب
 ان سے چھوٹے وسعت حسین خاں جو جامعہ عثمانیہ سید آباد میں پڑھتے
 رہے اور آج کل علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر چائنس ہیں اور اب
 سے چھوٹے محمد حسین خاں جو جامعہ الہ آباد میں پروفیسر ہیں۔

بچہ جنگ ترکی و بنگال شروع ہوئی تو ڈاکر صاحب آٹھویں اسکول
 میں تعلیم پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے ترکوں کے اعداد کے لئے چڑھ دیا بلکہ
 چڑھ کو معمول بنالیا۔ ہر مذمت جلد کرتے تو بچی کو جھولی بنا کر چڑھ
 کرتے اور قریب کے ڈاک خانہ سے رقم روانہ کر دیتے۔ اس سلسلہ میں
 انھوں نے میڈم کے تقریر بھی کی۔ یوں تو پندرہ سال کی عمر میں تقریر
 کرنا اب کوئی بڑی بات نہیں لیکن ان میں سے بیشتر تقریریں لفظی یا
 ماشروں کی ڈائی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن اب سے پچاس برس پہلے پندرہ
 سال کی عمر کے لڑکے کا مہر میں مجسمہ تقریر کرنا عیرت اخبر تھا۔
 اس کی دوسری مثال مرث مولانا، الحاکم آزاد کی ذات میں ملتی ہے۔

۱۹۱۳ء میں ذکر صاحب اہم - ۱۔ ۱۲ء کا علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں اہم - ۲۔ اسے پاس کر کے (۱۹۲۰ء میں جسٹس بن گئے۔ اہم - ۱۔ ۱۰ء) ادا کاغذ سے ان کی تعلیم ختم ہوتے ہوئے علم یونیورسٹی کی تشکیل اختیار کرنی تھی جیسے ہندو کاغذ سے ہندوئی و رستہ بنی تھی۔ ذکر صاحب کی اس کاغذ کی تعلیم کے دوران میں علی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد راجینی اور علی برادران جھنڈو واٹر میں نکل رہے ہوئے۔ کانگریس لیگ معاہدہ قلمبند ہو گیا۔ مولانا شیگرڈیو رستہ اصلاحات کا خاکہ مرتب کرنے ہندوستان آئے۔ علی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ہندوستان میں نئی سیاسی اصلاحات کاغذ ہوا۔ سوامی گروہ کی تحریک ملی پنجاب کا خونیاں بڑھا ہوا، خلافت کی تحریک ملی اور ہسپانا کا گڈھی اور علی برادران ملک کی ترقی کو کھلانے لگے۔ انجس مولانا محمد علی علی گڑھ میں جامعہ غنیہ اسلامیہ کی ریخ نیل ڈالی۔ علی گڑھ کی فضا اسے راس نہائی مخرجا جو جبرانیہ حکم اہل خاں اور ڈاکٹر انصاری میں خط و کتابت کے سلسلے پر پایا کر جامعہ کو قی لایا جائے۔ یہاں اس کا اقتصادی بار قسٹم اہل خاں نے اور ان کے لہذا کرنا انصاری نے اپنے کندھوں پر لیا اور انصاریات کا بار ڈاکٹر کر سچے ٹھکانا۔ اگر ان سے کم دہی کی ہمت کا آدمی ہوتا تو جس وقت ان لوگوں سے جامعہ کو دیا جاتا پڑا ہے، بھاگ کھڑا ہوتا۔ گروہاں ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اپنی تفرہاتیں سوئے گھٹا سے گھٹا نہ بھرتا دیر کرے۔

۱۹۳۱ء کے بعد جرمین میں میرا تاجانا شہر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد ڈاکٹر عابدین حسین، مولانا شفیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر محمد مصباح، ڈاکٹر عبداللطیف، جناب عادل علی خاں، جناب محمود علی خاں، جناب عبدالواحد حسن سی، ڈاکٹر عارف، ڈاکٹر طہم، مولانا اسلم جراح پوری، جناب شیخ الدین تیرا پاجا، جناب برکت علی، ڈاکٹر سلاحت اللہ، جناب میرزا نعمت دہلوی، جناب غلام ربانی تاناب سی سے ملاقات ہوئی اور یہ تلقین اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب میرا ڈاکٹر کا جرمین میں ۱۹۳۶ء میں ابتدائی تقسیم حاصل کرنے کیلئے داخل ہو گیا۔ بنیاد ڈاکٹر صاحب کی ملاقات سے ہی پڑی تھی۔ جب تک ڈاکٹر صاحب اور جرمین مسلمانوں پر قبول باغ میں رہے میرا تاجانا زیادہ دلچسپی سے جرمین کی تفریق

ختم ہو گیا ہے۔ وہ اپنی طرف سے یہی بحث کا پورا مورخہ دیتے ہیں لیکن
 ہم سب پر اللہ کا جادو کچھ ایسا چل گیا ہے کہ
 دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا
 میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میری دل میں ہے
 ہم لوگ ان کی عقل و بصیرت سے اسے محروم ہو گئے ہیں کہ جو کچھ
 وہ بہرہ رہے ہیں وہی بات سمجھیں آجاتی ہے اور آتا صدقنا
 ہمارے قبول کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ غارتی اور داخلی حالات نے
 جو کچھ انہیں ڈالا تھا ڈاکر صاحب نے اس کو داخل کر کے نیا ماحول پیدا
 کیا۔ خوان رسیدہ ہیں میں پھر مہربان آئی
 دشت از دہر سبزہ دما مون پر از گوہر شمشدہ

۱۹۰۶ء میں خواجہ محبت کی بنا پر ڈاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی
 کے وائس چانسلر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا
 مگر فلسفی گروہ کی گرافٹی تو جی میں سے نہیں بیٹھے دیتی اور ان کی
 سیدھی تو جی یعنی میں طرح مولانا شفیق الرحمن قدوسی کو بلا دیتا
 تو وہ سب جری طور پر زور نہ دیا گیا تھا اسی طرح
 آپ نے یہ تقدیر ہم ہی رسد
 در دستہ یستمی رسد

کے مصداق ڈاکر صاحب کو بہار کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس وقت میں
 چند بار لاہور چلے جہاں میں ان سے ملنے کا اتفاق ہو گیا کہ وہ
 گورنروں کی کانفرنس میں تشریف لاتے تھے۔ مگر ایک بار چار ماہ
 کے جلسے میں تھکے ہوئے تھے لکھنے سے بات ہوئی۔ قاعدے کی رو
 سے ان کی نشست راشدرتی کے برابر رکھی گئی تھی لیکن وہ چیئر مین
 وائل بیٹھ کر ہم لوگوں میں بیٹھے۔ ہر ایک سے اس کا حال پوچھا۔
 اور کچھ مناسب ہوا تو گفتگو کی۔ میرے پرے لڑکے کا حال پوچھا
 ہوا کہ طالب علم رہ چکا تھا میں نے یہ محسوس کیا کہ ڈاکر صاحب
 کو کہیں شہاد دے کر وہ ڈاکر صاحب ہی رہیں گے۔ یہ اس دور
 میں بڑی بات ہے جب

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

اب ڈاکر صاحب گورنر سے آپ راشدرتی یعنی ٹائپا صدر چوہدری
 جند بوسے گئے ہیں۔ اب بھی وہ ڈاکر صاحب ہی رہیں گے۔ عام طور پر
 وہ سخت باتیں نہیں کہتے مگر جامع قیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے
 مورخ پر ۱۹۰۶ء میں انھوں نے فرمایا:

”استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک
 ذرہ بھی نہیں بہتا۔ اس میں اور ان میں ذہنی آسماں
 کا فرق ہے۔ حکمران جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے۔
 وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلا دیتے ہیں یہ آزاد چھوڑ کر
 ساتھ لیتا ہے۔ ایک کے وسائل میں تشدد اور زبردستی
 ہے دوسرے کے بہت اور غمختہ۔ ایک کا کہنا ڈر
 مانا جاتا ہے دوسرے کا شوق ہے۔ ایک حکم دیتا ہے
 دوسرا مشورہ۔ وہ ظلم بناتا ہے یہ ساقی۔“

قدرت کا عجیب کھیل ہے کہ ڈاکر صاحب معلوموں کی صف سے حکمرانوں
 کی صف میں آگئے ہیں

ہر میں تفاوت رہ ان کی سبستی یا ہر

ان کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی ایمان میں سیاست دانوں کے
 مسلم ہو کر بیٹھیں گے کیوں کہ آپ راشدرتی راجہ بھیکا کا صدر بھی
 ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر ڈاکر صاحبیں صاحب مسلم ہیں اس لئے ان سے
 ذرا تسخیر کرات کرنی چاہیے۔ ایک بار وہ ڈاکٹر شراف کے ہسپتال
 میں تھے جہاں وہ ان کے علاج کے لئے آئے تھے۔ میں بھی اسی صحنہ
 میں گیا تھا۔ میں نے پوچھا:

”آپ کی آنکھوں کا کیا حال ہے؟“

فرمایا۔ ”اچھا ہے۔“

میں نے پھر درخت کیا کہ ”پھر آپ یہاں کیسے تشریف لائے
 ہیں؟“

جواب دیا۔ ”اچھا“ تو نسبتی لفظ ہے۔“

میں لا جواب ہو کر رہ گیا۔

ایک بار چاند کے نیچے میں ملاقات ہوئی۔ میں نے چلتے چلتے

ان سے عرض کیا

”اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کچھ مرض کروں۔“

فرمایا۔ ”وقت تو نہیں ہے مگر فرمائیے۔“

بھلا اس گھر کے بعد عرض کرنے کی جرأت کئے تھی۔

میں نے ڈاکر صاحب کو چون میں بھی بولتے سنا ہے اور عاموں

کے جلسوں میں بھی، ہر جگہ ان کی تقریر مناسب حال ہوتی ہے۔ ایک بار قزوِل بانا میں جامعہ کے جلسہ میں وہ تقریر کر رہے تھے ایک بدخط کوٹہ کی لپٹی اٹھا کر کہنے لگے۔ ”یہ آپ کا کھانا ہے۔ جب آپ بڑے ہوں گے تب آپ کی شادی ہوگی پھر آپ کے لڑکے ہوں گے، پوتے ہوں گے اور وہ اس بات پر نہیں گے کہ ہمارے باپ دادا ایسا لکھا کرتے تھے۔“

مجھے ٹھیک ٹھیک الفاظ یاد نہیں مگر کچھ اس طرح کی بات تھی۔ بچے اسی شوق سے ان کی تقریر سنتے تھے جیسے کوئی کہاں کی سُن رہے ہیں۔ میں نے ڈاکر صاحب کے کئی مضامین اور متاںے پڑھے ہیں لیکن بچوں کے لئے کبھی ہوتی کبھی فی ’الہ خاں کی بڑی ’کابیر دل پر بڑا اثر پڑا ہے۔ میں نے بچوں کو بستیہ گروہ کی تحریک دہن نشین کرانے والی اس سے بہتر کوئی کہاں نہیں پڑھی۔ ریڈیو پر میں نے ڈاکر صاحب کی جو تقریریں سُنیں ان میں سے حضرت حسین اور ہندوستانی زبان کے متعلق تقریریں میرے لئے بڑی بصیرت افروز تھیں۔ فلاٹو کی کتاب کا ترجمہ جو ڈاکر صاحب نے کیا ہے وہ اس شان کا ہے کہ ترجمہ بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے مختلف روٹی و رستیوں میں جو خطبات پڑھے ہیں وہ اگر کہاں کے شائق تھے جابیں تو بڑی عمدہ کتاب بن سکتے ہے۔ ہندوستان کے ایک مہتمم کا اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ ڈاکر صاحب سلطوں کی عین الاقوی کا فرائض سے مدد روہ چکے ہیں۔

ہم اتنا گدھے سے جب ہندوستان کے اشباب تعلیم میں تبدیلی کرنی چاہی تو ایک کئی مفرد کی جس کے مدد و اکرڈ ڈاکر حسین اور میروں میں آجادیہ زینت درو کا کا لکھنؤ، خواجہ غلام الدین اور شری آریہ ناٹم تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس رپورٹ پر عمل درآمد کہاں تک ہوا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس رپورٹ نے ہمارے

فریقہ تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں تجویز کی۔ ہندوستان کے نمائندے کی

جینیت سے ڈاکر صاحب نے نیسکو کے بھی ایک ممتاز ذکر رہ چکے ہیں۔

ایک بار ان کی تقریر میں، انھوں نے فرمایا کہ کوئی ایک صاحب تھے داغوں

نے تمام لیا نہ بتایا کہ وہ کس ملک کے نمائندے تھے جو ہر موضوع

پر بولنا چاہتے تھے اور ان کی تقریر ہمارے کچھ ہی آتی نہ سامعین

کے، اور رپورٹریچ سے کون کے ٹکڑے ہوتے ہی ہم جاتے تھے۔

۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ جناب ما جید زمانہ قضا لکھنؤ یونیورسٹی

سے ایم۔ اے پاس کر گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اردو کے کسی موضوع

پر ڈاکر صاحب حاصل کریں۔ اس سلسلے میں وہ میرے ساتھ ہی چند

اصحاب سے ملے ان میں ڈاکر صاحب بھی تھے۔ جب میں ڈاکر صاحب

کے دروازے پر پہنچی تو ایک ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ جس کا فیصلہ

حضر ہوا کی شدت سے کچھ مجروح بھی ہو چکا تھا۔ دیواری اینٹوں پر

استرکاری بالکل زخمی برتنے اصحاب کو تعجب ہوا میری ڈاکر صاحب

کا مکان ہے۔ میں نے کہا۔ جی ہاں یہ ہے۔ میں نے شک دہی تو

ڈاکر صاحب نے اندر لایا۔ دیکھا تو ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے

ہیں اور سانس کی چارپائی پر ایک بڑا ایلینڈ سے بٹھا ہوا ہم خود

کے عالم میں ہے۔ معلوم نہیں سنگ اصحاب گفت کی طرح اس میں

اشائیت کہاں تک آتی تھی مگر میں نے اس منظر کو دیکھ کر قدردانہ

تعبت کا اظہار کیا تو فسر دلایا کہ

”جی ہاں آج کا اور لوگ تو گھر میں ہیں نہیں یہی ساقی ہیں۔“

شیدہ اصحاب نے جب مرض مطلب کیا تو ڈاکر صاحب بولے

”میں ادو کا ماہر نہیں ہوں۔ اس بارے میں تو ڈاکٹر صاحب

صاحب سے بات لیجئے۔“

ہم لوگوں کے احرا کر کے پراعتوں نے اردو الفاظ کے مادہ کی

تحقیق کا موضوع بنایا

ڈاکر صاحب جیسے شوق انسان بہت کم ہوں گے مگر محسوس

ہی وہ مطالعہ کا وقت نکال لیتے ہیں۔ انھیں صرف ادب سے ہی

دل میپ نہیں ہے بلکہ تعویرون اور کچے کھٹنے سے بھی۔ میں نے

ڈاکر صاحب کو کئی مشاعروں میں دیکھا ہے۔ ان کے داد دینے کا

ہرگز یہ ہے کہ جب کوئی چھٹا شریک جاتا ہے تو شاعر کی طرف آنکھ پھر کر دیکھتے ہیں۔ اور اگر شریک بہت اچھا ہو تو گھورنے لگتے ہیں۔ جگر کے غزل پڑھتے وقت میں نے اگڑان کی یہ کیفیت دیکھی ہے۔ ایک بار شریک کی ایک ٹولی جا مد منگ سے ادا کھلا جانے لگی تو میری درخواست پر جگر صاحب بھی جانے کو تیار ہوئے۔ ذکر صاحب نے کہا کہ انھیں بڑے جاسٹے مگر گڑبیت کی راستے ہی ہوئی مگر صاحب کو لے جایا جائے۔ آخر جگر صاحب لگے اور ہم لوگوں کو ذکر صاحب کی بات کی حقیقت کا اس وقت اعتراف کرنا پڑا جب وہاں پہنچ کر ہم لوگ تو دریا کی روانی کا لطف لینے لگے اور جگر صاحب نے شان ہے افتخانی سے فرمایا

”یہاں دیکھنے کی بات کیا ہے“

ذکر صاحب بھی کچھ اس طرح کی عجیب باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو گاتہ میں یا دنیا کے اور پرشہ انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ شہر حال میں قفل لگا ہوا ہے اور ذکر صاحب اس میں بند ہیں۔ باہر سے ایک صاحب رپورٹ سنا رہے ہیں اور ذکر صاحب ایک بھر دے گئے ہیں سن رہے ہیں اور قفل سے رہے ہیں۔

مجھی ذکر صاحب کو بھی ایسے جواب دینے والے مل جاتے ہیں۔ مثلاً ذکر صاحب میں صاحب سے ذکر صاحب اگڑے اور کیا کوستے تھے کہ آپ بھی داڑھی رکھئے۔ عابد صاحب ہنس کر

ملل دیتے تھے۔ آخر جب ذکر صاحب نے زیادہ اصرار کیا تو عابد صاحب نے فرمایا کہ آپ اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں۔ ذکر صاحب نے کچھ کہی بات کہی کر

آپ جالیات کے ماہر ہیں۔ تنوع میں ہی تو لطف زندگی ہے۔ مجھی بھی رکھنے رکھنے، کبھی فرنگ دلہی رکھ لی، کبھی آدھی موبین رکھیں، کبھی پوری، جب تو کچھ بات ہے۔ یہ کیا کہہ رہے صفا چٹ، نہ آدھی نہ موبین۔ اس یکساٹی میں کیا لطف ہے۔ عابد صاحب نے عربی میں جواب دیا۔ جس کے الفاظ بچھریا نہیں لیکن ترجمہ یہ ہے کہ حق کا راستہ ایک ہے اور باطل کے مختلف۔

ذکر صاحب اس جواب یا صواب سے لا جواب ہو گئے۔

مجھی بھی ذکر صاحب کو غصہ بھی آ جاتا ہے۔ چاندروں کے ٹوکوں سے جو ذکر صاحب سے بے لطف تھے اس جانب توجہ دلائی تو فرمایا ”آپ جانتے نہیں میں نس سے افسریری چٹیاں ہوں۔“

ذکر صاحب کی زندگی میں طرح طریت سے پڑے اسی طرح لطیفوں سے بھی۔ مگر اس مقرر سے مضمون میں موت چند جھلکیاں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ذکر صاحب یوں تو صاحب نقر اور صاحب دلہی لیسٹن ان کی، ٹھوں میں بھی تکلیف رہی ہے اور دل کی بھی شایر اس دنیا کے ہونٹاں مگر کسی صاحب نقر کو اور بے لگے واہا کسی اہل دل کے دل کو ممول پر نہ رہتے دیں گے۔

فردری گزارش

۱۔ مضمران صاف، خوش خط اور کاغذ کے ایک طرف لکھا ہوا ہونا چاہیے۔

۲۔ قرطبیہ مضامین اسی صورت میں واپس کے جسٹیں جب ان کے ہمراہ مناسب سا تذکرہ لکھا نہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔

مقلوں کا سامانِ آرائش

ملکوں پر جیسا نیا نیا کی قرض سے مسلط ہوئے۔ وہاں رہ کر انھوں نے اس ملک کو کچھ اپنی چیزیں دیں اور ان سے کچھ نئی چیزیں لیں۔ یہ چیز خصوصاً مثل تہذیب کے ساتھ زیادہ رہی۔ اس تہذیب کے پر پہلوئے دوسری تہذیب سے ہمیشہ ایسے دین پرست اور رکھاؤ کی قیادت ہو کہ فن موسیقی اور ادب ہو کہ فن معموری۔ ہر طور اعمول نے فنون لطیفہ کے ہر پہلو کو متاثر کیا اور اسی سے متاثر ہوئے۔

یہ سرسری جائزہ تو عادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اب ہم داخلی زندگی کی طرف آتے ہیں۔ داخلی زندگی میں طرزِ رانٹش اور طرزِ لباس آتا ہے۔ باہر سے سلطنتِ ملکہ کی بنیاد ڈالی اور جلوئی عدائے اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد ہاویں تخت پر بیٹھا اور اس کی ساری زندگی مشکلات میں کٹی۔ ان بادشاہوں کو اتنا موقع نہ مل سکا کہ یہ ہندوستانی تہذیب کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہوں۔ یہ اس تہذیب میں لیں وہیں سے محسوس رہے مگر اگر کاماندہ کی حیثیت سے بڑا ام ہے۔ مقلوں کا مخصوص لباس 'جامر' تھا اور راجپوتوں کا مخصوص لباس 'تھو چیر' لیکن اگر کے اختراع سے نہ دونوں لباسوں کو بہت قریب کر دیا اور اس سے ایک نیا لباس پیدا ہو گیا۔

مقلوں کے زمانے میں کچھ مخصوص لباس تھے جو بہت عام

کسی مخصوص تمدن کا تصور کرنے ہی ذہن میں اس کے ساتھ ایجاد کیا ہونے لگے ہیں اور خصوصاً وہ تمدن اور کلچر جو مقلوں کا رہنما بنتا ہے اور اس کا خاکہ ذہن میں تیار ہوتے ہی ہزاروں طرح کے خیال آپس میں ٹکراتے لگتے ہیں، کیوں کہ کسی قوم کا مخصوص کلچر ہی دوسری قوم سے تعریف کا باعث بنتا ہے۔ یہاں تک کہ مقل قوم اور عرب قوم میں بھی یہی ایک چیز تعریف کا باعث بنتی ہے۔ اور اس میں بھی تعریف و تفریق کیوں کہ ہر قوم مختلف طبقوں میں تقسیم ہے اور ہر طبقے کا ایک مختلف اور مخصوص لباس ہے۔ مقل طبقے کا جو طرزِ پوشاک ہے وہ متوسط اور نیچے طبقے سے بالکل الگ ہو گا۔ اس طرز پر تعریف و تفریق کا سلسلہ سماج کے اوپر ہی ڈھانچے سے کہ بالکل نیچے تک پھیلا ہوا ہے۔

سردست مثل تمدنِ یورپ ہے۔ ہذا میں مثل تمدن کا جائزہ دینے سے پہلے پس منظر کے ان حوالے کا بھی خیال رکھنا ہے جس نے اس تمدن کی پشت پناہی کی ہے کیوں کہ اس کلچر کے پس پشت ایک بڑی روایت ہے اور وہ روایت مقلوں کی اپنی روایت ہے، دوسرے مقلوں میں جیسے ہم ایرانی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جون ہی اس مخصوص کلچر تہذیب و تمدن کے اہلکاروں نے اپنے وطن کو اوداع کہا اور دوسرے

تھے۔ شاہ شاہ مجیدہ، اشست خط، و دتا ہی اور غور وغیرہ۔
 اس میں سے ندر کی بناوٹ بالکل تباہی مٹی۔ فرق صرف اتنا
 تھا کہ ندر کی بناوٹ تباہی کے لیے لمباؤ اور چوڑائی میں مختلف
 تھی۔ جائدوں کے ایام میں ایک دین قسم کا لباس استعمال ہوتا
 تھا جسے قلعی کہتے تھے۔ اس لباس سے اور کوٹ کا پورا پورا کام
 لیا جاتا تھا۔ چون کہ متوں کی زندگی میں نفاست کو کافی دخل تھا
 لہذا اس لباس میں بھی خاص طور سے ذری کا کام ہوتا تھا۔
 اس سلسلے میں ایک تیسرا لباس بھی قابل ذکر ہے اور اس
 کا نام ہے البغیر۔ یہ ایک لباس کے شکل کا لباس تھا جو خاص
 طور سے جامہ اور پیشواؤں کے اوپر پہنا جاتا تھا اور اس کا
 اوپر ہی حصہ نہایت خوب صورت ڈھنگ سے تیار کیا جاتا تھا۔
 اس لباس کے۔۔۔ اس کی طرف مختلف جاوڑوں کی رنگ برنگی
 تصاویر ہوا کرتی تھیں جس کو مشتاق قسم کے روزی بنایا کرتے
 تھے۔

بارش کے دن میں چکان تام کا پڑا جام کے بجائے کے لیے
 استعمال کیا جاتا تھا۔ جسے موم جامہ، صورت یا سقلات سے تیار
 کرتے تھے۔ سر کی دھڑوں کا ڈھیر پر چادر ڈال کر پہنے
 کا کام رواج تھا اور کھمبیری شاہیں اس مقصد کے لیے خاص
 طور سے استعمال کی جاتی تھیں۔

بابر اور ہمایوں کے زمانے کے لباس

ان تہذیبوں کے زمانے میں لباس مجنسنہ اسی طرح
 رہا، جس طرح کہ ابچے ماضی کے تھے۔ ایشیائے کوچک
 میں وہ لباس جو روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتے تھے۔ ان میں
 جامہ، فرج، پیشوا، شلوار اور البغیر قابل ذکر ہیں۔ تاہم
 کے اوراق اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کر پاتے کہ آیا ان کے
 علاوہ بھی کوئی لباس استعمال ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن چنانچہ
 اگر کہ دور حکومت کا تعلق ہے اس کے زمانے میں زندگی کے

اس کے متعلق طرز زندگی (انٹیریئر) ڈاکٹر انصاری

مختلف شعبوں میں تجربے کے تھے۔ مختلف مذاہب، ایک دوسرے
 سے بیگانگی کی کیفیت کو دیکھا جی میں تبدیلی کرنے کی کوشش
 کی گئی۔ مشرک قدروں کی اہمیت کو جلا بخشی گئی اور یہی نہیں
 بلکہ سامان، رائج و زبائن میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا کہ
 اگر درج ایرانی ہو تو جسم ہندوستانی اور اگر جسم ایرانی ہو
 تو درج ہندوستانی۔ مثال کے طور پر یہ جلا دینا ضروری ہے
 جیسا کہ اوپر کی سطروں میں جامہ اور تلو چسپ کا ذکر کیا گیا ہے
 جامہ جو مغل پہنا کرتے تھے اور تلو چسپ وہ جو راجپوت
 استعمال کرتے تھے۔ لیکن اگر اسے وہ دن سے کہچہ میں مستور
 ہے کہ ایک تیسرے لباس کی ایجاد کی۔ ماسٹریٹ جواک پرتگری
 سیاح تھا اس نے ہی اکرے زمانے کے تعلق لباسوں کا اپنے
 سفر نامے میں تذکرہ کیا ہے۔

جانیئر کے زمانے میں بھی اکرے زمانے کے سارے
 لباس استعمال کے جاتے تھے لیکن کچھ مخصوص لباس جب ان کے
 خود اپنے لئے وقف کر رکھے تھے، اور یہ علم دنیا ہی تھا کہ اسے
 سوائے شہنشاہ کے اور کوئی شخص استعمال نہیں کر سکتا جیسا کہ
 کہ بادشاہ خود اسے کسی خاص موقع پر اس مخصوص لباس سے
 مزین کرتے۔

جانیئر کے بعد ہندوستان کے تحت پر ایک بادشاہ شہنشاہ
 آتا ہے جس کی زندگی ہر شہنشاہ اور ہمہ دل فری ہے۔ جس کی
 عظمت کا تصور خفاک یوں قلوں کی پیمہ و بلندوار اس اور
 جس کا تم کا جیسا درج پرورد و جاں انسرود۔ اس کے
 ایک نفاست پسند شہنشاہ سے جس طرح کی آمید کی جاتی تھی،
 اسی طرح ہوا۔ ایک ایک بیک جامہ وہ اپنی زندگی میں ایک
 عظیم المیہ سے دوچار ہوا اس وقت سے اس کی حیات کی
 رفتار مدہم ہو گئی۔ ذیقہ کے پیچھے میں متنازعہ عملے مولیٰ
 کو دیکھ کر اور شاہ جہان کے لئے یہ ہمین ماتم کر رہ گیا۔
 اس ہمین میں وہ سوائے سفید کپڑوں کے اور کوئی چیز استعمال
 نہیں کرتا تھا اور بدھ کا دن تو ہمیشہ کے لئے اسے سوگوتا

گیس کیوں کہ بدھ کے دن متاز محل کا انتقال ہوا تھا۔ ہسدا بدھ کے دن تو وہ خاص طور سے سفیر لباس ہی استعمال کیا کرتا تھا۔

اورنگزیب کے زمانے میں خاص تیز ہوا۔ ۴۱ اجزری ۱۶۶۹ء کے زمانے کے مطابق زربلغت کا لباس ناف تا بسند کر دیا گیا۔ لیکن اس کا استعمال ختم نہیں ہوا۔ بادشاہ خود سادہ کپڑوں کو ترجیح دیا کرتا تھا اور موچی کے بیان کے مطابق اورنگزیب کے کپڑوں کی قیمت دس روپے سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔

اگر سہ پہلے سر کو ڈھانکنے کے لئے دو طبرج کی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ چوں کہ سر کے بال منڈوانے کا عام رواج تھا۔ اس لئے اس طرح کی ٹوپی یا سر کو ڈھانکنے کی چیز استعمال میں لائی گئی۔ شاہ جہاں کے زمانے میں 'تاچ عز' اور 'خاصہ تاچ' کا عام رواج تھا۔ 'تاچ عز' کی شکل بالکل انگریزی کے (دو) جیبی تھی۔ اور خاصہ تاچ بادشاہ کی عطا کردہ ٹوپی کا نام جو اپنا مخصوص رنگ رکھتی تھی لیکن پتھر سے والا دھڑی کے بیان کے مطابق اکبر بال رکھنا پسند کرتا تھا اس لئے اس نے ٹوپی کی اس شکل کو ترجیح دی جو اس کے بالوں کو خوب صورت سے چھپا دے۔ ہسدا وہ گلاہ برٹس بہتر ڈھنگ سے تیار کرتا تھا جس میں سونے اور چاندی کا کام ہوتا تھا اور گلاہ میں طرسے کی موجودگی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جہانگیر اپنے سر پوش میں برٹس اور جواہرات کا استعمال ضرور کرتا تھا۔ اس کے سر پوش کے دو دونوں طرف قیمتی پیرے ٹکٹے رہتے تھے اور مزج میں طرہ ہوتا تھا۔ شاہجہان کے زمانے میں بھی مویشی سر پوش کی بنیاد ہی رہی، لیکن اورنگزیب کے زمانے میں لباسوں کی طرح سر پوش میں بھی پیرے اور جواہرات کا استعمال منہ کر دیا گیا۔

۱۰ مثل طرہ زندگی (انگریزی) ڈاکٹر انصاری

باہر اور ہاویوں کے بارے میں تو وقت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے استعمال میں پیرے اور زربلغت ہوتے تھے یا نہیں، لیکن جہاں تک اکبر کا تعلق ہے اُسے سر پوش اور مختلف قسم کے زربلغت سے خاص واصل جی تھی، لیکن اس سلسلے میں جہانگیر کا مذاق اکبر سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ ماسٹر جس نے اس کے جملہ حرکت کے سارے حالات قلمبند کئے ہیں لکھتا ہے کہ اس کے گیس میں ہمیشہ قیمتی جواہرات کی مالاں پڑی رہتی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی دوڑوں کہیں قیمتی موتیوں سے گھری رہتی تھیں۔ بالکنس اور پری کے بیان کے مطابق اس کی ہر ٹانگی میں انگوٹھیاں ہوتی تھیں جس میں بیش بہا سنگے ہوا کرتے تھے۔ چوں کہ انگریز سلیم جسٹس ۲۰۷ کے معتقدوں میں سے تھا اس نے اس سے ہمیشہ ہی میں جہانگیر کے کاؤں میں بس رعایت کے تحت چھلے ڈال دئے تھے۔ لہذا وہ کاؤں کے چھلے دائمی حیثیت میں تبدیل ہو گئے اور اس کے کاؤں میں ہمیشہ چھلے پڑے رہتے تھے۔ بیڑی نے اس سلسلے میں جہانگیر کی بڑی ترقیت کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جہانگیر کی طرح دنیا میں کوئی شہنشاہ نہیں ہے جو اتنے بیش قیمت موتیوں اور جواہرات سے اپنے کو مزین کر سکے۔

اورنگزیب نے جہاں ساری پیر مزوری چیزوں کو خرید دیا وہاں دہلی میں اور جواہرات کے استعمال سے بھی احترا کیا۔ بیان ان سب چیزوں کے ساتھ کچھ روایات کا نقل ہوتا ہے۔ لہذا وہ اس سے بالکل نزع سکا اور شاہی دستار میں ایک بیش قیمت پتھر کو جگہ دی پڑی۔ بہت سی چیزوں کی حیثیت ذاتی ہوا کرتی ہے۔ سو وہ کچھ اورنگزیب کے ساتھ بھی رہیں لیکن اس کے رٹھ کے جواہرات کا استعمال کرتے تھے جس میں وہ قطعاً عمل نہیں ہوا۔

کچھ مشروہ ہی سے مشرق کی سرزمین میں تعاست کو بڑا دخل رہا ہے اور اتام وہ عمل جو اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سکے تھے ان کو کام میں لایا گیا۔ پتالہ چپ اس سلسلے

میں خوشتر کا استقبال کیا ہی آتا ہے۔ اگر کوئی عطر و بخرہ کا پڑا سٹوق تھا چنانچہ اس نے ایک سی سی ایک شیشے کی بنیاد ڈالی جس کا "خوشبو بھرا" نام رکھا۔ جس میں مختلف قسم کی خوشبوئیں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے زمانے میں مختلف قسم کے عطریوں کے خزانے ملے۔ یہی ہیں "سندھنگ"، "ار بوم"، "گلگونہ" اور "دوبہ" وغیرہ۔ اگر کے بعد تیار کیا اور حکومت آتا ہے۔ اس شہنشاہ کو بھی اپنے باپ ہی کی طرح عطریوں کا پڑا سٹوق تھا۔ اس کے عسلوہ نورجہاں خوشبوؤں کے بارے میں کافی معلومات رکھتی تھی۔ اس نے کہا کہ قسم کے عطریں ایک دوسرے اور بہان تک کر ایک عطرس کا نام "عطر جہانگیری" بھی پڑ گیا۔ شاہجہان کو بھی عطرسے خاص دل و رجا

نہا۔ محلوں کی تہذیبی زندگی (انگریزی) ڈاکٹر چوپڑہ

اور اس نے اس کے استعمال کی جہت افزائی کی۔

مختصر یہ کہ ہم نے ان شہنشاہوں کی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے جن کا قدار اور جن کی عظمت آج بھی اپنی جگہ پر مستحکم ہے۔ مگر ان کی ایسی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ کسی قوم، افراد یا شخصیت کے بارے میں جانتے کے لئے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد کی شخصیت کا صحیح تعریف اس وقت کیا جا سکتا ہے جب حیات کا کوئی شہیرہ بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

ایسا لباس اور زیورات کے بارے میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے قسط سے ان شہنشاہوں کے قدار، ان کی وضع اور ان کی تہذیب کا صحیح طور سے اندازہ لگا سکیں۔

فن تعمیر

آج کل کا ماہ اگست ۱۹۶۲ء کا شمارہ "فن تعمیر" نمبر ہوگا

دیہہ زیب مرقع اور خوبصورت رنگی و سادہ تصاویر سے مزین یہ شمارہ میٹھا سا ۸۸ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ہندوستانی فن تعمیر کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات سے متعلق دل چسپ اور پُر اطلاعات معانی خالی اشاعت ہوں گے۔

قیمت صرف ایک روپیہ۔ یہ شمارہ خسریہ اول کو سالانہ پتھر میں ملے گا۔

آج ہی خریداریہ جائے تاکہ آپ بھی یہ سفارہ سالانہ چنے میں حاصل کر سکیں

آج کل کا سالانہ چندہ صرف سات روپے ہے

ایجنٹ حضرات نامہ کاروں کے لئے ابھی سے آرڈر بھیج دیں

بزنس مینوپلسیکیشنز ڈائریشن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

عداری

لیں اور بند آنکھوں کی تاریک دنیا میں اُسے جانے کیا کچھ اس طرح
حادثہ صاف اور واضح طور پر نظر آنے لگا کہ اس نے بوکھا کر
آنکھیں کھول دیں۔

اس نے اٹھ کر اپنے کمرے کا ریڈیو آن کر دیا۔
”تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم....“

”نہیں... نہیں... نہیں... وہ پاگلوں کی طرح
چلائی اور اس نے ریڈیو بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے
ذہن میں گونجتا رہا۔ تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم....
یہ پڑوس کی مس آرق شاہ کے ریڈیو کی آواز نہیں تھی،
یہ کسی کے گانے کی آواز نہیں تھی، لیکن مینا جیسے باکل واضح طور پر
سُن رہی تھی۔ تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم....“

پھر وہ موٹے پرگڑی لگی اور اس نے آنکھیں میچ لیں۔
کلاس دوم میں میز پر چائناٹکے کے تین بندر لکھے ہوئے تھے
ایک نے اپنے ماتحتوں سے اپنی آنکھیں چھپا رکھی تھیں۔ دوسرے
نے اپنے کالوں میں انگلیاں عٹوٹیں ہوئی تھیں اور تیسرے نے
اپنے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

”بچو! کیا تم جانتے ہو یہ بندر کیا کہہ رہے ہیں؟“ مینا نے
پوچھا۔

”یہ کچھ بھی نہیں کہہ رہے ہیں دیوی!“ ایک چھوٹے سے
بچے نے کہا۔ ”ایک تو یہ بندر ہاں۔ چرچ کے بندر ہوتے جب

سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دن کے ڈھائی بجے
بھی، سورج ڈھلنے کے ذرا بعد کی سی تاریکی پھیل چکی تھی۔ ساری
فضا پر موت کا سا سکوت اور جدوجہد کی آواز نہیں سے کسی چڑے
کی آواز آ رہی تھی نہ درخت کا ایک بھی پتہ ہل رہا تھا۔

ہر دھت ریڈیو آن رکھنے والی اور اس پر نشر ہونے والے
گانوں کی دھمی پر زور سے گانے والی پڑوس کی مس آرق شاہ بھی
شاید چپیلوں کی طرح دبی ہوئی تھی۔
”اوت یہ سکوت، یہ کرب ناک سکوت، یہ اذیت بھرنے والی غائبی
.....“

مینا اس سکوت سے اکتا گئی تھی۔ ”یہ سکوت کیوں؟
کیوں....؟“

اس نے اٹھ کر کمرے کی بڑی کھڑکی کھول لی اور اس کی
سلاخیں پرکھ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کے باہر بھی کمرے کے اندر
کا سا سکوت تھا، کرب تھا، اذیت تھی، جود تھا۔

”سکوت کسی طرفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟“ جیسے ایسا
کیوں لگتا ہے کہ میں کوئی بڑی خبر سننے والی ہوں۔..... مجھے

ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں کوئی بڑی بات سننے والی ہوں.....
لیکن مجھے کوئی بڑی بات نہیں سننی چاہیے..... نہیں... نہیں..“

کھڑکی کی سلاخیں چھوڑ کر وہ دایسے لٹائی اور جیسے نہ سنا
سی ہو کر موٹے پرگڑی لگی۔ پھر اس نے زور سے آنکھیں میچ

جی کہ نہیں کہہ سکے تھے۔ اور پھر یہ تو کھولنے ہیں۔

"نالی یہ کھولنے ہیں۔" مینا مسکرائی۔ "پڑیے بولتے ہیں۔۔۔"

"کیا سچ پڑیے بولتے ہیں۔" ایک بچی کھڑی ہو کر چائنا کالے کے بندوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"نالی نالی بول رہے ہیں۔" مینا ہنسنے لگی۔ "یہی تو میں تھیں بتا رہی ہوں۔"

وہ بچی بیٹھ کر تینا پھر کہنے لگی۔

"یہ بحث سولے بندوایہ چائنا کالے کے بچے ہوئے ہندو جن میں تم کھولتے ہو رہے ہو۔ پھر یہ اتنے چپے کی بات کہہ رہے ہیں کہ ان کی جی ان سے سبق لیکھا کرتے تھے"

"سنا رہی ہو؟" کسی بچے نے نالی سے پوچھا۔

"جس بچہ۔" مینا کہنے لگی۔ "دیکھو اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندو کہہ رہا ہے کہ کوئی بڑی چیز بند ہو گئی۔ اور اس نے اپنے کافور میں اٹھلیاں خوش رکھی ہیں گویا کہہ رہا ہے کہ کوئی بڑی بات نہ ہو اور اس تیسرے بندو نے اپنا منہ بند کیا ہوا ہے اور اس طرح بتا رہا ہے کہ کوئی بڑی بات نہ ہو۔"

"واہ۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔ واہ" کئی بچے اور بچیاں ہنسنے لگیں۔ تنہا یہ ایک بچہ نے اٹھ کر کئی قدم لال کے ساتھ کہا۔

"پڑو دیڑی! میں نے تو آج ایک بہت بڑی چیز دیکھ ہے!"

اور مینا جھجھکی اٹھی۔

دوسرے نے کہا

"اور دیڑی! میں نے ایک بہت ہی بڑی بات سنی ہے۔"

اور مینا بڑبھلائی گئی۔

اور تیسرے نے کہا

"دیڑی جی! میں نے اس کو ایک بڑی بات کہہ دی ہے۔"

اور مینا سر ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "کہہ دو ایک قہر! اپنے آپ کو بالکل ہی گمراہ کر دے سوس کر دے۔ لیکن پھر جیسے تبھہ کر کے اس سے پہلے نہ بچے پڑ جائے۔"

"کون سی بڑی چیز! کچھ ہے تم نے؟"

"دیڑی! آج اس کو آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک ہوٹل کے پاس دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک مرغ تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک چمک دار پتھر سی۔ پھر اس نے مرغ کی گردن پر پتھر سے چلا کر مرغ کو سڑک پر چھوڑ دیا اور مرغ دیڑی کے اس طرف تیرے دنگ میں کسی باتوں۔ کئی بڑی چیز سی دیدی میرا بنی چاہتا تو میں اس آدمی کی گردن کاٹ دیتا!"

"نہیں نہیں! بڑی بات نہیں بولا کرتے۔" مینا جلدی سے بولی اور دوسرے بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "تم نے کون سی بڑی بات سنی ہے؟"

"دیڑی! گھر پر پڑھانے کو آئے دالے ماسٹر نے مجھے بتایا کہ جہاں جنگ ہوتی ہے وہاں سب کڑوں اور ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں۔۔۔ کئی بڑی بات ہے۔"

"نالی یہ ایک بڑی بات ہے۔" مینا بولی "لیکن جنگ میں پتھر یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ تم اپنے ماسٹر سے کہنا کہ بچوں کو جنگ کی نہیں! امن کی باتیں سنائی چاہئیں۔"

اور آخر میں وہ تیسرے بچے کی طرف مخاطب ہوئی۔

"تم نے اس کو کون سی بڑی بات کہہ دی ہے؟"

"دیڑی! میں نے اسے گالی دے دی ہے۔" اس بچے نے کہا۔

"یہ تو بہت ہی بڑی بات ہے۔" مینا اسے سمجھانے لگی۔ "اچھے بچے! کبھی کسی کو گالی نہیں دیا کرتے۔ تمہیں اسلم سے مافی مانگنی چاہیے اور آئندہ پھر کبھی کسی کو گالی نہیں دینی چاہیے۔"

اور وہ جیسے گھٹتی پڑ گئی۔

اور مینا نے بولیکو کہ آئیں کھول لیں۔

میں ای جھوٹے چوہے بونوں سے ڈر کر بولی تھی۔۔۔۔۔

وہ بڑی سی بے سے سوچنے لگی۔۔۔۔۔ شاید میں یہ سمجھ رہی تھی کہ انھوں نے میری کوئی بڑی بات دیکھی تھی!۔ شاید انھوں نے میرے بارے میں کوئی بڑی بات سنی تھی۔ شاید اس نے

بگڈیشن نے اسلم سے میری بہت ہی بری بات کہی تھی! - "تمہ" دیکھ کر اٹھ اٹھی۔ "گلگلی انڈیا آؤں سپیشلس لیکس میں لے گیا جرم کیا ہے؟ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ آنسٹریرا تصور کیا ہے؟"

وہ دیر تک کھڑکی سے باہر نگاہیں اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے کھڑکی کی دوسری طرف کراؤں سے بنائے گئے گھر اس کا جسم کیا ہے اس کا گناہ کیا ہے، اس کا تصور کیا ہے؟

مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ جیسے میں خود کوئی بہت ہی بری چیز دیکھوں گی، جیسے میں خود کوئی بہت ہی بری بات سنوں گی اور جیسے میں خود کی کوئی بری بات کہہ دوں گی..... مجھے کیوں ایسا لگتا ہے؟ میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟..... مجھے ساری کائنات پر کس لاش کا شک کیوں ہوتا ہے؟..... یہ تاریکی کیوں؟ یہ سکوت کیوں؟ یہ جھوم کیوں؟ - آفت یہ بے پناہ تاریکی.....

مینا کی طرف مڑنے کو اس نے آتے ہی سب سے پہلے لائف آن کی۔ پھر اس نے پوچھا:

"یہ آپ اندر سے ہیں کیوں بیٹھی ہیں؟" "سکینہ۔" مینا ہنس پڑی۔ "کیا تو سمجھتی ہے کہ ساری دنیا مدھن ہو گئی؟"

"ہاں، دنیا سے کیا لیتا ہے؟" سکینہ بولی۔ "یہ کڑواؤں ہو گیا ہے، ساری دنیا ٹھیک ہمنے کی کیا لے رکھا ہے؟" "اُن۔۔۔۔۔ ساری دنیا کا ٹھیکہ..... مینا زور سے ہنس پڑی "ساری دنیا کڑواؤں کرنے کے لئے اپنا گھر حلال دینے کا ٹھیکہ بھی بنا رہی ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔۔ تو آپ پھر تینا صاحب کے بارے میں سوچ رہی ہیں؟" سکینہ نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے تینا صاحب کے بارے میں سوچنا گناہ ہو۔ "میں سمجھتی ہوں آپ کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ اس طرح سوچتے رہتے سے دنیا میں روزانہ لاکھوں، دواں ہوتے ہیں، کڑواؤں پھڑپھاؤں ٹوٹتی ہیں، لاکھوں ہسٹک اُچڑتے ہیں، کتنی جانیاں ہوتی ہیں، کتنے ہلاک ہوتے ہیں، کتنی جیتیں جہنم جاتی ہیں۔"

"اور خود کشیاں؟" مینا مسکرائی۔ "آپ نے تو قسم کھائی ہوئی ہے بابا کی دھن، مجھے بغیر مرنے والی نہیں؟" سکینہ بولی۔

"اُن مجھے مینا ہے، مجھے جینا چاہیئے۔" مینا نے ٹھنڈی ہانسی لی۔ "مجھے جینا ہی پڑے گا۔"

"آپ کو تینا صاحب کے بارے میں ہرگز نہیں سوچنا چاہیئے؟" سکینہ کہنے لگی۔ "نہیں تو آپ کا جینا دہر دہر ہو جائے گا۔ ادھر پھر قبل از مرگ داؤد ملے۔ یہ سوچنا ہی فعلوں کے کہ آپ کو طلاق مل جائے گی۔ تینا صاحب اپنا اناہہ بدل بھی تو سکتے ہیں۔"

"یقینی کر سکینہ میں یہ سب کچھ ہرگز نہیں سوچ رہی تھی۔" مینا کہنے لگی۔ "سچ ہوتا ہے تو پھر شام تو ہو گئی، پھر شام کے بارے میں سوچنا کیا، تینا صاحب! اپنا ارادہ نہیں بدل سکتے۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ انہیں اچھی طرح یقینی ہو چکا ہے کہ شادی سے پہلے میں پیوین سے محبت کر رہی تھی اور یہ بات غلط بھی تو نہیں ہے۔ روزانہ یہ معرفت اس بات کا کشادگی کے بعد میں نے پیوین کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں۔ سکینہ! میں نے اپنی ساری ساری اپنی کائنات، اپنی تمام تر خوشیاں، اپنا دل، اپنی روح سب کچھ میں نے شادی کے بعد تینا صاحب کے قدموں میں ڈال دئے..... سب کچھ سکینہ سب کچھ۔ لیکن میں اس سے ادنیٰ سا بھروسہ بھی مرنے کی سکینہ، کچھ ہی نہیں۔"

"اب تو بات صاف ہو گئی کہ آپ انہیں کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔" سکینہ نے اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

"ہاں۔" مینا نے کراہتی ہوئی سہ آواز سے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ لیکن جانے کیوں میں ڈر رہی ہوں سکینہ، میرے دل کی دھڑکنیں جانے کیوں بہت تیز ہو گئی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بری چیز سننے والی ہوں..... سکینہ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔"

"اور اس لئے آپ اسکول چھوڑ کر آگئیں؟" سکینہ کہنے لگی۔

میں یہ سمجھ رہی تھی کہ انسان کو اگر آلودہ ہوتا دیکھ کر آپ آگیش کو یہاں
المیستان کے ساتھ بیٹھ کر وہ بڑوں کی شب سپہیں گی جو آپ کے
خیال میں دنیا کی بہترین موسیقی ہے۔

"نہ نہیں ہو۔" مینا نے کہا۔ "جی۔ وہ دماغی میت
گئے، وہ دماغی میت سے روکھی سکینے، اب نہیں وہ ہوں، زندہ
نہیں ہیں، زندہ۔۔۔۔۔"

"جوڑے ان باتوں کو۔" سکینے بولی۔ "ان باتوں میں
اب رکاوٹ کیا ہے۔ چائے ملاؤں؟ پیراپ کو رضیہ کے ہاں بھی
تو جاتا ہے۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی سکینے۔" مینا بولی۔ "اب میں ان
کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"مجھ کو آپ بہتر ہی تھیں۔" سکینے نے کہا۔ "پیراپ نے۔۔۔"

مینا زور سے ہنس پڑی، پھر کہنے لگی
"نیا صاحب جانتے ہیں کہ خادی سے پہلے مجھے پردیز سے
بے پناہ محبت تھی۔ کسی کافر کو اس حقیقت سے انکار ہے، لیکن تم نے
میں کو چونک اٹھائی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اب میرے تعلقات

رضیہ کے خاوند زیدی صاحب سے بھی ٹھیک دیکھے ہیں جیسے۔۔۔"

"بے سب کچھ بکواس ہے۔" سکینے نے غصے سے کہا۔ "اور آپ
ان باتوں کو سوچیں ہیں یہ بھی بکواس ہے۔ میں تو کبھی ہوں کہ جب

آپ کو یقینی ہے کہ نیا صاحب آپ کو طلاق دے کر ہی دم لیں گے
تو چرچا کر کہہ دیجیے کہ ان۔ آپ کو زیدی صاحب سے محبت ہے۔"

"چائے آؤ۔" مینا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں
اد سکینے چلی گئی۔

اد ڈھبانی ہوئی آنکھوں اور لڑتے ہوئے بازوؤں سے
رضیہ نے مینا کو گلے لگایا اور مینا سسکیاں لینے لگی۔ دیر تک

وہ دونوں ایک دوسرے سے چٹہریں اڑ رہیں اور وہ الگ ہوئیں تو
ان کے ہونے پر مسکراہٹ تھی۔ رضیہ نے اپنے آنسو پونچھے ہوئے کہا

"میں تمہیں کیا سمجھوں؟ ہنسی، سہیلی، دماغی یا دماغی کی بہادری
"خاوری مت کرو۔" مینا نے کہا۔ "یہ تمہیں مافی نازی

رنگ کے جس کا لوگ نہیں، چلو ہم بیٹھ کر چائے پیئیں۔"
"مینا، تم کتنے دنوں پہلی ہی ہو، آؤ مجھے ہنگامہ بیت گئے
جیسے صدیاں بیت گئیں۔۔۔۔۔"

"بکواس ہے۔" مینا نے کہا۔ "ہم مرث سات ہیمنڈ تک
ایک دوسرے سے جڑے رہے۔"

"اے کم بخت، کبھی تو سفید ہو۔" رضیہ بولی
"چل چل۔" مینا کہنے لگی۔ "زیدی صاحب کی بیوی اور کسی کو سبھی

کاسین پڑھائے؟"
"لیکن میں ان کی طرح غیر سفید نہیں۔" رضیہ بڑی سفیدگی

سے بولی۔
"ان کی گالیں انہی۔" مینا نے کہا۔ "لیکن اب چلی بیٹھ کر

باتیں کریں۔ میں نے جیسے انتظار میں ایک چائے نہیں پی۔"
اد سکینے چائے لے کر آئی۔

لیکن مینا بستر پر سوں پہلے چوڑی ہوئی دنیا میں بیٹھتی رہی۔
"سکینے، رضیہ میری زندگی ہے، میری زندگی کی بہادری۔"

میری سہیلی ہے، میری بہن ہے۔ اچھا سکینے ایک بات تو بتاؤ۔
ایک خادی شہر عورت کی سب سے پیاری چیز کیا ہوتی ہے؟

"سہاگ۔" سکینے نے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ کر چائے
پناتے لگی۔

"اے سہاگ! مینا مسکراتے لگی۔ "لیکن ایک بات بتاؤں
تھیں، ایسی بات جو دنیا میں نہ ہوئی ہوگی، نہ کبھی ہو سکتی ہے۔"

سکینے نے ان دونوں کی بات سے جب نثار کے بعد نیا صاحب امداد
کے گھر والوں نے مجھے اس نے اپنا پسند کر دیا تھا کہ انہیں میری اور

پردیز کی عیت کا علم ہو گیا تھا۔ ان دونوں میری کیا حالت ہو گئی تھی
سکینے میں بتا نہیں سکتی۔ اور وہی وہ زمانہ تھا جب میں خون تھوکنے

لگی تھی اور ہر طرف خون کی آواز تھی۔ اور وہی سوجا ہوا تھا۔ ادب ہی
سکینے! رضیہ نے اپنا سہاگ مجھے ہانٹ کر دے دیئے کی پیش کش

کی تھی۔۔۔۔۔"
"کیا یہ؟" سکینے چونک سی گئی۔

"اے" - "میںا کہنے لگی۔" اس نے صاف نظروں میں کہا تھا کہ یہ دیر سے تو تمہاری شادی ہو نہیں سکتی۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ تیار صاحب کے گھر والے تھے تاہم سب کو سننے سے ہی، غلط ہو جائے گی اور کو اپنی زندگی تباہ کرے گی۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میںا تو تمہارے ساتھ رہے گی۔ تو زیدی صاحب کی بیوی بن کر رہے گی تو...."

میںا کے ادا زہبہ تھی۔ اس سے پہلی اٹھا کر چائے کا ایک گھونٹ لیا اور اسے ایسا لگا جیسے وہ چائے کا گھونٹ نہیں تھا کوئی نہایت خوش سی چیز۔ کوئی زہر! وہ پھر مروت کیجے جیڑی ہوئی دنیا میں دایس چلی گی جہاں نہیں آئے گی یہی تھی۔

"ڈارلنگ! یہ سب کچھ جو اس ہے کہ بہت سے ایک سے ہوتی ہے اور یہ نہ صرف سب کچھ کو ادا کر سکتی ہے بلکہ اپنے خاندانی محبت کا جو ادا برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بھی اُس کے بچوں کی بات ہے کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ ان دنوں میں سے نکل آئیں، میں تجھے ایک پرسکون دنیا دیاں گی۔ بھڑائی جیسا بڑے ستوہ، ہنسور اور کھنڈ لٹا جائے۔ دونوں کی بڑی بہت سے دونوں کی اور وہ سب کچھ ادا ہانڈ کر دے، وہی جو میرے پاس ہے...."

یہ ایک مینا جھنڈ لگی اور سکینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا کر بولی

"کیا بات ہے؟"

"سکینہ - اس کو بہت سے زیدی صاحب سے اپنے خیال کا تذکرہ کیا تو وہ چونک گئے۔" میںا جھنڈ پھنڈے لگی۔ "میں جانتی تھی زیدی صاحب کو رضیہ سے بے نیاز بہت تھی۔ بے نیاز وہ جسے تھی اس بہت میں وہ اس کو بہت کی یاد جا کر ستھتھے۔ انھوں نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ اور میں بتاؤں تھے جس وقت رضیہ نے مجھے بتایا کہ۔ یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا، تو وہ کہ بہت چوٹ چوٹ کر روئے گی اور دوڑتے روئے بے حال ہوگی۔" یہ سب کچھ بتاتے ہوئے میںا جھنڈ پھنڈے بیٹھا، ہوئی

جاری تھی۔

اور سکینہ بھی مروت کے گرد لپکتی تھی۔

اور بارش ہونے لگی تھی۔

موسلاہ حار باجڑ ہونے لگی۔

سکینہ نے ریڑھ پر آٹھ کر دیا

تمہاری اور میں کران اور داری کرے ناکوئے

گرد گرد سیلیاں سے کریں اور ٹر ٹر لکھیں دگ....

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔..." مینا بڑی سے اُٹھی اور

اس سے ریڑھ پر بند کر دیا۔ اس نے صاحبانی کو گیت کا مطلب تھا

کہیں تو تمہارا انتظار کر رہی ہوں لیکن میرا انتظار کوئی نہیں کرتا۔

باد بار سیلیاں لکھ کر دیتی تھیں اور لوگ مروت کو میری حالت دیکھتے

ہیں۔ "نہیں نہیں نہیں..... یہ غلط ہے سکینہ....."

یہ غلط ہے۔ اس نالائق لڑکی کو بھی میرا انتظار ہے۔ رضیہ میری راہ

مگر گھر رہی۔ میں جاؤں گی سکینہ۔ میں اس کے پاس ضرور

جاؤں گی، ابھی اسی وقت۔"

"اس موسلاہ حار باجڑ میں ہے؟" سکینہ نے بوجھا۔

اے، اے، اے، اے، میںا نے چائے کی پیالی ٹپکے سے انداز

میں میز پر رکھی اور کپڑوں کی اماری کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگی۔ "نہیں پڑوسے بدلنے کی کوئی ضرورت

نہیں۔ میری انہیں حاقون نے تو نیاز صاحب کو اور بھی مشکوک کر

دیا ہے، بھلا رضیہ کے پاس ہاتھ کھنڈ پڑوسے بدلنے کی کیا ضرورت

ہے؟۔" وہ مسکراتی ہوئی سنگھار مروت سے سامنے بیٹھ گئی۔

اور بارش کی طرح اس طرح ہو رہی تھی جیسے ساری دنیا کو

غرقاب کر کے دم لے گی۔

اتھ میں لب اشک اٹھا کر میںا نے پھر میز پر رکھ دیا۔

"نہیں اس کی بھی ضرورت نہیں۔" وہ پھر مسکرائی۔ "میری

انہیں حاقون نے تو نیاز صاحب کو اور بھی مشکوک کر دیا ہے،

سکینہ نے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سنی رہی تھی اور مسکرا

رہی تھی۔

مینا نے چٹری اٹھائی اور بارش کے اس اتھاہ طوفانی میں
کھڑکی پر۔

لیکھ اچھی دیکھ ہی دھڑکی تھی کہ نیاز جی آ ہوا جاگا آ
رہا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر نیاز نے کہا۔

”بھڑکے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”آپ جو کچھ کہیں گے میں جانتی ہوں۔“ مینا بولی۔ ”لیکھ
آپ جو کچھ کہیں گے وہ کوئی ایسی بری بات نہیں جس سے میں گھبرا

دہی ہوں۔ میں رضیہ کے پاس جا رہی ہوں۔ جانے کیوں میرا دل
بہت گھبرا رہا ہے۔ میں رضیہ کے پاس۔۔۔۔۔“

وہ آگے بڑھنے لگی لیکن نیاز نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔

”تم جو کچھ سمجھ رہی ہو وہ سب کچھ نہیں کہوں گا۔“ نیاز
نے کہا۔ ”میں تم سے موت پہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک طوف
تھرا سہاگ ہے اور دوسری طوف رھیبہ۔ کسی ایک کو پسند
کر لو۔“

مینا کو ایک غمت ایسا لگا جیسے بارش کے اس اتھاہ طوف
میں بھی وہ شطرنج کے پہنچ کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر شطرنج کے پہنچ

کھڑی رہی اور پھر نیاز کے ساتھ کچھ اس طرح چلنے لگی جیسے تعان
کی لگے! اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے

رضیہ کے ساتھ بہت بڑی فدااری کی ہو۔

اس کی آنکھوں سے سوسلاہ بارش ہونے لگی تھی!

حرمیت الاکرام

غزل

بھوم درد میں بیٹھنے کا اہتمام ہوا
حیات کی کوئی منزل ہمیں نصیب قیام
فسانے کتنے سنائے مری خوشی نے
نصلا جودل پہ تری چشمِ بانگات کا راز
عطائے تہن نگاہی جے کہیں وہ سرور
وہ ایک فاصلہ جو تھا نگاہ سے دل بگڑا
جہاں سے طوفی سفر کا سراغ دل کو ملا
مٹی پیٹے وجر لگے تنہی و کلام مگر
دماغ و دل کی کان کش کا سلسلہ تھا طویل
ذکوئی کام ہی ایہ تو ایک کام ہوا
یہ کس نے تم کو بتایا، سفر تمام ہوا
ٹی زبان تو میں بیگانہ کلام ہوا
تو فرماں مجھ پہ خود اپنا بھی احترام ہوا
ہمازی روح میں پل کر نیم دوام ہوا
خوشا نصیب کہ وہ فاصلہ تمام ہوا
وہیں سے قافلہ کچھ اور تیز گام ہوا
مرے سکوت کا فسانہ اور عام ہوا
کچھ خبر ہے کہ دل کب اسیر ہوا

رداں ہے پھر سوئے گردوں یہ قافلہ حرمیت

ابھی فسانہ آدم کہاں تمام ہوا

ہیروں کا شہر

ہیں اور ہیرے اکٹھے کر کے آتے ہیں۔۔۔۔۔
اس کے بعد کی صدی میں کئی فرتی ستیاج یہاں آئے۔ امون
نے کہا ہے کہ دادی کرشنا میں جگہ ہیرے کی کاہن ہیں اس
دربار ۱۰۲۱ میل سب اور ۹۵ میل پورا ہے جس میں کوٹیا، بلاری،
کول، کرشنا اور گوداری کے ضلع شامل ہیں۔ اس علاقہ پر
مطالعہ قطب شاہی اور لایان و جیناٹری حکومت تھی۔ مگر یہ
کاہن گوکنڈہ ہی کے نام سے مشہور تھیں جہاں پور پریسی ان کو
”گوکنڈہ ٹائٹل“ کہا جاتا تھا۔ گوکنڈہ کی کاہن ہیروں سے بچی
پڑی تھیں امدان کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ سارے دنیا کے لئے ہیرے
فراہم کرنے کو کافی تھیں۔

یہ کاہن شکر پر دی جاتی تھیں۔ شکر دار تین لاکھ سیلو
دقتیہ اسمالاکھ پٹم) بادشاہ کو دیتا تھا۔ گول کنڈہ کے فرانٹھاؤ
کے کان کے لئے چیز متواتر مضمون کر رکھے تھے۔ ہر جگہ کھلائی
کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ ان بادشاہوں کو انڈیشہ تھا کہ ہیروں کی
کثرت ہمیں اس کے ملک پر تباہی دلائے امدان کے
مقل شہنشاہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔

ارل مارشل آف انگلینڈ نے ۱۶۴۷ء میں ایک متاثرہ رائی
سوسائٹی کے سامنے پڑھا تھا۔ اس میں گول کنڈہ کی گاؤں کا ذکر ہے۔
یہ مضمون بہت دل چپ اور معلومات سے پر ہے۔ اس میں

دادی، دادی، دادی، دادی اور گنگا دادی دسیہ میں اپنی
نذرین کے لئے مشہور ہیں۔ یہ ختے وہ ہیں جہاں انسانی تہذیب
نے جنم لیا اور پہلی پھولی۔ دریا پانی کی شکل میں خدا کی رحمت ہوتے
ہیں، جہاں سے گزر جاتے ہیں، اس علاقہ کو سرسبز اور شاہاب
بنادیتے ہیں امدان میں دفن ہو جاتی ہے نذرین میں وادی کرشنا
دیکھ کے کسی علاقے سے کم نہیں بلکہ یہ دادی فزکر سکے ہے کہ
پیداوار میں دنیا کا کوئی خدا اس کی ہماری نہیں کر سکتا۔ اس جگہ
خو کی کثرت تھی جہاں ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ مارکوپو اور
دوسرے ستیان جہاں کی ہیرے کی کاہن دیکھ کر حیران رہ گئے۔ او
بسنے خیال کا ہر کیا ہے کہ امدان میں سسندیاہ جہاں کے سفر
کا قہرہ میں سے لیا گیا ہے۔ ایک اطالوی سیاح نواردی کاؤٹ
نے پندرہویں صدی میں اس وادی کو دیکھا تھا وہ لکھتا ہے،

”یہاں کے پہاڑی علاقوں میں سانپوں کی کثرت

ہے۔ لوگ بیلوں کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بٹھاتے

ہیں امدان ان کا کٹ ڈھتے ہیں اور تازہ گوشت

کے ساتھ کھاتے ہیں ادھر ادھر پھینک دیتے

ہیں۔ ہیرے ان میں چھٹ جاتے ہیں، پھر گھر ال

گو کھاتے کھاتے، مگر شکر کے جاتے ہیں اور کسی مضمون

جگہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اس کے بدلے لوگ ان میں بچے

کول کنڈہ کی سہ ماہی کا کھانا بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے
 یہاں صرف ایک کالی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ دیکھ لے:

..... ہمارا ایک کان کرورت ہے یہ بہت

پران اور شہرت ہے اور حال ہی میں قلب شاہوں

کے قہر چرچا ہے اس پر اس کا فائدہ ہم سے

لگے ہیں۔ ساتھ ستر برس پہلے یہ کان ہندو

حکومت کے تحت تھی تو کئی لوگوں کو یہاں کھانا کی

اجازت دی گئی تھی۔ ایک پتھر کو اسے یہاں آیا،

اس نے اپنی ساری رقم جو ایک لاکھ میوڈا کے

قریب تھی، کھانے پر خرچ کر دی۔ اس سے بعد اپنا

سلاخا تر جوستا نہ آیا تھا۔ پیچ کر خرچ کر دیا، یہاں

تک کراپے پیچنے کے کپڑے بھی بچ ڈالے اور

آخری دن کی مزدوری پر لگے دے۔ جب اس کے

پاس کچھ نہیں رہا تو اس نے زہر کا بیالہ تیار کیا

اور دل میں شان لی کہ اگرچہ رات تک کھانا نہ ملا

تو وہ پیر کے خاندان کے ساتھ اپنی زندگی بھی ختم کر دے گی

لیکن اسی تمام کم مزدوری اس کے پاس ایک بہت

بڑا ہیرا ملا۔ اس کا حق کی یادگاریں اس نے

ایک بڑا پتھر تیار کیا اور اس پتھر پر لکھا کہ

ایک کتبہ کندہ کر دیا جو اب تک موجود ہے۔ کتبہ کی

عبارت کا مطلب یہ ہے:

”اچھے بھائی! کچھ درد اور جو کچھ تمہارے

پاس ہے سب بیچ دو۔ اچھے بھائی! بے بھی بیچ

ڈالو۔ تم تو مجھ تک جاؤ اور غلام بن جاؤ لیکن

کس نہ کسی طرح بدبیر حاصل کرو۔ گوں کنڈہ جاؤ

اور گرد کی طرف دوڑو۔ وہاں کافین میں تلاش

کرو۔ ایک دن آئے گا کہ تم پھل ہو جاؤ گے۔“

گوں کنڈہ کی کافین کے بارے میں زیادہ بھی بات نہیں ہے، نیز
 نے اچھے سفر نامے میں لکھے ہیں۔ فیوڈر نیک فرانسیسی جوہری

تھا۔ ہیرو کی خاطر اس نے یہاں کے چھ سفر کئے اور رائل کوٹا کی
 کان دیگی۔ قدیم لوگوں میں رائل کوٹا کے معنی ”جواہرات کا گھر“ ہیں
 وہ گنگا گور بھی گیا۔ یہ وہ مشہور کان تھی جس سے دنیا کا سب سے بڑا
 ہیرا ”کوہ نور“ نکلا تھا۔ رائل کوٹا کوڈل سے ۱۸ میل جنوب مغرب
 ہیں۔ یہ فیوڈر نیک نے یہاں ہیرے نکالنے کا طریقہ دیکھا تھا۔ لکھتا
 ہے:-

..... وہ جگہ جہاں ہیرے نکلتے ہیں، ریتی

ذہن سے گہری جوتی ہے۔ جگہ جگہ جگہ ہیں جس میں

پٹاؤں کی کثرت ہے۔ ان پٹاؤں میں رنگیں ہیں جو

ایک انگلی اور نصف اس سے زیادہ پوری ہیں۔

کان کے دھوئے والے دھبے کی لمبی سلاخیں چلنے پانے

رنگتہ ہیں جو سرے پر سے مڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان

کو دھوئے ہوئے گندہ کو اندر کی ریت اور پٹی دھوئے

ہیں۔ اس میں کوکھنڈی میں برعکس ہیں۔ یہی وہ

مٹی ہوتی ہے جس میں سے ہیرے نکلتے ہیں۔

یہ رنگیں ہمیشہ سیدھی نہیں ہوتیں۔ بعض اوپر کو

پڑھتی ہیں اور بعض نیچے کو جاتی ہیں۔ یہ لوگ چٹاؤ

کو ڈھلے پر مہر پر ہو جاتے ہیں اور اس سمت میں

دیکھ جاتے ہیں ان کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ ان

کو کھانے کے بعد اندر کی ریت اور مٹی نکال لینے

ہیں اس کو دھوئے مرتبہ دھوتے ہیں اس عمل

یہ آتا ہے کہ جو ہیرے اس میں ہوتے ہیں وہ

دکھائی دے جاتے ہیں۔ لیکن ایک وقت یہ ہے

کہ چٹاؤں کے اندر کی ریت نکالنے وقت مزدور

احتیاط سے کام نہیں کرتے، وہ سلاخوں کو اس

زور سے مارتے ہیں کہ اکثر ہیرے ٹوٹ جاتے ہیں

.....

بارش سے جو مٹی بہہ کر کسی جگہ اکٹھی ہو جاتی ہے اس میں بھی
 ہیرے ہوتے ہیں۔ ان کے نکالنے کا وہ خاص طریقہ ہے۔ اس میں

اس نے یہ عمل دیکھا تھا، اس کا بیان ہے :

..... بسق سے کوئی ڈیڑھ میل پر او بچے پہاڑ ہیں، جو جلیبک کی شکل میں ہیں۔ سب سے پہلے اسی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں، جہاں کام کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے برابر ایک ادھربنگ صاف کرتے ہیں، اس کے گرد دو دو فٹ اوچائی دار بناتے ہیں۔ اس کی چڑیں دو دو فٹ کے فاصلے سے سوراخ بنا دیتے ہیں، جس سے پانی نکل سکے۔ پھر کان کا مالک پردہست کو بلاتا ہے وہ بوجھنے کے ایک عورت لاتا ہے۔ انسان کے بعد مالک کی طرف سے کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد پردہست مالک کو اسخرواد دیتا ہے اور اس کی ہمت بندھاتا ہے۔ اس کے بعد کام شروع ہوتا ہے۔ مرد کھدائی کا کرتے ہیں، عورتیں اور بچے مٹی اٹھا اٹھا کر اس جگہ سے جلتے ہیں جو اس کے برابر پہلے سے تیار کی جاتی ہے۔ کھدائی دس فٹ سے چودہ فٹ کی گہرائی تک ہوتی ہے لیکن پانی نکل آئے تو آگے لے کر قح نہیں رہتی۔

جب کھدائی پوری تمام مٹی اپنی جگہ پر پہنچ جاتی ہے تو مرد و عورتیں اور بچے سب ہل پڑتے ہیں اور نیکے او گھرے ہر جگہ کے کھان کا پانی اس مٹی پر ڈالتے ہیں جو انہوں نے اٹھی کی ہے۔ مٹی پانی ڈالنے سے نرم ہو جاتی ہے، اس کو دو ایک دن کے لئے اسی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر سوراخوں کو جو پانی کے ٹکڑے کے لئے بنائے گئے ہیں، کھول دیتے ہیں۔ اس پر او پانی ڈالتے ہیں تاکہ مٹی پانی کے ساتھ نکل جائے پھر اس کو وہی چھوڑ دیتے ہیں اور وہ دھوپ میں سوک جاتی ہے۔ اس کے پاس چھانچ کی طرح کا ایک ٹوکرا ہوتا ہے۔ مٹی کو اس میں ڈال کر پھینکے ہیں،

جس سے باریک گرد اڑ جاتی ہے اور موٹے دانے او ریزے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کو زمین پر پھیلا دیتے ہیں اور سب کی کرکڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں گدڑی کا ایک لک سمونا ہوتا ہے جس سے اس مٹی کو کٹتے ہیں۔ پھر اس مٹی کو ٹوکروں میں بھر لیتے ہیں اور پہلے کی طرح ایک دفعہ اور اس کو پھینکے ہیں۔ اس کے بعد اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اس میں سے برے چٹ لیتے ہیں۔۔۔۔۔

سولہویں اور سترھویں صدی میں کوکٹوہ کی کاہیں اپنی پیداوار کی انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ یہاں ایسی ہیما ہے کہ گاؤں میں سے گاؤں بھر بھر کرے برے نکالے گئے ہیں، شہروں میں جس طرح بری یا غلطی منڈی ہوتی ہے۔ کوکٹوہ میں پیرا منڈی مٹی لے یہاں جہاں ہر کاہیو پار ہوتا تھا۔ غیر تھوڑا گھٹا ہے :

..... یہاں ایک بڑے تھلے کی بات ہے

ہرست سے روکے جس کی ہر دس سال سے سو سال ملک کی عورت ہے و ہتر کے اندر چوک میں ایک درخت کے نیچے مٹی کو جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ملک کے پاس ہرست تو لے کے بات تھیلوں میں گڑھوں پر ٹھکے رہتے ہیں۔ اور ایک تھیلی و مٹی میں اڑسی رہتی ہے جس میں پانچ پیر سو لاف پیسہ لگا ہوتا ہے۔ یہ بڑے دیان منیر کہ ہرست سے پچھواؤں کا انتظار کرتے رہتے ہیں جب کوئی پیسے والا آتا ہے تو وہ انہیں پوچھتا ہے کہ بڑے کو ایسے سب کا اخراج کرنا چاہیے، ہر اوگ دیتا ہے۔ وہ اسے دیکھتا ہے اور پھر اپنے بھولی کے ہاتھ میں سے دیتا ہے۔ اس طرح وہ ہر اوگ ہرست سب لڑکوں کے پاس ہوا آتا ہے اور آخر میں پھر اس

لہ قلم کوکٹوہ میں یہ تمام ایک سبک پیرا منڈی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے برابر ہیرا خانہ ہے۔

کی ہوتی ہے کہ ان کے غریب سے ہوئے پتروں کو دور

خوار خسویر لیتے ہیں.....

گول کٹڑہ میں جو اہلرات کی یہ کڑت تھک بٹا ہوں کے دم تک
ہی۔ ان کی حکومت کے خاتمہ پر یہاں کی لادوں کا بیج غائب ہو گیا
یہ ایک مقام ہے اور اب تک کسی نے نہیں بتایا کہ ان لادوں کے
میرے ایک دم کس طرح کا مشابہ ہو گئے۔ جن مقامات کے وہ فور
اندو دیا نے فور بیسے ہیرے لئے، وہ کاہن انیسویں صدی
میں آئے آئے ماہوار شیک پر دی جاتے تھیں۔ لیکن یہ کہتا
شک ہے کہ ان مقامات کے ہیرے باقی نہ ہو گئے۔ اب تک ایسا
ہو تک ہے کہ بارش کے بعد بھی کھار کی کھار کو ہیرا مل جاتا ہے۔

بڑے لڑکے کے پاس آ جاتا ہے۔

اب وہ بڑا لڑکا قیمت پوچھتا ہے اور سب کی رائے
سے اس کا سودا ہو جاتا ہے۔ شام کو یہ سب
لڑکے ان پتروں کو گنتے ہیں جو انہوں نے دن بھر
میں خریدے ہیں اور یہ کہ کر انہیں ان کی آپ ذات
وزن اور صفات کے لحاظ سے الگ الگ کرتے ہیں
پھر ان کی قیمت لگاتے ہیں اور بڑے سودا گروں کے
پاس لے جاتے ہیں۔ اب یہ کہہ لیں ہوتا ہے وہ ان
سب لڑکوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہر چہ ان کی
حرچہ کی ہوتی ہے گرائی کو جو اہلرات کی پرکھ اس بلا

لسانی اقلیتوں کو ماورائی زبان میں تعلیم

گزشتہ چار برس میں تمام ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کو پرائمری تعلیم کے مرحلے تک ماوری زبان میں تعلیم دینے
سے متعلق سہولتیں ہیں اخذ کر دیا گیا ہے۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۵۰ داسے کے مطابق ہر ایک ریاست اور ہر ایک
مقامی ادارہ یہ کوشش کرے گا کہ لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو پرائمری تعلیم کے مرحلے تک ان کی ماوری
زبان میں تعلیم دینے کی سہولتیں ہم پختہ بنائی جائیں۔

۵۹۔ ۱۹۵۸ء میں ریاست آسام میں ان اقلیتوں کے بچوں کو بنگالی، ہندی، کھاسی، کھاسی، وٹانی، گجرات،
بھیلی اور منی پوری زبانوں میں تعلیم دینے والے اسکولوں کی تعداد ۱۰۰۰۰ تھی۔ ۱۹۵۸-۵۹ء میں مذکورہ بالا قسم کے طلباء
کی تعداد بڑھ کر ۱۹۲۳۷ تک پہنچ گئی۔ جبکہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں وہ ۱۹۱۳۶ تھی۔

بہار میں ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۹۲۵۰۰ اسکولوں میں ۳۸۸۶۱۱ طلباء ہندی، بنگالی، اڑیسا، میتھی اور سنہالی زبانوں
میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ان طلباء کی تعداد صرف ۲۶۸۳۲ تھی۔

اڑیسہ میں ۲۵۹ اسکولوں میں نیگرو، ہندی، اردو، بنگالی اور گجراتی میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہاں ۵۶-۱۹۵۵ء
میں ۱۸۹ طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر اس وقت ان کی تعداد ۳۱۱۲۶ ہے۔

مغربی بنگال میں بھی متعدد اسکولوں میں اسی قسم کے طلباء کو ہندی، اردو، بھیلی، بنگالی، تبتی، گجراتی، اڑیسا اور
آدی زبانوں میں تعلیم کی سہولتیں میسر تھیں۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں ماوری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد
۹۹۷۹۱ تھی مگر ۶۱-۱۹۶۰ء میں وہ ۱۰۸۲۸۶ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح اسکولوں کی تعداد بھی ۱۰۸۶ سے بڑھ کر ۱۱۱۱ ہو گئی۔

ڈال ڈال کے پات

کی ایک لاکھ لاکھ کے برسرِ ہے، اپنی گنیز کو میسی جاتی تھی۔ تینوں رسالوں کی ایک ایک کاپی میٹھی کے سیکرٹری سرٹیلر کی خدمت میں روانہ کر دی جاتی تھی۔

[ہسٹری آف جرلز م ان انڈیا۔ نٹ رائیں۔ صفحہ ۵۰]
ماسٹر رام چندر نے ۱۸۳۵ء میں "فرماندہ انارکین" کے نام سے ایک پندرہ روزہ علمی اخبار جاری کیا اور جب محسوس کیا کہ اس میں خبریں بھی چھاپنی چاہئیں تو خبریں بھی شامل کر دیں۔ لیکن اخبار کا علمی رنگ قائم رہا۔ عین مقرر تھے ۱۸۳۸ء کے ایک شمارے کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شمارے میں کل چار ہزار چھ سو تیس الفاظ کا مواد موجود ہے۔ اس میں تین سو ستر الفاظ کا ایک اشتہار ہے۔ دو ہزار آٹھ سو اکیس الفاظ پر مشتمل تین مضامین شامل ہیں اور باقی مواد خبروں پر مشتمل ہے۔

مضمون کے عنوان یہ ہیں :

۱۔ "کرؤن زمین کا حال، حال آغا محمد شاہ ایران کا۔ اور حال مرادید یعنی موتی کا"۔ موزوں ذکر مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"مرادید اور صفت میں سب سے ایک ہی مادہ سے پیدا ہوتی ہیں مگر مرادید کی پیدائش میں رائیں مملکت ہیں، لیونوں کے نزدیک مرادید ایک مادہ منجمد ہے اور مادہ یا تو گوشت کے اندر یا گوشت کے باہر ملا ہوا یا لٹی صدف سے اس طرح سے جم جھوکر منجمد ہوتا ہے کہ بظاہر صدف میں کوئی رشتہ پایا نہیں جاتا اور لیونوں کے

دلی کے رسائل — عبدالسلام خورشید

دلی کا لکے پرنسپل مسٹر پٹنل نے ۱۸۳۵ء میں "قرآن السیر" کے نام سے ایک علمی ہفت روزہ جاری کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار مسٹر لکے کی وساطت سے مسٹر پٹنل کی ایک کتاب سے متعلق اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"۱۸۳۵ء میں دہلی میں چھپی میگزین کی طرز پر ایک باتھورموت رسالے کی بناء دلی۔ اس کا نام "قرآن السیر" تھا۔ گویا مشرق اور مغرب مشرقی اور مغرب سے آج کا زمانہ اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رجعت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے چل رہے تھے۔"

[دلی کا لکے میگزین، عقیم دلی کا لکے ہر صفحہ ۱۳۰]
دلی کا لکے کی مبلوغات چار عینیں۔ ایک ہفت روزہ "قرآن السیر" اور تین رسالے "فرماندہ انارکین"، "محب ہند" اور "حقیقۃ الحقائق" ان مبلوغات کی نگرانی کے لئے یہ طریق کار مقرر تھا۔

"عربی کے شعبے میں جو مولوی مقرر تھے، ان کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ان رسائل میں شامل ہونے والے سارے مواد کی جانچ پڑتال کریں۔ اور وہ مجاز تھے کہ جس مضمون یا خطبات کو قابل اعتراض سمجھتے، اسے حذف کر دیتے۔ لیا جت کے بعد اخبار

تہذیب — کرشن موہن

کوئی کے یہ میٹھی گیت، جو حق کی رُت یہ سادہ

باغوں کا یہ روپ گل، اے تھرے ابلیلے بن

جاگ اُٹھی ہے دل میں پریت، سننے پہے پریت

جاتے ہیں جوں شکیست، ات ہے کتنی من موہن

نادک تن کی مادکست، چمنی من کی کو مست

رگ رگ میں شکیست کی نے، اے رستہ تارہ جوں

پھر کب لوٹ کے آئیں گے، یہ رگین دن یہ راتیں

تھکے نہیں آتا ہے کبھی گزرا سے، بیتا جیون

آپنا سپنا دیکھیں، چاہت کی سیلا کھلیں

آ فرمت ہے پیار کریں، چھوڑ بھی نہ سلا پیں

سوچ بچار میں وقت نہ کھو، پھتا سکا رنج نہ ہو

دل کی پھلتا سے بدل سوچ بچار کا پیراں

تن کی پیاس نہ بجھے دے، من کی کس نہ ٹٹھے دے

جینے کی لطف نہیں، ہو نہ اگر تن من کی لگن

(ہماری زبان، علی گڑھ)

نزدیک صدف میں انکا قریا بہ سبب خرامش کیڑوں کے سوراخ
ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے جو مادہ کہ جسم جانور سے صدف کی پیدائش
کے واسطے نکلتا ہے، قریب گوشت کے کچے ہو کے موتی بن جاتے ہیں۔

[فوٹو انٹارکین، ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء]

یہ ستمبر ۱۸ء کو اسلرام چندر نے ایک علی اور ادنی
ماہنامہ جاری کیا۔ اس کا نام 'خیر خواہ ہند' تھا۔ جب انہیں معلوم
ہوا کہ اس نام کا ایک ماہنامہ پہلے نکلا ہے تو انہوں نے دوسرا
شعار لے لیا۔ اس کا نام 'محب ہند' رکھ دیا۔ اس رسالے کا ذکر کرتے
ہوئے انہوں نے 'فوائد انٹارکین' میں لکھا،

'اہل دانش نے اس کی بڑی قدر کی۔ انشاء اللہ اس میں مضامین
عام ایسے ہیں گے کہ جو تعلقت ہندو کو میر ہو گے اور قاری کا ہر
درد پار کی شش ہندوستان، فرنگستان، ایران، افغانستان وغیرہ کے
اور مضامین ہندو نفاذ درج ہوں گے۔ اور باتیں علم اخلاق
اور علم طبی اور علم ہنیت کی مفصل بیان کی جائیں گی تاکہ ہر ایک کی
فہمید میں آسکیں۔ اور حالی یا رفینٹ کا اور جو ریز اور اصلاحی
حکام اخلاقیات کی اور عجیب و غریب حالات اور اشارہ بڑے
بڑے استادوں کے، حج المقدور سے تصورات ان کی لکھے جائیں گے
اس رسالے میں تصورات بادشاہوں کے اور نقشہ جات مکانات
وغیرہ کے، جہاں کہیں جیسے تصویریں مزد ہوں گی، مندرجہ ہو گی۔

مٹے اس رسالے کے پچاس ہوتے ہیں اور قیمت اس کی روپیہ
ماہوار ہی ہوتی جلد ایک روپیہ۔

صحابان علم و دولت پر داغ ہو کر یہ رسالہ مشل اڈ
پچ اخبارات کے نہ ہو گا کہ بعد لکھنے کے وہ کچھ کام کا نہیں
رہتا ہے۔ بلکہ یہ شش ماہیاب کتاب کے دہے گا۔

[فوٹو انٹارکین، ستمبر ۱۸ء]

محرور میں نسل]

(اردو نامہ، گراچی)

ہندوستانی ڈراما

(انڈیا ڈاکٹر مفدر آکا)

ڈاکٹر مفدر آکا دنیائے ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ گراں مایہ تصنیف ڈراما کے میدان میں ان کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فاضل مصنف نے اس تصنیف کو نصابی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈرامے کی تاریخ اور مغربی و ہندوستانی فن ڈراما سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں مصنف نے اداکاری سے بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ڈراما اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر ہے۔

صفحات: ۳۴۷ قیمت: تین روپے ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: بزنس میجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

باہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹-اسٹریٹ نمبر ۳۴-پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲-رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵-بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا-۳۱ گرین روڈ سنگاپور

بزنس میجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی



Edited and published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed By The Model Press Private Ltd., Naya Bazar, Delhi-6.

